اسلام کا معاشرتی نظام

ڈاکٹر خالد علوی

اسلام کا معاشرتی نظام

(اسلام اور جدید معاشرتی نظریات)

ڈاکٹر خالد علوی

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

انتساب

لِلّٰہِ وَ لِرَسُوْلِہٖ ﷺ

فہرست مضامین

صفحہ نمبر		صفحہ نمبر	

حصہ دوئم

معاشرت ادارے

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

حصہ سوئم

جدید معاشرتی تعبیرات

نقش ثانی

یہ نومبر 1964ء کی بات ہے کہ استاد مرحوم علامہ علاؤالدین صدیقی نے مجھے شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں بطور لیکچرار منتخب کیا۔ علامہ صاحب مرحوم شعبہ کے بانی صدر اور یونیورسٹی میں انتہائی موثر شخصیت تھے۔ اس زمانے میں صدر شعبہ کو چھ ماہ کے لئے تقرری کے اختیارات تھے چنانچہ مجھے اور مرحوم حافظ احمد یار صاحب کو تقرری دی۔ کچھ عرصہ بعد اسامیاں مشتہر ہوئیں اور نومبر 1964ء میں سلیکشن بورڈ ہوا جس میں حافظ صاحب مرحوم اور میری تقرریاں ہوئیں۔ ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی اور ڈاکٹر امان اللہ خان صاحب کا انتخاب بھی اسی سلیکشن بورڈ میں ہوا۔ یہ دونوں حضرات دو برس سے عارضی لیکچرر کے طور پر پڑھا رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات میرے اساتذہ گرامی ہیں۔ تدریس کی ذمہ داری کچھ یوں کی تھی کہ یہ تینوں حضرات نصاب کے متعین پرچے پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب فقہ، ڈاکٹر امان اللہ خان تاریخ اور حافظ صاحب مرحوم قرآن مجید۔ علامہ صاحب تقابل ادیان، پروفیسر عبدالبشیر آذری مرحوم معاشیات اسلامی اور ملک محمد اسلم مرحوم حدیث اور فلسفہ۔ اسی زمانے میں نصاب میں تبدیلیاں کی گئی تھیں اور ایک پرچہ اسلام اور جدید معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظریات کے عنوان سے متعارف کرایا گیا تھا۔ مجھے اس کا ایک حصہ پڑھانے کے لئے دیا گیا کہ نوجوان لیکچرر کے لئے سینئر استاذ کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرنا بہتر تھا میں ملک صاحب مرحوم کے ساتھ تاریخ حدیث پڑھاتا اور ڈاکٹر امان اللہ خان اور پروفیسر عبدالبشیر آذری کے ساتھ اسلام اور جدید نظریات کا معاشرتی حصہ پڑھاتا۔ کچھ عرصہ بعد یہ حصہ ایک جز وقتی استاد کو دیا گیا اور میرے حصے میں حدیث کے پرچے کا ایک حصہ اور مضمون/ مقالہ کا پرچہ آیا۔

جس قلیل عرصے کے لئے میں نے معاشرتی نظام کا حصہ پڑھایا اس کے نوٹس میرے پاس جمع ہو گئے تھے۔ کلاس لیکچرز میں کچھ اہم حصے لکھوائے جاتے تھے لہذا معاشرتی نظام کے بھی بعض حصے ایسے تھے جو طلبہ کے پاس تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک طالب علم ان نوٹس کو چھپوانے کے لئے ناشروں کے پاس گیا ہے۔ لہٰذا مجھے احساس ہوا کہ ان نوٹس کو ناقص شکل میں چھپنے کی بجائے مکمل صورت میں چھپنا چاہیے۔ میں نے ان پر کچھ مزید محنت کی۔ نوک پلک سنواری اور ناشرین تک رسائی حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ ایک نوجوان لیکچرار کی تالیف کی اتنی اہمیت نہ تھی اس لئے بعض ناشرین نے بہ کمال مہربانی یہ پیش کش کی کہ وہ چار آنے صفحہ کے حساب سے مسودہ خریدنے کو تیار ہیں۔ میں اس بھاری معاوضے کیلئے تیار نہ

ہوا اور مسودہ اپنے علمی دوست اور بزرگ مولانا عبید الحق ندوی کے سپرد کر دیا اور انہوں نے اسے چھاپ دیا۔ چونکہ کتاب نصاب کے بہت سے پہلوؤں پر مشتمل تھی اسی لئے طلبہ میں مقبول ہوئی اور الحمدللہ اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔

شعبہ کے ارباب اختیار نے دوبارہ مجھے اس مضمون کو پڑھانے کی زحمت نہیں دی تاہم کتاب اسلامیات کے طلبہ کے کام آتی رہی اور موضوع کے ساتھ میری دلچسپی بھی قائم رہی۔ حدیث' سیرت اور دوسرے موضوعات کی طرف توجہ ہوئی تو فرصت ہی میسر نہ آئی کہ اس پر نظر ثانی کی جا سکے۔ 1968ء میں پہلا ایڈیشن چھپا اور اب چھتیس برس بعد موقع ملا کہ اس پر نظر ثانی کی جا سکی۔

کتاب بنیادی طور پر درسی ہے اور مضمون کے طلبہ و اساتذہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اس لئے اس کی اولین افادیت تو علوم اسلامیہ کے طلبہ و اساتذہ کے لئے ہے۔ لیکن اسلوب اور معلومات کے لحاظ سے ایسے تمام قارئین کے لئے انشاءاللہ مفید ہوگی جو اسلام کے معاشرتی نظام' جدید معاشرتی نظریات اور معاشرتی تعبیرات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں معاشرتی نظریات بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے میں معاشرتی ادارات اور تیسرے حصے میں معاشرتی تعبیرات سے بحث کی گئی ہے۔ ترتیب کے مطابق چوتھے حصے میں معاشرتی مسائل کو زیر بحث لانا تھا لیکن مولف کی مصروفیت آڑے آئی ہے اس لئے اس بحث کو انشاءاللہ کسی اگلے ایڈیشن میں یا مستقل تالیف کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ قاری محسوس کرے گا کہ موضوعات پر جدید نظریات اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مفصل معلومات پیش کی گئی ہیں۔ مغرب کی طرف سے جو الحاد و انحراف آرہا ہے وہ عمرانی علوم ہی کے ذریعہ آرہا ہے۔ حیات و کائنات کی مادی تعبیر نے معاشرتی زندگی کا رخ بدل دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری جامعات میں تمام علوم کی طرح عمرانی علوم کی تدریس و تحقیق بھی مغربی روایت کے فریم ورک میں کی جارہی ہے اس لئے ہماری معاشرتی پالیساں بھی اسی روایت کے مطابق بنتی ہیں۔ مغرب اس وقت ہماری کمزوری کی وجہ سے معاشرتی تغیر (Socialchange) کا ایجنڈا کہیں زور سے اور کہیں عیارانہ ڈپلومیسی یا مکارانہ تدبیروں سے روبہ عمل لارہا ہے۔ ہمارے پالیسی ساز' ناواقفیت' نالائقی یا بدنیتی سے اس ایجنڈے پر عمل درآمد کر رہے ہیں۔ ایسے میں ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان کو ان نظریات اور تعبیرات سے آگاہ رہنا چاہیے جو ہماری معاشرتی تباہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جدید مآخذ سے اہم نظریات و تعبیرات کے بارے میں معلومات جمع کر دی گئی ہیں جو ایک مسلمان کے لئے بالخصوص اور ایک عام قاری کے لئے بالعموم ضروری ہیں۔ کتاب پر نظر ثانی اور نئے موضوعات پر معلومات کی جمع و ترتیب پر ایک برس سے زائد لگ گیا ہے۔ اگر معاشرتی مسائل پر کام کیا جاتا تو مزید تاخیر ہوتی۔ ہمارے ناشر محترم محمد فیصل صاحب کا اصرار تھا کہ کتاب کو مارکیٹ میں لانے کے لئے جلدی کرنی چاہئے چونکہ اس میں پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جتنا کام مکمل ہوا وہ قارئین کی نذر ہے۔ آپ کے تنقیدی جائزوں اور مشوروں کی روشنی میں انشاءاللہ نظر ثانی ہوتی رہے گی۔

ایک گذارش مجھے حوالوں کے سلسلے میں کرنا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی کتب حوالہ اسی طرح بحال رکھی گئی ہیں البتہ کتب حدیث کے بعض نئے ایڈیشن استعمال کئے گئے ہیں ان کی وضاحت حاشیہ میں کردی ہے یا مراجع ومصادر میں۔ مثلاً صحاح ستہ کے دارالسلام ایڈیشن کو بھی استعمال کیا گیا ہے لہٰذا ان کی وضاحت مراجع میں کردی گئی ہے۔ انگریزی کتب کے سلسلے میں اکثر تفصیلات حاشیہ میں دی گئی ہیں اور مراجع میں بھی لکھ دی گئی ہیں۔

اس سلسلے میں دعوہ اکیڈمی اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے عزیز رفقاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے معاونت کی۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب، مولانا محمد احمد زبیری جنہوں نے حوالوں کی جانچ پڑتال میں معاونت کی۔ محمود احمد فاروقی جنہوں نے اشاریہ مرتب کیا۔ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ دعوہ اکیڈمی اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے لائبریری سٹاف کا جنہوں نے کتب حوالہ کی فراہمی میں بہت مدد کی۔ اپنے اہل خانہ کا کہ میں انہیں کبھی بھی مناسب وقت نہ دے سکا۔ علمی کام جس طرح کی توجہ چاہتا ہے اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی اور جگہ پر صرف ہونے والا وقت اس کی نذر ہو جائے۔ یہ حق تلفی ایک خطا ہے جسے صرف وہی معاف کر سکتے ہیں جنہیں یہ زحمت برداشت کرنا پڑی۔

ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں مشتاق حسین صاحب کا ذکر نہ کروں جنہوں نے کمپوزنگ کے لئے بے حد محنت کی اور ہر پروف پر تغیر وتبدل اور حک واضافہ کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور آخر میں محترم محمد فیصل کا جن کی توجہ اور اصرار سے کتاب کا نقش ثانی تیار ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے قارئین کے لئے نافع بنائے اور اپنے دین کی اس حقیری کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

خالد علوی

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

اسلام آباد

نومبر ۲۰۰۴ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے بندۂ حقیر کو یہ توفیق دی کہ وہ اس کے دین کی معمولی سی خدمت انجام دے۔ یہ اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کا صرف ایک گوشہ ہے جو اس کتاب کا موضوع ہے۔ میں نے اس موضوع کو اس لئے منتخب کیا کہ معاشرتی نظم انسان کا بنیادی مسئلہ اور اس کی اہم ضرورت ہے۔ کوئی مذہب اور کوئی فکری نظام انسانی زندگی کے اس پہلو کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ چونکہ دور حاضر میں معاشرتی مسائل اور اجتماعی ضروریات نے ایک مرتب سائنس کی صورت اختیار کر لی ہے اور انسان اور اس کی اجتماعی عادات کو اب زیادہ گہری نظر سے دیکھا جا رہا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کو بیان کیا جائے۔ اسلام نے اس پہلو کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اتنا جامع اور مکمل ہے کہ اسے اپنانے کے بعد کسی معاشرتی بدنظمی کا امکان باقی نہیں رہتا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جدید ترتیب سامنے رہے اور کتاب وسنت سے بھی صرف نظر نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر انگریزی اور عربی میں مفصل کتابیں موجود ہیں اور اردو زبان میں بھی معاشرتی زندگی کے بعض اہم مسائل پر بہت اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً لیوی کی کتاب (Social Structure of Islam) ابوزہرہ اور احمد شلبی کی المجتمع فی الاسلام اور سید مودودیؒ کی حقوق الزوجین اور پردہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسی کتاب کی گنجائش تھی جس کی ترتیب نئی ہو اور وہ پورے نظم کو بحیثیت مجموعی زیر بحث لائے۔ میری محدود معلومات کے مطابق اردو زبان میں اس قسم کی یہ پہلی کوشش ہے۔ میں نے حتی الامکان یہ سعی کی ہے کہ اردو عربی اور انگریزی کی تمام متعلقہ کتب سے استفادہ کروں اس کے باوجود کوتاہیوں کا امکان ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس کتاب میں کئی خامیاں ہوں گی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری کوتاہیوں کو معاف کرے اور مزید عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ ناسپاس گزاری ہوگی کہ اگر میں اس مرحلے پر مکرم محترم جناب عبیدالحق خان صاحب کا ذکر نہ کروں۔ اگر آپ کی ذاتی دلچسپی اور محنت شامل نہ ہوتی تو اس کتاب کے چھپنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حقیقت میں ان کی محنت خود مولف کتاب سے بھی زیادہ ہے۔ کتاب کی ترتیب' اس کی زبان کی تصحیح اور پروف پڑھنے میں انہوں نے جس اخلاص اور محنت سے کام کیا ہے اس کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ مجھے ان عزیز طلبہ کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مسودہ کی تیاری میں میری مدد کی۔

خالد علوی

شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

پیش لفظ

میں نے اپنے عزیز مولانا خالد علوی صاحب کی تصنیف بعنوان اسلام کا معاشرتی نظام کے مسودہ کے جستہ جستہ مقامات پر نظر ڈالی ہے' عزیز محترم نے ایک نہایت ہی اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے' اور الحمد للہ کہ مضمون سے انصاف کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں' مصنف کتاب ایک شعلہ بیان اور راسخ العقیدہ خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ادیب بھی ثابت ہوئے ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت کے اصولوں کی تشریح نہایت واضح اور مستند طریق پر کی گئی ہے اور ساتھ ہی دور جدید کے مغربی مفکرین کی آراء بھی مناسب طور پر بیان کی گئی ہیں' یہ غالباً ان کی اس میدان میں پہلی تصنیف ہے میری دعا ہے کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ امید ہے کہ کتاب اصول معاشرت کے طالب علموں اور عام قارئین دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی' منعم حقیقی سے دست بدعا ہوں کہ عزیز موصوف کو دین برحق کی مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ان کے لئے دینی اور دنیوی خیر و برکت کا باعث بنائے۔

پروفیسر علامہ علاؤ الدین صدیقیؒ

صدر شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

و

سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور

حصہ اوّل

بنیادی تصورات

1 جدید عمرانیات ایک تعارف

عمرانی علم (Sociology) کا تعلق انسانی معاشرت سے ہے۔ چونکہ انسان ہمیشہ معاشرتی زندگی گزارتا رہا ہے اور معاشرے کا فرد رہا ہے اس لئے اس نے معاشرے کو اپنے لئے کوئی الگ چیز نہیں سمجھا اور اس کے بارے میں اس کا علمی رویہ ایسا رہا ہے جیسا اپنی ذات کے بارے میں ہوتا ہے۔ انسان اپنے وجود کو ایک بدیہی حقیقت سمجھتا ہے اور اس کے بارے میں اسے اس وقت تک خاص احساس نہیں ہوتا جب تک وجود کو کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا۔ اسی طرح معاشرے کے بارے میں بھی اسے الگ علمی و تفتیشی سرگرمی کا کبھی خیال نہیں آیا۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں معاشرے کے بارے میں آراء اور رویوں کا اظہار کیا ہے۔ معاشرتی مطالعہ و تجزیہ بالعموم علم تاریخ کا حصہ رہا ہے۔ انسان اور اس کی معاشرت کے بارے میں مذہبی و غیر مذہبی تہذیبوں نے اپنے نقطہء نظر کو بیان کیا ہے تاہم اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے انسان اور اس کی معاشرت، معاشرتی اداروں اور معاشرتی استحکام و زوال کے بارے میں الہامی آراء کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے ہاں علم المعاشرت ایک الگ علم کے طور پر مرتب نہیں ہوا۔ مسلم فلاسفہ، متکلمین اور مورخین نے معاشرتی اصولوں کو بیان کیا ہے۔ صحت مند معاشرے کے قیام، معاشرتی فساد اور ریاست کے کردار کے بارے میں موثر بحثیں کی ہیں۔ مسلمان مورخ ابن خلدون پہلا مفکر ہے جس نے فلسفہء تاریخ کے ساتھ عمرانیات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ دوسری اہم شخصیت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی ہے جنہوں نے عمرانی فلسفے اور معاشرتی ادارات پر فکر انگیز بحثیں کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے جس وقت سیاسی و عمرانی امور پر اظہار خیال کیا ہے اسی وقت ہابز (Hobbes) اور لاک (Locke) سیاسی و عمرانی موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ جب انگریز منکر خدا، تہذیب کے نقوش مرتب کر رہے تھے اسی وقت شاہ ولی اللہ الہامی بنیادوں پر سیاسی و معاشرتی تنظیم کے خدوخال واضح کر رہے تھے۔ مسلمان مفکرین کی ان کاوشوں کے باوجود یہ کہنا مناسب ہوگا کہ علم المعاشرت ایک الگ علمی شاخ کے طور پر مرتب نہیں ہوا تھا۔ (۱)

سوشیالوجی بطور علم اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں متعارف ہوئی اور پوری انیسویں صدی میں نشوو ارتقاء کی منازل طے کرتی رہی۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کے کئی پہلو مزید واضح ہو کر سامنے آئے ہیں۔ جس عہد میں اس کا آغاز ہوا اس عہد کے حادثوں اور بحرانوں نے نئے نظریات اور نئی اقدار کو متعارف کرایا۔ یہ ایسے حالات تھے جنہوں نے سوشیالوجی کو بنیادیں فراہم کیں۔ نشاۃ ثانیہ، اصلاح مذہب، انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب وغیرہ نے یورپ میں نئے معاشرتی حالات پیدا کر دیئے تھے اس لئے نئے نظریات کے لئے زرخیز ماحول مہیا ہو گیا تھا۔ ماہرین عمرانیات

---

(۱) اس موضوع پر ڈاکٹر بشارت علی مرحوم کا کتابچہ "Muslim the First Sociologist" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

کے خیال میں سوشیالوجی کے لئے تین نظریات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور وہ ہیں: آزادیٔ خیال' بحران کا ادراک اور یہ یقین کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی و معاشرتی تبدیلی' صنعتی انقلاب اور سائنسی فکر کے فروغ نے سوشیالوجی کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔ تحریک تنویر (Enlightenment) نے کلیسا کی گرفت کو کمزور کر دیا تھا۔ نتیجۃً معاشرے کو مافوق الفطرت قوت کے حوالے سے الگ کر کے خالص انسانی حوالے سے دیکھا جانے لگا۔ سائنسی انقلاب کا آغاز جن شخصیتوں کے کام سے ہوا ان میں کیپلر (Kepler 1571-1630)' گیلیلیو (Galileo 1564-1642) اور نیوٹن (Newton 1642-1727) نمایاں ہیں۔ ان شخصیات کے نظریات نے اٹھارہویں صدی میں اپنے اثرات مرتب کرنے شروع کئے۔ اب کائناتی قوانین کا مطالعہ خدائی قوانین کے بجائے قوانین فطرت کے طور پر کیا جانے لگا۔ اور جدید سائنسی تعلیم نے کلیسا کے تصور کائنات کو چیلنج کیا۔ سیاسی و معاشرتی سطح پر تحریک تنویر (Enlightenment) نے اس تصور کو رد کر دیا کہ معاشرہ ایک فطری نظام ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے۔ تحریک تنویر کے مفکرین نے مثالی اور عملی معاشرے کی تقسیم پیش کر کے کام کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اسی سلسلے میں برطانوی مفکر جان لاک (John Locke 1632-1704) اور فرانسیسی مفکر والٹیئر (Voltair 1694-1776) بے حد اہم ہیں۔ ان کی تحریروں کے نتیجے میں مساوات' آزادی اور قومیت کے تصورات نے یورپ اور امریکہ پر بے حد اثرات مرتب کئے۔ غالباً انہی نظریات کا اثر تھا کہ 1776ء میں امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر کے آزاد ریاست قائم کی اور یورپ میں 1789ء میں فرانسیسی انقلاب رونما ہوا۔ یورپ کے لئے پوری انیسویں صدی بحرانوں کی صدی تھی۔ یکے بعد دیگرے تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں' سیاسی و معاشرتی حالات بدلتے رہے اور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مصنفین کے ہاں ان بحرانوں کا شعور پوری طرح موجود ہے۔ یہی وہ ادراک ہے جس نے معاشرتی مسائل کے تجزیے میں نئی راہیں دکھائیں۔

تیسرا اہم عامل صنعتی انقلاب ہے جو 1750ء سے 1850ء تک جاری رہا۔ اس انقلاب سے جہاں معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں آئیں وہاں یہ خیال بھی مستحکم ہوا کہ فطرت کی ان طاقتوں پر قابو پایا جا سکتا ہے جنہیں اب تک انسان کی رسائی سے ماوراء سمجھا جاتا تھا۔ عیسائیت نے یہ عقیدہ مستحکم کر رکھا تھا کہ فطری اور معاشرتی نظم خدا کا پیدا کردہ ہے لہٰذا یہ انسانی معاملہ نہیں ہے عہد نامہ جدید کا مندرجہ ذیل بیان اس کی تائید میں پیش کیا جاتا تھا:

Let every Soul be subject to higher powers. For there is no power but of God: the powers that are ordinance of God. Who ever therefore resisteth the power, resisteth the ordinanse of God. …….. For rulers are not a terror to good work, but to evil. (۲)

Romans, 13/1-7 (۲)

معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں نے دکھ اور محرومی کے سائے طویل کر دیئے تھے۔ صنعتی انقلاب نے یورپ کی روایتی زرعی معیشت کو توڑ دیا تھا' دیہی معاشرت کو منتشر کر دیا تھا اور شہروں کی آبادی کو اچانک بڑھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوسائٹی کے بارے میں پرانا تصور بکھر کر رہ گیا اور غریبوں اور ناداروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جن کے پاس رہنے کی جگہ نہ تھی' علاج کے لئے مال نہ تھا اور اجتماعی زندگی کی بنیاد نہ تھی۔ اس صورت حال میں تحقیق کرنے والوں اور انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار لوگوں نے غریب اور نادار لوگوں کے حالات اور اس کے مطالعہ کے بارے میں سوچا۔ مثلاً برطانیہ میں غربت کے مطالعہ و تحقیق پر کام شروع ہوا۔ انیسویں صدی میں جن لوگوں نے برطانیہ میں کام کیا ان میں سے ہیو (Mayhew)' بوتھ (Booth) اور راؤنٹری (Rowntree) قابل ذکر ہیں۔ برطانوی علم المعاشرت پر ان کے اثرات اس وقت بھی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ بے حد پرامید تھے کہ نادار لوگوں کے حالات کو سنوارا جا سکتا ہے اور انیسویں صدی کے سرمایہ داروں کی پیدا کردہ تمام مشکلات کے باوجود نادار لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ انہی حالات نے علم المعاشرت کے نشوو ارتقاء کی بنیاد مہیا کی۔ معاشرتی تبدیلی (Social change) ہی وہ موضوع تھا جس پر تحقیق و تفتیش کی ساری عمارت کھڑی ہوئی۔ ان محققین کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ معاشرتی نظم کی بنیاد (Basis of social order) معلوم کی جائے۔ کارل مارکس (Karl Marx 1818-83) نے معاشی ڈھانچے کو معاشرتی نظم کی بنیاد قرار دیا' میکس ویبر (Max Weber 1864 - 1920) کے نزدیک معاشرتی رویوں اور عمومی طرز عمل کو مذہبی عقائد میں تلاش کیا جا سکتا ہے جبکہ درخائیم (Emile Durkheim 1858 -1917) معاشرتی نظم کی تلاش میں تھا۔

مغربی علم المعاشرت (Sociology) کی چند نامور شخصیات

مغربی علم المعاشرت اس وقت ایک منظم علم کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو جن لوگوں نے بنیادیں فراہم کیں حقیقت میں وہی قابل ذکر لوگ ہیں۔ ان میں سے چند نمایاں افراد کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(i) اگسٹ کومٹے (August Comte 1798-1857)

اگسٹ کومٹے فرانسیسی فلسفی تھا جس نے سب سے پہلے اپنی کتاب (Course de philosepiepositive) میں سوشیالوجی کی اصطلاح استعمال کی۔ اگرچہ کومٹے نے علمی طور پر اس موضوع پر زیادہ کام نہیں کیا تاہم اس نے معاشرے کے مطالعہ کے لئے فلسفیانہ اپروچ کے بجائے سائنسی طریق متعارف کرایا۔ بعد میں آنے والے مصنفین نے اس منہاج کو اختیار کیا اور یوں کومٹے نے بہت سے مصنفین کو متاثر کیا۔ بالخصوص درخائیم (Durkheim) کومٹے کی فکر سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔

(ii) کارل مارکس (Karl Marx 1818 - 1883)

اگرچہ مارکس اپنے آپ کو عمرانی ماہر کہنے کی بجائے انقلابی اور سیاسی معیشت دان (Political Economist)

کہتا تھا لیکن معاصر علم المعاشرت پر اس کے بڑے اثرات ہیں۔ مارکس کے نزدیک معاشرے کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان ضروریات زندگی کی پیداوار کے لئے اکٹھے ہوئے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق معاشرے کی بنیاد معاشی پیداوار ہے اسی لئے معاشرے کو سمجھنے کے لئے معاشی سرگرمی کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کا اگلا مرحلہ وہ ہے جب معاشرے کے مختلف گروہوں کے درمیان معاشی اختلافات پیدا ہوئے۔ مارکس کی رائے میں یہ اختلافات اس وقت پیدا ہوئے جب معاشرے کے ایک گروہ نے وسائل پر اجارہ داری قائم کرنے کے نتیجے میں معاشرے پر طاقت حاصل کر لی۔ اس طاقت کے ذریعہ اس نے پورے گروہ پر غلبہ حاصل کر لیا اور معاشرے پر اپنی اقدار نافذ کیں جو اس کے لئے مفید اور نفع بخش تھیں۔ معاشرے کی تاریخ اس کی معاشی ساخت کے تغیر کی تاریخ ہے اور اس کے ساتھ غالب گروپ کی تبدیلی منسلک ہے۔

مارکس کے نزدیک ہر گروہ کے غلبہ کا دور جدید باب (epoch) کہلاتا ہے۔ مارکسی تجزیہ کے مطابق معاشرتی اقدار و روایات کا تعلق معاشرے کے غالب طبقات کے مفادات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور انہی کے مفادات کے حوالے سے ہر شے کی قدر متعین ہوتی ہے۔

(iii) ہربرٹ سپنسر (Herbart Spencer 1820-1930)

سپنسر (Spencer) انیسویں صدی کا معروف انگریز مصنف ہے۔ معاشرتی فکر میں اس کا بنیادی حصہ یہ ہے کہ اس نے معاشرے اور جسم نامی (organism) میں مماثلت پر زور دیا اور بالخصوص یہ کہ معاشرے کے مختلف حصوں کا آپس میں ربط اسی طرح کا ہے جس طرح انسانی یا حیوانی وجود کے مختلف اعضاء کا ہوتا ہے۔ بظاہر یہ تصور بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اُس عہد میں یہ انوکھی بات تھی۔ سپنسر (Spencer) کی تحریروں کا بڑا کام نظریہ ارتقاء کو معاشروں پر منطبق کرنے سے متعلق ہے بالخصوص بقاء اصلح (Surviral of the fittest) کا نظریہ۔

(iv) جارج سمل (George Simmel 1856-1918)

سمل (Simmel) کا نقطہ نظر یہ ہے کہ معاشرے میں اصل شئی باہمی عمل یا تفاعل (Interaction) ہے۔ سمل (Simmel) کے دلچسپ نظریات میں خاص طور پر معاشرتی تعلقات میں ساخت اور محتویات کے درمیان امتیاز (Distinction between form and content) کا نظریہ ہے جیسے تناظرات میں اختلاف اور تصادم کا پیدا ہونا۔ اس کا خیال ہے کہ معاشرتی تعلقات میں اصل چیز وہ ساخت (form) ہے جو مختلف مواقع پر پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کمرہ تدریس میں استاد اور شاگرد کا تعلق اور دونوں کے ردہائے عمل۔ سمل کے اس نظریہ کو کچھ عرصہ تک نظر انداز کر دیا گیا تھا اور علم المعاشرت میں درخائیم (Durkheim) کے زیر اثر معاشرے کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا جاتا رہا تھا۔ ماہرین عمرانیات نے معاشرے کے بڑے اداروں پر توجہ دی جیسے مذہب' معاشی نظام اور خاندان وغیرہ۔

لیکن ساٹھ کی دہائی کے نصف میں زیادہ توجہ روزمرہ کے تجربے اور عارضی وغیر رسمی باہمی ربط پر ہوئی۔ اس طرح ساخت اور نظام (Structure and system) کے بجائے باہمی عمل (Interaction) پر زیادہ توجہ مرکوز ہوئی۔ اس تبدیلی میں سمل کے نظریات کا بڑا دخل ہے یا یوں کہیے کہ سمل کے نقطہ نظر کا احیاء کیا گیا اور سوشیالوجی میں مجموعی اور بڑی سطح کی بجائے چھوٹی سطح کے تعلقات کو اہمیت دی گئی۔ اسی نظریئے کا اثر تھا کہ خاندان اور کام کی جگہ پر آویزش کا جائزہ لیا گیا اور معاشرے میں اس سطح پر مفاہمت کی اہمیت کا اندازہ لگایا گیا۔

(v) جارج ہربرٹ میڈ (George Herbert Mead 1863-1931)

سمل (Simmel) جس وقت جرمنی میں معاشرتی تفاعل کا جائزہ لے رہا تھا اس وقت میڈ (Mead) امریکہ میں روزمرہ تفاعل کی پیچیدگیوں کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میڈ (Mead) پیشے کے لحاظ سے فلسفی تھا ماہر عمرانیات نہ تھا لیکن یہ عمرانیات کے لوگ تھے جنھوں نے اس کے نظریات کو نشوونما دی اور معاشرتی حالات پر منطبق کیا۔ میڈ (Mead) کا زیادہ کام روزمرہ ہزاروں مرتبہ معاشرتی تفاعل کے متعلق ہے۔ یہ باہمی عمل ہر مرتبہ ہمیں مختلف ردعمل پر آمادہ کرتا ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف صورتوں میں ہم کس طرح صحیح رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے صورت حال خراب نہیں ہوتی اور معاشرتی رابطہ برقرار رہتا ہے۔ میڈ (Mead) کا خیال ہے کہ یہ مہارت ہم بچپن ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ کھیلتے ہوئے ایک مرتبہ استاد کا کردار کرتے ہیں اور دوسری مرتبہ شاگرد کا۔ بڑے ہونے کے بعد ہمیں اس کا فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کھیلوں میں ہمیں اپنے متعلق یہ واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں اور اسی طرح ہم دوسروں کے متعلق مناسب رویہ اختیار کرنے کا سلیقہ بھی سیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں یہ شعور بھی حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہم نے زندگی میں کئی کردار ادا کرنے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعہ ہم نے یہ بھی معلوم کیا کہ ہم نے اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ پر رکھ کر یہ دیکھا کہ وہ کس طرح محسوس کرتے ہیں۔ اس طریقے پر ہم اپنے رویے کو دوسروں کے رویے سے جوڑ دینے کا سلیقہ بھی سیکھتے ہیں اور یوں ایک منظم اور قابل اعتماد معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جس کا ہمیں ہر روز تجربہ ہوتا ہے۔

(vi) ایمل درخائیم (Emile Durkheim 1858-1917)

درخائیم (Durkheim) ان اہم ماہرین عمرانیات میں سے ہے جن کا علم المعاشرت کے فروغ و استحکام میں بنیادی حصہ ہے۔ وہ پہلا پروفیسر تھا جسے بوڈیکس یونیورسٹی (Bodeaux University) میں مسند عمرانیات (Chair of sociology) پر فائز ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس نے ایک اہم اور موثر عمرانیاتی رسالے (Sociological Annee sociologique Journal) کا اجراء کیا۔ درخائیم سپنسر سے متاثر تھا۔ سپنسر کی اپروچ یہ تھی کہ معاشرتی عوامل

کو ان کے باہمی تعلق کے حوالے سے دیکھنا چاہئے ہر ایک کو انفرادی طور پر نہ دیکھا جائے۔ درخائیم نے اس نظریئے کو اپنایا۔ اسی طرح کومٹے کا سائنسی منہاج اسے پسند تھا۔ درخائیم ایک معاشرتی نظم کا قائل تھا کیونکہ معاشرے میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اور جس طرح کا انتشار تھا اس کے ردعمل میں وہ منظم ومربوط معاشرے کا داعی تھا۔ درخائیم نے چار کتابیں لکھیں:

1- The division of labour
2- Suicide
3- The Rules of Sociological Method
4- The Elementry form of Religious life

درخائیم (Durkheim) کے پیش نظر تین اہم نکات تھے۔

پہلا سروکار تو سوشیالوجی کی قدر و قیمت اور اس کی امتیازی حیثیت ثابت کرنا تھا۔ دوسرا یہ تجزیہ کہ معاشرے کس طرح مربوط ومنظم رہتے ہیں اور تیسرا یہ ثابت کرنا کہ معاشرے کے مختلف اجزا کس طرح باہم دگر متعلق رہتے ہیں۔

وہ اپنی کتاب (Division of Labour) میں سوسائٹی کی معاشرتی وحدت کے اسباب پر بحث کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ معاشرے میں دو طرح کی معاشرتی یکجہتی موجود ہوتی ہے نامیاتی (organic) اور میکانکی (Mechanical)۔ میکانکی معاشروں کے ارکان میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے جیسا کہ قبائلی معاشرے ہیں۔ ان معاشروں میں یکسانیت پر زور دیا جاتا ہے اور تصادم سے گریز کیا جاتا ہے۔ نامیاتی معاشروں میں جو عمرانی اور تکنیکی طور پر پیچیدہ ہوتے ہیں، معاشرتی یک جہتی کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ ہر جز تقسیم کار کے تحت مختلف طریقے سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے اور اس طرح باہمی انحصار تشکیل پاتا ہے۔ درخائیم یہاں سوسائٹی کے مختلف اداروں کے تعلق کو انسانی جسم کے اعضاء کے ساتھ مثال دیتا ہے۔ جس طرح جسم کے مختلف اعضاء مختلف کام کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اسی طرح سوسائٹی کے مختلف ادارے بھی مختلف کردار ادا کرنے کے باجود ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہیں اور معاشرے کو مستحکم رکھتے ہیں۔ درخائیم کے نزدیک انسان مکمل طور پر معاشرے کے کنٹرول میں ہے جس طرح پتلی تماشہ گر کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ ہر معاشرے کی بعض مشترک اقدار ہوتی ہیں جسے کسی معاشرے کا اجتماعی ضمیر (Collective conscience) کہا جا سکتا ہے۔ اسی اجتماعی ضمیر کے ذریعے معاشرہ افراد کو کنٹرول کرتا ہے۔ جب یہ اجتماعی ضمیر کسی وجہ سے کمزور ہوتا ہے یا منتشر ہوتا ہے تو معاشرے میں لاقانونیت پیدا ہوتی ہے اور ہر فرد معاشرتی نتائج کی پرواہ کئے بغیر اپنے مفادات کے لئے سرگرم عمل ہوتا ہے درخائیم (Durkheim) اس معاشرتی صورت حال کو ''anomie'' کا نام دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے یورپ میں جو تغیر اور انقلاب برپا تھا اور جو معاشرتی تبدیلیاں آ رہی تھیں ان سے پیش نظر درخائیم معاشرتی نظم (Social order) کی بات کرتا ہے۔

اپنی کتاب "The Elememnty form of Religious life" میں وہ اُن مرکزی اقدار کے آغاز اور ان کی ساخت کے بارے میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے جن کا ظہور اجتماعی ضمیر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ درخائیم نے "The Rule of sociological Method" میں ان بہت سے نظریات کی تشکیل کی جو اگلے 60 برس میں ثبوتی ماہرین عمرانیات (Positivistic Sociologists) کو متاثر کرتے رہے۔ ثبوتیت (Positivism) اس عمرانیاتی اپروچ کا نام ہے جس میں طبیعاتی علوم کے سائنسی منہاج کو عمرانی تحقیق میں استعمال کیا جاتا ہے۔ درخائیم کا استدلال یہ تھا کہ معاشرہ در حقیقت افراد کی سرگرمیوں سے بلند اور ماوراء اسی طرح موجود رہتا ہے جس طرح مشین اپنے ان اجزاء سے بڑھ کر ہے جو اس کا حصہ ہیں اور انسانی جسم اپنے مختلف اعضا سے بڑھ کر ہے جو اسے تشکیل دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم سوسائٹی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ سوسائٹی باہم دگر متعلق اداروں کے مجموعہ کا نام ہے جیسے خاندان اور معاشی نظام وغیرہ۔ ہر ادارہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے اور اسے عمرانی حقیقت (Social fact) تصور کیا جاتا ہے۔

سمل (Simmel) کے برخلاف، جو معاشرے کی مجرد خصوصیات پر زور دیتا ہے، درخائیم نے معاشرے کی حقیقی اور واقعی نوعیت پر زور دیتے ہوئے یہ دلیل دی کہ سوشیالوجی کو سائنس تسلیم کرتے ہوئے وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے جو سائنس کے سلسلے میں اختیار کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اس نے معاشرے کی نامیاتی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معاشرے کا بہترین تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرتی اداروں کا جائزہ لیا جائے کہ ان کا سوسائٹی کی بقاء پر کیا اثر ہے؟ جس طرح انسانی اعضاء کی کارگزاری کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دل کا کام دوران خون کو جاری رکھنا ہے اسی طرح معاشرتی ادارے کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کام معاشرے کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔ تجزیہ ثابت کرے گا کہ یہ کام ہو رہا ہے کہ نہیں۔

اپنی کتاب خودکشی (Suicide) میں درخائیم یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ معاشرتی مناظر کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان پر معاشرے کے اثرات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے مثلاً وہ مختلف ملکوں میں خودکشی کے اعداد و شمار کو سال بہ سال دیکھتا رہا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اگر یہ انفرادی منظر ہوتو مختلف ملکوں میں خودکشی کا تناسب مختلف ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ خودکشی کو تین اقسام پر تقسیم کرتا ہے۔

انانیت پر مبنی خودکشی (Egotistic suicide)

خود پرستانہ خودکشی ان معاشروں میں زیادہ ہوتی ہے جس میں فرد کو گروپ پر زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اس کا

خیال ہے کہ پروٹسٹنٹ معاشروں میں فرد کی اہمیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ درخائیم کے تجربے میں پروٹیسٹنٹ اور کیتھولک معاشروں میں خودکشی کے اعدادوشمار کا بڑا فرق ہے۔ اس کی تحقیق کے مطابق جرمنی کے صوبہ بویریا (Bavaria) میں خودکشی کی کم وارداتیں ہیں کیونکہ اس کی اکثریت کا تعلق کیتھولک فرقے سے ہے۔ اس کے خیال میں خودکشی کا معاشرتی پیوستگی (Social cohesion) سے گہرا تعلق ہے۔ فرد کا جتنا گہرا تعلق اپنے معاشرے سے ہوگا اتنا ہی خودکشی کا کم امکان ہوگا۔ اس کے اس نتیجہ کو اس تحقیق سے بھی تقویت پہنچی کہ تنہا رہنے والوں میں خودکشی کا تناسب شادی شدہ یا خاندان میں رہنے والے افراد سے زیادہ تھا۔

بے غرضانہ وایثار آمیز خودکشی (Altruistic Suicide)

یہ خودکشی ان معاشروں میں پائی جاتی ہے جن میں فرد کی معاشرتی ذمہ داری پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کے لئے ایثار کرے۔ درخائیم نے اس کی مثال میں ستی کی رسم کو پیش کیا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں خاوند کی موت پر عورت بھی چتا میں زندہ جل جاتی تھی۔ یہ رسم اگرچہ ختم ہوگئی تھی لیکن ہندو مت کے احیائی جوش کے نتیجہ میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات جبراً عورت کو چتا میں ڈال دیا جاتا ہے۔

بحرانی خودکشی (Anomic suicide)

درخائیم کی تحقیق کے مطابق معاشی بحران اور معاشرتی خوشحالی کے دوران خودکشی کے تناسب میں اضافہ ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں ایک تغیر یا انقلاب آتا ہے اور بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرتی یا قانونی نظم کی شکست وریخت کی وجہ سے فرد عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے اور خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔

درخائیم یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ خودکشی کا تعلق معاشرتی نظم سے ہے۔ درخائیم کی اس کتاب کو سائنسی منہاج کی عمدہ مثال تصور کیا گیا ہے۔

میکس ویبر (Max Weber 1864-1920)

ویبر نے سوسائٹی کے متعلق نیا تصور دیا۔ وہ سوشیالوجی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ علم المعاشرت انسانی عمل کا مکمل علم ہے۔ (۳) اس تعریف میں لفظ ''action'' کی خاصی اہمیت ہے کیونکہ سوسائٹی کے تصور اور معاشرتی مطالعہ میں اس کا اختیار کردہ منہاج اسی لفظ پر منحصر ہے۔ مارکس اور درخائیم کے نزدیک سوسائٹی کی ساخت (Structure) اہم ہے بایں وجہ کہ صورت پہلے سے موجود ہے جس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے لیکن ویبر کہتا ہے کہ سوسائٹی محض تصور ہے جو باہمی متعلق افعال کو بیان کرتا ہے مثلاً خاندان ایک ساخت یا ڈھانچہ ہے۔ ماں باپ اور بچے۔ جو جسمانی اور قانونی لحاظ سے باہم دگر

(۳) Sociology is the comprehensive science of human action

مربوط ہیں چند افعال کی وجہ سے ایک دوسرے سے متعلق ہیں یعنی اکٹھے رہنے اور بعض سرگرمیوں میں اشتراک کی وجہ سے۔

اسی طرح ویبر معاشرتی تغیر (Social change) کے بارے میں بھی خاص نقطہ نظر رکھتا ہے۔ درخائیم کا خیال ہے کہ سوسائٹی میکانکی معاشرتی ساخت سے نامیاتی صورت کی طرف آئی ہے جبکہ مارکس کے نزدیک معاشرے کی موجودہ ہیئت ایک معاشی و معاشرتی دور سے دوسرے دور کی طرف ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور خاص قسم کے معاشرتی عمل کی تبدیلی ہے۔ پھر وہ اس عمل (action) کی چار قسمیں بیان کرتا ہے۔ اور

1- Affective action. فوری اور موثر عمل
2- Traditional action. رواتی عمل
3- Wert rational action اصولی عقلی عمل
4- Zweck rational action. بامقصد عمل

Affective action سے مراد فوری جذباتی فعل ہے Traditional action سے مراد ہمارا وہ عمل ہے جسے لوگ ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں۔ Wert rational action سے وہ عمل مراد ہے جو کسی قدر (Value judgement) کی بنیاد پر کوئی مقصد حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جیسے نجات حاصل کرنے کے لئے صحیح عمل (Valuegral) عبادت کرنا ہے اور Zweck rational action ایک بامقصد فعل ہے جسے لوگ عقلی نصب العین حاصل کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں۔ جیسے سائنسی عمل (Scientific activity)

ویبر (Weber) کا خیال ہے کہ سوسائٹی اس آخری عمل کے حصول کے لئے ارتقاء پذیر ہے۔ انسانی عمل کی اس تعبیر کے نتیجے میں اس کا یہ عقیدہ بنا کہ ایک فرد جس طرح ایک صورت حال کا تصور کرتا ہے اس کا سمجھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس سے ہم سمجھ سکیں گے کہ ایک شخص نے ایسا اقدام کیوں کیا۔ عامل کے عمل کو اس کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے لئے وہ "Verstehen" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اپنی کتاب (Power, Class, State and Party) میں "action" اور "verstehen" کے تصور کی بنیاد پر ویبر وہ ترتیب پیش کرتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک فرد دوسرے کے اقتدار کو قبول کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنے اعمال کو مرتب کرتا ہے۔

ویبر کی مشہور کتاب (The protestant ethics and the spririt of capitalism) ہے۔ یہ ایک طرح کا جواب ہے مارکس کے اس تصور کا جو سرمایہ داری کے ارتقاء کے سلسلے میں اس نے اختیار کیا ہے۔ مارکس کا خیال تھا کہ سوسائٹی کو سمجھنے کی کنجی معاشی بنیاد ہے۔ معاشی تبدیلیاں سوسائٹی کی اقدار میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں۔ ویبر' مارکس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسانی قدریں معاشی تبدیلیوں پر مقدم ہیں۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سرمایہ درانہ نظام یعنی ہمارا معاشرتی نظام جو صنعت اور انفرادی ملکیت پر مبنی ہے' کی بنیاد ہمارے مذہبی عقائد پر ہے۔

کالیونزم (Calvinism) ایک سخت پروٹیسٹنٹ اصلاح کے طور پر سولھویں صدی عیسوی میں سوئیزرلینڈ میں

شروع ہوا۔اس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ لوگوں کی پیدائش سے پہلے خدا کی طرف سے یہ طے ہو چکا تھا کہ کس نے جنت میں جانا ہے اور کس نے دوزخ میں۔ یہ عقیدہ اس تصور پر مبنی تھا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔لہٰذا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہم جنت میں جائیں گے کہ جہنم میں۔اس سلسلے میں ایک آدمی کے لئے بنیادی مشکل یہ تھی کہ اسے کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی جس سے وہ اس تقدیر کو تبدیل کر سکے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ رب کے طریقہ کی پیروی کرے اور پھر کسی نشانی کا انتظار کرے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ منتخب لوگوں میں سے ہے یا نہیں؟ خدا نے زمین پر جو نشانی پیش کی ہے وہ مادی خوشحالی ہے کیونکہ خدا برے آدمی کو کیوں خوشحال ہونے دے گا؟۔

کالون (Calvin) اس زندگی کو ابدی زندگی کی تیاری سمجھتا تھا لہٰذا دنیا سے لطف اندوزی یا عامیانہ پن کو گناہ قرار دیتا تھا۔تاہم اس عقیدے کے تحت کہ کام عبادت (To work is to pray) ہے محنت کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی لہٰذا مادی اشیاء کی صورت میں صلہ لینے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔

ویبر اس عقیدے کی بنیاد پر یہ استدلال کرتا ہے کہ محنت کی حوصلہ افزائی اور خرچ کرنے کے مواقع کی کمی نے دولت کو جمع ہونے دیا۔ یہ جدید سرمایہ درانہ نظام کی نشوونما کے لئے بہترین حالات تھے۔اٹھارہویں صدی کے موجد اور مہم جو اپنا سرمایہ لگانے کے لئے نئی مشینری اور انڈسٹری کی جستجو میں تھے جبکہ یورپ کے کیتھولک ممالک میں تاجروں کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا۔اس کی وجہ کیتھولک قدریں تھیں کیونکہ ان کے ہاں مال خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔نتیجۃً ان کے پاس جمع شدہ سرمایہ ہی نہ تھا۔اس کے علاوہ یہ تاجر اور اشرافیہ اپنے حالات پہ قانع تھے جبکہ کالونسٹ کے ہاں قوت ارادی بھی تھی اور اتنا سرمایہ بھی تھا جو لگایا جا سکے۔ویبر کا خیال ہے کہ کالونسٹ قدریں' نئی ایجادات اور خاص حالات میں وہ بنیادی وجوہات تھیں جس سے سرمایہ درانہ نظام نے نشوونما پائی۔خاص طور پر برطانیہ جہاں کالونسٹ (Calvinist) زیادہ مضبوط تھے۔

ویبر کا بنیادی کارنامہ طریق کار (Methodology) میں ہے۔عمرانی علوم میں بنیادی مشکل یہ ہے کہ تصورات کی صحیح تعریف نہیں ہو سکتی۔سوشیالوجی کے لئے خاص طور پر یہ مسئلہ رہا ہے کہ وہ عام اور معروف تصورات کا تجزیہ کرتی ہے اور صحیح تعریف نہ کر سکنے کی وجہ سے مسئلہ ہی کنفیوژن کا شکار ہو سکتا ہے۔ویبر نے اس سلسلے میں مثالی قسم (Ideal type) کا تصور دیا ہے جس سے تعریف کا مسئلہ آسان ہو گیا ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس تصور پر بحث کرنی ہے سب سے پہلے اس کے ان اجزا کو تلاش کیا جائے جو اس میں پہلے سے موجود ہیں۔ان کو بیان کرنے کے بعد جو زیر بحث مطلوب ہے اسے اس ماڈل پر پرکھا جائے۔برطانوی ماہر عمرانیات گرین وڈ (Green wood) نے ایک Ideal type کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔پیشہ (Profession) کے Ideal type کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے پانچ معیارات مقرر کئے۔

(i) نظامی نظریہ (Systematical theory) یہ واضح کرتے ہوئے کہ اس کا تعلق علمی دنیا سے ہے۔

(ii) پیشہ ورانہ اختیار (Professional authority) کے ماہر کی رائے کو بلا چون و چرا تسلیم کرنا ہے۔

(iii) جماعت کی منظوری (The sanction of the community) یعنی عوام نے انہیں یہ حق دیا ہو کہ وہ اپنی مہارت کے میدان میں کام کر سکتے ہیں۔

(iv) ضابطہ اخلاق (Code of conduct) یعنی پیشہ اپنے ارکان کو ایک صحیح ضابطہ اخلاق کا پابند رکھنے کا انتظام کرے۔

(v) پیشہ ورانہ کلچر (Professional culture) اس پیشہ کا ایک عمومی انداز ہ جس سے وہ باہر کے لوگوں میں پہچانا جا سکے اور اندرونی رابطہ بھی مستحکم ہو سکے۔ جو پیشہ بھی ان معیارات کو پورا کرنے کے قریب تر ہو گا وہ پیشہ (Profession) تصور کیا جائے گا۔

ویبر (Weber) کا بنیادی کام یہ ہے کہ اس نے علم المعاشرت میں عمل اور نظریات کو سوسائٹی کے ادراک کے لئے ضروری قرار دیا۔

عمومی جائزہ

سوشیالوجی کی بنیادیں رکھنے والے ان مفکرین نے اس علم کو وہ بنیادی نظریاتی ڈھانچہ دیا ہے جو اب بھی اس علم کی معرفت میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ علم المعاشرت کے مطالعہ' اس کی تدریس اور اس کے تجزیاتی نمونوں میں مارکس' درخائیم' ویبر اور میڈ وغیرہ کے نظریات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سب مفکرین کے سامنے مرکزی سوال یہ تھا کہ سوسائٹی ایک منظم صورت پیش کرتے ہوئے اپنے آپ کو کس طرح مربوط رکھ سکتی ہے؟ یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ان کے عہد میں تھا۔ درخائیم کے نظریات نے ایک مکتب فکر کو جنم دیا جو افادیت پسندی ''Functionalism'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ درخائیم یہ دیکھتا تھا کہ معاشرے کے مختلف ادارے کس طرح کام کرتے ہیں۔ میڈ Mead کے نظریات Symbolic interactionists کو وجود میں لائے۔ یہ لوگ اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ لوگ اپنے روزمرہ کے معمولات کسی طرح ادا کرتے ہیں۔ مارکس کے نظریات نے Critical sociology کو وجود پذیر کیا جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ حکمران گروہ معاشرے پر کس طرح غلبہ پاتا ہے۔ ویبر کے نظریات نے کسی مکتب فکر کو تو نہیں پیدا کیا لیکن اس کے نظریات نے ہر جگہ اپنا اثر دکھایا ہے۔

غور سے کیا دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوشیالوجی کا آغاز وارتقاء بحرانوں کا رہین منت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی بحرانوں کی صدی تھی۔ یہ صدی' سیاسی' معاشی اور معاشرتی اضطرابات کی صدی تھی۔ تین نامور بنیاد کنندہ مفکرین نے ان اضطرابات کو مختلف نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ درخائیم منظم معاشرے کی یاد میں مبتلا (Nostalgically) معاشرتی نظم کو دیکھتا ہے۔ ویبر (Weber) کو مستقبل سے گھبراہٹ ہوتی ہے کیونکہ وہ معاشرے کو

بیورکریسی کے پنجے میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔ گویا معاشرہ ایک آہنی پنجرہ ہے لیکن مارکس اپنے گردوپیش میں نکبت و مسکنت اور ظلم دیکھتے ہوئے مستقبل میں امید کی کرن محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ مستقبل میں اشترا کی اشتمالی معاشرہ قائم ہو گا اور یہ دکھ دور ہو جائیں گے۔ اشترا کی روس نے اسے آزمایا لیکن بالآخر مایوس ہو کر پرانے نظام کی طرف لوٹ آیا۔

انسانی معاشروں میں بحرانوں کا باعث بااثر طبقات ہوتے ہیں۔ جدید مغربی معاشرے سے پہلے پوری دنیا کے معاشرے یکساں ماڈل پر کام کر رہے تھے۔ معاشرتی ادارے فعال تھے پیشہ ورانہ طبقات میں یکجہتی تھی۔ حکمران طبقات البتہ ہمیشہ سازشوں میں مبتلا رہے اور ان کی خرمستیوں کی وجہ سے فساد اور انتشار بھی پیدا ہوتا تھا' لیکن اداروں کے استحکام کی وجہ سے بڑا معاشرتی فساد نہیں ہوتا تھا۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام نے اس پرانے نظم کو منتشر کر دیا اور مغرب میں تو کسی قدر ظاہری استحکام ہے لیکن غیر مغربی معاشرے تو مسلسل بحران کا شکار ہیں۔ انہیں نئی سوشیالوجی کی ضرورت ہے کیونکہ مغربی نمونے (Models) ناکام ہیں۔

اصل فساد طاقتور طبقات کا ہے۔ مارکس حکمران طبقے کے غلبے کی بات کرتا ہے اور ویبر بیورکریسی کی ظالمانہ روش سے خائف ہے لیکن قرآن اس سے کہیں زیادہ جامع بات کرتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کے فساد کا باعث صاحب اختیار اور صاحب ثروت گروہ ہے اور فساد کی بنیادی وجہ اخلاقی ہے۔ ان نامور ماہرین عمرانیات کے نظریات میں یورپ کا مادی فلسفہ اور خدا بیزار رجحانات پوری طرح کارفرما ہیں سائنسی منہاج خالص مادہ پرستانہ منہاج ہے۔ انسان' اس کا ماحول' اور اس کے باہمی تعلقات سب مفادات' اغراض اور سہولتوں کے حصول کے حوالے سے ہیں۔ لہٰذا مغربی سوشیالوجی کی پوری اٹھان مذہب بیزاری پر ہے۔ مذہب کی حیثیت ایک معاشرتی جزء کی ہے جسے مذہبی اداروں کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن کے نزدیک معاشرتی استحکام' انسانوں کے باہمی تعلقات' اداروں کی مناسب کارکردگی' طبقات کی باہمی ہم آہنگی سب ایک اصول کے محتاج ہیں اور وہ ہے اخلاق۔ اس ایک اصول کے غائب ہونے سے معاشرتی نظم (Social order) میں ایسا خلل واقع ہوتا ہے کہ اسے کوئی قانون اور کوئی ضابطہ درست نہیں کر سکتا۔ قرآن کہتا ہے:

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (۴)

جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ حال کو (خواہش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی امتوں کو ہلاک کر ڈالا اور تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

---

(۴) بنی اسرائیل/۱۶۔۱۷

مسلمان علماء نے ہمیشہ اس اصول کو معاشرتی مطالعہ کے لئے ضروری سمجھا ہے۔ انسانی علوم میں مسلمانوں کا ایک مکتب فکر ہے اور وہ Moral Sociology or Spiritual Sociology ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں اور اس کے تجزیہ کا اپنا انداز ہے جو اخلاقی اصولوں کے حوالے سے تشکیل پاتا ہے۔

ابن مسکویہؒ نے الفوز الاصغر میں، ابن خلدونؒ نے مقدمہ میں اور شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بعض اہم امور کی طرف توجہ دلائی ہے مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ابن خلدون کا مختصر تذکرہ کریں۔

ابن خلدون

معاشروں کے مطالعہ، تجزیہ اور نتائج کے حوالے سے یہ بحث نامکمل ہوگی اگر ہم ایک ایسی شخصیت کا ذکر نہ کریں جو جدید مغربی ماہرین عمرانیات کا پیش رو ہے اور وہ ہے ابن خلدون۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے فلسفہ تاریخ اور معاشروں کے مطالعہ کے بنیادی اصول متعین کئے اور معاشرتی مطالعہ کو ایک مستقل علم قرار دیا۔ مغربی فکریات کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ جن مصادر سے استفادہ کرتے ہیں انہیں دفن کرتے ہیں تاکہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ مغربی تہذیب کی ساری علمی اٹھان مسلم علمی روایت کی مرہون منت ہے لیکن انہوں نے استفادہ کرکے اسے نظرانداز کر دیا۔ تاہم ابن خلدون کو نظرانداز کرنا آسان نہیں تھا۔ بالآخر مغرب میں ابن خلدون کے نظریات کو فروغ ملا اور اس پر مطالعات کئے گئے۔ مشہور جرمن ماہر عمرانیات (Giumplowits) کے نزدیک ابن خلدون کلاسیکل سوشیالوجسٹس کا پیش رو ہے۔ پروفیسر سوروکن (Sorokin) کے خیال میں ابن خلدون اپنے نظریات و تحقیقات کے لحاظ سے اپنے عہد سے کہیں آگے تھا۔ سترھویں صدی میں ابن خلدون کے بارے میں تحریریں آنا شروع ہوئیں اور آہستہ آہستہ محققین نے ابن خلدون کو سمجھنا شروع کیا اور بالآخر اعتراف کیا کہ فلسفہ تاریخ اور معاشرتی ارتقاء پر اس کے نظریات اولین حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مغرب نے بے پناہ ترقی کی ہے اور غالب تہذیب کی حیثیت سے کئی عملی میدانوں میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔ علم کی نئی شاخیں تشکیل دی ہیں، نئے پہلو تلاش کئے ہیں اور نئے افق منکشف کئے ہیں لیکن یہ عملی نالائقی، فکری پس ماندگی، انسانی ناشکرگذاری اور تہذیبی تنگ نظری ہے کہ آپ ان بنیادوں کا ذکر ہی نہ کریں جن پر آپ اپنی پوری عمارت اٹھا رہے ہیں۔

ابن خلدون (732/1332-1406) وہ شخص ہے جس نے علم العمران کی اصطلاح استعمال کی جو بعد میں Sociology کے طور پر مشہور ہوئی۔ یہ ابن خلدون تھا جس نے عصبیت کی اصطلاح استعمال کی جو جدید عمرانیات میں Solidarity کے طور پر اختیار کی گئی۔ درخائم اور دوسرے ماہرین عمرانیات نے اس پر اپنے نظریات کا تانا بانا بنا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی مشہور کتاب تاریخ عالم جو کتاب العبر کے نام سے موسوم ہے کے مقدمہ میں انسانی معاشروں کی تنظیم،

(۵) مقدمہ/۱-۶۸

ارتقاء، استحکام اور زوال پر مفصل بحث کی ہے۔ اس میں جہاں وہ تاریخ کے جدلیاتی تجزیہ پر بات کرتا ہے وہاں جدید علم العمران پر بھی گفتگو کرتا ہے۔ (۵) ابن خلدون مقدمہ کو چھ ابواب میں تقسیم کرتا ہے اور ہر ایک باب کی کئی فصلیں ترتیب دیتا ہے۔ ان میں انسانی حالات پر ماحول کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ ابتدائی اور دیہی معاشروں کا تجزیہ کرتا ہے' جنگلی' متحرک معاشرے خونی رشتوں پر مبنی جمعیتیں اور قبائل کی بات کرتا ہے۔ پھر سیاسی زندگی' حکومتوں کی قسموں ریاست اور اس کے اداروں' روحانی و مادی طاقت اور سیاسی مراتب کو زیر بحث لاتا ہے۔ اس طرح وہ شہری معاشروں کی بھی بات کرتا ہے اور انتہائی ترقی یافتہ معاشروں کے ساتھ تہذیبی کمالات اور عروج و زوال پر بھی گفتگو کرتا ہے۔ معیشت' صنعت' ذرائع آمدنی معاشی سرگرمیوں مختلف ہنر مندیوں اور پیشوں کو بھی موضوع بحث بناتا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ علم' سائنس اور کلچر کی بحث بھی کرتا ہے۔ ابن خلدون پہلا مفکر ہے جس نے ابتدائی' متحرک' دیہی اور شہری معاشروں کے تعلقات کی تحریک کو دریافت کیا۔ اٹھارہویں اور بیسویں صدی کے ماہر عمرانیات جیسے فرانس کے اگسٹ کامٹے (August Comte) اور ایمل درخائم (Emile Durkheim) جرمنی کے کارل مارکس (Marx) فرڈی ننڈ ٹونیز (Ferdinand Tornies) جارج سمل (George Simmel) اور میکس ویبر (Max Weber) برطانیہ کے ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) امریکہ کے جارج ہربرٹ میڈ (George Herbert Mead) ٹیلکاٹ پارسن (Talcatt Parson)) اور رائز مین (Reisman) سب اس بات سے آگاہ تھے کہ روایتی معاشرہ جدید معاشرہ میں تبدیل ہوا ہے۔ ہر ایک نے نئے معاشرے کے ظہور کے بارے میں اپنے نظریات بیان کئے ہیں اور دو قسم کے معاشروں کے تعلق کے بارے میں آراء دی ہیں لیکن کہیں بھی ابن خلدون کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔ (۶)

ابن خلدون مقدمہ میں دو قسم کے معاشروں کا ذکر کرتا ہے۔ بدوی معاشرہ اور حضری معاشرہ۔ ابن خلدون کے نزدیک بدوی معاشرے سے حضری معاشرے میں تحول ایک سادگی سے پیچیدگی کا تغیر ہے اور یہ تبدیلی تمام پہلوؤں میں ہوتی ہے۔ کسب معاش کے طریقے' پیشے' رسم ورواج' اور علوم سب میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ابتدا میں انسان صرف ضروریات حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے بعد ازاں ان ضروریات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کمیونٹیز کا ذکر کرتے ہوئے وہ وحشی' متحرک قبائل' زرعی کمیونٹی جو جانور پالتی ہے وغیرہ کی بات کرتا ہے۔ ابن خلدون کے مطابق ابتدائی کمیونٹی میں افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں اور ان کی ساری کاوشیں' زراعت' ماہی گیری اور شکار پر مرتکز ہوتی ہیں۔ زراعت والے سب سے پہلے شہروں کا رخ کرتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ دوسرے گروہ بھی حضری زندگی میں گم ہو جاتے ہیں۔ **حضری معاشرہ ایک کھلا معاشرہ ہوتا ہے اس میں ہر ایک سما جاتا ہے حتیٰ کہ متحرک قبائل بھی' جنہیں کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا وہ بھی آہستہ آہستہ اس میں جذب ہو جاتے ہیں۔ دونوں معاشروں میں نظم وضبط کے اصول مختلف ہوتے**

(۶) تفصیلات ان کی تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہیں۔ دیہی اور قبائلی معاشرے میں قبیلے کا سردار یا روایت انضباط کا کام کرتے ہیں جبکہ شہر میں حکمران یا عدالت یہ کام کرتی ہے۔ حکومتوں کی تشکیل اور سلطنتوں کے قیام میں عصبیت (Group solidarity) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ طاقتور اور سادہ طبیعت اور گہری عصبیت رکھنے والے گروہ فاتحین اور قابض گروہ ہوتے ہیں۔ حضری زندگی کی آسائشیں انسان کو تن آسان، بزدل اور مصلحت کیش بناتی ہیں اس لئے قبائلی اور دیہی خصائل کے حامل گروہ غالب آجاتے ہیں۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دیہی زندگی کو شہری زندگی پر تقدم حاصل ہے اور اسے تحقیق و تفتیش سے ثابت کیا جا سکتا ہے اگر شہر کے باسیوں کے آباؤ اجداد کے بارے میں تحقیق کی جائے تو ثابت ہوگا کہ موجودہ شہری لوگوں کی اکثریت کی اصل دیہی زندگی ہے۔ یہ معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی سطح پر ان کے آباؤ اجداد میں سے لوگ شہر میں آکر بسے اور یوں شہری زندگی کا آغاز ہوا اور اس میں مزید اضافہ ہوا۔ (۷)

ابن خلدون کے نزدیک عصبیت (Group Solidarity) کو معاشرتی تحریک میں بنیادی عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ ابن خلدون قبائلی معاشرت میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے مطالعہ و تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قبائلی معاشرت بالآخر ریاست پر منتج ہوتی ہے۔ مسلمان معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی معاشرے کے ماڈل تھے۔ سلطنتوں کی شکست و ریخت، نئی ریاستوں کی تشکیل، شہری زندگی کا انتشار اور معاشرتی تحول اور دیہی و شہری محاورات و فضائل اس کے مطالعہ کے موضوعات ہیں۔ جدید مغرب کے ماہرین عمرانیات کے سامنے مختلف قسم کے معاشرے تھے۔ ان کے تضادات اور تحولات مختلف تھے مذہبی جنگیں اور مذہب کے خلاف ردعمل، معاشرتی طریق کار کا تغیر، صنعتی و تکنیکی تبدیلیاں ایک مختلف قسم کا منظر تھا۔ تاہم ابن خلدون نے معاشرتی تحقیق و تحلیل کی جو بنیاد رکھی اس نے مزید مطالعہ کے لئے سامان مہیا کیا۔

ابن خلدون نے کمیونٹی اور معاشرے کے مطالعے میں جو اصول طے کئے انہیں جدید عمرانیات میں سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر سوروکن (P. Sorokin) زمرمین (Zimmer Man) اور گیپلن (Gaplin) نے اپنی کتاب (Systematics source books in Rural Sociology) میں ایک فصل ابن خلدون کی دیہی شہری عمرانیات پر لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ "عرب مورخ مدبر اور سوشیالوجسٹ ایک ایسا آدمی ہے جسے سوشیالوجی کی بنیاد رکھنے والا کہا جا سکتا ہے"۔

شمٹ (N. Shamidt) نے ابن خلدون کے بارے میں لکھا:

Tremendous as have been the accomplishedments in this vast field of

---

(۷) مقدمہ/۱۔۶۸

sociology in recenttimes, it is amazing to what an exent already Ibn Khaldun's fundamental treatise meets the demand formulated by Franklin H. Giddings, for example, that sociological theories should not start from psychological premises, but that the correlation of all processes with the character of physical envirenment should be recognised throughout.(8)

پروفیسر سوروکن (Sorokin) کے مطابق مقدمہ وہ پہلی کتاب ہے جس میں دیہی شہری عمرانیات (Rural Urban Society) پر سب سے پہلے مرتب انداز میں بات کی گئی ہے۔ وہ اپنی کتاب (Society, Culture and Personality) میں مختلف جگہوں پر ابن خلدون کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ پہلا ماہر عمرانیات تھا جس نے دور حاضر کی عمومی اور خصوصی سوشیالوجی کے بنیادی مسائل بیان کئے ہیں۔

......☆......

(8) N. Shamidt, Ibn Khuldun, Historian, Sociologist and Philosopher / 16 Columbia University Press, / 930/

علم المعاشرت کے امتیازات

حیوانات نباتات اور طبیعات کی علمی شاخوں کو چھوڑ کر انسان نے قدیم اور جدید علم کی جتنی شاخیں تشکیل دی ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق انسان سے ہے مثلاً: معاشیات انسان کی ان سرگرمیوں سے بحث کرتا ہے جن کا تعلق حصولِ دولت یا صرف دولت سے ہے۔ تخلیق دولت یا اصناف دولت بھی اسی سے منسوب ہیں۔ نقدی کی حیثیت اور فلاح کا تصور بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ تاریخ واقعات کے ریکارڈ اور ان کی تعبیر سے بحث کرتی ہے۔ نفسیات انسانی رویوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ بعض لوگ وجود اور ماحول کے باہمی تعلق کو اس کا موضوع قرار دیتے ہیں۔ ثقافتی بشریات (Cultural Anthropology) ابتدائی انسان کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کی سرگرمیوں' اس کی پیداوار' اس کا آرٹ' اس کی ٹیکنیک' اساطیر' توہمات اور اس کے معاشرتی ادارے وغیرہ پر بحث کرنا اس علم کا بنیادی وظیفہ ہے۔

علم المعاشرت (Sociology) کا موضوع ''اجتماعی رشتے'' ہے۔ اور علم کی کوئی اور برانچ اس کی شریک نہیں۔ سوشیالوجی ان رشتوں کا مطالعہ اس لیے نہیں کرتی کہ وہ معاشی' سیاسی یا مذہبی ہیں بلکہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اجتماعی و معاشرتی ہیں۔ انسانی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ معاشی' سیاسی' جمالیاتی اور مذہبی وغیرہ لیکن جو چیز ان سب تعلقات کو مجتمع کرتی ہے وہ معاشرتی پہلو ہے۔ یہ رشتہ ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان سے بطور انسان ربط قائم کرتا ہے۔ یہ انسانی رشتہ ہے جو مختلف افراد کو ایک اجتماعیت میں منظم کرتا ہے۔ معاشرہ بنیادی طور پر یکساں لیکن عملی طور پر ہمیشہ تغیر پذیر ساختوں کا نام ہے جن سے ان رشتوں کی کلیت معلوم ہوتی ہے۔ عمرانیات کے طالب علم کی بنیادی دلچسپی گروہی منظر سے ہے جس میں کچھ انسان اس طرح سرگرم عمل ہیں کہ وہ مشترک اداروں کو محفوظ و مستحکم کرتے ہیں۔ انسانی رویے ان تعلقات کی حیثیت متعین کرتے ہیں اور گروہی منظر میں یہ رویے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ علم المعاشرت کا نفس مضمون گروہ' معاشرتی عمل' معاشرتی مسائل' معمولات' ثقافت' معاشرتی تغیر' اجتماعی کردار اور اداروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ علم المعاشرت میں معاشرے کے مسائل کا جائزہ اور ان کے حل کا تجزیہ کیا جاتا ہے مثلاً جرائم' برائیاں' ناخواندگی' غربت' بے روزگاری وغیرہ۔ ثقافت کسی معاشرے کے راہ عمل کا نام ہے اسی لیے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ معاشرے حیاتیاتی وجود پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے ان کا متحرک و فعال رہنا فطری تقاضا ہے۔ معاشرتی تغیر کا تعلق اسی تحرک سے ہے اس لیے اس تغیر کا مطالعہ علم المعاشرت کا اہم موضوع ہے۔ معاشرتی تحریکیں' انجمنیں' جلسے جلوس' ہڑتالیں اور مطالبات وغیرہ معاشرتی تحرک کی علامتیں ہیں ان کا مطالعہ بھی علم المعاشرت کا حصہ ہے۔ معاشرتی مسائل کے حل کی تجاویز معاشرتی مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں جرائم کو کم کرنے' قیدیوں کے احوال کی اصلاح' طبی معاشرتی خدمات (Medical social services) سوشل سیکورٹی وغیرہ جیسے شعبے کام کر رہے ہیں۔

جب سے انسانی رویوں (Human behaviour) کا مطالعہ شروع ہوا ہے اہل علم نے کئی علمی شعبے قائم کیے ہیں اور ان کے اصول وضوابط بنائے ہیں تا کہ ہر شعبہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکے۔ انسان کے قائم کردہ علمی شعبوں میں باہم مختلف ہونے کا امکان رہتا ہے اس لیے ہر شعبے کے ماہرین نے حدود وقیود کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوشیالوجی بھی ایک ایسا عملی شعبہ ہے جو انسانی رویوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم یہ جائزہ لے لیں کہ یہ علم انسانی رویوں سے بحث کرنے والے دوسرے علوم سے کس طرح مختلف ہے یا کتنی مماثلث رکھتا ہے۔ انسانی رویوں سے بحث کرنے والے علوم کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو تمام انسانی رویوں سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو انسانی رویے کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مجموعی انسانی رویہ

مجموعی انسانی رویہ کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق انسانی رویہ سیکھنے سے متعین ہوتا ہے (Learned) (۱) جبکہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسانی رویہ کی بنیاد فطری (Innate) (۲) ہے۔ علم المعاشرت بشریات اور نفسیات (Sociology, Anthropology and Psychology) کا تعلق پہلے گروپ سے ہے اگرچہ نفسیات کا ایک مکتب فکر جبلی خواہشات کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ تاہم دوسرے عوامل بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حیاتیات اور اس سے متعلق علوم جیسے معاشرتی حیاتیات اور نسلی تعلقات کا علم (Biology, Sociobiology and Ethnology) دوسری قسم میں آتے ہیں۔ انسانی علوم کے طالب علم کے لیے یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علم المعاشرت کے ماہرین جن تصورات کو آج نظریات (Theories) کی صورت میں پیش کر رہے ہیں اور انہیں ان کی ایجادات پر ہدیہ

---

(۱) انسانی رویے کی فطری بنیاد

اس مکتب فکر کے مصنفین انسانی رویوں کو موروثی خصوصیات سے وابستہ کرتے ہیں۔ انسانوں میں جینیاتی لحاظ سے منتقل ہونے والی خصوصیات نے ماحول کے ساتھ سازگاری وغیرہ کو اپنایا۔ اس طریق کار میں موروثی میلانات کی اہمیت بیان کی جاتی ہے جن پر انسان کو کنٹرول حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے خیال میں انسان عام طور پر جذبوں اور جینیاتی طور پر منتقل ہونے والے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے حامل سوسائٹی میں مرد اور عورت کے مختلف کرداروں کی مثال دیتے ہیں جیسے مرد شکار کرتا تھا اور عورت کھانا پکاتی تھی۔ مرد اور عورت موروثی طور پر مختلف ہیں اور حیاتیاتی طور پر مختلف کاموں کے لئے موزوں ہیں۔ فرائیڈی مکتب فکر (Freudian School) انسانی رویے کو جبلی میلانات کی پیداوار سمجھتا ہے جن پر سیکھے ہوئے نمونوں (Pattern) کا بوجھ لدا ہے۔ جونہی انسان کو موقعہ ملتا ہے وہ جبلی میلانات کی طرف رخ کرتا ہے۔

(۲) انسانی رویے کی تربیتی بنیاد

ان مصنفین کے نزدیک جبلی خواہشات اور موروثی خصوصیات کو انسانی رویوں میں بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ جنس اور ہڈ کی جبلتیں اپنا کام کرتی ہیں لیکن انہیں بھی تربیت سے نئی تشکیل دی جا سکتی ہے۔ سیکھنا اور تربیت حاصل کرنا بنیادی طریقہ ہے جو ہمارے رویوں کی تشکیل کرتا ہے۔ معاشرتی حیاتیات کے ماہرین کا چیونٹیوں کے گروہ سے مماثلت دینا روراز کار بات ہے۔ یہ صرف تعلیم وتربیت ہے جو انسان کو مختلف رویے کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ تعلیم وتربیت ہی سے انسان انسان بنتا ہے۔

تبریک پیش کر رہے ہیں یہ وہی نظریات ہیں جنھیں پیغمبر آخرالزمان ﷺ نے بڑے سادہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی شخصیت کے دونوں پہلو ہیں بعض خصوصیات موروثی ہوتی ہیں اور بعض خصوصیات ایسی ہیں جو تربیت سے حاصل کی جاتی ہیں اور دونوں انسان اور اس کے معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

آنحضور ﷺ نے تربیت پر جس قدر زور دیا ہے اسے آپ کے ارشادات میں دیکھا جاسکتا ہے۔آپ سے منقول ہے۔

مامن مولود الایولد علی الفطرة فابواه یهودانه اوینصرانه اویمجسانه.(۱)

ہر پیدا ہونے والا فطرت کے سوا کسی چیز پر نہیں پیدا ہوتا۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں' یا نصرانی یا مجوسی۔

اب ہم معاشرتی علوم کا ایک مختصر جائزہ لیں گے۔ اس میں بشریات (Anthropology) تاریخ' نفسیات اور علم المعاشرت زیر بحث آئیں گے۔

تاریخ (History)

تاریخ اور علم المعاشرت کا تعلق مشترک علمی ورثے کا ہے۔روایتی طور پر تاریخی طریق کار یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کی انفرادیت کو پیش کیا جائے۔ ماضی کی بہترین توضیح اور خاص تاریخی واقعات کی مناسب تعبیر تاریخ کی بڑی ذمہ داری ہے۔علم المعاشرت کے لوگ اگرچہ انسانی تجربے کے وسیع تناظر کو دیکھ رہے تھے تاہم اکثر اوقات بہت معمولی واقعات پر بڑے نظریاتی اصولوں کو تشکیل دے رہے تھے۔دونوں شعبوں میں باہمی استفادہ کی صورتیں موجود رہی ہیں۔اور اب علم المعاشرت کے طالب علم دفائی حد تک تاریخی تحقیقات کو انسانی رویوں کی توضیحات کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔تاریخ اور علم المعاشرت کا اس اعتبار سے گہرا تعلق ہے۔تاریخ یہ معلوم کرتی ہے کہ واقعات کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔علم المعاشرت ان واقعات کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے۔اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ معاشروں کے تجزیوں میں تاریخی واقعات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔قدیم اور جدید معاشروں میں فرق اور ان کے اداروں کی سرگرمیوں کا جائزہ تاریخ کے ارتقائی سفر کی روشنی میں لیا جاتا ہے۔معاشرتی تغیر کا تعین تاریخی واقعات کے تقابل سے ہی کیا جاسکتا ہے لہٰذا تاریخ اور علم المعاشرت کا گہرا تعلق ہے۔

نفسیات (Psychology)

علم المعاشرت اور نفسیات کے طالب علم اکثر اوقات دونوں مضامین کے امتیازات کے بارے میں مبہوت رہتے ہیں کیونکہ دونوں مضامین انسانی رویوں کے تجزیہ پر مشتمل ہیں۔دونوں ایک طرح کے مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں جیسے

---

(۱) بخاری کتاب الجنائز' باب اذا اسلم الصبی' ۱/ ۲۱۷

خودکشی' طلاق کے اسباب اور ابلاغ عامہ کے اثرات وغیرہ۔ لیکن علم المعاشرت کے طالب علم اور نفسیات کے طالب علم ایک ہی مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہوئے دو مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں۔ تفتیش و تحقیق کے دوران انہیں مختلف جوابات ملتے ہیں کیونکہ دونوں کے سوالات مختلف ہوتے ہیں۔ نفسیات کا طالب علم فرد پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور وہ اس کے عمل کی توضیح صرف فرد کے حوالے سے کرتا ہے جبکہ سوشیالوجسٹ کی دلچسپی گروہی عمل میں ہوتی ہے اور وہ گروہ کے طرز عمل کا جائزہ گروہ کے رکن کے انفرادی شعور سے لیتا ہے۔ علم المعاشرت کا طالب علم دوسرے طریق کار پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ مثلاً گروہ اپنے ارکان کے عمل پر مشتمل ہے لیکن ان ارکان کا عمل اپنے گروہ کے رویہ سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا علم المعاشرت کا محقق اگرچہ انفرادی علم میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ وسیع تر معاشرتی تناظر میں فرد کا عمل کیسے متاثر ہوتا ہے؟۔ علم المعاشرت فرد کے انفرادی رویے کی بجائے انسانی رویوں کے نمونوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔

انسانی رویوں کا خصوصی پہلو

کچھ علوم ایسے ہیں جو انسانی رویوں کے خصوصی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں جیسے معاشیات' سیاسیات' قانون اور سوشل پالیسی وغیرہ ہم اختصار کے ساتھ علم المعاشرت کا ان مضامین کے ساتھ تقابلی جائزہ لیں گے۔

معاشیات (Economics)

معاشیات کا مضمون غالباً معاشرتی علوم میں سب سے زیادہ محترم گردانا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ مضمون معاشرے کی تنظیم کے ساتھ سب سے زیادہ متعلق ہے۔ معیشت دان ان ذرائع کا جائزہ لیتے ہیں جو مختلف انسان اشیاء اور خدمات (Goods and Services) کے تبادلے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ تحقیقی نمونوں (Models) میں معیشت دان ماہر عمرانیات سے زیادہ صحت کا دعویٰ کرتا ہے کیونکہ واقعات کا صحیح ادراک معاشروں کی معاشی تنظیم کے لیے بے حد مفید ہے۔ غالباً دونوں مضامین کے طریق کار میں اختلاف کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ متوقع معاشی فوائد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے فیصلے عقلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ دونوں علوم میں گہرا تعلق ہے۔ معاشیات جن پہلوؤں سے بحث کرتا ہے انہی کے بعض حصے ہیں جنہیں علم المعاشرت زیر بحث لاتا ہے مثلاً مزدور اور کارخانہ دار کے تعلقات میں کشمکش اور کارخانہ دار کے رویوں کی وجہ سے مزدوروں کی غربت اور پست معیار زندگی' علم المعاشرت کے مطالعہ کا موضوع ہے۔ علم المعاشرت معاشیات سے زیادہ وسیع تناظر سے متعلق ہے کیونکہ یہ معاشرتی واقعات کا مطالعہ کرتا ہے خواہ وہ معاشی ہوں تعلیمی یا سیاسی۔

سیاسیات (Political Science)

اس مضمون کا تعلق معاشرے میں قوت اور غلبہ حاصل کرنے سے ہے۔ سیاسیات اور علم المعاشرت بعض اعتبارات

سے ایک دوسرے پر محیط ہیں۔ علم المعاشرت کے طالب علم کے لیے طاقت کا حصول معاشرتی زندگی کا ایک پہلو ہے گو انسانی رویے کا بہت اہم پہلو ہے۔ علم المعاشرت کا محقق حصول طاقت کے تصور میں خاندان اور کام کی جگہ (Work Place) کے تعلقات کو شامل کرے گا جبکہ سیاسیات کا طالب علم سیاستدانوں کی سرگرمیوں تک محدود ہوگا۔ سیاسیات میں حکومت کی ساخت اور اس کی ذمہ داریوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں' ان کے پروگراموں اور ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے جب کہ علم المعاشرت میں معاشرہ بحیثیت مجموعی زیر مطالعہ ہوتا ہے اور سیاسی ادارے اس مطالعے کا ایک جز ہوتے ہیں۔ معاشرے کی ثقافت' اس ثقافت کی وسعت اور اس کے اثرات علم المعاشرت کا موضوع ہیں' سیاسیات اور علم المعاشرت میں جز اور کل کا تعلق ہے۔

بشریات (Anthropology)

اس مضمون کو عام طور پر سوشیالوجی کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے اس کنفیوژن کا سبب یہ ہے کہ دونوں مضمون معاشرے کا مطالعہ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بشریات کا دائرہ محدود ہے۔ ماہرین بشریات زیادہ تر غیر ترقی یافتہ معاشرتی گروہوں کا مطالعہ کرتے ہیں جبکہ علم المعاشرت کے ماہرین معاشرے کو اس کے کلی اور وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اب کچھ ایسے رجحانات پروان چڑھے ہیں کہ چھوٹے اور غیر ترقی یافتہ معاشرتی گروہوں کو بھی زیر مطالعہ رکھا جارہا ہے تاہم بڑا رجحان ترقی یافتہ معاشروں کے جائزہ تک محدود رہا ہے۔

ماہرین کے مطابق بشریات کی تعریف اسی طرح کی جاتی ہے کہ یہ علم قدیم عمارات' طبعی بشریت' تاریخ' ثقافت زبانوں کا نشو وارتقاء اور اس کی مختلف شاخیں اور غیر ترقی یافتہ انسانوں کی زندگی کے مطالعہ کا نام ہے۔ بشریات اور علم المعاشرت میں گہری مماثلتیں ہیں مثلاً طبعی بشریات (Physical Anthropology) میں قدیم ثقافتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور علم المعاشرت میں جدید اور ترقی یافتہ ثقافت کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ علم المعاشرت میں اقدار' معاشرتی ادارے' معاشرتی معمولات' معاشرتی نظم وضبط' فرمانبرداری اور قانون شکنی وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہی موضوعات ثقافتی بشریات (Cultural Anthropology) میں زیر مطالعہ رہتے ہیں۔

قانون (Law)

قانون کو عام طور پر معاشرتی علم تصور نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ اسے معاشرتی ضوابط کی تشکیل اور نفاذ کا مطالعہ قرار دیا جاتا تھا جو عام طور پر عوامی ارادہ (Will of the people) کو منعکس کرتے ہیں۔ اب قانون کے مطالعہ میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور اس مطالعہ میں اس معرفت کو شامل کیا گیا ہے جو یہ واضح کرتی ہے کہ قانون کا طاقت کی تقسیم سے بھی تعلق

ہے۔ اس حد تک قانون، علم المعاشرت اور سیاسیات ایک دوسرے پر محیط نظر آتے ہیں۔ بعض ماہرین اس تعلق کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قانون کا وظیفہ فرد کے حقوق اور معاشرے کے استحکام کا تحفظ ہے۔ اس اعتبار سے جرائم اور ان کا سد باب، اجتماعی امن اور اس کا تحفظ جہاں قانون کا مطلوب دائرہ ہے وہاں علم المعاشرت کے مطالعہ کا موضوع بھی ہے۔

معاشرتی حکمت عملی (Social Policy)

معاشرتی حکمت عملی کا مضمون علم المعاشرت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ علم المعاشرت کے تحقیقی نتائج کے نفاذ کا نام معاشرتی حکمت عملی ہے۔ اس کا تعلق معاشرتی مسائل پر حکومت کی حکمت عملیوں کے اثرات سے ہے جیسے غربت، صحت اور رہائش وغیرہ۔ علم المعاشرت تحقیق و تفتیش کے ذریعہ نہ صرف معاشرتی حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور اسباب تلاش کرتا ہے بلکہ وہ نتائج بھی اخذ کرتا ہے جو حالات کی تبدیلی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

صحافت

صحافت اگرچہ علمی مضمون نہیں شمار ہوتا تاہم اس کا سوشیالوجی سے ایک گونہ تعلق ہے۔ دونوں معاشرتی مسائل اور واقعات سے بحث کرتے ہیں لیکن دونوں کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ صحافت مفصل مشاہدے پر زیادہ توجہ دیتی ہے اور قابل تصدیق مقصد کی بجائے تاثر پذیری پر زیادہ زور دیتی ہے لہٰذا عمومی نظریہ کی تشکیل کے لیے مشاہدے کے تحت طریق کار کو اختیار نہیں کرتی جبکہ علم المعاشرت، مشاہدے کے طریق کار میں عمومی نظریہ کو پیش نظر رکھتا ہے تاہم تحقیقی صحافت کی مثالیں موجود ہیں جہاں حالات واقعات کا تاثراتی بیان ہی مطلوب نہیں ہوتا بلکہ تحقیق و جستجو کے ضوابط کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جاتا ہے اور نتائج سامنے لائے جاتے ہیں۔ علم المعاشرت بنیادی طور پر واقعات و حالات کے تجزیہ و توضیح پر توجہ مرکوز رکھتا ہے جو اس کا اصل کام ہے۔ صحافت میں عمومی طور واقعات و حادثات کے بیانیہ انداز پر توجہ دی جاتی ہے لیکن اب صحافت اس سادہ بیانیہ انداز سے نکل کر تجزیاتی دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔ مطبوعہ اور الیکٹرانک میڈیا میں خبر اور رپورٹنگ اب تجزیاتی اور تفہیمی ہوتی ہے اور اسے رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ علم المعاشرت اگرچہ سائنٹیفک اور معروضی انداز کا تجزیہ و تفتیش ہے لیکن بدقسمتی سے اسے بھی مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسے سروے اور تحقیقات پیش کی جا رہی ہیں جن سے ایک خاص تہذیبی نقطۂ نظر ثابت ہوتا ہے۔ البتہ صحافت کا دائرہ اثر وسیع ہے جب کہ علم المعاشرت محدود علمی سرگرمی ہے۔

......☆......

3 علم المعاشرت کے چند نظریات (Sociological Theories)

صحافت اور علم المعاشرت کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ صحافت واقعات کی تفصیل بیان کرتی ہے جبکہ علم المعاشرت اصولی طور پر ان کی توضیح کرتی ہے۔ علم المعاشرت میں کئی نظریات (Theories) وضع کئے گئے ہیں جن سے معاشرے کی مختلف توجیحات کی جاتی ہیں۔ چونکہ ان مختلف نظریات کو جانچنے کا کوئی حقیقی طریق کار وضع نہیں کیا جا سکا اس لیے کسی نظریہ کو صحیح یا غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہر نظریہ مختلف مفروضوں سے آغاز کرتا' مختلف سوال ترتیب دیتا اور اپنے مرتب کردہ سوالات کی بنیاد پر مختلف جوابات حاصل کرتا ہے۔ علم المعاشرت کی رو سے معاشرتی مطالعہ کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ تجزیہ معاشرہ کی سطح سے شروع کیا جائے اور فرد تک پہنچا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ فرد کے ادراک اور عمل سے شروع کیا جائے اور پھر اسے وسیع ربط میں لایا جائے۔ اگرچہ توقع یہ کی جاتی ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر ایک جیسے نتائج نکلیں گے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ علم المعاشرت کے ماہرین کی رائے ہے کہ اس علم کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مختلف اصولوں کی بنیاد پر عموماً مختلف نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی سطح سے تجزیہ شروع کرنے سے متعلق جو دو نظریات (Theories) وضع کئے گئے وہ یہ ہیں

(Functionalism) اور مارکسیت (Marxism)۔ ان کو (Macrosocial Theories) بھی کہتے ہیں۔

فرد کی سطح سے تجزیہ شروع کرنے کی بنیاد پر جو اصول وضع کئے گئے وہ ہیں معاشرتی تفاعل (Interactionism) اور نسلی منہاج (Ethnomethodology) ان کو (Microsocial theories) بھی کہا جاتا ہے۔

ان نظریات کی مختصر سی توضیح درج ذیل ہے۔

افادیت پسندی پر مبنی نظریہ (Functionlism)

یہ نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ سوسائٹی کے اداروں کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کس طرح کام کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم انسانی جسم کے مختلف اعضاء کو دیکھتے ہیں کہ ان کی صحت سے جسم صحتمند ہوتا ہے اور ان کی بیماری سے جسم بیمار ہوتا ہے اسی طرح معاشرے کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ اگر معاشرے کے ادارے ٹھیک کام نہیں کر رہے تو وہ معاشرہ فساد کا شکار ہوگا۔ یہ نظریہ بنیادی طور پر درخائم کے اس تصور پر مبنی ہے جو اس نے معاشرے اور حیاتیاتی جسم کے درمیان مماثلت کے سلسلے میں قائم کیا تھا۔ معاشرے کے ادارے مثلاً معاشی ڈھانچہ' مذہب' تعلیم' خاندان وغیرہ وہ ادارے ہیں جن کی تنظیم اور بد نظمی پر معاشرے کی تنظیم اور بد نظمی کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ درخائم کے اس مماثلاتی نظریہ کو امریکن ماہر عمرانیات ٹیلکاٹ پارسن (Talcott Parson 1902 - 1979) نے پروان چڑھایا۔ یہ نظریہ 1930ء سے 1960ء تک علم المعاشرت کے غالب نظریہ طور پر قائم رہا۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت میں قدرے کمی آئی۔ اس نظریہ کی وضاحت کے لیے مماثل تصور کو استعمال کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جس طرح جسمانی وجود کی ضرورتیں ہوتی ہیں اسی طرح

معاشرتی وجود کی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اگر حیاتیاتی وجود کی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو اس پر مرض یا موت کا حملہ ہوسکتا ہے اسی طرح معاشرتی وجود کی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو معاشرہ منتشر ہوسکتا ہے۔ مثلاً تعلیمی نظام تربیت یافتہ افرادی قوت مہیا کرتا ہے جو معاشرے کے تسلسل کی ضامن ہوتی ہے۔ اس نظام کی خرابی یا فقدان سے وہ تسلسل متاثر ہوتا ہے۔ درخائم تو یہاں تک کہتا ہے کہ جرائم بھی معاشرتی استحکام کے لیے مفید ہیں کیونکہ اس سے معاشرتی دشمنی کا تعین ہوتا ہے اور قانون کی وجہ سے افراد معاشرہ کی باہمی یکجہتی بڑھتی ہے۔ علم المعاشرت کے بعض محققین نے تو عدم مساوات کو کارکردگی کے لحاظ سے ایک مفید عمل (Function) قرار دیا۔ کنگزلے ڈیوس اور ولبرٹ۔ ای مور (Kingley Davis & Willbert E. Moore) جب 1940ء کی دہائی کے آخر میں معاشرتی پہلو پر لکھ رہے تھے تو اس نقطۂ نظر کو فروغ دے رہے تھے کہ عدم مساوات کی وجہ سے معاشرے میں مسابقت بڑھتی ہے اور یوں بہت اچھے لوگ آگے آتے ہیں اور اہم ملازمتوں پر ذہین اور محنتی لوگ فائز ہوتے ہیں۔ تاہم اس نظریہ پر تنقیدیں بھی ہوئی ہیں۔ اسے سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ بنیادی اعتراض یہ ہے کہ معاشرے کو حیاتیاتی وجود پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ حیاتیاتی وجود اور اس کے اعضاء کی خصوصی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ معاشرے کے طاقتور گروہ اپنے مفادات کے تحت معاشرے کی ضروریات کا تعین کرسکتے ہیں اور معاشرے کو انہی خطوط پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً معاشرے کے طاقت ور سیکولر طبقات مذہب اور مذہبی اداروں کو بے اثر بنا کر انحراف کو فروغ دے سکتے ہیں۔ طاقتور گروہ تعلیمی نظام کو خاص مقاصد کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ اسی طرح دیگر معاشرتی اداروں کی صورت بھی ہوسکتی ہے۔ سوسائٹی کی ضروریات اور حکمرانوں کی ضروریات میں امتیاز قائم رکھنا اور خالصتاً معاشرتی ضرورتوں کا تعین کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

مارکسی نظریہ Marxism

یہ نظریہ مارکس (Marx) کے تصورات پر مبنی ہے بالخصوص تاریخی یا مادی جدلیت (Dialectical or Historical materialism) اگرچہ مارکسی مصنفین افادیت پسندی (Functionalists) کی طرح معاشرے سے شروع کرکے فرد تک آتے ہیں لیکن کارکردگی کے نظریہ کے مخالف ہیں۔ کارکردگی کے نظریہ کے مطابق عدم مساوات اچھے لوگوں کے لیے اچھی ملازمتوں کی صورتیں پیدا ہوتی ہے جبکہ مارکسی نقطۂ نظر سے عدم مساوات امیروں کو یہ مواقع مہیا کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے اچھی ملازمتیں محفوظ کریں اور یوں معاشرتی گروہ کا یہ تصور امیر اور دوسرے لوگوں کے درمیان تقسیم کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ مارکسی تجزیہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی ظالمانہ پالیسیوں کا ایک اچھا تجزیہ ہے۔

اس نظریہ پر بھی تنقید کی گئی ہے لیکن یہ تنقید معاشرتی نظریہ کی بجائے سیاسی فلسفہ کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ مارکسی نقطۂ نظر کے حامل معاشرے کے طبقاتی اختلافات پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس طرح امیروں

کے خلاف ایک متعصبانہ سوچ کا اظہار کرتے ہیں جو متوازن نہیں ہے لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مارکسی نقطہ نظر سے معاشرتی تجزیہ میں معاشرے کے گرے پڑے طبقات کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں صاحب ثروت لوگوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آتا ہے جو پورے معاشرے کو یرغمال بنالیتا ہے اور ایک ایسا غیر انسانی رویہ پروان چڑھاتا ہے جس میں بے رحمی، ظلم اور استحصال جیسی بری خصلتیں فروغ پاتی ہیں۔ مارکسی تجزیہ سرمایہ دار کی بے لگام خواہشات کا توڑ تجویز کرتا ہے جس کا اپنا ایک اثر ہے۔ طبقاتی اختلاف اور تقسیم تو ایک معاشرتی حقیقت ہے البتہ اس پر مبنی سیاسی حکمت عملی پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ مارکس کا معاشرتی تجزیہ علمی طور پر مستحکم ہے۔

معاشرتی تفاعل (Interaction)

یہ ان دو نظریوں میں سے ایک نظریہ ہے جس میں تجزیہ کا آغاز فرد سے کیا جاتا ہے۔ اس کو (Microtheory) کا نام بھی دیا گیا ہے یہ نظریہ اس تصور کو رد کرتا ہے کہ معاشرے کی مجموعی حالت کی بنیاد پر کوئی نظریہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق زیادہ زور روبرو اور روزمرہ انفرادی انسانی تفاعل پر ہے۔ یہ نظریہ جارج ہربرٹ میڈ (Georg Herbert Mead) کی منتشر تحریروں پر مبنی ہے جس میں وہ انسانوں کے روزمرہ تفاعل پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ اس کے مطابق انسان باہمی تعلق پر توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ان توقعات کی بنیاد پر عمل کرتے ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر الجھاؤ کا شکار نظر آتا ہے لیکن اس تفاعل کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بہت واضح اور دلچسپ دکھائی دیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق جب ہم کسی شخص کو ملتے ہیں تو اسے اس طرح ملتے ہیں جو ہمارے نزدیک بہت مناسب ہوتا ہے۔ ہم پہلے اس شخص کی ایک معاشرتی حیثیت متعین کرتے ہیں اور پھر اس تعین کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ مثلاً پولیس کے آدمی کے ساتھ ہمارا رویہ اس سے مختلف ہوتا ہے جو ہم اپنے والدین کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہماری متعین کردہ تعریف (Definition) پر پورا نہیں اترتا تو پھر اس کے بارے میں نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اور باہمی ملاقات میں اسی طریق کار پر کاربند ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کی معاشرتی قسم متعین کرتے ہیں اور پھر اپنے رویہ کا اظہار کرتے ہیں۔ معاشرتی تفاعل کے ماننے والے اس طریق کار کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں افراد دوسرے افراد کے تعین در تعین کے عمل سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ اس مطالعہ کے اہم نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب کسی شخص کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے تو پھر اس کے بارے میں رویہ کا تعین اسی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی ذہین ہے یا بے وقوف، مجرم ہے یا شریف، ایک مرتبہ جب تعین کا نشان (Label) لگ جاتا ہے تو اس سے صرف نظر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص پر ذہنی بیماری کا لیبل لگ جاتا ہے تو پھر معاشرتی تفاعل میں اس کے ہر اقدام اور ہر بات کو ذہنی بیماری ہی کے حوالے سے دیکھا جائے گا۔

معاشرتی تفاعل پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ لوگ معمولی واقعات سے ہٹ کر معاشرے کو عمومی طور پر سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس سے ان کی اپروچ محدود اور ادراک کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ افراد کی انفرادی حیثیت اہم ہے

لیکن معاشرے کا وسیع تر تناظر معمولی انفرادی حیثیتوں سے متعین نہیں ہوتا۔ معاشرے کا اجتماعی وجود انفرادی سے کہیں بڑے عوامل کا محتاج ہوتا ہے تاہم یہ نظریہ انفرادی رویوں اور ان کے اجتماعی اثرات کے تجزیہ میں مفید بنیاد بن سکتا ہے۔

نسلی منہاج (Ethnomethodology)

یہ دوسرا نظریہ ہے جو فرد کے تجزیہ پر مبنی ہے۔ یہ ایک نیا معاشرتی نظریہ ہے جو علم المعاشرت کے امریکن مصنف ہیرالڈ گارفنکل (Herald Gar Finke) کی طرف منسوب ہے۔ اگرچہ اس کے پس منظر میں بیسویں صدی کے معاشرتی نظریات بتائے جاتے ہیں تاہم اسے جدید نظریہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اس تصور پر مبنی ہے کہ معاشرے کے افراد اپنے رویوں کی بنیاد ایک موہوم تصور پر رکھتے ہیں۔ اس نظریہ کا آغاز اس تصور سے ہوتا ہے کہ معاشرے کے بارے میں یہ خیال کہ یہ ایک منظم، مستحکم اور قابل فہم معاشرتی نظم ہے دراصل ایک خارجی حقیقت نہیں بلکہ یہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔ مثلاً آپ جرائم کے سرکاری اعداد و شمار کو لے لیں۔ یہ جرائم کے ارتکاب کی فہرست نہیں ہوگی بلکہ پولیس کے اس طریق کار کا مظہر ہوگی جس کے مطابق وہ انسانوں کے مختلف اعمال جرائم کی اقسام میں شامل کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی ایک مشکل تو زبان اور اصطلاحات کا استعمال ہے جو اسے پیچیدہ اور مشکل بنا دیتا ہے ورنہ بنیادی تصور آسان ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نظریہ کے حامل جس چیز پر زور دیتے ہیں وہ بعض محققین کے نزدیک بہت معمولی نوعیت کی ہوتی ہے۔

ان نظریات کا تفصیلی مطالعہ مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ مستقل کتاب کا متقاضی ہے یہاں صرف مختصر تعارف مطلوب ہے تاہم ایک مثال کے ذریعے نظریات کا انطباق دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ تعلیم کو بطور مثال لے لیں۔ کارکردگی کا نظریہ رکھنے والا (Functionalist) یہ دیکھتا ہے کہ معاشرے کو مستحکم رکھنے کے لیے نظام تعلیم کیا فریضہ انجام دے رہا ہے! مارکسی نقطہ نظر رکھنے والا یہ دیکھے گا کہ نظام تعلیم حکمران طبقہ کو اقتدار میں قائم رکھنے کے لیے کس طرح کام کر رہا ہے۔ معاشرتی تفاعل پر یقین رکھنے والا یہ دیکھے گا کہ نظام تعلیم میں استاد اور شاگرد ایک دوسرے پر کیا لیبل لگاتے ہیں اور کمرہ تدریس میں تعلقات پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے اور نسلی منہاج کا مدعی (Ethno Methodolegist) کمرہ درس میں غیر تحریری ضوابط کی تشکیل کا جائزہ لے گا۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ علم المعاشرت کے مختلف نظریات کے حامل حضرات معاشرے کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں یہ ایک جزوی اپروچ ہے جس سے معاشرے کا بحیثیت مجموعی مطالعہ ممکن نہیں۔ علم المعاشرت کو سائنس کا نام دینے والے لوگ تعبیرات کے اس تنوع اور اس کے غیر یقینی ہونے کا شاید ادراک نہیں کر سکے ہیں۔ قرآن مجید کا تبصرہ ایک جامع تجزیہ ہے۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۴)

یہ محض خیال کے پیچھے چلتے ہیں اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔

......☆......

(۴) الانعام/۱۱۶

انسان کی معاشرتی فطرت

کیا انسان ایک معاشرتی حیوان ہے؟ ہمارا معاشرے سے کیا رشتہ ہے؟ معاشرہ ہم سے کس طرح متعلق ہے؟ ہم اس اجتماعیت کی کیسی تعبیر کریں جس سے ہماری انفرادیت متعلق ہے؟ یہ سوالات ہمیشہ انسان کو درپیش رہے اور انسان ان کے بارے میں سوچتا رہا ہے اور علم المعاشرت کے وجود میں آنے سے پہلے بھی انسان نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ فرد کا اپنے گروہ کے ساتھ اور معاشرتی نظم کے ساتھ تعلق ہمیشہ زیر بحث آتا رہا ہے۔ یہی نکتہ معاشرتی تفتیش کا نقطہ آغاز ہے۔ فرد اور معاشرے کا تعلق ہی سوشیالوجی کا موضوع ہے۔ انسان نے اس تعلق کے بارے میں ہمیشہ مثبت سوچ کا مظاہرہ کیا ہے البتہ مغربی فکر کے دو نظریات نے ان سوالات کے جواب کے سلسلے میں گمراہ کن اثر ڈالا ہے۔ یہ دو نظریات ہیں:

عمرانی معاہدہ (Theory of social contract) اور عمرانی وجود (Theory of social organism)

یہ دونوں نظریات عمرانی علوم کے طلبہ کے لیے کنفیوژن کا باعث بنے ہیں۔

معاہدہ عمرانی

قدیم زمانے سے فلاسفہ کے ہاں یہ تصور موجود تھا کہ انسان نے اپنا معاشرہ بعض مقاصد کے حصول کے لیے تشکیل دیا ہے۔ بعض مفکرین کے نزدیک سوسائٹی اس لیے تشکیل دی گئی کہ انسان کو انسان کی بے مہار فطرت سے محفوظ کیا جائے۔ سترھویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابز (Thomas Hobbes) کی یہی رائے تھی (۱) کچھ اور لوگوں کے نزدیک معاشرہ ایک مصنوعی تدبیر ہے جو باہمی معاشی مفادات کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ آدم سمتھ (Adam Smith) اور ان کے پیرو اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے انفرادیت پسندوں کا نظریہ یہ تھا کہ انسان پیدائشی طور پر آزاد اور باہمی طور پر مساوی ہے (Born free and equal)۔ اس نے صرف معاشرتی سہولت کے لیے معاشرہ تشکیل دیا۔ تمام نظریات کا انحصار اس پر ہے کہ انسانوں کے درمیان یا افراد اور حکومت کے مابین ایک باہمی معاہدہ ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ فرد کو سوسائٹی سے حفاظت مہیا کی جائے۔ (۲) بعض مفکرین نے اسے سوسائٹی میں سیاسی تنظیم کے لیے استعمال کیا۔ گویا کہا یہ جا رہا ہے کہ انسان نے کسی وقت ضرورت کے تحت سوسائٹی کو ایجاد کیا اور اس طرح یہ ایک مصنوعی تنظیم وجود میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ انسان سوسائٹی میں شامل ہونے سے پہلے صرف افراد کی صورت میں زندگی بسر

---

(1) Laviathan. 13. 172

(2) G. D. H. coles. Introduction to the social contract and Discourse by Jean Jacques Rousseau. 1913.

کرتے تھے اور انہوں نے معاشرہ اسی لیے تشکیل دیا تا کہ اپنی ذات، جائیداد اور حقوق کی حفاظت کریں۔ اگر غور کریں تو یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ فرد اور معاشرہ کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایسا وقت نہیں طے کیا جا سکتا جس میں افراد نے بیٹھ کر طے کیا ہو کہ اب ہمیں سوسائٹی تشکیل دینی چاہیے۔ یہ ایک موہوم تصور ہے جس پر استدلال کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔

معاشرہ بطور ایک زندہ متحرک وجود (The Organismic Theory of Society)

اس نظریہ کے مطابق معاشرہ یا اس کا حصہ ایک زندہ و متحرک وجود (organism) ہے۔ ایک حیاتیاتی وجود کی حیثیت سے معاشرہ انہی کیفیات سے گزرتا ہے جن سے ایک جاندار وجود گزرتا ہے جیسے نشوونما، بلوغت اور زوال جیسے مراحل۔ سوسائٹی کے خلیات افراد ہیں اور اس کے نظامات ایسوسی ایشن اور ادارے ہیں۔ معاشرے کو حیاتیاتی وجود قرار دے کر اس پر انہی قوانین و شرائط کا انطباق کیا گیا جو حیاتیاتی فرد پر کیا جاتا ہے جیسے پیدائش، جوانی، کہولت و سنجیدگی، بڑھاپا اور موت۔ (۳) اس سے ملتا جلتا نظریہ جسے قدیم اور جدید مفکرین نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ سوسائٹی ایک بڑا ذہن ہے جو سب پر محیط ہے۔ قدیم فلاسفہ میں افلاطون (Plato) اور جدید مفکرین میں ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل (William Mac Dougall) ہے جو اجتماعی ذہن (Group mind) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے (۴)۔

اگر کسی خاص گروہ کے مخصوص رویوں کی بات کی جائے تو قابل قبول ہو سکتی ہے مثلاً انگریز یا روسی یا ہندو کسی خاص مسئلے پر خصوصی اجتماعی رویہ کا اظہار کریں گے لیکن اس نقطۂ نظر کے حامی اس سے زیادہ کے دعوے دار ہیں۔ ان کے نزدیک سوسائٹی اپنی ذات میں ایک ذہن ہے جو تمام افراد معاشرہ میں مشترک ہے۔ اس تصور نے دور حاضر کے کئی مصنفین و مفکرین کو متاثر کیا مثلاً اوسولڈ سپنگلر (Oswald spenglar) اپنی کتاب زوال مغرب (Decline of the west) میں دعویٰ کرتا ہے کہ معاشرے پیدائش اور موت کے حیاتیاتی دور سے گزرتے ہیں۔

معاہدہ عمرانی فرد کی حیثیت کو مستحکم کرتا ہے اور معاشرہ کو مفادات کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتا ہے جبکہ ''معاشرہ ایک حیاتیاتی وجود'' کا نظریہ فرد کے کردار کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا ہے۔ فرد اپنی ذات میں زندگی کی ابتدا اور انتہا نہیں بلکہ وہ زندگی کے تسلسل میں رابطہ کی کڑی ہے یہ عمرانی صداقت بھی ہے اور حیاتیاتی بھی۔ کیونکہ معاشرہ ہمارے لیے صرف ماحول ہی نہیں اور صرف زمین ہی نہیں جہاں ہماری پرورش ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ معاشرتی ورثے سے ہمارا تعلق اس بیج سے کہیں زیادہ ہے جو اس زمین سے ہوتا ہے جس میں وہ نشوونما پاتا ہے۔ ہم ایک معاشرے میں جنم لیتے ہیں جس کا

(3) Sorokin, sociocultural dynamism and Evolutionism in Twentieth century sociology (Gurvitch and W. E. MOOR, New York, 1945), 96-120.

(4) See Republic, Book, 11; W. Macdougall, the Group Mind chap, I (Cambridge 1920).

نظام ہماری موروثی حیثیت متعین کرتا ہے اور جس کے نظام کا کچھ حصہ ہمارا ظاہری مملوک ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمارا ذہنی سلاح بھی بن جاتا ہے۔ معاشرتی ورثہ جو مسلسل تغیر پذیر ہے ہم پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ ہمارا عمرانی تجربہ ہماری شخصیت کی اٹھان اور اس کی رہنمائی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کی صلاحیتوں کو آزادی بھی عطا کرتا ہے اور اس کی حد بندی بھی کرتا ہے۔ وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا اور مواقع مہیا کرتا ہے بلکہ متعین پابندیاں بھی لگاتا ہے اور مداخلت بھی کرتا ہے۔ وہ غیر مرئی اور غیر محسوس طریقہ پر ہمارے رویوں' عقیدوں' اخلاق اور نصب العین کی بھی تشکیل کرتا ہے۔

فرد اور اس کے معاشرتی ورثے کے درمیان اس بنیادی اور فعال بقائے باہمی کے رشتے کا ادراک ہمیں ارسطو کے اس مشہور جملے کی صداقت کا احساس دلاتا ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے (Man is a social animal)۔ معاشرتی زندگی اور معاشرے کے بارے میں فرد کے رویوں کے اختلاف کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ معاشرے کے بغیر اور معاشرتی رویے کی حوصلہ افزائی کے بغیر فرد کی شخصیت کا وجود میں آنا ممکن نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کا کوئی اجتماعی وجود نہیں۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اجتماعی ذہن (Group mind) نامی کوئی شے نہیں یہ صرف فرد ہے جو محسوس کرتا ہے' تجربہ کرتا ہے اور نتیجہ نکالتا ہے۔ افراد کے ذہن' افراد کے جذبات اور افراد کے ردہائے عمل ہوتے ہیں جو مشترک مفادات کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ افراد سوسائٹی کا اس طرح حصہ نہیں ہوتے جس طرح اعضاء جسم کا حصہ ہوتے ہیں سرگرمی' جذبات' اقدام اور مقاصد کا تعلق افراد سے ہے۔ سوسائٹی نام ہے اس شے کا جس کے ساتھ یہ افراد زمان و مکان کی وساطت سے باہم دگر جڑے ہوتے ہیں۔ یا وہ باہمی رشتے جو وہ خود تخلیق کرتے ہیں یا ورثے میں حاصل کرتے ہیں۔ فرد کا انفرادی تجربہ البتہ ایک استثناء ہے۔ کسی معاشرے کے مقصد اور نصب العین کا تعین افراد ہی کی سرگرمیوں' دلچسپیوں' آرزوؤں' امیدوں اور مخافتوں ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے' اسی طرح افراد کی دلچسپیاں' آرزوئیں اور نصب العین اس لیے ہیں کہ وہ معاشرے کا حصہ ہیں۔

فرد اور معاشرے کے درمیان باہمی انحصار کے اسی رشتے کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے قدیم و جدید فرد پسندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے سترھویں صدی عیسوی کے ماہر معاشرت ہابز (Hobbes) اور انیسویں کے جان سٹورٹ مل (John Stuart Mill) نے لکھا کہ سوسائٹی اپنے مزاج کے لحاظ سے فرد کی نشو و نما اور اس کے اظہار کی دشمن ہے۔ (۵)

اسی طرح کی غلط فہمی دوسرے گروہ میں پائی جاتی ہے جو سوسائٹی کو اصل اہمیت دیتے ہیں جیسے بینجمن کڈ (Benjamin Kidd) جس نے یہ اعلان کیا کہ فرد کو سوسائٹی کے ماتحت ہونا چاہئے (۶) یا جس طرح مشہور فلسفی ہیگل

---

(5) Hobbes, Laviathan, chap. 21; and Mill, on liberty.

(Hegel) کے پیرو یہ کہتے ہیں کہ سوسائٹی جو خدمات اپنے ارکان کو مہیا کرتی ہے اس سے ماوراء اپنی قدر و قیمت رکھتی ہے۔(۷)

فرد اور معاشرے کا وجود منحصر ہے باہمی تعلق پر۔ تعلق جو فرد اور فرد کا ہے اور فرد اور جماعت کا ہے اور جو معاشرے کے مسلسل تغیر پذیر منظر میں قائم رہتا ہے۔ معاشرہ اپنی روایات' ادارات اور اوزارات کے ساتھ جو وہ بہم پہنچاتا ہے ایک تغیر پذیر اجتماعی زندگی کا نظام ہے جو فرد کے اجسام اور اس کی جسمانی ضرورتوں کے نتیجے میں تشکیل پاتا ہے۔ ایک نظام جہاں افراد پیدا ہوتے ہیں اور اپنی محدودیتوں کے ساتھ ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں اور جہاں زندگی کے تقاضوں کو آنے والی نسلوں کو منتقل کرتے ہیں۔ فرد اور سوسائٹی کے بارے میں یک رخا نقطۂ نظر رد کر دینے کے قابل ہے کیونکہ یہ زندگی کے صرف ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔

معاشرت انسان کی فطری ضرورت ہے۔ خالق انسان نے اسے محض فرد کی حیثیت سے نہیں پیدا کیا بلکہ اجتماعی زندگی کے لیے پیدا کیا۔ بلاشبہ وہ اپنے عمل کا انفرادی طور پر ذمہ دار ہے لیکن اسے خاندان کا فرد بنایا' قبائلی زندگی کا شعور بخشا اور بستیاں بنانے اور تمدن تخلیق کرنے کا سلیقہ ودیعت کیا۔ یہ سب کچھ ربانی رہنمائی کی وجہ سے ہے۔ اجتماعیت کی تشکیل' قوموں کا وجود' معاشروں اور سلطنتوں کی تنظیم انسان کے اسی فطری شعور کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے ودیعت کیا ہے۔ انسان کی تمنائیں اور آرزوئیں اس کی شخصیت کا اہم پہلو ہیں اور اجتماعی زندگی اس کی فطرت کی آواز ہے۔ ربانی ہدایت نے اصول دیئے اور طریقے سکھائے اور انسان نے اتباع اور انحراف کے مطابق اپنے لیے راہیں متعین کیں۔ قرآن نے خاندانی رشتوں' جماعتوں اور قبیلوں کے تشخص کو حکمت خداوندی کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشیت ایزدی تھی کہ انسان خاندان کے ادارے کی تنظیم کرے اور گروہوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرتے ہوئے بڑی معاشرت کی تنظیم کرے۔(۸)

---

(6) B-kidd. Social Evolution (New York 1920) and Principle of western civilization (London, 1902)

(7) B.-Bosanquet. philosophical theory of the state (London, 1920), chapter.5 and 7

(۸) اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے آ رہی ہے۔

انسان کی معاشرت پسندی

انسان اس وقت ایک اجتماعی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی اس اجتماعی زندگی کے پیچھے کتنی کوششیں کارفرما تھیں؟ اور کتنے عوامل تھے جنہوں نے اسے اجتماعی زندگی پر مجبور کیا؟ کوئی انسان بھی یقین سے اس کے متعلق اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ اب تو ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ انسان معاشرت پسند ہے لیکن انسان کیوں معاشرت پسند ہے؟ یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ علمائے معاشرت نے انسان کی معاشرتی زندگی پر جو تحقیقات کی ہیں ان کے نتائج یہ ہیں کہ انسان زندگی کے بالکل ابتدائی اور سادہ دور میں بھی اجتماعیت پسند تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کی اجتماعیت بھی اس کی ابتدائی زندگی کی طرح ابتدائی تھی۔ گو ہابز (Hobbes) یہ کہتا ہے کہ ابتدائی انسان حیوان کے مماثل تھا' تنہائی کی زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے ہم جنسوں سے لڑتا تھا۔ لیکن اس کا نوجوان ہمعصر جان لاک (John Lock) کہتا ہے کہ ابتدائی انسان امن پسند تھا اور گروہی زندگی گزارتا تھا۔ انسان کا یہ طرز عمل ایسا ہے جس میں کمی نہیں آئی۔ وقت کے گذرنے سے اس کا یہ طرز عمل زیادہ بہتر صورتیں اختیار کرتا گیا مگر کم نہیں ہوا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب انسان اجتماعیت سے بے نیاز رہا ہو۔ بالکل ابتدائی زندگی سے لے کر تمدن کی وسعت تک اجتماعیت اس کا گہوارہ زندگی رہی ہے۔

معاشرت پسندی کے اسباب

عام طور پر انسان کی معاشرت پسندی کے اسباب دو ہی بیان کئے جاتے ہیں۔ داخلی و خارجی۔

(i) خارجی سبب اس کی کمزوری ہے۔ انسان جسمانی ساخت کے اعتبار سے کمزور ہے حالانکہ دوسرے حیوانوں کو قدرت نے جسمانی لحاظ سے اس طرح مسلح کیا ہے کہ وہ حملوں' حالات اور مشکلات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً کسی کو اس نے بال و پر عطا کئے ہیں تو کسی کو کینچلیاں' کسی کو پنجے اور تیز چونچیں بخشی ہیں تو کسی کو بے پناہ قوت دی ہے۔ غرض اس نے ان حیوانوں کے لیے ایسی سہولتیں مہیا کی ہیں کہ محفوظ زندگی گذار سکتے ہیں۔ گرمی سردی اور دیگر قدرتی عوامل کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انسان چونکہ قدرتی ہتھیاروں سے محروم ہے اس لیے وہ اکیلے نہ تو فطری عوامل کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ دوسرے حملوں کا دفاع۔ وہ مجبور ہے کہ خارجی ماحول سے نپٹنے کے لیے تعاون حاصل کرے۔ یہی مجبوری اس کی اجتماعیت کا سنگ بنیاد ہے۔ رابرٹ ایس وڈ ورتھ (Robert. S. Wood Worth) نے اجتماعیت پسندی کو انسان کی مجبوری قرار دیا ہے جو رفتہ رفتہ اس کے فطری شعور کا حصہ بن گئی۔ مانٹیسکیو (Montesque) کہتا ہے کہ آدمی کی معاشرت پسندی کا باعث ماحول کا خوف تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ماحول کی شدت اور اس کی کمزوری اجتماعیت کا سبب بنی اور اس نے اس ڈھب سے ماحول پر قابو پایا ہے۔

(ii) داخلی سبب اس کی جبلی خواہش ہے۔ علمائے معاشرت نے ارسطو کے ایک جملے کو بطور استدلال پیش کیا ہے کہ ''انسان مدنی الطبع ہے'' (۱) انسان طبعی اور جبلی طور پر مل جل کر رہنے کو پسند کرتا ہے۔ ابن خلدون کے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

''افراد انسانی کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے۔'' (۲)

نظم اجتماعی پیدا کرنا اس کا فطری جذبہ ہے' وہ انفرادیت وتنہائی سے گریز کر کے معاشرے میں طبعی سکون حاصل کرتا ہے۔ ممکن ہے خارجی ماحول نے اسے تنظیم پر مجبور کیا ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اجتماعیت کا حقیقی شعور اس کے خمیر میں موجود تھا جس نے حالات کے پیش نظر عملی صورت اختیار کی۔ بعض علمائے معاشرت نے حیوانی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ کچھ حیوان طبعاً اجتماعیت پسند ہیں' ان میں انسان بھی شامل ہے۔ سپنسر (Spencer) انسانی سوسائٹی پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض حیوان فطرتاً معاشرت پسند ہیں۔ جیسے چیونٹی' شہد کی مکھی' بھڑ وغیرہ۔ انہیں وہ (Social insect) کہتا ہے۔ انسان بھی ایسا ہی ہے لیکن انسانی معاشرت کی تنظیم صرف فطری تقاضوں پر ہی مبنی نہیں بلکہ اس کے اور بھی اسباب ہیں۔ اس کی رائے میں انسان انفرادی اور معاشرتی اعتبارات سے ارتقاء کی راہ پر گامزن ہے۔ اس لیے ہمیشہ نئے عوامل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

انسان کی مدنیت پسندی کے متعلق یہی دو نظریات ہیں جن کے بارے میں اہل علم کے ہاں کبھی اختلاف نہیں رہا۔ اس طرح معاشرت انسان کی فطری خواہش بھی ہے اور ذاتی مجبوری بھی' وہ طبعی تقاضوں کے تحت ابنائے نوع کا قرب چاہتا ہے اور ذاتی مجبوریوں کے تحت ان کا محتاج رہتا ہے۔ گویا اجتماعیت اور انسان لازم وملزوم ہیں اور انسان جب تک شرف انسانیت سے مزین ہے اجتماعی زندگی اختیار کیے رہے گا۔

اسلام اور اجتماعیت

مذکورہ بالا دونوں نظریے اسلام کے کسی اصول سے نہیں ٹکراتے بلکہ قرآن وسنت کی بعض نصوص سے دونوں کی تائید ہوتی ہے۔ فطری معاشرت پسندی کی تائید بھی اسلامی اصولوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً انسانی معاشرت کا سنگ بنیاد مرد وعورت کا تعلق ہے قرآن اسے رحمت ومودت قرار دیتا ہے' رشتہ داروں کے تعلق کو بھی اسی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رحم کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک وعدہ کیا جو باہمی انس کی نشاندہی کرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

مَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهُ (۳)

---

(۱) ارسطو سیاسیات/۱۲۵۳/الف (۲) ابن خلدون، مقدمہ/الفصل فی العمران البشری/۴۱

(۳) بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله/۱۰۴۸

جس نے تجھے جوڑا اس کو میں جوڑوں گا اور جس نے تجھے توڑا میں اس سے تعلق توڑ دوں گا۔
خاندان ہی پہلا معاشرتی ادارہ ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی صلہ رحمی ہے۔ پھر خلافت ارضی کا تصور فطری رجحان اور ماحول کے تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محض ایک فرد کے طور پر نہیں پیدا کیا کہ بعد میں اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے سرگردان رہے بلکہ اس کی فطرت میں اجتماعیت کا شعور ودیعت کیا' اجتماعیت کی بنیادی احتیاجات کو اس کی شخصیت کا حصہ بنایا اور اجتماعیت کی پہلی اکائی میاں بیوی کے تعلق کا شعور بخشا' پھر خاندان کی وحدت کے مختلف اجزاء کی اہمیت کا ادراک عطا کیا اور ان اجزاء کو مرتبط رکھنے کے احکام دیئے۔ یہ سب کچھ تدبیر الٰہی سے ہوا علماء معاشرت کے ظن وتخمین اور قیاس واجتہاد سے نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اجتماعیت انسان کا فطری داعیہ ہے جسے اللہ پاک نے اس کی ذات میں ودیعت کیا ہے۔ قرآن مرد وعورت کے تعلق کی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (۴)

''یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں پیدا کیں تاکہ تمہارے لیے راحت اور تسکین کا سامان ہو اور تمہارے درمیان محبت وشفقت پیدا ہو۔''

سید مودودیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

خالق کا کمال حکمت یہ ہے کہ اس نے انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی' بلکہ اسے دو صنفوں (Sexes) کی شکل میں پیدا کیا جو انسانیت میں یکساں ہیں۔ جن کی بناوٹ کا بنیادی فارمولا بھی یکساں ہے۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف جسمانی ساخت' مختلف ذہنی ونفسی اوصاف' اور مختلف جذبات وداعیات لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے درمیان یہ حیرت انگیز مناسبت رکھ دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پورا جوڑ ہے۔ ہر ایک کا جسم' دراس کے نفسیات وداعیات دوسرے کے جسمانی ونفسیاتی تقاضوں کا مکمل جواب ہیں۔ مزید برآں وہ خالق حکیم ان دونوں صنفوں کے افراد کو آغاز آفرینش سے برابر اس تناسب کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دنیا کی کسی قوم یا کسی خطہ زمین میں صرف لڑکے ہی پیدا ہوئے ہوں' یا کہیں کسی قوم میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس میں کسی انسانی تدبیر کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان ذرا برابر بھی نہ اس معاملہ میں اثر انداز ہو سکتا ہے کہ لڑکیاں مسلسل ایسی زنانہ خصوصیات اور لڑکے ایسی مردانہ خصوصیات لیے ہوئے پیدا ہوتے رہیں جو ایک دوسرے کا ٹھیک جوڑ ہوں' اور نہ اس معاملہ ہی میں اس کے پاس اثر انداز ہونے کا کوئی ذریعہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدائش اس طرح

---

(۴) الروم/۲۱

مسلسل ایک تناسب کے ساتھ ہوتی چلی جائے۔ ہزار ہا سال سے کروڑوں اور اربوں انسانوں کی پیدائش میں اس تدبیر و انتظام کا اتنے متناسب طریقے سے پیہم جاری رہنا اتفاقاً بھی نہیں ہوسکتا' اور یہ بہت سے خداؤں کی مشترک تدبیر کا نتیجہ بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ چیز صریحاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ایک خالق حکیم اور ایک ہی خالق حکیم نے اپنی غالب حکمت وقدرت سے ابتداءً مرد اور عورت کا ایک موزوں ترین ڈیزائن بنایا۔ پھر اس بات کا انتظام کیا کہ اس ڈیزائن کے مطابق بے حد وحساب مرد اور بے حد وحساب عورتیں اپنی الگ الگ انفرادی خصوصیات لیے ہوئے دنیا بھر میں ایک تناسب کے ساتھ پیدا ہوں۔

یہ انتظام الل ٹپ نہیں ہوگیا ہے بلکہ بنانے والے نے بالارادہ اس غرض کے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ مرد اپنی فطرت کے تقاضے عورت کے پاس' اور عورت اپنی فطرت کی مانگ مرد کے پاس پائے' اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہوکر ہی سکون واطمینان حاصل کریں۔ یہی وہ حکیمانہ تدبیر ہے جسے خالق نے ایک طرف انسانی نسل کے برقرار رہنے کا' اور دوسری طرف انسانی تہذیب وتمدن کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگر یہ دونوں صنفیں محض الگ الگ ڈیزائنوں کے ساتھ پیدا کر دی جاتیں اور ان میں وہ اضطراب نہ رکھ دیا جاتا جو ان کے باہمی اتصال ووابستگی کے بغیر مبدل بسکون نہیں ہوسکتا' تو انسانی نسل تو ممکن ہے کہ بھیڑ بکریوں کی طرح چل جاتی' لیکن کسی تہذیب وتمدن کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ تمام انواع حیوانی کے برعکس نوع انسانی میں تہذیب وتمدن کے رونما ہونے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ خالق نے اپنی حکمت سے مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے لیے وہ مانگ' وہ پیاس وہ اضطراب کی کیفیت رکھ دی جسے سکون میسر نہیں آتا جب تک کہ ایک دوسرے سے جُڑ کر نہ رہیں۔ یہی سکون کی طلب ہے جس نے انہیں مل کر گھر بنانے پر مجبور کیا۔ اس کی بدولت خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ اور اسی کی بدولت انسان کی زندگی میں تمدن کا نشوونما ہوا۔ اس نشوونما میں انسان کی ذہنی صلاحیتیں مددگار ضرور ہوئی ہیں مگر وہ اس کی اصلی محرک نہیں ہیں۔ اصل محرک یہی اضطراب ہے جسے مرد وعورت کے وجود میں ودیعت کر کے انہیں ''گھر'' کی تاسیس پر مجبور کر دیا گیا۔ کون صاحب عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ دانائی کا یہ شاہکار فطرت کی اندھی طاقتوں سے محض اتفاقاً سرزد ہوگیا ہے؟ یا بہت سے خدا یہ انتظام کر سکتے تھے کہ اس گہرے حکیمانہ مقصد کو ملحوظ رکھ کر ہزار ہا برس سے مسلسل بے شمار مردوں اور بے شمار عورتوں کو یہ خاص اضطراب لیے ہوئے پیدا کرتے چلے جائیں یہ تو ایک حکیم اور ایک ہی حکیم کی حکمت کا صریح نشان ہے جسے صرف عقل کے اندھے ہی دیکھنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

محبت سے مراد یہاں جنسی محبت (Sexual Love) ہے جو مرد اور عورت کے اندر جذب وکشش کی ابتدائی محرک بنتی ہے اور پھر انہیں ایک دوسرے سے چسپاں کیے رکھتی ہے۔ اور رحمت سے مراد وہ روحانی تعلق ہے جو ازدواجی زندگی میں بتدریج ابھرتا ہے' جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے خیرخواہ' ہمدرد' غم خوار اور شریک رنج وراحت بن جاتے

ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب جنسی محبت پیچھے جا پڑتی ہے اور بڑھاپے میں یہ جیون ساتھی بچہ جوانی سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کے حق میں رحیم و شفیق ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دو مثبت طاقتیں ہیں جو خالق نے اس ابتدائی اضطراب کی مدد کے لیے انسان کے اندر پیدا کی ہیں جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ وہ اضطراب تو صرف سکون چاہتا ہے اور اس کی تلاش میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ طاقتیں آگے بڑھ کر ان کے درمیان مستقل رفاقت کا ایسا رشتہ جوڑ دیتی ہیں جو دو الگ ماحولوں میں پرورش پائے ہوئے اجنبیوں کو ملا کر اس طرح پیوستہ کرتا ہے کہ عمر بھر وہ زندگی کے منجدھار میں اپنی کشتی ایک ساتھ کھینچتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محبت و رحمت جس کا تجربہ کروڑوں انسانوں کو اپنی زندگی میں ہو رہا ہے، کوئی مادی چیز نہیں ہے جو وزن اور پیمائش میں آ سکے، نہ انسانی جسم کے عناصر ترکیبی میں کہیں اس کے سر چشمے کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ نہ کسی لیبارٹری میں اس کی پیدائش اور اس کے نشو و نما کے اسباب کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ایک خالق حکیم نے بالا رادہ ایک مقصد کے لیے پوری مناسبت کے ساتھ اسے نفسِ انسانی میں ودیعت کر دیا ہے۔ (۵)

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَ صِهْرًا (٦)

اللہ وہ ذات ہے جس نے آدمی کو پانی سے پیدا کیا اور اسے نسب اور سسرال والا بنایا۔

نسب و سسرال رشتوں کا تذکرہ دراصل زوجین کے تعلق کی توسیع ہے اور خاندان کی بنیادی اکائی کا سنگ بنیاد ہے۔ اس تعلق کی حیاتیاتی بنیاد تو واضح ہے، یہاں اس کے ذکر کا مقصد اجتماعی اساس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے اور ایک طرح اخلاقی پہلو کو بھی واضح کرتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (٧)

اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔

اس آیت میں والدین رشتہ دار پڑوسی اور غلاموں کا ذکر خاندان کی وسعت اور اس کے استحکام کی طرف اشارہ ہے۔ خاندان کے ان عناصر کے ساتھ حسن سلوک اجتماعیت کا سنگ بنیاد ہے۔ قرآن اسے اللہ کی عبادت اور اس کی توحید

(۵) تفہیم القرآن، ۳/۴۴-۴۵ (۶) الفرقان/۵۴ (۷) النساء/۳۶

کے بعد دوسرے اہم اخلاقی و دینی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مشیت ایزدی میں انسان کی اجتماعیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور ربانی منصوبے میں انسان کی زندگی کا یہ پہلو شامل ہے۔ علماء معاشرت خاندان کے ادارے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں حتیٰ کہ اسے تمدن کی اساس قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے جتنے ادارے تشکیل دیئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طرح خاندان کے ادارے سے منسلک ہیں۔ قرآن صرف مرد و عورت' سسرالی اور نسبی رشتوں ہی کی بات نہیں کرتا بلکہ وسیع تر اجتماعیت کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۸)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور زمین میں ایک نائب بناؤں گا

خلافت ارضی اجتماعی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ انسان اس زمین کو بساتا بھی ہے اور نسل انسانی کی تنظیم بھی کرتا ہے۔ یہ تنظیم اجتماعی زندگی کا بھرپور مظہر ثابت ہوئی۔

يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (۹)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے۔

اِهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۰)

نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

کتب حدیث میں صلہ رحمی اور قطع رحمی کے بارے نبی کریم ﷺ کے ارشادات موجود ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی تعلقات کو جوڑنے کی کیا اہمیت اور انہیں توڑنا کتنا ناپسندیدہ ہے۔ صلہ رحمی اجتماعی زندگی کی اساس ہے اور قطع رحمی اجتماع کی دشمن ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے صلہ رحمی کی اہمیت منقول ہے اس پر غور کریں تو اجتماعیت کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔

عَنْ عبدالرحمن بن عوفؓ عن النبیؐ قال: قال اللّٰه تعالیٰ: أَنَا الرَّحْمَانُ أَنَا خَلَقْتُ الرحم وشققت لها إسماً مِنْ إِسْمِي فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَّتُّهُ (۱۱)

عبدالرحمان بن عوفؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں رحمان ہوں' میں نے رحم (نسبی رشتہ) پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے جس نے اسے پیوستہ رکھا میں نے اس کو پیوستہ رکھا اور جس

---

(۸) البقرہ/۳۰ (۹) ص/۲۶

(۱۰) البقرہ/۳۸ (۱۱) ابوداؤد، کتاب الزکاۃ، باب فی صلۃ الرحم/۲۶۱

نے اسے کاٹ دیا میں نے اسے الگ کر ڈالا۔

عن أبی هریره عن البنی ﷺ قال الرحم شَجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمَن فَقَال اللهُ مَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعتُه (۱۲)

ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: رحم رحمان کی شاخ ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جو تجھے جوڑے گا میں اسے جوڑوں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے قطع کروں گا۔

ساری مخلوق کے ساتھ انسان کے اس رحیمانہ فطری تعلق کو یوں بیان کیا گیا ہے:

عن عبد الله بن عمر وقَالَ: قَال رسول الله ﷺ: الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهم الرَّحْمٰن۔ ارْحَمُوا مَنْ فِي الْأَرضِ يَرْحَمْكُم مَنْ فِي السَّمَاءِ (۱۳)

عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

عن جرير بن عبد اللهؓ عن البنی ﷺ قال: من لَا يَرْحَم لا يُرْحم (۱۴)

جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ان احادیث میں جذبہ رحم کا بیان ہے۔ یہ جذبہ اجتماعی زندگی کی جان ہے۔ مفادات کا حصول۔ خواہشات کی تکمیل اور استحصال کی تدابیر اجتماعی زندگی کے استحکام کا ذریعہ نہیں بن سکتیں جذبہ ترحم ہی حقیقی بنیاد فراہم کرتا ہے اور حضور اکرم ﷺ کے مطابق اسی جذبے کو پروان چڑھانا چاہئے۔ یہی چراغ جلے گا تو روشنی ہوگی۔

آنجناب ﷺ سے ایک صحابیؓ نے گوشہ نشینی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اسے منع فرمایا اور اجتماعی زندگی گذارنے کا حکم دیا۔

عن عثمان بن مظعونؓ قال يا رسول الله: ائذَنْ لَنَا في الاخْتِصَاء۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَصِي وَلَا اخْتَصَى۔ اِنَّ خِصَاء اُمتِي الصِّيَام۔ فَقَال اِئذَنْ لَنَا فِي السِّيَاحَةِ۔ قَالَ: اِنَّ سِيَاحَةَ اُمتّي الجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللهِ۔ فَقَال ائذَنْ لَنَا فِي التَّرَهُّبِ۔ قَالَ: اِنَّ تَرَهُّبِ اُمتّي الجُلُوْسُ فِي المَسَاجِدِ وَ اِنْتِظَارُ الصَّلوٰة (۱۵)

---

(۱۲) ابوداؤد، کتاب الزکاۃ ، باب فی صلة الرحم/۲۵۰؛ ترمذی، ابواب البر، باب ماجاء فی قطعية الرحم/۴۴۵

(۱۳) بخاری کتاب الادب ۲/۸۸۵

(۱۴) ترمذی، ابواب البر والصلۃ ۲/۱۴ مطبوعہ دیوبند

(۱۵) بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس و البهائم ۲/۸۸۹ مطبوعہ کراچی

(۱۶) شرح السنۃ ۲/۳۷۱؛ مسند احمد ۳/۱۷۳

''عثمان بن مظعونؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ مجھ کو جنسی قوت کے ضائع کرنے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا وہ شخص ہماری جماعت میں سے نہیں ہے جو جنسی قوت کو ضائع کرے یا اپنی قوت کو ضائع کرے۔ میری امت کے لیے جنسی قوت کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ روزہ ہے۔ پھر عثمان بن مظعونؓ نے عرض کیا مجھ کو سیر و سیاحت کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا: میری امت کے لیے سیاحت ا... کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ عثمان بن مظعونؓ نے عرض کیا مجھ کو ترک دنیا کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا: میری امت کے لیے ترک دنیا صرف یہ ہے کہ وہ مسجدوں میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرے''۔

عن سعد بن ابی وقاصؓ قال : رَدَّ رسول الله ﷺ: علی عثمان بن مظعون التَّبَتُّل وَ لَوْ اَذِنَ لَه لَا خْتَصَيْنَا (١٦)

سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعونؓ کی ترک دنیا کی درخواست رد کر دی اگر آپؐ نے اجازت دی ہوتی تو ہم اپنی جنسی قوت ضائع کر دیتے۔

کنارہ کشی اور ترک دنیا اجتماع دشمن رویے ہیں۔ بد قسمتی سے بعض مذاہب نے اس رویہ کو مزین کر کے پیش کیا ہے لیکن اس کے باوجود بہت کم نفوس انسانی اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اور جنہوں نے اسے اختیار کیا ہے انہوں نے انسانیت پہ ظلم کیا ہے کیونکہ نیک اور شائستہ لوگ ترک دنیا کر گئے اور کاروبار حیات پر بدکردار اور اوچھے لوگوں کا قبضہ ہو گیا تو انسانی اجتماعیت فساد، استحصال اور ظلم کا شکار ہو گئی۔ اسلام کے نظام عبادات سے لے کر تنظیم ریاست تک یہی احساس پایا جاتا ہے کہ اجتماعیت کے فقدان سے مقصد تخلیق فوت ہو جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے اجتماعیت انسان کی فطری ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو مفصل بیان کیا ہے۔

معاشرتی ہیئت

انسانی معاشرت موجودہ مقام تک کیسے پہنچی؟ اس کی یہ ہیئت کیسے وجود میں آئی؟ اسے منظم کرنے میں کون سے عوامل کارفرما رہے ہیں؟ ان مختلف سوالات کا جواب بقول سپنسر (Spencer) یہ ہے کہ انسان کی موجودہ معاشرت طویل جدوجہد اور ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ہر دور میں مختلف عوامل نے انسانی معاشرت کی تشکیل کی ہے۔ اب تک جن عوامل نے انسانی معاشرت کی تشکیل کی اور اس کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے وہ یہ ہو سکتے ہیں:

(i) جغرافیائی عوامل: یعنی ایک خطہ ارضی میں رہنے والے لوگ اجتماعیت تشکیل دینے پر مجبور ہوں۔

(ii) جنسی عوامل: یعنی خاندان وغیرہ جو جنسی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے۔

---

(١٦) مسلم کتاب النکاح ١/٤٤٩؛ شرح السنہ ٢/٣٧١

(iii) نسل۔

(iv) نفسیاتی عوامل: نوعی وحدت کا احساس (۱۷) خوف وغیرہ (۱۸)

(v) پیشہ ورانہ اتحاد: کسی خاص پیشہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی اجتماعیت۔

(vi) زبان: زبان کا اشتراک اجتماعیت کی قدرتی بنیاد ہے۔

(vii) مذہب: مذہب ہمیشہ نظریاتی اجتماعیت کی تخلیق کا باعث بنا ہے۔

(viii) سیاسی وقانونی عوامل۔

مختلف عوامل نے انسان کو مل جل کر رہنے کا سلیقہ سکھایا۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کی بدولت انسانی زندگی بالکل سادہ سی کیفیت سے پیچیدہ معاشرتی تنظیم تک پہنچ گئی۔ رابرٹ ایس وڈ ورتھ (Robert S. Wood Worth) نے انسانی معاشرت کا اہم عامل ''فعالیت'' کو قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک فعالیت انسانی خواہشات کا مظہر ہے۔

اس کی رائے ہے کہ انسانی طرز عمل کی بنیاد چند خواہشات اور جذبات ہیں جو انسان کے حیاتیاتی وجود ہونے کا فوری مظہر ہیں اور وہ یہ ہیں:

(i) ذاتی تحفظ یعنی زندہ رہنے کی خواہش۔ مثلاً خوراک' لباس' مکان' صحت وغیرہ۔

(ii) تخلیق' بقائے نوع' جنسی کشش' رومان' شادی' بچوں کی محبت' خاندانی محبت جس کے نتیجے میں اقرباء کے لیے ضرویات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ یہ عمرانی اور حیاتیاتی پہلو ہے۔

(iii) اظہار ذات' شخصی وقار کا تحفظ۔ ایسے اعمال جن سے اظہار شخصیت ہوتا ہے جیسے شکار' کھیل' اظہار برتری۔''

اظہار ذات کے متعلق ایلفرڈ ایڈلر (Alferd Adler) کی رائے ہے کہ یہ انسان کی بنیادی خواہش ہے۔ Adler کے نزدیک فرد معاشرے کے لیے چیلنج ہے۔ ایڈلر کے نزدیک حب تفوق کا جذبہ لاشعور میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچے کی خواہش تفوق کا سبب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ دوسرے اس کی تعریف کریں گے اور وہ دوسروں کی توجہ اور محبت کا مرکز بن جائے گا۔ اس کے نزدیک طاقت کا جذبہ لاشعوری ہے اور ہر چیز جسے انسان چاہتا ہے طاقت ہی کے لیے چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک طاقت انسان کی تمام خواہشات میں سے مرکزی اور بنیادی خواہش ہے۔ (۱۹) نفسیات والوں کی اصطلاح میں یہ جبلی تقاضے ہیں جو انفرادی مظاہر ہیں۔ اجتماعیت کی تشکیل کے عوامل کیسے بن گئے؟ تاہم دیگر ماہرین نے انہی کو بنیادی خواہشات قرار دیا ہے اور یہ عوامل حیاتیاتی ہیں۔ بہرکیف علماء معاشرت کے مطابق انہی کی تکمیل کے لیے ابتدائی اور

---

(۱۷) In F. G. Giddings's words Conciousness of Kind

(۱۸) Herbert Spencer said. Fear of the living created state and fear of dead created Religion.

(۱۹) قرآن اور علم جدید/ ۳۹۷۔۳۹۸

سادہ سی معاشرت وجود میں آئی اور انہی کے اختلاف سے نزاع پیدا ہوا اور سوسائٹی کے اصول مرتب ہوئے۔ محسن مہدی نے کہا ہے کہ انسانی ضروریات تین طرح کی ہوتی ہیں:

(i) شہوات بدنیہ (غضب' انتقام اور سکون وغیرہ)

(ii) رفاقت (Affiliation) اکٹھے رہنا' دوستی' تعاون' زندگی اور موت کے تجربے میں مشارکت۔

(iii) وہ خواہشات جو معاشرے کے وجود پذیر ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں مثلاً فتح' جاہ وشرف اور تحصیل مال وغیرہ (۲۰) اس کا تعلق عمرانی ترقی کی تیسری شرط یعنی تسخیر ماحول ہے۔

معاشرتی تنظیم وارتقاء

انسان اپنی طبیعت' اپنے ماحول' اپنی خواہشات اور دیگر عوامل کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کے لیے مجبور ہوا۔ اور اسلامی نقطہ نظر سے مشیت ایزدی کے منصوبہ کے مطابق اس نے اجتماعیت اختیار کی۔ علماء معاشرت جسے طبیعت کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطرت ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۲۱)

اللہ کی دی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں۔

اسی تشکیل کو ہم معاشرتی تنظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مربوط کوشش کرنا ہے۔ یہ معاشرتی تنظیم کسی مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے اور مقاصد جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے جنس' ذاتی تحفظ' اور اظہار شخصیت اور خلافت کا قیام وغیرہ ہیں۔ یہی مقاصد آگے چل کر مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ اس معاشرتی تنظیم کی پہلی وحدت خاندان ہے۔ اس کے ساتھ بچوں کے کھیل کے میدان اور ہمسائیگی کو بھی ابتدائی تنظیم قرار دیا گیا ہے۔ اس ابتدائی وحدت کے بعد اس کے ارتقاء کی مندرجہ ذیل صورتیں بیان کی گئی ہیں۔

(i) تدریجی تعلیم وتربیت نے انسانی معاشرت کو زیادہ منظم کیا۔

(ii) فنی مہارت نے اسے ماحول پر قابو پانے کی صلاحیت دی۔

(iii) ذہنی وعقلی نشوونما نے اسے وہ صلاحیت عطا کی جس کی بنا پر وہ زیادہ وسیع پیمانے پر تلاش کر کے میل جول بڑھانے لگا اور اسکی وجہ سے انسانی مسائل کی معاشرتی تنظیم ہونے لگی۔

اسی اعتبار سے معاشرتی تنظیم ایک ایسی تنظیم ہے جس میں انسان کی معاشی' سیاسی' قانونی' مذہبی اور تعلیمی جدوجہد

---

(۲۰) Ibn Khaldun's Philosophy of History / 176

(۲۱) الروم/۳۰

سمودی گئی ہے۔ بلکہ اس کے مجموعے کا نام معاشرتی تنظیم اور ارتقاء ہے۔ اس کے اندر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ سپنسر (Spencer) کا قول ہے کہ انسانی معاشرے کو ساکن و جامد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور ایچ۔ ای بارنیس (H. E. Barness) کا کہنا ہے کہ:

''معاشرتی تنظیم اور انسانی ادارات کے غائر اور عالمانہ مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ جامد نہیں ہیں (۲۲)۔''

ابتدائی انسان سے لے کر اب تک کے تہذیبی و تمدنی ارتقاء اور اس کے تنوع پر نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی معاشرتی حس نے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ مل بیٹھنے کے مختلف طریقے اور اجتماع کے متنوع اصول سب اسی خواہش کی تکمیل ہیں۔ معاشرتی تنظیم کے ارتقاء کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ سادہ سی معاشرتی حالت نے اخوت' مساوات' قومیت' بین الاقوامیت' ہمدردی و ایثار' خلافت و ریاست' بادشاہت اور صدارت کی کتنی ہی ترقی پذیر صورتیں اختیار کی ہیں۔

بہرکیف انسان مدنیت پسند ہے۔ اس کے اس احساس نے انسانی زندگی کو رنگین بنایا اور آئے دن اس کو نئے روپ دیئے۔ انسانی خواہشات کا جس قدر تجزیہ کیا جائے اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ مل جل کر رہنا انسانی شخصیت کی اندرونی آواز ہے۔ اسے حیاتیاتی خواہشات کا نام دیا جائے' یا ارتقائی کیفیات کا نتیجہ' بات ایک ہی ہے کہ انسان معاشرت پسند ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل موجود اور قدیم انسانی معاشرے ہیں تہذیب کی رعنایاں ہیں اور تمدن کی ضوفشانیاں ہیں۔ انسان کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور ہوس نے ظلم و فساد کے نمونے بھی قائم کئے ہیں۔ قتل و غضب' غارت گری ولوٹ مار' خونخواری و درندگی کا مظاہرہ بھی کیا ہے' بستیاں اجاڑی ہیں' کھیتیاں جلائی ہیں' پانیوں کو زہر آلود کیا ہے۔ کیمیائی اور حیاتیاتی زہروں سے ہلاکتوں کے انبار لگائے ہیں لیکن بالآخر نئی معاشرت یا پرانی معاشرت کے تحفظ کے نام پر اجتماعی معاشرت ہی کی طرف آیا ہے اور اسی کے استحکام کو اپنا مقصود بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے ظلم و فساد اور خونخواری و درندگی کے باوجود انسان کے لیے اجتماعیت کے بغیر زندگی گذارنا ممکن نہیں۔ یہی اس کی شخصیت کا مثبت پہلو ہے' جس نے ہر تخریب کے بعد تعمیر اور ہر فساد کے بعد امن کی صورتیں پیدا کی ہیں۔

......☆......

---

(۲۲) Social Institutions / 17

5 انسانی اجتماعیت کا ارتقاء

انسان کی معاشرت پسندی نے انسانی اجتماعیت کو جنم دیا اور یہ چھوٹی سی خاندانی تنظیم بڑھ کر اچھے معاشرے تشکیل دینے میں کامیاب ہوئی۔ انسان کی طویل اجتماعی زندگی میں بے شمار اجتماعی نظام معرض وجود میں آئے اور لاتعداد قومیں آباد ہوئیں۔ لیکن تمام اقوام و نظامہائے معاشرت کے صحیح نقوش محفوظ نہیں رہے۔ الٰہی قانون سے ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا (۱)

اور نوح کے بعد ہم نے کتنی بستیاں ہلاک کر دیں اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں پر خبیر و بصیر ہونے کے لیے کافی ہے۔

انسان کی تہذیبی داستان اور تمدنی سفر میں جن اقوام کو سربلندی حاصل رہی ہے ان میں مصری، یونانی، ہندی، رومی اور ایرانی نمایاں ہیں۔ گو ابتدائی معاشرت کے نمونے اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں لیکن جن اقوام نے اپنے اجتماعی نظام قائم کئے ان کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ معاشرت کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ معاشرے بڑے مہذب و متمدن تھے گو ان کے اصول اپنے تھے اور ان اصولوں کے نتیجے میں یا اس سے انحراف کے سبب یہ معاشرے زوال کا شکار ہوئے۔ ان معاشرتی نظاموں میں عدل و انصاف ثقافتی و تمدنی شعور اور علمی و عقلی جدوجہد کے نشانات نظر آتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت ان معاشروں کی تصویر کشی نہیں ہے۔ ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تاریخ کے ارتقائی مراحل میں انسان نے کیسے کیسے معاشرے تشکیل کئے ہیں۔

اسلام کے آنے تک دینی ولادینی دونوں اعتبارات سے انسانی اجتماعیت نے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ کھویا تھا۔ طالیس سے لے کر ارسطو تک فلاسفہ اور اشوک سے لے کر نوشیروان تک بادشاہوں نے بھی انسانی معاشرت میں اپنا اہم کردار ادا کیا تھا اور معاشرے اجتماعی احساس کے امین تھے۔ اسلام جس وقت رہنمائی کا دعویٰ لے کر آیا اس وقت کئی معاشرے منظم تھے اور اپنی تاریخ کا عظیم سرمایہ رکھتے تھے۔ گو یہ معاشرے اپنا اجتماعی اثر کھو چکے تھے اور ان کے جسد اجتماعی کو گھن لگ چکا تھا۔ قرآن کے بلیغ ارشاد کے مطابق:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ (۲)

بحر و بر میں فساد رونما ہے (اس کا سبب) لوگوں کے اعمال ہیں۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ انسانیت میں ہمیشہ انفرادی و اجتماعی فلاح کا کام ہوتا رہا ہے اور اسلام کے اعلان کے وقت بھی کہیں کہیں خیر کی کرنیں موجود تھیں لیکن اجتماعی خیر کا تناسب کم تھا۔ نیز وہ اصول جس پر ایک اچھی

(۱) بنی اسرائیل/۱۷ (۲) الروم/۴۱

اجتماعیت استوار ہو سکتی تھی عملاً موجود نہ تھے نتیجہ یہ تھا کہ اجتماعیت انتشار کا شکار تھی۔ اسلام نے جس سرزمین سے اذین اعلان کیا وہ سرزمین عرب ہے۔ عربوں میں بھی احساس جمعیت تھا اور ان کے شہری اور بدوی معاشرے بھی موجود تھے لیکن معیاری نہ تھے۔ اسلام کو عربوں کے بعد جن معاشروں کا سامنا کرنا پڑا وہ رومی و ایرانی معاشرے تھے۔ ہم اختصار سے ان تین معاشروں کا تعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ اسلام کے معاشرتی نظم کا اعتدال واضح ہو سکے۔

عرب قبل از اسلام

جزیرہ عرب ایک وسیع خطہ ہے جس میں صحرا' پہاڑ اور سنگلاخ حصے شامل ہیں۔ زراعت قلیل تھی کیونکہ پانی کی قلت تھی۔ اس کے اطراف میں رومی اور ایرانی سلطنتیں تھیں لیکن جزیرہ عرب نے ان سلطنتوں کے اثرات قبول نہیں کیے تھے۔ سرحدی علاقوں میں کچھ کچھ اثرات تھے۔ مگر وہ بھی ناقابل اعتبار۔ جزیرہ کی معاشرت کے دو حصے تھے:۔

(i) بدوی (صحرائی) (ii) حضری (شہری)

بدوی

صحراء اور پہاڑی علاقوں میں بدوی قبائل آباد تھے۔ جن کا اپنا نظام تھا۔ ہر قبیلہ ایک مستقل وحدت تھا اور اپنے اندرونی معاملات کا فیصلہ خود کرتا تھا۔ دوسرے قبائل سے معاملات میں قوت و غیرت اور شجاعت و حمیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اکثر اوقات اپنے قبیلے کے لیے ناجائز امور اور ظلم میں تعاون پر تیار رہتے تھے۔ مکانوں کے لیے خیمے ساز و سامان میں تیر تلوار' اونٹ' بھیڑ اور بکری کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی اجتماعیت کی صورت صرف قبیلہ یا اس کے حلیف کی تھی۔ اکثر اوقات قبائل میں باہمی جنگ رہتی اور وہ کئی کئی سالوں تک جاری رہتی تھی۔ ان کے اپنے اصول و قوانین اور اپنے ہی طریق ہائے صلح و جنگ تھے۔

حضری

اس وسیع علاقے میں دو چار مشہور شہر تھے مثلاً مکہ' یثرب' طائف وغیرہ۔ یہ شہر تجارتی مرکز تھے۔ مختلف علاقوں کا مال یہاں آتا اور یہاں سے دوسرے علاقوں میں جاتا تھا۔ ان شہروں میں اجتماعیت کی وہ صورتیں موجود تھیں جو شہری معاشروں میں ہوتی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان پر خصوصی رنگ غالب تھا۔ بدویانہ اخلاق کی جھلکیاں یہاں بھی پائی جاتی تھیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کا کوئی مشترک معاشرتی نظم نہیں تھا بلکہ وہ مختلف اجزاء تھے جو مختلف صورتوں میں اجتماع پذیر تھے۔ زندگی سادہ اور مقاصد حیات محدود تھے اس لیے اس مختصر اجتماعی نظم میں پیچیدگی نہیں تھی۔

عرب معاشرت کی خصوصیات

عرب معاشرہ اپنی ساخت اور تنظیم کے لحاظ سے بعض خصوصیات کا حامل تھا۔ ذیل میں ہم عرب معاشرت کی بعض اہم خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔

(i) خاندان کے بڑے آدمی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے فیصلوں کے نفاذ میں خودمختار ہوتا تھا۔

(ii) خاندان کی بنیاد اکثر اوقات شادی بیاہ ہی ہوتی۔ لیکن نسب کے لیے صرف نکاح ہی شرط نہیں تھا سفاح سے بھی نسب ثابت ہو جاتا۔ اس لیے نکاح اور سفاح کی اولاد میں بعض اوقات کینہ و منافرت کی صورتیں پیدا ہوتی تھیں۔ منہ بولی اولاد کو بھی حقیقی اولاد کے برابر شمار کیا جاتا تھا۔

(iii) نکاح کی کوئی حد نہ تھی کوئی آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا' بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کے پاس دس سے زائد بیویاں تھیں۔ بیوی کو خاندان میں کوئی مقام حاصل نہ تھا' حتی کہ باپ کی موت پر بیٹے باپ کی بیویوں یعنی سوتیلی ماں کے وارث بنتے تھے۔

(iv) عرب معاشرے میں عورت کو معزز مقام حاصل نہ تھا حتی کہ بعض قبائل تو اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ صرف چند بڑے خاندانوں میں بعض عورتوں کو اچھا مرتبہ حاصل تھا جیسے خدیجہؓ بنت خویلد یا ہندؓ زوجہ ابی سفیانؓ وغیرہ۔

(v) اخلاقی اعتبار سے ان میں شجاعت و حمیت کے ساتھ ظلم اور سنگدلی کے رجحانات عام تھے اس لیے وہ اجتماعیت کے لیے بعض اوقات مضر ثابت ہوتے تھے۔ لڑائی اور لوٹ مار کی وجہ سے وہ اجتماعی احساس کی باریکیوں سے محروم تھے حتی کہ رشتہ داروں کے ساتھ بھی عمدہ سلوک نہیں کرتے تھے اس لیے قرآن و سنت نے صلہ رحمی پر خاص توجہ دی۔

(vi) غلامی کا رواج عام تھا' رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر امتیاز اور تفریق عرب معاشرے کی خصوصیت تھی۔ کمزور لوگوں اور غلاموں کے ساتھ حیوانی سلوک کیا جاتا تھا اور انہیں وہ حقوق حاصل نہ تھے جو ایک آزاد انسان کو ملنے چاہئیں۔

عرب معاشرت دراصل اجتماعیت کی ان ابتدائی منزلوں میں تھی جن سے آگے ترقی تو ممکن تھی لیکن اس حالت میں اس سے کسی مفید معاشرتی نتیجے کی توقع نہ تھی۔ (۳)

---

(۳) ابوزہرہ' تنظیم الاسلام للمجتمع /۶۔۷' دارالفکر العربی

رومی معاشرت

عرب کے ساتھ سلطنت روما ملحق تھی۔ یہ سلطنت عروج و زوال کی عبرت ناک مثال ہے۔ رومی معاشرہ متمدن اور مہذب معاشرہ شمار ہوتا تھا۔ اس نے انسانی اجتماعیت کے کئی پہلوؤں میں مفید اضافے کئے تھے رومی اجتماعیت کی پشت پر ایک زبردست حکومت اور مضبوط سیاسی نظام تھا۔ اس معاشرے نے اس وقت قائدانہ فریضہ سرانجام دیا۔ لیکن طلوع اسلام کے وقت یہ معاشرہ شکست وریخت کا شکار تھا۔ اس معاشرے میں بھی خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ تاریخ زوال روما کے مصنف کے بقول رومی تہذیب کے زوال کا باعث خاندانی نظم کا انتشار ہے۔ اس معاشرے کی اہم خصوصیات کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں۔

خصوصیات

(i) خاندان میں باپ کو مطلق اختیار حاصل تھا۔ اولاد کو صرف اتنی آزادی میسر تھی جتنی انہیں باپ عطا کرتا حتیٰ کہ چالیس سال کی عمر تک بھی بیٹے کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔

(ii) قانون نے عورت کے شخصی استقلال کو تسلیم نہیں کیا تھا اس کی حیثیت ایک غلام کی تھی وہ باپ کی غلامی سے نکل کر خاوند کی غلامی میں آ جاتی۔ اس کے کوئی حقوق تھے نہ خاوند کے کوئی فرائض۔ باپ کو اختیار تھا کہ وہ بیٹی کی شادی جہاں چاہے کرے اور اگر اس کی مرضی نہ ہو تو عین شادی کی رسوم کے وقت اسے منسوخ کر سکتا تھا۔ (۴) خاوند کے اختیارات میں اتنی وسعت تھی وہ اپنی بیوی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ (۵)

(iii) جسٹنین کے عہد میں رومی قانون نے منظم صورت اختیار کی لیکن اس قانون نے بھی اشراف کے حقوق کا تحفظ کیا اور کمزوروں کی حمایت میں یہ ناقص رہا۔

(iv) غیر رومی اقوام کے لیے رومی معاشرت میں کوئی عزت کی جگہ نہ تھی۔ غیر رومی ماتحت علاقوں کی دولت تو سمٹ کر رومی معاشرہ میں پہنچ جاتی مگر غیر رومی لوگ ذلت و حقارت سے نوازے جاتے۔ یہودیوں، مسیحیوں اور دیگر غیر رومی اقوام کے ساتھ یہی سلوک ہوتا البتہ ان میں سے چند افراد کو سہولتیں دے کر انہیں ان پر مسلط کر دیا جاتا۔

(v) رومی معاشرت آزاد اور غلام کی تقسیم کا شکار تھی۔ جرائم اور سزاؤں میں اس تفریق کا خاص لحاظ تھا۔ آزاد کے جرم کی سزا کم اور غلام کی زیادہ تھی۔ اسی طرح اشراف اور رعایا کا معاملہ تھا۔

(vi) حکومت اور قانون پر صرف چند افراد کا قبضہ تھا باقی لوگ ان کے رحم و کرم پر ہوتے۔ رومی لشکر کی فتوحات مال

---

(۴) تاریخ اخلاق یورپ ۲/۱۹۰ (۵) ایضاً

غنیمت پر منتج ہوتیں اور وہ مال صرف چند افراد کی فلاح کے لیے استعمال ہوتا۔ دراصل یہ قانون، یہ حکومت، یہ نظام اور یہ اجتماعیت صرف اشراف کے لیے تھا عوام کے لیے نہیں۔ جہاں تک دینی اور اخلاقی قدروں کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے رومی معاشرہ ہمیشہ انتشار کا شکار رہا۔ یونانی فلسفہ مشرکانہ نظریات کا حامل تھا ہی یہودی اور مسیحی افکار نے اس معاشرے کے استحکام کو اور بھی شدید نقصان پہنچایا۔ کوئی مشترک نظریہ حیات نہ تھا۔ مادی منفعتوں نے روحانی قدروں کو متزلزل کر دیا تھا اور برسر اقتدار طبقہ کی عیاشیوں نے دین پسندوں کے لیے ابتلاء کا سامان فراہم کیا تھا۔ مسیحی مبلغین کے ساتھ جو کچھ ہوا اور یہودیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ رومی معاشرے کی تصویر ہے۔ (۶)

رومی قانون کی رو سے معاشرہ تین طبقات میں بٹا ہوا تھا۔

(i) ہونیسٹائرز (Honestoires) اشرافیہ۔ یہ اعلیٰ ترین طبقہ تھا۔ انہیں قانونی تحفظ حاصل تھا اور انہیں بغاوت کے سوا کسی جرم پر سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔

(ii) ہیمولائرس (Humeloires) یہ دوسرا طبقہ ہے جسے کم درجہ کا تحفظ حاصل تھا۔ اس طبقے کے افراد کو غیر معمولی حالات میں سزائے موت دی جا سکتی تھی۔

(iii) سروی (Servi) سب سے کم درجہ کا طبقہ تھا جس کے کوئی حقوق نہ تھے۔ اس سے خدمت لی جاتی لیکن معمولی جرائم کی بنیاد پر قتل، آگ میں جلانے اور درندوں کے سامنے پھینکنے کی سزا دی جاتی۔ (۷)

رومی معاشرہ شہری اور غلام کی تفریق پر مبنی تھا۔ حقوق صرف شہریوں کے تھے۔ غلاموں کے حقوق نہ تھے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی معاشرہ متمدن معاشرہ تھا۔ اس کی تہذیب اس کی اجتماعیت کی بنیاد تھی۔ رومی معاشرہ اچھے شہریوں اچھے اجتماعی شعور اور منظم معاشرتی اہمیت کی تصویر تھا گو بعد میں یہ تصویر مسخ ہو گئی۔ ہماری رائے میں چونکہ اس معاشرے کو صالح بنیادیں میسر نہ آ سکی تھیں اس لیے وہ نتائج برآمد نہ ہوئے جو اچھی معاشرت کے لیے لازمی ہیں۔

ایرانی معاشرہ

ایرانی معاشرہ طویل اجتماعی ورثے کا حامل ہے۔ لیکن اس کی ارتقائی منازل کی بحث یہاں بے محل ہے۔ اس لیے ہم اس وقت کی کیفیات و خصوصیات پر ہی اکتفا کریں گے۔ ایرانی معاشرہ بھی رومی معاشرے کی طرح افتراق و تشتت کا شکار تھا اور اس میں بھی تقریباً وہی امراض پائے جاتے تھے جنہوں نے رومی معاشرت کے جسد اجتماعیت کو کھا لیا تھا۔ طبقاتی تقسیم عروج پر تھی اور اجتماعی احساس مجروح۔ دراصل سکندر مقدونی کے حملے کے بعد کم از کم اثر یہ ہوا کہ فارسی معاشرے کی اجتماعیت

---

(۶) Combridge Medievnl History, 2/06-07 (۷) ایضاً تنظیم المجتمع/۷

ختم ہوگئی کیونکہ اس نے سلطنت فارس کے مختلف حصوں پر اشراف کو مسلط کر دیا تھا۔ اور یہ سیاسی تفرقہ معاشرتی انتشار کا باعث ہوا۔ گو بعد میں سیاسی وحدت کی کوئی صورت بن گئی تھی لیکن معاشرتی انتشار بدستور قائم رہا۔ معاشرتی استحکام زوال پذیر ہونے کے باعث ایرانی معاشرہ عجیب تضادات کا شکار ہوگیا۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور قابل ذکر ہیں (۸):

(i) رومی قانون نے جو طبقاتی تقسیم کی تھی اسی طرح کی تقسیم یہاں بھی کارفرما تھی۔ ایرانی معاشرہ چار طبقات پر مشتمل تھا:

(i) مذہبی طبقہ: آذرواں　　(ii) فوجی طبقہ: ارتشتیاراں

(iii) عمال گروہ: دبیراں　　(iv) ہنرمندی کاشکار: استر بوشال ودہتخشاں

ہر گروہ کے ذمہ کام تھے اور ایک طبقہ کا شخص دوسرے طبقہ میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ چوتھے طبقہ کا کوئی شخص نہ سرکاری ملازم ہوسکتا تھا اور نہ اعلیٰ طبقات کی جائیداد خرید سکتا تھا۔ (۹)

(ii) ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات نے خصوصی کردار ادا کیا۔ مختلف مذہبی اثرات کے تحت اجتماعیت انتشار کا شکار ہوتی چلی گئی مثلاً 'مانی' یہ چاہتا تھا کہ انسان کو ختم ہونا چاہئے تاکہ جہان اس کے شر سے پاک ہو جائے۔ اس نے شادی کو حرام قرار دیا تاکہ انسانیت جلدی ختم ہو۔ اس کی رائے میں انسان ایک لعنت ہے اور اس کی اجتماعی زندگی میں شر و معصیت اور فتنہ وفساد کے سوا اور کچھ نہیں۔ (۱۰) اس کے بعد مزدک آیا اس نے سمجھا کہ شر وفساد کا سبب مال اور عورت ہے اس کی ملکیت پر لوگ لڑتے ہیں اس لیے ان کی ملکیت ختم کر دینی چاہئے اور انہیں مباح قرار دیا جائے اس طرح لوگوں کا کینہ وفساد ختم ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اجتماعی قیود اور اخلاقی حدود ختم ہوگئیں ہر طرف شہوات و ہوس پرستی کا دور دورہ اور بغض وعناد میں اضافہ ہوا۔ حتی کہ مزدک کو قتل کیا گیا (۱۱) اور ایرانی معاشرت از سر نو مجتمع ہونی شروع ہوئی یہ اسلام کے قریبی عہد کی بات ہے۔

(iii) ایرانی معاشرت کے دور ثبات وانتشار میں کوئی اجتماعی ادارہ مستحکم نہ ہوسکا۔ عورت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔ اولاد کی تربیت اور چھوٹے بڑے کے لحاظ کا احساس ختم ہوگیا۔ لے دے کے اگر کوئی بات تھی تو اقتدار کی گرفت تھی جو کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ ایران میں دو قسم کی بیویاں ہوتیں۔ ایک زن پادشائی ہا کہلاتیں اور ان کی اولاد جائیداد کی وارث ہوتی جب کہ دوسری زن چگاری ہا کہلاتیں اور ان کی اولاد جائیداد میں حصہ سے محروم رہتی۔ (۱۱) قانون کی نظر میں عورت کی کوئی وقعت نہ تھی۔ غلام اور بیوی ایک درجے پر تھے۔ (۱۲)

(iv) غلاموں اور کمزوروں کے ساتھ یہاں بھی وہی کچھ ہوتا تھا جو دنیا کے دوسرے معاشروں میں ہوتا رہا۔ انسانیت کی عظمت و برتری کا احساس یہاں بھی مفقود نظر آتا ہے۔ غلام کی موجودگی شرف کی علامت تھی۔ کوئی شخص جتنے

---

(۸) تنظیم المجتمع/۱۱　(۹) ایران بعہد ساسانیاں/۴۲۷

(۱۰) ایضاً/۴۲۷　(۱۱) ایضاً　(۱۲) ایضاً

غلاموں کا مالک ہوتا اتنا ہی معزز و محترم شمار ہوتا۔ رومیوں کی طرح یہاں بھی معمولی جرائم پر غلام کی جان لے لینا ایک عام سی بات تھی۔ (۱۳)

ہندوستانی معاشرہ

ہندوستان جہاں قدیم ترین مذہب کا امین ہے وہاں منفرد معاشرت کا حامل بھی ہے۔ غالباً یہ واحد معاشرہ ہے جس نے رسوم و رواج اور معاشرتی نظم کا مفصل دستور پیش کیا ہے۔ مذہبی' قانونی اور سماجی لحاظ سے تفصیلی قواعد و ضوابط کو مرتب کیا ہے۔ ہندو معاشرت کا خصوصی پہلو اس کا ذات پات کا نظام ہے۔ اس کے مطابق معاشرہ چار ذاتوں پر مشتمل ہے:

برہمن: مذہبی طبقہ جو ویدوں کی تعلیم کا محافظ' مذہبی رسوم کی تنظیم' چڑھاوے دینا' دان لینے کا فرض انجام دینا۔

کشتری: یہ بازوئے شمشیر زن طبقہ ہے جس کا کام دفاع اور حفاظت ہے۔ دان دے' چڑھاوے چڑھائے۔

ویش: یہ طبقہ کھیتی باڑی کرنے والے اور کاروبار کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ چوپایوں کی پرورش اور سود کی وصولی اس کا کام ہے۔

شودر: یہ خدمت گذاروں کا طبقہ ہے۔ اس کا بنیادی کام تو برہمن کی خدمت کرنا ہے لیکن عمومی طور پر پورے معاشرے کا خدمت گذار ہے۔

اس طبقاتی تقسیم کے لحاظ سے شودر ایک پست طبقہ شمار ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت حیوانوں سے بھی بدتر تھی۔ ان کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ انہیں ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ وہ برہمن کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ عام مندروں میں نہیں جا سکتے تھے حتیٰ کہ ویدوں کو سن بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے لیے شدید ترین قوانین تھے۔ انہیں بستیوں کے باہر رہنا اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کو اپنے سایے سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔ اس ظالمانہ نظام نے انسانوں کے ایک بڑے طبقے کو جانوروں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ویدوں کی تعلیم کے مطابق برہمن پرماتما کے منہ سے' کشتری بازوؤں سے' ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔ شودر کی غلامی دائمی ہے۔ برہمن شودر کو خدمت پر مجبور کر سکتا ہے اگر برہمن کو تکلیف پہنچے تو شودر کو قتل کر سکتا ہے۔

عورت کی حیثیت

ہندو معاشرے کی ایک اور خصوصیت عورت کی پست حیثیت ہے۔ ہندو قانون کے مطابق عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچپن میں باپ کے اختیار میں رہے' جوانی میں شوہر کے ماتحت اور بیوہ ہونے کے بعد بیٹوں کے اختیار میں رہے۔

---

(۱۳) تنظیم المجتمع/۱۱

خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔ (۱۴) عورت جائیداد کی وارث نہیں بن سکتی تھی' خاوند عورت کو جوئے میں داؤ پر لگا سکتا تھا۔ خاوند کی وفات پر عورت دوبارہ شادی نہیں کر سکتی تھی بلکہ خاوند کی چتا میں زندہ جل کر مر جاتی۔ عورتوں کی خرید و فروخت ہوتی اور راجہ و مہاراجہ کو لاتعداد بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ (۱۵) ہندو معاشرے میں عورت کی نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ وہ اپنے خاوند پر مر مٹے۔

غلام

ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں میں غلاموں کا ذکر ہے۔ منوسمرتی میں غلامی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں:

(i) جنگ میں گرفتار ہونا۔ (ii) برضا و رغبت غلام بننا۔
(iii) کسی باندی کے ہاں پیدا ہونا۔ (iv) فروخت ہو کر غلام بننا۔
(v) بطور تحفہ دیا جانا۔ (vi) ورثہ میں منتقل ہونا۔
(vii) کسی جرم کی پاداش میں غلام بننا۔

اس کے علاوہ جوئے میں ہار جانے کی صورت میں اور قرض نہ ادا کر سکنے کی صورت میں غلام بننے کی صورتیں بھی موجود تھیں۔ ہندو معاشرہ ایک ظالمانہ معاشرہ تھا جس میں انسانی کرامت اور اخلاقی شرافت کی کوئی قدر باقی نہ تھی۔ ظلم اور فریب پر مبنی یہ معاشرہ ایک دلدل تھا جس میں ہر اخلاقی قدر غرق ہو رہی تھی۔

انسانی اجتماعیت کے عوامل میں دین اور سیاسی و معاشی احساسات کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان معاشروں میں دین کا پہلو تو بہت کمزور نظر آتا ہے۔ البتہ سیاسی و معاشی احساس پایا جاتا ہے۔ یہ معاشرے انسانی زندگی کے ارتقائی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی معاشرہ بھی ایسا نہیں جسے اصولی اور عملی اعتبار سے مکمل معاشرہ کہا جا سکے۔ ان معاشروں کی تشکیل میں جن اصولوں کا تذکرہ ہوتا ہے وہی ناقص اور جن عوامل کی نشان دہی ہوتی ہے وہی کمزور ہیں تو معاشرے کس طرح صحت مند ہوں گے۔

گرد و پیش کے جن معاشروں کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پوری دنیا کی معاشرتی زندگی کی کیا کیفیت ہوگی۔ انسانی معاشرت اس انتظار میں تھی کہ کوئی کامل ترین شخصیت جامع تر تعلیمات کے ساتھ زندگی کے ڈھانچے کو استوار کرے۔ خالق کائنات نے اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے محمد کریم ﷺ کو قرآن مجید دے کر بھیجا تا کہ مثالی معاشرہ قائم کر کے انسانیت کو ابدی نمونہ عطا کر دیا جائے۔

......☆......

(۱۴) منوسمرتی ۹/ ۱۷

(۱۵) تفصیل کے لئے دیکھئے اکبر شاہ نجیب آبادی کی "نظام سلطنت" اور البیرونی کی کتاب "الہند"۔

اسلامی معاشرہ۔نوعیت وخصوصیات

اسلام دین فطرت ہے۔اس نے انسان کے اجتماعی شعور کوملحوظ رکھا ہے۔اسلام انسانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہونے والی اجتماعیت کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس اجتماعیت کی نشوونما میں معاونت کرتا ہے اور اسے ایسے فطری اصول دیتا ہے جن سے اجتماعیت کوتقویت ملے۔وہ اس کے لیے صالح بنیادیں فراہم کرتا اور ایسے عوامل کا قلع قمع کرتا ہے جو اسے بگاڑ دیں یا محدود اور غیر مفید بنادیں۔اسلام فرد کی انفرادیت کو بنیاد قرار دیتا ہے۔فرد اجتماعی زندگی کے لیے جو جمعیتیں بناتا ہے اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا،ان کے لیے اصول وقوانین فراہم کرتا،مفید اور غیر مفید جمعیتوں کی تمیز سکھاتا اور صحیح جمعیتوں کی حدود وقیود بیان کرتا ہے۔مثلاً اسلام وحدت نسل انسانی کا داعی ہے۔وہ کسی ایسی جمعیت کو مستقل نہیں قرار دیتا جو انسانوں میں باہمی تفریق پر منتج ہو جیسے رنگ ونسل،زبان ووطن۔معاشرتی زندگی میں عمومی طور پر انہی بنیادوں سے جمعیتیں بنتی ہیں۔لیکن صرف وقتی اور مکانی مصلحتوں کے لیے ہی مفید ہیں۔انسان کے وسیع تر مفاد کے لیے بالکل مضر ہیں۔اسلام اختلاف کی ان بنیادوں کو غیر فطری قرار دیتا ہے۔

انسان کی پہلی اجتماعی اکائی اس کا خاندان ہے۔اس میں میاں بیوی،والدین،رشتہ دار،ہمسائے اور پھر عام انسانی برادری شامل ہے۔اسلام نے ان میں سے ہر ایک کے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں جو الگ الگ اپنے مقام پر آرہے ہیں۔تاہم اسلام کے معاشرتی نظام کے کچھ بنیادی اصول اور خصوصیات ہیں جن پر سارا معاشرتی ڈھانچہ استوار ہے اس لیے ان اصولوں میں آپ کو اسی شان کی جھلک نمایاں نظر آئے گی۔

وحدت نسل انسانی

اسلام وحدت نسل انسانی کا داعی ہے وہ انسانوں کی محدود تفریق کا قائل نہیں۔ان کے درمیان مخصوص وجوہ (رنگ، نسل،وطن اور زبان) کی بنا پر فضیلت وذلت کو نہیں مانتا۔قرآن پاک نے اس اصول کو یوں بیان کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ(۱)

''اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو۔''

---

(۱) النساء/۱

وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْ بًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَ فُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (۲)

''اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو''۔

عن ابن عمرؓ أن رسول ﷺ خطب الناس یوم فتح مکة فقال: یا ایھا الناس ان اللہ قد اذھب عنکم عبیة الجا ھلیة وتعا ظمھا باٰ با ئھا۔ فا لناس رجلا ن رجل بر تقی کریم علی اللہ وفاجر شقی ھین علی اللہ۔ والناس بنوادم وخلق اللہ ادم من التراب (۳)

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آبا و اجداد پر ہر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ پس لوگ صرف دو قسم کے آدمی ہیں: ایک انسان نیک ہستی جو اللہ کے ہاں معزز ہے اور دوسرا معصیت کار بد بخت اور اللہ کے ہاں بے وزن ہے۔ لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

ابن ہشام نے اس خطبہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

یَامَعْشَر قُرَیش۔ اِنَّ اللّٰہ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ نَخْوتَ الجَاھِلِیّۃِ وَ تَعَظُّمُھا بالآباءِ۔ اَلنَّاسَ مِنْ آدَمَ و آدَم مِنْ تُراب (۴)

اے گروہ قریش اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے۔

لَا فَضلَ لِعَرَبِی عَلَی عَجَمِی وَلَا لِعَجَمِی عَلَی عَرَبِی کُلُّھُم اَبْنَاء آدَمَ و آدَمَ مِنْ تُراب (۵)

کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب لوگ آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے ہے۔

وحدت فکر انسانی

اسلام کا دعویٰ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے جن اصولوں کی ضرورت تھی وہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمجھائے اسے جس بنیادی فکر کی ضرورت اور جس رہنمائی کی احتیاج تھی وہ رب العالمین نے مہیا کر دی۔ انسان نے اسے ضائع کر کے مصنوعی فکری خاکے مرتب کرنے شروع کیے۔ انسانوں کا باہمی فکری اختلاف ان کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکری تشتت نہیں دیا بلکہ فکری وحدت عطا کی تھی، قرآن نے بڑے جامع الفاظ میں اسے بیان کیا ہے۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ. (۶)

(ایک زمانہ تھا) سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی (کے وعدے) سناتے

---

(۲) الحجرات/۱۳ (۳) ترمذی ابواب التفسیر ۲/۱۵۰ (۴) ابن ہشام ۴/۴

(۵) مسند احمد ۵/۴۱۱ (۶) البقرہ/۲۱۳

تھے اور ڈراتے تھے۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ (۷)

بلا شبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (کہ اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کے سبب سے۔

قیام خیر و رفع شر

اسلام ایک ایسا معاشرہ چاہتا ہے جس میں خیر و شر کے پیمانے متعین ہوں۔ اور افراد معاشرہ ان سے سر مو تجاوز نہ کریں۔ اگر تجاوز ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول اپنایا جائے۔ ہر فرد اس پر عمل کرے۔ بدی سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بچانے کے لیے بھی کوشش کرے۔ یہ کوشش انفرادی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی بھی۔ حضور اکرمؐ فرماتے ہیں کہ جس معاشرے میں باہمی خیر کے قیام اور شر کے مٹانے کی سعی نہیں ہوتی وہ بالآخر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے ان امور کی نشاندہی کی جو معاشرے کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ گناہ بھی بتائے جو فرد اور جماعت کے ایمان کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ادارہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بیان کیا۔ اس میں بھی باہمی حسن ظن کو اصل اول قرار دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ محض بدگمانیوں کی بنا پر نہی عن المنکر کو چلائیں۔ وہ امور جن سے افراد معاشرہ کو مجتنب رہنا چاہیے یہ ہیں:

کبائر، بدگمانی، تجسس، حسد و بغض، ناجائز حمایت، غیبت اور جھوٹی گواہی وغیرہ۔ قرآن و سنت میں ہر ایک کے متعلق بہت تفصیلی احکام بیان ہوئے ہیں لیکن ہم اختصار سے صرف چند اشارات نقل کیے دیتے ہیں۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال اجتنبوا السبع الموبقات، قیل یا رسول اللہ وما ھو؟ قال: الشرک باللہ والسحر و قتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق وأکل مال الیتیم وأکل الربا والتولی یوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات (۸)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سات ہلاک کر دینے والی باتوں سے بچو۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون سی باتیں ہیں؟ فرمایا کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اس جان کو مار ڈالنا جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق شرعی کے طور پر مار ڈالنا جائز ہے سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، لڑائی کے روز پشت دکھانا یعنی میدان جنگ یا جہاد سے

---

(۷) آل عمران/۱۹

(۸) مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر/۶۴

بھاگ جانا، پاک دامن مومن اور بے خبر عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا ہے۔

معاشرتی استحکام کے لیے اسلام نے حسن ظن کو بنیادی حکمت عملی قرار دیا۔ قرآن نے فرمایا:

لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (۹)

جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہ کیا جھوٹی خبریں نشر کرنے سے منع فرمایا۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِى الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَايُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۰)

یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں (جھوٹی) افواہیں اڑایا کرتے ہیں اگر باز نہ آئے تو ضرور ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے پھر یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بہت ہی کم رہنے پاویں گے۔

عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ وحوله عصابة من اصحابه: تعالوا بايعوني على ان لا تشركوا بالله شيئا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادكم ولا تأتون بهتان تفترونه بين ايديكم و ارجلكم ولا تعصوا في معروف فمن وفى منكم فأجره على الله ومن اصاب من ذلك شيئا فعوقب به في الدنيا فهو كفارة له ومن اصاب من ذلك شيئا ثم ستره الله عليه فهو الى الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه فبايعناه على ذالك (۱۱)

عبادہؓ ابن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جماعت صحابہؓ کو جو آپ کے گرد جمع تھی (مخاطب کر کے) فرمایا اس امر پر مجھ سے بیعت کرو (یعنی میرے سامنے اس بات کا عہد کرو) کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، کسی پر خود ساختہ بہتان نہ باندھو گے اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پس جس شخص نے تم میں سے (اپنے) عہد کو پورا کیا اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ جس نے اس کے کچھ خلاف کیا اور دنیا میں اس کو اس کی سزا مل گئی تو یہ سزا اس کا کفارا ہے اور جس نے ان میں سے بعض باتوں کے خلاف عمل کیا اور خدا نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خواہ اس کو معاف کر دے خواہ اس کو سزا دے۔ عبادہؓ بن ثامت کہتے ہیں کہ ہم سب لوگوں نے اس پر بیعت کی (یعنی رسول اللہ کے سامنے اس کا عہد کر لیا)

عن أبي هريرةؓ قال/ قال رسول الله ﷺ! إياكم و الظن فان الظن أكذب الحديث و لا تحسسوا و لا تجسسوا و لا تناجشوا و لا تحاسدوا و لا تباغضوا و لا تدابروا و كونوا عباد

---

(۹) النور/۱۲ (۱۰) الاحزاب/۶۰

(۱۱) بخاری، کتاب التفسیر/۷۶۹

الله إخواناً (۱۲)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدگمانی سے بچ کر رہو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑھ کر جھوٹ بات ہے، اور نہ کسی کی راز جوئی کرو اور نہ کسی کی جاسوسی کرو اور نہ قیمت بڑھانے کی بولی دو اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ باہم روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔

عن أوس بن شرحبيلؓ أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: من مشى مع ظالم ليقويه و هو يعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام (۱۳)

اوس بن شرحبیلؓ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: جس نے ظالم کے ساتھ اس کی تقویت کی خاطر قدم اُٹھایا اور وہ اسے جانتا ہے کہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

عن ابی هريرة أن رسول الله ﷺ قال: اتدرون من المفلس؟ قالوا: المفلس فينا يا رسول الله من لا درهم له ولا متاع۔ قال رسول الله ﷺ: المفلس من امتى من ياتى يوم القيمة بصلاة وصيام و زكوة و ياتى قدشتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفك دم هذا و ضرب هذا فيعطى هذا من حسناته و هذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل ان يقضى ما عليه من الخطايا أخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح في النار (۱۴)

ابوھریرہؓ سے (روایت ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے کہا: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ کوئی درھم ہو نہ سامان۔ آپؐ نے فرمایا: میری امت میں مفلس وہ ہوگا جو قیامت کے روز نماز، روزہ اور زکوۃ لائے گا اور وہ ایسے حال میں آئے گا کہ اس نے ایک شخص کو گالی دی ہوگی، ایک اور پر بہتان لگایا ہوگا، اس کا مال کھایا ہوگا اور اس کا خون بہایا ہوگا اور اسے پیٹا ہوگا۔ لہٰذا اس کی نیکیوں میں سے کچھ ایک کو دیا جائے گا اور کچھ دوسرے کو۔ پھر اگر اس کی نیکیاں حساب چکانے سے پہلے ختم ہو جائیں گی تو ان کی خطائیں لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

عن أبى هريرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: أتدرون ما الغيبة؟ قالوا الله و رسوله أعلم۔ قال ذكرك اخاك بما يكره۔ قيل أفرأيت إن كان فى اخى ما اقول؟ قال: إن كان فيه ما تقول فقد اغتبه و إن لم يكن فيه فقد بهته (۱۵)

---

(۱۲) بخاری کتاب الادب، باب ماينهى عن التحاسد ۲/۸۹۶؛ مسلم، باب تحريم الظن والتجسس ۱۱۲۳/۲

(۱۳) مشکوٰۃ، کتاب الاداب، باب الظلم/۴۳۶؛ کشف الخفاء ۲/۳۸۹

(۱۴) مسلم، کتاب البر والصله، باب تحريم الظلم/۱۱۲۹؛ ترمذی، ابواب صفة القيامة ۲/۶۴

(۱۵) ترمذی، ابواب البر والصلة ۲/۱۵ مطبوعہ دیو بند

ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا تیرا اپنے بھائی کو اس سے یاد کرنا جو اسے ناگوار ہو، کہا گیا آپ کا کیا خیال ہے کہ جو میں کہتا ہوں میرے بھائی میں ہو۔ فرمایا: تو جو کہتا ہے اگر اس میں ہو تو تو نے اس کی غیبت کی اور تم جو کہتے ہو اس میں نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امور مہلکہ کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد بھی معاشرتی نظم کا تقاضا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا رہے۔ قرآن وسنت میں اس کے متعلق بھی تفصیلی ہدایات ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (١٦)

تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ بھلے کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (١٧)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کام کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (١٨)

اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔"

عن أبی سیعد الخدریؓ عن رسول الله ﷺ من رأی منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلك اضعف الایمان (١٩)

ابوسعید خدریؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے درست کردے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی (بھی) استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے (برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہوگا۔

عن حذیفةؓ ابن الیمان رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف و لتنهون عن المنکر اولیو شکن الله ان یبعث علیکم عذابا منه فتدعونه

---

(١٦) آل عمران/١١٠ (١٧) آل عمران/١٠٤ (١٨) المائدہ/٢

(١٩) مسلم باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان/١/٥١

فلا یستجیب لکم (۲۰)

حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: قسم اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ تمہیں نیکی کی ضرور ہدایت کرنا ہوگی اور برائی سے ضرور روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اسے پکاروگے اور تمہیں جواب نہ آئے گا۔

عن جریرؓ عن ابیہ قال سمعت النبیؐ یقول: ما من رجل یکون فی قوم یعمل فیہ المعاصی یقدرون علی ان یغیروا علیہ فلا یغیروا اصابھم اللہ منہ بعقاب قبل ان یموتوا (۲۱)

جریرؓ ابن عبداللہ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ کوئی شخص اگر ایسے لوگوں میں رہتا ہو جہاں گناہوں کا ارتکاب ہو اور وہ اسے تبدیل کرنے پر قادر ہو لیکن تبدیل نہ کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کردے گا۔

ان آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ معاشرتی نظم کو ہر قیمت پر برائیوں سے پاک رکھنا چاہیے۔ انفرادی برائیاں بڑھ کر اجتماعی شر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اس لیے اسلامی معاشرہ انہیں آغاز ہی میں ختم کرنے کا انتظام کرتا ہے۔ چونکہ اسلامی معاشرہ باہمی خیر و فلاح کے اصول پر قائم ہے لہذا ہر وہ عمل جو اسے نقصان پہنچائے مٹ جانا چاہیے۔ ان کے علاوہ اسلامی معاشرے میں پاکیزگی، ضبط نفس، لہو و لعب سے اجتناب، رواداری، فاسد رسوم سے کنارہ کشی اور معاشی عدم توازن سے بچاؤ کے اصول بھی نافذ رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے اگر پہلے تین اصول مکمل طور پر اپنا لئے جائیں تو باقی چیزیں از خود ہوتی چلی جائیں گی۔ اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے دو اہم اصولوں کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہیں ہمدردی و ایثار اور انفرادی احساس۔ یہ جذبہ معاشرتی نظم کی روح ہے۔ جس معاشرہ میں اس کا فقدان ہو وہ کبھی اچھا معاشرہ نہیں بن سکتا۔

ہمدردی و ایثار

ہمدردی و خیر خواہی اور ایثار و قربانی کا جذبہ دراصل انسان کی بے غرضی اور خلوص کی دلیل ہے۔ حدیث کی کس میں الحب فی اللہ کے عنوان سے ایک مستقل باب ہے۔ جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جذبے کی خوبصورت مظاہر ہیں۔ مثلاً آپ کسی اچھے کام میں ایک شخص سے تعاون کرتے ہیں۔ وہ اگر مصیبت میں مبتلا ہے تو

---

(۲۰) ترمذی ابواب الفتن باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، ۳۹/۲

(۲۱) ابوداود، کتاب الملاحم، باب الامر والنہی/ ۶۱۰، ابن ماجہ نے الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسے نقل کیا ہے' کتاب الفتن باب المعروف والنہی عن المنکر/ ۵۲۶: ما من قوم یعمل فیہم بالمعاصی ہم أعزّ منہم و أمنع، لا یغیرون إلا عمّہم اللہ

آپ اس کی مدد کرتے ہیں۔ وہ کہیں زیادتی کرنے لگتا ہے تو آپ اسے عدل طریق سے روک لیتے ہیں۔ آپ ... اس طرح کا ہے کہ آپ دوسروں کے لیے مضرت رساں نہیں ہیں۔ آپ کی ذات سے لوگوں کو فائدے ہی پہنچتے ہیں نقصان کبھی نہیں پہنچتا۔ قرآن وسنت نے اسے مختلف پیرایوں میں بیان کیا:

عن أبی امامةؓ عن رسول الله ﷺ انه قال: من أحب لِلّٰه وابغض لله واعطی لله و منع لِلّٰه فقد استکمل الایمان (۲۲)

ابی امامہؓ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جس شخص نے محبت کی خدا کے واسطے اور بغض رکھا خدا کے واسطے اور دیا خدا کے واسطے اور منع کیا خدا کے واسطے کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

عن أبی ذرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: افضل الأعمال الحب فی الله والبغض فی الله (۲۳)

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کے لیے محبت کرنا اور خدا کی راہ میں بغض رکھنا بہترین اعمال میں سے ہے۔

عن عبد الله بن عمروؓ عن النبی ﷺ قال: المسلم من سلم المسلون من لسانه ویده والمهاجر من هجر ما نهی الله عنه (۲۴)

عبداللہ بن عمروؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں اور مہاجر وہ ہے جو اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده والمومن من اَمِنَه الناس علی دماءِ هم واموالهم (۲۵)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ (وماموں) رہیں اور مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں پر محفوظ رہیں۔

عن ابی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ الساعی علی الأرملة والمسكين كالساعی فی سبيل الله واحسبه قال كالقائم لا يفتر و كالصائم لا يفطر (۲۶)

---

(۲۲) ابوداؤد، کتاب السنة، ۲/۲۴۳

(۲۳) ایضاً، ۵/۷، مطبع دارالحدیث دمشق

(۲۴) بخاری، کتاب الایمان باب المسلم من سلم المسلمون، ۱/۶

(۲۵) ترمذی، کتاب الایمان باب ماجاء فی أن المسلم من سَلِمَ مسلم المسلمون/۵۹۷، نسائی کتاب الایمان باب صفة المؤمن/۲۸۶

(۲۶) مسلم فضل الاحسان الی الارملة، ترمذی ۲/۳۱۱ مطبوعہ کراچی

ابوھریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: محتاج، بے شوہر عورت اور مسکین کے لیے سعی کرنے والا اللہ کی راہ میں مجاہد کی طرح ہے اور میرا گمان ہے کہ آپ نے فرمایا وہ اس شب خیز کی طرح ہے جو ناغہ نہیں کرتا اور اس روزہ دار کی طرح ہے جو روزہ نہیں کھولتا۔

عن انسؓ عن النبیؐ، قال: لایومن أحدکم حتی یُحب لأخیه او قال لجاره مایحب لنفسه (۲۷)

انسؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے یا اپنے پڑوسی کے لیے بھی وہ بھلائی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔

عن تمیم الداریؓ أن النبی ﷺ قال: الدین النصیحه ثلاثاً قلنا لمن؟ قال لله ولکتابه و لرسوله و لائمة المسلمین و عامتهم (۲۸)

تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین بار فرمایا: دین خلوص ہے۔ ہم نے پوچھا کس کے لیے؟ فرمایا اللہ کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور مسلمانوں کے رہنماؤں کے لیے اور ان کے عوام کے لئے۔

عن أبی الدرداءؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: ما من مسلم یرد عن عرض اخیه إلا کان حقاً علی الله ان یرد عنه نار جهنم یوم القیامه (۲۹)، ثم تلا هذه الآیة کان حقاً علینا نصر المؤمنین (۳۰)

ابودرداءؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان اپنے بھائی کی عزت کا بچاؤ کرتا ہے اللہ پر لازم آ جاتا ہے کہ قیامت کے روز اسے جہنم کی آگ سے بچائے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وکان حقاً علینا نصر المؤمنین. اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

عن أنسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالما أو مظلوما۔ قال یا رسول الله: هذا ینصره مظلوما فکیف ینصره ظالما؟ قال تاخذ فوق یدیه (۳۱) وفی روایة: تمنعه من الظلم فذلك نصرك إیّاه.

---

(۲۷) مسلم، باب الدلیل، علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه، ۱/۵۰

(۲۸) مسلم، باب بیان ان الدین نصیحة/۵۴۱

(۲۹) شرح السنة، باب الذب عن المسلمین، ۱۳/۱۰۶

(۳۰) الروم/۴۷

(۳۱) بخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب اعن اخاک ظالما او مظلوما، ۱/۳۳۱۔ مترجم اردو، مسلم، کتاب البر والصلہ، انصر اخاک ظالما او مظلوما، ۹/۲۱۹

انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا وہ مظلوم۔ تو ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اس کی مظلومی میں (تو) مدد کروں گا پر اس کے ظلم کرنے میں کس طرح اس کی مدد کروں؟ آپ نے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑو اور ایک روایت میں ہے کہ تو منع کرتا ہے اس کو ظلم سے تو وہ تیری اس کے لیے مددگاری ہے۔

عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ ﷺ قال: المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه و من کان فی حاجة اخیه کان اللہ فی حاجته ومن فرج عن مسلم کربة فرج اللہ عنه کربة من کربات یوم القیامة و من ستر مسلماً ستره اللہ یوم القیامة (۳۲)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس سے کنارہ کرتا ہے اور جو آدمی اپنے بھائی کی حاجت روائی میں رہے اللہ اس کی حاجت روائی میں رہتا ہے اور جس نے کسی مسلمان سے ایک دکھ ہٹایا اللہ نے اس سے روز قیامت کے دکھوں سے ایک دکھ دور کر دیا اور جس نے کسی مسلمان پر پردہ ڈالا اللہ نے اس پر قیامت کے روز پردہ ڈالا۔

ان احادیث سے وہ معاشرتی ہمدردی بخوبی واضح ہو جاتی ہے جسے ہم نے ایک اچھے معاشرے کے لیے ضروری قرار دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے معاشرتی ہمدردی اور خیر خواہی کے تمام امکانی پہلو واضح فرمائے ہیں۔ آپ کے ارشادات میں سے چند ایک درج کئے گئے ہیں۔ کتب حدیث کے اوراق ان ہدایات سے بھرے پڑے ہیں جن سے ایک اچھی معاشرت قائم ہو سکتی ہے۔

احساس ذمہ داری

اجتماعی شعور پیدا کرنے، اسے بیدار رکھنے اور مؤثر بنانے کے لیے اسلام نے جو اقدامات کئے ہیں ان میں بہت اہم فرد کا اپنا احساس ہے۔ فرد کو اس امر کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کا تنہا ذمہ دار ہے۔ جو سزا اسے ملتی ہے اسے کوئی اور نہیں اٹھائے گا۔ معاشرتی جرائم کی ایک سزا تو اجتماعی ہے جسے معاشرہ ہی نافذ کرتا ہے لیکن اس کا انفرادی معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے۔ جسے اس کو ہی نبٹانا ہے کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوگا۔ لہٰذا اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور اپنا فرض پورا کرنے میں دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ اسے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ فلاں شخص نیکی نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں؟ اسے صرف اپنا دامن گناہوں سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس کا معاشرتی فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنا احتساب کرتا ہے اپنی اصلاح کرتا ہے اور اپنی برائیوں کے لیے دوسرے کو نمونہ نہیں بناتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اکا دکا کہیں کسی ناز یبا حرکت کا ارتکاب کر بیٹھے تو وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ عریاں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح کی

---

(۳۲) بخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب لا یظلم المسلم المسلم، ۱/۳۳۰

طرف مائل ہو جاتا ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۳۳)

اپنی فکر کرو جب تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۳۴)

اور جو کوئی (برا) فعل کرتا ہے تو اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

إِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا(۳۵)

اگر اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لیے اچھے کام کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو (ان کا) وبال بھی تمہاری جانوں پر ہو گا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ اصلاح کی اجتماعی ذمہ داری سے بری ہو گیا وہ ذمہ داری اس کے سر ہے حضور ﷺ نے اسے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

عن عبد الله بن عمر رضی اله عنه إن رسول الله ﷺ قال: الا كلكم راع وكلكم مسؤلٌ عن رعيته(۳٦)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم سب نگران ہو اور تم سب اپنے ماتحتوں کے بارے میں جوابدہ ہو۔

اسلام کا معاشرتی نظام ان اصولوں پر قائم ہے اور اپنی خصوصیات کی بدولت دنیا کے تمام معاشرتی نظاموں سے مختلف اور منفرد ہے۔اسلام کا معاشرتی نظام خیر و صلاح، طہارت و تقدس، ہمدردی و خیر خواہی اور اعتدال و توازن پر قائم ہے۔اس نظام میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی بہبود کا پورا انتظام موجود ہے۔معاشرتی آداب کی تنظیم اور ان کی فائدہ مندی کا اندازہ آپ کو اس تفصیل سے ہو سکے گا جو اسلام نے مہیا کی ہے۔

......☆......

(۳۳) المائدہ/۱۰۵

(۳۴) الانعام/۱٦۴

(۳۵) بنی اسرائیل/ ۷

(۳٦) بخاری، کتاب الاحکام/۲،/۵۷

شرفِ انسانیت

تصورِ انسان

کائنات گوناگوں موجودات کا مرقع ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک قدرت کی کرشمہ سازی کا مظہر ہے۔ لیکن ہمارے پیشِ نظر موجودات کی تفصیلی بحث نہیں۔ ہم سہولت کے لیے صرف فلاسفہ کی اس تقسیم کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے موضوع سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ فلاسفہ نے اشیاء کائنات کو تین نام دیئے ہیں۔ جمادات' نباتات اور حیوانات یعنی شعور مادے اور پھر وہ جن کے اندر نشو و ارتقاء ہوتا ہے تیسری قسم میں وہ جن میں نشو و ارتقاء کے ساتھ حرکت و ارادہ بھی پایا جاتا ہے۔ پس آخری قسم میں مخلوق کی وہ نوع بھی ہے جس میں تمام حیوانی اوصاف کے ساتھ عقل و شعور اور سلیقہ گفتار کے جوہر بھی موجود ہیں۔ کائنات کی یہی انوکھی مخلوق ہے جو علم الاجتماع میں خصوصی موضوع کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ حضرت انسان ہیں جو شاہکار فطرت ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ پستیوں کی انتہاء تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ انسان کی شخصی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ انسان متضاد کیفیتیں رکھتا ہے وہ ظالم و مظلوم' عالم و جاہل' عابد و معبود' شاہ و غلام' صاحب اقتدار اور بے بس سب کچھ ہے۔ اس کی انہی متنوع خصوصیات کی وجہ سے علمائے اجتماعیت کو دقت پیش آتی ہے کہ کس انسان کو نمائندہ تسلیم کیا جائے؟ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ انسان کی فضیلت کیا ہے؟ اس کا حقیقی مقام کیا ہے؟ مقامِ انسانی کو متعین کرنے کی کوششیں دو قسم کی ہیں۔ ان لوگوں کی کوشش جو مذہب کو بنیاد تصور نہیں کرتے اور ان لوگوں کی جو مذہب کو بنیادی سرمایہ تصور کر کے چلتے ہیں۔ ان کوششوں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ہم اس حیثیت میں ہوں گے کہ اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں۔

غیر مذہبی کاوشیں

انسان چونکہ حیوانی قوتیں بھی رکھتا ہے اس لیے غیر مذہبی ذہنوں کو انسانی تخلیق اور اس کی حرکات و سکنات کے اندر حیوانیت نمایاں نظر آئی۔ اس نے ارتقاء کے ذریعے انسان کا رشتہ حیوان سے جوڑ دیا۔ ڈارون (۱) نے اپنے نظریہ ارتقاء میں کہا کہ زندگی کا آغاز نچلی سطح سے مختلف (Species) انواع کے ذریعہ ہوا۔ اس کے بعد تمام انواع میں ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارتقاء خالصتاً میکانکی قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا۔ ان قوانین میں طبعی انتخاب (Natural selection) ماحول کے ساتھ مطابقت (Adoptability to the environment) اور بقاء اصلح (Survival of the

---

(۱) انگلستان کا ماہر حیاتیات: Charles Darwin (1980 - 1882)

fittest) یہ آخری اصطلاح ڈارون نے ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer 1820-1903) سے مستعار لی ہے۔

ہر نوع آہستہ آہستہ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی کمزور اور غیر صالح فنا ہوتی رہیں اور صلاحیت والی انواع باقی رہیں اور بالآخر انسانی پیکر وجود میں آیا۔ انسان بھی میکانکی قوانین کے مطابق جی رہا ہے اور انہی قوانین کے مطابق ختم ہوتا جائے گا۔ اس نظام ارتقاء میں کسی خارجی قوت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی مقصدیت پائی جاتی ہے۔ حیات کی یہ تعبیر مادیین (Materialists) ہی کے فلسفہ پر کی گئی ہے۔ جس کا ایک نمائندہ مشہور جرمن فلسفی برگساں (Henry Bergson) ہے۔ اس نے نظریہ ارتقاء کو مابعد الطبیعاتی قوت سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تمام کائنات کسی ہستی کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ایک خاص مقصد کے تحت ظہور میں آئی ہے اور ارتقاء وغیرہ اس منزل کی طرف بڑھنے کے ذرائع ہیں جو میکانکی طور پر پیدا نہیں ہو گئے۔ برگساں اس قوت کا نام (Elanvital) رکھتا ہے۔ اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے گیلووے (Galloway) کہتا ہے!

جب تم کسی چیز کو علت و معلول کے تمام قاعدے کی رو سے سمجھا نہ سکو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ یہ کہہ دو کہ فطرت یا خالق فطرت نے یہ سب کچھ کسی خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ (۲)

جن لوگوں نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا انہوں نے بھی بنیادی حیوانی خواہشات ہی کو انسانی اعمال کا ضابطہ قرار دیا ہے۔ اس سے انسان کی حیثیت کا ایک پہلو تو واضح ہو گیا لیکن ظاہر ہے کہ انسان کا فقط یہی ایک پہلو تو نہیں۔ پھر انہوں نے بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے اصول سے انسان کے مفید اور غیر مفید ہونے کا جو مادی معیار مقرر کیا وہ بھی ایسا نہیں ہے کہ اسے ابدی اصول بنا لیا جائے اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے انسان کی مجموعی حیثیت متعین نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو بعض افراد زیادہ قوت اور صلاحیتیں رکھنے کی وجہ سے حق بجانب ہوں گے کہ وہ کمزوروں کو دبوچ کر انہیں ختم کر دیں۔ یہ انسان کا ایک پہلو ہے۔

فلسفہ مادیت کے پیرو کائنات کی مادی تعبیر رکھتے تھے اس لیے انہوں نے انسان کو بھی میکانکی نقطہ نظر سے دیکھا گویا انسانی جسم ہی سب کچھ ہے اور انسان بھی طبعی قانون علت و معلول کے ماتحت میکانکی طور پر ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا انسان صاحب اختیار و ارادہ نہیں بلکہ میکانکی قوانین کی محسوس و غیر محسوس زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

بعض دوسرے لوگوں نے انسان کی فطرت کا تجزیہ کر کے اس کی جبلتوں کا کھوج لگایا اور نتیجہ یہ نکالا کہ جنس و شکم پر ہی اس کی تمام تر جدوجہد کا دارومدار ہے۔ کبھی کبھی ان جبلتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بے ہنگم حرکتیں بھی کر بیٹھتا ہے مگر اکثر اوقات سلجھے ہوئے طریقے پر اپنی ضروریات کو خوش سلیقگی سے ترتیب دیتا اور خواہشات کی تکمیل کے لیے نئے اسلوب اختیار کرتا ہے میکانکی تصور کے بارے میں علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

---

(۲) Philosophy of Religion.

زندگی کا مسئلہ ایک منفرد مسئلہ ہے اور اس کے تجزیے کے لیے میکانکی تصور بالکل ناکافی ہے ڈریش (Driesch) کی اصطلاح میں اس کی (Factual Wholeness) ایک ایسی وحدت ہے جو ایک اور نقطہ نگاہ کے مطابق کثرت بھی ہے۔ زندگی ایک مقصد کے لیے نشوونما پاتی ہے اور اسی مقصد کے لیے اپنے ماحول سے تطابق اختیار کئے جاتی ہے (خواہ یہ تطابق نئے عادات و اطوار اختیار کرنے سے حاصل ہو یا قدیم عادات میں ردو بدل کر لینے سے) اس طرح زندگی ایک (Career) کی حامل بن جاتی ہے اور مشین کے لیے (Career) کا تصور ہی ناممکن ہے۔ Career کے حامل ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی عملی قوتوں کا سرچشمہ بہت دور زمانہ ماضی میں واقع ہے جس کی ابتداء ایک روحانی حقیقت (Spiritual Reality) سے ہوتی ہے جسے کوئی مکانی تجربہ (Spacial experiment) دریافت نہیں کرسکتا۔ البتہ وہ حقیقت اپنے آپ کو مکانی تجربہ پر واشگاف کرسکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی ایک بنیادی حقیقت ہے اور طبیعاتی اور کیمیائی طریق عمل کی ابتداء سے پہلے موجود ہے۔ اس طریق عمل کے متعلق اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ زندگی کا ایک متعین عمل ہے جو اس نے ارتقاء کے طولانی دور میں اختیار کرلیا ہے۔ (۳) اقبالؒ میکانکی تصور حیات کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

سائنس زندگی کا احاطہ نہیں کرسکتی (سائنس صرف مشینوں کا احاطہ کرسکتی ہے جو بندھے ہوئے قواعد کے ماتحت نقل وحرکت کرتی ہیں) علم الحیات کا وہ ماہر جو چاہتا ہے کہ زندگی کی میکانکی تعبیر مل جائے وہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کو زندگی کی ابتدائی اور پست سطح تک محدود رکھتا ہے جہاں وہ دیکھتا ہے کہ زندہ اشیاء کا طور طریق مشین سے ملتا جلتا ہے۔ اگر وہ اس زندگی کا مطالعہ کرے جس کا مظہر خود اس کی ذات ہے۔ یعنی وہ اپنے اس دل کا مطالعہ کرے جو اپنے لیے آپ فیصلے کرتا ہے' کسی چیز کو اختیار کرتا ہے کسی کو مسترد کردیتا ہے' سوچتا ہے ماضی اور حال کا جائزہ لیتا ہے اور ابھرنے والی قوتوں کے ساتھ مستقبل کا تصور کرتا ہے تو وہ یقیناً اس امر کا اعتراف کرے گا کہ زندگی کے متعلق اس کا میکانکی تصور بالکل ناکافی ہے (۴)۔

اگرچہ مغرب میں فلسفیوں نے اس میکانکی تصور کو رد کردیا ہے اور انسانی نفس (mind) اور شعور کے حوالے سے شاندار بحثیں کی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان کی حیثیت کے بارے میں سب آراء ظن وتخمین پر مبنی ہیں۔ اہل منطق انسان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ گویا وہ حیوان تو ہے لیکن جو چیز اسے حیوان سے ممتاز کرتی ہے وہ نطق ہے لیکن فلاسفہ کے ہاں نطق کے اور امتیازات بھی ہیں مثلاً شعورِ ذات (Self consciousness) وغیرہ۔ جہاں تک شعور سادہ (Simple consciousness) کا تعلق ہے وہ تو حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے لیکن شعور ذات صرف انسانی خاصہ ہے۔ G. G. Simpson کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی ایک حیوان ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ انسان صرف حیوان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف حیوان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان تمام

---

(۳) Reconstruction of Religious Thought in Islam / 42.

(۴) Ibid / 49.

خصائص کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو صرف انسان کے اندر ہیں اور باقی حیوانات میں سے کسی میں موجود نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں۔ فطرت میں انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے۔ انسان ایک بالکل نئی قسم کا حیوان ہے۔ ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس میں ایک بالکل نئی قسم کا ارتقاء بھی نمودار ہو رہا ہے (۵)۔

انسان حیوانی جبلتوں کا مجموعہ

میگڈوگل کے مطابق ایک حیوان کے سارے افعال جبلتوں کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں۔ جبلت عمل کا ایک اندرونی حیاتیاتی دباؤ ہے جس کے لیے حیوان کے نظام عصبی یا دماغ میں خاص مراکز موجود ہوتے ہیں۔ ہر جبلت کی قدرتی فضیلت ایک خاص اندورنی یا بیرونی تحریک (Stimulus) کے ماتحت ایک خاص مدعا کے ساتھ اور ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت یا عاطفہ (Emotion) کی ہمراہی میں شروع ہوتی ہے اور جب تک مدعا حاصل نہیں ہو جاتا برابر جاری رہتی ہے۔ جبلتوں کے عمل کی قدرتی غرض یہ ہے کہ فرد کی حیوانی زندگی اور نسل باقی رہے۔ انسان کے اندر بھی وہی جبلتیں ہیں جو اس سے نچلے درجے کے حیوانات میں موجود ہیں کیونکہ جہاں تک بقائے حیات اور نسل کا تعلق ہے انسان کی ضروریات بالکل وہی ہیں جو حیوان کی ہیں۔ وہ کہتا ہے: انسان کے سارے افعال کا اصل منبع اس کی جبلتیں ہیں ہر سلسلہ خیالات خواہ وہ کیسا خشک اور خالی از جذبات نظر آتا ہو کسی نہ کسی جبلت کی قوت محرکہ کی وجہ سے اپنے مقصد کو پہنچتا ہے۔ ایک انتہائی درجہ کے ترقی یافتہ ذہن کی فکری مشین کے تمام پرزے مل کر صرف ایک ایسے آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعے سے یہ جبلتیں اپنی تسلی اور تشفی حاصل کرتی ہیں۔ ان جبلتی خواہشات کو ان کے زبردست مادی حیاتیاتی پرزوں سمیت انسان کے دماغ سے خارج کر دیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ جسم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ کسی قسم کی سرگرمی یا عمل کا اظہار کر سکے۔ وہ قطعاً بے عمل اور بے حرکت ہو جائے گا جیسے کہ عجیب وغریب گھڑی جس کی کمانی الگ کر لی گئی ہو۔ (٦)

ہم دیکھتے ہیں کہ حیوان کی تمام جبلتیں محبت و جذب سے تعلق رکھتی ہیں یا نفرت و دفع ضرر سے متعلق ہیں۔ حیوان کے تمام افعال جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور ان تمام افعال کا حاصل یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف جذب کا اظہار کرتا ہے جو اس کی زندگی اور نسل کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں اور ان تمام اشیاء کو دفع کرتا ہے جو اس کی زندگی اور نسل کو برقرار رکھنے کے مقصد میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہوتی ہیں مثلاً جبلت جنس (Sex instinct) جبلت تغذیہ

---

(۵) The Meaning of Evolutional 137 - 39

(٦) Social Pychology

(Feeding) جبلت امومت (Maternal instinct) جبلت اجتماعی (Gragarian) جبلت انقیاد (Submission) سب جذب یا محبت سے پیدا ہوتی ہیں اور جبلت فرار (Flight)، جبلت غضب (Pugnacity)، اور جبلت تفوق (Assertion or supermacy) جذبہ نفرت یا مدافعت سے ماخوذ ہیں۔ میکڈوگل محبت و نفرت کے جذبوں کے علاوہ ایک تیسرے جذبہ کا ذکر بھی کرتا ہے اور وہ ہے جذبہ احترام و عزت (Respect) جس کی بنا پر انسانی اعمال اور رویوں کی تحریک ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ انسان صرف ایک ہی جذبہ رکھتا ہے اور وہ جذبہ محبت ہے نفرت کا جذبہ اسی کے تحت محبوب کی نقیض کے خلاف محبت کی تکمیل اور اعانت کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ (۷)

میکڈوگل کا نظریہ ہے کہ انسان ایک حیوان ہے جس کا کوئی فعل ایسا نہیں جو اس کی کسی نہ کسی جبلت کے منبع سے سر زد نہ ہوتا ہو۔ جب تک انسان کو کوئی جبلت نہ اکسائے وہ کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کام کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ میکڈوگل کے نزدیک حیوان اور انسان میں صرف ایک ہی امتیاز ہے اور وہ یہ کہ انسان میں عقل کا وصف ہے اور حیوان میں نہیں۔ حیوانی جبلتوں کا نظام انسان میں ایک جذبہ پیدا کرتا ہے جو حالات اور واقعات کے تحت ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اتفاقاً جبلتیں مل کر ایک جذبہ ذات اندیشی پیدا کرتی ہیں جو اس کے جملہ اقدامات کا محرک ہوتا ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جذبہ ذات اندیشی انسان ہی کے ساتھ کیوں مختص ہے ان جبلتوں کے ذریعہ یہ حیوان میں کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ظن و تخمین پر مبنی دانشوری سے اسی طرح کا کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔

انسان ایک مغلوب الشہوت حیوان

فرائڈ نے انسانی شخصیت کا تجزیہ اس کی جنسی خواہش سے کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کی ایک ہی جبلت کام کر رہی ہے وہ جنسی خواہش (Sexual desire) ہے۔ اس نے اس تصور پر مبنی شخصیت کا ایک ہیولیٰ تیار کیا ہے جس میں لاشعور، شعور اور فوق الشعور اپنا کام کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''انسانی شخصیت یا نفس انسانی صرف وہی نہیں جسے ہم شعور کہتے ہیں اور جس کی مدد سے سوچتے، جانتے اور محسوس کرتے ہیں اور گرد و پیش کے حالات میں تغیر پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ نفس انسانی کا ایک ایسا حصہ بھی ہے جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے۔ فرائڈ کے نزدیک انسان کی ساری شخصیت یا نفس انسانی لاشعور ہی ہے اور شعور اس کا ایک جزو ہے جو بیرونی دنیا کا جائزہ لینے کے لیے اوپر ابھر آیا ہے۔ نفس انسانی کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر میں تیرتا ہوا برف کا ایک تودہ، جو اپنے ایک نہایت ہی قلیل قریباً دسویں حصہ کے سوا تمام کا تمام سطح سمندر سے نیچے ہوتا ہے۔ ...... بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شعور کو لاشعور سے وہی تعلق ہے جو سمندر کی جھاگ کو سمندر سے ہے کیونکہ لاشعور کے تمام مشمولات و متضمنات یعنی ہمارے تمام جذبات، محسوسات اور خیالات

(۷) قرآن اور علم جدید/۲۴۴

لاشعور ہی سے آتے ہیں۔"

لاشعور میں ایک طوفان تمنا ہر وقت موجزن رہتا ہے اور یہ تمنا ایک زبردست جنسی خواہش ہے جسے یہ مرد اور عورت کا لاشعور غیر متناہی حد تک مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن لاشعور اپنی جنسی خواہشات کو شعور کے ذریعہ پوری کر سکتا ہے لہٰذا وہ شعور کو مجبور کرتا ہے کہ اس کی تسکین کا سامان مہیا کرے۔ معاشرتی ضوابط کی وجہ سے شعور تعمیل نہیں کر سکتا اور یوں لاشعور کو اپنی خواہشات کو روکنا پڑتا ہے۔ لیکن اس رکاوٹ کے نتیجے میں انسان کو بے چینی اور بے قراری لاحق ہوتی ہے جو دماغی امراض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ فرائڈ لکھتا ہے:

"لاشعور ابلتی ہوئی خواہش کی ایک دیگ ہے۔ اس کے اندر کوئی نظم اور کوئی سوچا سمجھا ہوا ارادہ نہیں۔ صرف لذت کی خاطر جنسی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ ہے۔ منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول لاشعور کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے۔ مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ فلسفی کا یہ دعویٰ کہ وقت اور یہ فاصلہ ہمارے افعال کے لازمی عناصر ہیں، لاشعور کی دنیا میں غلط ہو جاتا ہے۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے علاقہ رکھتی ہو۔ لاشعور میں وقت گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے، جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت گزرنے سے لاشعور کے عمل میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ایسی خواہشات عمل جو لاشعور سے کبھی باہر نہیں آئیں بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنہیں روک کر لاشعور میں دبایا گیا ہو، لاشعور میں ہر لحاظ سے غیر فانی ہوتے ہیں۔ اور سالہا سال تک اس طرح محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔"

مختصر یہ کہ فرائڈ کے نزدیک انسان ایک مغلوب الشہوت حیوان ہے جسے قدرت نے ذیل کے تین متبادل طریق ہائے کار میں سے ایک کے اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا ہے:

(i) وہ اپنے لاشعور کی حد درجہ شرمناک جنسی خواہشات کو پوری آزادی اور بے حیائی سے مطمئن کرے۔ بے شک معاشرہ اسے برا سمجھے گا لیکن اسے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ معاشرے کی پرواہ کرے۔

(ii) وہ معاشرے کے خوف سے اپنی طاقت ور جنسی خواہشات کو دبائے اور پھر تشویش، ہسٹیریا، جنون، خوف اور پریشانی وغیرہ جیسے دماغی امراض میں مبتلا ہو جائے۔

(iii) وہ اپنی جنسی خواہشات سے قطع نظر کر کے، ان کی بجائے مذہب، اخلاق، علم اور ہنر ایسی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو دھوکہ دیتا رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی خوب یاد رکھے کہ ان سرگرمیوں کی حقیقت ایک وہم سے زیادہ نہیں اور دراصل ان کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس کے دکھے ہوئے دل کو بہلانے فریب کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔

انسان احساس تفوق کا مجسمہ

فرائڈ کا شاگرد ایڈلر جو اس کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا اپنے استاد کے ساتھ لاشعور کے وجود پر متفق ہے، اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہے کہ مذہب' اخلاق' فلسفہ' علم' ہنر اور انسان کی دوسری اعلیٰ سرگرمیاں معاشرے کی مخترعات ہیں اور ان کی قدر و قیمت فرضی ہے۔ تاہم وہ اپنے استاد سے اس مسئلہ پر اختلاف رکھتا ہے کہ لاشعور میں جنسی خواہش کا طوفان بپا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی زندگی کی ساری تگ و دو کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر غالب کرے۔ بچپن میں جب وہ اپنے والدین اور دوسرے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں کمزور و ناتواں پاتا ہے اور وہ اپنی قوت اور برتری کی وجہ سے اس پر حکمران ہوتے ہیں اور احساس تفوق اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ غلبہ حاصل کرے تاکہ مغلوبیت سے نجات بھی حاصل کرے اور غلبے کے فوائد بھی سمیٹے۔ اس کی ساری زندگی اس تگ و دو میں گزرتی ہے کہ کمزوری کی تلافی کرے اور قوت حاصل کر کے دوسروں کو مغلوب کرے۔ ایڈلر کے نزدیک انسان ایک ایسا وجود ہے جو دوسروں کو مغلوب کرنے کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ ایڈلر کے نزدیک طاقت کی خواہش جذبہ لاشعور کا ایک جز نہیں بلکہ سارا جذبہ لاشعور ہے۔ اس کے نزدیک طاقت کے علاوہ جو چیز بھی انسان چاہتا ہے وہ طاقت ہی کے لیے چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک طاقت انسان کی تمام خواہشات میں سے مرکزی اور بنیادی خواہش ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ انسان اپنی خواہشات کے لحاظ سے پست سطح کا حیوان ہے' فرق صرف اتنا ہے کہ وہ صاحب عقل ہے اور خود شعوری کے مقام پر فائز ہے۔ اور اسے یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ عقل کو کام میں لا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق عقل انسانی خواہشات کی ترتیب و تکمیل میں لگی رہتی ہے۔ فی الحقیقت عقل انسانی خواہشات انسانی کی باندی ہے جو ان کے لیے راہیں تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس طرح انسان ایک سلجھے ہوئے حیوان سے زائد اور کچھ بھی نہیں۔ مکمل انسان کی وہ عظیم الشان تصویر اس سے بھلا کہاں ابھرتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ انسان واقعی شاہکار فطرت ہے؟ جنس و شکم کی تسکین اور خوف کا اظہار تو عام درجے کا حیوان بھی کر لیتا ہے اگر انسان نے ذرا سلجھاؤ اور سلیقہ اپنا لیا تو کیا ہوا یہ کمال انسانیت نہیں ہے۔ کمال انسانیت تو ابھی محتاج بیان ہے۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے تو روئے زمین پر جو ظلم و زیادتی ہوتی اور جس قدر حقوق پامال ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک جائز قرار پاتے ہیں۔ بادشاہ' سپہ سالار' امراء اور دوسرے شہ زور لوگ اپنے اپنے مفاد کے لیے جو کچھ کرتے ہیں وہ درست اور انسان جن خواہشات کی تکمیل کرتا ہے وہ بالکل روا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین کے ہاں انسان کے بارے میں جو خیالات ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

ارسطو کے مطابق انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ دو ٹانگوں والا جانور ہے۔ اور روسو کے نزدیک انسان ایک وحشی ہے البتہ اس کو سدھایا جا سکتا ہے۔ ہابز کی رائے میں ایک انسان دوسرے کے لیے بھیڑیا ہے۔ ہیوم انسان کو بدمعاش تصور

کرتا ہے اور سارتر کے بقول انسان ایسا جانور ہے جس کو عقل و خرد سے بیگانہ بنا کر دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔ مغربی مفکرین کی رائے کے مطابق اگر انسان ایسا ہی شریر حیوان ہے تو پھر معاشرہ بھی ایسا ہی تخلیق کرے گا۔

میکانکی نظریہ کے مطابق انسان مادی عناصر کی ترتیب سے ظہور میں آ گیا ہے۔ چونکہ مادہ میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں اسی لیے انسان بھی ہر آن تبدیل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر مادی اجزاء کے تشتت و انتشار سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن اب یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ: ''ہر انسان دو ہستیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو جمادات، نباتات اور حیوانات کا مرکب ہے۔ یعنی وہ انسان جو زمان و مکان کی دنیا میں رہتا ہے دوسرا وہ جس کی دنیا اس سے الگ ہے۔ پہلی قسم کا انسان ماضی سے متعلق ہے اور دوسری قسم مستقبل کا انسان ہے .... انسانی انا میں ماضی اور مستقبل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ انسان کی روح درحقیقت اس کشمکش کی رزمگاہ ہے۔ نٹشے نے زرتشت کی زبان سے اس حقیقت کا اعلان کیا تھا، جب اس نے کہا تھا کہ میں ''دیروز و امروز ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ ایسا بھی ہے، جو فردا اور مستقبل سے متعلق ہے''۔ (۸)

یہی مصنف اپنے استاد G. Gudirjieff کی زبان سے کہتا ہے:

مثلاً آپ رات کو تہیہ کر کے سوتے ہیں کہ میں صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھوں گا۔ پانچ بجے آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے لیکن بستر سے باہر نکلنے کو آپ کا جی نہیں چاہتا، آپ بدستور لیٹے رہتے ہیں۔ گورچیف کہتا ہے کہ بتائیے سوتے وقت تہیہ کرنے والا ''میں'' اور صبح کے وقت اس عزم سے انحراف کرنے والا ''میں'' کبھی ایک ہو سکتے ہیں؟ یا مثلاً آپ کسی شخص سے ایک وعدہ کرتے ہیں اور آدھ گھنٹے بعد اس وعدہ کے خلاف کام کرتے ہیں، تو کیا آپ کا وعدہ کرنے والا ''میں'' اور وعدہ توڑنے والا ''میں'' ایک ہو سکتے ہیں؟ اسی قسم کی مثالوں کے بعد گورچیف کہتا ہے کہ: ''یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ انسان ہمیشہ وہی رہتا ہے۔ انسان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے'' (۹) کیا انسان موت کے بعد زندہ رہتا ہے؟ اس پر گورچیف کہتا ہے:

اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے، اگر اس میں اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جئے تو یہ ''شے'' کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہر ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح ہمارے بہت سے انا (IS) فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشو و نما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ (۱۰) انسان کی ذات جس کی تعبیر (Self) سے کی جاتی ہے۔ یہی ذات جب پختہ ہو جاتی

---

(۸) Ouspensky- Tertium organum.

(۹) In Search of the Miraculous / 53.

(۱۰) Ibid / 108.

ہےتواسےشخصیت(Personality)کانام دیاجاتاہے۔(۱۱)وہ راشڈیل کی ہمنوائی میں کہتاہے:

اخلاقی نظام کادارومدارہی اسی سلسلہ پر ہے کہ ''میں'' اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔اس لیےاگر کچھ عرصہ بعد''میں'' وہ نہیں رہتاجو پہلے تھاتواس صورت میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرارنہیں پاتااوران فیصلوں کی خلاف ورزی اوران معاہدوں کی شکست کاالزام مجھ پر کیسے عائد ہوسکتاہے'' (۱۲)

ان آراء کی روشنی میں یہ کہاجاسکتاہے کہ فکرجدیدمیں انسان کوثبات(Permanance)اورتغیر(Change)کا مجموعہ قراردیاجاسکتاہے۔انسان کی ماہیت پر گفتگوکرتے ہوئے(Berdyaeu)کہتاہے:

دنیامیں جس قدرتغیرات رونماہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کانقطہ نظردہراہوناچاہیئے۔زندگی تغیرات کانام ہے اورجدت کے بغیرزندگی کچھ نہیں۔لیکن صرف تغیرکاتصورفریب انگیز ہے۔تشخص ذات کے لیے تغیراورجدت کی بھی ضرورت ہے۔لیکن اس میں ایک ایسی شئے بھی ہے جومستقل اورتغیرآشناہے۔اس کے بغیرتشخص ذات کاتصورناممکن ہے۔لہٰذاذات کے نشوونمامیں انسان کوخوداپنی ذات سے فریب دہی کرنی چاہئے۔یعنی اسے اس مستقل شئے کوبھی نظراندازنہیں کرناچاہیئے جواسے ابدی طورپرملی ہے۔زندگی میں یہ چیزنہایت ضروری ہے کہ تغیرات کے اس پیہم علم میں جس سے جدت نمودارہوتی ہے'استقلال ذات کے ساتھ امتزاج کیاجائے'' (۱۳)

انسان کی مجموعی شخصیت کامطالعہ ہی مفیدہوسکتاہےاسی لیے جوڈ(C. E. M. Joad)کہتاہے:

انسان کے متعلق صحیح علم'اس کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مطالعہ کے مجموعہ کانام نہیں۔انسان کے متعلق صحیح علم اس صورت میں حاصل ہوسکتاہے کہ انسان کابہ تمام وکمال مطالعہ کیاجائے۔یہ تمام وکمال مطالعہ اس کی ذات کے مطالعہ کانام ہے' اس لیے کہ انسانی ذات ہی کومکمل انسان کہاجاسکتاہے۔اگرچہ انسان کے مختلف حصے اسی ذات کے اجزاءہوتے ہیں لیکن اس کی ذات ان اجزاءکے مجموعہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔انسانی ذات کامطالعہ سائنس کی روسے نہیں کیاجاسکتا'' (۱۴)۔

اقبال اس فرق کوان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

خداکی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وہ شعوری طورپراپنے خالق کی حیات تخلیقی میں شرکت کرسکے اس میں یہ جوہرودیعت کیاگیاہے کہ یہ ایک بہتردنیاکاتصورکرسکے اورجوکچھ موجودہے اسے وہ کچھ بنادے جواسے ہونا چاہئے۔(۱۵)

---

(۱۱) Brightman, philosophy of Religion / 200.

(۱۲) Ibid / 196.

(۱۳) The Divine and Human.

(۱۴) Guide to Morals and Politics / 250.

(۱۵) The Reconstruction of Religious Thought in Islam / 41-15.

مذہبی کاوشیں

چونکہ مذہب کے پیش نظر ہمیشہ انسان کا روحانی پہلو رہا ہے اس لیے مذہبی گروہ نے انسان کو روحانی اعتبار سے بلند دیکھنے کی آرزو کی ہے۔ بعض مذہبی گروہوں نے اس بات کو بنیادی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے کہ انسان بڑی گھٹیا مخلوق ہے اور بہت سی آلائشوں سے ملوث ہے۔ اسے بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنی چاہیے اور روحانی مراتب کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے اسے فطری آلائشوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ دنیا اور دنیا کا تعلق انسانی شخصیت کو مسخ کرتا ہے۔ لہٰذا اس سے کنارہ کشی کی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ ترک دنیا اعلیٰ ترین انسانی مرتبہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لیے دنیا کو چھوڑ دینے ہی میں عافیت ہے۔ دیکھیے مسیحیت نے انسان کو پیدائشی گناہ گار قرار دیا۔ عیسائیت کے مطابق ہبوط آدم معصیت کے نتیجہ میں ہوا۔ اس گناہ کی وجہ سے انسان ہر وقت گناہ کی حالت میں رہتا ہے اور اس سے نکلنے کے لیے عمل کی نہیں فضل خداوندی کی ضرورت ہے اور وہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کوئی شخص مسیحؑ کے نام پر بپتسمہ لے گا۔ اس اصطباغ کے ذریعہ سے وہ نئی زندگی حاصل کرے گا اور اصطباغ کے بعد وہ ہمیشہ فضل خداوندی کا محتاج رہے گا۔ فضل خداوندی کی یہ دائمی اعانت صرف کیتھولک کلیسا کے حوالے سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نجات کے اس تصور کے لیے کفارہ کا عقیدہ اختیار کیا گیا۔ اگرچہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد نہیں تاہم پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے اسے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد پالِ (Paul) کے بعض بیانات ہیں۔ وہ رومیوں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اس لیے کہ سب نے گناہ کیا، کیونکہ شریعت کے دیئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔ تو بھی آدمؑ سے لے کر موسیٰؑ تک موت نے ان پر بادشاہی کی جنھوں نے اس آدمؑ کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا...... جب ایک شخص کے گناہ کے سبب سے موت نے اس ایک کے ذریعہ سے بادشاہی کی تو جو لوگ فضل اور راستبازی کی بخشش افراط سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص یعنی یسوع مسیحؑ کے وسیلہ سے ہمیشہ کی زندگی میں ضرور ہی بادشاہی کریں گے۔ غرض جیسا ایک گناہ کے سبب وہ فیصلہ ہوا جس کا نتیجہ سب آدمیوں کی سزا کا حکم تھا ویسا ہی راستبازی کے ایک کام کے وسیلہ سے سب آدمیوں کو وہ نعمت ملی جس سے راستباز ٹھہر کر زندگی پائیں۔ (۱۶)

عیسائی عقیدہ کے مطابق چونکہ اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور رحیم بھی اسی لیے اس نے انسانوں کو گناہوں کے اثرات سے نجات دینے کے لیے خود اپنے بیٹے کو چنا اور اس کو انسانی جسم میں دنیا کے اندر بھیجا۔ اس نے یہ قربانی پیش کی کہ خود سولی پر چڑھ گیا اور اس کی موت تمام انسانوں کی طرف سے کفارہ ہوگئی اور اس کی وجہ سے تمام انسانوں کا نہ صرف اصلی گناہ

(۱۶) رومیوں، ۵/۱۲-۲۶

معاف ہو گیا بلکہ انہوں نے اصل گناہ کے سبب جتنے گناہ کیے تھے وہ بھی معاف ہو گئے۔ (۱۷) گناہ کا یہی تصور اور اس سے نجات کا یہی غیر منطقی عقیدہ ہے جس نے مغرب کے فکری نظام کو افراط و تفریط کا شکار کیا اور اسے اعتدال کی راہ پر نہیں آنے دیا۔ اب مغرب کا یہی نظامِ فکر پوری دنیا کے لیے مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے۔

بدھ مت نے بھی دنیوی زندگی کو آلائش کا نام دیا اور مہاتما بدھ کے ہاں ہر چیز افسوس ناک ہے ہر چیز فانی ہے اور غیر حقیقی ہے۔ مہاتما بدھ کے نزدیک نئے جیون کی آرزو انسان کو جیون پر آمادہ رکھتی ہے۔ آرزو مصیبت کا سبب ہے حتی کہ موت اور فنا کی آرزو بھی زندگی کی آرزو کی طرح ہے۔ آرزو سے کنارہ کشی آرزو کو ختم کرنا، رد کرنا اور ترک کر دینا ہی مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنا ہے لہٰذا دنیا سے کنارہ کشی اور اشیاء کائنات سے بے رغبتی ہی عین انسانیت ہے۔ بدھ مت میں نجات کا مطلب مکمل فنا ہے۔ یعنی خواہشات کی نفی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے انسان اپنے گناہوں اور آلائشوں سے اسی صورت نجات حاصل کر سکتا ہے جب اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر دے۔ مذہب کے اس تصور میں ایک خدا یا کئی خداؤں کی خوشنودی کے لیے چند انسان ریاضت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو پاکیزہ بناتے ہیں۔ اس طرح طبقاتی تقدس کا ایک نظام جنم لیتا ہے۔ عام انسان اس تقدس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مذہبی طبقات خدا کی نمائندگی میں خلقِ خدا کی تذلیل کرتے ہیں، انہیں محکوم بناتے ہیں اور ان کے وسائل پر دادِ عیش دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کی یہ طویل داستان دردناک بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ مذہب کے نام پر انسان سے جو سلوک ہوا اور مقدس مذہبی گروہ کے ہاتھوں انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوئی۔ وہ ناقابل بیان ہے۔ انسان ہی عابد ہے اور انسان ہی معبود؟ بات اگر یہیں ختم ہو جاتی تو بھی خیر تھی۔ مذہبی طبقے نے تو انسانیت پر یہ ظلم بھی کیا کہ اسے پتھروں، حیوانوں، درختوں، پانی، آگ اور دیگر مظاہر فطرت کے سامنے جھکا دیا۔ پتھر کی مورتیوں، اینٹ اور سیمنٹ کے مشاہد اور لکڑی گتے کے بنے ہوئے مواد کے سامنے سجدہ ریز کرانا مذہبی ناخداؤں کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اگر بغور دیکھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی انسان کا مقام متعین نہ ہو سکا۔ اگر ایک طرف روحانی پیشوا کی پرشکوہ شخصیت کو دیکھ کر انسان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف جھکتے ہوئے انسانوں کی ذلت آشکار ہوتی ہے ایک طرف بادشاہ اور صاحب اقتدار انسان اپنی عزت و شان دکھاتے ہیں تو دوسری طرف بھیڑ بکریوں کی طرح بکنے والے غلام اور باندیاں تذلیل کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں خالص معاشرتی سطح پر انسانوں کو ناپاک قرار دیا گیا۔ آریہ قبائل جب ہندوستان میں آئے تو انہوں نے پیدائشی طور پر انسانوں کی چار قسمیں قرار دیں۔ تین کا تعلق آریہ نسل سے تھا اور چوتھی کا مقامی باشندوں سے۔ بظاہر یہ تقسیم کار پر مبنی تصور تھا لیکن بالآخر اس کی حیثیت مذہبی اور آئینی ہو گئی۔ پروہت یا برہمن جو مذہبی رسوم ادا کرتا۔ کشتری جو جنگی اور دفاعی فرائض انجام دیتا اور ویش جو گھربار، مال مویشی اور کھیتوں فصلوں کی ذمہ داری نبھاتا۔ غیر آریائی مقامی آبادی کے لوگوں کو شودر کا نام دیا گیا جن کا کام خدمت گذاری تھا۔ اس وقت بھی ہندوستانی معاشرت میں ذات

---

(۱۷) The Enchiridian, 1/687.

پات کا یہ نظام پوری قوت کے ساتھ قائم ہے۔شودر ہندو رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو قبول کرنے کے باوجود ناپاک ہیں اور ہندو معاشرت میں نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ برہمن کے ہاں غیر ہندو بھی ناپاک ہیں۔اس سے قطع نظر انسان کے بارے میں ہندووں کا عمومی رویہ بھی یہ ہے کہ اسے نجات حاصل کرنے کے لیے کئی جیون اختیار کرنے پڑتے ہیں۔انسانی وجود ناپاک ہے لہٰذا مرنے کے بعد اسے جلا دینا چاہیئے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندومت میں انسان کی تعریف یہ ہے کہ انسان ایک جانور ہے جو قربانی کرتا ہے۔(۱۸) البتہ ان کے ہاں Pantheistic فلسفہ کی وجہ سے انسان کے خدا کا حصہ اور اس کی ذات میں گم ہونے کے امکانات ہیں۔روح کائنات یا معبود اعلیٰ کے حلول کا عقیدہ انسان کی اعلیٰ ترین حیثیت کا پتہ دیتا ہے۔لیکن اس کا اطلاق عمومی انسانیت پر نہیں۔عام انسان کی حیثیت تو ناپاک شے کی ہے۔تناسخ ارواح اور وجود کائنات صورت میں ظاہر ہونا اپنشد کے عہد سے راسخ ہے اس لیے ہندومت میں ان تصورات کے بغیر انسان اور اس کی حیات دنیوی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ بلکہ انسان کی نجات انہی تصورات سے وابستہ ہے۔کرما کا تصور تناسخ کے پورے عمل پر حاوی ہے لہٰذا انسان کی نجات اس کا ابتلاء اس کے مصائب اور اس کی پاکیزگی کا ان تصورات سے گہرا تعلق ہے۔

ہم نے انسان کی ابتدا اور اس کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسے یا تو حیوانی سطح کی مخلوق تصور کیا گیا ہے یا کم از کم ایک غیر ذمہ دار مخلوق جس کے مقصد حیات کو متعین کرنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ فلسفہ اور مذہب دونوں نے انسان کے حوالے سے تین اہم سوالات اٹھائے ہیں اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ انسانی فکریات میں یہ تینوں سوال بے حد اہمیت کے حامل ہیں اور تینوں فلسفہ و مذہب کے مشترک مسائل ہیں:

(i) کائنات کیا ہے؟ (ii) کائنات کا بنانے والا کون ہے؟

(iii) انسان کیا ہے؟ اس کا کائنات سے کیا رشتہ ہے اور اس کا کائنات بنانے والے سے کیا تعلق ہے؟

فلسفہ و مذہب نے اس حوالے سے گہری علمی بحثیں کی ہیں مذاہب کو خاص طور پر ان مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے کیونکہ انسان کی دنیوی حیثیت اس کی فلاح اور نجات کا دار و مدار ان سوالات کے جوابات سے متعلق ہے۔جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں۔اس کی تخلیق' اس کی حیثیت' انسان کا اس سے رشتہ' یہ مستقل ہے یا فانی؟ انسان پر موت طاری ہوتی ہے۔اس کی حقیقت کیا ہے؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اس کے اعمال کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے؟ کیا انسان اور کائنات کا کوئی خالق ہے اگر ہے تو اس نے انسان اور کائنات کا کیا رشتہ ہے۔یہ سب بہت اہم سوالات ہیں۔ان سوالات کو اگر مرتب کریں تو مندرجہ ذیل تین صورتیں سامنے آتی ہیں:

چونکہ ہمارے موضوع سے متعلق صرف آخری سوال ہے اس لیے ہماری بحث اسی پر مرتکز رہے گی۔گذشتہ صفحات میں انسان کی حیثیت پر بات ہوئی ہے اس لیے اب ہم اس امر کا مختصر جائزہ لیں گے کہ انسان کا اپنے خالق سے کیا تعلق ہے؟

---

(۱۸) Christianity and World Religion / 212.

انسان اور خدا

انسان کی متوازن شخصیت اور معتدل سرگرمیوں کا انحصار اس تعین پر ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس سے بھی پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کا تصور خدا کیا ہے؟ کیونکہ اس تعلق کا دارومدار اس تصور پر ہے کہ خدا کیا ہے؟ اور انسان نے خدا کو کیا سمجھا ہے یہ وہ اہم سوال ہے جس کے ساتھ انسان کی تقدیر وابستہ ہے۔ چونکہ خدا ایک غیر مرئی قوت ہے اس لیے اس پر پراسراریت کا ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان کو اس غیر مرئی وجود کو سمجھنے اور ماننے میں ہمیشہ دشواریاں پیش آتی رہی ہیں۔ مذاہب نے اسے جس طرح متعارف کرایا اور مادی دنیا میں اس کی موجودگی کی جو تعبیرات کی ہیں اس سے یہ مسئلہ اور الجھا ہے۔ وحدت الوجود اور حلول ایک تعبیر ہے اور دیوی دیوتاؤں کا وجود اور ارواح کا تصرف تعبیر کا دوسرا رخ ہے۔ مذاہب نے خدا کو انسان اور انسان کو خدا بنانے کے کئی تجربات کیے ہیں۔ انسانی تاریخ ان تجربات کی شاہد ہے۔ حفیظ نے کہا تھا۔

حسن نظر کی آبرو صنعت برہمن میں ہے
جس کو صنم بنا لیا اس کو خدا بنا دیا

خدا کیا ہے؟

مختلف مذاہب میں ذات الٰہی کے متعلق دلچسپ بحثیں ہیں۔ ان کے علم کلام ان بحثوں کا مرقع ہیں۔ اگرچہ یہ بحثیں کنفیوژن کا ذریعہ ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مذہب میں کسی نہ کسی انداز میں ایک مافوق الفطرت قوت کا تصور ضرور پایا جاتا ہے۔ مختلف مذہبی رسوم' عبادات' مراقبے' دعائیں' قربانیاں مذہبی نقطہ نظر سے تعلق قائم کرنے کے ذرائع ہیں۔ اسی تعلق ہی کے سلسلے میں مذہبی شخصیتوں کا ایک طبقہ وجود میں آیا' پروہت' پنڈت' پادری' ربی اور شیخ اس رابطہ کا وسیلہ قرار پائے جو ایک انسان کو اپنی زندگی میں درکار ہوتا ہے۔ خدا تک رسائی' خدا کی مدد اور اس کی نگرانی یہ مذہبی شخصیات کرتی ہیں۔ مشرکانہ معاشروں میں صاحب اقتدار کے ساتھ پروہت کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان مذہبی شخصیات نے حقیقی یا موہوم وسائل کا مفصل نظام مرتب کیا جن سے مافوق الفطرت ہستی یا ہستیوں سے برکات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وسیلہ یہی مذہبی شخصیات ہیں لہٰذا انہیں نذرانہ پیش کر کے ہی کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مذاہب کے تصور خدا میں' خدا کے بیٹے بیٹیاں اور چہیتی ہستیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے توسط سے یا ان کی سفارش سے انسانی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ ان کے ناموں کے استھان بنے۔ ان کے بت تراشے گئے' ان کے مراکز قائم کئے گئے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے گئے اور نذرانے پیش کئے گئے۔ مشرکانہ کلچر اور اس کے مذہبی مظاہر کا ایک تسلسل ہے جو پوری انسانی تاریخ پر محیط ہے۔

مغربی مفکرین جنھوں نے سیکولر نقطہ نظر سے خدا کے تصور پر بحث کی ہے ان کے نزدیک اس میں ایک ارتقاء پایا جاتا ہے۔ وہ زمانہ قبل از تاریخ کے انسانی ذہن کے چھلاوے' بھوت' پریت' ارواح خبیثہ' دیوتا اور اس کے بعد خدا کے مختلف تصورات کو اسی سلسلہ کی کڑیاں قرار دیتے ہیں۔ تاہم دور حاضر کے مغربی مفکرین نے خدا کی تعریف متعین کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ذیل میں ہم چند تعریفات کو نقل کریں گے۔(۱۹)

فرائز (Frise) کے نزدیک "خدا ہی وہ ہستی ہے جسے مقدس کہا جا سکتا ہے"۔ ولیم جیمز (W. James) کے مطابق "خدا کائنات کا حصہ اعلیٰ ہے" پروفیسر وائی مین (Weiman) کہتا ہے کہ "خدا اس ہستی کا نام ہے جو اپنے اندر بلند ترین قدر کا امکان رکھتی ہے"۔ پروفیسر الیگزینڈر (Alexander) کے نظریہ میں کائنات کی اس سطح کا نام جو (Diety) کہلاتی ہے خدا ہے۔(۲۰) پروفیسر ایڈنگٹن (Eddington) کا خیال ہے "کہ خدا اور کائنات ایک ہی ہیں"(۲۱) ٹیگرٹ (Taggart) کے نزدیک خدا ایک بلند ترین اور خیر کی مظہر ہستی ہے اور وہ ذاتی تشخص رکھتا ہے۔ میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) کہتا ہے کہ خدا اس قوت کا نام ہے جو سب کی مسبب ہے۔

ان تمام تعریفات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر شخص نے خدا کی تعریف اپنے فہم اور اپنے تصور کے مطابق کی ہے۔ چونکہ یہ لوگ کائنات کے تصور اور سائنسی فکر کے ذریعہ خدا کی ہستی کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے یہ تصورات جدا جدا نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ہیلڈین (J. S. Haldane) کہتا ہے کہ "خدا کسی ایسی مکمل ہستی کا نام نہیں جو ہماری دنیا میں جہالت' گناہ اور مصائب سے الگ ہو وہ ان سب میں موجود ہے اور اس کشمکش میں شریک ہے"۔(۲۲)

کائنات کی مادی تعبیر کے نتیجے میں خدا کو بھی اسی انداز میں سمجھا گیا۔ خدا اور کائنات کو ایک تصور کیا گیا۔ بعض مذاہب میں وحدت الوجود کا تصور تھا اس کی تعبیرات مختلف الفاظ میں سامنے آئی ہیں۔ پروفیسر ایوان (Evan) کہتا ہے:

"خدا اور کائنات دو الگ الگ ہستیاں نہیں ہیں۔ ایک ہی توانائی ہے جو بیک وقت خدا بھی ہے اور کائنات بھی"۔(۲۳)

ولیم براؤن (Walliam Browne) لکھتا ہے کہ:

اشیائے کائنات میں من حیث المجموع خیر، حسن اور صداقت ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سب ایک ہی شئے

---

(۱۹) یہ تعریفات ہم نے ای۔ ایس۔ برائٹ مین (E. S. Brightman) کی کتاب Philosophy of Religion سے لی ہیں۔ دیکھیے صفحات ۸۹۔۸۱

(۲۰) اس کے نزدیک کائنات ارتقاء پذیر ہے۔ جونہی کائنات ایک منزل طے کرتی تو Diety دوسری منزل پہ ہوتی ہے۔(Time and Diety)۔

(۲۱) Philosophical basis of Biology 21

(۲۲) Philosophy of Religion 94.

(۲۳) Theistic Monism / 329.

کے مختلف گوشے ہیں۔ یہ اشیا تو مجرد ہیں لیکن نفس شئی خود مجرد (Abstract) نہیں یہ بالکل ٹھوس ہے۔ یہ حقیقت کلی ہے۔ یہ کائناتی خدا ہے''(۲۴)

مغربی مصنفین کائنات سے آگے بڑھ کر انسان اور معاشرے کو بھی خدا کہتے ہیں۔ J. H. Homes اپنی کتاب (A struggling God) میں لکھتا ہے کہ خدا انسان ہے اور انسان خدا۔ دونوں سے مراد وہ زندگی ہے جو محبت کے لیے مصروف کشمکش ہے۔ مفکرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ خدا نے کائنات کو بنا دیا۔ اب اس کے بعد وہ اس مشینری کے چلانے میں دخل نہیں دیتا۔ یہ مشین انسان کے سپرد کر دی گئی ہے لہٰذا کائنات میں اب الوھیاتی منصب خود انسان کو مل چکا ہے۔ کاملے (Auguste comte 1798- 1857) اس نظریہ کا موجد تھا۔ اس کا قول تھا کہ ''انسانیت خدا ہے'' اسی نظریہ کو (Humanism) کہتے ہیں۔ اسی دلیل کو بنیاد بنا کر فیور باخ (Feuerbach) نے خدا کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا صرف انسان کے دل میں ہوتا ہے اس کے باہر اس کا کہیں وجود نہیں۔ ایمز (Edward scnibner Ames) کہتا ہے:

خدا کا مخصوص اور قابل رسائی تصور اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسے انسانوں کا وہ اجتماعی ضمیر سمجھ لیا جائے جو معاشرے میں کارفرما' اور اس طرح معاشرتی اداروں میں برنگ مجاز جلوہ گر نظر آتا ہے۔ (۲۵)

جان کیرڈ (John Caird) ان نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور انسان' محدود اور لامحدود' ایک ہی کل کے جزو ہیں جس کل میں بیک وقت سب موجود ہوتے ہیں الگ الگ بھی اور اکٹھے بھی۔ (۲۶)

ان نظریات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ جدید مغرب شدید الجھاؤ کا شکار ہے۔ مادہ پرستی کی بنیاد پر انہوں نے خدائے خالق و مالک کا انکار کیا جب مسائل پیدا ہوئے تو سوچنے پر مجبور ہوئے۔ وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم تھے پس منظر میں عیسائیت تھی جو سریت پر زور دیتی تھی۔ یونانی فلسفہ تھا جس میں خدا کے بیرون کائنات (Trenscendence) اور اندرون کائنات (Immenance) کا نزاع موجود تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے ہندو فلسفہ اور زرتشی تصورات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے وحدت الوجود اور ثنویت کے تصورات کے زیر اثر وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے۔ وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کی وجہ سے کسی صحیح رائے پر نہ پہنچ سکے۔ مغرب کے Deism اور Theism کے تصورات کے تحت مغربی معاشرہ خدا کے بارے میں بحث کرتا ہے لیکن اس کو انسان کے معاملات سے غیر متعلق سمجھتا ہے۔ مغرب کے مجموعی طور پر انکار خدا کے سبب سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں اس کے نتیجے میں ایک گروہ سریت Mysticam کی طرف راجع ہوا ہے اور نتیجہ

---

(۲۴) Science and personality / 81.

(۲۵) My Conception of God.

(۲۶) An introduction to the philosophy of Religion / 229-2.

وحدت الوجود ہے۔ عظمت انسان کی جو باتیں مغرب میں ہوتی ہیں اور اس کے زیر اثر ہمارے محدود مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاں پائی جاتی ہیں وہ انسان کی خودمختاری اور خدائی کی باتیں ہیں:

یہ پھول سب اسی ڈھول سے آ گئے ہیں ندیم

میرا خدا میری دنیا کا رہنے والا ہے

ارتقاء کے مفکرین اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کی آخری منزل الٰہی صفات کا حصول ہے۔ ان صفات میں سے صفت تخلیق آسان انتخاب ہے عمل تخلیق انسان اور خدا میں قدر مشترک ہے لہٰذا اسی صفت کی تکمیل سے الوہیت سے متصف ہونا ممکن ہوگا۔ برگساں لکھتا ہے:

آج نوع انسان خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی کچلی ہوئی مصروف آہ وفغاں ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کیلئے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں؟ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر فریضہ کائنات کی تکمیل کے لیے بھی جدوجہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضہ کائنات کیا ہے؟ صفات الوہیت رکھنے والی ہستیوں کی تخلیق (۲۷)۔

انسان اور خدا میں قدر مشترک صفت تخلیق ہے، خدا خود تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنے عمل تخلیق کو جاری رکھے۔ بارڈایو (Berdyaeu) انسانی تخلیقی عمل کے بارے میں لکھتا ہے: ''یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد وساکت نہیں۔ اس میں عمل تخلیق جاری رہے گا اور انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اسے تمام ممکنات کی پردہ کشائی کرنا ہوگی اور ہر مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہوگا۔ یہ امر تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے اور وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر ہے۔ (۲۸) مارٹن بوبر (Martin Buber) کے الفاظ ہیں: ''پھر ہم خود تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں ہم خالق سے جا ملتے ہیں۔ اس کے معاون اور رفقاء کی حیثیت سے (۲۹)۔

انسان کی صفت تخلیق اسے خدا کا شریک کار بنا دیتی ہے جس کے لیے اقبال نے ''Coworker'' کی اصطلاح استعمال کی ہے (۳۰)۔ اقبال کے پیش نظر شاید انسان کے خدا بننے کا تصور تو نہ ہو لیکن وہ انسان کی صفت تخلیق کی بات ضرور کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

اس ارتقائی تبدیلی کے طریقے میں خدا خود بندہ کا رفیق کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس میں سبقت اقدام کرے:

---

(۲۷) Creative Evolution / 36

(۲۸) The Divine and the Human / 52

(۲۹) I and Thou / 82

(۳۰) Reconstruction of Religious Thought in Islam / 12

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۳۱) اللہ کسی قوم کو جو حاصل ہے اسے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے حالات نہیں بدلتے۔ لیکن اگر وہ اس بات میں سبقت نہیں کرتا' اگر اپنی ذات کی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا اگر وہ آگے بڑھنے والی زندگی کی اندرونی خیزش کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی سی تساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ جلد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔(۳۲)

Leslie Paul لکھتا ہے:

انسان اپنی زندگی میں فطری عمل ارتقاء کے خلاف چلتا ہے وہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حوادث عالم اپنے طریق پر اس کے مقصد کی سمت چلیں۔ نہ ہی وہ زمانہ کا انتظار کرتا ہے کہ وہ اس کے پروگرام کے مطابق چلیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے اس کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کر لیتا ہے اور پھر عمل تخلیق سے اپنے ماحول پر غلبہ پا کر اسے اپنا سازگار بنا لیتا ہے............ جو کچھ اس کائنات میں انسان کے ہاتھوں وجود میں آیا ہے' فطرت کا عمل تخلیق و ارتقاء انہیں کروڑوں برس میں بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔(۳۳)

انسانی فکر نے انسان اور خدا کے تعلق میں اسی طرح ٹھوکر کھائی ہے جس طرح انسان اور کائنات کے تعلق میں کھائی ہے۔ ابدی صداقتوں سے محرومی کے نتیجے میں انسان نے ظن و تخمین اور وہم و گمان کی بنا پر حقائق کا ادراک کرنے کی کوشش کی ہے جو صداقت کا جزوی ادراک تو ہو سکتا ہے لیکن کلی حقیقت شناسی ممکن نہیں ہے۔ قرآن کا یہ جملہ ان پر صادق آتا ہے: وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۳۴) اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کے ضمن میں ہم اپنی بات (F. J. Sheen) کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

مشرق کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور مغرب کی بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے سمجھ رکھا ہے کہ انسان ہی سب کچھ کرتا ہے۔ مشرق عقیدہ جبر کا قائل ہو چکا ہے اور مغرب میں انانیت پھیل گئی ہے۔(۳۵)

---

(۳۱) الرعد/۱۱

(۳۲) Reconstruction of Religious thought in Islam / 12.

(۳۳) The Meaning of Human Existance / 157-158.

(۳۴) البقرہ/۱۵

(۳۵) Philosophy of Religion / 253.

انسان اور کائنات

انسان کی حیثیت کو سمجھنے کے لیے جس طرح انسان اور خدا کے تعلق کا ادراک ضروری ہے اسی طرح انسان اور کائنات کے رشتے کو جاننا ضروری ہے۔ اس تعلق کو سمجھنے کے لیے کائنات کی حقیقت کو جاننا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سے تعلق کی نوعیت متعین ہوگی۔ گورجیف کہتا ہے:

انسان کی حیثیت کو سمجھنے کے لیے جس طرح انسان اور خدا کا ادراک ضروری ہے اسی طرح انسان اور کائنات کے رشتے کو جاننا بھی ضروری ہے اس تعلق کو سمجھنے کے لیے کائنات کی حقیقت کو جاننا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے تعلق کی نوعیت متعین ہوگی۔

''یہ ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کئے بغیر کائنات کا مطالعہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کائنات کا مطالعہ کئے بغیر کر سکیں۔ انسان تو کائنات کا عکس ہے۔ اس کی تخلیق انہی قوانین کی رو سے عمل میں آئی ہے، جن قوانین کی رو سے کائنات کی تخلیق عمل میں لائی گئی تھی۔ لہٰذا یہ اپنی ذات کے مطالعہ سے کائنات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ یعنی ان تمام قوانین وضوابط کا مطالعہ جن کے ماتحت اس کارخانہ عالم کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ کائنات اور اس کے قوانین کا مطالعہ کرنے سے ان قوانین کا مطالعہ کرے گا جن کے تابع اس کی اپنی زندگی بسر ہونی چاہیے ....
اس لیے مطالعہ فطرت اور مطالعہ ذات' متوازی طریق پر ساتھ ساتھ ہوتا جائے گا تا کہ ایک دوسرے سے مدد لے سکے۔''(۱)

اوپنسکی کہتا ہے:

فطرت کی تمام بادشاہتیں انسان کے اندر ہیں انسان خود ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ اس کے اندر مسلسل قوت اور مسلسل پیدائش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک ہستی کا دوسری ہستی کو جذب کر لینے کا پیہم سلسلہ، طاقتور کا کمزور کو نگل جانے کا سلسلہ' ارتقاء اور تنزل کا سلسلہ' بڑھنے' پھولنے پھیلنے اور مر جانے کا سلسلہ' غرضیکہ انسان کے اندر جمادات سے لے کر خدا تک سب کچھ موجود ہوتا ہے''۔(۲)

Berdyaeu کہتا ہے:

یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں امر تخلیق جاری رہے گا اور انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اسے تمام ممکنات سے پردہ کشائی کرنی ہوگی اور ہر مخفی کو مشہود کر کے دکھانا ہوگا۔ یہ امر تخلیق صرف خدا کی طرف سے نہیں آتا بلکہ خدا انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے۔(۳)

---

(۱) In Search of Miraculous / 75.

(۲) A New Model of Universe / 18.

(۳) The Divine and Human / 53.

انسان اور کائنات کے تعلق کا تعین دونوں کے تصورات اور حیثیتوں سے ہوگا۔ انسان کے بارے میں ہم نے مختلف تصورات کا جائزہ لیا ہے، مناسب ہوگا اگر کائنات کے بارے میں ایک مختصر سا جائزہ لے لیا جائے کہ کائنات کیا ہے؟ اس کی ابتداء وانتہا کیا ہے؟ اس کے قوانین کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے اندر شکست وریخت ہورہی ہے یا یہ ارتقاء پذیر ہے؟ کائنات کے اندر انسان کی کیا حیثیت ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو انسان کو ہمیشہ پریشان کرتے رہے ہیں اور انسانی رویوں اور عقیدوں کا دارومدار بھی انہی سوالوں پر ہے۔

مادیین کا ابوالآباء دیمقراطیس (Democritus. B. 470 BC) کہتا ہے کہ تمام کائنات ذرات (Atoms) سے بنی ہے۔ جن کی مزید تقسیم ممکن نہیں۔ مسلمان فلسفیوں کی اصطلاح میں اسے جزء لایتجزی (Indivisible unit) کہا جاتا ہے۔ ہر شئے انہی ذرات سے مرکب ہے ایک دوسرا یونانی فلسفی ہرقلیطس (Heraclitus) کا خیال ہے کہ زمانہ (Time) ہی سب کچھ پیدا کرتا ہے اور وہی فنا کرتا ہے .... جو چیزیں ہم اس کے ذریعے محسوس کر سکتے ہیں انہی کی قیمت ہے .... یہ دنیا سب کے لیے یکساں ہے۔ نہ کسی آدمی کی بنائی ہوئی ہے نہ دیوتاؤں کی یہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ (۴)

مادیین اس تصور کو کائنات کی تخلیق تک محدود نہیں رکھتے بلکہ کائنات اور انسان سے متعلق تمام مسائل کا حل ہی اسی نقطۂ نگاہ سے دریافت کرتے ہیں۔ ارنسٹ ہیکل (Earnst Haeckel) لکھتا ہے کہ کائنات معموں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔

(i) ماہیت مادہ اور توانائی (ii) زندگی کا آغاز

(iii) مبداء حرکت (iv) اشیائے فطرت کا ربط

(v) زبان اور فکر کی بنیاد (vi) مبدا شعور

(vii) انسانی اختیار کا مسئلہ

ہیکل کے نزدیک پہلے چھ معمے دو بنیادی اصولوں کے تحت حل ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ ''مادہ اور توانائی غیر متبدل ہیں اور دوسرے یہ کہ کائنات میں عمل ارتقاء جاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غیر شعور اور غیر ذی حیات مادہ سے ارتقائی طور پر زندگی اور شعور پیدا ہو جاتے ہیں۔ باقی رہا ساتواں معمہ یعنی انسانی اختیار وارادہ کا مسئلہ تو یہ سوال ایسا نہیں کہ اسے کسی سائنٹیفک تحقیق کا موضوع بنایا جائے کیونکہ اس کی بنیاد ایک عقیدہ پر ہے جو وہم کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا حقیقی وجود ہی نہیں (۵)۔ اس نقطۂ نظر سے دنیا میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ کسی آزاد روحانی یا نفسی قوت کے ارادہ کے ماتحت وقوع

(۴) Russel Birtand. Mysticism and Logic.

(۵) The Riddle of the universe /12 - 13.

پذیر نہیں ہوتا' بلکہ قوائے فطرت کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ انہی اصول کے اعتبار سے مادہ ہی ہے۔ اس کے ماوراء کچھ نہیں۔ میکانکی تصور کائنات کی رو سے کائنات کا کوئی خالق ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق سے کچھ مقصد ہے۔ لیکن دور جدید کا سائنس دان مختلف انداز میں سوچتا ہے۔ میکانکی تصور کے مطابق کائنات مختلف عناصر کا ڈھیر سمجھا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی مقصدیت کا تصور نا قابل قبول تھا۔ لیکن جدید تحقیقات نے نئی راہ اختیار کی ہے۔ ڈریش (Han Driesh) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظم وحدت ہے وحدت نظم جسے (Monism of order) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ وحدت نظم کا یہ تصور نظم کائنات کے متعلق دیگر تمام تصورات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رو سے کائنات میں الگ الگ نظام کہیں باقی نہیں رہتے۔ بلکہ تمام کائنات وحدت نظم کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس وحدت نظم کے پیش نظر ''قوانین فطرت'' کے تصور میں بھی تبدیلی کرنا پڑے گی، کیونکہ اس صورت میں متعدد قوانین کی بجائے صرف ایک قانون کارفرما نظر آئے گا۔ اور یہی وہ واحد قانون ہوگا جس کی روشنی میں ہم کائنات کے متعلق وہ سب کچھ جان لیں گے جس کا جان لینا انسان کے لیے ممکن ہے (۶)۔ مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر جونز (F. W. Jones) کائنات میں وحدت نظم کی موجودگی اور سوچی سمجھی تدبیر (Plan) کی کار فرمائی پر بحث کرتا ہے۔ وہ تھامس ڈوائٹ (Thomas Dwight) کے حوالہ سے لکھتا ہے: ''اگر اس بات کو بفرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس قسم کا حیرت انگیز منظم پلان (Plan) محض اتفاق کی پیداوار ہے تو بھی اس قسم کے بے شمار منظم (Plans) کا اس طرح موجود ہونا اس مفروضہ کو مہمل قرار دیتا ہے۔ ہم ذی حیات اور غیر ذی حیات' دونوں میں حیرت انگیز نظم دیکھتے ہیں۔ جوں جوں ہم عناصر اور ان کے مرکبات سے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے''۔ (۷)

جدید تحقیقات نے سائنسی علوم کے ماہرین کو اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ کائنات کے اندر ایک نظم کو تسلیم کریں۔ اسی طرح وہ اس رائے کا بھی اظہار کر رہے ہیں کہ کائنات ایک مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہے اور اس مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔ انسان بھی اس کائنات کا جزو ہے اسی لیے یہ بھی سلسلۂ کائنات کے ساتھ اس منزل کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے۔ پروفیسر جونز (F. W. Jones) اپنی کتاب کے آخر میں لکھتا ہے:

اگر انسان نے اپنی فکر میں یہ تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی بے مقصد نہیں تو اس سے نوع انسان کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ انسانی زندگی کو بامقصد تسلیم کرنے کے ساتھ یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء

---

(۶) The Problem of Individuality / 63 - 64.

(۷) Design and Purpose/ 59.

غرضیکہ پوری کائنات بامقصد ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان شاہراہ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آئے کہ اس کے ساتھ تمام سلسلہ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہائے نگاہ ہے اور یہ اس کاروان کا ایک راہ رو ہے'' .... تاریخ کے جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی خواہ وہ اس قدر غیر اہم کیوں نہ ہو اس کائناتی مقصد کا جزو ہے۔(۸)

مذہبی نقطہ نظر

کائنات کے متعلق مذہب کا نقطہ نظر مختلف ہے۔ مختلف مذاہب نے اگرچہ کائنات اور انسان اور کائنات کے تعلق کے بارے میں مختلف تعبیرات پیش کی ہیں تاہم ایک قدر مشترک سب میں موجود ہے اور وہ کائنات کے خالق کا تصور ہے۔ مذہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات اور کائنات کے اندر موجود ہر شئے مخلوق ہے اور اس کا ایک خالق ہے۔

ہندو تصور

ہندوؤں کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات مخلوق ہے اور کنٹرول کرنے والی کئی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ ہندوؤں کے اساطیری ادب میں آسمانوں کے خدا اور زیریں دنیا کے خدا' روشنی کی قوتیں اور تاریکی کی قوتیں' نظم کی قوتیں اور بدنظمی اور تباہی کی قوتیں موجود ہیں۔ اسی طرح حرکت اور طاقت کی قوتیں ان کے تصور کائنات میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ان قوتوں کے باہمی تصادم کی وجہ سے انسان کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ آسمانی خداؤں کو دیوا اور زیریں دنیا کے خداؤں کو اسورا کہا جاتا ہے۔ البتہ ویدک دور کے بعد تین خداؤں کی حیثیت مسلم ہو گئی۔ براہما' وشنو اور شیوا۔ ہندومت نے انہی تینوں کو نظم کائنات کے حوالے سے اہمیت دی۔ براہما جو خالق کائنات ہے وشنو اس کا انتظام کرتا ہے اور سنبھالتا بھی ہے اور شیوا تباہی کا دیوتا ہے۔

کائنات کا نظام دورانیہ پر چلتا ہے موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ پیداوار اور زندگی کی خوشگواری وابستہ ہے۔ ہندوؤں نے ہر نفع بخش شئے کو خدائی حیثیت دے رکھی ہے۔ سورج' آگ پانی حتی کہ نفع و ضرر رساں جانور بھی خدائی فیض کا منبع ہیں۔ مشرکانہ رسوم اور وجودی فلسفہ کی بنا پر ہندوؤں کے ہاں انسان اور کائنات کے درمیان ایک دلچسپ تعلق قائم ہے۔ ویدک مصنف کائنات کو تخلیق در تخلیق اور قربانی کا عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ تصور بھی ہے کہ کائنات کسی بڑے منتظم کا کارخانہ ہے جس نے آسمان و زمین کو الگ کیا۔ سیارے اور ستارے مزین کئے اور زمین پر درخت پیدا کئے یہ کسی بڑے صانع کا کارنامہ ہے۔ کائنات کی تخلیق میں صرف ایک ہستی کی کارفرمائی ہے یا بہت سی ہستیوں کی تدبیر شامل ہے' اس کے بارے میں ہندوؤں کے متضاد نظریات موجود ہیں۔ ایک خالق کا تصور بھی ہے اور وجودی نقطہ نظر سے کائنات

---

(۸) Ibid.

اسی ہستی کا حصہ تھی جسے اس نے الگ کیا اور پھر اسی کے ساتھ مل جائے گی۔

ہم رگ وید (۹) میں پڑھتے ہیں کہ ابتدا میں ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ اگر خدا ہی وہ منفرد ذات ہے تو پھر اس کے ساتھ کوئی Primordial وجود نہیں ہو سکتا۔ لیکن آغاز کائنات کے بارے میں ہندوؤں کے ہاں ایک کنفیوژن موجود ہے۔ وہ کائنات کی تخلیق کی بات نہیں کرتے بلکہ ارتقائی ظہور کی بات کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں اس طرح کا تصور موجود ہے کہ کائنات خدا کا مظہر ہے یا خدا کائنات کا حصہ ہے۔ خدا کائنات سے الگ ہے مگر بالکل الگ نہیں۔ ویدانتی فلسفہ کے تحت خدا اور کائنات کے الگ تشخص کی بات خاصی الجھی ہوئی ہے۔ چونکہ انسان کائنات کا حصہ ہے اس لیے خدا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت بھی کائنات جیسی ہے۔ شنکر (Shankara 788 - 820) کے مطابق کائنات اور براہما ایک ہیں جبکہ مدھوا (Madhva 1199-1278) کے نزدیک براہما اور عالم مکمل طور پر جدا ہیں۔ ایک تیسری صورت بھی ہے کہ براہما اور عالم تنوع کے ہوتے ہوئے ایک ہیں۔ یہ رائے رامانوجا (Ramanuja 1056-1137) کی ہے۔ یہ شخص مدھوا کی طرح اپنشد پر مبنی فلسفہ وایدانت کا منکر نہیں ہے لیکن اس کی تعبیر شنکر سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا محض فریب نظر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

بدھ مت کا تصور

بدھ مت خدا کے مسئلے کو زیر بحث نہیں لاتا لہٰذا کائنات کی تخلیق یا ظہور کے تصورات غیر متعلق ہیں۔ البتہ انسان اور کائنات کے تعلق کے حوالے سے بدھ مت واضح تصور رکھتا ہے۔ بدھ مت کا رویہ سری نوعیت کا ہے دنیا دکھوں کا گھر ہے لہٰذا انسان کو نروان اور تنویر حاصل کرنے کے لیے علائق دنیا چھوڑ دینا چاہئے۔ دنیا سے کنارہ کشی ہی روحانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

یہودی وعیسائی تصور

یہودیت اور عیسائیت کا کلاسیکل نقطہ نظر بائبل کی نصوص پر مبنی ہے جس کا بیان (Genesis) میں ہے لیکن عیسائی علم کلام نے نئی جہتوں کو بیان کیا ہے۔ (Hans kung) نے ہندو تصور پر بحث کرتے ہوئے عیسائی نقطہ نظر کو مرتب انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے:

It is a theological formula for the belief that the world and humanity, space and time, have no other cause but God for their existence and since God is the origin of each and every thing, faces no competition from an evil or demonic counter principle (as he would in mazdaism or manachaism). According to the biblical account, the world in general and in particular, including matter, the human body and sexuality is fundamentally good.(۱۰)

Rig- veda, x, 129, 2. (۹)

ہندو تصورات پر تبصرہ کرتے ہوئے اور عیسائی نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

The world should be thought of as God's creation in such a way that the creator does not remain outside his work. Instead, creation can be understood as God's unfolding in the World, without the world dissolving into God or God into the world, without the world surrendering its autonomy or God vanishing into the world thus we could have creation as a process of unfolding God or God unfolding through creation. No being would be made into God, but neither it exists out side God.(۱۱)

God is to be thought of omnipresent, ineffable mystery of this world, a mystry that embraces the origin if its being, its becoming, its order, and to good, such that man and the world are neither independent of God nor a mere illusion, but a relative reality. Neither undifferentiated identity of God and the individual soul, nor a permanent out distinction between them, but the difference dialectically "Sublated" in identity. (۱۲)

انسان نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس کائنات کا حصہ سمجھا ہے اور اس کے اندر اور اس کے ساتھ رہ کر اپنی حیاتیاتی اور روحانی آرزوؤں کی تکمیل کی ہے۔ گرد و پیش کے ہیبت ناک نظاروں نے اسے توہمات کی دنیا میں لا کھڑا کیا اور وہ اشیاء کائنات کے ساتھ سازگاری کے عمل میں ان میں خدائی قدرت کے آثار تلاش کرنے لگا۔ اس طرح اس نے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کی اور دیوی دیوتاؤں کی صناعت سے وہ استمداد و استعانت کے اسلوب وضع کرنے لگا۔ ان تمام توہماتی سرگرمیوں کے باوجود قدیم فکر کی اساس انسان اور کائنات کی سازگاری پر ہے۔ اور یہ سازگاری بھی رفتہ رفتہ پیدا ہوئی ورنہ ابتداء میں تو وہ خارجی قوتوں کے سامنے یکسر بے بس و لاچار تھا۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک، بارش کی تباہ کاریاں، دریاؤں کی طغیانیاں، سمندر کی موجیں، پہاڑوں کی آتش فشانیاں، زمین کی زلزلہ خیزیاں، حادثات اور بیماریاں اور بالآخر موت وہ بے

---

(۱۰) Christianity and other Religions / 205

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عیسائی راہب بھی دنیا کو اسی طرح ناپاک سمجھتے تھے جیسے ہندو یوگی یا بدھ راہب۔ پھر مذہب و ریاست کی تفریق اور مذہب کو ذاتی تجربے تک محدود کرنے کے تصورات تو عیسائی علم کلام میں واضح طور پر موجود ہیں۔

(۱۱) Ibid

آخری جملے پر غور کریں۔ یہ مخصوص مسیحی مبہم انداز بیان ہے جو عقیدہ کی وضاحت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ "کوئی خدا کے اندر بھی نہیں اور باہر بھی نہیں" کا جملہ عقیدۂ تثلیث کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح وہ اسی عقیدے کی توضیح کرتے ہیں۔

(۱۲) Ibid/207

پناہ قوتیں تھیں جن کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ وہ ان سے ڈرتا' کانپتا اور لرزتا تھا اس لیے ان کے سامنے گڑگڑاتا اور جھکتا تھا۔ انہیں سجدے کرتا تاکہ وہ اس خوشامد کے ذریعہ ان کو راضی کر سکے اور ان کے ضرر سے محفوظ رہ سکے۔

دور حاضر کی سائنسی فکر نے ایک نئی طرح ڈالی ہے اور وہ تسخیر کائنات کی ہے۔ اس فکر کی رو سے کائنات انسان کے مدمقابل اور نقصان دہ ہے لہٰذا اسے کنٹرول کرنا اور مسخر کرنا انسان کے مفاد میں ہے۔ دور حاضر کی سائنس نے تجربات و اکتشافات کے حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں۔ بحر و بر اور فضا و آسمان کے چھپے گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوششوں کے ساتھ حقائق اشیاء کو جاننے کی انسانی کاوشوں نے نئے زاویے منکشف کیے ہیں۔ تسخیر کائنات کے فلسفے نے انسان کو وسائل کائنات کے استحصال کا زبردست موقعہ دیا ہے۔ لیکن اس استحصال کا نتیجہ ماحول کا عدم توازن ہے۔ کائناتی حرارت (Global warming) اور فطری توازن (Echo system) کی تباہی انسانیت کے لیے نئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ قدیم فکر کا اشیاء کائنات کی پرستش کا تصور اور دور جدید کا تصور تسخیر دونوں غیر متوازن ہیں' دونوں سے انسان کو مجموعی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ انسان نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر زنجیر حقائق عالم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعض مشاہدات و اکتشافات کی وجہ سے سائنسدانوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ صرف کائنات کا ایک صحیح تصور پیش کر سکیں گے لیکن اپنی پہلی بڑی بڑی امیدوں کے باوجود سائنس دان کچھ عرصہ سے اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ وہ قیامت تک بھی قوانین کائنات کی زنجیر کی ساری کڑیوں کو دریافت نہیں کر سکیں گے۔ (۱۳) اس تسخیر سے اس کی مادی قوت میں اضافہ ہوا ہے لیکن اقبال کے بقول:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

میسن (J. W. T. Mason) لکھتا ہے:

''اگر انسان نے اپنے اندر کردار' عزم اور ایسی قوت پیدا نہیں کی جو مادی ترغیبات کا مقابلہ کر سکے' تو مادہ پر جس قدر قوت انسان کو حاصل ہوتی جائے گی اسی قدر اس کا اندیشہ زیادہ ہوگا کہ یہ مادی قوت اسے تباہ کر دے گی'' (۱۴)

---

(۱۳) قرآن اور علم جدید/۹۹

(۱۴) Creative Freedom / 28.

ارسطو سے لے کر ابن خلدون تک ہر شخص کا کہنا ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ اسے اپنے ہم جنس کے ساتھ رہنا ہے۔ لیکن انسانی تاریخ اس کے بھیانک مظالم سے بھری پڑی ہے۔ اگرچہ بعض جنگلی قبائل میں انسان خوری کی مثالیں پائی گئی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انسان خوری اس کی عادت نہیں بن سکی۔ انسانی تعلق کی قدیم ترین مثال تو ہندوؤں کی ہے جنہوں نے ذات پات کا ایک مستحکم نظام قائم کیا۔ اس نظام میں انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں سے جو سلوک کرتا ہے وہ انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوؤں نے دور حاضر میں اس امتیازی اور ظالمانہ سلوک کو قائم رکھا ہے اور ہندومت پر لکھنے والے مصنفین ہندوؤں سے زیادہ اس کی توجیہات پیش کرتے ہیں:

Ever since the middle of the first millennium B. C. There have been loud and repeated demands that people should be judged not by their social origin, but by their qualities. This ideal was tried out by a number of religious communities but over the course of time, most of them went back to achnowledging the cast or cast like structure.(۱۵)

مختلف مذاہب اور معاشروں میں انسان کی غلامی اور اس کی خرید و فروخت ایک مسلمہ اصول کی حیثیت سے رہی۔ نسلی امتیاز اور گروہی تفوق بھی اب تک ایک تصور اور عقیدے کے طور پر موجود ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ جس تحریک اور تصور نے امتیازات کی صورتوں کو مستحکم کیا وہ عصر حاضر کا نیشنلزم ہے جس نے قوموں کو غلام اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ انسان اور انسان کے تعلق کو دور حاضر کے جس تصور نے تباہ کیا وہ بقاء اصلح Survival of the fittest کا اصول ہے۔ اس کے مطابق حیاتیات کے دائرے میں جو کشمکش اور تنازع للبقاء ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کمزور مٹ جائیں اور طاقتور قائم رہ جائیں۔ اسے فطرت کا اصول بنا کر پیش کیا گیا اور انسانی زندگی کو حیاتیاتی لحاظ سے حیوانی دنیا سے متعلق کیا گیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق انسان حیوانیت کی ایک ارتقائی کڑی ہے۔ ڈارون (Darwin 1809 - 1882) نے دعویٰ کیا کہ طبعی قوانین کے زیر اثر دنیا میں حیات نمودار ہوئی۔ حیات نے بالآخر انسان کی شکل میں ظہور کیا ہے جس سے ضمنی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ کارنامہ بغیر خداوند تعالیٰ کے چل رہا ہے اس طرح خدا کے وجود اور اس کی خالقیت کا انکار کر دیا گیا۔ انسان کی حیوانیت، خدا کا انکار اور بے مقصد حیات کی وجہ سے عصر حاضر نے انسان کشی کی جو مثالیں قائم کی ہیں اس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پروفیسر سورکن (Sorokin) لکھتے ہیں:

گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک تمام جنگوں میں مجموعی طور پر کوئی ڈیڑھ کروڑ آدمی

---

(۱۵) Christianity and other religions / 248 - 49.

قتل ہوئے اور زخمی ہوئے۔ لیکن دنیا کی پہلی جنگ عظیم میں کوئی دو کروڑ انسان ہلاک ہو گئے اور جنگ عظیم دوم میں تو صرف ایک شہر ہیروشیما میں دو کروڑ آدمی ہلاک اور ناکارہ بنادیے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہلاک شدگان کی تعداد پانچ کروڑ سے زائد تھی۔(۱۶)

انسانیت کشی کی یہ رسم اب بھی جاری ہے۔ انسان انسان کے خلاف جو کچھ کر رہا ہے اس کے پیچھے مغربی مفکرین کی آراء ہیں۔ روسو کہتا ہے "انسان ایک وحشی ہے البتہ اس کو سدھایا جا سکتا ہے" ہابز کے مطابق ایک انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا ہے" ہیوم کے نزدیک انسان کو بدمعاش تصور کیا جانا چاہیے۔ مسئلہ ارتقاء کے زیر اثر انسان کو نرا حیوان قرار دے کر انسانی زندگی کو بے مقصد حیوانی کشمکش قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا انسان اور انسان کا تعلق رحمت و شفقت کا نہیں بلکہ حیوانی چیر پھاڑ کے قانون پر مبنی ہے جو جنگل کا قانون تو ہو سکتا ہے انسانی معاشرے کا نہیں۔ انسان کے متعلق غلط تصورات کی وجہ سے انسان نے انسان سے جو سلوک کیا ہے وہ خوفناک ہے۔ انسانی رویہ اور زیادہ ہولناک ہو جاتا ہے جب اسے Institutionalise کر لیا جاتا ہے مثلاً ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت کے بعد بیوی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کیا جاتا رہا۔ اس کو شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ ہندوستان ہی میں انسانوں کے ایک طبقہ کو اچھوت قرار دیا گیا اور انہیں انسانیت کے مرتبے سے محروم رکھا گیا۔ یونان میں ارسطو (Aristotal 384-322 B.C) جیسا فلسفی عورتوں اور غلاموں کو انسانوں سے فروتر درجہ دیتا ہے۔ بدھ مت کے زیر اثر ہندوستان میں اور کیتھولک مذہب کے زیر اثر یورپ میں ازدواجی تعلقات کو گندگی قرار دیا گیا جس سے اجتناب ضروری تھا۔ امریکہ میں ریڈ انڈین (Red Indian) کے ساتھ اور آسٹریلیا میں مقامی باشندوں (Aborignes) کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ انسانیت کے لیے باعث شرم ہے۔ سفید فام امریکیوں نے ریڈ انڈین کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے ان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ قتل و نہب کے اس پورے عمل میں انہیں دادفریاد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ 1830ء میں امریکی صدر انڈریو جیکسن (Andrew Jachson) نے کانگریس سے یہ ظالمانہ قانون پاس کرایا کہ ریڈ انڈین کی گواہی امریکی عدالت میں ناقابل قبول ہے۔ اس قانون کے پاس ہونے کے بعد ان کے تمام مقدمات خارج کر دیئے گئے (۱۷) انسان اور انسان کے تعلق کے بارے میں مختلف مذاہب اور جدید سیکولر فکر نے جو غلط بنیادیں فراہم کی تھیں ان کے نتیجے میں انسانیت کا خون بہتا رہا' اس کی تذلیل ہوتی رہی اور انسان دوسرے انسان کے لیے واقعی بھیڑیا ثابت ہوا۔ رہی سہی کسر جدید سرمایہ دارانہ نظام نے پوری کر دی جس نے انسانی زندگی میں مسابقت کے اصول کو بنیاد قرار دیا۔ اس مسابقت نے کمزوروں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ جدید سرمایہ دارانہ زبان میں اس مسابقت کو Cut throat competition قرار دیا گیا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ واقعی گلا کاٹنے والی سرگرمی ہے۔

---

(۱۶) Reconstruction of Man/104.

(۱۷) William & Branden, the Indian Removal, The American Heritage . book of Indians, New York 1961.

اسلام کا تصور انسان

ہم نے قدیم اور جدید فکر کی روشنی میں انسان کی ابتداء اس کی حیثیت' انسان اور انسان اور کائنات اور انسان کے تعلق کا جائزہ لیا ہے جو واضح طور پر غیر متوازن نظر آتے ہیں۔ اسلام نے انسان کے بارے میں غیر متوازن نظریات کے مقابلے میں عظمت انسانی کے بارے میں ایک مثبت اور متوازن نظریہ پیش کیا۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے انسانی عظمت کا نظریہ اس وقت پیش کیا جب ان بنیادوں پر سوچنے کا شعور بھی کم ہی تھا۔ گذشتہ صفحات میں جن نکات پر بات کی گئی ہے انہی کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر پیش کیا جائے گا۔

تخلیق انسان

تخلیق انسان کے سلسلے میں اسلام کا موقف تقریباً وہی ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کا ہے یعنی انسان اللہ کی براہ راست تخلیق کردہ مخلوق ہے البتہ قرآن نے جو تفصیلات دی ہیں وہ مختلف ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۱)

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی' پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

سید مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (۲)

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی' پھر تمہیں صورت بخشی' پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادہ آفرینش تیار کیا' پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی' پھر جب ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آ گیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ ص میں ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۳)

تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں' پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔''

اس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق پھر اس کا تسویہ یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا' پھر اس کے اندر اپنی روح

---

(۱) الاعراف/۱۱ (۲) تفہیم القرآن ۲/۱۰

(۳) ص/۷۱-۷۲

سے کچھ پھونک کر آدمؑ کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حجر میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے:

وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ O فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۴)

اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔"

تخلیق انسانی کے اس آغاز کو اس تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی لیکن بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں ڈارون کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تاریخی ارتقاء کے طویل خطہ میں کوئی نقطہ خاص ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر "نوع انسانی" کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے، اس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین، حتی کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اس کے لیے حیوانات کا سا طرز عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرز عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرز عمل اور حیوانی طرز عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش ونگار کے بغیر کرتے ہیں انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے "انسان" ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ "حیوان ناطق" یا "متمدن جانور" نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سپرد

(۴) الحجر/۲۸۔۲۹

کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یک سر مختلف ہو جائے گی۔ آپ انسان کے لئے ایک دوسرا ہی فلسفہ حیات اور ایک دوسرا ہی نظام اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالم اسفل کے بجائے عالم بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔(۵)

قرآن نے تخلیق انسان کے بارے مختلف مقامات پر ارشادات ربانی پیش کئے ہیں۔ ان آیات کے مطالعہ سے ایک تصویر ابھرتی ہے جو اسلام کے تصور انسان کو واضح کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ (۶)

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کے لپٹ سے پیدا کر چکے تھے۔ پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔"

یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آتا ہے۔ جیسا کہ نئے دور کے ڈارونیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کی تخلیق ابتداء براہ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صلصال من حما مسنون کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ حمأ عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بو پیدا ہو چکی ہو، یا بالفاظ دیگر خمیر اٹھ آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں متغیر متعفن اور املس یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔ سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں۔ اور نار کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے۔ روح کے لفظ سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفات الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی

---

(۵) تفہیم القرآن، ۲/۱۹-۱۱

(۶) الحجر/۲۶-۲۹

ہیں، جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبد خاکی پر ڈالا گیا ہے اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجودات ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ یوں تو ہر صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ اس کا مصدر منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ

جعل الله الرحمة مِأة جزء فامسك عنده تسعة وتسعين وانزل فى الارض جزءا واحدا فمن ذلك الجزء تتراحم الخلق حتى ترفع الدابة حافرها عن ولدها خشية ان تصيبه (۷)

اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے تاکہ اسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اس حصہ رحمت کا اثر ہے"۔ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔ یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی ہو جائے تو انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفات الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جز پا لینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراء الوراء ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پا سکے۔ (۸)

ایک اور مقام پر تخلیق انسانی کو دوسرے پیرایہ میں بیان کیا۔ اصل مضمون ایک ہے لیکن یہاں ابتدائی تخلیق کے بعد نسل انسانی کے تسلسل کو بیان کیا۔ فرمایا:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۹)

جو چیز اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔ پھر اس کو نِک سِک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں، اور دل دیئے تم لوگ کم ہی شکر گذار ہوتے ہو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یعنی اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد وحساب چیزیں بنائی ہیں، مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو۔ ہر شے اپنا الگ حسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ متناسب اور موزوں ہے جو چیز جس کام کے

(۷) بخاری، کتاب الادب، باب جعل الله الرحمة فى مائة جزء، ۱۰۵۰/۲، مسلم، کتاب التوبہ، باب فى سعة رحمة الله/۱۱۹۳

(۸) تفہیم القرآن، ۲/ ۵۰۵

(۹) السجدہ ۳۲/ ۷-۹

بھی اُس نے بنائی ہے اس کے لیے موزوں ترین شکل پر مناسب ترین صفات کے ساتھ بنائی ہے دیکھنے کے لئے آنکھ اور سننے کے لئے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ہوا ٹھیک ایسی ہی ہے جیسی ہونی چاہئے اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہئیں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دہی نہیں کر سکتے، نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

پہلے اس نے براہ راست اپنے تخلیقی عمل (Direct Creation) سے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفہ سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور تعقل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آئندہ مزید انسانوں کو پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ آیت قرآن مجید کی ان آیات میں سے ہے جو انسان اول کی براہ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون کے زمانہ سے سائنس دان حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اس کو ایک غیر سائنٹیفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں۔ لیکن انسان کی نہ سہی تمام انواع حیوانی کی نہ سہی اولین جرثومہ حیات کی براہ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑے گی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے، حالاں کہ صرف ایک خلیہ (Cell) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اس سے لاکھوں درجہ غیر سائنٹیفک بات ہے جتنا نظریۂ ارتقاء کے قائلین نظریۂ تخلیق کو ٹھہراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے، اور پھر اس کی نسل تناسل (Procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے علمبرداروں کی ساری سائنٹفک شاعری کے باوجود ان کے نظریہ ارتقاء میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انتہائی باریک خوردبینی وجود سے بڑھا کر اسے پوری انسانی شکل تک پہنچایا اور اس کا جسم سارے اعضاء و جوارح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان

تمام دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز ایک صاحب شخصیت ہستی، صاحب انا ہستی، اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔ اس روح کو
اللہ تعالیٰ نے اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اسی کی ملکیت ہے اور اس کی ذات پاک کی طرف اس کا انتساب اسی طرح کا ہے
جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم،
فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا
سرچشمہ مادے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو
دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے
اندر نہیں آئے ہیں۔

ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک لطیف انداز بیان ہے۔ روح پھونکنے سے پہلے انسان کا سارا ذکر صیغہ غائب
میں کیا جاتا رہا۔ ''اس کی تخلیق کی''، ''اس کی نسل چلائی''، ''اس کو نک سک سے درست کیا''، ''اس کے اندر روح پھونکی''،
اس لیے کہ اس وقت تک وہ خطاب کے لائق نہ تھا۔ پھر جب روح پھونک دی گئی تو اب اس سے فرمایا جا رہا ہے کہ ''تم کو
کان دیے''، ''تم کو آنکھیں دیں''، ''تم کو دل دیے'' اس لیے کہ حامل روح ہو جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اسے
مخاطب کیا جائے۔ کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حصول علم کے ذرائع
ذائقہ اور لامسہ اور شامہ بھی ہیں۔ لیکن سماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے بڑے اور اہم ذرائع ہیں۔ اس لیے قرآن
جگہ جگہ انہی دو کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد دل سے مراد وہ ذہن ہے جو حواس کے
ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی ایک راہ
منتخب کرتا ہے اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ (۱۰)

تخلیق انسان اور اس کے نسلی تسلسل کے بارے میں قرآن کا بیان زیادہ منطقی اور مدلل ہے۔ اس بیان سے انسان
کی اخلاقی شخصیت، ذمہ دارانہ حیثیت اور اشرف المخلوقات ہونے کا تصور زیادہ بہتر طور پر اجاگر ہوتا ہے۔ قرآن کے مطابق
وہ خلیفہ ہے جو نیابت الٰہی جیسے عظیم فریضہ کی ادائیگی پر مامور کیا گیا ہے۔

(۱۰) تفہیم القرآن ۴/۴۰-۴۲

انسان اور رب تعالیٰ

ایک اہم بات جس کی طرف انسان کی توجہ دلائی گئی ہے وہ انسان اور رب تعالیٰ کا تعلق ہے۔ انسان تھوڑی سی قوت کے بل بوتے پر کبھی کبھی غلط فہمی کا بھی شکار ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مالک سمجھنے لگ گیا ہے بلکہ خدائی دعوے بھی کر بیٹھا ہے یہ دوسری انتہا ہے جس پر اسے بہر حال نہیں پہنچنا چاہئے تھا۔ قرآن پورے زور استدلال سے ثابت کرتا ہے کہ انسان خدا نہیں۔ وہ اس کائنات میں مالکانہ حقوق بھی نہیں رکھتا وہ شتر بے مہار بھی نہیں بلکہ اس کا بندہ ہے اور بندہ بھی کمزور جسے چند روزہ زندگی میں خدائی احکام کی پیروی کرنی ہے وہ یہاں خدا کے نائب اور بندہ کی حیثیت سے رہ رہا ہے خدا کی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس سے انسان کا بیجا غرور بھی ٹوٹتا ہے اس کی عظمت بھی واضح ہوتی ہے اور اس کی صحیح حیثیت کا تعین بھی ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے اسے یوں بیان کیا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ O فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ O وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۱)

ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یونہی مہمل (خالی از حکمت) پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی عالیشان ہے جو کہ بادشاہ حقیقی ہے اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارے گا اس کے معبود ہونے پر ہے اس کے پاس کوئی بھی دلیل نہیں تو اس کا حساب اسی کے رب کے ہاں ہوگا۔ یقیناً کافروں کو فلاح نہ ہوگی۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا O اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۱۲)

اور ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا ہو پھر اس کے ذریعے سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی ہوں پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اڑائے لیے پھرتی ہو اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔

---

(۱۱) المؤمنون/ ۱۱۵ تا ۱۱۷

(۱۲) الکہف/ ۴۵، ۴۶

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّاشَآءَ رَكَّبَكَ (۱۳)

اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو انسان بنایا پھر تیرے اعضاء کو درست کیا پھر تجھ کو اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (۱۴)

تو ہم نے تم کو مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے جو پوری ہوتی ہے اور ادھوری بھی تا کہ ہم تمہارے سامنے (اپنی قدرت) ظاہر کر دیں اور ہم (ماں کے) رحم میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تم کو بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں پھر تا کہ تم اپنی جوانی تک پہنچ جاؤ اور بعضے تم میں وہ بھی ہیں جو پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض تم میں وہ نکمی عمر (یعنی بڑھاپے) تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِىَ خَلْقَهٗ (۱۵)

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا سو وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِىْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۶)

اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں ہم ہی نے تمہارے درمیان موت کو ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ اور تم جیسے پیدا کر دیں اور تم کو ایسی

---

(۱۳) الانفطار/ ۶،۸

(۱۴) الحج/ ۵

(۱۵) یسین/ ۷۷،۷۸

(۱۶) الواقعہ/ ۵۸-۶۲

ورت میں بنادیں جن کو تم جانتے ہی نہیں اور تم کو اول پیدائش کا علم ہے پھر تم کیوں نہیں سمجھتے ؟

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا○ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا○ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا(۱۷)

اور جب تم کو سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بجز اللہ کے اور جتنوں کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب تم کو وہ خشکی کی طرف بچالاتا ہے تو پھر تم پھر جاتے ہو اور انسان ہے بڑا ناشکر گزار۔ تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ وہ تم کو خشکی کی جانب میں لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی ایسی تند ہوا بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدائے تعالیٰ پھر تم کو سمندر ہی میں دوبارہ لے جائے پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا تم کو نہ ملے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَاۤ اَكْفَرَهٗ ○ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ○ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ (۱۸)

انسان پر خدا کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی چیز سے پیدا کیا نطفہ سے بنایا اور پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

انسان کے بگڑنے اور اس کی ذلت و بے راہ روی کے یہی دو نقاط ہیں جنہیں اسلام نے بیان کیا۔ مندرجہ بالا آیات میں اللہ نے انسان کی بے بسی اور اس کی حیثیت بیان کر کے بتایا ہے کہ اسے مغرور متکبر غیر ذمہ دار اور ظالم نہیں بننا چاہئے بلکہ اپنی کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اعتدال پر رہنا چاہیے۔ اسلام انسان کے متوازن مقام کو اس طرح متعین کرتا ہے کہ اسے کائنات سے مرعوب ہونے کی ضرورت ہے نہ اپنے آپ کو ایسی بلند ہستی تصور کر لینے کی کہ خدائی احکام ہی سے روگردانی کرنے لگے۔ انسان اور اللہ کا تعلق خالق و مخلوق کا ہے۔ قرآن نے واضح طور پر تخلیق انسان کا ذکر کیا ہے اس لیے انسانی وجود کا بخت و اتفاق سے ہونا قرآنی تصور کے منافی ہے۔ قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ انسانی تخلیق بے مقصد نہیں وہ کہتا ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۱۹)

''اور میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''۔

انسان اور اس کے رب کے تعلق میں ایک خاص بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اسے ذمہ داری سونپی ہے اور وہ اس

---

(۱۷) بنی اسرائیل/ ۶۷-۶۹

(۱۸) عبس/ ۱۷-۱۹

(۱۹) الذاریات/ ۵۶

سے اس کا حساب لے گا۔قرآن نے اسے نمایاں طور پر بیان کیا ہے:

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى O اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِيٍّ يُّمۡنٰى O ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى O فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى O اَلَيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡـِۧىَ الۡمَوۡتٰى (۲۰)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ منی کا جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا پھر لوتھڑا ہوا پھر اللہ نے اس کی تخلیق کی پھر اس کے اعضاء درست کئے پھر اس کی دو قسمیں بنائیں۔مرد اور عورت کیا اللہ اس پر قادر نہیں کہ وہ مُردوں کو جلا اٹھائے۔

اللہ اور انسان کے تعلق میں اسلام دو امور پر توجہ مرکوز کرتا ہے ایک یہ کہ انسان مخلوق ہے اور اللہ خالق لہٰذا انسان کو اپنے معاملات اس طرح ترتیب دینے چاہئیں کہ وہ مخلوق ہی رہے اللہ بننے کی کوشش نہ کرے کیونکہ اس سے فساد برپا ہوگا اور دنیا ظلم کدہ بن جائے گی۔دوسری بات جس کی طرف اسلام توجہ دلاتا ہے وہ انسان کی ذمہ داری اور زندگی کی محدود مہلت ہے۔

خالق نے اپنی مشیت میں افراد کے لیے انفرادی طور پر اور قوموں کے لیے اجتماعی طور پر ایک مہلت رکھی ہے۔ اس مدت میں انہیں عمل کرنے کی کھلی اجازت ہے۔پھر موت آتی ہے اور وہ مہلت ختم ہو جاتی ہے پھر آخرت کا نیا نظام ہوگا اور وہاں اس مہلت کے بارے پوچھا جائے گا۔قصہ آدم وابلیس میں قرآن نے دو حقائق بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ زمین پر قیام کی مدت متعین ہے اور دوسرے یہ کہ رب تعالیٰ کی طرف سے درست طرز عمل کے لیے رہنمائی مہیا کی جائے گی لیکن اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا جبر نہیں ہوگا۔انسان اپنے اختیار و ادارہ سے جو طرز عمل اختیار کرے گا اس کا بدلہ اسے ضرور ملے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ (۲۱)

تب ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک مدت تک ٹھکانا اور معاش مقرر کر دیا گیا ہے۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (۲۲)

ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جنھوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

---

(۲۰) القیامہ/۳۶-۴۰

(۲۱) البقرہ/۳۶

(۲۲) ایضا/۳۸

انسان ان دو امور سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی زندگی محدود اور متعین ہے اور اس تعلق کو خوش گوار بھی بنایا جا سکتا ہے اور ناخوش گوار بھی۔ اس کی پوری زندگی کا ریکارڈ نئے نظام کے آغاز پر اسے پیش کر دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا:

اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۲۳)

آج کے دن شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا آج بے انصافی نہیں ہوگی بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا O اِقْرَاْ کِتٰبَكَ کَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا O مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَلَاتَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۲۴)

اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال کر دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ اپنی کتاب پڑھ لو تو آج اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔ جو شخص ہدایت کی راہ اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کا ضرر بھی اسی کو ہوگا اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

اطاعت اور بغاوت کا رویہ جس طرح افراد پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح قوموں پر بھی۔ قوموں کی مہلت بھی متعین ہے اور ان کی جزا و سزا کا قانون بھی طے شدہ ہے۔ جس طرح ایک فرد ایک متعین مدت کے بعد مر جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی مٹ جاتی ہیں البتہ قوموں کی ہلاکت بعض اوقات بڑی عبرت انگیز ہوتی ہے قرآن نے اس بارے میں مفصل تبصرے کئے ہیں ہم نمونہ کے طور پر صرف ایک اقتباس نقل کریں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا O وَکَمْ اَهْلَکْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ وَکَفٰی بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا (۲۵)

جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوتا ہے تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (خواہش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے ہیں اس پر اللہ کا حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی امتوں کو ہلاک کر ڈالا اور تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے اور دیکھنے کے لیے کافی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان خدا نہیں ہے۔ غیر ذمہ دار اور خود مختار بھی نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے۔ اس کی آزادی اور خود مختاری کی ایک حد ہے۔ اس طرح وہ لامحدود زندگی کا مالک نہیں ہے۔ اس کے خالق نے اس کے لیے موت

---

(۲۳) الغافر/۱۷

(۲۴) الاسراء/۱۳۔۱۵

(۲۵) ایضاً/۱۶۔۱۷

کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ اس کا مطلوب تعلق اطاعت' عبادت اور محبت کا ہے۔ یہی تعلق اس کی فلاح کا ضامن ہے۔ تعلق کی دیگر تمام نوعیتیں اس کے لیے مشکل کا باعث بنیں گی۔ انسانی فلاح کا دارومدار اس تعلق کی نوعیت پر ہے۔ قرآن نے کہا:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ O الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ O وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ O اُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۶)

یہ کتاب اس میں کچھ شک نہیں۔ ڈرنے والوں کی رہنما ہے جو غیب پر ایمان لاتے' آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں آپ سے پہلے نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو فساد ہے اس کا ایک بڑا سبب انسان کی رب ناشناسی ہے۔ وہ اپنے محدود مفادات اور خواہشات کی بنا پر اقدام کرتا ہے اور وہ اقدام انسانوں کے لیے بھی اور کائنات کے لیے بھی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ رب کریم نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تا کہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے عجیب نہیں کہ وہ باز آ جائیں۔

انسان اور کائنات

لیز لی پال (Leslei Paul) انسان اور کائنات کے تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلقات جس قدر زیادہ واضح ہوتے ہیں اور ان کی معقولیت نکھرتی جاتی ہے اسی نسبت سے مذہب قوی ہوتا جاتا ہے۔ (۲۸) مختلف مذاہب میں مظاہر فطرت کی پرستش کا سبب ہی یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے ربط کو نہیں سمجھا گیا۔ انسان کائنات کی مختلف پرشکوہ چیزیں دیکھ کر ان کے سامنے جھکنے لگتا ہے حالانکہ اس کے لیے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش

(۲۶) البقرہ/۲۔۵

(۲۷) الروم/۴۱

(۲۸) The Annihilation/170

نہیں۔ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیاء انسان کے لیے بنائی گئیں اور وہ اس کی خدمت پر مامور ہیں۔ یہ ان سے کام لے سکتا ہے اسے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح قرآن اس تصور کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ کائنات اور انسان ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اور انسان بزور اسے مسخر کرے گا۔ تسخیر کائنات کا یہ تصور اسلامی نقطہ نظر سے مہلک ہے۔ کائنات کے خالق نے اسے انسان کے لیے مسخر کیا ہے۔ انسان اپنی کوششوں سے اشیاء کائنات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کائنات سے انتفاع خالق کائنات کی منصوبہ بندی کے عین مطابق ہے۔ قرآن نے تسخیر کی اصطلاح استعمال کر کے اس تصور کی وضاحت کی ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات کو انسان کی منفعت کے لیے بنایا گیا ہے اور اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان و کائنات دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور دونوں ایک مقصد تخلیق کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ انسان اور کائنات میں تصادم نہیں توافق ہے۔ اجزاء کائنات اطاعت رب میں سرگرم ہیں اور کائنات کا نظام خالق کائنات کے قوانین اور اس کے تکوینی حکم کے مطابق چل رہا ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کائناتی نظام سے ہم آہنگی رکھتے ہوئے اطاعت اور بندگی رب کی راہ پہ چلے۔ قرآن مجید نے تسخیر کائنات، اطاعت کائنات اور انسانی ہم آہنگی اور عبادت رب کے بارے میں واضح اعلانات کئے ہیں۔ قرآن پاک میں بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲۹)

جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۳۰)

کیا تم دیکھتے نہیں کہ جتنی چیزیں زمین میں ہیں اللہ نے تمہارے زیر فرمان کر رکھی ہیں اور کشتیاں جو اسی کے حکم سے دریا و سمندر میں چلتی ہیں۔ وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پہ نہ گر پڑے مگر اس کے حکم سے۔ بے شک اللہ نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ

---

(۲۹) البقرہ/۲۹

(۳۰) الحج/۶۵

شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ○ یُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ○ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۳۱)

اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لیے ایک شان جمال ہے جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر جانکاہی نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری کے لیے ہیں اور سامان زیست ہیں۔ اللہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے.......... وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ اس میں کچھ تمہارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کا چارا حاصل کرتے ہو۔ اسی پانی سے اللہ تمہارے لیے کھیتی اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے پھل اگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے تمہارے لیے رات اور دن' سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں۔ یہ سب اسی اللہ کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت سی مختلف الانواع چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔ ان میں سبق حاصل کرنے والون کے لیے بڑی نشانی ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ اور زیست کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی میں تیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجالاؤ۔ اس نے زمین پر پہاڑ لگادیے کہ زمین تم کو لے کر نہ جھک جائے اور دریا اور راستے بنا دیے کہ منزل مقصود کی راہ پاؤ۔ اور بہت سی علامات بنائیں' منجملہ ان کے تارے بھی ہیں۔ جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ تو جو یہ سب کچھ پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ پیدا نہ کرسکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۳۲)

(۳۱) النحل/۵۔۱۸ (۳۲) یٰسین/۸۰

وہ ایسا (قادر) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے پھر تم اس سے آگ سلگاتے ہو۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۳)

سو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعض چیزیں تمہارے) اور (بعض چیزیں) تمہارے مواشی کے فائدے کے لئے۔

یہی مضمون سورہ نازعات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔قرآن پاک اشیاء کائنات کو انسان کے لیے فائدہ مند، خدمت گذار اور مسخر قرار دے رہا ہے ان کے سامنے انسان کا سر بسجود ہونا اور ان سے حاجت روائی کی دعا کرنا اس کی کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔مذکورہ بالا آیات میں انسان کو یہ باور کرایا گیا کہ زمین کی جتنی چیزیں ہیں وہ سب اس کی خدمت اور منفعت کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند یہ سورج اور یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو انسان دیکھتا ہے اس کی خادم ہیں، اس کی منفعت کے لیے ہیں اور انہیں اس کے لیے کارآمد بنایا گیا ہے۔اسے بتایا گیا کہ اسے سب پر فضیلت ہے، اسے ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے اور اس کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔یہ بڑی بے عقلی کی بات ہے کہ انسان اپنے خادموں کے سامنے سر جھکاتا پھرے، ان کو اپنا حاجت روا سمجھے اور ان کے آگے دست سوال دراز کرے، ان سے مدد کی التجائیں کرے، ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا رہے اور ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا رہے۔ایسا کرنے سے نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور اپنا مرتبہ گراتا ہے بلکہ خادموں کا خادم اور غلاموں کا غلام بن کر اپنے خالق و مالک کی بھی ناشکری کرتا ہے۔(۳۴)

کائنات کی مقصدیت

قرآن کے مطابق اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور اس نے اسے ایک مقصد کے تحت بنایا ہے۔یہ اندھی بہری قوت (Nature) کا کام نہیں کہ بلا کسی علم، عقل، شعور اور ارادہ و حکمت کے چلا رہی ہے۔کائنات کا نظام کسی بنانے والے کے بغیر نہیں چل رہا، نہ یہ از خود بن گیا ہے اور نہ خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی طرح چل رہا ہے۔قرآن کے نقطہ نظر

(۳۳) عبس/۲۴۔۳۲

(۳۴) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی/۲۶

ے اس کا بنانے والا، اس کا چلانے والا اور اس کو سنبھالنے والا موجود ہے اور وہی ایک مقصدیت کے تحت پورے نظام ع

کو چلا رہا ہے۔

ارشادِ باری ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ o وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ

لَايَعْلَمُوْنَ o اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ o (۳۵)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ہم نے تو ا

مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یقیناً ان سب کے لیے فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَ

مُّسَمًّى وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (۳۶)

کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ج

کیا ہے تو حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے اور ان کے لیے ایک وقت مقرر ہے؟ مگر بہت سے لوگ ہیں جو اپنے ر

ملاقات کے منکر ہیں۔

تکوینی نظام

کائنات اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت چل رہی ہے اور کائنات کا ایک ذرہ بھی اس نظام سے ادھ

نہیں ہو سکتا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَايَعْلَمُوْنَ o وَاٰيَ

الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَاهُمْ مُّظْلِمُوْنَ o وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَ

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ o لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا

سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۷)

اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جا

اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے اور غالب و دانا کا اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی

تک کہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی د

---

(۳۵) الدخان/ ۳۸-۴۰

(۳۶) الروم/ ۸

(۳۷) یٰسین/ ۳۶-۴۰

پہلے آسکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

کائنات کا یہ لگا بندھا نظام کسی اندھے کی لاٹھی نہیں کہ یونہی ایک مدت تک چلتا رہے اور پھر بغیر کسی نتیجہ کے معدوم ہو جائے۔ کائنات کی کوئی شئی تکوینی نظام سے منحرف نہیں ہے۔ قرآن نے علامتی طور پر زمین و آسمان کی اطاعت کو بیان کیا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ پوری کائنات اپنے خالق کی مطیع و تابع فرمان ہے اور جہاں جہاں جس جس کو جیسا حکم ملا ہے اس کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ انسان ابھی تک کائناتی قوانین ہی کے انکشاف میں لگا ہوا ہے اور ابھی تک اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکا جب بھی کوئی اکتشاف ہوتا ہے تو تکوینی نظام کی حقانیت اور زیادہ مبرہن ہوتی ہے۔ کائنات کا اپنے خالق کے سامنے سرنگوں رہنا کائناتی حقیقت ہے جسے قرآن نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ارشادالٰہی ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳۸)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۳۹)

اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی یا زبردستی سے اللہ کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ کرتے ہیں۔

تخلیق کائنات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِىْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِىْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ O وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِىْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ O ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْكَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ O فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِىْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُالْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ O (۴۰)

کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور اس کے مد مقابل معبود بناتے ہو وہی تو سارے جہاں کا مالک ہے۔ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں اور تمام طلبگاروں کے لیے یکساں ہے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دن میں

---

(۳۸) آل عمران/۸۳ (۳۹) الرعد/۱۵ (۴۰) فصلت/۹-۱۲

سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبردست اور خبردار کے اندازے ہیں۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات تکوینی قوانین کے ذریعہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ جب تک وہ چاہے گا یہ نظام چلے گا اور جب اسے منظور ہوگا وہ اسے بدل دے گا۔ کائنات کا نظام وجود خالق کا مرہون منت ہے اور اس کی بقا بھی امر ربی پر منحصر ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وقت آئے گا جب یہ سارا نظام بدل جائے گا اور نیا نظام قائم ہوگا۔ یہ ربانی صداقتوں میں سے ایک صداقت ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۱)

جس دن زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور سب لوگ اللہ یکتا و زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہونگے۔

انسان اور کائنات دونوں رب تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے احکام کی پابند ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کائنات تکوینی قوانین میں جکڑی ہوئی اسے اختیار و ارادہ کی قوت حاصل نہیں ہے جبکہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ اسی لیے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے اور آخرت کے نئے نظام میں بھی مجرم کے طور پر پیش ہوگا۔ قرآن نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (۴۲)

اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کرتے گندھک کے ہونگے اور ان کے چہروں کو آگ لپٹ رہی ہوگی یہ اس لیئے کہ اللہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان اور کائنات کا تعلق اللہ کے دو بندوں کا ہے جنہوں نے سازگاری کے ساتھ احکام الٰہی کی پابندی کرنا ہے۔ کائنات انسان کی منفعت کے لیے بنائی گئی لہٰذا وہ اس سے استفادہ کرے لیکن اگر وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کرے گا تو خود بھی تباہ ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عقل اور طاقت عطا کی ہے اسے بروئے کار لا کر وہ اشیاء کائنات پر کنٹرول حاصل کرے، اسے اپنی منفعت میں استعمال کرے۔ اسلامی نقطہ نظر سے کائنات نہ تو الٰہی قوت سے متصف ہے کہ انسان اس کی پرستش کرے اور نہ ہی انسان کی دشمن ہے کہ اسے مغلوب کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ ان دونوں رویوں سے اسے نقصان پہنچے گا۔ کائنات اللہ کی تخلیق کا شہکار ہے اور اس کے اندر ایک نظم اور ایک قانون کام کر رہا ہے۔ اس کے نظم کو قائم رکھنا اور اس کے قانون کی معرفت حاصل کرنا انسان کے فائدے میں ہے۔ انسان

---

(۴۱) ابراہیم/۴۸ (۴۲) ایضاً/۴۹۔۵۱

اور کائنات کا یہ رشتہ صرف اسلام ہی کے ذریعہ معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ متوازن رویہ قرآن ہی نے متعارف کرایا ہے اور انسان کو بالآخر اس متوازن رویے کی طرف آنا ہوگا۔

انسان اور انسان

اسلام انسان اور انسان کے تعلق کو بھی مثبت انداز سے دیکھتا ہے اس کا تصور یہ ہے کہ انسان کی ابتداء ایک انسان کی تخلیق سے ہوئی اور اس کے بعد وہ برادریوں' قبیلوں' اور نسلوں اور قوموں میں پھیلا پھولا ہے۔ لہٰذا ایک انسان دوسرے انسان کے لئے بھیڑیا نہیں بھائی ہے۔ قرآن نے انسانیت کو وحدت و اخوت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًاo (۴۳)

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اس سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیئے اور اللہ سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور قطع رحمی سے بچو کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۴)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کا انسان سے تعلق ان تین اصولوں سے طے ہوتا ہے ایک یہ کہ انسان کی بنیاد ایک مرد اور عورت ہے دوسرے یہ کہ قومیں و قبیلے پہچان کا ذریعہ ہیں اور تیسرے یہ کہ انسان کی اصل قیمت اس کا کردار ہے جو درست علم اور اچھے عمل سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام باتیں جاہلیت کی باتیں ہیں۔ حضور اکرمؐ نے جس جاہلی معاشرے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا تھا اس میں نسلی امتیازات کا تصور ایک مسلمہ عقیدہ تھا۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے خاندانی اور نسلی پس منظر سے متعین ہوتی تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ان امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی۔ نسل پرستی کی وجہ سے انسان ہی انسان کی تذلیل کرتا ہے، اور انسان کے ہاتھوں ہی انسانیت بے وقار ہوتی ہے۔ دور حاضر جسے نیشنلزم کا نام دیتا ہے وہی تو Racism ہے۔ بس اسے ذرا خوشنما لباس پہنا دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کے ارشادات انسانیت کی اس تذلیل کے خلاف منقول ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیہ و تعظمھا بالآباء۔ الناس من آدم

---

(۴۳) النساء/۱ (۴۴) الحجرات/۱۳

و آدم من تراب۔(۴۵)

اے گروہ قریش اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء پر فخر کرنے کو رد کر دیا۔لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

امام ترمذی نے اسی بات کو ذرا مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ و تعاظمھا بابائھا۔ فالناس رجلان رجل بَرٌّ تقی کریم علی اللہ وفاجر شقی ھَیِّنٌ علی اللہ۔ والناس بنو آدم و آدم من تراب۔(۴۶)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آباء پر فخر کرنے کو چھین لیا ہے۔لوگ دو قسم کے ہیں۔ایک شخص نیک متقی اور اللہ کے ہاں مکرم ہے دوسرا فاجر، بد بخت اور اللہ کے ہاں بے وزن ہے۔لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے ہے۔

نسلی امتیازات کے اصول کی نفی کرتے ہوئے حضور اکرم ﷺ نے واضح الفاظ میں مساوات انسانی کا اصول عطا فرمایا! آپؐ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسوُد الا بالتقوی(۴۷)

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی کسی گورے کو کالے پر سوائے تقویٰ کے۔

انسان پر انسان کے ظلم کی ایک مثال غلامی کی رسم ہے۔پوری انسانی تاریخ غلامی کی تاریخ ہے۔یونان، روم، ایران، مصر اور ہندوستان کے معاشرے غلامی کی بدنما رسم کو قائم رکھنے والے اور اسے فروغ دینے والے تھے۔یہ اسلام تھا جس نے اس ظالمانہ رسم کو ختم کرنے کی مثبت کوششیں کی۔اسلام کے آغاز کے وقت تین قسم کی غلامی رائج تھی۔غلاموں کی بڑی تعداد موجود تھی جو بکتے بکاتے معاشرے کا حصہ تھے۔جنگی قیدی جنہیں بیچ دیا جاتا تھا اور آزاد افراد کو پکڑ کر غلام بنا لیا جاتا تھا۔حضور اکرمؐ نے تینوں قسموں کے بارے میں انقلابی پالیسی اختیار کی۔جو غلام موجود تھے ان کی آزادی کی حوصلہ افزائی کی آپؐ نے خود غلام خرید کر آزاد کیے۔دینی امور کی خلاف ورزی پر سزا و تاوان کی صورت میں غلاموں کی آزادی متعین کی۔جنگی قیدیوں کی تاوان پر یا بغیر تاوان آزادی کی حوصلہ افزائی کی اور آزاد انسان کو غلام بنانے کی سخت ممانعت کی۔آپؐ نے فرمایا:

من اعتق رقبۃً مُومَنۃً کانَتْ فِداءَہ مِنَ النّار (۴۸)

جس شخص نے ایک مومن کی گردن آزاد کرائی وہ اس کے لیے آگ کے بچاؤ کا ذریعہ ہوگی۔

چونکہ معاشرے سے غلامی کو بتدریج ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی اس لیے ایسے اقدامات کیے گئے جن سے

---

(۴۵) سیرۃ، ۴/۵۴

(۴۶) ترمذی، ابواب التفسیر، ۷/۱۵۹

(۴۷) مسند احمد، ۵/۴۱۱

(۴۸) ابوداؤد، کتاب العتق، باب الرقاب افضل، ۴/۵-۳

غلاموں کو عزت ملے۔ معاشرے میں موجود غلاموں کو معزز مرتبہ دینے کی ترغیب دی آپؐ نے فرمایا:

ان اخوانکم خَوَلُکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه ممایا کل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم مایَغلِبُهم فاعینوهم(۴۹)

تمہارے خدمت گزار تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے اس لیے جس کا بھائی اس کے تحت ہو تو اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے ان کو ایسے کام کی تکلیف نہ دو جو ان سے نہ ہو سکے اگر ان کو تکلیف دو تو ان کی مدد کرو۔

انسان اور انسان کے تعلق میں عدل واحسان کے اصولوں کو متعارف کرایا اور ظلم کو حرام قرار دیا۔ آپؐ سے منقول ہے۔

من مشی مع ظالم لیقویه وهو یعلم انه ظالمٌ فقد خرج من الاسلام(۵۰)

جس نے ظالم کے ساتھ اس کی اعانت کی خاطر قدم اٹھایا اور وہ اسے جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

قرآن نے عدل واحسان کے بارے میں اللہ کا یہ حکم ریکارڈ کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۵۱) اللہ تم کو عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔

دور حاضر میں انسان کے مسائل کی بنیادی وجہ وحی کے نور سے بے نیازی اور احکام الٰہی کے بارے میں جہالت ہے۔ اسلام نے انسانی تعلقات میں بنیادی اصول متعارف کرائے ہیں جس سے انسانی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔ کافروں نے تو اپنی جہالت اور انکار کی وجہ سے ان اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے بھی ان اصولوں کو نہیں اپنایا اور انتہائی ڈھٹائی سے کافرانہ رسموں اور جاہلانہ اصولوں کو پسند کیا ہے۔ نتیجہ ہر طرف فساد ہی فساد ہے۔

ان پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد قرآن عظمت انسان کا تصور بھی دیتا ہے جس سے انسان کی صحیح حیثیت اور مقام کا تعین ہوتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان اول وآخر انسان ہے اور انسان رہنے ہی میں اس کی عظمت ہے۔ خدا بننے کی کوشش یا حیوانی سطح پر آنے کی کاوش اس کے مقام ومرتبہ کے منافی ہے۔ اگر وہ انسانی مرتبہ کو پہچانے اور اس پر قائم رہے تو اللہ کے بعد کائنات میں اسی کا مرتبہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ جس طرح انسان اور خدا، انسان اور کائنات اور انسان اور انسان کے تعلق کے حوالے سے یہ ثابت ہوا کہ انسان معزز ومحترم ہے اور اسے فراط سے بچنا چاہیئے اسی طرح عظمت انسان کے مثبت تصور سے بھی قرآن یہی ثابت کرتا ہے کہ انسان عظیم ہے۔ اور کائنات کا گل سرسبد اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ مخلوق ہے۔

---

(۴۹) بخاری، کتاب العتق، باب قول النبیؐ العبید اخوانکم، ۱۲۳/۳

(۵۰) ایک روایت میں لیقویہ کی جگہ لیعینہ ہے۔ کشف الخفا، ۳۸۹/۲

(۵۱) النحل/۹۰

عظمت انسان

قرآن وسنت نے مثبت انداز میں عظمت انسان کا تصور دیا ہے۔ ایسے ارشادات ونصوص موجود ہیں جن سے مقام انسان کا پتہ چلتا ہے مثلاً:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۵۲)

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۵۳)

کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۵۴)

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدے میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے تو ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے۔

احادیث

حضور اکرم ﷺ کے ارشادات میں انسانی شخصیت کی تکریم کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ چہرہ انسانی شخصیت کی علامت اور پہچان ہے۔ احترام آدمیت میں چہرے کو خاص اہمیت دی۔ آپ ﷺ سے منقول ہے:

خلق الله آدم على صورته (۵۵) اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

عن ابى هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: اذا ضرب احدكم خادمه فليتق الوجه (۵۶)

وفى رواية ان رسول الله ﷺ قال: اذا قاتل احد كم فَلْيَجْتَنِب الوجه۔ (۵۷)

---

(۵۲) بنی اسرائیل/۷۰

(۵۳) التین/۴

(۵۴) البقرہ/۳۴

(۵۵) شرح السنۃ، ۱۲/۲۵۶

(۵۶) مشکاۃ، کتاب الآداب/۲۹۷

(۵۷) بخاری، کتاب العتق، ۱/۳۶۷

جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے پر نہ مارے اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی لڑائی کرے تو اسے چہرے کو نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ اذا قاتل احدكم اخاه فليجتنب الوجه (۵۸)

جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے پر وار نہیں کرنا۔

عن ابی هريرة قال لا تقولن قبح الله وجهك .... فان الله خلق آدم على صورته (۵۹)

وفی رواية قال: لا تقولوا قبح الله وجهه.

یہ نہیں کہنا چاہئے کہ خدا تیرے چہرے کو بگاڑے کہ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: یہ نہ کہو کہ اللہ اس کے چہرے کو بگاڑے۔

ان آیات میں انسانی فضیلت وعظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسی فضیلت جس میں اور کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ احادیث سے بھی اظہار فضیلت ہی مراد ہے اور انسان کے چہرے کی تعظیم اس کی فضیلت کی وجہ سے ہے۔ انسان کی صورت کو خدائی صورت سے تشبیہ بھی دراصل بیان فضیلت ہی کا ایک پیرایہ ہے۔

انسانی فضیلت کی اصل اس کی نائبانہ حیثیت میں ہے۔ انسان نائب خدا ہے اس لیے وہ صاحب فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس شان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا اور فرشتوں کے اعتراض پر انسان کی حمایت میں فرمایا تھا۔ **اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ** (۶۰)۔ کائنات کی کوئی اور مخلوق اس فضیلت میں انسان کی شریک نہیں۔ انسان کے سوا کوئی بھی خلافت کے اہل نہیں۔ قرآن پاک نے اسے امانت قرار دیا ہے اور انسان کو اس کا امین، کیونکہ ساری مخلوق نے بار امانت اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ بقول شاعر:

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ارشاد باری ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۶۱)

ہم نے یہ امانت آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس

---

(۵۸) مسلم، ابواب البر والصلہ باب النهی عن ضرب الوجه، ۳۲۸/۲

(۵۹) الادب المفرد/۵۴۔ امام مسلمؒ نے ابی حاتمؒ سے حضور ﷺ کی جو حدیث نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں فان الله خلق آدم على صورته اور ابوہریرہؓ کی روایت ہے فلا يلطمن الوجه یعنی تھپڑ نہ مارے۔

(۶۰) البقرہ/۳۰

(۶۱) الاحزاب/۷۲

سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ وہ ظالم ہے جاہل ہے۔

اس آیت میں لفظ امانت توجہ کا محتاج ہے۔ علماء نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ ہم یہاں صرف دو ایک نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب باندھا ہے اور اس آیت کی پوری تشریح وتفسیر کی ہے۔ شاہ صاحب نے امام غزالیؒ اور قاضی بیضاویؒ کے حوالے سے امانت کے معنیٰ ''تکلیف شرعی'' بیان کیے ہیں اور ظلوماً جھولا کی تعبیر میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''میں کہتا ہوں اس معنی کے اعتبار سے انہ کان ظلوماً جھولا گویا تعلیل وسبب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ظالم اس کو کہتے ہیں جو عدل وانصاف نہ کرے لیکن اس کی شان یہ ہے کہ وہ عدل وانصاف کر سکتا ہے اور جاہل وہ ہے کہ عالم نہ ہو لیکن اس کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو سکتا ہے۔ انسان کے سوا جس قدر بھی مخلوق ہے یا تو وہ سراسر عالم و عادل ہے، اس میں ظلم وجہالت نام کو بھی نہیں جیسے ملائکہ یا وہ ہے کہ اس کے اندر نہ تو عدل وانصاف ہے اور نہ وہ علم حاصل کر سکتی ہے جیسے کہ چوپائے۔ جب آپ نے یہ جان لیا تو اب یہ سمجھ لیجئے کہ خدا کی جانب سے تکلیف کا سزاوار وہی ہے جو امر مکلّف کا بالقوہ کمال رکھتا ہو بالفعل اس کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ (۶۲)

آگے چل کر شاہ صاحب قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا فرمائی ہیں اور دونوں کے مطابق ڈھل جانے کی اسے صلاحیت دی۔ اگر وہ قوت ملکیہ کو اپنائے تو اللہ تعالیٰ آسانیاں مہیا کرتا ہے اور اگر قوت بہیمیہ اس پر غالب آ جائے، غلط راہوں پر چل پڑے تو اللہ تعالیٰ رکاوٹیں نہیں ڈالتا اور انسان انجام کار سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

قرآن اس اختیار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی o فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی o وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی o وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی o (۶۳)

سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا تو ہم اس کو آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اسے سختی میں پہنچائیں گے اس کو تکالیف کی چیز کے لیے سامان دے دیں گے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۶۴)

آپؐ کے رب کی عطاء میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپؐ کے رب کی عطاء کسی پر بند نہیں۔

---

(۶۲) حجۃ اللہ البالغہ (اردو ترجمہ) ۱/ ۶۵ مطبوعہ لاہور

(۶۳) اللیل/ ۵،۱۰

(۶۴) بنی اسرائیل/ ۲۰

محقق دوانی نے اخلاق جلالی میں امانت کی تشریح کچھ تنقیدی انداز میں کی ہے۔ انہوں نے تکلیف شرعی کے مفہوم کو نادرست قرار دیا ہے کیونکہ مکلّف تو جن بھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں امانت سے مراد نیابت خداوندی اور خلافت الٰہی ہے۔ دوانی کی بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مکلّف قرار دیئے جانے میں انسانی فضیلت کا کوئی خاص اظہار نہیں ہوتا۔ (٦٥) جب کہ خلافت مراد لینے سے انسانی عظمت مثبت طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اس مفہوم کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (٦٦)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں زمین میں ایک نائب بناؤں گا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ (٦٧)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا۔ اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ وہ خدا کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔ جو لوگ خدا کے رستے سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہوگا۔ اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔

قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (٦٨)

موسیٰ نے فرمایا: بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنا دیں گے پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ (٦٩)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو کہ تم کو دی ہیں۔

تکلیف شرعی صرف اطاعت احکام سے آتی ہے جو انفرادی عمل ہے اور خلافت میں نفاذ احکام بھی شامل ہے۔ عظمت انسان اس پر ہے کہ وہ ایک اجتماعی نظام تشکیل دے جس میں احکام خداوندی کا نفاذ شعوری ہو۔ یہی اس کا کمال ہے

---

(٦٥) ایک اور دقت بھی پیش آتی ہے کہ ظلوما جھولا کی دور از کار تاویل کرنی پڑتی ہے ورنہ مفہوم یہ بنتا ہے کہ جس انسان نے بار امانت اٹھایا وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔ عجیب بات ہے ایک طرف وہ بے چارہ بوجھ اٹھا رہا ہے دوسری طرف اسے صلہ یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔

(٦٦) البقرہ/٣٠

(٦٧) ص/٢٦

(٦٨) الاعراف/١٢٩

(٦٩) انعام/١٦٥

اور اسی کی وجہ سے اسے مسجود الملائکہ بنایا گیا۔ اس توضیح کے لحاظ سے فحملها الانسان کا ترجمہ فانها الانسان ہوگا یعنی انسان نے ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اسے نباہا نہیں۔ نفس اور شیطان کی اطاعت میں خدا سے غافل ہو گیا اور ظالم و جاہل ٹھہرا۔ اس کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن کر رہے اور لوگوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دے۔ خدا کی بندگی کا نظام مستحکم کر کے لوگوں کو اس میں شامل کرے۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ خود خدا بن بیٹھے اور خلق خدا کو اپنا محکوم بنا لے۔

غلط فہمی کا ازالہ

عظمت انسان سے کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کسی مخصوص طبقہ کی عظمت مراد ہے۔ گو اسلام عظمت کا صحیح مدار تقویٰ و دین ہی قرار دیتا ہے لیکن مطلق مخلوق کے لحاظ سے بھی اس کی فضیلت کا اعتراف کرتا ہے اور اسے حقیقی عظمت کی بنیاد بناتا ہے۔ اسلام میں عظمت انسان کا حقیقی تصور گوشت، پوست یا نسل و خون سے وابستہ نہیں ہے۔ اسلام تو انسانیت کی برتری اور فضیلت کا علمبردار ہے۔ نسل و خون سے وابستہ تصور غلط ہے اس غلط احساس عظمت اور ناقص تصور شرف نے دنیا کو ظلم کدہ بنا دیا ہے قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۷۰)

لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے بحر و بر میں فساد رونما ہوا۔

اسلام انسانی شرف کے لحاظ سے سب کو مساوی قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کو اظہار فضیلت کا ایسا کوئی حق نہیں جس سے فساد بپا ہو اور جس کی بنیاد باطل ہو۔ آنحضرتؐ نے فخر و مباہات اور عصبیۃ جاہلیہ کو ملعون قرار دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم، آقا و غلام اور اشرف و ارزل کی تمیز اٹھ گئی اور انسان اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔ وہ مصنوعی حد بندیاں جنہیں وضع کر لیا گیا تھا ٹوٹ گئیں اور انسان ایک مرتبہ پھر انسانی شرافت کا متحمل اور عظمت آدمیت کا رفیق ہو گیا۔ حضورؐ کے مندرجہ ذیل ارشادات بطور دلیل پیش کئے جا سکتے ہیں:

عن عياض بن حمار المجاشعي ان رسول الله ﷺ قال: ان الله تعالىٰ اوحى اِلَيَّ ان تواضعوا حتى لا يبغى احد على اَحَدٌ ولا يَفخر احد على احد(۷۱)

عیاض بن حمار مجاشعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ نے میری طرف وحی کی کہ تم فروتنی اختیار کرو حتیٰ کہ کوئی کسی پر بڑائی نہ جتائے اور کوئی کسی پر دراز دستی نہ کرے۔

عن ابی هريره قال: قال رسول الله ﷺ: لينتهين اقوام يفتخرون بآباء هم الذين ماتوا انما هم فحم من جنهم او ليكونن اهون على الله من الجعل الذى يدهده الخراء بانفه. ان الله قد

(۷۰) الروم/۴۱

(۷۱) ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التواضع ۲/۶۷۱

اذهب عنكم عبية الجاهلية وفخرها بالآباء انما هو مؤمن تقی و فاجر شقی. الناس کلهم بنوآدم و آدم من تراب(۷۲)

ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء پر فخر کرتے ہیں انہیں باز آ جانا چاہئے وہ فقط دوزخ کے کوئلے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نجاست کے اس کیڑے سے بھی زیادہ سبکسار ہونگے جو نجاست کو ناک سے دھکیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباء پر فخر کرنا دور کر دیا یا تو وہ متقی مومن ہوتا ہے یا بد بخت فاجر ہوتا ہے۔ سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے تھے۔

عن جبیرؓ مطعم انّ رسول الله ﷺ قال: لیس منا مَن دَعَا اِلی عصبیة ولیس منا من مات علی عصبیة(۷۳)

جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں۔ جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں اور جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں۔

قال رسول الله ﷺ لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی(۷۴)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے۔

ان تمام احادیث میں فضیلت کے غلط تصور کو مٹایا گیا اور مساوات انسانی کو مستحکم کیا گیا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر دوسرے کے برابر ہے۔ فرق صرف اخلاق و تقویٰ اور صلاحیتوں کا ہے اس قدرتی اور اکتسابی فرق کے سوا جملہ تفریق مصنوعی ہے اور نسل انسانی کے لیے باعث ہلاکت ہے۔

عن أبی هریره قال قال رسول الله ﷺ ان الله قد أذهب عنکم عبیة الجاهلیة وفخرها بالآباء. مومن تقی وفاجر شقی انتم بنو آدم و آدم من تراب لید عن رجال فخرهم باقوامه انماهم فحم من فحم جهنم اولیکونن اهون علی الله من الجعلان التی تدفع بانفها النتن.(۷۵)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جاہلیت کی نخوت اور آباؤ اجداد کے ساتھ فخر کرنے کو تم سے دور کر دیا ہے۔ اب تو متقی مومن شخص ہے یا فاجر بدکار ہے تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد کے ذریعہ فخر کرنے سے باز رہیں وہ جہنم کے کوئلوں میں کوئلے ہیں۔ یا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گندگی کے کیڑے سے بھی ذلیل تر ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے نجاست دھکیلتا ہے۔

......☆......

(۷۲) ایضاً، کتاب الادب باب التفاخر فی الانساب ۲/۶۹۷ (۷۳) ایضاً، کتاب الادب باب فی العصبیة ۲/۶۹۸

(۷۴) مسند احمد ۵/۴۱۱ مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت (۷۵) ابوداؤد، کتاب الادب، باب التفاخر فی الانساب ۱/۶۹۷

8

ثقافت

مفہوم

انگریزی کا لفظ کلچر عربی کے لفظ ثقافت کے ہم معنی ہے اگر چہ اس کے لیے تہذیب کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ ثقافت کے لغوی معنی ہیں زیرک، سبک اور چالاک ہونا، ثقف (۱) کے معنی سیدھا کرنا، مہذب بنانا، تعلیم دینا ہے۔ اور الثقاف نیزوں کو سیدھا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (۲) ھذب کے لغوی معنی شاخ تراشی کرنا، پاکیزہ کرنا، درست کرنا، ھذب کے معنی اصلاح کرنا بھی ہے۔ کلچر (Culture) اسم ہے۔ (۳) جس کے معنی زراعت، فلاحت، پرورش، تہذیب اور ترقی (ذہنی) ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں کلچر کے ایک معنی یہ بھی بیان کیے گئے ہیں:

Intellectual development, Improvement, Training by (Mental or Physical)

ان تینوں الفاظ کے معنی میں درستی اور اصلاح کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہی معنی ان اصطلاحی تعریفوں میں نمایاں ہیں مثلاً راغب علی بیروتی اپنے رسالہ الثقافہ میں لکھتے ہیں:

الثقافة ا هل هی إلّا إصلاح النفس الصحیح الکامل بحیث یکون صاحبها مرآة الکمال و الفضائل...... اصلاح الفاسد و تقویم المعوج (۴)

ثقافت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ نفس کی صحیح اور کامل اصلاح ہے اس طرح کہ مثقف آدمی کی ذات کمال وفضائل کا آئینہ ہو...... فاسد کی اصلاح اور ٹیڑھے کو سیدھا کرنا ثقافت ہے۔

جہاں تک لفظ کلچر کا تعلق ہے اس کا مفہوم پوری طرح متعین نہیں ہو سکا۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تعریفیں کی ہیں جو باہم مناسبت بھی رکھتی ہیں اور مغائیرت بھی۔ بیگ بی (Bagby) نے اپنی کتاب کلچر اینڈ ہسٹری (Culture & History) میں "Concept of Culture" کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے جس میں اس نکتہ پر مفصل بحث کی ہے۔ (۵) اس کا کہنا ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے فرانسیسی مصنفین (Voltair and Vanvenargues) کے ہاں ہوا۔ ان کے نزدیک ذہنی تربیت وتہذیب کا نام کلچر تھا۔ جلد ہی اچھے آداب، آرٹ، سائنس اور تعلیم وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ (۶) آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق انگریزی زبان میں یہ

---

(۱) المنجد طبع بیروت (۲) ایضاً/۹۴۵

(3) Oxford English Dictionary.

(۴) راغب القہانی بیروتی الثقافہ /۱۹۔ مکتبہ اهلیہ بیروت۔

(5) Philip Bagby___ Culture and History. / 73.

(6) Culture Critical review of Concept and definition.

مفہوم 1705ء تک نہیں پایا جاتا تھا۔(۷) کلچر کی اصطلاح کو میتھو آرنلڈ نے اپنی کتاب (Culture and Anarchy) میں استعمال کیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس وقت سے لے کر اب تک یہ ایک مبہم لفظ ہے جس کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مصنف نے (A. L. Kroeher and Kluck Halm) کے حوالے سے بتایا ہے کہ اس کی ایک سو اکسٹھ تعریفیں کی گئی ہیں۔

فاضل مصنف کے نزدیک اس کی تعریف ایسی ہونی چاہیے جو انسانی زندگی پر محیط ہو مثلاً مذہب' سیاست' اقتدار، آرٹ، سائنس، ٹیکنالوجی، تعلیم، زبان، رسم ورواج وغیرہ' بلکہ ماہرین انسانیت تو نظریات، علم، عقیدہ، نمونہ (Norm) اقتدار اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ٹی، ایس ایلیٹ (T.S. Eliat) کلچر کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''ثقافت آداب کی شائستگی کا نام ہے یعنی مدنیت اور انسانیت''(۸) ذرا آگے چل کر وہ اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''ثقافت سے میری اولین مراد وہ ہے جسے ماہرین لسانیات بیان کرتے ہیں یعنی ایک خاص مقام پر رہنے والے مخصوص افراد کا طرز حیات''(۹)

میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) اپنی کتاب (Culture and Anarchy) میں اسے یوں پیش کرتا ہے:

> کلچر انسان کو کامل بنانے کی بے لوث سعی ہے۔ کلچر کمال کی تحصیل ہے۔(۱۰)

وہ مختلف تعریفوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انہیں خوبصورت الفاظ تو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ کلچر کے وسیع مفہوم کو ٹھیک نہیں ادا کر سکتے۔ اس نے ماٹیسکیو (Montesqueu) کے الفاظ ''ایک ہوشمند انسان کو ہوشمند تر بنانا'' اور بشپ ولسن (B. Wilson) کے الفاظ ''عقل سلیم اور رضائے الٰہی کے فروغ کے لیے سعی کرنا'' کو بہترین مقولے قرار دیا ہے مگر اس کے نزدیک یہ کلچر کی صحیح تعریف نہیں ہے۔ وہ کلچر کو مذہب سے وسیع تر قرار دیتا ہے اسی کتاب کا مقدمہ نگار خصوصی کلچر کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

یہ کلچر آدمیوں کی عام زندگیوں سے پھوٹتا ہے۔ اس کلچر کا مطلب انسانی روح کی معمولی زمین کی درستی یا اسے قابل کاشت بنانا ہے۔(۱۱)

محسن مہدی نے Ibn Khuldun's philosophy of history میں کلچر کے متعلق تقریباً اسی قسم کے

---

(7) Philip Bagby ___ Culture and History. / 73.

(8) T.S. Eliot Notes Towards the Definition of Culture / 13.

(9) Ibid / 120

(۱۰) میتھو آرنلڈ۔ ترجمہ ثقافت وانتشار۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کراچی/۱۶۱

(۱۱) ایضاً/۲۰۷

خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

''ثقافت نہ تو صلاحیت واستعداد کا نام ہے اور نہ ان خواہشات کا جو آدمی کی ذات کے اندر موجود ہیں بلکہ صحیح طور پر یہ معاشرتی ادارات اور فنی تخلیقات کی عادی اور رسمی صورت کا نام ہے''۔ (۱۲)

فیضی نے کلچر کی دو تعریفیں بیان کی ہیں ایک معاشرتی دوسری انسانی، ایک تعریف کے لحاظ سے وہ تمدن سے بھی زیادہ وسعت رکھتا ہے، اور دوسری کے اعتبار سے وہ صرف انسانی روح کی تکمیل ہے۔ (۱۳)

کلچر کی ان مختلف تعریفات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فلپ بگ بی کی تعریف نسبتاً بہتر ہے وہ کلچر کی تعریفات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''آیئے اب اس پر اتفاق کر لیں کہ کلچر جس طرح فکر و احساس کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے اسی طرح طرز عمل و کردار کے تمام پہلوؤں کو بھی شامل کیا ہے۔'' (۱۴)

فاضل مصنف نے معاشرت، نفسیات اور تمدن کو سامنے رکھتے ہوئے کلچر کی بہت جامع تعریف کی ہے، کہتے ہیں:

''ثقافت معاشرے کے افراد کے داخلی اور ابدی طرز عمل کی باقاعدگیوں کا نام ہے اس میں وہ باقاعدگیاں بھی شامل ہیں جو صاف طور پر موروثی بنیاد رکھتی ہیں۔'' (۱۵)

فیضی نے اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے:

کلچر کسی مخصوص زمانے یا ملک کے عام دانشورانہ معیار کا نام ہے۔ (۱۶)

کلچر کے مفہوم کو واضح کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ پیش آ رہی ہے کہ ہر آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسی تعریف کرے جس سے اس کی پوری تصویر سامنے آ جائے۔ پھر اس کے مادی وجود کو ثابت کرنے کے لیے ان ماہرین نے بڑی قلابازیاں کھائی ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر مظاہر تہذیب کو تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اچھی بات کہی ہے کہ لوگ آرٹ، معاشرتی نظام، رسوم مذہب وغیرہ کو کلچر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں کلچر نہیں بلکہ وہ کچھ ہیں جن سے کلچر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (۱۷)

---

(12) Mohsin Mehdi Ibn Khuldun's Philosophy of History / 181.

(13) Culture two meanings - Socialogical - Humanistic.

(1) Culture is that complete whole which includes Knowledge, belief, art, moral law, customs and many other capabilities and habits acquired by man as a member of society.

(2) Human culture is a continuous movement towards the complete freedom of human spirit.

(14) Philip Bagby Culture and History / 80.

(15) Ibid.

(16) Fayzee: Islamic Culture.

(17) T.S. Eliot Notes Towards the Definition of Culture / 120.

کلچر اور تمدن

کلچر کی تعریف میں یہ ابہام دراصل اس لیے پیدا ہوا کہ اسے چند اور الفاظ کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا' مثلاً تمدن (Civilization) معاشرتی ڈھانچہ (Social Structure) اور مذہب (Religion) ان تینوں میں سے ہر ایک چونکہ بلاواسطہ انسانی زندگی اور انسانی ذات سے متعلق ہے اس لیے اکثر اوقات کلچر کے تعین میں تمدن' معاشرتی نظم یا مذہب کے اثرات و نتائج اور طریق کار کا اثر آ جاتا ہے۔ جس اصطلاح نے سب سے زیادہ ابہام پیدا کیا ہے وہ تمدن ہے کیونکہ عام طور پر ان دونوں کو مترادف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایک کو بول کر دوسرا مراد لیا جاتا ہے اور ایک کے اثرات کو دوسرے کے نتائج قرار دیا جاتا ہے اس وجہ سے لوگوں کو یہ طے کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے کہ وہ کیا حدود ہیں جن کے ذریعے کلچر اور سویلائیزیشن کو علیحدہ کیا جائے تاکہ ہر ایک کی جامع و مانع تعریف ہو سکے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اسی کا رونا رویا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے آغاز میں اپنی عدم استطاعت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''تمدن کے لفظ سے اس کی حیثیت دو چند ہو جاتی ہے۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی جس سے ان کی حدود متعین ہوں۔ کیونکہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس طرح کی کوئی کوشش بھی صرف مصنوعی تفریق پیدا کر سکے گی۔ جو صرف کتاب تک ہی محدود ہو گی اور قاری اسے محفوظ نہیں رکھ سکے گا بلکہ کتاب بند کرنے کے بعد اس کو بھول جانے ہی میں سکون محسوس کرے گا۔'' (۱۸)

فیضی نے تمدن کی جو تعریف کی ہے اس سے بھی کلچر کی یہی وضاحت ہوتی ہے:

> ''تمدن سے مراد دو میں سے ایک ہو گی: ایک مہذب ہونے کا طرز عمل دوسرے انسانی معاشرے کی مکمل اور ترقی یافتہ صورت''۔ (۱۹)

الندوة العالمية للاسلاميات کے مقالہ نگاروں میں صرف ایم زیڈ صدیقی نے کلچر کی تعریف پر موزوں اور مناسب گفتگو کی ہے صدیقی صاحب نے نہ صرف یہ کہ کلچر کی تعریف کی ہے بلکہ تمدن کے ساتھ اس کا موازنہ بھی کیا ہے۔ یہ موازنہ اتنا صحیح ہے کہ اس سے تقریباً ہر ایک کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے وہ کہتے ہیں:

''ثقافت کی اصطلاح فکری ارتقاء پر دلالت کرتی ہے جبکہ تمدن معاشرتی ترقی کے بلند درجہ کو ظاہر کرتا ہے لہذا ثقافت ذہنی کیفیت کو بیان کرتی ہے اور تمدن اس کے مساوی مظہر کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہلی کا تعلق فکری عمل سے ہے اور دوسرے کا مادی اکتسابات سے۔ پہلی ایک داخلی کیفیت ہے جب کہ دوسرا خارجی دنیا میں اس کی عملیت کا نام ہے۔'' (۲۰)

---

(18) T.S. Eliot Notes Towards the Definition of Culture / 13.

(19) Islamic Culture /2.

(20) M.Z. Siddiqui___ International Colloquim Papers, /26.

فیضی نے کلچر کی تعریف میں مختصر مگر صحیح بات کی ہے کہ کلچر باطنی روح کا نام ہے جب کہ تمدن خارجی مظہر ہے۔(۲۱)
اس موازنہ کے ساتھ اگر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تجزیئے کو ملا لیا جائے تو معاملہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ سید مرحوم
اپنی کتاب ''اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی'' کے دیباچے میں تہذیب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
''اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟
لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوار معاشرت، انداز
تمدن اور طرز سیاست کا' مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں
شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات پر متعین نہیں کی جا سکتی
ہے۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا ہے اور اس کے اساس و اصول کا تجسس کرنا ہے۔(۲۲)
ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ' ایم زیڈ صدیقی اور سید مودودیؒ کے بیانات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کلچر نام ہے افکار و نظریات
میں ایسے سلجھاؤ اور ترتیب کا جو عملی زندگی کے لیے بہتر بنیاد بن سکیں جب کہ تمدن اس کے مظاہر کا نام ہے۔

کلچر اور مذہب

میتھو آرنلڈ کے نزدیک کلچر مذہب سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے بلکہ اس کے نزدیک تو مذہب کلچر کا ایک جز ہے۔ اکثر
مصنفین نے کلچر اور مذہب کے ضمن میں یہی بات کہی ہے مثلاً فیضی نے اسلامک کلچر میں اس خیال کو اس طرح دہرایا ہے۔
''مذہب، زبان، نسل، ملک، یہ ہیں وہ عناصر جن سے ثقافت کی بوقلموں ساخت بنتی ہے۔''(۲۳)
اس امر کا فیصلہ بھی صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کلچر کی تعریف کے ساتھ مذہب کی تعریف واضح اور اس کی
اثر آفرینی کی حدود متعین کر دی جائیں۔ اس طرح کلچر اور مذہب کا باہمی ربط متعین کرنا آسان ہو جائے گا لیکن تعریف کی
دقت یہاں بھی پیش آئے گی کیونکہ تعریف ایک ایسا الجھاؤ ہے جس سے نجات مشکل ہی سے ملتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف
ریلیجن اینڈ ایتھیکس (Encyclopedia of Religion and Ethics) کے مقالہ نگار نے مذہب کی
تعریف پر مختلف علماء کے بیان اکٹھے کیے ہیں۔ جن میں سے چند ایک کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ تعریفات سے پہلے ایک
دلچسپ تبصرہ بھی دیکھ لیں جسے مقالہ نگار نے نقل کیا ہے۔ سی۔ سی۔ جے۔ ویب (C. C. J. Webb) نے مذہب کی
تعریف کے ضمن میں کہا ہے:
الف۔ ''میں ذاتی طور پر نہیں مانتا کہ مذہب کی تعریف بیان ہو سکتی ہے'' تاہم مذہب کی مندرجہ ذیل تعریفات کی گئی ہیں۔

---

(21) Islamic Culture / 2.
(۲۲) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی/۱۱
(23) Ibid / 2.

(i) مذہب، ماوراء الطبیعات ہستی پر یقین رکھنے کا نام ہے (ای۔بی۔ ٹیلر)

(ii) مذہب ایسے عقائد و اعمال کا ایک متحدہ نظام ہے جس کا تعلق مقدس اشیاء سے ہو۔ وہ اشیاء جن کو ممتاز گردانا گیا ہے اور وہ جو ممنوع ہیں۔ عقائد و اعمال جو ایک اخلاقی طور پر منظم مرکزیت کو جنم دیتے ہیں جسے معبد کہا جاتا ہے۔ (درخائیم)

(iii) مذہب سے مراد آدمی سے ماوراء طاقت پر ایمان رکھنا ہے' ایسی طاقت جس سے وہ اپنی جذباتی احتیاجات اور منافع کی تسکین چاہتا ہے اور استحکام حیات جسے وہ پوجا پاٹ اور خدمت کے عمل کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔

ڈبلیو۔ڈی۔ گنڈری نے (W. D. Gundry) اپنی کتاب ''مذہب'' (Religion) کے پہلے باب میں مذہب کی تعریف کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مذہب چونکہ انسانی زندگی پر گہرا اثر رکھتا ہے۔ اس لیے ہر انسان نے اپنے تجربے کی بنیاد پر مذہب کی تعریف کی ہے مثلاً مذہب خدا پر یقین رکھنے کا نام ہے۔ مذہب اچھی زندگی گزارنے کا نام ہے اور مذہب باطن کے گہرے تجربے کی کوئی قسم ہے وغیرہ۔

اسی باب میں وہ مذہب کے متعلق یوں رقم طراز ہے: ''غیر جانبداری سے اگر دیکھا جائے تو مذہب یہ ہو سکتا ہے:

(i) کائنات کے متعلق ایک طرز فکر جس میں آدمی بھی شامل ہے۔

(ii) ایک طرز عمل۔

(iii) ایک طریق احساس۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب میں ایک فکری، اخلاقی اور تجرباتی پہلو شامل ہے۔ بلکہ فنی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہر مذہب کا ایک عقیدہ، ایک اخلاقی ضابطہ اور ایک نظم ہوتا ہے''۔ (۲۴)

مذہبی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہی مصنف لکھتا ہے کہ مذہب میں عام طور پر ان تین امور سے بحث ہوتی ہے۔

(i) دنیا کیسے وجود میں آئی اور کدھر جا رہی ہے؟ آدمی کا کیا مقام ہے اور موت کے بعد کیا ہو گا؟

(ii) گفتگو اور طرز عمل کے متعلق وہ احکام جن کے بغیر کوئی معاشرہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔

(iii) عبادت اور پرستش جس کے بغیر خدا اور بندے کے درمیان ربط نہیں رہ سکتا۔

بعض اوقات مذہب انہی تین امور کا نام ہوتا ہے اور بعض اوقات ان میں سے کسی ایک کا۔ فاضل مصنف نے مذہب کی جامعیت کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

''یہ انسانی زندگی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہے۔'' (۲۵)

---

(24) W.D. Gundry ___Religion / 6.

(25) Ibid / 7.

مذہب کی ان مختلف تعریفات پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کی تعریف میں بھی کوئی مستقل اور مکمل بات نہیں کہی جا سکتی بعض لوگ اسے زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی سمجھتے ہیں تو بعض اسے زندگی کا ایک پہلو قرار دیتے ہیں۔

(i) مذہب زندگی کا ایک پہلو ہے تو وہ کلچر کا ہم معنی ہو سکتا ہے اور اس کا جز بھی۔

(ii) اور اگر مذہب انسان کی پوری زندگی کو زیر بحث لاتا ہے تو کلچر مذہب کا ایک جز ہے۔

کیونکہ مذہب انسان کی فکری و عملی زندگی پر حاوی ہے جبکہ کلچر صرف فکری نشو ونما سے بحث کرتا ہے۔ مذہب کی یہ جامع تعریف کسی اور مذہب کے لیے جائز ہو یا نہ ہو اسلام پر یہ حرف بہ حرف صادق آتی ہے کیونکہ قرآن پاک میں اسلام کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو پوری زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۲۶)

بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (۲۷)

کہ وہ ایک مستحکم دین ہے، ابراہیم کا طریقہ ہے جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

اسلام ایک پورا نظام حیات ہے اور زندگی کی اس وسیع رہنمائی کا فکری حصہ کلچر ہے۔ اسلام تہذیب و تمدن دونوں پر محیط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں کیونکہ یہ دونوں اسلام میں شامل ہیں۔

کلچر کے عناصر ترکیبی

کلچر کے عناصر ترکیبی متعین کرنے میں بھی وہی دقت پیش آتی ہے جو اس کے مفہوم کا تعین کرنے میں آئی تھی۔ کیونکہ اجزائے ترکیبی یا تکمیلی میں تصور کا دارومدار بنیادی مفہوم پر ہے۔ اگر کلچر کا مفہوم انسانی زندگی کے تمام اعمال ہیں تو پھر اس کے اجزائے ترکیبی میں آرٹ، معاشرتی نظم، عادات و رسوم اور مذہب وغیرہ شامل ہوں گے اور اگر اس سے مراد عقلی و ذہنی سدھار اور نشو و ارتقاء ہے تو پھر اس کے عناصر ترکیبی، نظریاتی اور فکری طرز کے ہوں گے۔ ہم نے ثقافت کی تعریف میں چونکہ دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے اس لیے ہمارے نزدیک تہذیب کے عناصر ترکیبی ذہنی و عقلی ہوں گے۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تہذیب کے عناصر ترکیبی یہ ہو سکتے ہیں:

(i) دنیوی زندگی کا تصور: مثلاً انسان کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ دنیا برتنے کی چیز ہے کہ نہیں؟

---

(۲۶) آل عمران/۱۹ (۲۷) الانعام/۱۶۱

(ii) زندگی کا نصب العین: مثلاً انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ سعی و جہد کس لیے ہے؟ وہ کون سا منتہا مقصود ہے جسے حاصل کرنا انسان کا فرض ہے؟

(iii) اساسی عقائد و افکار: یعنی انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی ہے۔ انسان کی ذہنیت کو کس سانچے میں ڈھلنا ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو نصب العین کے حصول کے لیے مخصوص عملی رنگ پر ابھارتے ہیں؟

(iv) تربیت افراد کے اصول: یعنی انسان بحیثیت انسان کیسے ہونا چاہیے؟ وہ کون سے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جو انسان کے اندر پیدا ہونے اور نشو و نما پانے چاہئیں؟

(v) نظام اجتماعی کے اصول: جیسے انسان اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسانی تعلقات کی تقسیم کیسے ہوئی؟ خاندان، ہمسایہ، دوست، اجنبی، ماتحت وغیرہ کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟

میں نے سید مرحوم کی تشریح کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ میری محدود معلومات کے مطابق کلچر کا اس سے بہتر تجزیہ اور تہذیبی تصویر کی اس سے اچھی نقاب کشائی مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ کسی تہذیب کا تجزیہ ہم انہی عناصر کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ کیا وہ تہذیب مستحکم ہے یا فساد پذیر، اچھی ہے یا بری؟ اس کا فیصلہ یہی عناصر کریں گے۔ ان عناصر ترکیبی پر نظر ڈالنے سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تمام تر فکری بنیادیں، اصول اور افکار ہیں۔ انہی اصولوں کی فکری تشریح و توضیح سے تہذیب کا پورا ڈھانچہ استوار ہوگا اور انہی اصول و افکار کی عملی صورت سے تمدن (Civilization) وجود پذیر ہوگا۔ انسانی زندگی کے دو کامل اجزاء ہیں جن میں سے ایک فکر ہے اور دوسرا عمل، اس لیے کلچر فکر اور تمدن کے عملی مظاہر کا نام ہوگا۔ جس طرح فکر صالح بھی ہو سکتی ہے اور فاسد بھی، اسی طرح تہذیب صالح بھی ہو سکتی ہے اور فاسد بھی؛ بلکہ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح انسانی طبائع میں سطحیت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی، اسی طرح کلچر سطحی بھی ہوتے ہیں اور عمیق بھی۔ محسن مہدی نے ابن خلدون کے حوالے سے اسے یوں بیان کیا ہے:

"انسانی ثقافت کا انسانی فطرت کے ساتھ وہی تعلق ہے جو عادات، رسومات اور مصنوعی تخلیقات کا انسانی فطرت سے ہے۔ اس لیے ثقافت کو فطری اور مصنوعی دونوں نام دیئے جا سکتے ہیں۔" (۲۸)

......☆......

---

(28) Mohsin Mehdi____Ibn-Khuldun's Philosophy/181.

(9) اسلامی ثقافت کی روح

اسلامی ثقافت کا مفہوم

اسلام مکمل نظام زندگی ہے اور اس پورے نظام زندگی کا فکری حصہ اسلامی تہذیب ہے۔ اسلامی تہذیب کو ہمارے نامور مصنفین نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے مثلاً فیضی نے کہا: اسلامی تہذیب سے تین چیزیں مراد ہیں:

(i) بلند ترین فکری سطح اور معیار جو اسلامی حکومت کے کسی دور میں پیدا ہوا۔

(ii) تاریخی لحاظ سے وہ کامرانی جسے اسلام نے ادب، سائنس اور آرٹ کے میدان میں حاصل کیا۔

(iii) مسلمانوں کا طریق زندگی، مذہبی عمل، زبان کے استعمال اور معاشرتی رسوم ورواج کے خصوصی ربط کے ساتھ۔(۱)

زبیر صدیقی نے بھی اسلامی تہذیب کے دو مفہوم بیان کئے ہیں جن میں ایک فکری ہے اور دوسرے میں ادب، سائنس، زبان اور نظم معاشرت وغیرہ سب آ جاتے ہیں لیکن ہمارے پیش نظر پہلا مفہوم ہے۔ اس کے متعلق ان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

''اسلامی ثقافت، جہاں تک میں سمجھا ہوں، ایک مخصوص ذہنی مسلک کی نشاندہی کرتی ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے مرتب ہوتا ہے، مثلاً وحدت ربانی، عظمت انسانی اور وحدت نسل انسانی کا عقیدہ۔''(۲)

اس نقطہ نظر سے انسان کی فکری زندگی متصور ہوتی ہے اور اس نور سے پوری نسل انسانی روشن ہو جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب دراصل روشنی کا مینار ہے جس سے اسلامی تمدن وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہی وہ مینار ہے جس نے پوری دنیا کی تہذیبوں کو اپنے اندر سمیٹا بھی اور متاثر بھی کیا۔

اسلامی ثقافت کی روح

اسلامی ثقافت سے مراد اعلیٰ نظریات، بلند نصب العین اور معاشرتی واخلاقی اقدار ہیں اور اس ثقافت کی روح وہ بنیادی اصول ہیں جن پر ہمارے ثقافتی ڈھانچے کی استواری کا دارومدار ہے۔ اگر ان اصولوں کی تعمیم کی جائے تو ان کی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم مختصر رکھتے ہیں تاکہ وہ روح ہی رہیں۔ ذیل کے اصولوں کو اسلامی ثقافت کی روح قرار دیا جا سکتا ہے:

(i) وحدت ربانی　　(ii) رسالت

(iii) جواب دہی کا تصور　　(iv) وحدت نسل انسانی

---

(۱) Fayzee, Islamic Culture /6.

(۲) M.Z. Siddiqui, International Islamic Colloqium Papers / 26.

(v) عظمت انسانی (vi) تقویٰ

قرآن وسنت میں تقویٰ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ (۳)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ. تُؤْتِىْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۴)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (یعنی کلمہ توحید اور ایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۵)

اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اگر قرآن وسنت کی نصوص کو سامنے رکھیں تو واضح ہوگا کہ تقویٰ اسلامی ثقافت کی روح بھی ہے اور مظہر بھی۔ عبادات' معاشرتی آداب' اخلاقی فضائل اور اجتماعی کردار سب کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی نتیجہ ہے اور وہ ہے تقویٰ کا حصول' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' حسن معاشرت اور فضائل اخلاق سب کا منتہا تقویٰ ہے۔

وحدتِ ربانی

ہم سب سے پہلے توحید کو لیتے ہیں۔ توحید یا وحدت ربانی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے یقین کو۔ توحید مثبت اور منفی تصور پر مبنی ہے۔ مثبت یہ ہے کہ وہ ایک موجود ہے اور منفی یہ ہے کہ اس جیسا اور کوئی نہیں۔ وہ نظام کائنات میں اکیلا با اختیار قادر مطلق، فعال لما یرید اور حاکم علی الاطلاق ہے۔ اسلام کا تصور توحید کامل ہے جسے مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں:

(i) الوہیت کا تصور۔ (ii) تمام اشیاء سے اس کی نفی۔

---

(۳) النساء/۱ (۴) ابراہیم/۲۴ (۵) الحجرات/۱۳

(iii) فقط اللہ کے لیے اس کا اثبات۔

اس میں اصل چیز الوہیت کا تصور ہے۔ گو خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں مختلف اقوام و مذاہب کے ہاں موجود ہے لیکن کسی جگہ بھی اس قدر صحیح اور اس طرح مکمل نہیں۔ مثلاً اسے عقل اول' علت العلل' قوت، یا خوف و ہیبت کی چیز قرار دیا گیا ہے' بلکہ بعض لوگوں نے تو خدا کو قابل تجزیہ و تقسیم تسلیم کیا ہے۔ کہیں اس کے ساتھ سلسلہ نسب وابستہ کیا گیا ہے تو کسی جگہ اس کو تجسم و تشبیہ سے آلودہ کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے الوہیت کے ان ناقص تصورات کو چھوڑ کر ایسا کامل تصور پیش کیا ہے جس کا آغاز تقدیس و تمجید سے ہوتا ہے۔ اس نے اس کی ذات کو صفات کے ایسے مجموعے سے متعارف کرایا جس میں نقص اور غلطی کا کوئی گمان تک نہیں رہتا۔ مثلاً اللہ وہ ہے جو بے نیاز ہے' قیوم ہے' جس کا علم محیط ہے' جس کی رحمت سب پر وسیع ہے' جس کی طاقت سب پر غالب ہے' جس کی حکمت و عدل میں کوئی نقص نہیں۔ زندگی بخشنے والا اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہے۔ نفع و ضرر کی سب قوتیں اسی کے پاس ہیں۔ حساب و کتاب اور جزا و سزا کا اختیار اسی کو ہے۔ اس کی الوہیت ابدی و ازلی ہے۔ جملہ صفات کمال اس کی ذات میں جمع ہیں اور اس کی کسی صفت میں نقص کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کامل تصور کے بعد کائنات کی تمام اشیاء سے اس کی نفی کی گئی ہے۔ چونکہ کائنات کی کسی شے کے اندر ایسی صفات نہیں ہیں اس لیے کوئی شے بھی الٰہ بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ انسان، فرشتے، جن اور مظاہر فطرت غرضیکہ دوسرا کوئی بھی خدا کہلانے کے قابل نہیں۔ کیونکہ ان اعلیٰ صفات و اختیار کی حامل اور کوئی ہستی نہیں اور عقل اس امر کی متقاضی ہے کہ کسی ایسی ذات کو تسلیم کیا جائے جو مدار کائنات ہے۔ قرآن نے اسے مختصر جملے میں بیان کیا ہے جو مسلمانوں کے عقیدے کا بیان ہے:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (٦) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اسے بیسیوں جگہ پر مختلف اسالیب میں بیان کیا گیا ہے مثلاً:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (٧) **اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ** (٨)

یہ ایک مکمل بیان ہے لیکن عقیدے کے مختلف اجزا الگ الگ بھی بیان کئے گئے ہیں جیسے **اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ** (٩) تمہارا معبود صرف ایک اللہ ہے۔

کائنات کی دیگر اشیاء سے الوہیت کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ (١٠) اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (١١)

اگر یہ لوگ معبود ہوتے تو اس (جہنم) میں داخل نہ ہوتے سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

---

(٦) محمد/١٩ (٧) البقرہ/٢٥٥ (٨) آل عمران/٢

(٩) الکہف/١١٠؛ الانبیا/١٠٨؛ فصلت/٦ (١٠) الانبیا/٢٢ (١١) الانبیا/٩٩

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۱۲)

اور (لوگوں نے) اس کے سوا اور معبود بنا لیے ہیں جو کوئی چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے اور خود پیدا کیے گئے ہیں اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے اور نہ جینا اور نہ مرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہونا۔

قرآن نے الوہیت کے بارے میں ایک ایسا بیان دیا ہے جو جامع اور مکمل ہے۔ اور جس کی نظیر مذہبی لٹریچر میں نہیں ملتی۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. (۱۳)

اللہ وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ زندہ، ہمیشہ رہنے والا، اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے کسی کی سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے۔ اسے سب معلوم ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے (اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے) اس کی بادشاہی آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے۔

رسالت

رسالت کے معنی پیغام پہنچانے کے ہیں لیکن اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ منصب ہے جس کے ذریعے ایک اللہ کا بندہ لوگوں تک اس کے احکام پہنچاتا ہے۔ نسل انسانی کی رہنمائی کے لیے بے شمار افراد منصب رسالت و نبوت سے سرفراز کیے گئے۔ انبیاء کا سلسلہ نبی آخر الزماں محمد ﷺ پر اس لیے ختم ہوا کہ آپؐ کو پوری انسانیت کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔ نبوت انسان کی عقلی و فکری ضرورت ہے۔ انسانی زندگی اس کی اتنی ہی محتاج ہے جتنی خوراک و آسائش کی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ انسان اپنی اجتماعی زندگی میں اصول و قوانین کا محتاج ہے کیونکہ اس کی اچھی زندگی کا دارومدار انہی اصولوں پر ہے۔ اس کے جتنے اچھے اصول ہوں گے۔ اس کی زندگی اتنی ہی اچھی ہوتی جائے گی۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اصولوں کی تشکیل مندرجہ ذیل صورتوں میں ہو سکتی ہے:

(i) انسان اصول بنائے۔

---

(۱۲) الفرقان/۳ (۱۳) البقرہ/۲۵۵

(ii) بعض انسانوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اصول بنائیں۔

(iii) اصول سازی کی تقسیم کر لی جائے اور مختلف لوگوں کو مختلف دوائر دے دیے جائیں مثلاً مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی۔

(iv) ہر معاشرہ نئے اصول بنانے کے بجائے بعض رسوم ورواج کو جوں کا توں تسلیم کر لے اور ان کی حیثیت اصول وقوانین کی ہو جائے۔

(v) انسانی زندگی کے بنیادی اصول وقوانین فوق البشر ذات کی طرف سے آئیں اور فروعات وجزئیات میں بلندتر انسان خصوصی رہنمائی کے تحت کام کرے اور اس کے بعد اجتہاد انسانی پر انحصار کیا جائے۔

ان تمام صورتوں پر تنقیدی نظر ڈالیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ نمبر (v) کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی سو فیصد علم یقینی کی حامل نہیں ہے۔ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر کوئی اٹل اور غیر متبدل اصول وضع نہیں کر سکتا۔ اور مختلف انسانوں کے ذہنی اور تجرباتی اختلافات سے انسانی معاشرہ سنگین کشمکش کا شکار ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف انسانی معاشروں میں فساد اور بگاڑ کا ایک بڑا سبب یہی فکری واصولی اختلافات ہیں اور دنیا کے اندر تہذیبی انتشار کا باعث بھی یہی اختلاف ہے۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کی رہنمائی اور اصول وقوانین کی صحیح تشکیل صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے اور انہیں متعارف کرانے کا واحد ذریعہ رسالت ہے۔ رسولؐ اپنی خصوصی صلاحیتوں، مخصوص تربیت اور الٰہی نگرانی کے سبب عام انسانوں سے مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔ اس میں خواہشات ومفادات کے لیے وہ دلچسپی نہیں ہوتی جو عام انسانوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اصول حاصل کرتا ہے اور ملکہ نبوت کے فیض سے ان کی فروعی تشریح وتعبیر کرتا ہے۔ ان اصولوں میں ذاتی تاثرات، ملکی، وقتی اور نسلی اثرات نہیں ہوتے اور یہ اصول سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔

اسلام کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں وحدت فقط عقیدہ رسالتؐ ہی کے سبب پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ یہاں قوانین واصول ایک بالاتر ہستی سے ایک معصوم ذات کی وساطت سے انسانی زندگی تک پہنچتے ہیں جن پر ماحول، معاشرہ، انفرادی واجتماعی تعصب کی پرچھائیاں نہیں پڑتیں۔ جو تہذیب اس عقیدے پر پروان چڑھے اس میں وحدت ویگانگت ہوتی ہے۔ چونکہ زندگی کے تمام مسائل ایک ہی راہ سے آ رہے ہوتے ہیں اس لیے ان میں اختلاف کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ انسانی اجتماعیت کے لیے رسالت ہی بہترین ذریعہ وحدت ہے۔ پھر اس میں غلطی کا امکان بھی نہیں جب کہ کسی انسانی ساخت کے اصول کے متعلق اس یقین کے ساتھ بات نہیں کی جا سکتی۔ قرآن پاک نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ O ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۱۴)

اور بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدون واقفیت یعنی علم ضروری اور بدون دلیل یعنی استدلال عقلی اور کسی روشن کتاب کے، تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۱۵)

بلکہ ان ظالموں نے بلا دلیل اپنے خیالات کا اتباع کر رکھا ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۱۶)

حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کے اثبات) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اس کے بعد قرآن پاک بیان کرتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے اصول اللہ کی طرف سے آتے ہیں جنہیں وہ وحی والہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے اور جو لوگ مرکزِ وحی والہام رہے ہیں انہیں خصوصی صفات سے متصف کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس وحی کو علم و حکمت قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ وحی والہام کے بغیر کسی کے پاس یقینی علم نہیں ہے۔ مثلاً: ابراہیم اپنے والد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۱۷)

اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا تو آپ میرے کہنے پر چلو میں آپ کو سیدھا راستہ بتلاؤں گا۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۱۸)

اور لوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکمت اور علم (جو شان انبیاء کے مناسب ہوتا ہے) عطا فرمایا۔

موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (۱۹)

اور جب (پرورش پا کر) وہ اپنی بھری جوانی (کی عمر) کو پہنچے اور (قوت جسمانیہ وعقلیہ) سے درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا فرمایا۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا (۲۰) اور یوں ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا۔

---

(۱۴) الحج/۸-۹ (۱۵) الروم/۲۹ (۱۶) النجم/۲۸ (۱۷) مریم/۴۳

(۱۸) الانبیاء/۷۴ (۱۹) القصص/۱۴ (۲۰) الانبیاء/۷۹

حضور اکرم ﷺ کو ارشاد ہوا:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۱)

اور اگر آپؐ ان کے نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اس کے بعد کہ آپؐ کے پاس علم (وحی) آئے تو یقیناً آپؐ (نعوذ بالله) ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲۲)

اگر آپؐ نے اپنے پاس علم وحی آ جانے کے بعد بھی اِن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں آپ کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

قرآن پاک نے دراصل ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک طرف وہ تہذیب ہے جس کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے اور دوسری طرف وہ تہذیب ہے جس کی بنیاد یقین، علم اور حکمت پر ہے۔ کسی زندہ تہذیب کے لیے جاندار روح صرف رسالت ہی ہوسکتی ہے۔ رسالت کے بغیر ہر تہذیب ادھوری، بے بنیاد اور بے روح ہوگی۔ تصور رسالت سے اسلامی تہذیب کو پائیداری نصیب ہوئی۔ انبیاء کرام کا طویل سلسلہ دراصل اسی تہذیب کی روحانی حیات کا مظہر ہے۔ پھر نبی رحمت ﷺ کو آخری نبی بنا کر بھیجا تو اسلامی تہذیب کو آخری زندہ جاوید اور متحرک تہذیب بنایا۔ جس طرح آنحضرت ﷺ کی رسالت تمام رسالتوں کی جامع ہے اسی طرح اسلامی تہذیب بھی تمام تہذیبوں کی جامع ہے۔ اسلامی تہذیب کی اہم بنیاد عقیدہ رسالت ہے اور اس کی تکمیل حضور ﷺ کی خصوصی حیثیت کو تسلیم کرنے سے ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی خصوصی حیثیت کو قرآن نے چار طریقوں سے بیان کیا ہے۔

(i) دعوت عام (ii) تکمیل دین (iii) نسخ ادیان سابقہ (iv) ختم نبوت

ان چار عناصر سے رسالت محمدیؐ کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی جز کا انکار تصور رسالت کو ناقص کر دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ تمام انسانیت کے رہنماء ہیں۔ (۲۳) آپؐ نے دین کی تکمیل کر دی ہے۔ (۲۴) آپ کی موجودگی میں کسی اور نبی پر تفصیلی اور اتباعی ایمان نہیں لایا جاسکتا۔ (۲۵) آپ کی ذات پر ہر قسم کی نبوت ختم ہے (۲۶) کیونکہ آپ کی

---

(۲۱) البقرہ/۱۴۵ (۲۲) البقرہ/۱۲۰

(۲۳) قرآن پاک کی یہ آیات اس مفہوم کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ الاعراف/۱۵۸ ۲۔ السبا/۲۸ ۳۔ النساء/۱۷۰ ۴۔ الانبیاء/۱۵۷ ۵۔ الفرقان/۱

(۲۴) قرآن پاک کی یہ آیات اس مفہوم کو واضح کرتی ہیں۔ ۱۔ الفتح/۲، المائدہ/۳

(۲۵) المائدہ/۱۵ (۲۶) الاحزاب/۴۰

ذات ہی تہذیبی رہنما کا کام دے گی۔ اگر نئی نبوت تسلیم کی جائے تو یہ تین خصوصیات بھی ختم ہو جائیں گی۔ نیز اسلامی تہذیب کو نئی رہنمائی کی ضرورت لاحق ہو جائے گی۔ (۲۷)

یہ تمام اجزاء رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء ہیں اور انہی پر اسلامی تہذیب کی عالمیت، وسعت، ابدیت اور پائیداری کا دارومدار ہے۔ خدانخواستہ ان میں سے اگر کوئی ایک بھی چھوٹ جائے تو اسلامی تہذیب کی روح ناقص ہو جائے گی۔

جوابدہی کا تصور

اسلامی ثقافت کے روحانی ڈھانچے کا تیسرا اہم عنصر جوابدہی کا تصور ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو افکار و اعمال کو پاکیزہ رکھتا ہے اور یہی وہ تصور ہے جس کی وجہ سے تقویٰ و احتیاط کا رویہ پیدا ہوتا ہے یہ تصور مفصل فکری نظام پر مبنی ہے مثلاً کائنات کا موجودہ نظام ختم ہونے والا ہے۔ اس کی جگہ ایک نیا نظام قائم ہوگا یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس سے اچھے یا برے نتائج و ثمرات وہاں اصلی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ جزاء و سزا کا عادلانہ و رحیمانہ نظام قائم ہوگا اور انسان کی کوئی بات اور کوئی عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ اس تصور کا اثر انسانی معاشرے کے فکری و عملی پہلوؤں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے کئی ایک مقامات پر لوگوں کی فکری ناپختگی اور عملی کجی کا باعث اس تصور کا نہ ہونا قرار دیا ہے اور مومن کے متوازن ہونے کا سبب اس کے اسی احساس کو بتایا ہے مثلاً:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (۲۸)

اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کئے گئے یا ہم آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں۔ یہ اپنے خیال میں بڑائی رکھتے ہیں اور بڑے سرکش ہو رہے ہیں

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا (۲۹)

اور یہ (کفار مکہ) اس بستی پر ہو گزرے ہیں جس پر بری طرح پتھر برسائے گئے۔ تو کیا یہ لوگ اس کو دیکھتے نہیں رہے بلکہ یہ لوگ مر کر جی اٹھنے کا احتمال ہی نہیں رکھتے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۳۰) کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روز آخرت کو جھٹلاتا ہے۔

---

(۲۷) تفصیل کے لئے سید مودودیؒ کی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" ملاحظہ فرمائیں۔

(۲۸) الفرقان/۲۱ (۲۹) الفرقان/۴۰ (۳۰) الماعون/۱

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۳۱)

اور اس (روز جزاء کو) تو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد (عبودیت) سے گزرنے والا مجرم ہو۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۳۲)

اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۳۳)

اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپؐ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں۔ اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔

قرآن کریم کے مطابق یہ عقیدہ انسانی اخلاق کے لیے بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اس تصور کے ذریعے انسانی مزاج کو دراصل پختہ کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذمہ دار محسوس کرے۔ اس سے آدمی کا ایسا پختہ ضمیر تیار ہوتا ہے جس سے وہ کسی قانون اور خارجی دباؤ کے بغیر راست فکر اور صحیح عمل پر گامزن رہتا ہے۔ قرآن پاک میں اس تصور کو مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم صرف ایک پہلو پر اکتفاء کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل محفوظ ہو رہا ہے اور ایک ایسا وقت آ جائے گا جب یہ محفوظ سرمایہ اس کے سامنے ہوگا اور اس کے متعلق اس سے پرسش ہوگی:

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۳۴)

تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں ہر شخص (کی حفاظت) کے لیے کچھ فرشتے (مقرر) ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۳۵)

اور نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ ہے اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامہ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بے قلم بند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

(۳۱) المطففین/۱۲ (۳۲) النازعات/۴۰ (۳۳) البقرہ/۴

(۳۴) الرعد/۱۰-۱۱ (۳۵) الکہف/۴۹

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا(۳۶)

اور ہم نے انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار کر کے رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامہ اعمال اس کے واسطے نکال کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا۔ اپنا نامہ اعمال خود پڑھ لے آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا(۳۷)

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ(۳۸)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں جب دو اخذ کرنے والے فرشتے اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔

جوابدھی ہی کے اس تصور سے فکری تطہیر ہوتی ہے۔ انسان محتاط ہوتا ہے۔ ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ اور شتر بے مہار ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اسلامی تہذیب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسانی اعمال کے لیے ایسی صحیح اور پختہ بنیاد مہیا کرتی ہے کہ انسان کے اندر ثابت قدمی کا وصف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لغزش کھانے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

عظمت انسان

عظمت انسان اسلامی تہذیب کی جان ہے۔ انسان معزز و محترم ہے، اسے ذلیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی یہ عظمت ذاتی بھی ہے اور اضافی بھی۔ ذاتی اس اعتبار سے کہ اس کی شخصیت کو اس کائنات میں نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اس کا وجود اور اس کی ساخت مختار کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن و سنت نے انسان کی اس حیثیت کو پیش کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔(۳۹) ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ(۴۰)

اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور سمندر میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا کیں۔

حدیث میں آیا ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (۴۱) اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

---

(۳۶) بنی اسرائیل/۱۳-۱۴ (۳۷) بنی اسرائیل/۳۶ (۳۸) ق/۱۶-۱۷-۱۸

(۳۹) التین/۴ (۴۰) بنی اسرائیل/۷۰ (۴۱) بخاری، کتاب العتق ۲/۵۷۱؛ مسلم، کتاب البر والصلۃ ۲/۳۱

حضورؐ نے ایسی دعاء بد سے منع فرمایا جس میں چہرہ مسخ کرنے کا ذکر ہو۔

مزید برآں انسان اس کائنات میں اللہ کا نائب ہے۔ چونکہ یہ نائب الٰہی ہے اس لیے ساری مخلوق سے اونچا ہے۔ قرآن نے اس کی یہ عظمت بیان کی ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (۴۲)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپؐ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں نائب۔

يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (۴۳)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا اگر ایسا کرو گے تو وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ (۴۴)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تا کہ (ظاہراً) تم کو آزمائے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۴۵)

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی تو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے۔

اسلامی تہذیب نہ صرف یہ کہ انسانی عظمت کو قبول کرتی ہے بلکہ انسانی معاشرت میں اسے مستحکم کرتی اور فروغ دیتی ہے۔

مساوات انسانی

عظمت انسان کے بعد دوسری اہم خصوصیت انسانی مساوات ہے۔ انسانی معاشروں میں مدتہائے دراز سے یہ ظلم ہوتا چلا آ رہا ہے کہ کچھ لوگ از خود ہی اشراف بن جاتے ہیں اور انہی جیسے دوسرے لوگ اراذل کہلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شرافت و ذلت کے یہ معیار خود ساختہ ہیں۔ اس تقسیم کے اسباب عموماً قوم، نسل، زبان، رنگ اور جغرافیائی حدود ہوتے ہیں۔ اسلام نے ان تمام مصنوعی معیارات کو ٹھکرا کر لوگوں کو یہ بتایا کہ تخلیق کے اعتبار سے سب لوگ برابر ہیں۔ بنیادی انسانی ضروریات اور حقوق مساوی ہیں کوئی شخص محروم نہیں۔ معاش، معاشرت اور سیاست میں تمام انسان مساوی بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی فرق تسلیم کیا جا سکتا ہے تو وہ فقط فکر و عمل اور صلاحیت کا ہے۔ جو انسان بھی اس میدان

---

(۴۲) البقرہ/۳۰ (۴۳) ص/۲۶ (۴۴) الانعام/۱۶۵ (۴۵) الاحزاب/۷۲

میں آگے بڑھا وہ اونچا ہوگا۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَ الْاَرْحَامَ(۴۶)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو۔

وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ(۴۷)

اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان فرمایا:

یا ایھا الناس ألا ان ربکم واحد وإن أباکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأحمر علی اسود ولا لأسود علی أبیض إلا بالتقوی(۴۸)

اے لوگو تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، سنو کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر سوائے تقویٰ کے۔

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا وہ بھی مساوات انسانی کے تصور کی بہترین مثال ہے:

یا معشر قریش إن الله قد اذھب عنکم نخوة الجاھلیة و تعظمھا بالأباء. ایھا الناس کلکم من آدم و آدم من تراب لا فخر للانساب لا فضل للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی إن اکرمکم عند الله اتقاکم(۴۹)

اے اہل قریش۔ اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو تم سے دور کر دیا۔ اے لوگو! تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے تھے۔ نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

اسلام نے اونچ نیچ کے سارے امتیازات مٹا دیئے اور تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ مساوات انسانی کا اتنا عظیم خیال عملی صورت میں مسلم معاشرے ہی میں ظاہر ہوا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ جس مساوات انسانی کا ہم ذکر کر رہے ہیں

---

(۴۶) النساء/۱ (۴۷) الحجرات/۱۳

(۴۸) مسند احمد، ۵/۴۱۱ (۴۹) ابن ھشام ۴/۵۴۔

ں سے مراد ہے معاشرتی اور سیاسی حقوق کی مساوات، بنیادی انسانیت کی مساوات اور یہ ایسی مساوات ہے جو خود ساختہ امتیازات کو یکسر مٹا دے۔ ایسی مساوات نہیں جو غیر فطری اور ناممکن الحصول ہو، ایسی نہیں جس کے لیے انسانوں کی آزادی سلب کر لی جائے اور انہیں انسانیت سے نکال کر مشین یا حیوان بنا دیا جائے۔

اسلام سماجی، شہری اور سیاسی مساوات کی تو ضمانت دیتا ہے لیکن اوصاف و معاش کی مساوات کے متعلق اسلام کا مستقل نقطۂ نظر ہے جسے اللہ نے چاہا تو ہم کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔

تقویٰ

تقویٰ کے لفظی معنی اپنے آپ کو کسی شے کے ضرر سے بچانا ہے۔ پرہیز گاری اور بچنا اس کا عام مفہوم ہے۔ امام راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے کہ عرف شرع میں تقویٰ نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام ہے جو گناہ کی طرف لے جائے۔ یہ بات ممنوعات کے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے مگر اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب کہ بعض مباحات کو بھی ترک کر دیا جائے۔ حضور اکرمؐ نے حلال و حرام اور مشتبہات کے بارے میں ارشاد فرمایا:

الحلال بینٌ والحرام بَینٌ وَبَیْنَھُما مشتبھاتٌ لا یَعلَمُھُم کثیر مِنَ النَّاس فَمَنِ اتَّقیٰ الشُّبھاتِ اِستبر أَلِدِینہ وَعِرْضیہ (۵۰)

حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنا دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا۔

تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کرے۔ یہ دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ قرآن و سنت میں تقویٰ سے متعلق بےشمار نصوص ہیں اختصار کے پیش نظر ہم ان میں سے صرف دو ایک پر اکتفاء کرتے ہیں:

ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ(۵۱)

یہ بات بھی ہو چکی اور (قربانی کے جانور کے متعلق اور سن لو کہ) جو شخص دین خداوندی کی ان (مذکور) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا اللہ تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ و

---

(۵۰) بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، ۱۲/۱

(۵۱) الحج، ۳۲

یحقرہ، التقوی ھھنا ویشیر الی صدرہ ثلاث مرار ....(۵۲)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر جانتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے اور آپ نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

قرآن وسنت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تقویٰ نام ہے اس محتاط روش کا جس میں اللہ کی عظمت کا احساس، اس کی سزا کا ڈر اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں انتہائی احساس بندگی پوری طرح موجود ہو۔

یہ ہیں وہ اجزا جنہیں اسلامی تہذیب کی روح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان عناصر سے ایک ایسی تہذیب ترکیب پاتی ہے جو اپنے مظاہر اور خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کی تمام تہذیبوں میں منفرد مقام رکھتی ہے۔

خصوصیات

یہ اصول اسلامی تہذیب کی روح ہیں۔ اس روح کی قوت سے اسلامی ثقافت ایک زندہ، متحرک اور حیات بخش حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ثقافت دنیا کی ثقافتوں سے اعلیٰ اور مستقل مقام رکھتی ہے۔ وہ خصوصیات جو اسے انفرادیت عطا کرتی ہیں وہ بقول زبیر صدیقی یہ ہیں: (۵۳)

(i) اس کی بنیاد وحدت ربانی، عظمت انسانی اور مساوات انسانی پر ہے۔

(ii) یہ استحکام عدل وانصاف پر زور دیتی ہے جس کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی ہے۔

(iii) یہ وسعت رکھتی ہے اور تمام سابقہ تہذیبوں کی روح کو سمیٹ لیتی ہے۔

(iv) اسلام کی طرح اس کی حکمرانی بھی پوری زندگی پر ہے۔

(v) ہر قسم کے تعصب سے بالاتر اور زندگی کے تمام مسائل کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے حق میں ہے۔

(vi) فطرت کے عمیق مشاہدہ کی طرف دعوت ہے اور اس کے قوانین کا تنقیدی جائزہ ہے قطع نظر اس کے کہ پہلے کام کرنے والوں نے کیا کیا ہے۔

اسلامی ثقافت کا مقصد انسانی زندگی کے خارجی عناصر کو خوشنما بنانا نہیں بلکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بذات خود خوشنما بنانا اور سر بلند کرنا ہے۔

ہم اپنی بات ڈاکٹر میر ولی الدین کے بیان پر ختم کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

''اسلامی تہذیب کی روح سے حریت، سکینت قلب اور جذبۂ عمل پھوٹتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی اسی روح کا اثر پورے اسلامی معاشرے، اس کے اعمال اور اسلامی تمدن پر نمایاں ہوتا ہے۔ (۵۴)

......☆......

---

(۵۲) مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم/۱۱۲۴؛ مسند احمد، ۲/۳۹۱

(۵۳) International Islamic Calloqium-1975. Article-Islamic Culture What do we mean by it p.27

(۵۴) ایضاً، مقالہ؛ اسلامی ثقافت کا مفہوم

حصہ دوم

معاشرتی ادارے

معاشرتی ادارات

معاشرہ ایک غیر مرئی وجود ہے۔ اس کے نظم کا تجزیہ اور اس کے احوال کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا اس لیے علمائے
[عمرانیات/معا]شرت نے معاشرے کو ادارات پر تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک معاشرہ چند ادارات کا مجموعہ ہے۔ انہی ادارات سے
[معا]شرے کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے اور انہی ادارات کے عمل سے معاشرتی عمل کا تعین ہوتا ہے۔ معاشرتی استحکام اس کی ترقی
[و] تنزل کا پتہ انہی کے ذریعے چلتا ہے۔ چونکہ یہ خاص فنی اصطلاح ہے اس لیے ہم اسے اسی زبان میں بیان کریں گے۔
[یہ]اں پر ادارات کا مفہوم ان کا ارتقاء فرائض، فوائد اور اقسام بیان کریں گے اس کے بعد اسلامی معاشرے کے ادارات کا
[ذ]کر کریں گے۔

[م]فہوم

عمرانیات کی دیگر اصطلاحات کی طرح اسے بھی عام مفہوم کی بجائے مخصوص مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔
[اد]ارات کے اصطلاحی مفہوم کو مختلف طریقوں پر بیان کیا گیا ہے اور ان کی وضاحت میں بہت اختلافات ہیں۔ ہم ان میں
[س]ے چند ایک تعریفات نقل کئے دیتے ہیں۔ ان تعریفات میں سے قدر مشترک نکالنا مشکل نہیں۔ اصل تعریفات چونکہ
[انگ]ریزی زبان میں ہیں اس لیے ترجمانی میں غلطی کا امکان ہے قارئین عمرانیات کی کسی کتاب سے اصلی عبارتوں کو دیکھ سکتے
[ہ]یں۔(۱)

(i) لسٹر ایف وارڈ (Lister F. Ward) کے نزدیک ادارات معاشرتی قوت کے ضبط اور استفادہ کا ذریعہ ہیں۔

(ii) ای۔ اے راس (E. A. Ross) کے ہاں ادارات نام ہے اس جمعیت یا تعلق کا جسے معاشرہ نے منظور کیا ہے۔

(iii) ایل۔ ٹی ھابہاؤس (L. T. Habhouse) کی زبان میں معاشرتی زندگی کا مکمل یا کچھ حصہ ان ذرائع کا ہے جو مستحکم اور مقبول ہوتے ہیں۔

(iv) جائس۔ او۔ ہرٹزلر (Zoyce, O. Hertzler) نے اپنی کتاب سوشل انسٹی ٹیوشن میں ادارہ کو اس طرح بیان کیا:

---

(۱) تعریفات کے سلسلے میں زیادہ اعتماد سموئیل کوننگ کی کتاب پر کیا گیا ہے سہولت کے لئے ان تعریفات کی اصل عبارت یہاں درج کی جارہی ہے۔

Samuel Koening: Sociology- an Introduction to the Science of sociology.

(i) Lester F. Ward: He regards Institution as the means for the Control and utilization of the Social energy.

(ii) E. A. Ross: Grouping or relation that is sanctioned by Society.

(iii) L. T. Habhouse: As the whole or any part of the established and recognised apparatus of Social life.

(iv) A fabric of fairly definite and generally Sanctioned relations .... between individual of a group in respect to another.

یہ ایک بڑی حد تک متعین رشتہ ہے اور عام حالت میں منظور شدہ تعلقات ہیں جو ایک جماعت کے افراد میں ا
دوسرے کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

(v) ای سی ہیز (E. C. Hays) کی نظر میں ادارات افعال کا ایسا مجموعہ ہیں جنہیں معاشرہ سوچ کر تسلیم کردہ ضا
کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے تاکہ ادارہ کے منظور کردہ نتائج حاصل کئے جائیں۔

(vi) سی۔اے ایل وڈ (C.A.Ellwood) نے ادارات کی یہ تعریف کی ہے: وہ معاشرتی خصائل جو مرتب و منظم ہیں۔

(vii) رابرٹ۔ ایم میکلوور (Robert M. Maclover) کے خیال میں (ادارات سے مراد) گروہی عمل
باضابطہ خصلت (خصوصیت) کی منظم صورت یا حالت ہے۔

ان کی تمام تعریفوں میں غالباً سب سے زیادہ واضح سمنر اور کیلر (Sumner & Keller) کی تعریف کو سمجھا
ہے (۸) کہ ادارہ ایک مرکزی دلچسپی یا سرگرمی (عمل) ہے جو عوام کے طور طریقوں سے گھری ہوئی ہے۔

اگر چہ اس رائے کو اصول کے لحاظ سے نہیں مانا جا سکتا تاہم یہ ایک اچھی تعریف ہے۔ سمنر (Sumner
(Folkways) میں ادارے کو صرف خیال، نظریہ اور تصور ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک ڈھانچہ (Structure) خیال ک
ہے۔ اس نے (Structure) کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد (Group of functionaries).
وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ معاشرتی ادارے کا ڈھانچہ فرد، ساز و سامان، تنظیم اور عوامی انداز کی عملی صورت سے مرتب ہ
ہے (۹)۔

ان تمام تعریفات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسٹی ٹیوشن ایک ایسی اجتماعی وحدت کا نام ہے جس میں اف
ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں اور معاشرے نے اس تعلق کو قبول کیا ہوتا ہے۔ یہی وحدت معاشرے کے وسیع تر پھیل
میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ (۱۰) میں اسے ارتفاق کا نام دیا ہے اور ارتفاقات کے مجمو
ہی کا نام معاشرہ ہے چونکہ معاشرہ ایک غیر طبعی وجود ہے اس لیے معاشرے کی پہچان کا واحد ذریعہ یہی ارتفاقات ہیں۔

(v) E. C. Hays: Looked institutions as assets of activities which a society adopts as its deliberately accepted method of attaining a deliberatly approred end.

(vi) C. A. Ellwood defined: as Social habits which are systematized.

(vii) Robert M. Maclver regards them as Established forms or Conditions of procedure Characteristic of group activity.

(8) An institution is a vital interest or activity which is Surrounded by a cluster of modes and folkways.

(9) Structure of a Social institution as Consisting of personal equipment, organisation and ritual Folkways P 53-54.

(10) حجۃ اللہ البالغہ، ۳۸

ان معاشرتی ادارات کے آغاز کا صحیح پتہ چلانا تو ممکن نہیں کیونکہ ایک تو ہم انہیں بہت مدت سے منظم صورت میں دیکھ رہے ہیں دوسرے ان کی ابتدائی کیفیات بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہیں۔ تاہم ماہرین عمرانیات کی رائے ہے کہ افراد معاشرہ کی متعین ضروریات نے ان ادارات کو جنم دیا ہے۔ یہ ضروریات چونکہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہیں اس لیے ان ادارات میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی ہے مثلاً خاندان ہر فرد کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے یہ ادارہ ہر زمانہ میں موجود رہا ہے مگر تھیٹر ایسی ضرورت نہیں اس لیے اس کا کئی ادوار میں سراغ نہیں ملتا۔ ماہرین عمرانیات کی رائے ہے کہ یہ ادارات بالعموم انسان کی غیر شعوری کوششوں کا نتیجہ (۱۱) ہیں۔ میکلوور (Maclover) کا کہنا ہے کہ معاشرتی اعتبار سے ہر مستحکم چیز چونکہ ادارہ بن جاتی ہے اس لیے انسان کی اس ایک خصوصیت کی وجہ سے کئی چیزیں مستحکم ہوتی ہیں۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ ایک خاص عمل معاشرت کا جزبن جاتا ہے۔ یہی طرز عمل جو معاشرتی طور پر مستحکم اور جاری وساری ہوتا ہے آنے والی نسلوں کے لیے ادارتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کی یہی خصوصیت اسے باقی حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تمام مخلوقات میں غالباً انسان ہی کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے فکر وعمل کو مستقبل کے سپرد کرتا ہے۔ اور یہی چیز اجتماعی وحدت کی بنیاد ہے۔ ادارات کی موجودہ صورت بہت ترقی یافتہ ہے مگر ان میں ان جذبات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو ان کی تشکیل کا باعث بنے۔ گوتمام علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ ضروریات نے ان ارتقاقات کو جنم دیا ہے تاہم خصوصی اسباب و عوامل کے تعین میں قدرے اختلاف ہے مثلاً سمنر اور کیلر کہتے ہیں (۱۲) کہ:

(ا) ادارات انسان کے اہم ترین مفادات کی تسکین کے لیے وجود میں آئے۔

(ب) وارڈ کا خیال ہے کہ ادارات معاشرتی ضروریات یا مطالبے کا نتیجہ ہیں۔

(ج) برنارڈ کی رائے میں ان کی تخلیق جبلی ضروریات کی تسکین کے لیے ہے۔

(د) ایل ایچ مارگن کے نزدیک ہر ادارے کی بنیاد دائمی ضرورت پر ہے۔

وہ ضروریات اور مفادات جنہوں نے ادارات کو جنم دیا ہے بقول سمنر اور کیلر یہ ہیں:

بھوک' محبت اور خود پسندی جو ان تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ ذاتی تحفظ' ذاتی تسکین' جنس یا فوق الفطرت عناصر کا

---

(11) Winkerg.

(12) Introduction to the science of Sociology

a. Institution come to existance to satisfy vital interest of man.

b. Ward thinks: they arise because of a Social demands or necessity.

c. Bernard Concludes that they originate to meet instinctive needs.

d. L. H. Margon (American) is of the view that the basis of every institution is perpetual want.

خوف۔ مسلم مفکرین میں سے شاہ ولی اللہؒ کے ہاں اس موضوع پر بہت عمدہ اور مرتب بحث پائی جاتی ہے۔ شاہ صاحب نے آغاز ارتقاء پر جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

انسان جماعت پسند مخلوق ہے۔ گو جماعت پسندی بعض حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے لیکن ہمیں جس منظم جماعت پسندی سے بحث کرنا ہے وہ انسان کی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک جماعت پسندی کے فطری محرکات دو ہیں۔

(i) تحفظ جان۔

(ii) بقائے نسل

ان محرکات کا ہونا انسانی خصوصیت نہیں کیونکہ یہ محرکات حیوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو حیوانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کی یہی خصوصیت اس کی جماعتی اور معاشرتی زندگی کو جلا دیتی ہیں۔ مثلاً

(i) **بالاتر چیزوں کی حاجت:** عقلی و شعوری تقاضے انسان کو بعض اوقات عام حیاتیاتی احتیاجات سے بالاتر بنا دیتے ہیں اور وہ جسمانی خواہشات کی تکمیل سے بلند ہو کر خالص روحانی مقاصد کے لیے ایسے کام سرانجام دیتا ہے جو اسی کی خصوصیت ہے۔ اعمال کے اس سلسلے میں انسان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

(ii) **حفظ نفس اور بقائے نسل میں تنوع:** انسان حفظ نفس اور بقائے نسل کی ابتدائی ضروریات پر قناعت نہیں کرتا بلکہ وہ ان کے اندر تنوع پیدا کرتا ہے۔ وہ خوراک' پوشاک اور لباس میں نئے طریقے اور انوکھے نمونے ایجاد کرتا ہے اسی طرح بقائے نسل میں' نکاح و طلاق کے اصول' ازدواج کے طریقے' پرورش اولاد اور تنظیم خاندان وہ طرز عمل ہے جس کا حیوان تصور بھی نہیں کر سکتے اور یہی طرز عمل اس کے مذاق لطیف اور ذوق جمال کو تسکین دیتا ہے۔

(iii) **تعلیم و تجربہ:** حیوان خواہشات کی تسکین کا طریقہ فوری طور پر معلوم کر لیتے ہیں جسے فطری الہام کہا جا سکتا ہے لیکن انسان اس فطری الہام سے آگے قدم رکھتا ہے۔ وہ تعلیم و تجربہ سے نئے نئے طریقے دریافت کرتا ہے اس طرح سے اس نے اپنی زندگی کو رنگین اور پرکشش بنایا اور اس میں آئے دن تبدیلیاں اور ترقیاں ہو رہی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے اصل محرکات یہی ہیں۔ ان بنیادوں کے بغیر اتنا متنوع معاشرہ اور اتنا مہذب انسان کبھی صورت پذیر نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحب نے بدور بازغہ (۱۳) میں انسانی معاشرے کے چار مدارج قرار دیئے ہیں۔ بنیادی جذبات کی تسکین مختلف ہوتی ہے۔ ابتدائی اجتماعیت چونکہ سادہ ہوتی ہے اس لیے تسکین بھی وجدانی طریقہ سے ہوتی ہے لیکن تمدنی اور اجتماعی وسعت کے سبب معاشرہ جوں جوں ارتقائی منازل طے کرتا ہے طریقہ تسکین میں تنوع اور احتیاجات کی ترتیب میں عقل و فکر کی کاوشوں کا دخل

---

(۱۳) بدور بازغہ/۲۰

زیادہ موثر ہوتا جاتا ہے۔انسان ابتدائی اجتماعیت میں صرف ضروریات پوری کرتا ہے۔ بعد میں انہیں ترتیب دیتا ہے ان میں ردو بدل بھی کرتا ہے۔ بعض اوقات خارجی حالات کے تحت ان کے اندر حسن بھی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ خارجی حالات کا انسان اور اس کے فطری تقاضوں پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک مادی ضروریات اور اخلاقی قدروں کا گہرا تعلق ہے۔ معاشرے کی ترقی پذیر صورت ایک پیچیدہ تمدن پر منتج ہوتی ہے جس کے لیے ریاست کی تنظیم ناگزیر ہوتی ہے۔ جب معاشرہ اس سطح پر پہنچتا ہے تو شاہ صاحب کے بقول بنوت یا خلافت قائم ہوتی ہے۔ جس کا مقصد خدا کی عبادت سکھانے کے ساتھ تہذیب و تمدن کی تعمیر و اصلاح اور معاشرے کو فاسد رسوم و رواج سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ معاشرے کے یہی مدارج ہیں جو انسان کی انفرادی زندگی سے اجتماعی زندگی تک کا ارتقاء ہے ان اسباب و محرکات کے تحت مختلف ادارے وجود میں آتے ہیں جن پر معاشرتی زندگی کا انحصار ہے۔

دوسرے ماہرین عمرانیات کی طرح شاہ صاحب بھی تشکیل ادارات کی بنیاد ان فطری محرکات کو قرار دیتے ہیں لیکن شاہ صاحب انسانی اور حیوانی محرکات کی تقسیم کرتے ہیں۔ان کے نزدیک ادارات کی تشکیل کا باعث حیوانی جذبات سے زیادہ انسانی جذبات ہیں۔(۱۴)

لامارک (Lamarck) نے اپنی کتاب (Systam of Positive Polity) میں کہا ہے کہ معاشرہ تین ارتقائی مدارج سے گذرا ہے اور معاشرہ کی ہر سطح پر معاشرتی ادارات نے کام کیا ہے ان تین مدارج کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(i) مذہبی و جنگی

(ii) مافوق الفطرت اور قانونی

(iii) سائنسی اور صنعتی

یہ تینوں ادوار مختلف ادارات کی تشکیل کا مرکز ہوتے ہیں اور ہر درجہ مختلف نوعیت کے ادارات کو جنم دیتا ہے۔ ہربرٹ سپنسر (H. Spencer) کے بقول اتحاد و اختلاف معاشرتی ارتقاء کا باعث ہے' اسی کی بنیاد پر ادارات نے جنم لیا اور اسی کی بنا پر تہذیبیں اور تمدن ابھرے اور مٹے ہیں۔انسان کی معاشرت پسندی یا اجتماعیت میں جن محرکات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ادارات کا وجود و ارتقاء ان کی تسکین' ترتیب اور انضباط کا وسیلہ ہے۔

سی۔ایچ۔کولی (C. H. Cooley) نے اپنی کتاب معاشرتی تنظیم (Social Organization) میں ادارات کے آغاز و ارتقاء پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

(۱۴) حجۃ اللہ البالغہ، ۱/ ۳۸

Individual is Sensitive to the gesture and opinion of others. This sensitivity is the basis of social constraint.(15)

وائنز برگ اپنی کتاب (Society and man) میں رقمطراز ہے:

Sentiments always imply some kind of relationship or association between human beings ____ The sentiments occupy a basic position in the organization of human beings.(16)

ان اقتباسات پر ہم آغاز وارتقاء کی بحث کو ختم کرتے ہیں کیونکہ بنیادی تصور کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہیں۔ تفصیلات کا طالب قاری بنیادی مصادر کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

اقسام

ماہرین عمرانیات نے ادارات کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ وائنز برگ اور شاہاٹ نے اپنی کتاب (Society and man) میں ادارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک معاشرتی ادارے کا کام انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل ہے۔ آدمی کی ضروریات مثلاً خوراک، تخلیق، بچوں کی پرورش اور عام بہبود کا خیال ہر معاشرے میں زیادہ تر ادارے ہی انجام دیتے ہیں اور یہی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ بعض ادارے معاشی جدوجہد کے گرد گھومتے ہیں جیسے زراعت صنعت، مالیات وغیرہ۔ بعض ادارے جنس سے منضبط ہوتے ہیں۔ بعض فطرت اور کائنات سے متعلق عقیدہ پر استوار ہوتے ہیں اور بعض گروہی اور جماعتی بہبود کے لیے کام کرتے ہیں۔ دور حاضر کی ریاست اسی کی ترقی یافتہ (17) صورت ہے۔ بعض اور ادارے بھی ہیں جو معاشرے میں دیگر امور سر انجام دیتے ہیں جیسے تعلیم، سائنس، تفریح، صحت اور رسل ورسائل وغیرہ۔ بائرن۔ آر۔ ولسن (Byron R. Wilson) کی زبان میں معاشرتی ادارے یہ ہو سکتے ہیں:۔

صنعتی ادارے۔ حکومتی شعبے۔ ٹریڈ یونینیں۔ فوجی تنظیمیں۔ عوامی رسل ورسائل کے ادارے۔ سیاسی جماعتیں۔ ہسپتال۔ یونیورسٹیاں۔ مدرسے۔ عبادت خانے۔ فرقے۔ کلبیں اور تمام قسم کی رضا کارانہ تنظیمیں۔ (18) بعض ماہرین نے اسے یوں بیان کیا ہے:۔

(i) معاشی اور حکومتی نظم (جس کا تعلق ترسیل خوراک، جائداد، جماعت اور نظامہائے قانون سے ہے)۔

(ii) خاندان (جس کے ذریعے نکاح، طلاق، تربیت اولاد اور بزرگوں کی نگہداشت ہوتی ہے)۔

---

(15) Everret Charringtan Hughes ____ Principles of Socialogy, / 226.

(16) Weinsberg and Shahat _____ Society and Man. / 69.

(17) Weinsberg /126.

(18) Byron R. Wilson (ant.)- Society_ Problem and Method of Study- Edited by A. T. Wilford /96.

(iii) جمالیاتی و ذہنی اظہار اور تفریحی ضرورت (جس میں ناچ' اداکاری' شاعری' آرٹ' سائنس' فلسفہ' سماجی سعی و جہد' کھیلیں اور تفریحات وغیرہ شامل ہیں)۔

(iv) مذہب (عقائد و عبادات وغیرہ)

دنیا کے ہر معاشرے میں یہی ادارات کام کرتے ہیں ابتدائی درجہ سے لے کر دور حاضر کے متمدن معاشروں تک۔ ہر ایک میں بنیادی احتیاجات پائی جاتی ہیں اور ان کے اظہار و تسکین کے لیے یہی ادارات وجود میں آئے ہیں۔ ممکن ہے مختلف معاشروں میں ان کے نام مختلف ہوں لیکن ان کی حیثیت کسی نہ کسی طرح انہی بنیادوں پر متعین ہوتی رہی ہے۔

سمنر (Sumner) کے خیال میں یہ ادارات قدم بہ قدم ارتقاء پذیر ہوئے ہیں۔ ہر ادارے کا کوئی نہ کوئی عملی پس منظر ہوتا ہے خواہ وہ بالکل ہی اچانک وجود میں آ گیا ہو۔ اس کے نزدیک ادارات کی دو قسمیں ہیں:

(i) ارتقائی (Crescine) (۱۹)

(ii) نفاذی یا حکمی (Enactid) (۲۰)

پہلے کی مثال ریاست ہے اور دوسرے کی کالج۔ لیکن ہم کسی ادارے کو بھی بالکل وقتی اور ہنگامی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مثال ضرور ہوتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری قسم کے اداروں کی وجود پذیری جلدی ہوتی ہے۔ یہ ادارات چونکہ سوسائٹی کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں اس لیے کوئی ادارہ بھی ضرورت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ ان ادارات کا کام احتیاجات کی تقسیم پر ہی نہیں ختم ہو جاتا بلکہ ان میں تنظیم و انضباط پیدا کرنا بھی ان کا کام ہے۔ اس لیے ان میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ بعض ادارات مٹ جاتے ہیں بعض کے اندر اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور کئی ایک اپنی حیثیت بدل کر رونما ہوتے ہیں۔ یہ ادارات اپنا علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ معاشرے کے لاتعداد ادارات کے وجود کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے اور یہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتے ہیں۔ کسی ایک ادارے کو مستقل وحدت بنا کر پورے معاشرے سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے نہ بالذات قائم ہی رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے باہمی ربط و انحصار کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ سب انسانی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور سب بالآخر ایک ہی مرکز کا رخ کرتے ہیں اور وہ ہے انسان۔

ہم ان کی اقسام کے بارے میں چند ایک معروف مفکرین کے بیانات لکھ کر اس حصے کو ختم کرتے ہیں۔

ہرٹزلر (Hertizler) نے اپنی کتاب سوشل انسٹی ٹیوشن (Social Institutions) میں ادارات کی یہ قسمیں بیان کی ہیں۔

---

(19) Those develping in the process of accretion.

(20) Those appearing as a result of conscious and rational effort.

(i) معاشی و صنعتی

(ii) ازدواجی و خانگی

(iii) سیاسی

(iv) مذہبی

(v) اخلاقی

(vi) تعلیمی و سائنسی

(vii) مزاحیہ، جمالیاتی اور اظہاری (Communicative esthetic and expressional)

(viii) صحی اور تفریحی

ان میں سے عام طور پر زیادہ محسوس کئے جانے والے یہ ہیں۔

معاشی۔حکومتی۔مذہبی۔خاندانی اور تعلیمی و تفریحی (۲۱)

ہربرٹ سپینسر (Herbert Spencer) نے اپنی کتاب پرنسپلز آف سوشیالوجی (Principles of Sociology) میں ادارات کی یہ چھ قسمیں بیان کی ہیں:

(i) خانگی (Domestic)

(ii) رسمی (Ceremonial)

(iii) سیاسی (Political)

(iv) کلیسائی (Ecelesiastical)

(v) پیشہ ورانہ (Prófessional)

(vi) صنعتی (Industrial)

وائنز برگ (Weinsberq) نے ان ادارات کو اس طرح بیان کیا ہے:

ہمارے معاشرے میں اہم اجتماعی ادارات وہ ہیں جو معاشی تگ و دو، حکومت، مذہب اور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈیوی (Deivy) کہتا ہے کہ عادات انسانی فطرت کی تشکیل کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے حقیقی ادارات وہ ہیں جو ہماری انسانی فطرت کی تشکیل کرتے ہیں (۲۲)۔

اس تفصیلی بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ادارات کی اقسام کیا ہیں اور ان میں بنیادی قسمیں کون کون سی ہیں؟ چونکہ معاشرتی نظم کا دارو مدار ادارات کی وسعت و تنظیم پر ہے اس لیے جس معاشرے میں ادارات جس قدر وسیع و منظم ہوں گے

---

(21) Samuel Koening. Socialogy- An introduction of Sociology

(22) Weinsberg. Society and man /61

وہ معاشرہ اتنا ہی بڑا اور منظم و مستحکم ہوگا۔ وسعت و تنظیم کے فقدان سے معاشرتی تنگی اور فساد و انتشار کا اظہار ہوگا۔

اداروں کی اقسام کے بعد اس کے فرائض کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ فرائض سے ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا نیز وہ طریقہ بھی سامنے آ جائے گا جس سے ایک ادارہ معاشرے کے استحکام یا انتشار کا باعث بنتا ہے۔

فرائض و فوائد

اداروں کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ ان فرائض و فوائد سے ہوگا جو یہ سرانجام دیتے ہیں۔ عمرانیات میں اداروں کے فرائض و فوائد کی بحث بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ علماء نے اس پہلو پر اظہار خیال کر کے فرائض و فوائد کی پوری فہرست دی ہے اور مسئلے کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً گڈنگز (Giddings) کہتا ہے:

ادارات ہی وہ ذریعہ ہیں جن سے نسل انسانی کے شاندار ماضی کا تحفظ ہوتا ہے۔ سمنر اور کیلر (Sumner and Keller) کے الفاظ میں (Folkways) عوامی طرز عمل کو معاشرے میں وہی مقام حاصل ہے جو خلیے کو حیاتیاتی وجود میں' اور اداروں کی حیثیت اس وجود میں ہڈیوں کے نسیج (۲۳) کی ہے۔ یہ ادارے ایک مشین کی طرح ہیں جس کے ذریعے سوسائٹی افراد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اپنی ضروریات پوری کریں۔ ادارہ کی حیثیت عام گروہی عمل سے زیادہ اہم ہوتی ہے کیونکہ عام جماعتی زندگی دراصل اداراتی زندگی کی تقویت کا موجب ہوتی ہے۔ انسانی معاشرہ وسیع' پیچیدہ اور غیر طبعی ہے۔ اس لیے کسی معاشرے کا اندازہ اس کے اجتماعی ادارات ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اجتماعی ادارات معاشرتی مطالعہ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ادارات چونکہ معاشرے کا دوسرا نام ہے' اس لیے کسی معاشرے کا استحکام اس کی فعالیت پر اور اس کے تجزیئے کا انحصار اس کے اپنے ادارات پر ہوتا ہے۔ معاشرے کے مذہبی معاشی سیاسی اور تعلیمی معیار کا اندازہ انہی سے ہو سکتا ہے۔ کسی معاشرے کے یہ ادارے جتنے مضبوط واضح' منضبط اور مرتب ہوں گے اتنا ہی وہ معاشرہ بہتر ہوگا۔ پھر یہ ادارات ہی ہیں جن کے ذریعے بنیادی احتیاجات کی تسکین ہوتی ہے۔ ان کے فوائد کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(i) یہ معاشرتی زندگی کی بنیاد ہیں۔

(ii) ان کی وجہ سے معاشرے کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔

(iii) انہی کے سبب معاشرتی حالات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

(iv) یہی وہ ذرائع ہیں جن سے ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادی فوائد جن سے معاشرتی اداروں کا طریق کار متعین ہوتا ہے۔ ہر معاشرتی ادارے کا ایک دائرۂ عمل ہے

23. Folkways are to Society what cells are to the biological organism. institutions are its bones and tissues.

جس سے افرادِ معاشرہ کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ یہ معاشرتی ادارے انسان کی کسی نہ کسی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لیے وجود پذیر ہوتے ہیں اس لیے ہر معاشرتی ادارے کا اولین فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ان ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔

ساخت

معاشرتی ادارے کے فرائض بیان کرنے سے پہلے ایک امر کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور وہ اس کی تنظیم یا ڈھانچہ ہے۔ معاشرتی ادارہ کا مقصد تقسیم عمل اور سہولت کار ہے۔ اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی تنظیمی نوعیت واضح نہ ہو۔ معاشرتی ادارہ ایک پیچیدہ ساخت ہے گو اس کے تجزیہ کے بغیر آگے چلنا مشکل ہے۔ سمنر کے بقول معاشرتی ادارے کا انحصار ڈھانچہ پر ہوتا ہے۔ ایک معاشرتی ادارے کی ساخت فرد، ساز و سامان، تنظیم اور عمل پر مشتمل ہوتی ہے (۲۴) ایوریٹ کیرنگٹن ہیوز (Everrat Charrington Hughes) نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔ یہی اجزاء دراصل کسی معاشرتی ادارے کی تعمیری ساخت کا سبب بنتے ہیں۔ فرائض کے تعین اور ادائیگی میں بھی یہی اجزاء مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرتی ادارے کی کامیابی یہ ہے کہ اس کے سارے اجزاء باہم دگر مربوط ہوں اور مجموعی عمل کے لیے وحدانی کوشش کرسکیں۔ سارے اجزاء میں مرکزی حیثیت تنظیم کو حاصل ہے کیونکہ اس کے ذریعے فرد اور سامان کی پیوستگی ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اعمال وجود میں آتے ہیں جنہیں فرائض کا نام دیا جاتا ہے۔ ساخت کے بعد فرائض کا درجہ ہے۔

فرائض

فرائض ہی وہ افادی پہلو ہے جس سے معاشرے کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ وہ فرائض کیا ہیں اسے ریڈ کلف براؤن (Redcliff Brown) نے بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ایک معاشرتی ادارے کے فرض سے میری مراد اس کا وہ کردار ہے جو وہ معاشرتی یک جہتی کے پورے نظام میں ادا کرتا ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ معاشرتی یک جہتی کا جملہ استعمال کرکے میں یہ مراد لے رہا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی ثقافت کا مقصد عمل یہ ہے کہ وہ منفرد افراد انسانیت کو کم و بیش مستحکم معاشرتی تنظیم سے ملا دے: مستحکم نظام حکومت وہ ہے جو ان افراد کے باہمی تعلق کو متعین اور منظم کرے اور عملی ماحول اس طرح کی اثر پذیری کو مہیا کرے اور مشتمل افراد یا گروہوں کا ایسا اندرونی انتخاب و اختیار کرے جو مطلوبہ معاشرتی زندگی کو ممکن بنا دے (۲۵)۔

---

(24) Weinsberg Shahat ___ Society and man. / 126.

(25) Redcliff Brown. The Present position of anthropologist studies Section H __ /13, quoted in Principles of Sociology / 231.

ان معاشرتی اداروں کے فرائض انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ انفرادی یہ کہ ہر ادارہ اپنے مخصوص دائرہ کار میں اپنی حدود کے مطابق فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ادارہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً مدرسہ تعلیم و تربیت دیتا ہے لیکن ریاست نگہداشت کرتی ہے اس طرح عبادت گاہ کا فریضہ اور ہے اور خاندان کا کچھ اور۔ انفرادی فرائض کے علاوہ ان ادارات کے اجتماعی فرائض بھی ہیں مثلاً

(i) معاشرتی ہم آہنگی:

یہ سب سے اہم فریضہ ہے۔ معاشرے کا ہر ادارہ اس طرح کام کرے کہ وہ دوسرے کا معاون ہو۔ تعلیم، مذہب، سیاست اور معیشت باہم دگر مربوط ہوں کیونکہ ادارات کے باہمی اختلاف کی وجہ سے معاشرے کا سکون ختم ہو جاتا ہے اور معاشرتی استواری میں ایسا فساد پیدا ہو جاتا ہے جس کا روکنا محال ہوتا ہے۔ اگر تعلیمی ادارہ میں مذہب بیزار نصاب پڑھا جائے گا یا ریاست خاندان دشمن پالیسیاں بنائے گی تو معاشرے میں استحکام کیسے پیدا ہوگا؟

(ii) افراد کا نظم و ضبط:

ادارہ چونکہ نام ہی تنظیم و ترتیب کا ہے اس لیے اس کا ایک نہایت ہی اہم فریضہ یہ ہے کہ افراد کے اندر نظم و ضبط پیدا کرے اور مختلف دوائر کار میں انسانی کوششوں کو منضبط و مربوط رکھے۔ افراد کی تنظیم ہی سے معاشرے کا استحکام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی تنظیم ایک ناگزیر امر ہے جس کا لحاظ ہر منظم ادارہ کرتا ہے۔

(iii) معاشرتی احساس کی بیداری:

فرد پر کبھی کبھی اپنی انفرادیت غالب آنے لگتی ہے جس سے وہ معاشرے کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ بننے لگتا ہے ایسی کیفیت میں یہ ادارے اپنا کام کرتے ہیں اور فرد کو اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیتے۔ افراد کے معاشرتی احساس کی بیداری اور تحفظ کا دارومدار انہی ادارات پر ہے۔

(iv) مقاصد کی تکمیل:

انسان تمام ضروریات زندگی کی تکمیل اکیلے نہیں کر سکتا اسے مجبوراً دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کی تکمیل اس کے مقاصد زندگی کی تکمیل ہے۔ یہ ادارات ان احتیاجات کی تکمیل بطریق احسن کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے حصول مقصد کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ فرد اپنے کام میں سہولت محسوس کرتا ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان

بہت سی مشکلات سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

(۷) حقوق و فرائض:

معاشرتی زندگی حقوق و فرائض کے احساس پر مبنی ہے اور باہمی ارتباط کا ادراک اس کی روح ہے۔ اس کے بغیر کوئی معاشرہ بھی اپنی اجتماعیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہ ادارات مختلف دائروں میں انسان کے حقوق و فرائض متعین کرنے اور ان کی رعایت کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔

معاشرتی اداروں کی تعریف' ارتقاء' اقسام اور فرائض و فوائد بیان کرنے کے بعد یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارات تمام انسانی معاشروں کی مشترک میراث ہیں۔ یوں تو ان کے اندر عالمی مطابقت پائی جاتی ہے لیکن بعض اوقات محض معاشرتی اور مذہبی حالات کی وجہ سے ان ادارات کے اندر بنیادی اختلافات آ جاتے ہیں۔ یہ اختلافات بالعموم ایسے نہیں ہوتے جن سے ادارے کی روح بدل جائے۔ یہ اختلاف صرف ساخت اور فرض کے طریق ادائیگی کا ہوتا ہے۔ ادارات کی تنظیم و ترتیب میں مذہب معیشت اور سیاست نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ معاشرتی زندگی میں کوئی چیز بھی خود مختار نہیں ہے اس لیے یہ ادارات افراد سے شدید طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ مثلاً مذہب معیشت اور سیاست میں کسی ایک کے غالب اثر سے دوسرے ادارات لازماً متاثر ہوتے ہیں۔ بہرکیف معاشرتی ادارات معاشرے کا اساسی اثاثہ ہیں جن سے صرف نظر نہیں ہو سکتا۔ معاشرتی ادارت کا استحکام معاشرے کا استحکام ہے اور ان کی کمزوری یا انتشار نہ صرف معاشرتی احساس کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ فرد کے احساس ذمہ داری کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ ایک اچھا معاشرہ ہر لحہ اپنے اداروں کی تنظیم' فرائض اور اثرات کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور اصلاح احوال سے غافل نہیں ہوتا۔

......☆......

2 خاندان

مفہوم:

انسان فطری طور پر معاشرت پسند ہے۔اسی فطری تقاضے اور خارجی ماحول کی ضروریات نے اسے اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔معاشرتی تنظیم کا آغاز کب ہوا؟ صحت کے ساتھ اس کا تعین ممکن نہیں تاہم یہ تو بدیہی امر ہے کہ انسانی معاشرے کی ابتداء خاندانی تنظیم سے ہوئی ہے۔خاندان کی ابتداء مرد وعورت کے باہمی تعلق سے ہوتی ہے۔اس بنیادی تعلق کی بدولت انسانی زندگی کا کاروان آگے بڑھتا ہے۔بچے ہوتے ہیں تو یہی مرد وعورت والدین کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔بچے جوان ہوتے ہیں تو پھر ازدواجی رشتے بنتے ہیں اور اس طرح کنبے اور قبیلے وجود میں آتے ہیں۔خون کے رشتے پھیلتے ہیں اور یہ وحدت پھیل کر معاشرہ بن جاتی ہے۔انسانی زندگی کی ارتقائی کڑیاں یونہی بنتی سنورتی چلی جاتی ہیں۔غرضیکہ خاندان کی سادہ اور ابتدائی صورت مرد وعورت کا مستحکم تعلق ہے اور وسیع تر بیت میں وہ تمام عناصر ہیں جو مرد وعورت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں۔ماہرین عمرانیات نے اپنی مخصوص زبان میں خاندان کی وضاحت کچھ اس طرح سے کی ہے: انگریزی زبان کا لفظ (Family) لاطینی استخراج ہے اور بنیادی طور پر ایک گروپ کو ظاہر کرتا ہے جو والدین بچوں، نوکروں اور غلاموں پر مشتمل ہو۔اس کا مماثل یونانی لفظ (Oikonomid) ہے جس سے لفظ (Economic) نکلا ہے۔جو ظاہر کرتا ہے کہ خاندان بنیادی طور پر معاشی تنظیم ہے اور اس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو وسیع تر معاشرتی زندگی میں موجود ہیں ماہر عمرانیات ایف نمکوو (Meyer F. Nimkoff) اپنی کتاب میرج اینڈ فیملی (Marriage and Family) میں خاندان کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے: میاں بیوی اور اولاد پر مشتمل ایسا باہمی ربط جو نسبتاً پائیدار ہو۔سمنر اور کیلر کے الفاظ میں خاندان ایک مختصر معاشرتی تنظیم ہے جس میں کم از کم دو نسلیں شامل ہوتی ہیں اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ یہ خونی رشتے کی تنظیم ہے۔غرض خاندان کی معاشرتی زندگی کی ابتدائی وحدت ہے جس میں بنیادی حیثیت مرد وعورت کو حاصل ہے۔

ارتقاء واستحکام

خاندان بھی دوسرے معاشرتی اداروں کی طرح ترکیبی وانتظامی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا۔اس کے ارتقاء میں استحکام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔مختلف مراحل پر خاندان کے استحکام اور عدم استحکام ہی سے اس کا تعین ہوتا رہتا ہے۔ایک مستحکم خاندان کی بنیاد مرد وعورت کا تعلق ہے۔اس سے بچہ وہ سکون حاصل کرتا ہے جو وہ ماں کی گود میں بیٹھ کر یا بہن

بھائیوں کی معیت میں کھانے اور کھیلنے میں محسوس کرتا ہے۔ بچے کے لیے پہلا اور آخری سہارا ماں باپ ہوتے ہیں تا آنکہ وہ بڑا ہو کر آزاد اور خود مختار ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ بوڑھے والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کا سہارا بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کا آغاز و ارتقاء ایک ایسا مسلسل عمل ہے جس میں ہر فرد دوسرے کا سہارا بن جاتا ہے۔ (۱)

انسان نے بالکل آغاز ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار خاندان پر ہے۔ تمدن کے ابتدائی درجے سے لے کر دور حاضر تک خاندان کی بنیادی حیثیت نہیں بدلی۔ علمائے معاشرت کا کہنا ہے کہ اچھے معاشرے کا دارومدار مستحکم خاندان پر ہے۔ تاریخ انسانی پر نظر رکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تہذیبوں اور تمدنوں کے زوال کا باعث خاندان کا انتشار ہے۔ رومی تہذیب اسی کے سبب زوال کا شکار ہوئی اور دور حاضر کے متمدن اور مہذب معاشرے بھی اسی کے انتشار کی وجہ سے معاشرتی فساد کا شکار ہیں جو انجام کار تباہی تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان ایسا ادارہ ہے جو انسانی رویئے اور طرز عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس کے ذریعے معاشرتی تربیت ہوتی ہے۔ خاندان ہی وہ ادارہ ہے جو فرد کو اپنے فرائض کا احساس دلاتا ہے اور اسے فرق مراتب کا شعور دبخشتا ہے۔ اگر خاندان کا استحکام ختم ہو جائے تو انسانی طرز عمل، معاشرتی فرائض کا شعور اور افراد معاشرہ کے مراتب کا تعین سب کچھ ختم ہو جائے۔ ان قدروں کا فقدان معاشرتی بحران پر منتج ہوتا ہے جسے قومی ہلاکت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جدید امریکی محققین خاندانی انتشار کے اس پہلو سے سخت پریشان ہیں اور وہ اپنی تحریروں میں جا بجا اس ہلاکت خیز رجحان کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں عصر حاضر کا معاشرہ زوال پذیر ہے کیونکہ اس کا خاندانی نظم منتشر ہو رہا ہے ولیم ایف اگبرن (Villiam F. Ogburn) اپنے مضمون ''امریکی خاندان کا زوال'' میں اس مسئلہ پر بڑی تشویش کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان ایک معاشرتی ادارے کے لحاظ سے زوال پذیر ہے یہ نتیجہ ہے مسلسل اور کثیر تحقیقات کا۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ خاندان رو بہ زوال ہے یا اس میں کوئی تبدیلی ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہم خاندان کے متعلق اسی طرح سوچنے کے عادی ہیں جیسے ہم پتھر کے زمانے کے خاندان کے متعلق سوچتے ہیں۔ پھر کچھ حصہ ایسا بھی ہے جو فطرت اور ساخت اشیاء میں لازمی طور پر غیر متبدل رہتا ہے جیسے معاشرے کی بنیاد ورنہ بذات خود تہذیب کا وجود نہ ہوتا اور پھر جب دن بدن معمولی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو ہم انہیں محسوس نہیں کرتے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے اگر وہ طویل غیر حاضری کے بعد لوٹیں تو اس وقت اس وقوع پذیر عظیم تبدیلی کو ان لوگوں سے زیادہ بہتر دیکھ سکیں گے جو کہیں دور نہیں گئے۔ (۲)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تہذیب حاضر کا انسان خاندان کے استحکام کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور

---

(۱) Benson, Religion in Contemporary Cultures, / 777

(۲) New York Magzine, 1927; H.E Barness, Social Institutions, 611, New York 1946.
قاری اندازہ کر سکتا ہے کہ امریکی خاندان کے زوال کی بات 1927ء میں ہو رہی ہے اور 1946ء میں باقاعدہ علمی انداز میں جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اب امریکی خاندان نامی ادارے کی حیثیت صرف ڈھانچے کی ہے۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت نے مغرب میں خاندان کے ادارے کو تباہ کر دیا ہے۔

خاندانی انتشار کو مصیبت سمجھ رہا ہے جس سے نجات کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آتی۔ خاندانی استحکام اچھی معاشرت کے لیے ناگزیر ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مستحکم خاندان ہی بہترین معاشرت کا سنگ بنیاد ہے۔ انسان خاندان کے مثبت اثرات سے جتنا محروم ہوتا جارہا ہے اتنا ہی اس کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے۔

فرائض

عمرانی نقطہ نظر سے معاشرے کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(i) ابتدائی (Primary)

(ii) ثانوی (Secondary)

اس تقسیم کے لحاظ سے خاندان ابتدائی گروہ میں آتا ہے۔ یہ ایک معاشرتی وحدت ہے جو جنسی کشش اور پدری و مادری محبت سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ (۳) خاندان کے فرائض کیا ہیں؟ اس کا تعین ان ضروریات سے ہوگا جو کسی معاشرے کیلئے اجتماعی حیثیت سے اہمیت رکھتی ہیں۔ گویا خاندان کو ایک ادارہ کی حیثیت سے وہ تمام فرائض سرانجام دینے ہیں جو اس کے افراد کی ضروریات کی تکمیل اور خواہشات کی تسکین کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً خوراک، لباس اور مکان وغیرہ وہ ضروریات ہیں جو بالکل ابتدائی دور کے ایک سادہ سے کسان خاندان میں پائی جاتی تھیں اور موجودہ ترقی یافتہ معاشرے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جس طرح خاندان کی ہیئت بدلتی رہی ہے اسی طرح اس کے فرائض بھی بدلتے رہے؛ مثلاً زرعی معاشرے میں بچے نعمت ہوتے ہیں وہ کھیتوں میں کام کر کے خاندان کی تقویت کا باعث بنتے اور خاندان ان بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا، لیکن جدید معاشرتی زندگی میں بچے بوجھ بن گئے ہیں اس لیے کہ ان کی کفالت کرنا خاندان اپنا فریضہ نہیں سمجھتا۔ اس کا اندازہ ایچ۔ ای بارنیس (H. E. Barnes) کے اس جملے سے کیجئے: جدید معاشرے میں بچے اب معاشی اثاثہ نہیں بلکہ اہم مالی ذمہ داری ہیں۔ (۴)

زرعی معاشرہ میں خاندان پر معاشی دباؤ زیادہ نہیں ہوتا اس لیے چند افراد کے کام سے خاندان کی کفالت ہو جاتی ہے۔ تقسیم کار میں گھریلو اور بیرونی کام کاج کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن صنعتی انقلاب کے بعد خاندان کی تنظیم میں بہت اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ معاشی تگ و دو نے بنیادی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس لیے خاندان کے فرائض میں کسب معاش کو نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی خاندان کے کئی فرائض ہیں جنہیں علماء معاشرت نے بیان کیا ہے۔ مثلاً ایوریٹ کیرنگٹن (Everret Charington) ادارہ کا فریضہ اس طرح بیان کرتا ہے۔ ''بظاہر خاندان کا عجیب اور

---

(۳) Social Institutions/160

(۴) Ibid/608

مرکزی فریضہ یہ ہے کہ وہ ان افراد کے مابین جو آپس میں خاندانی قرب رکھتے ہیں محبت وشفقت کے خصوصی روابط برقرار رکھے"۔(۵)

سمز اور کیلر فرائض کا تعین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

خاندان کے اہم فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ اہل خاندان کی معاشرتی حس کو اس طرح بیدار کرے کہ وہ اپنے معاشرے کے رکن بن جائیں۔ دوم یہ کہ جماعت کے ثقافتی احساس کو دوام اور استمرار بخشا جائے۔(۶)

بنسن (Benson) کے نزدیک خاندان کے فرائض یہ ہیں۔(۷)

(i) کام (ii) معاشی (iii) تعلیمی (iv) تفریحی (v) خاندانی وقار (vi) مذہب۔

فرائض کے ساتھ خاندان کی ہیئت ترکیبی کی بحث بھی آجاتی ہے ہر ادارے کی ہیئت ترکیبی کا تعلق اس کے اس طرز عمل سے ہوتا ہے جس سے اس کے فرائض کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے فرائض اور ہیئت ترکیبی جزوی طور پر ایک چیز سے متعلق ہوتے ہیں۔ خاندان کی ہیئت ترکیبی کی چند خصوصیات بھی ہو سکتی ہیں جو فرائض سے مختلف ہوں مثلاً:

(i) خاندان کی افرادی قوت (ii) استحکام (iii) افراد خاندان کی نقل وحرکت (iv) خاندانی فیصلوں کا طریق کار (v) وہ نظم جس سے خاندان کے افراد کا عمل منضبط ہوتا ہے (vi) خاندانی ہم آہنگی۔

یہ چند امور وہ ہیں جو براہ راست خاندان سے متعلق ہیں اور اس کی ہیئت ترکیبی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ساری ارضی رونقیں خاندان ہی کے دم قدم سے ہیں۔ اس کے بغیر انسان کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ خاندان اپنے فرائض اور طرز عمل کے سبب اس قدر وسعت اختیار کر گیا ہے کہ پوری انسانی جدوجہد خاندانی تنظیم کے تحت آجاتی ہے۔

علمائے معاشرت نے ایک اور دلچسپ بحث چھیڑی ہے کہ خاندان کی ابتدائی ہیئت ترکیبی کیا تھی؟ انگریز مصنف (H. Summer Main) کی رائے یہ ہے کہ ابتدائی کیفیت پدرسری تھی۔(۸)(Y. Bochofen) کی رائے ہے کہ ابتدائی کیفیت مادرسری تھی۔ امریکی عمرانی عالم (Margon)۔ جسے عمرانیات کا بابا آدم خیال کیا جاتا ہے۔ کی رائے یہ ہے کہ خاندان مختلف مراحل سے گزرا ہے بالکل ابتدائی مرحلے سے لے کر منظم صورت تک ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کس مرحلہ پر مادرسری نظام تھا۔ ممکن ہے کسی مرحلہ کی ابتداء میں ایسا ہو لیکن اس کی انتہا پدرسری ہے۔ اکثر علماء کی یہ رائے

---

(۵) Principles of Sociology / 231

(۶) Samuel Kooning Introduction to the Science of Sociology / 54

(۷) Religion in Contemporary Cultures / 777

(۸) Social Institutions, / 620

ہے کہ مادرسری نظام کبھی موجود نہیں رہا۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ ابتدائی کیفیت آزادانہ تھی۔ خاندان کی ارتقائی حالت اور اس کے فرائض کے پیش نظر ماہرین عمرانیات نے کہا ہے کہ عام طور پر خاندان کی دو قسمیں پائی گئی ہیں۔

(i) یک جدی (Consanduine)

(ii) ازدواجی (Conjugal)

خاندان کا تعین عموماً انہی دو اسباب سے ہوتا ہے یعنی نکاح سے یا خونی رشتے سے۔ انہی پر خاندان کے وجود کا انحصار ہے اور انہی کی بنیاد پر خاندان کی افرادی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ باپ یا مرد کا کردار ہمیشہ بنیادی رہا ہے اور اسی کے ذریعہ خاندان ایک مستحکم ادارے کے طور پر باقی رہا۔ مادرسری خاندان کا تصور چند عمرانی محققین کی اپج ہے جس کے لیے کوئی محکم تاریخی دلیل نہیں ملتی۔

عناصر ترکیبی

خاندان کے اجزائے ترکیبی: مرد و عورت' اولاد' والدین اور دیگر رشتہ دار ہیں۔ ان سے متعلق جو امور زیر بحث آتے ہیں وہ ہیں: عورت کی حیثیت' نکاح وطلاق' تربیت اولاد' حقوق والدین' صلہ رحمی اور خاندان کی ہم آہنگی۔

عورت کی حیثیت

خاندان میں عورت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن خاندانی ارتقاء کے ساتھ اس کے مقام میں بھی فرق پڑتا رہا ہے۔ بعض معاشروں میں اسے سیادت تو حاصل رہی مگر وہ مرد کی معاون اور خادمہ کی حیثیت سے معروف رہی۔ پدرسری معاشرے کو اساس قرار دیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مرد کے مقابلے میں اسے ہمیشہ کمزور سمجھا جاتا رہا ہے' ھندو' یہودی' عیسائی' ایرانی' یونانی' رومی اور ایام جاہلیت کے عرب معاشروں میں اس کی حالت ناگفتہ بہ رہی ہے۔ اسلامی معاشرے میں البتہ اسے بلند مقام دیا گیا اور ذلت و پستی سے نکال کر اسے انسانی معیار تک لایا گیا۔ دور حاضر میں تحریک آزادی نسواں کے نتیجے میں عورتوں کے حقوق کی مہم چلی ہے اور مختلف معاشروں میں عورتیں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں اور مزید حقوق کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ آزادی کی جو صورتیں پیدا ہوئی ہیں ان میں سے عورت کو انفرادی طور پر یقیناً کچھ فائدہ پہنچا ہے لیکن خاندان کے ادارے پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

نکاح وطلاق

خاندان کا نمایاں جزء دراصل مرد اور عورت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے خاندان کی عددی قوت بڑھتی ہے اسی کے

سبب اسے استحکام نصیب ہوتا ہے۔ یہ تعلق فرد کی انفرادی حاجت کی تسکین بھی ہے اور اجتماعی فلاح کا ذریعہ بھی۔ ماہرین عمرانیات نے اس تعلق کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ جنہیں نکاح اور جنسی روابط پر تحقیقات کرنے والوں کی زبان میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(i) تعدّد ازواج یا چند زنی (Polygamy)

(ii) یک زوجگی (Monogamy)

(iii) کثیر شوہری (Polyandry)

تیسری قسم میں ایک اور نوع ہے جسے گروہی شادی (Group Marriage) کہا جاتا ہے۔ اس میں چند مرد چند عورتوں کے خاوند ہوتے ہیں اور یہ تعلق ان میں سے ہر ایک کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چند شوہری شادی بہت کم رہی ہے اور گروہی عقد تو بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔ عام رواج تعدّد ازواج یا یک زوجگی کا رہا ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف معاشروں میں یہی طریقے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مسیحی معاشرے میں ایک سے زیادہ شادیاں ممنوع ہیں۔ جبکہ مسلم معاشرہ اس کی محدود اجازت دیتا ہے۔ جہاں تک طلاق کا تعلق ہے تو یہ تقریباً سبھی معاشروں میں پائی جاتی رہی ہے۔ بعض معاشروں میں طلاق کی اجازت نہیں اور ازدواجی تعلقات کو ناقابل انقطاع تصور کیا جاتا ہے۔ مسیحی اور ہندو معاشرے اسکی مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ مغرب کے سیکولر معاشرے نے مسیحیت کے اس تصور کو رد کر دیا ہے اور عورت کو طلاق کی اجازت دی۔ اب مغربی معاشرے میں طلاقوں کی بھرمار ہے۔ طلاق دراصل انقطاع تعلق ہے جس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ناپسندی طبع' ارتکاب جرم اور کسی مہلک مرض میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ تمام مذاہب نے اسے تسلیم کیا ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ انتشار سے بچتا رہا ہے۔ طلاق ایک ناگزیر ناپسندیدہ امر ہے جسے فقط مجبوری کی صورت میں اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن دور حاضر میں اسے کھلونا بنایا جا رہا ہے۔ مغرب کی بے راہ رو معاشرت نے اسے وسعت سے اپنایا ہے اور اب اس کے مفکرین بڑھتی ہوئی طلاقوں سے سخت پریشان ہیں۔ ایک تو عورت غیر محفوظ ہوگئی ہے۔ دوسرے خاندانی نظم کی بنیاد ہل گئی ہے۔ نکاح و طلاق کے قوانین ابتدائی معاشروں سے لے کر اب تک بدلتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود یہ قوانین انسانی معاشرت کا لازمی جزو رہے ہیں۔ جس طرح تعلق پیدا کرنا انسانی فطرت ہے اسی طرح کبھی کبھی تعلقات توڑنے پر مجبور ہونا بھی اس کی ضرورت ہے لہذا یہ اتصال و انقطاع انسانی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔

تربیت اولاد

خاندان میں مرد و عورت کے تعلق کے بعد سب سے زیادہ اہم بچوں کی تربیت اور بزرگوں کی نگہداشت ہے ابتدائی اور زرعی معاشروں میں بچے چونکہ معاشی معاون ہوتے تھے اس لیے ان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر خاندان

اولاد کی افزائش کے سبب معزز سمجھا جاتا تھا۔گو بعض معاشروں میں بچیوں کو ناپسند کیا جاتا تھا اور عرب کے چند جاہل قبائل لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔لیکن اسلام نے بچوں اور بچیوں کی تربیت کو عبادت اور احسان سے تعبیر کیا۔تربیت اولاد کی نوعیت بھی معاشرتی ارتقاء کے ساتھ بدلتی رہی۔اولاد کی تربیت میں زرعی تعلیم' پیشہ ورانہ ہنر مندی' فوجی تربیت اور مذہبی تعلیم شامل رہی ہے۔معاشرتی اطوار کی وسعت کے ساتھ تربیت اولاد کے گوشے بھی بدلتے گئے تاہم ہر معاشرہ اپنے مخصوص اخلاق اصولوں کو تربیت کیلئے ضروری قرار دیتا تھا۔دور حاضر کی صنعتی معاشرت کی بدولت زندگی زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہوگئی ہے اس لیے تربیت اولاد بھی مشکل مسئلہ بن گیا ہے' بلکہ اب تو اولاد کو بوجھ سمجھا جارہا ہے کیونکہ اب بچے معاشی معاون نہیں رہے۔عصر حاضر میں اولاد کی افزائش ناپسند کی جاتی ہے اور مصنوعی تدابیر سے کثرت اولاد کو قلت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔

نگہداشت بزرگان

بزرگوں کی نگہداشت اور ان کا مرتبہ بھی خاندان کا لازمی عنصر ہے بوڑھے والدین خاندان کی تنظیمی بنیاد ہیں۔ چونکہ والدین اپنی زندگی کا بہترین حصہ اولاد کی خدمت میں صرف کرتے تھے اس لیے وہ بجا طور پر اس کے مستحق سمجھے جاتے کہ نوجوان اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے۔ابتدائی معاشروں میں والدین خاندان کا لازمی جزو تھے اور اولاد کیلئے ضروری تھا کہ وہ والدین کی خدمت کریں۔دور حاضر میں خاندانی نظم ڈھیلا ہونے' ہر فرد کے آزاد ہونے اور معاشی اعتبار سے خود مختار بن جانے کی وجہ سے ان کی نگہداشت کا انداز کچھ بدل گیا ہے۔اس دور کی ہلاکت خیزی ہے کہ بوڑھے باپ کانپتے ہاتھوں اور لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ضروریات زندگی فراہم کررہے ہیں اور بیٹے جوانی کی صحت مندی پہ نازاں علیحدہ بیٹھے ہیں۔مغربی معاشرے کا یہ خطرناک رجحان اب بوڑھوں کیلئے مستقل مراکز قائم کررہا ہے جس سے ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے گا۔اسلام نے تربیت اولاد اور نگہداشت بزرگان کا جامع عملی منصوبہ دیا ہے لیکن اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

خاندانی ہم آہنگی

ایک اچھے خاندان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض ادا کرے اور اسکے عناصر ترکیبی مکمل ہوں۔خاندانی ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ مرد اور عورت کے تعلقات مستحکم ہوں۔تربیت اولاد اور نگہداشت بزرگان کا پورا اہتمام ہو۔ خاندان اس طرح کا ہو کہ اس کا ہر فرد خواہ وہ زرعی معاشرے کا ہو یا صنعتی کا اسکے فیصلوں کا پابند ہو۔معاشرتی استحکام کی بنیاد خاندانی ہم آہنگی ہے۔جس معاشرے کے خاندانی نظام میں عورت و مرد کے تعلقات پر کوئی پابندی نہ ہو۔بچے خاندان کا

لازمی جزو نہ ہوں اور بزرگوں کا احترام نہ ہو وہ معاشرہ جنسی بے راہ روی اور مجرمانہ تغافل کا شکار' شفقت و رحم سے عاری اور انسانی ہمدردی سے خالی ہو جاتا ہے۔ علمائے معاشرہ کے مطابق خاندانی ہم آہنگی فرد کے جذباتی تحفظ کا باعث بنتی ہے۔ دور حاضر کے معاشرتی انتشار کا سبب یہی خاندانی بدنظمی ہے جنسی تعلقات میں غیر ذمہ داری' طلاق کی کثرت' ضبط تولید اور بوڑھوں سے عدم التفات وہ برائیاں ہیں جنہوں نے استحکام و سکون کو ختم کر دیا ہے اور دور حاضر کا انسان اکثر و بیشتر اخلاقی خوبیوں سے عاری دکھائی دیتا ہے۔

عصر حاضر کا خاندان

صنعتی انقلاب کے بعد سے خاندانی جمعیت رو بہ زوال رہی ہے اور عصر حاضر میں تو خاندان نے اپنی ادارتی حیثیت ہی کھو دی ہے۔ معاشی انفرادیت نے ہر شخص کو خود مختار بنا دیا ہے۔ یہی خود مختاری اجتماعی مفاد کیلئے مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ عصر حاضر میں خاندان کا ادارہ جس انتشار کا شکار ہے اس کا اندازہ ان رویوں سے لگایا جا سکتا ہے جو جدید انسان اختیار کر رہا ہے۔ دور حاضر میں Sociology اور Anthropology کے نام سے جو علوم متعارف ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان کی تعریف سے لے کر اس کے فرائض تک میں ایک تبدیلی آئی۔ مثلاً جارج پیٹر مرڈوک (George Peter Murdock) نے اپنی کتاب (Social Structure) میں خاندان کے ادارے کا مطالعہ کرتے ہوئے دو سو پچاس معاشروں کے نمونوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خاندان کا ادارہ کسی نہ کسی صورت میں انسانی معاشروں میں موجود رہا ہے۔ لیکن جب وہ خاندان کی تعریف کرتا ہے تو وہ حیرت انگیز حد تک مغربی معاشرے کی تصویر لگتی ہے۔ مغرب نے خاندانی نظام میں جن انحرافات کو متعارف کرایا ہے فاضل مصنف نے انہیں خاندان کی تعریف میں شامل کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"The Family" is social group characterised by common residence, economic cooperation and reproduction. It includes adults of both sexes, at least two of whom maintain a socially approved sexual relationship and one or more own or adopted children, of sexually cohabiting adults" (9)

ٹیلکاٹ پارسن (Telcott Parson) کے مطابق امریکی خاندان کے کم از کم دو فرائض ہیں جو دنیا کے تمام معاشروں میں خاندان کا ادارہ انجام دیتا ہے اور وہ ہیں:

Primary socialization of children and the stabilization of the adult personalities of the population of the Society. (10)

(۹) Sociology Themes and perspectives / 326

(۱۰) Ibid / 332

پارسن مزید کہتا ہے کہ "خاندان ایک فیکٹری ہے جو انسانی شخصیتیں پیدا کرتی ہے"۔(۱۱)

مغرب نے روایتی مسیحی ماڈل کو چھوڑ کر (Pagan Model) پر آزاد جنسی تعلقات کو فروغ دیا۔ اگرچہ اب بھی مغرب میں خاندان کا ادارہ موجود ہے لیکن اب مغربی محاورہ میں "Family" کی جگہ "Kinship" کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے۔ Robin Fox نے Kinship and Marriage جیسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ مارکس نے خاندان کے ادارہ کو استحصال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ وہ معاشرتی تنظیم کے لیے (Fuedal society, slave society) اور Capitalist society کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچے کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ کس طرح اطاعت کرنی ہے یہ نہیں سکھایا جاتا کہ کس طرح Survive کرنا ہے۔ اصل رویہ تو آزادی کا رویہ ہے۔(۱۲) آزادی نسواں کے علمبردار ماہرین عمرانیات و بشریات اور انتھراپولوجسٹ (Liberationist Sociologists and Anthropologist) جو نئے نظریات پیش کر رہے تھے اس کے نتیجے میں شادی اور مرد و عورت کی حیثیت اور تعلقات کے بارے میں نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً اوکلے (Oakley) کے الفاظ میں:

"Marriage and house wife are basic impediments to occupational sex equality. The female professional worker is likely to differ in one important respect from the male professional worker: She is between three and four times more likely to be unmarried." (13)

1960ء کی دہائی میں تحریک آزادی نسواں نے نیا رخ اختیار کیا۔ ہارالمبس (Horalambas) نے کہا:

During the late 1960s the women's liberation movement began shaking the Foundation of the family by attacking the role of women in it. This attack was developed by some feminist writers into a condemnation of "family" as an institution.(14)

ڈیوڈ کوپر (David Cooper) ایک فینا مینولوجیکل نفسیاتی معالج (Phenomenological psychiatrist) ہے۔ وہ بچے اور خاندان کے حوالے سے دلچسپ تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

To develop an autonomous self, the child must be free to be alone, free from the instant demands made upon him in the family, free from the imprisoning and ambiguous love which engulfs him." He argues that "The family is an ideological conditioning device in an exploitative society, with in the family

(۱۱) Families are Factories which produce human personalities / 333

(۱۲) The Origin of family, private property and the state / 154 (First published 1884)

(۱۳) A Housewife

(۱۴) Sociology. Themes and perspectives / 323

children bear to conform to submit to authority. (15)

انفرادیت پسندی نے خاندان کو نیا رخ دیا۔ روایتی اختیار کی جگہ کمانے والے کارکن کی حیثیت بڑھی اور آہستہ آہستہ خاندان کم سے کم افراد کا مجموعہ بنا۔

مرڈوک (Murdock) نے امریکہ کے کالوں (Black) کے خاندانی نظم (Family structure) پر بحث کرتے ہوئے ثابت کیا کہ ان کے ہاں خاندان ایک عورت اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن یہ استثنا ہوسکتا ہے کیونکہ غلامی کے عہد میں آقا خاندان کے مرد کو کہیں بیچ کر صرف عورت اور بچوں کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا اس طرح خاندان منتشر (Split) ہوتے رہے۔

روایتی نظام کے بگڑنے کے سنگین نتائج برآمد ہوئے۔

(i) شادی کے بغیر مل کر رہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ایک نئی اصطلاح شریک کار (Partner) کی ایجاد ہوئی۔

(ii) شادیاں ناکام ہونا شروع ہوئیں اور طلاقوں کی تعداد بڑھی۔

(iii) بچوں پر برے نفسیاتی اثر مرتب ہوئے' جذباتی طور پر مضطرب بچوں (Emotionally disturbed children) کا اضافہ ہوا۔

(iv) تنہا ماؤں (Single Mothers) کا ایک نیا گروپ وجود میں آیا جو جنسی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوئے بچوں کو بغیر باپ کے پالتی ہیں۔

(v) جدید معاشرے کو نوخیزی کے حمل (Teenage Pregnancy) کا مسئلہ درپیش ہے۔ آزادی کی وجہ سے نوخیز لڑکیاں جنسی تجربوں کی وجہ سے حاملہ ہوتی ہیں۔ برطانیہ میں 10 برس کی لڑکیوں نے بچوں کو جنم دیا ہے۔

(vi) اخلاقی قدروں کی پامالی کے نتیجے میں جنسی طور پر منحرف افراد کا اضافہ ہوا ہے اب مغرب میں ہم جنس پرستی ایک قابل قبول رویہ ہے اور اب تو پروٹسٹنٹ کلیسا نے ہم جنس پرستوں کو پادری کے طور پر بھی قبول کیا ہے۔ مغربی ریاستوں نے خاندان کے بہت سے فرائض اپنے ذمہ لے لیے ہیں لہٰذا خاندان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

تاہم مغرب میں اب خاندان کے کردار کو دوبارہ زندہ کیا جارہا ہے لیکن اب خاندان میں عورت کی حیثیت مختلف ہے۔ Fletcher اپنی کتاب The family and marriage in Britain میں اظہار کرتی ہیں کہ خاندان نے اپنے کردار کو برقرار رکھا ہے لیکن اسے مشکلات کا سامنا ہے۔

خاندانی نظام میں اب بھی عورت بچوں کی نگہداشت اور گھر کے کام کاج کرتی ہے لیکن اب خاوند اس میں شریک ہوتے ہیں۔ کپڑے دھونے' صفائی کرنے' برتن دھونے اور دوسرے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور اسی پر بعض

---

(۱۵) The death of family / 342

اوقات گھروں میں ہنگامے بھی ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں شادی سے ایک یا دوسرا فرد بھاگنا چاہتا ہے اور چونکہ قانون موجود ہے اس لیے طلاقیں ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے خاندان کا ادارہ شدید بحران کا شکار ہے اور اس سے بچوں کے لئے مزید مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔

اولاد کی تربیت اب خاندانی مسئلہ نہیں رہا۔ جدید معاشرہ میں تعلیمی اداروں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ بزرگوں کی نگہداشت کا مسئلہ بعض ریاستوں نے اپنے ذمہ لے کر انکے لیے پنشن یا الگ سکونت کا انتظام کر دیا ہے۔ مرد و عورت آزادانہ زندگی گزارتے ہیں اس لیے نکاح اب انسانی تقدس کھو چکا ہے اور اب وہ زیادہ تر معاشی اور جنسی معاہدہ ہے جو انکی پسند پر طے اور ناپسندیدگی پر ختم ہو سکتا ہے۔ خاندان اگر کبھی معاشرتی استحکام کی بنیاد تھا تو آج وہ خود انتشار کا شکار ہے۔ بعض امریکی ماہرین عمرانیات یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب خاندانی نظام ختم ہو جائیگا اور معاشرہ انفرادیت پر مبنی ہو گا جسے ریاست منظم کریگی اور ایسا معاشرہ اشتراکی فلسفہ کے مطابق وجود پذیر ہو گا جو کسی تنظیم اور ریاست کے بغیر از خود کام کرے گا۔

......☆......

3 ادارہ ازدواج۔ایک عالم گیر معاشرتی حقیقت*

گزشتہ صفحات میں خاندان کی بحث میں یہ تصریح کی جا چکی ہے کہ انگریزی زبان کا لفظ Family لاطینی زبان سے نکلا ہے۔جس کا یونانی مماثل (Oikonomid) ہے جس سے لفظ اکنامکس بنا ہے۔خاندان بنیادی طور پر ایک معاشی تنظیم ہے۔یہ نظریہ ماہرین عمرانیات وبشریات کے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ شروع شروع میں جب غاروں میں رہنے والے انسان کے پیٹ کی بھوک اس کے بطور (Hunter & Gatherer) ختم ہوئی تو اس کی خواہش جنس جاگ اٹھی جس نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی طرف راغب کیا اور اس کے ہونے والے بچوں نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا۔ماں کا نوزائیدہ کو دودھ پلانا اور باپ کا تحفظانہ کردار دونوں نے مرد اور عورت کو مستقل رشتے میں جوڑ دیا۔یوں ابتدائی طور پر شادی اور پھر خاندان کے ادارہ کی داغ بیل پڑی جو آج معاشرتی مبادیات کی ایک عالمی شناخت ہے۔شادی اگرچہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق ہے لیکن اس کے اور بھی مختلف وظائف ہیں مثلاً شادی شدہ جوڑے کے اکٹھا رہنے پر معاشرے کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور ان کے ہونے والے بچوں کی قانونی اور اخلاقی حیثیت مسلم ہوتی ہے اور ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے وہ بچوں کی پیدائش وافزائش کے ساتھ ساتھ خانگی ذمہ داریوں کو مشترکہ طور پر نبھانے کی کوشش کریں گے۔اگرچہ معاشرہ میں شادی کے معاہدہ کو توڑنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن عمومی طور پر یہ تادم زیست معاہدہ تصور کیا جاتا ہے اور اس معاہدہ میں شریک دونوں افراد معاہدہ سے آسانی کے ساتھ لاتعلق نہیں ہو سکتے۔

ہر معاشرے میں شادی سے پہلے ہر مرد اور عورت کو جنسی لحاظ سے پاکدامن رہنے کی تلقین کی جاتی ہے لیکن مغربی معاشرہ اور کچھ دیگر غیر ترقی یافتہ معاشرے مرد وعورت کو جنسی اختلاط کی اجازت دیتے ہیں مثال کے طور پر پولی نیشیا کے سیموئن قبائل میں ہر بالغ مرد اور عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ شادی سے پہلے جنس کا تجربہ کر چکے ہوں۔(۱) ان قبائل میں شادی سے پہلے منگیتر کے ساتھ راتیں گزارنا ان کی روایت اور تمدن کا حصہ ہے۔اس طرح کینیا کے ماسی قبائل میں جب ایک لڑکا بالغ ہوتا ہے تو وہ اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر تربیتی کیمپوں میں چلا جاتا ہے جہاں وہ جنگی ماہرین سے جنگ اور لوٹ مار کرنے کے طریقے سیکھتا ہے۔اس دوران نزدیکی گھروں میں رہنے والی جوان لڑکیاں ان کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہوتی ہیں جن سے جنسی تعلق قائم کرنا ان جوانوں کا حق ہوتا ہے۔جب ایسے تعلق کے نتیجہ میں کوئی لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے تو وہ شادی کے لیے مکمل طور پر تیار تصور کی جاتی ہے۔حمل کے بعد فوری طور پر اس لڑکی کی شادی کسی بھی جوان سے کر دی جاتی ہے اور ہونے والا بچہ قبیلے میں مکمل سماجی اور قانونی حیثیت کے ساتھ رہتا ہے۔(۲)

---

* مولف اس باب کی تیاری کے سلسلے میں خصوصی اعانت کے لئے اپنے رفیق کار ڈاکٹر امتیاز ظفر صاحب کا ممنون ہے۔

(۱) Murdock, George P. Our Primitive contemporaries, (New York: The Macmillan Co., 1935)

(۲) Forde, C. Daryll, Habitat, Society and Economy, (New York: e.P. Dutton, 1950)

جن خونی رشتوں میں شادی ہونے کا رواج ہے۔ ہر معاشرہ نے اپنے اپنے طور پر طریقے اور اصول اپنائے ہوئے ہیں کہیں ماموؤں اور پھوپھیوں کی اولاد سے شادی کرنے کو ترجیح حاصل ہے اور کہیں چچاؤں اور خالاؤں کے بچوں سے رشتہ ازدواج باندھا جاتا ہے اور بعض قبائل کے ہاں یہ دستور ہے کہ شادی بیاہ کا تعلق قریبی رشتہ داروں میں قائم نہ کیا جائے۔ مثلاً مغربی آسٹریلیا کے کارائر قبائل میں کراس کزن (cousin) کا (ماموں اور پھوپی کی اولاد) میں شادی کرنے کا رواج ہے۔ (۳) جبکہ امریکی ریڈ انڈین اپاچی قبائل میں نہ صرف ماموں اور پھوپھی کی اولاد بلکہ چچا اور خالہ کی اولاد بھی آپس میں شادی نہیں کر سکتی اور شادی کے لیے ان رشتوں میں تعلق نہ قائم کرنے کی روایت ہے۔ (۴)

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے انسانی معاشروں میں یہ ایک آفاقی اصول ہے کہ باپ بیٹی، ماں بیٹا اور بہن بھائی میں شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس بین الاقوامی اصول کے باوجود پیرو کے قدیم انکاس قبائل، مصر کی پرانی تہذیب اور جزائر ہوائی کی سابقہ ریاستوں میں ان رشتوں کی حرمت اور لحاظ کو پامال کیا جاتا رہا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام جگہوں پر اس کی روحانی اور مذہبی توضیحات پیش کی جاتی رہی ہیں۔ (۵)

مخصوص رشتہ داروں میں شادی کرنے یا نہ کرنے کے اصول وقوائد کے طے ہونے میں صدیوں کے تجربات نے قبائل اور معاشروں کی رہنمائی کی اور مختلف عوامل نے ان کے پیچھے اپنے اپنے کردار ادا کیے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم عنصر قبائل کا سیاسی نظام اور طاقت و اختیار کا استحکام تھا۔ کہیں قبائل کی نسلی وسماجی برتری کے احساس نے انہیں اپنے اندر ہی نسل کی ترویج اور پھیلاؤ کی خاطر (Endogamous) رکھا اور کہیں قبائل کے استحکام کے لیے نئے خون کی ضرورت نے انہیں (Exogamous) بنانے پر مجبور کیا اور یہ قبائلی تسلط و استحکام بین طور پر ان کے مادی وسائل پر اختیار کے جذبے کی تقویت کا سبب بنا۔ معاشی عنصر اس نظام ہائے ازدواج کے پیچھے کام کرتا نظر آتا ہے۔ سیاسی ومعاشی عوامل کے ساتھ ساتھ نفسیاتی پہلوؤں نے بھی اس ادارے کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا۔ برطانوی ماہر عمرانیات لیسلے وائٹ (lesli white) کا خیال ہے کہ جنسی تعلق کی تسکین کی مثال بھوک مٹانے کے عمل کی سی ہے جس طرح انسان جانی پہچانی خوراک سے ہی غذا کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اسی طرح بچہ اپنے قریبی عزیزوں والدین اور بہن بھائیوں کے توسط سے ہی جذبہ جنس کی تسکین کرتا ہے۔ (۶) اور معروف ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ اس سے بڑھ کر دور کی یہ کوڑی

---

(۳) Radcliffe - Brown, A.R., The Andaman Islamders. (Cambridge: The University Press, 1933)

(۴) Morris E. Opher, "An Outline of Chiricahua Apache Social Organization, *Social Anthropology of North American Tribes.* ed. Fred Eggan, (Chicago: The University of Chicago Press; 1939

(۵) Ralph L. Beals and Harry Haijer, "An Introduction to Anthropology', P: 515 (London: the Macmillan Company, 1970), 3rd Edition.

(۶) Lesli A. White, "The Definition and Prohibition of Incest" *American Anthropologist* /50. 1948

لائے ہیں کہ عوام الناس کی نفسیاتی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب ہی یہ ہے کہ ایک نوجوان (Teen ager) جب شخصیت کی تکمیل کے Super Ego کے مرحلے سے گزر رہا ہوتا ہے' معاشرتی اقدار اور مذہبی تعلیمات اس کے آگے بندھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی جنسی تسکین کی آزادی کو کچلنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ان قدغنوں کو توڑنے والوں کے لیے معاشرہ سخت ترین سزائیں تجویز کرتا ہے۔ باہر کی پابندیاں اور اندر کا خوف انسان کو ان رشتہ داروں سے جنسی تعلق قائم کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس طرح نفسیاتی عوامل جنسی تعلق اور شادی کے اصولوں کو طے کرنے میں اور اس کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (۷)

برطانیہ کا قانون شادی مجریہ 1949ء اور 1960ء اس کے علاوہ جنسی جرائم کا قانون مجریہ 1956ء ایک عورت کو اپنے دادا' باپ' بھائی' سوتیلے بھائی اور بیٹے سے جنسی تعلق قائم کرنے اور شادی کرنے سے روکتا ہے اور یہ قانون برطانوی خاتون کو اس طرح کے 21 قسم کے رشتہ داروں سے اور ایک مرد کو 23 قسم کے رشتوں سے شادی کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔ (۸) اس طرح زیادہ تر مغربی ممالک میں فرسٹ کزن کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت ہے جبکہ چند امریکی ریاستوں کا قانون اس طرح کی شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ (۹) اسی طرح بحرالکاہل کے جزیرہ ٹوکیو پیا میں سوتیلے بہن بھائیوں میں شادی کا رواج پایا جاتا ہے۔ (۱۰)

جنوبی افریقہ کا Prohibition of Mixed Marriage act of 1949 سفید نسل لوگوں کی غیر سفید لوگوں میں شادی پر قدغن لگاتا ہے جبکہ یہ لوگ ہندوستانی' کالے اور بانتو نسل کے لوگوں میں شادی کر سکتے ہیں۔ (۱۱) اسی طرح ہندوستان میں شادی صرف اپنی ذات کے لوگوں کے درمیان پسندیدہ رہی ہے یا زیادہ سے زیادہ اپنی گوت کے لوگوں میں۔ (۱۲)

شادی کے حوالے سے یک زوجگی (Monsogamy) اور کثیر زوجگی (Polygamy) کا رواج دنیا بھر کی تہذیبوں اور معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ ماہرین بشریات دنیا بھر میں تین طرح کی شادیوں کا ذکر کرتے ہیں یک زوجگی کا مطلب ہے ایک مرد کا ایک عورت کے ساتھ شادی کرنا جبکہ کثیر زوجگی کی دو اقسام ہیں:

(i) ایک مرد کا دو یا دو سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا (Polygaymy) اور

(۷) Ralph L. Beals and Harry Haijer, "an Introduction to Anthropology', (London: The Macmillan company, 1970), 3rd Edition /: 17

(۸) Bromley, P.M., Family Law, 1971 cited in Goldthorpe J. E. *"An Introduction to Sociology"* (Cambridge: Cambride University Press 1985)

(۹) Ibid

(۱۰) Ibid

(۱۱) Ibid

(۱۲) *International Encyclopaedia of Social Sciences*, (New York: The Macmillan Company and The free Press, 1972) Vol. 9.

(ii) ایک عورت دو یا دو سے زیادہ مردوں سے بیک وقت شادی کے بندھن میں بندھی ہوتی ہے۔ (Polyandry) اور قبائل اس شادی کو ایک قانونی شادی کا درجہ دیتے ہیں۔ ماہرین بشریات یک زوجگی کو ایک بین الاقوامی رواج کے طور پہ جانتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اگر ایک مرد کو زیادہ عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت عام ہو تو مشکل پیش آئے گی کیونکہ دنیا بھر میں مردوں اور عورتوں کی تعداد کا تناسب تقریباً یکساں ہوتا ہے' اس صورت میں بہت سے مرد ایسے بچ جائیں گے جن سے شادی کرنے کے لیے کوئی عورت نہیں بچے گی تاہم مشرقی افریقہ کے ملک یوگنڈا کے باگنڈا قبائل میں قبیلے کا سردار جس کا سماجی مرتبہ کسی ملک کے بادشاہ کی طرح ہوتا ہے سینکڑوں عورتوں سے شادی کرتا ہے۔ (۱۳) جبکہ قبیلے کے صاحب ثروت افراد دو دو تین تین یا اس سے زیادہ عورتوں سے شادی کر کے ان کو اپنے حرم میں رکھتے ہیں۔ اگر چہ تصدیق شدہ شماریات کا حصول ممکن نہیں لیکن یہ مسلمہ امر ہے کہ باگنڈا قبائل دنیا کے باقی تمام قبائل کی بہ نسبت کثیر زوجگی کی اس قسم میں منفرد مقام پر فائز ہیں۔ ان قبائل میں سردار کی سب سے پہلی بیوی کو باقی تمام بیویوں پر برتری حاصل ہوتی ہے جبکہ سب سے پہلی نرینہ اولاد کو باقی تمام بچوں پر فوقیت ملتی ہے حتیٰ کہ تمام پیدا ہونے والے باقی لڑکوں کو بچپن میں ہی مار دیا جاتا ہے کیونکہ پہلا لڑکا ولی عہد بھی ہوتا ہے اور یہ خدشہ ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا بھائی اس کی ولی عہدی کو چیلنج کر سکتا ہے۔ اس طریقہ سے جہاں قبیلہ کے اندر فساد کی روک تھام ہوتی ہے وہیں لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے جو کثیر زوجگی کے ادارے کے قیام و استحکام کی ایک فطری وجہ ہے۔ 1965ء کے شماریاتی اندازے کے مطابق مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد تین گنا تھی۔ (۱۴)

کثیر زوجگی کی دوسری قسم جنوبی ہندوستان کے ٹوڈا قبائل میں مروج رہی ہے۔ (۱۵) ان قبائل میں ایک عورت تمام بھائیوں کی زوجہ ہوتی ہے جب ایک بھائی اس عورت/زوجہ سے جنسی آسودگی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ جھونپڑے کے باہر اپنا ڈنڈا اور رومال چھوڑ دیتا ہے یہ دوسرے بھائیوں کے لیے ایک علامت ہوتی ہے کہ وہ اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ جب ان کی بیوی حاملہ ہوتی ہے تو کوئی ایک بھائی رسم کے ذریعے سے ہونے والے بچے کا باپ ہونے کا اعلان کرتا ہے جس میں وہ بیوی کو ایک کمان پیش کرتا ہے اس طرح وہ اس کا حقیقی باپ تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے بھائی اس بچے کے ثانوی باپ شمار کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی شادی کے رواج کے پیچھے بھی اس جنسی تفاوت کی وجہ لڑکیوں کا بعد از پیدائش مارا جانا ہے جب کبھی دو بچوں کی جڑواں پیدائش ہوتی ہے تو لڑکی کو منحوس گردان کر پیدا ہونے کے فوراً بعد قتل کر دیا جاتا تھا اور اگر جڑواں پیدائش کی صورت میں دونوں بچیاں ہی ہوں تو دونوں ہی کو ختم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح قبیلہ میں شماریاتی فرق پیدا ہوا و

---

(۱۳) Murdock, George P. Our Primitive contemporaries, (New York: The Macmillan co. 1945).

(۱۴) Ibid

(۱۵) Ibid

آخر کار ایک عورت کی زیادہ مردوں سے شادی پر منتج ہوا۔(۱۶)

معروف ماہر بشریات جارج مرڈوک نے اپنی تحقیقات کے نتیجے میں مختلف معاشروں میں درج ذیل صورتحال پائی۔(۱۷)

یک زوجگی	40
کثیر زوجگی (قسم اول)	145
کثیر زوجگی (قسم دوم)	2

شمالی مشرقی سائبیریا میں رہنے والے رین ڈیئر بچکی قبائل میں کثیر زوجگی کی وجہ معاشی بتائی جاتی ہے کیونکہ ایک مرد کے پاس رین ڈیر کے بہت سے ریوڑ ہوتے ہیں۔اس طرح ہر ریوڑ کے انتظام وانصرام کے لیے مرد کو بہت سی عورتوں سے شادی کرنا پڑتی ہے تاکہ یہ ریوڑ براہ راست اس کے اپنے کنڑول میں رہیں اور اس سے حاصل ہونے والا دودھ گوشت اور فزیکل طاقت اس کے زیر استعمال رہ سکے۔(۱۸)اس کے مقابلے میں تبت میں رہنے والے قبائل میں جہاں گزراوقات کھیتی باڑی پر منحصر ہے۔زمین وراثتاً لڑکوں میں منتقل ہوتی ہے اور کیونکہ زمین زیادہ نہیں ہے اس لیے زمین کے مخصوص ٹکڑے کو مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔اس معاشی عنصر نے جہاں خاندان کو اس قطعہ زمین سے خوراک کے حصول پر مجبور کیا ہے وہیں بھائیوں کو ایک ہی عورت سے شادی کر کے رہنے پر بھی مجبور کر دیا ہے تاکہ زیادہ عورتوں سے شادی کر کے ہونے والے بچوں کی تعداد کا اضافہ ان کے ذریعہ معاش کو مکمل طور پر ختم نہ کر دے۔(۱۹)

---

(۱۶) Ibid

(۱۷) Murdock, George "Social Strucutre", (New York: The Macmillan 1949)

(۱۸) Niel J. Smelser, "Sociology" (New Jersy: Prentice Hall, Inc. Englewood Cliffs, 1981)

(۱۹) Niel J. Smelser, "Sociology" (New Jersy: Prentice Hall, Inc. Englewood Cliffs, 1981)

اسلام کا ادارۂ ازدواج

اسلام کا ادارہ ازدواج ایک مرتب نظام ہے۔ اس میں نکاح، طلاق، خلع، ایلاء، ظہار، اور لعان وغیرہ شامل ہیں۔ اس کی ہر ایک شق انسانی مزاج اور اس کی فلاح کے عین مطابق ہے۔ یہ ادارہ ازدواج انسانی اجتماعیت کی بنیاد ہے۔ اگر اس کی تنظیم صحیح طریق پر ہو تو یوں سمجھئے کہ کوئی معاشرتی فساد رونما نہیں ہوگا اور اگر اس کی تنظیم میں خرابی ہے تو اس کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوں گے۔ اسلام نے ادارہ ازدواج کی تنظیم اور اس کی حفاظت کے لیے مفصل نظام دیا ہے جس میں اخلاقی اور قانونی اصولوں کو غیر مبہم انداز میں بیان کیا ہے۔ مرد اور عورت کے تعلق کو معاشرتی قدر کے طور پر قانونی اور اخلاقی تحفظ دیا۔ اس رشتے کو معاشرے میں قبولیت کا درجہ دینے کے لیے نکاح کی صورت دی جو ایک علانیہ معاہدہ ہے جسے قانونی و اخلاقی قبولیت حاصل ہے اور معاشرے نے اسے اسی طرح قبول کیا ہے۔ پھر اس تعلق کو قائم رکھنے کے آداب بتائے اور غیر ذمہ دارانہ اظہارات کے خطرات سے آگاہ کیا۔ قانونی اور اخلاقی طور پر اس تعلق کو مستحکم رکھنے کے لیے غیر ضروری جذباتیت سے منع فرمایا۔ پھر اگر یہ تعلق بوجھ بن جائے اور فریقین اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہوں تو علیحدگی کے قانونی ضابطے اور اخلاقی اصول متعین کیے۔ اگر خاوند علیحدگی چاہے تو طلاق دے سکتا ہے اور عورت چاہے تو خلع کا اقدام کر سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں معاشرتی شائستگی کو قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے معاشرتی پاکیزگی کے لئے عفت و عصمت کو بنیادی اہمیت دی اور مرد و عورت کے جنسی تعلق کو اخلاقی اور قانونی حدود سے منضبط کیا ہے۔ نکاح کی اہمیت۔ مرد و عورت کی باہمی وابستگی معاشرے کی صحت مند نشوونما کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ قرآن نے اس تعلق کے حسن اور اس کی تاثیر کو واضح کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی توضیح میں شاندار ارشاد فرمائے ہیں۔ ناگزیر صورتحال میں اس تعلق کو ختم کرنے کی اجازت دی ہے اس کے لئے قرآن و سنت نے ضوابط طے کیے ہیں اس طرح خلع، ایلاء، ظہار اور لعان وغیرہ کے بارے میں تفصیلی احکام موجود ہیں۔ مرد و عورت کے تعلق کو منضبط کرنے اور جنسی رابطہ کو پاکیزہ رکھنے کے جو احکام دیئے ہیں ان کا مقصد خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنا اور مسلم معاشرے کو مضبوط اور پاکیزہ رکھنا ہے۔ مسلم فقہاء نے اس دائرے میں شاندار بحثیں کی ہیں۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ چند پہلوؤں کو بیان کریں گے۔

نکاح

نکاح کے لغوی معنی وابستگی اور پیوستگی کے ہوتے ہیں۔عربی میں کہا جاتا ہے **تناکحت الاشجار اذا تمایلت و انضم بعضها الی بعض(۱)**

عبدالرحمان الجزیری نے الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں نکاح کے معنی پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ نکاح کے مطلق معنی عقد کے ہیں اور مجازاً اس سے جنسی تعلق مراد ہے۔قرآن وسنت میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً

وَلَاتَنْكِحُوْا مَانَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۲)

تم ان عورتوں میں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو مگر جو بات گزر گئی۔

حضور اکرم ﷺ سے منقول ہے:

عن علی ان النبیؐ قال: خرجت من نکاح ولم اخرج من سفاح من لدن آدم الی ان ولدنی امی وابی (۳)

الجزیری کے مطابق نکاح کے تین مفہوم ہیں: (i) دنیوی (ii) شرعی (iii) فقہی مگر ان تینوں مفہوموں میں اصل یہی ہے۔قرآن وسنت کے اعتبار سے نکاح سے مراد مرد اور عورت کی وہ جائز اور کھلی وابستگی ہے جسے اسلامی معاشرہ قبول کرتا ہے۔خالق کائنات نے انسانی زندگی میں اس ناگزیر تعلق کو ضروری قرار دیا ہے۔ہمارے بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ پوری کائنات میں زوجین کا سلسلہ پایا جاتا ہے اور خالق کائنات نے زوجین کا یہ سلسلہ تمام انواع کائنات میں رکھا ہے۔قرآن کریم میں آیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا(۴) وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا۔

انسانی زندگی میں تو یہ تعلق انفرادی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ، کتاب النکاح ۴/۱

(۲) النساء/۲۲

(۳) مجمع الزوائد، کتاب علامات النبوۃ، باب فی کرامۃ اصلہ ﷺ، ۲۱۴/۸، طبرانی نے ابن عباسؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:
قال رسول اللہ ﷺ: ماولدنی من سفاح اهل الجاهلية شیء وماولدنی الا نکاح کنکاح الاسلام۔ المعجم الاوسط، ۸۵/۵ (الحدیث: ۴۷۲۸)؛ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفضائل، باب ما اعطی اللہ تعالی محمداً، ۳۰۳/۶ (الحدیث: ۳۱۶۴۱) میں روایت کے یہ الفاظ منقول ہیں: عن جعفر عن ابیه قال: قال رسول اللہ ﷺ: انما خرجت من نکاح ولم اخرج من سفاح من لدن آدم لم یصبنی سفاح الجاهلية

(۴) یٰسین/۳۶

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۵)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے مرد اور عورت کے اس فطری تعلق کو نظر انداز نہیں کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فلسفہ نکاح پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نکاح انسان کا طبعی تقاضا ہے۔ عقلی حاجت اور تمدنی ضرورت ہے۔(۶) اس کے علاوہ نکاح دینی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ انسان جب غذا کھاتا ہے اور اس کے اندر جسمانی نشو ونما اور ارتقاء ہوتا ہے تو لامحالہ اس کی قوت بہیمیہ کو تقویت ملتی ہے۔ قوت بہیمیہ کا حد سے بڑھنا جسمانی زندگی کیلئے مضر اثرات رکھتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ انسانی وجود کے اندر قویٰ کا اعتدال لازمی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے بقول نکاح بہیمی قوتوں کو فروتر کر کے وجود کو اعتدال پر لاتا ہے۔(۷) اس کے علاوہ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ اس سے انسان کی اس بنیادی خواہش کی تکمیل ہوتی ہے کہ وہ یہاں کسی نہ کسی طرح موجود رہے۔ بقائے نسل انسان کی خواہش بھی ہے اور مقصود بھی۔ نکاح اس فطری خواہش کی تسکین کا عقلی پہلو ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت زکریاؑ کی دعائیں موجود ہیں۔ جن میں صالح اولاد کی خواہش کا تذکرہ ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ (۸)

ہر قسم کی حمد و (ثناء) خدا کے لیے (سزاوار) ہے جس نے بڑھاپے میں مجھے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ (دو بیٹے) عطا فرمائے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (۹)

اس موقع پر دعا کی (حضرت) ذکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے۔ عرض کیا اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بے شک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَ اشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۱۰)

جبکہ اس نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر پکارا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، اور بوجہ پیری سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی اور (اس سے قبل کبھی میں) آپ سے مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں۔

---

(۵) النساء/۱

(۶) حجة الله البالغه. الخطبة وما يتعلق بها، ۲/۱۲۶-۱۳۱

(۷) ایضاً

(۸) ابراہیم/۳۹

(۹) آل عمران/۳۸

(۱۰) مریم/۳، ۴

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نکاح دینداری اور تقویٰ کے خلاف نہیں ورنہ یہ جلیل القدر انبیاءؑ نہ نکاح کرتے نہ اولاد کی دعائیں مانگتے۔ اچھے انسانی معاشرے اور صالح تمدن کا دارومدار مرد اور عورت کے صالح تعلق پر ہے۔ مرد اور عورت کی جائز وابستگی معاشرے کو ایک ایسا سکون دیتی ہے جس سے اس کا درست اجتماعی شعور تشکیل پاتا ہے۔ پھر ایک اچھے تمدن کیلئے ایسے افراد ضروری ہیں جن کے اندر احساس ذمہ داری پایا جائے اور یہ احساس ذمہ داری نکاح ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مرد و عورت کے ناجائز تعلقات کو نہ روکا جائے تو اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ عورت اولاد کی پرورش کا بوجھ اٹھائے گی اور یا دونوں نسل کشی کے طرز عمل کو اختیار کریں گے جو ہر صورت میں انسانی معاشرے کیلئے مہلک ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے انسان کے وہ انسانی جذبات مٹ جائیں گے جنہیں ہمدردی' ایثار' قربانی' شفقت اور تعاون کہا جاتا ہے۔ اور انسانی معاشرے ایسے خود غرض درندوں کا انبوہ بن جائیں گے جنہیں اپنی خواہشات کی تسکین کے سوا اور کچھ مطلوب نہیں ہوگا۔ لہذا نکاح ہی وہ عقلی و منطقی اور اخلاقی و انسانی ضرورت ہے جس پر تمدن کی فلاح و بقاء کا انحصار ہے۔

دینی ضرورت

نکاح ایک انفرادی تمدنی ضرورت ہے جسے تمام معاشروں نے تسلیم کیا ہے لیکن قرآن و سنت نے اس پہلو کے علاوہ اسے اخلاقی و دینی ضرورت بھی قرار دیا ہے اور اس کے قیام پر بہت شدت سے عمل کرایا ہے۔ قرآن نے تو اسے سنت انبیاء قرار دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (۱۱)

اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے۔

بخاری کی کتاب النکاح میں عبداللہ بن جبیرؒ کا یہ بیان موجود ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ نے مجھ سے پوچھا تم نے شادی کی؟ میں نے عرض کیا نہیں..... فرمانے لگے۔

تزوج فان خير هذه الامة كان اكثرهم نسآء يعني النبي ﷺ (۱۲)

نکاح کرلو کیونکہ اس امت کی بہترین شخصیت کے ہاں سب سے زیادہ عورتیں تھیں۔

قرآن پاک میں نکاح کا حکم بڑے معنی خیز انداز میں دیا گیا ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۱۳)

---

(۱۱) الرعد/۳۸

(۱۲) بخاری، کتاب النکاح باب کثرۃ النساء،۲/۷۵۸

(۱۳) النور/۳۲

اور تم میں (یعنی افراد میں) جو بے نکاح ہوں تم ان کا نکاح کر دیا کرو اور (اس طرح) تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو اس کے لائق ہو اور اس کا بھی اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا) ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔

ابوبکر جصاصؒ نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس آیت کا حکم عام ہے حتیٰ کہ اس نے غلاموں اور باندیوں کو بھی شامل کرلیا ہے۔(۱۴) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء (۱۵)

جوانو! تم میں سے جو نکاح کی قوت رکھے اس کو چاہیے کہ نکاح کرے اس لیے کہ یہ نگاہوں کو محفوظ اور شرم گاہوں کو مُصئون رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے اور جو شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا اسے چاہیے کہ وہ روزہ رکھے کہ وہ قاطع شہوت ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نکاح اور روزے کی وجہ سے تمام فاسد اخلاق جو کثرت اختلاط اور فراوانی طبیعت سے پیدا ہوتے ہیں تبدیل ہو جاتے ہیں۔(۱۶) یہیں سے فقہاء نے استنباط کیا ہے کہ نکاح کی کئی حالتیں ہیں مثلاً فرض، واجب، سنت، مباح، مکروہ وغیرہ۔

یعنی اگر برائی کے ارتکاب کا یقین ہو جائے تو نکاح فرض ہے ورنہ واجب بشرطیکہ وہ نان نفقہ پر قادر ہو اور اگر نان نفقہ پر قادر ہے لیکن برائی کا امکان نہیں تو سنت ہے۔ نان ونفقہ کی قدرت نہیں مگر ارتکاب جرم کا خوف ہے تو نکاح مباح ہے۔ نان ونفقہ کی اہلیت نہیں رکھتا تو مکروہ ہے۔ لیکن اگر وہ طبعی نااہلیت رکھتا ہے تو پھر اس کیلئے نکاح حرام ہے۔ نبی کریمؐ نے مختلف مواقع پر نکاح کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے اور کتب حدیث میں انہیں محفوظ کرلیا گیا ہے۔ ذیل میں چند ارشادات نقل کئے جاتے ہیں۔

عن انسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من اراد ان یلقی اللہ طاہراً مطہراً فلیتزوج الحرائر (۱۷)

انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ خدائے پاک سے مطہر کیفیت میں ملے اسے چاہیے کہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے۔

---

(۱۴) احکام القرآن (اردو ترجمہ) ۶/۱۷۳

(۱۵) بخاری، کتاب النکاح، ۲/۷۵۸

(۱۶) حجۃ اللہ البالغہ الخطبۃ ما یتعلق بہا، ۲/۱۳۲۔۱۳۱

(۱۷) ابن ماجہ، ابواب النکاح، ۱/۱۳۵

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الدنیا کلھا متاع و خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ (۱۸)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ساری دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔

عن اسامہ بن زیدؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ماترکت بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من نساء (۱۹)

اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنے بعد مردوں کیلئے عورتوں سے زیادہ ضرررساں کوئی فتنہ نہیں چھوڑے جارہا۔

اسلام نے نکاح کی ترغیب دے کر غیر فطری راہوں کو بند کر دیا ہے۔ اس نے زنا، عیاشی اور رہبانیت وغیرہ جیسے سب غیر فطری طریقے بند کر کے تعلق کے صحیح مواقع مہیا کئے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ عثمان بن مظعونؓ نے نبی کریم ﷺ سے تبتل (جنسی قوت کو ضائع کرنے) کی اجازت طلب کی تو حضور ﷺ نے فرمایا:

اما واللہ انی لأ خشاکم لِلہ واتقاکم لہ لکِنّی اصوم وافطر واصلی و ارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۲۰)

سنو خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کے معاملے میں محتاط روش والا ہوں۔ لیکن میں روزے رکھتا ہوں اور چھوڑتا ہوں نماز پڑھتا ہوں۔ سوتا ہوں اور شادیاں کرتا ہوں۔ پھر جس نے میرے طریق سے منہ پھیرا وہ مجھ سے نہیں۔

بخاری کی کتاب النکاح میں ان تین اشخاص کا ذکر ہے جنہوں نے حضور اکرم کی عبادت کا حال سن کر رات بھر نماز پڑھنے، دن بھر روزہ رکھنے اور شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو حضور ﷺ نے انہیں منع فرمایا اور اپنی ساری کیفیت بیان فرمائی جو سابقہ روایت سے ملتی جلتی ہے اس کے آخری الفاظ بھی یہی ہیں۔

واتزوج فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۲۱)

اور میں شادی کرتا ہوں پھر جس نے میرے طریق سے کنارہ کشی کی وہ مجھ سے نہیں۔

مشکوۃ کی کتاب النکاح میں نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد موجود ہے جس میں آپ نے نکاح کو نصف دین قرار دیا۔

---

(۱۸) شرح السنۃ، ۱۱/۹

(۱۹) شرح السنۃ، ۱۲/۹

(۲۰) بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح ۲/۷۵۷

(۲۱) ایضاً

عن انس قال: قال رسول الله ﷺ: اذا تزوج العبد فقد استكمل نصف الدين (۲۲)

انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب بندہ شادی کرے تو وہ آدھا دین مکمل کر لیتا ہے۔

نکاح کی دینی اہمیت قرآن وسنت سے واضح ہے۔ اسے اخلاق وتقویٰ کی بنیاد اور صالح تمدن کی روح قرار دیا گیا ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب معاشرے کے افراد اس صالحیت کو مدنظر رکھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے نکاح سے متعلق تمام تفصیلی جزئیات بیان فرمادی ہیں۔ اگر ان کا لحاظ کرتے ہوئے عقد کئے جائیں تو ان کے ٹوٹنے سے معاشرہ کے اندر خرابی نہیں پیدا ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو اسی احتیاط کی بنیاد پر نصیحت فرمائی جسے ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے:

عن ابی هریرةؓ قال کنت عند النبی ﷺ فاتاه رجل فاخبره انه تزوج امراة من الانصار فقال له رسول الله ﷺ: انظرت اِلَیْهَا قال: لا۔ قال: فاذهب فانظر الیها فان فی اَعْیُنِ الانصار شیئاً (۲۳)

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے انصار کی ایک عورت سے شادی کرنی ہے آپ نے فرمایا کہ اسے دیکھ لو کیونکہ انصار میں عورتوں کی آنکھ میں خرابی ہوتی ہے۔

مقصد نکاح کو بھی حضور اکرم ﷺ نے کس قدر خوش اسلوبی سے بیان فرمایا:

عن ابی هریرة: قال: تنکح المراة لاربع لمالها ولِحَسَبِها ولِجَمَالِها ولِدینِهاَ فاخْتَر بذات الدین تربت یداك (۲۴)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے مال کی وجہ سے اس کے حسب کی وجہ سے اس کے حسن کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں دینداری کی وجہ سے کامیابی حاصل کر۔

شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ (۲۵) میں نکاح کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا: حضور اکرمؐ نے ان مقاصد کو جمع کر دیا جن کا اکثر قصد کیا جاتا ہے۔ آنجنابؐ نے دین کو مقدم قرار دیا ہے چنانچہ ترمذی میں آپؐ کا ارشاد موجود ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال رسول الله ﷺ: اذا خطب احد کم من ترضون دینه و خلقه فزوجه اِلّا تفعلوه تکن فتنة فی الارض وفساد عریض (۲۶)

جب تمہیں ایسا آدمی پیغام نکاح بھیجے جس کے دین وخلق کو تم پسند کرتے ہو تو اس سے نکاح کرلو۔ اگر تم نے ایسا نہ

(۲۲) مشکوۃ المصابیح کتاب النکاح/۲۶۸

(۲۳) مسلم، کتاب النکاح، ۴۵۶/۱

(۲۴) بخاری، کتاب النکاح، باب الاکفاء فی الدین، ۷۶۲/۲

(۲۵) حجة الله البالغه الخطبة ما یتعلق بها، ۱۳۲/۲-۱۳۱

(۲۶) ترمذی، ابواب النکاح، ۱۲۸/۱

کیا تو زمین پر عظیم فتنہ وفساد رونما ہو جائے گا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے کہ اس تعلق کیلئے یہ چار اسباب ہو سکتے ہیں۔لیکن جس کو انسان کے دین واخلاق اور اس کی آخرت کیلئے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے وہ دینداری ہے۔ نبی ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ انسان دینداری کو پیش نظر رکھ کر اقدام کرے تو اللہ تعالیٰ دوسری صورتوں کی تلافی کرے گا۔سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ (۲۷)

اگر وہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (چاہے گا) تو ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

چونکہ رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اس لیے انسان کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَیَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ (۲۸) اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے۔ جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

و ان خفتم عَيۡلَةً فسوف يغنيكم الله من فضله إن شاء (۲۹)

اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے (ان کا) محتاج نہ رکھے گا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ضمن میں عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی رغبت دلانے کے ساتھ ہی غنا کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ابوبکرؓ سے بھی ایسا ہی قول منقول ہے۔(۳۰) حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ضمن میں عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

التمسوا الغنى فى النكاح (۳۱) نکاح میں تونگری تلاش کرو۔

ابوہریرہؓ نے بھی آنحضورؐ سے اس طرح کی بات روایت کی ہے۔

عن ابن هريرةؓ قال:قال رسول الله ﷺ: ثلاثه حق على الله عونهم المكاتب الذى يريد الأداء والناكح الذى يريد العفاف والمجاهد فى سبيل الله (۳۲)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تین آدمی ہیں جن کی اعانت اللہ کے ذمہ ہے: وہ غلام جو اپنی قیمت ادا کرنا چاہتا ہو وہ نکاح کرنے والا جو پاکبازی چاہتا ہو اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے۔

قرآن وسنت کے مطابق اصل چیز دین ہے کیونکہ یہ قائم رہنے والا ہے اور آخرت میں بھی فائدہ مند ہے جب کہ

---

(۲۷) النور/۳۲

(۲۸) الطلاق/۳

(۲۹) التوبہ/۲۸

(۳۰) ابن کثیر،۳/۲۸۶

(۳۱) ایضاً

(۳۲) نسائی، کتاب النکاح،۲/۶۹

حسن اور مال عارضی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشادات بالکل واضح ہیں۔

عن عبد الله ابن عمرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لاتزوجوهن لحسنهن فعسى حسنهن ان يرديهن ولا تزوجوهن لاموالهن فعسى اموالهن ان تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين وَلأَمَةٌ خرماء سوداء ذات دين افضل (۳۳)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو ہوسکتا ہے کہ ان کا حسن انہیں خراب کرے اور نہ ان کے اموال کی وجہ سے کیونکہ ممکن ہے یہ مال انہیں مغرور بنادے بلکہ ان سے دین کی بنیاد پر نکاح کرو کیونکہ سیاہ رو کان چھدی متدینہ باندی زیادہ بہتر ہے۔

طبرانی نے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

ولا تزوجو النساء لحسنهن فعسى حسنهن يرديهن ولكن تزوجوا على الدين. من تزوج امرأة لغيرها لم يزده الله الا ذلا. ومن تزوج لِمَالِها لم يزده الا فقراً ومن تزوج لحسبها لم يزده الله الادناءة. ومن تزوج امراءة لم يردبها الا ان يغض بصره و يحصن فرجه اويصلُ رحمه بارك الله له فيها و بارك لها فيها (۳۴)

عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو۔ شاید ان کا حسن انہیں خراب کرے بلکہ دین کی بناء پر شادی کرو۔ جس شخص نے اس کے سوا کسی اور بناء پر شادی کی تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے غربت کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرے گا اور جو شخص حسب کے پیش نظر شادی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنائت کے سوا اور کچھ نہیں بڑھائے گا جو شخص کسی عورت سے شادی کرتا ہے اور اس کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی نگاہیں محفوظ ہونگی۔ شرمگاہ مصون ہوگی یا صلہ رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ اس مرد کیلئے اس عورت میں برکت دیتا ہے اور اس عورت کیلئے بھی۔

مقاصد نکاح

قرآن وسنت کی تعلیمات کو سامنے رکھیں تو نکاح کے کئی ایک مقاصد قرار دیئے جاسکتے ہیں تاہم مندرجہ ذیل نتائج تو بالکل بدیہی ہیں۔

(i) عفت وعصمت (ii) مودت ورحمت (iii) بہیمی قوتوں کا علاج

(۳۳) ابن ماجہ، ابواب النکاح، ۱/۱۳۵

(۳۴) ابن ماجہ، ۱/۵۹۷

عفت وعصمت

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کا سب سے زیادہ قیمتی جوہر اس کی عفت ہے۔ یہی چیز اس کے جملہ حقوق کیلئے حصار ہے۔ عفت کے ضائع ہونے سے سیرت کی بنیاد تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی جب جنسی آوارگی کا شکار ہوتا ہے تو اس کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر سے بھی اخلاقی بندشیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں یہی وہ دروازہ ہے جہاں سے شیطانیت بآسانی داخل ہو کر پوری انسانی طبیعت کو متاثر کر سکتی ہے۔ بدون سبب اسلام نے عفت وعصمت کی حفاظت کیلئے سخت اقدامات کئے ہیں۔ اس نے زناء کو حرام قرار دیا ہے' باہم اختلاط کے بے جا مواقع بند کئے ہیں' تہمت کیلئے بڑی سزا مقرر کی ہے' بری افواہیں پھیلانے والوں کو سخت وعید سنائی اور معاشرے کے لیے ضابطہ اخلاق کو اس طرح مرتب کیا اور اس کی اجتماعی کیفیت کو اس طرح ڈھالا کہ اس میں نکاح آسان اور غیر فطری طریق مشکل ہو جائے۔ قرآن وسنت کی رو سے نکاح جوہر عصمت کا بہترین محافظ ہے۔ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی" قرآن پاک میں نکاح کو احصان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳۵) حصن قلعہ کہتے ہیں اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ محصن ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آ گئی ہے جو نکاح کی صورت میں تعمیر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اسے یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (۳۶)

اور ان عورتوں کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں اس طرح کہ تم اپنے مالوں کے ذریعے ان سے نکاح کرو بشرطیکہ (نکاح) سے مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ کہ شہوت رانی۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۳۷)

تو ان باندیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کر لو اور ان کو ان کے مہر قاعدہ کے موافق دے دو اس طور پر کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں بشرطیکہ وہ پاکدامن ہوں خفیہ آشنائی کرنے والی نہ ہوں۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ

(۳۵) حقوق الزوجین/ ۱۸

(۳۶) النساء/ ۲۴

(۳۷) النساء/ ۲۵

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيٓ اَخْدَانٍ (۳۸)

آج تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال رکھی گئی ہیں اور جو لوگ کتاب دیئے گئے ہیں ان کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے اور پاکدامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں میں سے بھی (حلال ہیں) جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں جب کہ تم ان کو ان کا مہر دے دو اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ دوستی رکھو۔

قرآن وسنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عفت وعصمت کو بحال رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا انسانی تمدن کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اللہ تعالیٰ نے اسے مومنوں کی صفات میں بیان فرمایا ہے حضور اکرمؐ نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت ان سے عفت کا عہد لیا۔ قرآن نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا۔ (۳۹)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ...... (۳۹)

اے پیغمبر ﷺ جب آپ کے پاس مومن عورتیں اس پر بیعت کرنے آئیں کہ اللہ کے ساتھ نہ تو شریک ٹھہرائیں گی نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری .....

نوجوانوں کو اس کی تلقین فرمائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود آنحضرت ﷺ دعاؤں میں خدا سے عفت طلب کرتے رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عفت کی کس قدر اہمیت ہے اور اس کی حفاظت کیلئے اس نے کتنا اہتمام کیا ہے۔ قرآن وسنت کی مندرجہ ذیل نصوص اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ قرآن یوسفؑ کے واقعہ میں عزیز مصر کی عورت اور یوسفؑ کے اخلاقی رد یوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۴۰)

اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا تو زیادہ خیال ہو جانا عجیب نہ تھا۔ ہم نے اس طرح ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں تھے۔

قرآن امرأۃ العزیز کی زبان سے یوسفؑ کی پاکبازی کی شہادت ان الفاظ میں نقل کرتا ہے۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (۴۱)

---

(۳۸) المائدہ/۵ (۳۹) الممتحنہ/۱۲

(۴۰) یوسف/۲۴ (۴۱) یوسف/۳۲

اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا۔

یحیٰؑ کے پاکیزہ کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ(۴۲)

کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحیٰؑ کی جن کے احوال یہ ہونگے۔ کہ وہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہونگے اور مقتدر ہونگے اور اپنے نفس کو (لذات سے) بہت روکنے والے ہونگے اور نبی بھی ہونگے اور اعلیٰ درجہ کے شائستہ بھی ہونگے۔

سیدہ مریمؑ کی عفت وعصمت کی الٰہی شہادت مندرجہ ذیل الفاظ میں دی:

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ(۴۳)

اور (نیز مسلمانوں کی تسلی کیلئے) عمران کی بیٹی (حضرت مریم علیہ الاسلام) کا بیان کرتا ہے جنہوں نے اپنے ناموس کو محفوظ رکھا اور ہم نے ان کے چاک گریبان میں اپنی روح پھونک دی اور انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور اطاعت کرنے والوں میں سے تھیں۔

مومنین کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ(۴۴)

اور یہ اس بات سے پاک ہیں جو (منافق) بکتے پھرتے ہیں ان (حضرات) کیلئے (آخرت میں) مغفرت اور عزت کی روزی یعنی جنت ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ(۴۵)

اور جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص (کے قتل کرنے) کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے' ھاں مگر حق پر اور وہ زنا نہیں کرتے۔

مسلمان عورتوں کی بیعت ایمان میں ان اخلاقی برائیوں سے اجتناب کا ذکر ہے جو ایمان کے لیے لازمی ہیں:

---

(۴۲) آل عمران/۳۹

(۴۳) التحریم/۱۲

(۴۴) النور/۲۶

(۴۵) الفرقان/۶۸

وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ (۴۶)

اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد ساتھ لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفہ شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کر کے) بنالیں۔

امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں نبی کریم ﷺ کا وہ خطاب نقل فرمایا ہے جو انہوں نے قریش سے کیا۔ امام حاکم کا قول ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔

یا شباب قریش احفظو فروجکم لاتزنوا آلا مَنْ حَفِظ فرجه فله الجنّة (۴۷)

نوجوانانِ قریش اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو' زنا نہ کرو' سنو جس نے اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کی اس کیلئے جنت ہے۔

کتب حدیث میں آنحضرت ﷺ کی جو دعائیں منقول ہیں ان میں حسن اخلاق و پاکیزہ کردار کی طلب موجود ہے۔ آپ سے منقول ہے:

اللهم انی اسئلك الهدی والتقی والعفاف والغنی (۴۸)

اے اللہ میں تجھ سے ہدایت' تقویٰ' پاک بازی اور تونگری طلب کرتا ہوں۔

اللهم انی اسئلك الصحة والعفة والامانة وحسن الخلق والرضابالقدر (۴۹)

اے اللہ میں تجھ سے صحت' عفت' امانت' حسن الخلق اور راضی بہ تقدیر رہنا مانگتا ہوں۔

اللهم اَلْهِمْنی رشدی واعذنی من شرنفسی (۵۰)

اے اللہ مجھے ہدایت و بصیرت عطا فرما اور مجھے اپنے من کے شر سے بچا۔

اللهم ان اعوذبك من منكرات الأخلاق و الأعمال و الأهوإ (۵۱)

اے اللہ میں ناپسندیدہ اخلاق و اعمال اور خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

کتب حدیث میں معراج کے موقع پر مشاہدات کی تمثیلات بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضورؐ نے آگ کا دہکتا ہوا تنور دیکھا اور اس سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ آپ نے دیکھا تو اس میں ننگے مرد اور عورتیں تھیں جن کے جسموں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ آپ نے جبرائیل سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ زناء کار مردوں اور

---

(۴۶) الممتحنه/۱۲

(۴۷) المستدرک، کتاب الحدود، ۴/ ۳۹۸ حدیث: ۲۲۹۔ قال صحیح علی شرط مسلم؛ شعب الایمان، ۴/ ۳۵۳ حدیث: ۵۳۶۹؛ المعجم الاوسط، ۷/ ۶۱

(۴۸) مسلم، ابواب الادعیہ، ۲/ ۳۵۰

(۴۹) مشکاۃ، باب جامع الدعا/ ۲۲۰

(۵۰) ترمذی، ابواب الدعوات، ۲/ ۱۸۶

(۵۱) ترمذی مع شرح ابن عربی، ابواب الدعوات، ۱۳/ ۲۴

عورتوں کی جماعت ہے جو دنیا میں زنا کاری کا ارتکاب کرتے رہے۔اسی طرح عفت کی عظمت کا احساس اس طویل واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو حضورؐ نے بنی اسرائیل کے بعض افراد کے ضمن میں بیان فرمایا ہے۔(۵۲)

مودت ورحمت

دوسرا اہم مقصد مودت ورحمت ہے چونکہ عورت ومرد کا تعلق صالح تمدن کیلئے ضروری ہے اس لیے اس تعلق کو وقتی اور ہنگامی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر ایک پائیدار اور مضبوط بندھن کی حیثیت دینی چاہیے۔یہ بندھن دراصل اس گہرے ربط و تعلق کی علامت ہے جو سکون خاطر اور اطمینان قلب کا باعث ہے۔قرآن اس مودت ورحمت کو اس تعلق کی بنیاد بھی قرار دیتا ہے اور نتیجہ بھی۔اور اس کا تعلق یوں بیان کرتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّ رَحْمَۃً(۵۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیبیاں پیدا کیں تا کہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم (میاں بیوی) میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔

ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا(۵۴)

اور وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا قادر عظیم ہے جس نے تم کو ایک تن واحد سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اپنے جوڑے سے راحت حاصل کرے۔

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ (۵۵) وہ تمہارے لیے پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

قرآن زوجین کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیتا ہے جو گہرے ربط واتصال اور یقینی حفاظت کی علامت ہے اور جس کے تقدس اور عظمت کو برقرار رکھنا اسلامی معاشرے کا فرض ہے۔زوجین میں اس مودت ورحمت کو حدود اللہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اور طلاق کو جو ابغض المباحات ہے اسی صورت میں جائز قرار دیا گیا ہے جب مودت ورحمت کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ(۵۶)

طلاق (صرف) دو مرتبہ ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق یا چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ۔اور تمہارے

---

(۵۲) بخاری، کتاب الادب، باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ، ۳۴/۴

(۵۳) الروم/۲۱

(۵۴) الاعراف/۱۸۹

(۵۵) البقرہ/۱۸۷

(۵۶) البقرہ/۲۲۹

لیے یہ بات حلال نہیں کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ (چھوڑنے کے وقت) واپس لے لو ہاں اگر میاں بیوی دونوں کو خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۵۷)

پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں اپنی عدت گزارنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم کو دو اختیار ہیں، یا قاعدے کے موافق نکاح میں رہنے دو یا قاعدے کے موافق رہائی دے دو۔

ایک اچھے معاشرے کیلئے ازدواجی تعلق رحمت وکرم ہے۔اسی پر بچوں کی تربیت کا انحصار ہے اور یہی خاندان کے سکون کا سبب ہے۔ باہمی مودت ورحمت نہ صرف ازدواجی تعلق کے استحکام کا ذریعہ ہے بلکہ گھر کے ماحول کو پرامن رکھنے کا وسیلہ بھی ہے۔

بہیمی قوتوں کا علاج

انسان کی بہیمی قوتیں اسے اکثر بے راہ روی کی طرف لیے جاتی ہیں۔اسلام نے ان بہیمی قوتوں کا علاج نکاح کی صورت میں کیا ہے جس سے انسان کی طبیعت میں اعتدال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔اس طرح اسلام کا قانون ازدواج انسانی معاشرے کے افراد میں جائز درست اور پائیدار ربط پر زور دیتا ہے اور ان تمام ناجائز روابط کی نفی کرتا ہے جو جاہلیت قدیمہ یا جاھلیت جدیدہ میں پائے جاتے ہیں۔اسلام ایک صالح معاشرہ استوار کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد نکاح ہے۔اسلام کے نزدیک پر سکون تمدن کا دارومدار نکاح پر ہے۔انسان کے جسمانی داعیات فطری ہیں ان کی تسکین کا مناسب اور بروقت انتظام مستحکم اجتماعی نظام کے لیے ضروری ہے۔اسلام نے ان فطری دواعی کو سامنے رکھا ہے اور نکاح کو نیکی قرار دیا ہے۔جن مذاہب نے جنسی تعلق کو گندگی قرار دیا ان کے معاشرے بالآخر جنسی بے راہ روی کا شکار ہوئے ہیں۔

سید مودودیؒ کے بقول: انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتیاتی حیثیت سے (Biologically) اسی نوعیت کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ایک صنف کا ہر فرد صنف مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کی طرف شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے سوا نہیں روکا جاسکتا اور ایک مرتبہ بے قابو ہوجائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات سے بھی ارزل بن جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔(۵۸)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍO ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَO اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۵۹)

ہم نے بنایا آدمی کو خوب انداز ے پر، پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے مگر جو یقین لائے اور عمل کیے اچھے۔

---

(۵۷) الطلاق/۲ (۵۸) پردہ/۲۴۵ (۵۹) التین/۴-۶

طلاق

طلاق کے لغوی معنی قید سے آزادی کے ہیں یہ قید حسی بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ جیسے قید الاسیر اور قید نکاح۔طلاق اور تطلیق دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔دور جاہلیت میں یہ لفظ التفریق بین الزوجین کیلئے استعمال ہوتا تھا۔اسلام آیا تو اس نے اسے اسی معنی میں جائز رکھا البتہ اس کی اصلاح کردی۔فقہاء کے نزدیک طلاق کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں ازالہ نکاح یا حلال تعلق کے اختتام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

طلاق کی حیثیت

اسلام انسانی معاشرے کیلئے نکاح کو اس لیے اصل قرار دیتا ہے کہ اس سے حدود اللہ کی پابندی اور اخلاق کی تربیت ہوتی ہے۔اسلام اسے قائم رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔اگر اس تعلق میں کچھ کمی واقع ہو تو بھی اسے برداشت کرنے کا حکم دیتا ہے۔کیونکہ اصل مقصد انسانی معاشرے کا ربط واستحکام ہے۔مثلاً سورۃ النساء:(۱) کی آیت 19 میں یہ ارشاد ہے کہ اگر تمہیں اس تعلق میں کراہت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا ہے تو تمہارے صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس میں خیر کے عنصر کو غالب کردے گا۔اگر یہ تعلق کسی سطح پر نہ چل سکے تو پھر انسانی معاشرے کی فلاح وبہبود کیلئے اسے توڑ دینا مناسب سمجھا لیکن یہ توڑنا بالکل ناگزیر حالات کے ساتھ مختص قرار دیا۔

قرآن وسنت میں ایسی واضح نصوص موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ طلاق اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے۔احادیث کی کتاب الطلاق میں اس پہلو سے متعلق حضورؐ کے بہت سے ارشادات موجود ہیں۔یہاں ہم چند احادیث نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن سے طلاق کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

عن ابن عمرؓ:أن النبی ﷺ قال: ابغض الحلال الی الله الطلاق(۲)

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حلال چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین طلاق ہے۔

عن معاذؓ قال: قال رسول الله ﷺ: یا معاذا ما خلق الله شیئًا علی وجه الارض احب الیه من العتاق ولا خلق الله شیئًا علی وجه الارض ابغض الیه من الطلاق (۳)

معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے روئے زمین پر کوئی شے نہیں پیدا کی جو اسے غلام آزاد کرنے سے زیادہ پسند ہو اور کوئی شے ایسی روئے زمین پر نہیں پیدا کی جو اسے طلاق سے زیادہ مبغوض ہو۔

عن ثوبان قال: قال رسول الله ﷺ: ایما امرأة سألت زوجها طلاقاً فی غیر ماباس

---

(۱) وعاشروهن بالمعروف. فان کرهتموهن فعسی ان تکرهوا شیئا ویجعل الله فیه خیرا کثیرا.

(۲) ابوداؤد، کتاب الطلاق،۱/۲۹۶

(۳) دارقطنی،۴/۳۵

فحرام علیها رائحة الجنة (۴)

ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ہر وہ عورت جس نے غیر ضروری طور پر اپنے خاوند سے طلاق طلب کی اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔

تَزَوَّجُوا و لا تُطَلِّقُوا فإنَّ اللہ لا یُحِبُّ الذوّاقین والذوّاقات (۵)

نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ مزہ چکھنے اور پھرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن وسنت کے ارشادات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نکاح ایک ایسا مقدس رشتہ ہے جسے قائم رکھنا چاہیے لیکن چونکہ اس کا مدار محض طبائع کے توافق اور تعاون پر ہے اس لیے انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جہاں تعلق بوجھ بن رہا ہو اسے ختم کر دینا چاہیے۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب نے جو طریقہ ہائے کار اختیار کئے ہیں وہ فطرت کے خلاف تقریباً بغاوت ہے مثلاً یہودیت میں مرد کو طلاق کے وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں اور وہ بالکل معمولی وجوہ کی بناء پر جب چاہے طلاق دے سکتا ہے۔ اس کے برعکس عورت کو کسی وقت بھی مطالبہ طلاق کے اختیارات نہیں۔ یہودیوں کے ہاں عورت کی مظلومیت ایک مذہبی حقیقت تھی۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت اسلام سے پہلے دور جاہلیت کی تھی۔ اس دور میں طلاق مرد کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھی جب چاہتا طلاق دیتا' جب چاہتا رجوع کر لیتا اور اس طرح عورت کو معلق رکھ کر عذاب دیا جاتا۔ عیسائیت اور ہندومت میں رشتہ نکاح کو ناقابل انقطاع تصور کیا جاتا ہے۔ مسیحؑ کا قول ہے جسے خدا نے جوڑا بنایا اسے آدمی جدا نہ کرے۔ مسیحیت اس قول پر مدت تک عمل پیرا رہنے کے بعد اسے خیر باد کہہ چکی ہے اور اب جدید مسیحی معاشرے میں طلاق ایک معمولی بات بن کر رہ گئی ہے۔ جاہلیت جدیدہ بھی جاہلیت قدیمہ کا عکس ہے۔ بلکہ اس سے بھی ذرا زیادہ کیونکہ جاہلیت قدیمہ میں مرد معمولی بات پر طلاق دیتا تھا' جاہلیت جدیدہ میں عورت بھی اس کاوش میں شریک ہو گئی ہے۔ وہ بھی کسی نہ کسی بہانے مرد سے جان چھڑانے میں مرد سے کئی گنا زیادہ مستعد ہے۔ چونکہ مغربی قانون نے اسے مرد کی جائیداد سے حصہ لینے کا حق دیا ہے اس لیے وہ بھی حق طلاق کو استعمال کرنے میں دلیر ہو گئی ہے۔ اسلام نے ان غیر فطری طریقوں کی بجائے بڑا فطری طریق اختیار کیا ہے۔ وہ ایک طرف تو اس مقدس رشتے کی پختگی اور عظمت کا ذکر کرتا ہے کہ اسے آسانی سے توڑا نہیں جانا چاہیے لیکن دوسری طرف یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ اگر مل کر رہنے میں حدود اللہ ٹوٹنے کا خدشہ ہے تو پھر جدا کر دینا ہی قرین مصلحت ہے۔

طلاق کے بارے میں اصل چیز دینی واخلاقی قدروں کی حفاظت ہے لیکن بعض اوقات طبائع کا اختلاف اور شکل و صورت کی عدم قبولیت بھی بنیاد بن جاتے ہیں۔ اسلام نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ طلاق صرف دینی واخلاقی قدروں کی بنیاد پر ہو۔ جہاں تک طبائع کے فرق اور شکل وصورت کے اختلاف کا تعلق ہے تو اسلام نے اسے برداشت کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اگرچہ کسی وقت یہ چیزیں بھی ناقابل برداشت ہو کر بنیاد بن سکتی ہیں۔ اسلام نے اسے تسلیم کیا ہے جیسا کہ

ایک صحابی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میں طلاق دینا چاہتا ہوں تو حضورؐ نے اسے اجازت دے دی۔

عن لقیط بن صبرةؓ قال: قلت یا رسول الله: ان لی امرأة فی لسانها شیءٌ یعنی البذاء قال: طلقها قلت: ان لی منها ولداً ولها صحبة قال: فمرها یقول عظها فان یك فیها خیر وَمستقبل ولا تضربن ضَیْعَتِكَ ضربك امتك (٦)

لقیط بن صبرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری بیوی بدزبان ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے طلاق دے دو۔ میں نے عرض کیا حضور ﷺ میرا اس سے ایک لڑکا ہے اور اس سے ایک تعلق بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسے سمجھاؤ یعنی نصیحت کرو۔ اگر اس میں خیر ہوئی تو وہ نصیحت قبول کرے گی اور اپنی بیوی کو ایسا نہ مارنا جیسا باندی کو مارا جاتا ہے۔

دور جاہلیت میں چونکہ طلاق کو ایک مذاق بنالیا گیا تھا اس لیے نبی کریمؐ نے اس کی اس حیثیت کو بھی واضح فرما دیا۔ کتب حدیث کے باب الخلع والطلاق میں ابو ہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے جسے طلاق کے بارے میں اسلام کی پالیسی قرار دیا جا سکتا ہے۔

عن ابو هریرةؓ: قال: اِن رسو ل الله قال: ثلاث جدهن جد و هزلهن جدٌ: الطلاق و النکاح والرجعة۔ (٧)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین باتیں ہیں جن میں حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت، طلاق، نکاح اور رجوع۔

اسلام نے طلاق کی حد متعین کر کے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ایک آدمی تین سے زائد طلاقیں نہیں دے سکتا اور اگر کبھی تین طلاقیں دیں تو رفاقت سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا جائے گا اور پھر کسی حیلہ بازی کی اجازت نہیں ہوگی۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ (٨)

پھر اگر کوئی عورت کو (تیسری) طلاق دے دے تو پھر وہ اس کیلئے حلال نہ رہے گی اس کے بعد۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور شوہر سے نکاح کرے۔

---

(٤) ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، ١/١٤٢

(٥) کشف الخفاء، ١/٣٦١؛ شرح جامع الصغیر للمناوی، ١/٣٤

(٦) معجم الکبیر للطبرانی، ١٩/٢١٧

(٧) ابوداؤد، کتاب الطلاق، ١/٢٩٨؛ ترمذی، کتاب الطلاق، باب ماجا وفی الجد والهزل فی الطلاق/٢٥٨، ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب من طلق اونکح اورَجَعَ لاعباً /٢٩٢

(٨) البقرہ، ٢٣٠/

عن مالکؒ ان رجلاً قال لعبد الله ابن عباسؓ: انی طلقت امراتی مائة تطليقة فما ذا ترى علی ؟ فقال ابن عباسؓ: طلقت منك ثلاث وسبع وتسعون اتخذت بها آيات الله هزواً (۹)

مالکؒ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں تمہارے خیال میں مجھ پر کیا عائد ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ تین طلاقوں سے تیری بیوی مطلقہ ہو گئی ہے۔ اور ستانوے طلاقوں سے تو نے اللہ کی آیات کا مذاق اُڑایا ہے۔

طلاق کے بارے میں حیلہ بازیاں بھی ممنوع ہیں۔ مثلاً کوئی شخص طلاق کے بعد اسے اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی عارضی نکاح کا بندوبست کرے پھر اس سے طلاق لے کر نکاح کر لے۔

عن عبد الله بن مسعودؓ قال: لعن رسول الله ﷺ المحلل والمحلل له (۱۰)

عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے حلالہ نکالنے اور نکلوانے والے پر لعنت کی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ پابندیاں لگا کر اسلام نے طلاق کو انسانی معاشرے کیلئے مفید بنایا اور ایسا طریق کار بتایا جس سے طلاق کو موثر، مفید اور غیر مضر بنایا جا سکتا ہے اور وہ پانچ پابندیاں ہیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں:

(i) طلاق حالت طہر میں دی جانی چاہیے۔

(ii) طلاق کے بعد عدت لازمی ہے۔

(iii) طلاق رجعی کے بعد بھی دوران عدت صلح کی جا سکتی ہے۔

(iv) عورتوں کے حقوق کی رعایت لازمی ہے۔

(v) طلاق صرف دو دفعہ دی جا سکتی ہے۔ تیسری دفعہ دینے کی صورت میں دوبارہ نکاح یا رجوع کی گنجائش نہیں رہتی۔

قرآن و سنت کی مندرجہ ذیل نصوص ان کی تائید کرتی ہیں۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۱)

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض تک اور عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر

(۹) المؤطا، کتاب الطلاق، ۱۹۹/۱

(۱۰) ترمذی، ابواب النکاح، ۱۳۳/۱

(۱۱) البقرہ، ۲۲۸/۲

اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں۔ اور ان عورتوں کے شوہران کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں۔ اور عورتوں کیلئے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق۔ اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں حکیم ہیں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۱۲)

اے پیغمبر ﷺ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو۔ اور تم عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے۔ اور یہ سب اللہ کے مقرر کیے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً اس نے عورت کو گھر سے نکال دیا) تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (۱۳)

وہ طلاق دو مرتبہ (کی) ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ۔

عن عبد الله بن عمرؓ انه طلق امراته وهي حائض على عهد رسول الله ﷺ فسأل عمر بن الخطابؓ رسول الله ﷺ عن ذلك. فقال رسول الله ﷺ: مره فليراجعها ثم ليمسكها حتى تطهر ثم تحيض ثم تطهر إِنْ شاء امسك وَإِن شاء طلق قبل ان يمس فتلك العدة التي امر الله ان تطلق لها النساء (۱۴)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور وہ حائضہ تھیں۔ عمر ابن خطابؓ نے اس چیز کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو حضورؐ اس بارے میں غصے ہوئے اور فرمایا: اسے کہو کہ رجوع کرے پھر اسے روک رکھے تا کہ وہ پاک ہو پھر اسے حیض آئے پھر پاک ہو پھر اگر وہ سمجھے کہ اسے طلاق دینا ہے تو اسے اس حال میں طلاق دے کہ وہ عورت طہر میں ہو اور اس سے قربت نہ کی ہو تو یہ وہ عدت ہے جس کیلئے اللہ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو طلاق دی جائے۔ اور

---

(۱۲) الطلاق/۱

(۱۳) البقرہ/۲۲۹

(۱۴) بخاری، کتاب الطلاق، ۲/۷۹۰

ایک روایت میں ہے کہ ایک دفعہ پھر رجوع کرے پھر اسے حالت طہر میں طلاق دے یا حمل کی صورت میں۔

طلاق دینے کا طریقہ

کتاب وسنت سے طلاق کا پسندیدہ طریقہ ایک ہی ثابت ہوتا ہے جسے فقہا نے احسن کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ حالت طہر میں ایک طلاق دی جائے اور اس پر عدت گزرنے دی جائے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات متصور ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ دوسرے طہر میں دوسری طلاق دی جائے۔ قرآن وسنت کے لحاظ سے طلاق کو رجعی رکھنا ہی بہتر ہے بقول سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''طلاق کا صحیح مفہوم جو قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو حالت طہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا ہو جب کہ عورت ایام ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں بلکہ ان ایام سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیے پھر ایک اور طلاق دے دے ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے''۔(۱۵)

یہی وہ طلاق ہے جسے احسن کہا جاتا ہے یعنی مرد عورت کو طہر میں بغیر ازدواجی تعلق کے طلاق دے یعنی ایک ہی مرتبہ اور یہی وہ طلاق ہے جو قرآن کریم کی آیات سے صاف معلوم ہوتی ہے اور جس کا پتہ احادیث سے بھی چلتا ہے اور یہی وہ طریق طلاق ہے جسے اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے طریقے اختیار کر کے مسلمانوں کو اس قدر ذلت اٹھانا پڑی ہے جس کا بیان نہیں ہوسکتا۔

فقہا نے طلاق کی تین قسمیں بیان کی ہیں: احسن، حسن، بدعی۔

قرآن وسنت کے اعتبار سے وہی طریقہ زیادہ پسندیدہ ہے جسے احسن کہا جاتا ہے البتہ حسن بھی قابل قبول ہے۔

طلاق کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ بیک وقت تین طلاقیں دینے کا ہے۔ قرآن سے بیک وقت تین طلاقیں دینے کا پتہ نہیں چلتا البتہ حدیث میں اس کا ذکر آتا ہے لیکن حضورؐ کے طرز عمل سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

عن محمود بن لبیدؓ قال: اخبر رسول اللہ ﷺ عن رجل طلق امراۃ ثلاث تطلیقات جمیعاً فقام غضبان ثم قال: ایلعب بکتاب اللہ وانا بین اظہرکم حتی قام رجل فقال یا رسول اللہ الا اقتلہ (۱۶)

محمود بن لبیدؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ کو ایک آدمی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دی ہیں تو آپ غضبناک ہوکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا: کیا وہ اللہ کی کتاب سے کھیلتا ہے اور میں تمہارے اندر موجود ہوں، حتیٰ کہ ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا کہ میں اسے قتل نہ کردوں؟

---

(۱۵) تفہیم القرآن، ۱/۱۷۴

(۱۶) النسائی، کتاب الطلاق ۲/۹۹

عن رکانة بن عبد یزید انه طلق امراته سهیمه البتة فاخبر بذلك النبی ﷺ وقال والله ما اردت الا واحد ة فقال رسول الله: ما اردت الا واحدة فقال رکانة: والله اردت الا واحدة فردها الیه رسول الله ﷺ (۱۷)

رکانہ بن عبدؒ یزید کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی سہیمہ کو بتہ طلاق دی نبی کریم کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے کہا: اللہ کی قسم میں نے صرف ایک کا ارادہ کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو نے صرف ایک کا ارادہ کیا تھا؟ تو رکانہ نے کہا خد کی قسم میں نے صرف ایک کا ارادہ کیا تھا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے رکانہ کی طرف لوٹا دیا۔

ان دونوں حدیثوں سے اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اکھٹے طلاقیں دینا مبغوض ترین فعل ہے جسے نبی کریمؐ نے ناپسند فرمایا ہے البتہ ہمارے فقہاء میں اس کی حیثیت پر اختلاف ہوا ہے۔ ابن رشد قرطبی لکھتے ہیں۔

جمهور فقهاء الامصار علی ان الطلاق بلفظ الثلاث حکمه حکم الطلقة الثالثة وقال اهل الظاهر و جماعة حکمه حکم الواحده ولا تاثیر للفظ فی ذلك (۱۸)

مختلف علاقوں کے جمہور فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ لفظ ''ثلاث'' سے دی جانے والی طلاقوں کا حکم تیسری طلاق کا ہے اہل ظاہر اور ایک اور جماعت نے کہا کہ اس کا حکم ایک طلاق کا ہے اور اس میں لفظ کو کوئی دخل نہیں۔

ظواہر کے دلائل

(i) قرآن پاک نے طلاق کے بارے میں مرتان کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ طلاق ایک ایک مرتبہ ہی کہی جا سکتی ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت کے علاوہ ان حضرات کا استدلال نبی کریمؐ کی احادیث سے بھی ہے۔ مثلاً

عن ابن عباسؓ قال: الطلاق علی عهد رسول الله و ابی بکر ثنتین من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فامضاه علیهم عمر (۱۹)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ کے عہد میں اور عمرؓ کی خلافت کے دو برسوں میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں پھر عمرؓ نے اسے نافذ کیا۔

ابن اسحاقؒ نے عکرمہؒ کے حوالے سے عبداللہ ابن عباسؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

---

(۱۷) ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، ۱/۱۴۰؛ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتة/۲۹۳

(۱۸) بدایة المجتهد، ۲/۶۰

(۱۹) ابوداود، کتاب الطلاق، ۱/۲۹۹

عن ابن عباسؓ قال: طلق رکانة زوجته ثلاثا فی مجلس واحد فحزن علیها حزنا فَسَئَاله رسو ل الله ﷺ کیف طلقت ؟ قال: طلقتها ثلاثا فی مجلس واحدة قال: انما تلك طلقةٌ واحدةٌ فارْ تَجِعها (۳۰)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں پھر اس پر شدید غمزدہ ہوئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا تم نے کس طرح طلاق دی ہے۔ اس نے جواب دیا: میں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ تو ایک طلاق ہے تم رجوع کرلو۔

جمہور کے دلائل

(i) جمہور کے نزدیک احادیث میں بیان کردہ طلاقیں بائنہ تھیں مغلظہ نہیں تھیں اور ان میں رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

(ii) حضورؐ کے یہ فیصلے خصوصی حالات کے پیش نظر تھے اس لیے ان انفرادی واقعات کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔

(iii) عمرؓ کے زمانے میں جب طلاق مغلظہ کا فیصلہ کیا گیا تو جلیل القدر صحابہؓ کا اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام صحابہؓ نے عمرؓ کے اس طرز عمل کی تصدیق کی تھی۔

کچھ لوگ طلاق کے بارے میں نیت کو بنیاد قرار دیتے ہیں اس لحاظ سے طلاق دینے والوں کو یہ اظہار کرنا ہوگا کہ ان کی مراد کیا تھی؟ الطلاق مرتان کی تشریح جمہور علماء نے یہ کی ہے کہ اس جملے سے فقط یہ واضح ہوتا ہے کہ دو مرتبہ تک رجوع کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہونگی۔

علمائے حدیث نے حضرت عمرؓ کے طرز عمل کا یہ جواب دیا کہ یہ انکی شدت تھی جو محض وقتی سزا قرار دی جاسکتی ہے اسے ہمیشہ کے لیے نافذ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہر کیف حالات کے مطابق ان دونوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کے قانون طلاق میں خوبی یہ ہے کہ اس نے سختی اور نرمی کے درمیان حد اعتدال اختیار کی ہے۔ اگر ہم اعتدال کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے تو اسلامی روح مجروح ہوگی۔

اس مسئلہ پر عبد الرحمان الجزیری نے اپنی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (مبحث تعداد الطلاق' ۱/۳۴۱) میں بہت اچھی بحث کی ہے جس سے تفصیل کے طالب قاری کی تشفی ہوسکتی ہے۔

شرائط طلاق

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کیلئے کچھ اور شرائط بھی ہیں مثلاً' بلوغ' اختیار نکاح وغیرہ جن کا

---

(۳۰) ایضاً، کتاب الطلاق، ۱/۳۰۰

ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔

عن أبی ھریرۃؓ قال: رسول اللہ ﷺ کل طلاق جائز الا طلاق المعتوہ والمغلوب علی عقلہ (۲۱)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر طلاق جائز ہے سوائے مدہوش اور اس آدمی کی طلاق کے جس کی عقل پر غلبہ ہے۔

عن عائشۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: رفع القلم عن ثلاثہ عن النائم حتی لیستیقظ عن الصبی حتی یبلغ عن المعتوہ حتی یعقل (۲۲)

عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین آدمیوں سے مواخذہ نہیں، سونے والے سے حتیٰ کہ وہ بیدار ہو، بچے سے تا آنکہ وہ بالغ ہو۔ مغلوب العقل سے حتیٰ کہ وہ ہوش میں آئے۔

عن عائشۃؓ قالت :سمعت رسول اللہ ﷺ: یقول :لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق۔ قیل: معنی الاغلاق الاکراہ (۲۳)

عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اغلاق کی حالت میں طلاق اور عتاق نہیں اور یہ کہا گیا ہے کہ اغلاق کے معنی اکراہ کے ہیں۔

گویا طلاق ایک عاقل بالغ شخص اپنے اختیار و ارادہ سے دے گا۔ ان میں سے کسی حیثیت کا فقدان بھی طلاق کو غیر موثر کر دے گا۔ بچہ، مجنوں اور مجبور انسان کی دی ہوئی طلاق قابل قبول نہ ہوگی۔ طلاق کرہ کے بارے میں امام مالکؒ کا موقف اور اس کی خاطر سزا کا برداشت کرنا ہماری تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جو ایک طرف سرکاری جبر دوسری طرف عالمانہ استقامت و عزیمت کی شاندار مثال ہے۔

---

(۲۱) ترمذی، مع شرح ابن عربی، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی طلاق المعتوہ، ۴/۱۶۷

(۲۲) ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المعتوہ، ۱/۱۶۸

(۲۳) ایضاً، کتاب الطلاق، باب طلاق المکرہ، ۱/۱۶۸

خلع

خلع لغوی طور پر ازالہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔لسان العرب میں ہے۔

خلع الرجل ثوبه خلعا ازاله عن بدنه و نزعه عنه(۱)

آدمی نے اپنے کپڑے اتارے۔اپنے بدن سے ہٹائے اور اتارے۔

خلع اصطلاحاً اس ترک تعلق کو کہتے ہیں جو عورت اپنے مطالبے سے مرد سے حاصل کرتی ہے۔گویا خلع ایک قسم کی طلاق ہے لیکن اس میں مرد کے اختیار کی بجائے عورت کا مطالبہ پایا جاتا ہے۔اسلام سے پہلے طلاق مرد کا ہتھیار تھا جسے وہ جب چاہتا اور جس طرح چاہتا استعمال کر لیتا تھا۔اسلام نے پہلے تو اس کے اس اختیار کو چند شرائط سے مقید کر دیا پھر مرد کی گرفت کو مزید نرم کرنے کیلئے یہ قدم اٹھایا کہ عورت کو بعض حالات میں اجازت دی کہ وہ طلاق کا مطالبہ کر سکے اور اگر وہ اپنے مطالبے میں حق بجانب ہو تو حکمین کے ذریعے یا عدالت کی سطح پر طلاق حاصل کر سکتی ہے۔بعض فقہاء نے خلع کی تعریف میں یہ بات کہی ہے کہ اگر قطع تعلق عوض کے بغیر ہو تو طلاق ہے اور جب اس میں عوض دینے کا معاملہ آ جائے تو وہ خلع ہو جائے گا۔خلع کے بارے میں بنیادی بات قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲)

اور تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ جو (مہر) تم ان کو دے چکے ہو واپس لے لو مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔تو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اس (مال لینے دینے میں) جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔یہ خدائی ضابطے ہیں تو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے تو ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔

اسلام میں نکاح کا اصل مقصود معاشرتی سکون اور مودت و رحمت ہے لہذا جب سکون اور مودت و رحمت ختم ہونے لگے تو طلاق کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح ناخوشگوار حالات میں خلع کا قبول کرنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔خلع میں بنیادی حیثیت عورت کی صوابدید کی ہے اگر وہ کسی شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو اسے اختیار ہے کہ وہ علیحدہ ہو جائے البتہ اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اگر وہ نجات حاصل کرنا چاہے تو اسے کچھ قربانی کرنا پڑے گی۔اور وہ یہ کہ مہر کی جو رقم اسکے شوہر نے اسے

---

(۱) لسان العرب، ۶/۸۰

(۲) البقرہ/۲۲۹

دے رکھی ہے وہ اسے واپس کر دے اور طلاق حاصل کر لے۔ اول تو یہ معاملہ گھریلو سطح پر طے ہو جانا چاہیے لیکن اگر یہاں فیصلہ نہ ہو تو عورت عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر سکتی ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں۔ قرآن پاک کے اسی حکم کے پیش نظر حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ﷺ کے عہد میں کئی ایک مقدمات پیش ہوئے جن کا ذکر احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ گو اس فیصلے کو اسلامی معاشرتی استحکام کیلئے ضروری قرار دیا گیا لیکن اس کیلئے ایک اخلاقی اصول پہلے بیان فرما دیا کہ بغیر وجہ طلاق طلب کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ بات ہے یہ اسی طرح کا اصول ہے جو پہلے طلاق کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس تعلق کے اخلاقی بنیاد کو واضح کیا جائے اور اس تعلق کے ٹوٹنے سے جو اخلاقی اثرات مرتب ہوں گے انہیں پیش نظر رکھا جائے۔ آنحضرت ﷺ سے مروی احادیث میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

عن ثوبانؓ قال: رسول الله ﷺ :ايما امراة سالت زوجها فی غير ما بأس فحرام عليها رائحة الجنة (۳)

ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ عورت جس نے بلا ضرورت اپنے خاوند سے علیحدگی طلب کی اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

عن ابی هريره قال: قال رسول الله ﷺ: المنتزعات والمختلفات هن المنافقات (۴)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ علیحدگی چاہنے والی اور خلع حاصل کرنے والی عورتیں ہی منافق ہیں۔

ابن جریرؒ نے وہ تمام روایات نقل کی ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں پیش آنے والے خلع کے واقعات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ ثابتؓ بن قیس کی عورت کا ہے۔

عن ابن عباسؓ إن امرأة ثابت بن قيس اتت النبی ﷺ فقالت: يا رسول الله ما اعتب عليه فی خلق ولا دين ولكن اكره الكفر فی الاسلام. فقال رسول الله ﷺ: اتر دين عليه حديقته؟ قالت نعم: قال رسول الله ﷺ اقبل الحديقه وطلقها تطليقه (۵)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ثابتؓ بن قیس کی بیوی نے نبی ﷺ کے پاس آ کر عرض کی۔ یا رسول اللہ ﷺ میں اس کے خلق و دین پر کوئی حرف گیری نہیں کرتی لیکن میں اسلام میں کفر کو پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کا باغیچہ لوٹا دو گی؟ اس نے کہا ہاں۔ حضورؐ نے فرمایا باغیچہ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔

عن نافع عن مولاة لِصَفِية بن ابی عبيد انها اختلعت من زوجها بكل شيئٍ لها فلم ينكر

---

(۳) ابن ماجہ، کتاب الطلاق، ۱/۱۴۹

(۴) ترمذی، ابواب الطلاق واللعان باب ماجاء فی المختلعات، ۱/۱۴۲

(۵) بخاری، کتاب الطلاق باب کيفية الخلع ۲/۷۹۴

ذلك عبد الله ابن عمرؓ(٦)

نافعؒ نے صفیہؓ بنت ابی عبید کی باندی سے روایت کیا ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے تمام مال کے بدلے میں جو اس کے پاس تھا خلع لیا اور عبداللہ بن عمرؓ نے اسے ناپسند نہیں کیا۔

خلع کے سلسلے میں ابن عباسؓ کا مندرجہ ذیل بیان اہمیت کا حامل ہے:

کان ابن عباسؓ یقول: ان اول خلع کان فی الاسلام اخت عبد الله بن أبیٰ إنها اتت رسول الله ﷺ فقالت: یا رسول الله لا یجمع راسی وراسه شیءٌ ابداً. انی رفعت جانب الخباء فرایته اقبل فی عدة فاذا هو اشدهم سواداً واقصرهم قامة و اقبحهم وجهاً. قال زوجها: یا رسول الله: إنی اعطیتُها افضل مالی حدیقة فان ردت علی حدیقتی. قال: ماتقولین؟ قالت: نعما وان شاء زدته قال ففرق بینهما (٧)

ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ پہلا خلع جو اسلام میں پیش آیا وہ عبداللہ بن ابی کی بہن کا تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی یارسول اللہ ﷺ: اس کے اور میرے سر کو کہیں کوئی چیز جمع نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنے گھونگھٹ کے پلو کو اٹھایا تو دیکھا کہ وہ اپنے چند دوستوں میں آرہا تھا لیکن کیا دیکھتی ہوں کہ وہ ان میں سب سے زیادہ کالا سب سے زیادہ کوتاہ قامت اور سب سے زیادہ بدصورت ہے۔ اس کے خاوند نے کہا یا رسول اللہ ﷺ: میں نے اسے اپنا بہترین مال باغ دیا اگر وہ مجھے باغیچہ واپس کر دے تو ٹھیک ہے۔ آپ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے؟ اس عورت نے کہا ہاں اگر وہ چاہے تو میں کچھ اضافہ کر سکتی ہوں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ حبیبہؓ بنت سہل الانصاریہ کا ہے وہ ایک دن صبح سویرے ہی آنجنابؐ کے راستے میں کھڑی تھی۔ آپؐ کے سوال پر اس نے کہا میں اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی نبی کریمؐ نے ثابتؓ بن قیس کو بلا کر پوچھا اور فیصلہ اس امر پر ہوا کہ حبیبہؓ کے پاس اس کے خاوند کا دیا ہوا جو کچھ بھی ہے وہ اسے واپس کر دے۔ (٨)

خلع کے دو واقعات عمرؓ اور عثمانؓ کے عہد میں بھی پیش آئے ان میں سے عمرؓ کے عہد کا واقعہ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپؓ نے خلع طلب کرنے والی عورت کو ایک باڑے میں بند کر دیا اور صبح اس خاتون سے اس کا حال پوچھا گیا تو بولی: میرے لیے یہ رات ان تمام راتوں سے زیادہ آرام دہ تھی۔ یہ سن کر عمرؓ نے خلع کا فیصلہ کر دیا اور اس شخص سے کہا:

اخلعها ویحك ولو من قرطها (٩)

---

(٦) الموطأ، کتاب الطلاق، ۲/۲۰۵

(٧) ابن جریر، سورۃ البقرہ، ۲/۲۸۰

(٨) ابوداؤد، کتاب الاطلاق، باب فی الخلع ۲/۲۹۶؛ نسائی کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخلع ۶/۱۶۹؛ الموطا، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخلع ۲/۲۳

(٩) کشف الغمہ ۲/

عثمانؓ کے عہد میں ربیعؓ بنت مسعود نے سارا مال دے کر خلع حاصل کیا حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے:

قالت: اختلعت من زوجی بما دون عقاص راسی فاجاز ذلك عثمان (۱۰)

ربیع ؓ کہتی ہیں کہ میں نے چوٹی کے موباف تک پر خلع حاصل کیا اور عثمان نے اس کی اجازت دی۔

اس آیت اور احادیث و آثار سے خلع کے بارے میں مندرجہ ذیل امور مستنبط ہوتے ہیں۔

(i) خلع اس وقت ہوگا جب حدود اللہ ٹوٹنے کا اندیشہ ہو۔ ازدواجی زندگی میں حدود اللہ سے مراد مروت و احسان کے پیش نظر حقوق و فرائض کا خیال ہے۔ اگر حقوق و فرائض میں خیانت کا اندیشہ ہو یا مقاصد ازدواج ہی فوت ہو رہے ہوں تو خلع ضروری ہے۔

(ii) خلع کے لیے عورت کی طرف سے فقط نفرت اور اظہار ناپسندیدگی ہی کافی ہے البتہ عورت کی اس نفرت کو دور کرنے کی کوئی تدبیر کر کے اسے خوش گوار تعلقات پر آمادہ کیا جا سکتا ہو تو بہتر ہے مگر صرف اخلاقی حدود کے اندر رہ کر پندو نصیحت سے۔ اور اگر وہ آمادہ نہ ہو تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اس کا آمادہ نہ ہونا ہی خلع کے لیے کافی ہے۔

(iii) خلع کے مطالبہ میں عورت کے سوا باہر کی کوئی شخصیت بھی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی کہ وہ اپنی صوابدید پر عورت کے مطالبہ کو ناجائز قرار دے۔ قانونی طور پر عورت اپنے مطالبے میں اگر طبیعت کی ناپسندیدگی کے سوا اور کوئی سبب بھی نہ پیش کر سکے تو بھی وہ حق بجانب ہے کیونکہ اس کی نفسیات کا اندازہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔

(iv) عورت کو کچھ مال بطور فدیہ دینا چاہیے اور مرد کیلئے اس کا لینا جائز ہے جب نشوز عورت کی طرف سے ہو اور اگر نشوز مرد کی طرف سے ہو تو جمہور کے نزدیک اس کا لینا درست نہیں۔ ابن عباسؓ، طاؤسؒ، عطاءؒ، حسنؒ اور دیگر تابعین و فقہاء کی یہی رائے ہے۔ امام اوزاعیؒ کا تو یہ مسلک ہے کہ اگر نشوز مرد کی طرف سے ہو تو اسے فدیہ واپس کرنا پڑے گا۔ صحابہ میں سے بعض کی یہ رائے ہے کہ مرد اپنے دیئے ہوئے سے بھی زائد لے سکتا ہے لیکن جمہور صحابہؓ کا مسلک یہی ہے کہ اسے زائد نہیں لینا چاہیے ابن جریرؒ نے علیؓ، عطاء بن رباحؒ، شعبیؒ، زھریؒ اور ابوحنیفہؒ وغیرہ کی یہی رائے نقل کی ہے۔

(v) نبی کریمؐ کے ارشاد کے مطابق اس کی حیثیت طلاق بائنہ کی ہے اور اس کی عدت طلاق کی عدت ہوگی عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، سعید ابن میسبؒ، امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی یہی رائے ہے لیکن بعض دوسرے حضرات کے نزدیک یہ ایک مستقل معاملہ ہے اس لیے اس کی عدت صرف ایک ماہ ہوگی۔ ابن عباسؓ، عثمانؓ بن عفانؓ، ابن عمرؓ، احمد بن حنبلؒ داؤد بن علی ظاہریؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

(vi) خلع کا مسئلہ براہ راست بھی عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے اور درمیان کے ہر واسطے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

......☆......

(۱۰) فتح الباری، باب الخلع، ۹/۳۲۶

4

حقوق الزوجین

حقوق حق کی جمع ہے۔علمائے لغت نے حق کے کئی معنی بیان کئے ہیں لیکن عام طور پر یہ چار معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(i) اس ذات کیلئے جو اقتضائے حکمت کے مطابق کسی چیز کی ایجاد کرے مثلاً قرآن میں ہے:

رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ (۱) اور وہ اپنے سچے مالک کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۲) یہی خدا تو تمہارا پروردگار حق ہے۔

(ii) وہ چیز جو اقتضائے حکمت کے مطابق ایجاد کی گئی ہو جیسے اللہ تعالیٰ کے افعال تخلیق۔قرآن پاک میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (۳)

وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور (کاموں کا) حساب معلوم کرو۔یہ سب کچھ اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

(iii) کسی چیز کے متعلق وہ اعتقاد رکھنا جو نفس الامر کے مطابق ہو مثلاً:

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (۴)

تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

(iv) وہ قول و فعل جو اس طرح واقع ہو جس طرح پر اس کا ہونا ضروری ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمایا:

لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۵)

لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

حق کے معنی لازم و واجب اور جائز کے بھی ہوتے ہیں اور اس سے مراد وہ ذمہ داری ہوتی ہے جو کسی اور نسبت سے ایک انسان پر عائد ہوتی ہے۔یہاں ہم حق کو جن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں وہ یہی وجوب اور لزوم کے ہیں۔یہ وجوب اخلاقی بھی ہو سکتا ہے اور قانونی بھی۔ایک اخلاقی نظام میں حق کے ساتھ کچھ اور اصطلاحیں بھی استعمال ہوتی ہیں۔

---

(۱) یونس/۳۰

(۲) یونس/۳۲

(۳) یونس/۵

(۴) البقرہ/۲۱۳

(۵) السجدہ/۱۳

مثلاً جو طرز عمل دوسروں سے متعلق ہوتا ہے وہ فریضہ یا حق کہلاتا ہے اور جو فعل انسان کی اپنی ذات کی زینت ہوتا ہے اسے فضیلت یا زینت کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں حق کے لفظ پر مشتمل بعض آیات درج ذیل ہیں:

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۶)

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

وَالَّذِيْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷)

اور جن کے مالوں میں سوالی اور بے سوال سب کا حق ہے۔

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۸)

پھر قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی یہ ان لوگوں کیلئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (۹)

اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی وغیرہ) دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی دیتے رہنا اور (مال کو) بے موقع مت اڑانا۔

احادیث میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے۔

فان لنفسك عليك حقاً	بلاشبہ تیری ذات کا تجھ پر حق ہے
ولجسدك عليك حقاً	اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے
ولا هلك عليك حقاً	اور تیرے اہل وعیال کا تجھ پر حق ہے
ولزوجك عليك حقاً (۱۰)	اور تیرے شریک زندگی کا تجھ پر حق ہے

حقوق الزوجین سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو مرد اور عورت کے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے کی صورت میں شریعت واخلاق نے ان پر عائد کی ہیں۔ مرد اور عورت کے تعلق میں بھی اسلام نے وہی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے جو اس کا خاصہ ہے یعنی اس نے جس طرح مرد کے حقوق بیان کیے ہیں اسی طرح عورت کے بھی اور جس طرح عورت کے

(۶) الذاریات/۱۹

(۷) المعارج/۲۵،۲۴

(۸) الروم/۳۸

(۹) بنی اسرائیل/۲۶

(۱۰) بخاری، کتاب النکاح، ۲/۷۸۳

فرائض کا ذکر کیا ہے اسی طرح مرد کے فرائض بھی واضح کیے ہیں۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۱)

اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں رو کے رہیں۔ اور اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کو جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں اور ان کے شوہر اگر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

مرد و عورت کے حقوق کے تعین میں تفصیلی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ ایک بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے اور وہ ہے مرد کی قوامیت۔ اسلامی معاشرے میں مرد کو منتظم کا مقام حاصل ہے اور منتظم ہونے کی حیثیت سے اسے بعض اختیارات بھی دیئے گئے ہیں لیکن ان اختیارات میں وہ مطلق العنان نہیں کہ جو چاہے کر گزرے بلکہ عدل و انصاف اور شریعت و اخلاق کے تقاضے معلوم ہیں۔ اگر وہ اپنی اس حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے تو شریعت نے ایسے ضوابط مقرر کیے ہیں جن سے ناجائز انتفاع کو روکا جا سکتا ہے۔ مرد کو قوام بنانا فطرت انسانی کی ٹھیک ترجمانی ہے اور اس کی یہ قوامیت اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کے خلاف نہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا پیش نظر رکھنا مفید ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۱۲)

مرد منتظم و نگہبان ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۱۳) اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔

بخاری کی کتاب النکاح میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

عن ابن عمرؓ عن النبی ﷺ قال: کلکم راع و کُلّکم مَسْئولٌ عَنْ رعیته والامیر راعٍ والرجل راعٍ علی اهل بیته والمَرْأة راعیةٌ عَلَیَ بیت زوجها۔ (۱۴)

---

(۱۱) البقرہ/۲۲۸

(۱۲) النساء/۳۴

(۱۳) البقرہ/۲۲۸

(۱۴) بخاری، کتاب النکاح ۲/۷۸۳

ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اپنے زیر نگرانی لوگوں کے بارے میں مسئول ہے۔ حکمران نگراں ہے۔ ایک آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے۔

مرد کی قوامیت ہی سے خاندانی نظام درست رہ سکتا ہے مرد اور عورت انسانی فضیلت اور معیار کے اعتبار سے برابر ہیں لیکن انتظامی عمل کے میدان میں مرد کو تقدم اور فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے اسلام نے مرد کی اس حیثیت کو تسلیم کر کے اس کی قوامیت کے نتیجے میں کچھ اختیارات دیئے ہیں جنہیں وہ ٹھیک عدل و انصاف اور تقویٰ و دیانت کے ساتھ استعمال کرے تو ان سے خاندانی زندگی کی تنظیم اور معاشرتی یک جہتی میں مدد ملے گی۔ یہ اختیارات محدود اور مفید ہیں کوئی انسان انہیں بے کھٹک استعمال نہیں کر سکتا۔ قرآن نے ان اختیارات کو حدود اللہ کہہ کر محدود کیا اور نبی کریم کا ارشاد ہے:

لا طَاعَةَ لِمَنْ لَمْ يُطِعِ اللهَ (۱۵) اس کی اطاعت نہیں جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔

ایک روایت میں لمن عصی اللہ کے الفاظ آئے ہیں۔ (۱۶) اسی طرح آپؐ سے منقول ہے:

لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةِ اللهِ۔ انما الطّاعة فی المعروف (۱۷)

اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں اطاعت صرف معروف میں ہے۔

قرآن نے تنظیم امور کیلئے تین مراحل بیان کئے ہیں۔

(i) نصیحت (ii) **هجر فی المضاجع** (iii) تعزیر

لیکن یہ مطلب نہیں کہ تینوں کام بیک وقت کر ڈالے جائیں (۱۸) یہ تین مرحلے ہیں جو اصلاح احوال کیلئے ناگزیر صورت حال میں اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کسی مسئلے میں مرد حق پر ہے اور عورت ضد سے مخالفت کرتی ہے تو نصیحت کے ذریعے سمجھانے کے بعد تادیب اور تعزیر بھی کی جا سکتی ہے تاکہ اطاعت اور ہم آہنگی یقینی ہو جائے۔ یہ تینوں امور سورۃ نساء کی اس آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (۱۹)

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بدماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں

---

(۱۵) مسند احمد، ۲/۲۱۲، حدیث: ۱۳۴۸

(۱۶) ابن ماجہ، کتاب الجهاد، باب لا طاعة فی معصية الله/۳۱۴؛ مسند احمد، ۱/۴۰۰

(۱۷) مسلم، کتاب الامارہ، باب وجوب طاعة الامراء/۸۲۶؛ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی الطاعة/۳۷۹

(۱۸) تفہیم القرآن، ۱/۳۵۰

(۱۹) النساء، ۳۴

میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔

قرآن کریم نے اس آیت میں نعمت اور عظمت کو بنیاد قرار دیا۔ قرآنی روح کے اعتبار سے یہ بات پسندیدہ ہے کہ پہلے مرحلہ پر ہی اصلاح ہو جائے اور اگر صورت حال بدستور کشیدہ رہتی ہے تو ضرورت و مصلحت کے تحت تادیب و تعزیر بھی دی جاسکتی ہے لیکن اس تادیب و تعزیر کی حد متعین کر دی تاکہ یہ اجازت ظلم کا باعث نہ بن جائے۔ دوسری صورت کی حد بندی ایلاء سے کر دی اور ''واضربوھن'' کو بھی محدود کر دیا۔ حضور اکرمؐ سے منقول ہے۔

واضربوهن اذا عصينكم فى المعروف ضرباً غير مبرح ولا يضرب الوجه ولا يقبح واتقوا الله فى النساء فانهن عندكم عوان ولكم عليهن ان لا يوطين فرشكم احداً تكرهونه فان فعلن فاضربوهن ضرباً غير مبرح (۲۰)

جب وہ معروف میں تمہاری نافرمانی کریں تو انہیں ہلکی مار دو اور چہرہ پر نہ مارو اور اسے برا نہ کہو۔ عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے ماتحت ہیں۔ ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ تمہارے بستر پر کسی کو نہ آنے دیں اگر ایسا کریں تو انہیں مارو لیکن یہ زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔

استوصو بالنساء خير فانهن عندكم عوان ليس تملكون منهن شيئاً غير ذلك الا ان ياتين بفاحشه مبَيِّنَة فان فعلن فاهجروهن فى المضاجع واضربوهن ضرباً غير مبرح فان اطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا (۲۱)

عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت حاصل کرو کیونکہ عورتیں تمہارے ماتحت ہیں تم اس کے سوا اور کسی شے کے مالک نہیں مگر جب وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ترک تعلق کرو اور انہیں ہلکی مار دو۔ اگر وہ اطاعت کر لیں تو ان سے کچھ نہ کہو۔

غرض مرد کی قوامیت کو چند حدود سے محدود کیا گیا ہے تاکہ ظلم نہ ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے میں مرد کی انتظامی حیثیت اور نگہبانی کا مقام متعین ہے۔ یہی حیثیت ازدواجی تعلقات کو مستحکم رکھ سکتی ہے اس پر کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ عورت کی خودسری گھریلو معاملات میں فساد کا بڑا سبب ہوتا ہے اس لیے جہاں مرد کو اسلامی حدود کا پابند کیا وہاں عورت سے مطالبہ کیا کہ وہ خیانت کا ارتکاب نہ کرے۔ اکثر اوقات عورت کا رویہ ازدواجی تعلق کی خرابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسلام مرد کو ناجائز تشدد سے روکتا ہے لیکن اس کا رعب اور وقار قائم رہنا چاہیے ورنہ توازن بگڑ جائے گا۔

---

(۲۰) الطبری، ۵/۴۳؛ خطبہ حجۃ الوداع کے سلسلے میں آنحضرتؐ سے اسی طرح کا مضمون منقول ہے؛ مسلم کتاب الحج، باب حجۃ النبی/ ۵۱۵؛ ابوداؤد، کتاب المناسک، باب صفۃ حج النبیؐ / ۲۷۹؛ ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورہ التوبہ/ ۶۹۲؛ ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق المرأة على الزواج / ۲۶۵؛ مسند احمد، ۵/۷۳

(۲۱) ابن ماجہ، ۱/۱۴۴

شوہر کے حقوق

قرآن وسنت نے ازدواجی زندگی کی استواری کیلئے مرد اور عورت کے حقوق کا تعین کر دیا ہے تا کہ ان کی رعایت سے معاشرتی نظم برقرار رہے۔ مرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ایک فریق کے حقوق دوسرے کے فرائض بن جاتے ہیں۔ عورت کے حقوق وہ ہیں جو مرد کے فرائض ہیں اور مرد کے حقوق سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جن کا بجالانا عورت کے لیے ضروری ہیں مثلاً: عورت کی ذمہ داریوں میں مندرجہ ذیل اہم ہیں:

(i) اطاعت (ii) حفظ غیب (iii) عدت (iv) سوگ

اطاعت

قرآن وسنت نے عورت کیلئے لازم قرار دیا کہ وہ شوہر کی اطاعت کرے یہ اطاعت قرآن وسنت کی نصوص سے واضح ہے۔ قرآن وسنت نے اچھی خواتین کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان میں اطاعت سرفہرست ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (۲۲)

تو جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں بحفاظت الٰہی (مال و آبرو) کی حفاظت کرتی ہیں۔

نبی کریمؐ نے اس آیت کی تفصیلی تشریح یوں فرمائی ہے۔

قال النبی ﷺ اذا خرجت المرأہ من بیتها و زوجها کارہ لعنها کل ملك فی السماء و کل شیء مرت به غیر الجن والانس حتی ترجع (۲۳) و فی روایة اذا خرجت المرأة من بیت زوجها لعنها کل شئی طلعت علیه الشمس والقمر إلا ان یرضی عنها زوجها

نبیؐ فرماتے ہیں کہ جب عورت اپنے گھر سے نکلتی ہے اور اس کا خاوند ناپسند کرتا ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت کرتا ہے اور جن وانس کے سوا ہر شے بھی جس کے پاس سے وہ گزرتی ہے حتیٰ کہ وہ لوٹ آئے

عن ابی هریرةؓ عن النبی ﷺ قال: لاتسافرا مرأة مسیرة یوم ولیلة الا و معها ذو محرم (۲۴)

---

(۲۲) النساء، ۳۴۔

(۲۳) الترغیب والترہیب ۲/ ۳۹۔ یہی مضمون مختلف روایات میں بیان ہوا ہے۔ البیہقی، سنن الکبریٰ باب ماجاء فی بیان حقہ علیہا، ۷/ ۲۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ ۳/ ۵۰۸، مسند الطیالسی ۱/ ۲۶۳، حدیث ۱۹۵۱

(۲۴) الفوائد المجموعہ، ۱/ ۱۳۲۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی مسلمان عورت کیلئے جائز نہیں کہ ایک رات کا سفر کرے الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم آدمی ہو۔

عن انسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ :المراۃ اذا صلت خمسھا وصامت شھرھا واحصنت فرجھا و اطاعت بعلھا فتدخل من ای باب الجنۃ (۲۵)

انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت جب پانچوں نمازیں پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی آبرو کی حفاظت کرے، اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے تو جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

عن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لوکنت آمر احداً ان یسجد لأ حد لامرت المراۃ ان تسجد لزوجھا (۲۶)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

عن ام سلمۃ قالت: قال رسول اللہ ﷺ: ایما امرأۃ ماتت و زوجھا عنھا راض دخلت الجنۃ (۲۷)

ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر وہ عورت جو اس حال میں فوت ہو کہ اس کا خاوند اس سے راضی ہو تو جنت میں داخل ہو گی۔

قرآن وسنت نے اس اطاعت کو مشروط کر دیا ہے اور اس کو غیر محدود نہیں چھوڑا۔ بخاری نے کتاب الاحکام میں حضور اکرم ﷺ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

عن عبداللہ بن عمر عن النبی ﷺ قال: السمع والطاعۃ علی المرء المُسلم فیما أَحَب وَکَرِہ مالم یُومَرُ بمَعْصیَۃٍ فاذا أُمِرُ بمَعْصیۃٍ فلا سَمْعَ وَلَا طَاعۃ۔ (۲۸)

عبداللہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: سمع وطاعت ہر مسلمان فرد پر لازم ہے خواہ پسندیدہ امر ہو یا ناپسندیدہ الا یہ کہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو کوئی سمع وطاعت نہیں۔

لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف(۲۹) معصیت میں اطاعت نہیں اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔

---

(۲۵) ترمذی، ابواب الرضاع، ۱/۱۳۹۔

(۲۶) ترمذی، ابواب الرضاع، ۱/۱۳۸۔

(۲۷) ترمذی، ابواب الرضاع، ۱/۱۳۸۔

(۲۸) ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الطاعۃ/ ۳۷۹؛ الفاظ کی معمولی سے تقدیم، تاخیر سے ساتھ مسلم نے بھی نقل کیا ہے۔ کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء/ ۸۲۶

(۲۹) ایضاً

مطلب یہ ہے کہ مرد کی ایسی اطاعت جو دین و اخلاق کی حدود کے خلاف ہو ضروری نہیں بلکہ ایسے میں اس کی اطاعت سے انکار کر دینا زیادہ دینی اور اخلاقی بات ہوگی۔

حفظ غیب

حفظ غیب سے مراد بقول سید ابو اعلیٰ مودودیؒ "اس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس ہے" اس میں اس کے نسب کی حفاظت کرنا، اس کی آبرو کی حفاظت کرنا، اس کے مال کی حفاظت اور اس کے رازوں کی حفاظت غرض سب کچھ ہی آ جاتا ہے۔ قرآن کی آیت حفظ غیب کا واضح ذکر کرتی ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ (۳۰)

تو جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کے کہنے پر چلتی ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں مال و آبرو کی نگہداشت کرتی ہیں۔

نبی کریمؐ کے ارشادات سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے

عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ قال: اربع من اعطی فقداوتی خیر الدنیا قلب شاکر ولسان ذاکرٌ و بدن علی البلاء صابر و زوجة لا تبعه خوف فی نفسها و لا فی ماله (۳۱)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں ہیں جس کو وہ عطا ہوں اسے دنیا و آخرت کی بھلائی مل گئی شکرگزار دل، ذکر الٰہی کرنے والی زبان، مصیبتوں پر صبر کرنے والا جسم اور ایسی بیوی جس کے بارے میں اسے یہ خوف نہ ہو کہ وہ اپنی ذات اور اس کے مال میں خیانت کرے گی۔

جہاں تک گھر کے مال کا تعلق ہے اس میں ان چیزوں کو چھوڑ کر جو بالکل عورت کی ملکیت ہیں دوسرے مال پر خاوند کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ناپسندیدہ ہے آنجناب ﷺ نے فرمایا:

لا تصدق بشیء من بیته الا باذنه فان فعلت فان له الاجر و علیها الوزر و لا تخرج من بیته الّا باذنه (۳۲) و فی روایة: لعنتها ملائکة الله

اسے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے صدقہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرے تو خاوند کے لیے اجر ہوگا اور اس پر بوجھ اور خاوند کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر نہ نکلے۔ ایک روایت کے مطابق اللہ کے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔

المراة راعیه علی بیت زوجها وهی مسئولة (۳۳)

---

(۳۰) النساء/۳۴

(۳۱) طبرانی، ۱۱/۱۳۴

(۳۲) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب النکاح ۴/۳۰۴

(۳۳) بخاری، کتاب النکاح ۲/۷۸۳

عورت اپنے خاوند کے گھر پر نگران ہے اور جوابدہ ہے۔

عن ابی ھریرةؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ای نساء خیر؟ قال: التی تسرہ اذا نظر وتطیعہ اذا امر ولا تخالفہ فی نفسھا ولا مالھا بما یکرہ (۳۴)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا: کون سی عورت بہتر ہے؟ فرمایا: وہ جب اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ اسے خوش کرے اور جب اسے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور اپنی ذات اور شوہر کے مال کے بارے میں ایسی بات نہ کرے جو اسے ناپسند ہو۔

حفظ غیب میں عورت کی گھر سے وابستگی بھی آتی ہے۔ اس پر خاندان کی تنظیم وترتیب کا دارومدار ہے اس لیے اس کا اولین دائرہ عمل خاندان ہی متعین کیا گیا ہے اور ان لوگوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے جو اس دائرے کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔

عن ابی ھریر ة قال: قال رسول اللہ ﷺ: منَ خَبَّبَ خادماً علی اھلھا فلیس منا و من افسد امرء ة علی زوجھا فلیس منا۔(۳۵)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: جس کسی نے خادم کو اس کے گھر والوں سے برگشتہ کیا وہ ہم میں سے نہیں اور جس نے کسی عورت کو اپنے خاوند سے باغی کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

عن ابی ھریرةؓقال: قال رسو ل اللہ ﷺ: لیس منا من خبث امراة علی زوجھا او عبداً علی سیدہ(۳٦)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو خاوند سے ورغلائے اور غلام کو مالک کے خلاف بدراہ کرے۔

ان ارشادات سے اطاعت اور حفظ غیب کو مستحکم کرنا مقصود ہے۔ حفظ غیب کے استحکام کیلئے رسول اللہ ﷺ نے کچھ ایسے امور بھی بتائے ہیں جن سے عورت کے دائرہ عمل کے خارجہ پہلو کو محدود کرنا مطلوب ہے۔ مثلاً

(i) عورت پر نماز جمعہ فرض نہیں۔(۳۷)

(ii) جنازوں میں اس کی شرکت ضروری نہیں۔(۳۸)

(iii) باجماعت نماز اور مسجدوں کی حاضری بھی اس کے لیے لازمی نہیں گو بعض پابندیوں کے ساتھ اس کی اجازت ہے۔

---

(۳۴) نسائی، کتاب النکاح باب ای النساء خیر، ۲/۷۱

(۳۵) مسند احمد، ۲/۳۹۷

(۳٦) سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، ۱/۲۹٦

(۳۷) ابوداؤد، کتاب الصلوة باب الجمعہ للمملوک والمرأة ۱/ ۲۷۳

(۳۸) ابوداؤد، کتاب الجنائز، باب اتباع النساء الجنائز/ ۲۷۳۳

(iv) اس کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں۔(۳۹)

نماز کے متعلق حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے

صلاۃ المرأۃ فی بیتھا افضل من صلاتھا فی حُجرتھا و صلاتھا فی مخدعھا افضل من صلاتھا فی بیتھا(۴۰)

عورت کی اپنے گھر میں نماز اس نماز سے بہتر ہے جو وہ صحن میں پڑھے اور اس کی وہ نماز جو اندرونی کمرے میں پڑھے اس سے بہتر ہے جو اپنے گھر میں پڑھے۔

اس اعتبار سے عورت کی بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ گھر کی تنظیم، بچوں کی تربیت اور خاندان کے وقار کی حفاظت کرے۔ عورت اگر ان ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے تو خاندانی نظم تباہ ہو جائے گا اور انفرادیت کی وحشت پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

مرد کے حقوق میں یہی دو چیزیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کو میں نے بیان کر دیا گو عدت اور سوگ کی حیثیت بھی اہم ہے۔ مگر اس کی تفصیل ضروری نہیں عدت سے مراد وہ وقفہ ہے جو اسے طلاق یا خاوند کی وفات کے بعد گزارنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ خاوند کی وفات کے بعد ایک مدت تک اپنے آپ کو خوشیوں سے دور رکھے۔

بیوی کے حقوق

بیوی کے حقوق سے مراد وہ امور ہیں جن کا ملحوظ خاطر رکھنا مرد کیلئے ضروری ہے۔ بیوی کے حقوق کے سلسلے میں بقول سید مودودیؒ تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔(۴۱)

(i) ایک یہ کہ جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیئے گئے ہیں مرد ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ظلم نہ کرے اور ایسا نہ ہو کہ تابع و متبوع کا تعلق عملاً باندی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

(ii) دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظام معاشرت کی حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیر تمدن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر طریق پر سرانجام دے سکے۔

(iii) تیسرے یہ کہ عورت کیلئے ترقی اور کامیابی کے بلند سے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو، مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے اور نہ مردانہ زندگی گزارنے کیلئے اس کو تیار کرنا

---

(۳۹) ترمذی، مع شرح ابن عربی، باب ما جاء ان تسافر امرأۃ وحدہ، ۱۱۷/۵

(۴۰) ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب التشدید فی ذلک، ۱۵۶/۱

(۴۱) پردہ/۲۷۱

اس کے لئے اور تمدن کے لئے مفید ہے اور مردانہ زندگی میں وہ بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ان امور کی رعایت سے اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں ان کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔قرآن وسنت کے مطالعہ سے ہمیں عورت کے کم از کم مندرجہ ذیل حقوق معلوم ہوتے ہیں۔

(i) وراثت (ii) مہر

(iii) نفقہ (iv) حسن سلوک

(v) خلع (vi) خیار فسخ

(vii) مفقود الخبر شوہر سے انقطاع

(viii) نئے شوہر کے انتخاب میں آزادی

زیادہ سہولت کے لئے ہم انہیں دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(i) معاشی حقوق

(ii) تمدنی حقوق

(i) معاشی حقوق

حقوق کی مندرجہ بالا فہرست کے پہلے تین حقوق کو ہم معاشی کہہ سکتے ہیں۔اسلام نے مختلف طریقوں سے عورت کی معاشی حیثیت کو مستحکم کیا ہے تاکہ وہ بالکل ہی دست نگر نہ بن جائے۔وراثت میں وہ باپ سے، بیٹے سے، شوہر سے اور بعض اوقات دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔اس کے ساتھ مہر اور نفقہ کی ذمہ داری بھی اسلام نے مرد پر ڈال کر عورت کی حیثیت کو مضبوط بنایا ہے۔مہر اور نفقہ دو لازمی حقوق ہیں جن سے گریز کرنا مرد کیلئے ممکن ہی نہیں۔قرآن وسنت کی مندرجہ ذیل نصوص میں انہیں بیان کیا گیا ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا (۴۲)

اور تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو ہاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر کا کوئی جزء تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوش گوار سمجھ کر۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا (۴۳)

---

(۴۲) النساء/۴

(۴۳) النساء/۲۴

اوران عورتوں کے سوااور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے چاہے اس طرح کہ تم بیوی بناؤ صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو۔ پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے منقطع ہوئے ہو تو ان کو ان کے مہر دو جو کچھ مقدر ہو چکے ہیں اور مقدر ہوئے۔ بعد میں بھی جس پر تم باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں بڑے حکمت والے ہیں۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ٥(۴۴)

آج تمہارے لیے حلال چیزیں رکھی گئیں اور جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں اور پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں جب کہ ان کو ان کا معاوضہ دے دو اسی طرح کہ تم بیوی بناؤ نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا۔ تو اس شخص کا عمل غارت جائے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُ وا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ(۴۵)

جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں (کے پاس جانے) سے ان کیلئے چار مہینے تک کی مہلت ہے سو اگر یہ لوگ (قسم توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر لیں تب تو اللہ تعالیٰ معاف کریں گے رحمت فرمائیں گے۔

عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ(۴۶) وسعت والے پر اسکی حیثیت کا اور تنگدست پر اس اسکی حیثیت کا۔

احادیث

عن ابی سلمة قال: سالت عائشةؓ کم کانت صداق النبی ﷺ؟ قالت: کانت صداقه لازواجه ثنتی عشرة اوقیة ونش. قالت: اتدری ما النش ؟ قلت: لا۔ قالت: نصف اوقیة فتلك خمس مائة درهم (۴۷)

ابو سلمہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی ﷺ کا اپنی بیوی کے لیے مہر کتنا تھا؟ انہوں نے فرمایا: کہ آپ

(۴۴) المائدہ/۵

(۴۵) البقرہ/۲۲۶

(۴۶) البقرہ/۲۳۶

(۴۷) شرح السنۃ ۹/۱۲۳

کا مہر اپنی بیویوں کیلئے بارہ اوقیہ اور ایک نش تھا۔ پھر حضرت عائشہؓ نے کہا نش کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نصف اوقیہ اور سب ملا کر پانچ سو درہم ہوئے۔

عن عمر ابن الخطابؓ قال: ألا لا تغالوا صدقة النساء فانّها لو كانت مكرمة فى الدنيا و تقوى عند الله لكان اولكم بها نبى الله۔ ما عملت رسو ل الله نكح شيئًا من نسائه و لا نكح شيئًا من بناته على اكثر من اثنتى عشرة اوقيه (۴۸)

عمر ابن الخطابؓ کہتے ہیں: خبردار عورتوں کا مہر زیادہ نہ باندھو اگر زیادہ مہر باندھنا دنیا میں عظمت کا سبب اور اللہ کے ہاں تقویٰ کا باعث ہوتا تو اللہ کے نبیؐ اس کے زیادہ حق دار تھے۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بیوی اور بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ رکھا ہو۔

من تزوج امراة وهو ينوى ان لا يعطيها الصداق لقيه الله عزوجل وهو زان (۴۹). وفى رواية مَنْ تزوج امرأة بصداق ينوى ان لا يوديها فهو زان ومن ادان ديناً ينوى ان لا يقضيه فهو سارق۔

جس نے عورت سے ایک مہر پر شادی کی اس ارادے سے کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا وہ زانی ہے اور جس نے قرض لیا اس نیت سے کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا وہ چور ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے ایک مہر پر شادی کی اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ ادا نہیں کرے گا تو وہ زنا کار ہے اور جو اس نیت سے قرض لیتا ہے کہ ادا نہیں کرے گا وہ چور ہے۔

عن حكيم بن معاوية عن ابيه ان رجلاسال النبى ﷺ ماحق امرأة على الزوج؟ قال: ان يطعمها اذا طعم وان يكسوها اذا اكتسى ولا يضرب الوجه ولا يقبح ولا يهجر إلا فى البيت.(۵۰)

حکیمؒ بن معاویہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا: جب تو کھائے تو اسے کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے پہنائے اور اس کے منہ پر نہ مارے اور اسے برا نہ کہے اور گھر کے سوا اس سے علیحدگی نہ اختیار کرے۔

ان آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر اور نفقہ مرد کے ذمہ ہے جو اسے ہر صورت ادا کرنا چاہیئے یہ درست ہے کہ مہر اور نفقہ میں سے مرد کی حیثیت کو سامنے رکھا جائے گا وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر کوئی چیز دینے پر مجبور نہیں ہے۔

---

(۴۸) ترمذی، ابواب النکاح، ۱/۱۳۲

(۴۹) کنز العمال، ۱۶/۳۲۳

(۵۰) ابن ماجہ ابواب النکاح، ۱/۱۳۴

کتب حدیث کے باب عشرۃ النساء میں وہ واقعہ مذکور ہے جس کے مطابق ازواج مطہرات نے آپؐ سے دنیوی زندگی کی چیزیں طلب کی تھیں تو اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک ترک تعلق کر لیا تھا اور ابو بکرؓ اور عمرؓ نے اپنی صاحبزادیوں کو دھمکایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔ اس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ مرد اپنی بساط سے زیادہ دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ مہر میں اعتدال پسندیدہ امر ہے لیکن مہر ایک حقیقت ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فقہاء نے کہا ہے کہ اگر نکاح میں مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بھی مہر مثل ضرور لازم آئے گا کیونکہ اس کے بغیر نکاح وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے معاشی حقوق کو اتنی اہمیت دی ہے کہ نفقہ اور سکنیٰ نہ ملنے کی صورت میں عورت طلاق لینے کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ ان حقوق کے علاوہ جتنے حقوق ہیں ہم انہیں تمدنی حقوق کہہ سکتے ہیں۔

(ii) تمدنی حقوق

تمدنی حقوق کی وسعت ان تمام امور پر حاوی ہے جو مرد اور عورت کے معاشرتی تعلق میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان حقوق میں سب سے اہم حسن سلوک ہے۔ مرد اپنے اختیارات اور طبعی فوقیت کی وجہ سے ظلم کرنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ اسے ظلم سے باز رکھنا اور حسن معاشرت پر قائم رکھنا خاندانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ قرآن و سنت نے اس اہم خانگی ضرورت کو اہم نصوص کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۵۱) اور ان کے ساتھ اچھی طرح رہو سہو۔

نبی کریم ﷺ نے تو اس حسن سلوک کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دیکھئے مندرجہ ذیل احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہیں۔

عن عائشةؓ قالت: قال رسول الله ﷺ: خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي (۵۲)

عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہوں۔

عن عائشةؓ قالت: قال رسول الله ﷺ: إن من اكمل المئومنين إيماناً احسنهم خلقاً والطفهم بأهله (۵۳)

عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مؤمنین میں سے زیادہ کامل وہ ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر اور گھر والوں سے بہتر اور گھر والوں کے ساتھ سب سے زیادہ مہربان ہو۔

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: أكمل المومنين ايمانا احسنهم خلقا وخياركم

---

(۵۱) النساء: ۱۹

(۵۲) ترمذی، ۵/۷۰۹

(۵۳) شرح السنۃ، ۹/۱۸۰

خیارکم لنسائهم (۵۴)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومنوں میں کامل ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ حسن اخلاق والا ہے اور تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے بہتر ہے۔

اس حسن سلوک کو نبی کریم ﷺ نے عملی زندگی کی ایک عمدہ تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عن أبی ھریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: استوصوا بالنساء خیراً فإنھن خلقن من ضلع وإن اعوج شیء فی الضلع أعلاه فان ذھبت تقیمه کسرته وإن ترکته لم یزل اعوج فاستوصوا بالنساء خیراً (۵۵)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی چیز اس کے اوپر کا حصہ ہے۔ اگر تو اسے سیدھا کرنے لگے گا تو اسے توڑ دے گا اور اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دے گا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھا ہی رہے گا۔

وعن أبی ھریرةؓ عن البنی ﷺ قال: من کان یومن بالله والیوم الاخر فاذا شَھِد امراً فلیتکلم بخیر اویسکت واستو صوا بالنساء خیرا فان المرأة خلقت من ضلع وان اعوج شیی فی ضلع اعلاه و ان ذھبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج؛ استوصوا بالنساء (۵۶)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، جب کوئی واقعہ دیکھے تو اسے اچھی بات کہنی چاہئے یا خاموشی اختیار کرے۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی کا رویہ اختیار کرو اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں زیادہ بڑھا ہوا حصہ اوپر والا ہے۔ اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے عورتوں سے بھلائی اختیار کرو۔

عن ابی ھریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: المرأة خلقت من ضلع لن تستقیم لك علی طریقة فان استمتعت بھا اسْتَمْتَعْتَ بھا و بھا عوج وان ذھبت تقیمھا کسرتھا وکسر ھا الطلاق.(۵۷)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ وہ تیرے لیے ایک راہ پر سیدھی نہیں رہے گی اگر تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسی حالت میں اٹھا۔ اگر تو اس کو سیدھا کرنا چاہے گا تو اس کو توڑ دے گا اور اس کو توڑنا طلاق ہے۔

---

(۵۴) ترمذی، ابواب الرضاع، ۱/۱۳۸

(۵۵) بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاة بالنساء، ۲/۷۷۹

(۵۶) مسلم، باب الوصیة بالنساء، ۱/۴۷۵

(۵۷) مسند احمد، ۵/۸: الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ بخاری و مسلم نے بھی نقل کی ہے۔ بخاری، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم/۵۵۴۔ مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء/۶۲۶

واقعہ یہ ہے کہ حضورﷺ نے بعض خواتین کی شکایت پر عورتوں کو مارنے سے روک دیا تھا اس پر عمرؓ نے آنحضرتﷺ سے عرض کیا کہ عورتیں سر چڑھ گئی ہیں تو حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اعتدال کی راہ اختیار کرو کیونکہ انتہا پسندی میں معاشرتی نقصانات کا اندیشہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے عورت کی فطرت اور طبیعت کو ٹیڑھی پسلی سے تشبیہ دی ہے۔ استعارہ کی زبان میں اس طرح بیان کیا گیا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جو عورت کی فطرت میں ہیں اور انہیں اس کی فطرت سے نکالنا ظلم بھی ہے اور ناممکن بھی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ خالق نے اسے اسی طرح بنایا ہے اس لیے ربط و تعلق میں اس حقیقت کو سامنے رہنا چاہیے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان احادیث پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

''حضورﷺ ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی اور حسیات کی نزاکت اور انتہاء پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اسے پیدا کیا اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اسے اس فطرت پر قائم رکھ کر ہی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے۔'' (۵۸)

آزادی

حسن سلوک کے بعد سب سے بڑا حق عورت کی آزادی ہے۔ شوہر کے انتخاب میں اور شوہر کے ساتھ رہنے میں شریعت نے اسے اختیار دیا ہے۔ انتخاب میں اس کی رائے کا احترام کیا ہے اور رفاقت میں اس کے جذبات کو پیش نظر رکھا ہے۔ گو انتخاب میں بالکل آزادی نہیں ہے تاہم یہ آزادی عام معاشرتی رجحانات سے کہیں بلند ہے۔ عرب معاشرے میں کم سن لڑکیوں کی شادی کا رواج تھا۔ اسلام نے اس کی اصلاح یوں کی کہ اسے خیار بلوغ کا حق دیا۔ شوہر کے عیوب اور طبیعت کی ناپسندیدگی پر اسے اختیار دیا کہ وہ حکمین کے ذریعے یا عدالت کے واسطے سے فسخ نکاح کا فیصلہ لے سکتی ہے۔ طلاق اور بیوگی کی صورت میں اسے نکاح ثانی کا مکمل اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا خیال رکھا گیا اور اس میں اسلامی قانون عورت کو مرد کے برابر تسلیم کرتا ہے، بلکہ اکثر اوقات اسلامی معاشرے کی اجتماعی غیرت' عورت کے جان و مال کے تحفظ کو مرد کی جان و مال سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے۔ اسلام نے عورت کو معاشی اور تمدنی حقوق دے کر اس کی حیثیت کو محفوظ کر دیا ہے تاکہ معاشرے میں اس کی عزت اور وقار بھی رہے اور اس پر ظلم اور دست درازی بھی نہ ہو سکے۔ اسلام میں آزادی کا وہ تصور نہیں ہے جسے مغرب کی آزادی نسواں اور نسائیت کی تحریکوں نے پیش کیا ہے اور جسے عالم اسلام کی متبرجات لے کر چل رہی ہیں۔ اس بے لگام آزادی نے مغرب کے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے اور ہمارے ہاں بھی یہی کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ ارباب اختیار کی ملی بھگت سے بعض ناپسندیدہ فیصلے ہو رہے ہیں جن کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

......☆......

(۵۸) پردہ/۲۸۱۔۲۸۲

حقوقِ والدین

اسلام اپنے معاشرتی نظام میں خاندان کو بنیادی اکائی قرار دیتا ہے۔ اس خاندان کا ایک مظہر والدین کا وجود ہے۔ ماں باپ کے بغیر کوئی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکتا۔ ماں باپ کی بقا پر معاشرے کی بقا کا انحصار ہے۔ عورت اور مرد کا سب سے اچھا روپ ماں اور باپ کا ہے۔ یہ روپ خدا کی رحمت اور اس کے انتظام کا عکس ہے۔ معاشرتی زندگی میں چونکہ اولین چیز ایثار ہے اور کوئی معاشرہ بھی ایثار کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا والدین اس ایثار کا کامل نمونہ ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ معاشرتی تربیت کے لیے ایثار ضروری ہے اور اس ایثار کے لیے والدین کا وجود نا قابل انکار حقیقت ہے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی والدین کی عظیم حیثیت مسلّم رہی ہے۔ بلکہ بعض انسانی معاشروں میں تو آباؤ اجداد کی پرستش بھی کی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بعد اس کائنات میں اولین حیثیت والدین کو ہے۔ انسانی رشتوں کی بنیاد یہی ہے اور خدا کی صفت رحمت اور انتظام کا پرتو بھی یہی ہے۔ عہد نامہ عتیق کے باب خروج میں یہ لکھا ہے:

''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو''۔(۱)

کتاب احبار میں ہے: ''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا ہے''(۲)۔ والدین کی نافرمانی کو بائیبل ایک جرم قرار دیتی ہے اور اس پر سزا تجویز کرتی ہے۔ کتاب احبار میں یہ الفاظ قانون کی حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں:

''اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا جس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی کے سر پر ہے(۳)۔''

کتاب خروج میں ہے: ''اور جو اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا(۴)۔''

عہد نامہ جدید میں بھی اس قسم کی عبارتیں پائی جاتی ہیں مثلاً: ''خدا نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں اور باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے گا پھر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔''(۵)

اس ٹکڑے میں جناب مسیحؑ کی تنقید بنی اسرائیل کے طرز عمل پر ہے کہ انہوں نے والدین کی اطاعت سے جان

(۱) بائیبل، خروج/۲۰

(۲) احبار، ۱۹/۳

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً، ۲۰/۹

(۵) متی، ۱۵/۴

چھڑانے کے حیلے تراشنے شروع کئے ہے۔

والدین کی اہمیت

قرآن وسنت نے والدین کے مسئلہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اس کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

قرآن سب سے پہلے حقوق کی ترتیب متعین کرتا ہے پھر اس کی تفصیل بیان کرتا ہے اس ترتیب میں والدین سرفہرست ہیں۔ قرآن مجید نے اس ترتیب کو اس طرح بیان کیا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (٦)

اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں کے ساتھ بھی اور پاس رہنے والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں شیخی کی باتیں کرتے ہوں۔

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (٧)

لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں؟ آپؐ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو تو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نیک کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔ (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىْ صَغِيْرًا ۝ (٨)

اور تیرے رب نے حکم کر دیا کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک

(٦) النساء/٣٦

(٧) البقرہ/٢١٥

(٨) بنی اسرائیل ٢٣-٢٤

کیا کرو اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ہی ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمایئے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے۔

مختلف احادیث میں نبی کریم ﷺ نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے۔

عن أبی هريرة قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول من سره ان يبسط له في رزقه وان ينسئا له فی اثره فليصل رحمه.(۹)

ابو ہریرہؓ سے (روایت ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کی اجل میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے۔

عن أبی هريرةؓ عن البنی ﷺ قال: الرحم شجنة من الرحمن فقال الله من وصلك وصلته ومن قطعك قطعته (۱۰)

ابو ہریرہؓ نبیؐ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: رحم رحمٰن کا حصہ ہے سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے تجھے جوڑا میں اسے جوڑوں گا جس نے تمہیں توڑا اسے میں قطع کروں گا۔

عن عبد الرحمن بن عوفؓ قال: قال رسول الله ﷺ: قال الله تعالى: أنا الله وانا الرحمن. خلقت الرحم وشققت لها اسم من اسمی فمن وصلها وصلته ومن قطعها بَتَتُّه (۱۱)

عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا (کہ) میں رحمان ہوں۔ میں نے رحم (نسبی رشتہ) پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام نکالا ہے جس نے اسے پیوستہ رکھا میں نے اس کو پیوستہ رکھا اور جس نے اسے کاٹ دیا میں نے اسے الگ کر ڈالا۔

قرآن نے انبیاء کے سلسلے میں والدین کی حیثیت کو بیان کیا ہے نیز مطلق احکام کی صورت میں بھی والدین کو توحید کے بعد سب سے اونچا درجہ دیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا(۱۲)

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ تعالیٰ کے

---

(۹) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۵

(۱۰) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۵

(۱۱) مشکاۃ، کتاب الآداب، باب للبر والصلہ/۴۲۰

(۱۲) البقرہ/۸۳

اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۳)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کی کوئی دلیل تیرے پاس نہیں تو تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے۔ پھر میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلا دوں گا۔

قرآن مجید نے والدین سے حسن سلوک کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے نہ صرف حکم الٰہی بیان کیا ہے بلکہ حسن سلوک کے لیے عقلی دلیل بھی مہیا کی ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ० وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (۱۴)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میرے اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کچھ کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا ہے) یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے اے میرے پروردگار مجھ کو اس

---

(۱۳) العنکبوت/ ۸

(۱۴) لقمان/ ۱۴۔۱۵

(۱۵) الاحقاف/ ۱۵

پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی نعمتوں کا شکریہ کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے لیے صلاحیت پیدا کر دیجئے۔ میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا○ ...... قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُلَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا○......(۱۶)

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا (قصہ) ذکر کیجئے وہ بڑے راستی والے پیغمبر تھے۔ جب کہ انہوں نے اپنے باپ سے (جو کہ مشرک تھا) کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو کچھ سنے نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے ...... ابراہیمؑ نے کہا میرا اسلام لو اب میں تمہارے لیے اپنے رب سے مغفرت کی درخواست کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔

یحییٰؑ کی صفات بیان کرتے ہوئے والدین کے ساتھ ان کے حسن سلوک کا خصوصی ذکر کیا:

وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا(۱۷)

اور وہ اپنے والدین کے خدمت گزار تھے اور (خلق کے ساتھ) سرکشی کرنے والے (یا حق تعالیٰ کی) نافرمانی کرنے والے نہ تھے۔

مسیحؑ نے اپنے بچپن میں جو گفتگو کی تھی اس میں بھی والدہ کے حسن سلوک کا خاص تذکرہ ہے۔

وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا○ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا(۱۸)

اور مجھ کو برکت والا بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا جب تک میں دنیا میں زندہ ہوں اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا اور مجھ کو سرکش بد بخت نہیں بنایا۔

احادیث

احادیث میں صلہ رحمی اور حسن سلوک کے بارے میں مفصل احکامات موجود ہیں۔

عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: رغم انفه رغم انفه رغم انفه قیل من یا رسول الله؟

---

(۱۶) مریم/۴۱-۴۷

(۱۷) مریم/۱۴

(۱۸) مریم/۳۱-۳۲

قال من ادرك والديه عند الكبر احدهما او كلاهما ثم لم يد خل الجنة (۱۹)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا (کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کی ناک خاک آلود ہوئی اس کی ناک خاک آلود ہوئی اس کی ناک خاک آلود ہوئی عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کس کی؟ فرمایا جس نے ماں باپ میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے میں پایا (اور) پھر جنت میں داخل نہ ہوا۔

عن اسماء بنت ابی بکرؓ قالت: قدمت علی امی وھی مشركة فی عهد قريش (حديبيه) فَقُلْتُ يا رسول الله! إن أمي قدمت علی وھی راغبة أفأصلها قال نعم صليها(۲۰)

اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں کہ قریش کے معاہدہ کے دوران میری ماں جو اس وقت مشرکہ تھی میرے پاس آئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں میرے پاس آئی ہے۔ اور وہ کچھ خواہش رکھتی ہے کیا میں اس سے مہربانی کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس سے مہربانی کر۔

عن المغيرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: إن الله حَرَّم عليكم عقوق الأمهات وَ وَأد البنات(۲۱)

مغیرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے یقیناً تم پر حرام ٹھہرائی ہے ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ گاڑنا۔

عن عبدالله بن عمروؓ قال: قال البنی ﷺ إن مِن اكبرا لكبائر ان يلعن الرجل والديه قال يسب ابا الرجل فيسب اباه ويسب امه فيسب امه۔ (۲۲)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین پر لعنت بھیجے۔ فرمایا کہ ایک شخص کسی آدمی کے والد کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے والد کو گالی دیتا ہے، وہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

عن عبدالله بن عمرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من الكبائر شتم الرجل والديه. قالوا يارسول الله! هل يشتم الرجل والديه؟ قال نعم! يسب ابا الرجل فيسب اباه و يسب امه فيسب امه۔ (۲۳)

---

(۱۹) مسلم، ابواب البر والصلۃ، ۳۱۴/۲

(۲۰) بخاری، کتاب الادب، ۸۸۴/۲

(۲۱) ایضاً

(۲۲) ایضاً، کتاب الادب، ۸۸۳/۲

(۲۳) مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر واکبرھا/ ۵۴، مسند احمد ۱۶۴/۲؛ ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی عقوق الوالدین/ ۴۴۴

عبداللہ بن عمرؓ سے (روایت ہے) کہا (کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی کا اپنے والدین کو برا کہنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ (صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ کیا کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو برا کہتا ہے؟ فرمایا ہاں وہ کسی کے باپ کو برا کہتا ہے تو وہ اس کے باپ کو برا کہتا ہے اور وہ اس کی ماں کو برا کہتا ہے تو وہ (جواباً) اس کی ماں کو برا کہتا ہے۔

عن جبیر بن مطعمؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا یدخل الجنة قاطع (۲۴)

جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی قرابت شکن جنت میں نہیں جائے گا۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: رضی الرب فی رضی الوالد وسخط الرب فی سخط الوالد (۲۵)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب کی رضا والد کی رضا میں ہے اور رب کی خفگی والد کی خفگی میں ہے۔

عن أبی بکرةؓ عن البنی ﷺ قال: ما من ذنب احری ان یعجل اللہ لصاحبه العقوبة فی الدنیا مع مایدخرله فی الا خرة من البغی وقطیعة الرحم (۲۶)

ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی گناہ بدکاری اور قطع رحمی سے زیادہ اس چیز کا مستحق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں جلدی سزا دے مع اس کے جو آخرت میں اس کے لیے مقدر ہے۔

عن ابی بکرةؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: کل الذنوب یغفراللہ منه ماشاء الا عقوق الوالدین فانه یجعل لصاحبه فی الحیاة قبل الممات. (۲۷)

ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ چاہے تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے سوائے والدین کی نافرمانی کے۔ وہ اس کے مرتکب کے لیے مرنے سے پہلے (زندگی ہی) میں (سزائیں) جلدی کر دیتا ہے۔

عن عبه اللہ ابن عمرؓ أن البنی ﷺ قال: اَبَرالبر أن یَصِلَ الرَّجُل وُدَّابیه (۲۸)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی باپ سے محبت رکھنے والوں سے اس کے چلے جانے کے بعد تعلق رکھنا ہے۔

---

(۲۴) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۵

(۲۵) سنن ترمذی، ابواب البر والصلہ، ۲/۱۲

(۲۶) شرح السنہ، باب تحریم العقوق، ۱۳/۲۶

(۲۷) مسلم، باب البر والصلہ ۲/۳۱۴

(۲۸) ابن ماجہ ابواب الادب، ۲/۲۶۹

عن ابی امامةؓ ان رجلا قال یا رسول اللہ ﷺ: ما حق الوالدین علی ولدھما قال ھما جنتك و نارك(۲۹)

ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہوتا ہے؟ فرمایا: وہ تیری جنت اور تیری دوزخ ہیں۔

عن ابی ھریرةؓ قال: قال رجل یا رسول اللہ ﷺ: من أحق بحسن صحابتی؟ قال: امك. قال: ثم من؟ قال: أمك. قال: ثم من؟ قال: امك. قال: ثم من؟ قال: ابوك(۳۰)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں، بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ (۳۱)

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح مت کرنا مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا۔

حقوق والدین کی حرمت کی احادیث پیچھے گزر چکی ہیں۔ یہ وہ حقوق ہیں جنہیں قانونی طور پر والدین حاصل کر سکتے ہیں اور عدم ادائیگی کی صورت میں اولاد کی گرفت ہو سکتی ہے۔

اخلاقی حقوق

اخلاقی حقوق میں وہ امور آتے ہیں جن کا ادا کرنا ایک مومن کی اچھی صفات ہو سکتی ہیں اور ان کے نہ کرنے سے اسے اخلاقی پستی کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے اس میں تین چیزیں سرفہرست ہیں۔

(i) حسن سلوک (ii) اطاعت (iii) نماز میں دعا

اطاعت اور حسن سلوک پر گذشتہ آیات و احادیث شاہد ہیں اسلام نے حسن سلوک اور اطاعت میں چند اہم چیزیں بیان فرمائی ہیں جو وسعت و اعتدال کے اعتبار سے بے نظیر ہیں۔

(i) ماں کا درجہ مقدم ہے حضورؐ نے فرمایا کہ تمہاری والدہ سب سے زیادہ حسن سلوک کی مستحق ہے پھر آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

(ii) والدین کی اطاعت جہاد سے بھی اولیٰ تر ہے۔

---

(۲۹) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۳

(۳۰) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۳

(۳۱) النسا/۲۲

عن عبدالله بن عمرؓ و قال: قال رجل للنبی ﷺ: اجاهد۔ قال: لك ابوان؟ قال: نعم۔ قال: ففيهما فجاهد(۳۲)

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے کہا: میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: تمہارے والدین ہیں؟ اس نے کہاہاں! آپؐ نے فرمایاان کی خدمت میں جہاد کرو۔

عن معاويةؓ قال: إن جاهمة جاء الى النبی ﷺ فقال: يا رسول الله! انی اردت ان اغزو وجئتك استشيرك۔ فقال: هل لك من ام؟ قال: نعم۔ قال: فالزمها فان الجنة عند رجلها (۳۳)

معاویہؓ سے (روایت ہے) کہ جاہمہؓ نبی کریمؐ کے پاس آیا اور کہا' یا رسول اللہؐ! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں اور آپؐ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تیری ماں ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں' فرمایا' تو اس کے پاس رہ کیونکہ جنت اس کے پاؤں سے وابستہ ہے۔

جاء رجل الى النبیؐ وقال: جئتك ابايعك على الهجرة وتركت ابوی يبكيان قال فارجع إليهما فاضحكهما كما ابكيتهما (۳۴)

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ہجرت کے لیے بیعت کرنے آیا ہوں اور اپنے والدین کو روتے چھوڑ آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ان کی طرف جاؤ اور انہیں اسی طرح ہنساؤ جس طرح رلایا ہے۔

حسن سلوک کو حقوق والدین میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ نبی کریمؐ نے حسن سلوک کے دائرے کو حقیقی والدین سے بڑھا کر رضاعی والدین تک وسیع کر دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک دن تشریف فرما تھے کہ ان کے رضاعی والد تشریف لائے تو آپ نے اپنی چادر بچھادی اور اس پر انہیں بٹھایا۔ تھوڑی دیر میں آپ کی رضاعی والدہ بھی تشریف لائیں تو آپؐ نے چادر کا دوسرا حصہ بھی بچھادیا اور اس پر انہیں بٹھایا۔ اتنے میں ان کے رضاعی بھائی بھی آگئے تو نبی کریم ﷺ ان کے استقبال کے لیئے کھڑے ہو گئے اور اسے والدین کے درمیان بٹھادیا۔

ان آیات واحادیث سے والدین کی حیثیت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ قرآن پاک میں جس طرح توحید کے بعد دین واخلاق میں والدین کو اونچا درجہ دیا گیا ہے اسی طرح حدیث میں بھی اس کی عملی تشریح کی گئی ہے۔ قرآن وسنت کی انہی تصریحات کی بناء پر ہمارے علماء نے والدین کی حیثیت پر مفصل بحثیں کی ہے۔ علماء نے والدین کے حقوق کو دو حصوں

---

(۳۲) مشکاۃ، کتاب الادب، باب البر والصلۃ، ۴۲۱

(۳۳) ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الرجل یغذو ابواہ کارھان/ ۳۶۷؛ ابن ماجہ، کتاب الجهاد، باب الرجل يغزو له ابوان /۲۰۲؛ نسائی نے اسے ہجرت کے حوالے سے نقل کیا ہے، کتاب البیعۃ، باب البیعۃ علی الہجر ۲/۵۸۱

(۳۴) ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الرجل یغزو وابواہ کارھان/ ۳۶۷

پر تقسیم کیا ہے۔

(i) آئینی حقوق

(ii) اخلاقی حقوق

آئینی حقوق

آئینی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا بجالانا اولاد پر لازم ہے اور اس میں کوتاہی قانونی جرم بن سکتی ہے۔ اسلامی شریعت ان حقوق کے تعین اور حصول کے لیے پوری کوشش کرتی ہے مندرجہ ذیل حقوق کو آئینی حقوق قرار دیا جاسکتا ہے:

(i) میراث

(ii) نفقہ

(iii) باپ کی بیوہ سے شادی کی حرمت

(iv) حرمت عقوق الوالدین' والدین کی نافرمانی کی حرمت

یہ امور مندرجہ ذیل نصوص سے ثابت ہوتے ہیں

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ(۳۵)

اور ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ(۳۶)

لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں؟ آپؐ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نیک کام کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔

عن عمرو بن العاصؓ انه أتاه رجل فقال: يا رسول اللهﷺ: إن لي مالا وولدان وإن أبي يحتاج إلى مالي فقال انت ومالك لأبيك(۳۷)

عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس مال ہے اور صاحب اولاد ہوں اور میرا باپ میرے مال کی حاجت رکھتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: تم بھی اپنے باپ کا مال ہو اور تمہاری متاع بھی۔

(۳۵) النساء/۱۱

(۳۶) البقرہ/۲۱۵

(۳۷) مسند احمد، حدیث ۶۶۰۸

عن عمروؓ بن شعیبؓ عن ابیه عن جده قال: جاء رجل الی البنی ﷺ فقال: ان ابی احتاج مالی فقال انت ومالك لا بیك وقال رسول الله ﷺ: إن اولادکم من أطیب کسبکم فکلوا من اموالکم (۳۸)۔

عمرو بن شعیبؓ اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرا والد میرے مال کا محتاج ہے تو آپؐ نے فرمایا: تم اور تمہارا مال تمہارے والد کا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے سو اپنے مال کا فائدہ اٹھاؤ۔

عن عمرو بن شعیبؓ عن جده ان رجلاً اتی النبی ﷺ فقال: ان لی مالاً وان لی والدی یحتاج الیٰ مالی۔ قال: انت ومالك لوالدك۔ ان اولادکم من اطیب کسبکم فکلوا من کسب اولادکم (۳۹)

عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: میرے پاس مال ہے اور میرا والد ہے جسے میرے مال کی ضرورت ہے۔ فرمایا تو اور تیرا مال تیرے باپ کا مال ہے۔ اس لیے کہ تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ۔

والدین کمانے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو اولاد پر فرض ہے کہ والدین کے نان ونفقہ کا انتظام کرے اگر ایسا نہ کرے تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کرے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کے مال سے تعرض کیا تو اس نے عمرؓ سے شکایت کی۔ عمرؓ نے فیصلہ دیا:

انت ومالك لابیك

تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے باپ کی بیوہ کی حرمت قرآن پاک میں بیان کی ہے۔ قرآن وسنت نے تو مشرک والدین کو بھی حق اطاعت سے خارج نہیں کیا۔ ان کی اطاعت سے گریز صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب وہ شرک کا حکم دیں باقی معاملات میں ان کی اطاعت مومن والدین کی سی ہے۔

وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (۴۰)

اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کی تیرے پاس کوئی

---

(۳۸) ابن ماجہ، کتاب التجارات ۲/ ۱۶۷

(۳۹) ایضاً

(۴۰) لقمان/ ۱۵

دلیل نہ ہو تو ان کا کچھ کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا۔

یہی مضمون سورہ العنکبوت میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

حقوق کی پاسداری کے فوائد

والدین سے حسن سلوک کا اچھا نتیجہ دنیا اور آخرت میں ظاہر ہوتا ہے۔

(i) حضورؐ نے والدین کی اطاعت کو رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کا سبب قرار دیا۔

(ii) دنیا میں نیکیوں کا باعث قرار دیا۔

(iii) انسان کے لیے عملی اعتبار سے مفید قرار دیا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے والدین کو محبت کی نگاہ سے دیکھنا حج مقبول کا ثواب ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

بِرُّوا آباء کم تبرکم ابناء کم (۴۱)

والدین سے حسن سلوک کرو تمہارے بیٹے تم سے حسن سلوک کریں گے۔

قال ابو درداءؓ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: الوالد أوسط ابواب الجنة فان شئت فضع ذالك الباب او احفظ (۴۲)

ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے: والد جنت کے دروازوں کا درمیانی حصہ ہے اگر چاہے تو اس دروازے کو ضائع کر دے یا حفاظت کرے۔

والدین سے بدسلوکی کے تین نتائج مرتب ہوتے ہیں:

(i) احکام خداوندی کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ **حرم علیکم عقوق الامهات۔**

(ii) آخرت کی محرومی اور خدا کی ناراضگی کا باعث بنتی ہے۔

(iii) والدین کی نافرمانی سے معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس شخص کے پاس مال و دولت ہو اور وہ اسے والدین سے روک رکھے تو قیامت کے دن وہ سانپ کی صورت میں اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا۔

---

(۴۱) اس حدیث کو ابو ہریرہؓ اور جابر بن عبداللہؓ نے روایت کیا ہے۔ مستدرک، ۴/۱۷۰، حدیث نمبر ۷۲۵۸: ۳/۱۷۱ حدیث: ۷۲۵۹: طبرانی نے عبداللہ بن عمر کی روایت نقل کی ہے۔ المعجم الاوسط، ۱/۲۹۹، حدیث: ۱۰۰۲۔ حافظ ہیثمی نے کہا ہے: رجالہ صحیح۔ مجمع الزوائد، ۸/۱۳۸

(۴۲) ترمذی، کتاب السنہ، ۴/۳۱۱

اہمیت

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت صرف دینی نیکی ہی نہیں ایک معاشرتی خوبی بھی ہے جس کے ہونے نہ ہونے کے گہرے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ خاندان چونکہ معاشرے کی پہلی اکائی ہے اور خاندان میں والدین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے ان سے حسن سلوک معاشرے کو ایثار، ہمدردی اور محبت وانسانیت کے جذبات دے گا۔ ان کی اطاعت معاشرے میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرے گی۔ والدین کے ساتھ بدسلوکی کے نتیجے میں نافرمانی کی فضا عام ہوگی۔ جو افراد کے اندر جذبہ اطاعت کو ختم کر دے گی اور شتر بے مہار قسم کے وہ افراد پرورش پائیں گے جنہیں قانون، احکام اور اخلاق کی پابندی کا احساس نہیں ہوگا۔ والدین عزت وشرافت کا معیار ہیں۔ والدین کی عزت واحترام اٹھ جانے سے شرافت کی عام قدریں مٹ جائیں گی۔ آنکھوں سے حیا اور دلوں سے ادب مٹ جائے گا۔ خودغرضی اور خودسری کی لعنتیں معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی اور وہ اجتماعی سکون سے محروم ہو جائے گا۔ ایسے معاشرے کو انسانی معاشرہ کی بجائے حیوانوں کا انبوہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ احادیث میں اطاعت والدین کو جس تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں ''والدین کے ساتھ نیکی اور نیک سلوک کی تکمیل چند امور سے وابستہ ہے۔ ان کو پوشش وخوراک مہیا کی جائے ان کی خدمت کی جائے، ان کو جب بھی کسی خدمت کی ضرورت ہو اور وہ پکاریں اور آواز دیں تو ان کے پاس جا کر ان کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری کرے۔ البتہ معصیت وگناہ میں ان کا حکم نہیں ماننا چاہیے اور ان کے پاس کثرت سے آمد ورفت رکھے اکثر ملاقات کرتا رہے ان کے ساتھ نہایت نرمی سے گفتگو کرے۔ ان کو کبھی بھی اف تک نہ کہے۔ ان کا نام لے کر نہ انہیں پکارے نہ بلائے۔ اگر ساتھ چلنے کا اتفاق ہو تو پیچھے پیچھے چلے۔ اگر کوئی شخص اس کے والدین کی غیبت اور عیب جوئی کرے یا ان کو تکلیف وایذاء پہنچائے تو ان کی مدافعت کرنا ان کا فرض ہے۔ اپنی مجلس میں بھی وہ والدین کی انتہائی تعظیم وتوقیر کرے اور ان کے لیے ہمیشہ مغفرت ورحم کی دعا کرتا رہے۔

دور حاضر میں معاشرتی انتشار کی بدولت حالات دگرگوں ہو گئے ہیں۔ اب ضرورت ایسے اداروں کی ہے جن کے افراد خود نہایت اچھا نمونہ بن کر اطاعت والدین کے جذبے کو ادب، تقریر اور گفتگو کے ذریعے عام کریں اور معاشرے کے اندر والدین کی عزت وعظمت کا جذبہ کسی طور پر بھی کم نہ ہونے دیں۔ مغرب نے والدین کے ساتھ جو رویہ اپنا رکھا ہے وہ دوسرے معاشروں میں بھی منتقل ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمان معاشرے اس مغربی بداخلاقی سے متاثر ہو رہے ہیں۔

......☆......

6

اولاد کے حقوق

اسلام نے حیات انسانی کو متوازن نظام فکر و عمل دیا ہے۔ اس میں مستحکم معاشرتی زندگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ استحکام اس اخلاقی تعلیم کا مرہون منت ہے جو قرآن و سنت نے مہیا کی ہے۔ اس نظام میں معاشرے کی تمام اکائیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اخلاقی ماحول کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں جہاں والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت بیان کی گئی ہے وہاں بچوں کے حقوق بھی واضح کیے گئے ہیں۔ اسلام کی معاشرتی زندگی یک رخی نہیں' ہمہ گیر ہے اس لیے والدین اگر اسلامی معاشرے میں بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں تو بچے اس اکائی کا نتیجہ ہیں۔ یہ دونوں مل کر معاشرے کی صورت گری کرتے ہیں۔ بچے تو اور بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف والدین کی شخصی توسیع ہیں بلکہ وہ معاشرے کے ارتقاء اور اس کی متحرک زندگی کا عکس ہیں۔ آج کی اولاد کل کے والدین ہوتی ہے اور آج کے بچے کل کے جوان اور بزرگ ہوتے ہیں لہٰذا اسلام نے بچوں کے بارے میں خصوصی ہدایات دی ہیں۔ کوئی معاشرہ بچوں کے بارے میں جو رویہ اختیار کرتا ہے وہی اس کا معاشرتی معیار قرار پاتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے بے اعتدالی روا رکھی گئی تو اس سے نہ صرف یہ کہ معاشرے کا ارتقائی مزاج مجروح ہوگا بلکہ مستقبل کے والدین بھی خطرناک حد تک اولاد کش ثابت ہوں گے۔ ایک معاشرے میں بچوں اور بڑوں کا تعلق سب سے اہم مسئلہ ہے کیونکہ بڑوں کا احترام اور بچوں کے ساتھ شفقت اس معاشرے کے مجموعی رویوں کے عکاس ہوں گے۔ بڑوں کے ساتھ حسن سلوک اور بچوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ ایک رحم دل معاشرے کی تشکیل کا باعث ہوگا۔ حسن سلوک' ادب و احترام' ایثار و شفقت اور عزت و وقار اسلامی معاشرے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ سے منقول ہے:

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا(۱)

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں ہے"۔

بچے کی حیثیت

اسلامی معاشرہ اولاد کو انسانی اقدار کی بقا و تحفظ کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اسے نعمت عظمیٰ قرار دیتا ہے۔ قرآن و سنت کی

(۱) ترمذی' ابواب البر و الصلہ' باب ماجاء فی رحمۃ الناس ۱۴/۲

تعلیمات سے اولاد کے نعمت عظمیٰ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔اولاد انسانی شخصیت کی توسیع اور اس کی خصوصیات کا بہترین مظہر ہوتی ہے اس لیے ہر انسان جبلی طور پر اولاد کی خواہش رکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اولاد نہ صرف رنج و آلام میں ہمدرد اور غم خوار ہوگی بلکہ اس کے مقصد حیات کی تکمیل میں ممد و معاون ہوگی۔ بچوں کی موجودگی میں ذاتی تسکین کا بڑا سامان موجود ہے۔ بچے جہاں مادی طور پر ایک سہارا ہوتے ہیں وہاں روحانی طور پر تسکین کا باعث ہوتے ہیں۔قرآن مجید نے اس نعمت عظمیٰ کی طرف مندرجہ ذیل طریقہ پر اشارہ فرمایا ہے:

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ(۲)

''اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے عورتیں پیدا کیں اور پھر ان عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔ اور تم کو کھانے کے لیے پاکیزہ چیزیں دیں۔''

قرآن مجید کے مطابق بچے دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔اگرچہ آخرت کے لیے اعمال صالح ہی باقی رہنے والے ہیں لیکن دنیوی زندگی کی رونق بچوں ہی کے دم سے ہے۔ارشاد ربانی ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳).

''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں''۔

بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا(۴)

''اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تم کو جماعت کثیر بنا دیا۔''

ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس دلاتے ہوئے بچوں کا ذکر کیا:

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ (۵)

''اور اس سے ڈرو جس نے تم کو ان چیزوں سے مدد دی جن کو تم جانتے ہو۔اس نے تمہیں چوپایوں اور بیٹوں سے مدد دی''۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہوئے اس کے انعامات کا ذکر کرتے ہیں اور اس میں

---

(۲) النحل/۷۲

(۳) الکہف/۴۶

(۴) الاسراء/۶

(۵) الشعراء/۱۳۲-۱۳۳

مال واولاد کا خصوصی تذکرہ کرتے ہیں:

وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا(٦)

''اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہیں باغ عطا کرے گا اور ان میں تمہارے لیے نہریں بہادے گا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بچوں کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:

فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ(٧)

''تو ہم نے اس کو اسحق علیہ السلام کی اور اسحق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کی خوشخبری دی''۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے رویہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے نعمت اولاد کے عطا ہونے پر اختیار کیا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ عَلَى الۡـكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ(٨)

''اللہ کا شکر ہے جس نے مجھ کو بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحق بخشے بیشک میرا پروردگار دعا سننے والا ہے''۔

زکریا علیہ السلام کی دعاء میں تو باطنی آرزوئیں اور شخصی احتیاجات سمٹ آئی ہیں۔ یہ ایک دل کی پکار ہے جو براہ راست رب تعالیٰ تک پہنچتی ہے۔ قرآن مجید نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے!

وَاِنِّىۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِىَ مِنۡ وَّرَآءِىۡ وَكَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۙ يَّرِثُنِىۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ‌ ‌ۖ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا(٩)

''اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما جو میری اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو اور اے میرے پروردگار اس کو خوش اطوار بنائیو''۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ‌ ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ‌ ۚ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ(١٠)

''اس وقت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دعا کی (اور) کہا کہ پروردگار مجھے اپنی جناب سے اولاد صالح عطا فرما تو بیشک دعا سننے والا ہے''۔

مومنین کی صفات کو بیان کرتے ہوئے اس اظہار تشکر کو بیان کیا گیا ہے جو وہ اولاد کی نعمت پر کرتے ہیں:

وَالَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعۡيُنٍ وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا(١١)

---

(٦) نوح/١٢

(٧) ہود/٧١

(٨) ابراہیم/٣٩

(٩) مریم/٥۔٦

(١٠) ال عمران/٣٨

(١١) الفرقان/٧٤

''وہ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا''۔

قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۲)

''تو کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کا شکرگذار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح (وتقویٰ) دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں۔''

قرآن مجید نے بچوں کے نعمت ہونے پر شاید زور اس لیے دیا ہے کہ اس سے رویوں کی اصلاح ہوگی۔ قرآنی نقطہ نظر سے بچے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔ انہیں زحمت سمجھ کر ان سے نجات حاصل کرنا نہ صرف کفران نعمت ہے بلکہ انسانی معاشرے کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔ ان سے بدسلوکی کرنا' ان کی پرورش میں کوتاہی برتنا اور ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام نہ کرنا نسل انسانی کی بقا اور اس کے استحکام کے لیے مضر ہے۔

بچوں کے حقوق

اسلامی تعلیمات کی رو سے بچوں کی حفاظت ونگہداشت بہت ضروری ہے۔ اسلام نے بچوں کے حقوق کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دی ہیں۔ ان ہدایات پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقوق دو طرح کے ہیں۔ حقوق کی ایک قسم وہ ہے جن کی ادائیگی لازمی ہے اور ان سے کوتاہی کرنا موجب سزا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن کا ادا کرنا پسندیدہ ہے اور ان سے کوتاہی کی صورت میں اخلاقی ومعاشرتی سزا تو ملتی ہے لیکن قانونی گرفت نہیں ہوتی۔ انہیں ہم آئینی حقوق اور اخلاقی حقوق کا عنوان دے سکتے ہیں۔

آئینی حقوق

اسلام نے اولاد کے معاملے کو صرف والدین کی صوابدید پر ہی نہیں چھوڑا اور نہ ہی معاشرے کے رویے پر انحصار کیا ہے بلکہ بچوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا ہے اور ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے غلط رویہ کو قابل سزا قرار دیا ہے۔ دور حاضر میں بچوں کی نگہداشت کی صورت میں جو سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں اور اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں میں اس سلسلے میں جو اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ انسانی معاشروں کی کوتاہیوں اور غفلتوں کا ہی ردعمل ہے۔ اسلام نے اپنی معاشرتی تنظیم

---

(۱۲) الاحقاف/۱۵

میں پہلے دن سے ہی بچوں کے حقوق کے بارے میں واضح موقف اختیار کیا ہے اور یہ اس عظیم اصلاح کا حصہ ہے جسے اسلام نے معاشروں کی تشکیل میں اختیار کیا ہے۔ آئینی حقوق میں مندرجہ ذیل حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔

(i) حق حیات (ii) حق پرورش

(iii) حق تربیت (iv) حق میراث

(v) حق نکاح

حق حیات

بچے کا سب سے پہلا آئینی حق' حق زیست ہے۔ مرد اور عورت کا جائز جنسی تعلق صرف تفریح اور لذت کشی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق نسل انسانی کے تسلسل کا ذریعہ ہے لہٰذا اس تعلق کے نتیجے میں جو بچہ جنم لیتا ہے اس کا یہ حق ہے کہ اس کی زندگی کو محفوظ بنایا جائے۔ چونکہ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اس لیے والدین اور معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اس کی زندگی کو یقینی بنائیں۔ بعض انسانی معاشروں میں اولاد کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ معاشی تنگی کی وجہ سے یا مذہبی عقیدہ کی بنا پر انہیں معبودوں کے لیے قربان کر دیا جاتا تھا۔ قرآن و سنت نے قتل اولاد کو قانونی جرم قرار دیا ہے خواہ معاشی عوامل کی وجہ سے ہو یا مذہبی عقیدہ کی بنا پر۔ بعض عرب قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآن نے اسے ممنوع قرار دیا۔ معاشی' مذہبی اور قبائلی عصبیت کی بنا پر ہونے والی قتل اولاد کی تینوں نوعیتوں کو ممنوع قرار دیا۔

معاشی بنیاد پر اولاد کا قتل

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کے لیے بے پناہ وسائل حیات رکھے ہیں اور اسے حکم دیا ہے کہ محنت اور جدوجہد سے ان وسائل سے استفادہ کرے اور ان سے دنیوی زندگی کو مزین کرے۔ بعض انسانوں کے ظالمانہ رویوں کے باعث وسائل حیات پر چند لوگوں کا قبضہ ہو جاتا ہے اور بقیہ خلق خدا کو وسائل حیات سے کم حصہ ملتا ہے' اس لیے بعض اوقات وہ معاشی تنگی کی وجہ سے قتل اولاد جیسے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ انسان کی کم ہمتی یا ظالمانہ معاشی نظام کی مداخلت کی وجہ سے وہ اولاد سے محرومی کا اقدام کر گزرتا ہے۔ قرآن و سنت نے معاشی وجوہ کی بنا پر قتل اولاد کو شدت سے منع کیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (۱۳)

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا (کیونکہ) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ان کا

---

(۱۳) بنی اسرائیل/۳۱

مارڈالنا سخت گناہ ہے"۔

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَاحَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَاِیَّاہُمۡ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَاظَہَرَ مِنۡہَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (۱۴)

"آپ ان لوگوں سے کہیں کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناتا ہوں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کردی ہیں: کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ بنانا' ماں باپ سے حسن سلوک کرنا' ناداری کے اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا کیونکہ تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ ان کے پاس نہ پھٹکنا اور کسی جان (والے) کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر (یعنی جس کا شریعت حکم دے) ان باتوں کی وہ تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم سمجھو"۔

مذہبی بنیاد پر اولاد کا قتل

مشرکانہ کلچر میں دیوی دیوتاؤں کی نذر میں اولاد کی قربانی کی جاتی تھی۔ بعض مشرکانہ معاشروں میں اب بھی یہ رسم باقی ہے۔ قرآن اس قبیح رسم کی مذمت کرتا ہے اور اسے احمقانہ عمل قرار دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے اس رسم کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قرآن مجید اس رسم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَہُمۡ سَفَہًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّحَرَّمُوۡا مَارَزَقَہُمُ اللّٰہُ افۡتِرَآءً عَلَی اللّٰہِ ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ (۱۵)

"جن لوگوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے بے سمجھی سے قتل کیا اور خدا پر افترا کر کے اس کی عطا کی ہوئی روزی کو ٹھہرایا وہ گھاٹے میں پڑ گئے۔ وہ بلاشبہ گمراہ ہیں اور ہدایت یافتہ نہیں ہیں"۔

وَکَذٰلِکَ زَیَّنَ لِکَثِیۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِہِمۡ شُرَکَآؤُہُمۡ لِیُرۡدُوۡہُمۡ وَلِیَلۡبِسُوۡا عَلَیۡہِمۡ دِیۡنَہُمۡ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَافَعَلُوۡہُ فَذَرۡہُمۡ وَمَا یَفۡتَرُوۡنَ (۱۶)

"اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بچوں کو جان سے مارڈالنا اچھا کر دکھایا ہے تاکہ انہیں ہلاکت میں ڈال دیں اور ان کے دین کو ان پر خلط ملط کر دیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جانیں اور ان کا جھوٹ"۔

---

(۱۴) الانعام/۱۵۲

(۱۵) الانعام/۱۴۱

(۱۶) الانعام/۱۳۸

لڑکیوں کا قتل

کئی معاشروں میں لڑکیوں کو پیدائش کے فوراً بعد قتل کر دیا جاتا تھا۔عربوں میں بعض قبائل ایسے تھے جو لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے۔قبائلی معاشروں میں بالعموم لڑکی کو ایک بوجھ سمجھا جاتا۔چونکہ شادی کے بعد اسے کسی دوسرے قبیلے یا خاندان میں جانا ہوتا اس لیے وہ قبیلہ اور خاندان کے لیے مدد و معاون ثابت ہونے کے بجائے بوجھ سمجھی جاتی۔اس نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی لڑکیاں جہیز کم لانے کی وجہ سے قتل ہو رہی ہیں اور بعض عورتیں (Scanning) کے بعد یہ معلوم کر کے کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہو رہی ہے اسقاط کرا دیتی ہیں۔لڑکی معاشی بوجھ اور معاشرتی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے اس لیے اس سے نجات کے راستے تلاش کیے جاتے ہیں۔بعض عربوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور ان کی سفارش سے مشکلات حل ہوتی ہیں۔دوسری طرف وہ انہی بیٹیوں سے نجات حاصل کرتے یا انہیں شدید دباؤ میں رکھتے۔قرآن مجید نے ان کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۷)

''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے تو اس کا چہرہ غم کے سبب کالا پڑ جاتا ہے اور اس کے دل کو دیکھو تو وہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔اور اس خبر بد کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے۔دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری بات ہے''۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۸)

''اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انہوں نے اللہ کے لیے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے''۔

قرآن و سنت نے ان تینوں اقسام کے قتل کو ممنوع فرمایا ہے اور اولاد کی نعمت کو پہچاننے کا سلیقہ سکھایا۔اس قتل کو قانونی طور پر جرم قرار دیا اور قابل سزا بنایا۔کتب حدیث میں وہ تفصیلی واقعات موجود ہیں جو قتل اولاد کی سنگینی پر دلالت کرتے ہیں۔اولاد اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اور اسے کسی طرح بھی ختم کرنا درست نہیں۔اولاد کی محبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے اور اس سے نوع انسانی کی بقا ہے۔

---

(۱۷) النحل/۵۸-۵۹

(۱۸) الزخرف/۱۷

حقِ پرورش

بچے کا دوسرا حق پرورش ہے۔ پرورش سے مراد وہ طریق کار ہے جو بچے کی زندگی اور اس کی نشوونما کا ضامن ہو۔ اسلام نے والدین کو اپنے بچوں کی بقا اور نشوونما کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اور اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ ایک بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں خطرات و عوارض سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ اپنے وجود کی حفاظت تو بعد کی بات ہے وہ تو خورد و نوش کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کو اس امر کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی خوراک کا انتظام کریں' انہیں بیماریوں سے بچائیں اور حادثات سے محفوظ رکھیں۔ قرآن و سنت نے والدین پر فرض عائد کیا کہ وہ بچے کی عمر کے مطابق خوراک اور لباس کا انتظام کریں۔ حضور اکرم ﷺ کے ایک ارشاد سے اس ذمہ داری کا عمومی تصور ملتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْوَالِدُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَعِيَّتِهٖ فِيْ مَالِ زَوْجِهَا وَ وَلَدِهٖ وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِيْ مَالِ سَيِّدِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ. (١٩)

"تم سب اپنے اہل خانہ کے کفیل اور ذمہ دار ہو۔ باپ اپنے خاندان کی کفالت کرتا ہے اور اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔ عورت اپنے شوہر کے مال اور اولاد کی نگران ہے اور اپنے گھر والوں کی ذمہ دار ہے اور خادم اپنے مالک کے مال و اسباب کا نگران ہے اور اس کام کا ذمہ دار ہے۔ تم سب اپنے لواحقین کے کفیل اور ذمہ دار ہو"۔

والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کی پرورش پر توجہ دیں اور ان کی ضروریات پوری کریں ان کی غذا کا خیال رکھنا ان کو گرمی و سردی سے محفوظ رکھنا اور بیماریوں سے بچاؤ کا اہتمام کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ والدین کی غفلت سے بچے شدید جسمانی و نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچے اپنی ابتدائی عمر میں شدید توجہ کے محتاج ہوتے ہیں اور والدین کی لاپرواہی سے کئی نفسیاتی' روحانی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پرورش کے ضمن میں خوراک' لباس' صاف ستھرا ماحول اور محبت و شفقت کا رویہ سب شامل ہیں۔ بچہ اپنی ابتدائی زندگی میں جس خوراک کا محتاج ہوتا ہے مشیت ایزدی نے اس کا انتظام ماں کے دودھ کے طور پر کر دیا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ

---

(١٩) بخاری، کتاب الجمعہ ۱/۱۱

اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ(۲۰)

''جو باپ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت تک دودھ پیئے' تو مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوتا' مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے' اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا کہ بچے کے باپ پر ہے کہ ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔ لیکن اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو' وہ معروف طریقے پر ادا کرو۔ اللہ سے ڈرو' اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' سب اللہ کی نظر میں ہے۔''

اس آیت کی رو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ماں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ بچے کو اپنے دودھ سے محروم رکھے۔ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ اس سے کم مدت میں دودھ چھڑاتے ہوئے یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ بچے کی صحت اور پرورش پر برا اثر تو مرتب نہیں ہوگا۔ اس آیت نے واضح کیا کہ دودھ پلانے والی ماں کے حقوق کا خیال رکھنا ہے۔ باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دودھ پلانے والی ماں کے طعام و لباس کا پورا انتظام کرے۔ باپ کی غیر موجودگی میں خاندان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچے اور اس کی ماں کی نگہداشت کا پورا انتظام کرے۔ والدین کی علیحدگی کی صورت میں بچے کی رضاعت (دودھ پلوانے) کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ ماں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بلاوجہ بچے کو دودھ کی نعمت سے محروم کر دے کیونکہ یہ اس کی پرورش میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے:

مسلمانوں کے ہاں دودھ پلانے کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ یہ دور حاضر کی بدعت ہے کہ ماؤں نے اپنا دودھ پلانے سے گریز کیا ہے جس کا نتیجہ ماؤں کے حق میں بھی بہتر نہیں نکلا جبکہ بچوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ دور حاضر کی طبی تحقیقات نے ماں کے دودھ کی اہمیت و ضرورت کا ادراک کیا ہے اور ماؤں کو یہ مشورہ دینا شروع کیا ہے کہ وہ بچوں کو دودھ پلائیں۔ چونکہ ماں کا دودھ بچے کی صحت' عادات و اطوار اور مستقبل کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے ماں کی صحت' اس کی دینی اور اخلاقی حیثیت کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے بدکار اور پاگل عورتوں کے دودھ سے اجتناب کا حکم دیا۔ کتب فقہ میں **استرضاع المجنونۃ والحمقاء** کے عنوانات موجود ہیں۔(۲۱)

محدث ہیثمی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

---

(۲۰) البقرہ/۲۳۳

(۲۱) بحر الرائق/۸/۱۹۵

لاتر ضع لکم الحمقاء فان اللبن یغذی (۲۲)

''بے عقل عورت دودھ نہ پلائے کیونکہ دودھ کی غذائی تاثیر ہے''۔

بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اسے مناسب غذا اور لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ والد کی ذمہ داری ہے کہ وہ خوراک اور لباس کا انتظام کرے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ رزق حلال سے اولاد کی پرورش کریں۔ ارشاد خداوندی ہے:

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَارَزَقْنٰكُمْ (۲۳)

''ہم نے جو پاکیزہ چیزیں تمہیں دی ہیں انہیں کھاؤ''۔

يٰـاَيُّهَا النَّـاسُ كُـلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۴)

''لوگو جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

پرورش میں مساوی سلوک

غذا، لباس اور رہن سہن میں بچوں کے ساتھ مساوی رویہ اختیار کرنا اسلام کا تقاضا ہے قبائلی معاشروں میں لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور خوراک اور لباس میں امتیازی رویہ رکھا جاتا ہے۔ آنجناب ﷺ نے اس امتیازی رویہ کو ناپسند فرمایا اور امت کو ایک طرح کی ہدایت ہے کہ وہ مساوات کی روش اپنائیں۔ عائشہؓ روایت کرتی ہیں:

جاء تنی امرأۃ ومعها ابنتان تسالنی فلم تجد عندی غیر تمرۃ واحدۃ فاعطیتها فقسمتها بین ابنتیها ثم قامت فخرجت. فدخل النبیؐ فحدثته فقال: من بلی من هذه البنات شیئاً فأحسن الیهن کن له سترا من النار (۲۵)

''ایک عورت میرے پاس آئی اور اس کے ہمراہ اس کی دو بیٹیاں تھیں اس نے میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ پایا تو میں نے اسے وہی دے دی پھر اس نے اسے اپنی بیٹیوں پر بانٹ دیا اور اس میں سے خود نہ کھایا پھر اٹھ کر باہر چلی

---

(۲۲) مجمع الزوائد ۴/۲۶۲: یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں منقول ہے۔ بیہقی نے سنن الکبریٰ ۸/۲۲۴ میں نقل کی ہے۔ اس حدیث کا بنیادی ماخذ طبرانی ہے اور اس کی سند میں ضعیف راوی شامل ہے۔ روایت میں ''الحمقاء'' اور الورھاء کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یہ ان سے منقول ہے ''لاتسترضعوا اولادکم الحمقاء فان اللبن یغذی 'الفردوس بماثور الخطاب' ۳۱۱۵ یہ روایات المعجم الاوسط ۱۱/۱۲۸ المعجم الصغیر ۱/۱۰۰ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۲۳) طٰہٰ/۸۱

(۲۴) البقرۃ/۱۶۸

(۲۵) بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد، ۲/۸۸۷

گئی۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ گھر آئے اور میں نے آپؐ کو بتایا تو آپؐ نے فرمایا: جوان بیٹیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے آگ سے آڑ ہوں گی"۔

کئی احادیث میں اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے ان میں سے تین کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

عن انسؓ قال :قال رسول الله ﷺ : من عال جاریتین دخلت انا وھو الجنة کھاتین واشار باصبعیه (۲۶)

انسؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی وہ اور میں جنت میں اس طرح داخل ہوں گے اور آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ملایا۔

عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله ﷺ من کانت له انثی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یوثر ولده علیھا (یعنی الذکور) ادخله الله الجنة (۲۷)

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کی عورت (بہن بیٹی) ہو اور وہ اسے زندہ نہ گاڑے اور اس کی توہین نہ کرے اور لڑکوں کو ان پر ترجیح نہ دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا"۔

عن ابن عباسؓ قال قال رسول الله ﷺ سَوّوا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ فِیْ العَطِیَّةِ فَلَوْ کُنْتُ مُفَضِّلاً اَحَداً لَفَضَّلْتُ النساء (۲۸)

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا معاملہ کرو اگر میں اس معاملہ میں کسی کو ترجیح دیتا تو عورتوں کو ترجیح دیتا"۔

پرورش میں تمام مادی سہولتوں کی فراہمی شامل ہے جب تک بچوں کو احتیاج رہتی ہے اس وقت تک والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ وسائل مہیا کریں اور ان کو تحفظ فراہم کریں۔

حق تربیت

اگرچہ پرورش میں تربیت شامل ہے لیکن ہم نے اسے الگ رکھا تا کہ اس کی اہمیت واضح ہو۔ پرورش میں جسمانی نشوونما اور تحفظ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جبکہ تربیت کا تعلق ذہنی اور روحانی نشوونما سے ہے۔ والدین جس طرح بچے کے لیے جسمانی آسودگی اور مادی آسائشوں کا اہتمام کرتے ہیں اسی طرح ذہنی و روحانی آسائش اور سکون فراہم کرنا بھی ان

(۲۶) ترمذی، ابواب البر والصلہ، ۲/۱۴

(۲۷) ابوداؤد، کتاب الادب، ۲/۷۰۰

(۲۸) رواہ الطبرانی فی الکبیر، مجمع الزوائد، کتاب البیوع باب الھبة للولد، ۴/۱۵۳

ذمہ داری ہے۔ بچے کی متوازن شخصیت کی نشو ونما کے لیے ذہنی و روحانی سہولتیں بے حد ضروری ہیں۔ تربیت میں سب سے زیادہ اہم دو چیزیں ہیں ایک تعلیم اور دوسرے آداب زندگی۔

تعلیم

تعلیم انسانی شخصیت کا زیور ہے۔ بچے کی شخصی نشو ونما کے لیے تعلیم بے حد اہم ہے کتب میں روایت ہے:

علموا اولادکم فانهم مخلوقون لزمان غير زمانكم

''تم اپنے بچوں کو تعلیم دو اس لیے کہ وہ ایک ایسے زمانے کی مخلوق ہیں جو تمہارے زمانے سے مختلف ہے''۔

بدر کے قیدیوں کے سلسلے میں کتب حدیث میں وارد ہے کہ جو لکھنا جانتے تھے ان کو کہا گیا کہ دس بچوں کو لکھنا سکھا دو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

عن ابن عباسؓ قال: كان الناس من الاسرى يوم بدر لم يكن لهم فداء فجعل رسول الله ﷺ فداء هم ان يعلموا اولاد الأنصار الكتابة (۲۹)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کے پاس زر فدیہ نہ تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا فدیہ یوں قرار دیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔

''علم کی فضیلت کے بارے میں کئی احادیث موجود ہیں۔ ایک حدیث کا نقل کرنا کافی ہوگا''۔

طلب العلم فريضة على كل مسلم (۳۰) ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے''۔

حضور اکرم ﷺ نے عبداللہ بن عباسؓ کے لیے دعا کرتے ہوئے فرمایا: **اللهم فقهه فى الدين** اے اللہ اسے دین کا فہم عطا فرما۔ علم کو عام کرنے کی پالیسی اور اسے بلا امتیاز سب کے لیے مہیا کرنا حضور اکرم کا انسانیت پر احسان عظیم ہے۔ مختلف مذاہب نے علم کو مخصوص طبقوں تک محدود کر رکھا تھا اور جاہلیت جدیدہ میں بھی بڑی طاقتیں عام انسان کو تھوڑی سی واقفیت پر مبنی تعلیم کی اہمیت پر شدومد کے ساتھ زور دیتی ہیں اور نادان لوگ اس کو حسن معاشرت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم اور بالخصوص اختصاص کے دروازے مسلمانوں پر بند کئے جا رہے ہیں۔ تعلیم میں دینی معلومات کے ساتھ دنیوی زندگی میں کام آنے والے علوم بھی شامل ہیں۔ اسلام اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ سب کچھ حاصل کیا جائے جسے دماغ اور حواس علم کے طور پر حاصل کر سکیں، اور جس سے انسان اپنی معلومات میں وسعت پیدا کر سکے۔ فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تیرا کی، شکار اور گھڑ سواری سکھائیں۔ اس عہد میں گھڑ سواری اور شکار عربوں کے

(۲۹) سنن ابن ماجہ/ مقدمہ/ ۲۰

(۳۰) مسند احمد/ ۱/ ۲۴۷

ہاں مقبول تھا۔ آج کے حالات میں جو علوم انسانی زندگی کے لیے مفید ہیں ان کا حصول ضروری ہے۔ فاروق اعظمؓ آج کے دور میں ہوتے تو وہ ان علوم کے اکتساب کا حکم دیتے۔

گویا تعلیم میں دینی و دنیوی دونوں علوم ضروری ہیں اور بچوں کو قرآن و حدیث اور شریعت وعقیدہ کے ساتھ مروجہ سائنسی و عمرانی علوم کا سکھانا والدین کی ذمہ داری ہے۔

آداب سکھانا

تعلیم کے ساتھ جو چیز بے حد ضروری ہے وہ اسلامی آداب کی آبیاری ہے۔ فاروق اعظمؓ کا قول ہے:

مَنْ لَمْ يُؤَدِّبْهُ الشَّرْعُ فَلَا اَدَّبَهُ اللّٰهُ (۳۱)

''جسے شریعت مودب نہ کر سکے اسے اللہ بھی مودب نہیں کرتا''۔

بچے کو نظم وضبط سکھانا اس میں اچھی عادتیں اور اعلیٰ اخلاق پیدا کرنا والدین کا فرض ہے۔ آنجناب کا فرمان ہے:

عن جابر بن سمرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لَاَنْ يُّؤَدِّبَ اَحَدُكُمْ وَلَدَهُ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ اَنْ يَّتَصَدَّقَ بِصَاعٍ (۳۲)۔

''اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے بچے کو ادب سکھاتا ہے یہ اس کے لیے اس کام سے بہتر ہے کہ وہ ہر روز ایک صاع خیرات کرے''۔

مغرب نے بچوں کی تربیت کے حوالے سے آزادی وخود مختاری کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے نتیجہ میں ایک آزاد' بے ادب' غیر منظم اور بد لحاظ افراد کا گروہ وجود میں آیا ہے جنہیں اپنی ذات کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام اس کے مقابلے میں ایک ذمہ دار' منظم اور دوسروں کے لیے خیر خواہی رکھنے والے افراد کی تشکیل کرتا ہے۔ اسلام نے اچھی تربیت کو ثواب سے منسلک کیا ہے۔ وہ والدین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام کریں۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَكْرِمُوْا اَوْلَادَكُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَبَهُمْ (۳۳) ''اپنے بچوں کی تکریم کرو اور انہیں ادب وتمیز سکھاؤ''۔

بچے کی تعلیم وتربیت اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ معاشرے کی اساس ہے۔ فرد سے خاندان اور خاندان سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اچھے افراد جو تربیت یافتہ اور زیور علم سے آراستہ ہوں گے وہ معاشرے کو جنت کا نمونہ بنائیں گے۔ وہ

---

(۳۱) ابجد العلوم ۱/ ۱۱۶

(۳۲) ترمذی' ابواب البر و الصلة' باب ماجاء فی ادب الولد ۲/ ۱۷

(۳۳) ابن ماجہ' حدیث رقم ۳۶۷۱' کتاب الادب باب بر الوالد والاحسان الی البنات عن انس بن مالک ۲/ ۱۱-۱۲

ایساماحول تشکیل دیں گے جس میں تمام افراد خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ غیر تربیت یافتہ افراد کے نتیجہ میں غیر مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے جو مزید انتشار اور فساد کا باعث بنتا ہے اس لیے اسلام نے بچے کی تعلیم و تربیت دونوں پر زور دیا ہے اور اسے آزاد اور بے مہار نہیں چھوڑا۔ حضور اکرم ﷺ نے تربیت کے حوالے سے بنیادی اصول بیان فرمایا کہ بچہ فطرت اسلام پر یعنی فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے اس کے بعد اس کے والدین اس کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں اور اسے جس رنگ میں چاہیں ڈھال دیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او یمجسانه اوینصرانه (۳۴)

''ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی' مجوسی یا نصرانی بناتے ہیں''۔

اسلام نے آداب زندگی کے بارے میں مفصل ہدایات دی ہیں۔ والدین بچوں کی عمر اور ان کے مزاج کے مطابق آہستہ آہستہ اسلامی آداب سکھاتے رہیں۔ کھانا پینا' گفتگو کرنا' والدین اور بڑوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا' پاکیزگی اور ثقافت کا خیال رکھنا' وہ چیزیں ہیں جن کی طرف والدین توجہ دے سکتے ہیں۔

حق میراث

اولاد کے آئینی حقوق میں ایک اہم حق میراث کا ہے۔ اسلام نے اولاد کو باپ کی جائیداد میں نہ صرف شریک کیا بلکہ ان کے حصے بھی متعین کر دیے ہیں تاکہ کوئی ظلم نہ ہو سکے۔ بعض معاشروں میں صرف بڑے بیٹے وارث ہوتے ہیں۔ قدیم معاشروں میں بیٹیوں کو حصہ نہیں ملتا تھا۔ قرآن نے ان کا حصہ متعین کیا اور سنت نبویؐ نے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ باپ کو کسی جائز وجہ کے بغیر قانونی طور پر اولاد کو جائیداد سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس سے ان کی حق تلفی ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۳۵)

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے سلسلے میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے''۔

اس پر ہمارے مفسرین اور قانونی ماہرین نے مفصل بحثیں کی ہیں کہ لڑکی کا حصہ آدھا کیوں ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن نے لڑکی کا کچھ حصہ متعین کیا ہے۔ جبکہ دوسرے معاشروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر لڑکی کئی اور طریقوں سے بھی اپنا حق وصول کرتی ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے اور بیوی کی حیثیت سے اس کے حصے متعین ہیں۔ پھر مہر ہے' نان نفقہ کی ذمہ داری خاوند کی ہے۔ اسے کئی پہلوؤں سے رعایت دی گئی ہے جو اس کے نصف حصہ کی کمی پوری کرنے کا

---

(۳۴) بخاری' کتاب الجنائز' باب ماقیل فی اولاد المشرکین' ۱/۱۸۵

(۳۵) النساء/۱۱

باعث بنتی ہے۔ چونکہ اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں اس لیے ان کے حق وراثت کو قانونی حیثیت دی گئی اور والدین کو یہ حق نہیں کہ وہ انہیں محروم کردیں۔

حق نکاح

اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ والدین ان کے نکاح کا انتظام کریں۔ بحیثیت مجموعی معاشرہ اور والدین اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنے جوان بچوں کی زندگی کی تنظیم کے لیے مناسب قدم اٹھائیں۔ قرآن وسنت میں نکاح کے متعلق واضح احکام موجود ہیں۔ ایک روایت کے مطابق والدین کی غفلت کی وجہ سے اولاد اگر گناہ کا ارتکاب کرتی ہے تو اس میں والدین کا بھی حصہ ہے۔ یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے تاہم ایک پہلو کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن ابن سعیدؓ و ابن عباسؓ قالا: قال رسول اللہ ﷺ :من ولد له مولود فليحسن ادبه واسمه فاذا بلغ فليزوجه فان بلغ ولم يزوجه فاصاب اثما فانما اثمه على ابيه (۳۶)

''ابن سعیدؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے ہاں اولاد پیدا ہو تو اسے چاہیے کہ اسے حسن ادب سے آراستہ کرے اور اس کا اچھا نام رکھے اور جب بالغ ہو تو اس کی شادی کرنی چاہیے۔ اگر وہ بالغ ہوا اور اس کی شادی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر ہے۔''

عن عمر ابن الخطابؓ وانس بن مالکؓ عن رسول اللہ ﷺ قال :فی التوراۃ مکتوب من بلغت ابنته اثنتی عشرۃ سنة ولم یزوجها فاصابت اثما فاثم ذلك عليه (۳۷)

عمر بن الخطابؓ اور انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تورات میں لکھا ہے جس کی بیٹی بارہ برس کی ہوئی اور اس نے اس کی شادی نہ کی اس نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کا گناہ باپ کے سر ہے۔

آزاد معاشروں اور جاہلیت قدیمہ وجدیدہ میں نکاح کی اہمیت کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ جنسی آزادی کو انسانی حق قرار دیا گیا ہے جس سے معاشرے کی تنظیم اور اس کی اخلاقی وروحانی حیثیت کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اولاد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ساتھی کا انتخاب کرے لیکن والدین پر راہنمائی کرنے، وسائل مہیا کرنے اور انتخاب میں سہولت پیدا کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اسلام آزادانہ جنسی اختلاط کو معاشرے کے اخلاقی وجود کے لیے خطرناک سمجھتا ہے۔ عفت وعصمت اور غیرت وحیا کو بنیادی اجتماعی اقدار قرار دیتا ہے اس لیے نکاح کو آسان بنانے اور جنسی بے راہ روی کو روکنے میں والدین اور معاشرے کو مل کر کردار ادا کرنا چاہیے۔ نکاح کے سلسلے میں والدین پر ذمہ داری عائد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ و

(۳۶) سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ' (الالبانی)' ۲/۱۲۳

(۳۷) شعب الایمان' ۶/۴۰۲

معاشرے کی اخلاقی قدروں کے تحفظ کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ انتظام کی سہولتیں مہیا کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ والدین جبری نکاح کرائیں۔ جبر کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ ولی کو صرف اس لیے ساتھ رکھا کہ وہ اولاد کے نفع ونقصان کو غیر جذباتی انداز میں دیکھ سکیں گے' لڑکی یا لڑکا جذباتی وابستگی کی بنا پر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ نکاح کو آسان بنانے کے لیے مناسب حالات پیدا کریں اور اولاد کی مدد کریں۔ بچوں کو آزاد چھوڑ دینے کے بھیانک نتائج سامنے آئے ہیں جنہیں مختلف معاشرے بھگت رہے ہیں اور ان کی نقالی میں اس راہ پر چلنے والے دوسرے معاشرے بھی انہی حالات کا سامنا کریں گے۔

اخلاقی حقوق

اخلاقی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا ادا کیا جانا اخلاقی اعتبار سے ضروری ہو لیکن ادا نہ کرنے کی صورت میں قانونی گرفت نہ ہو۔

ان حقوق میں درج ذیل نمایاں ہیں:

☆ اچھا نام رکھنا ☆ عقیقہ کرنا ☆ روحانی تربیت کرنا

اچھا نام رکھنا

والدین کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کا اچھا نام رکھیں۔ بیہقیؒ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حَقُّ الْوَلَدِ عَلَى الْوَالِدِ اَنْ يُحْسِنَ اِسْمَهٗ وَ يُحْسِنَ اَدَبَه (۳۸)

''باپ پر بچے کا یہ بھی حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو حسن ادب سے آراستہ کرے۔''

اخلاقی حقوق میں اولین بات یہ ہے کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کا نام ایسا رکھا جائے جو مسلم عقائد اور مسلم اخلاق کا آئینہ دار ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم اپنے بچوں کے نام خوبصورت رکھو۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَحَبُّ الْاَسْمَاءِ اِلَى اللّٰهِ عَبْدُ اللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ (۳۹)

''اللہ کے نزدیک سب سے پیارے نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں''۔

---

(۳۸) شعب الایمان، باب فی حقوق الاولاد والاھلین، ۶/۴۰۰

(۳۹) ابوداؤد کتاب الادب۔ ۲/۶۷۲

شاہ ولی اللہؒ نے اس حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

''شریعت کے اہم اور عظیم ترین مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تمام ارتفاقات ضرور یہ اور تدابیر معاشیات میں بھی ذکرالٰہی شامل کر دیا جائے اور اسے دوچند کر دیا جائے تا کہ یہ امور بھی دعوت اسلام کی زبان بن کر حق کی دعوت دیں اور نومولود بچے کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن سے موسوم کرنا درحقیقت اسے توحید سے آگاہ و باخبر کرنا اور توحید آشنا بنانا ہے۔ نیز اہل عرب اور دیگر ممالک کے باشندے اپنی اولاد کا نام ان لوگوں کے نام پر رکھتے تھے جن کی وہ لوگ عبادت و پرستش کیا کرتے تھے چونکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد ہی مراسم توحید قائم کرنا تھا اس لیے لازم وضروری ہوا کہ نام رکھنے میں سنت' توحید اور طریق توحید ہی کا اعتبار و لحاظ رکھا جائے۔(۴۰)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابی هريرةؓ قال: قال رسول الله: اخنع اسم عندالله تبارك و تعالى يوم القيامة رجل يسمى ملك الاملاك(۴۱)

''ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک کم بخت نام اس شخص کا ہوگا جو ملک الاملاک کہلائے گا''۔

نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ جن ناموں کے اچھے معانی نہ ہوتے تو ان کو تبدیل فرما دیتے۔ اچھا نام انسان کو احساس تشخص دیتا ہے' برا نام شرمساری کا باعث بنتا ہے۔ انبیاء کرامؑ اصحابؓ عظام' اولیاء اللہ اور سلف صالحین کے ناموں پر نام رکھنا پسندیدہ ہے۔ ناموں میں شرکیہ عنصر نہیں ہونا چاہیے۔ والدین اگر اچھا نام نہ رکھیں یا کسی وجہ سے پسند نہ آئے تو لوگ تبدیل کرتے ہیں۔ ابوالدرداءؓ کی روایت میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

تُدْعَوْنَ يومَ القيامة بَاسْمَاءِكم وَاَسْماءِ آبَاءِكم فَاَحْسِنُوا اَسْمَائَكُمْ(۴۲)

''قیامت کے روز تمہیں اپنے ناموں اور اپنے والد کے ناموں سے پکارا جائے گا اس لیے بہتر نام رکھو''۔

حضور اکرم ﷺ کے ارشادات کی تاثیر ہے کہ امت مسلمہ میں ہمیشہ اچھے نام مقبول رہے ہیں۔ انبیاء و صلحاء کی نسبت سے نام رکھے گئے۔ بعض ایسے نام پائے جاتے ہیں جو شرعی طور پر متنازع رہے ہیں تاہم امت مسلمہ اچھے ناموں کی وجہ سے منفرد ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا۔ آپؐ کا یہ ارشاد کتب حدیث میں منقول ہے: **تَسَمَّوا بَاسْمَاءِ الْاَنبِيَاء**(۴۳) یعنی پیغمبروں کے نام پر نام رکھو۔

(۴۰) حجۃ اللہ البالغہ' ۲/ ۳۹۱

(۴۱) ابوداؤد' کتاب الادب باب فی تغییر الاسم القبیح' عن ابی هريرة' ۴/ ۲۹۰

(۴۲) البیہقی' کتاب الضحایا باب مایستحب ان یسمی به' ۹/ ۳۰۸

(۴۳) البیہقی' کتاب الضحایا باب مایستحب ان یسمی به' ۹/ ۳۰۸

روحانی تربیت

اخلاقی حقوق میں اہم چیز تربیت ہے۔ بقول سید سلیمان ندویؒ (۴۴) ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد روحانی تربیت کا درجہ ہے۔ گو یہ ایک اخلاقی حق ہے لیکن یہ آئینی حقوق سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سے وہ صحیح معنوں میں انسان بنے گا اور اسی سے وہ معاشرے کا مفید رکن سمجھا جائے گا۔ قرآن پاک میں کم از کم ایک ارشاد تو ایسا ملتا ہے جو اسے قانونی حق بنا دیتا ہے یا فرض کی حد تک پہنچا دیتا ہے:

یَاۤیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا قُوۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰۤئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ (۴۵)

''اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جس پر تندخو مضبوط فرشتے متعین ہیں جو خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے''۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا (۴۶)

''اور ایسے ہیں کہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک (یعنی راحت) عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا''۔

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۷)

''اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں''۔

عَنْ اَیوب بن موسیٰؒ عَنْ اَبیه عَن جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قال: مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ (۴۸)

''ایوب ابن موسیٰؒ سے منجانب اس کے باپ اور دادا کے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی باپ اپنی اولاد کو حسن ادب سے بڑھ کر اچھا عطیہ نہیں دیتا''۔

---

(۴۴) سیرۃ النبی، ۶/۲۴۴

(۴۵) التحریم/۶

(۴۶) الفرقان/۷۴

(۴۷) الاحقاف/۱۵

(۴۸) ترمذی، ابواب البر و الصلة باب ماجاء فی ادب الولد ۲/ ۱۷

(۴۹) شرح السنۃ باب رحم الخلق، ۱۳/۴۴

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من آوی یتیما الی طعامه و شرابه اوجب الله له الجنة البتة الا ان یعمل ذنبا لا یغفر. من عال ثلاث بنات او مثلهن من الا خوات فادبهن او رحمهن حتی یغنیهن الله اوجب الله له الجنة فقال رجل یا رسول الله: واثنتین قال: او اثنتین حتی لو قالوا و واحدة لقال واحدة...... (۴۹)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں ساتھ رکھا تو اللہ نے اس کے لیے جنت لازم کردی سوائے اس کے کہ کوئی ایسا گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہو سکے۔ اور جس نے تین بیٹیوں یا تین بہنوں کی پرورش کی اور انہیں سلیقہ سکھایا اور ان پر ترس کھایا یہاں تک کہ اللہ نے انہیں بے نیاز کر دیا تو اللہ نے اس کے لیے جنت لازم کردی۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا' یارسول اللہ ﷺ! اگر دو ہوں تو؟ فرمایا اور چاہے دو ہوں۔ یہاں تک کہ اگر لوگ ایک کا پوچھتے تو آپؐ یہی جواب دیتے۔

بخاری کے باب العلم میں ہے اگر کوئی شخص مسجد میں ساری رات نوافل پڑھنے میں گزارے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ بچے کو اچھے آداب سکھائے۔ شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی حکمت عملی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ بچوں کی زندگی میں استقلال نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے والدین کی نگرانی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ماں باپ کے دلوں میں بے پناہ شفقت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا تاکہ وہ تربیت اولاد کا کام خوشی سے انجام دیں اور ہر طرح ان کے نگران حال رہیں۔ وہ ان کی تربیت ایسے طریقے پر کریں جس سے ان کی آئندہ زندگی سنور جائے اور وہ ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے جائز اور باعزت طریقے پر کمانا جان سکیں' زیور علم سے آراستہ ہوں۔ والدین اپنی اولاد کے بزرگ و محترم ہوتے ہیں اور محسن بھی۔ اور ان کی ظاہری و معنوی تربیت میں انہوں نے وہ تکالیف برداشت کی ہیں جن کا اندازہ لگانا یقیناً مشکل ہے''۔ (۵۰)

عقیقہ

بچے کے پیدا ہونے کے ساتویں دن یا اس کے بعد جو جانور ان کے حوالے سے ذبح کیا جاتا ہے اس کو عقیقہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عقیقہ کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ نے حسنینؓ کا عقیقہ کیا تھا۔ اس سے بچہ بہت سی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ عربوں کے ہاں قبل از اسلام یہ رسم موجود تھی اور عقیقہ بچے کی پیدائش پر خوشی کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ قربانی چونکہ سنت ابراہیمی ہے اس لیے جانور ذبح کیا جاتا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس رسم کو باقی رکھا۔

---

(۵۰) حجۃ اللہ' ۱۲/۳۹۱

(۵۱) مسند احمد' ۲/۱۹۴

البتہ اس میں اصلاح فرمائی۔ حضرت بریدہؓ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں ہم لوگوں کا دستور تھا کہ جب کسی کا لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری یا بکرا ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچے کو رنگ دیتا۔ پھر جب اسلام آیا تو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہمارا طریقہ یہ ہو گیا کہ ساتویں دن عقیقہ کی بکری یا بکرے کی قربانی کرتے اور بچے کا سر صاف کرا کے اس کے سر پر زعفران لگا دیتے۔

آنجنابؐ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے لیے دو اور لڑکی کے لیے ایک جانور ذبح کیا جاتا۔ عمرو بن شعیبؒ اپنے والد کے ذریعے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَن وُلِدَ له ولَدٌ فَاَحَبَّ ان يَنسِك عَنهُ فَلْيَفعَل عَنِ الْغلام شاتان مكافاتان وَعَنْ الجَارِيَة شاةٌ (۵۱)۔

جس کے بچہ پیدا ہوا، اس کی طرف سے عقیقہ قربانی کرنا چاہیے۔ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرے۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقیقہ فرض و واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اگر کر لے تو اچھا ہے نہ کرے تو گناہ نہیں۔ البتہ حضور ﷺ کے ایک ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے فدیہ ادا ہوتا ہے۔ سلمان بن عامر الضبیؒ بتاتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا:

مع الغلام عقيقة فاهر يقوا عنه دما و اميطوا عنه الاذى (۵۲)

"بچے کے ساتھ عقیقہ ہے۔ لہٰذا بچے کی طرف سے قربانی کرو اور اس کا سر صاف کروا دو"۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے نواسوں حسنؓ اور حسینؓ کا عقیقہ کیا تھا۔ علیؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے حسنؓ کی پیدائش پر بکری ذبح کی اور سیدہ فاطمہؓ سے کہا کہ بچے کا سر منڈوا کر بالوں کے برابر چاندی صدقہ کرو۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن عليٌّ ابن ابى طالب قال: عق رسول الله ﷺ عن الحسن بشاة و قال يا فَاطِمَةُ احلقى راسَه وَ تَصَدّقِي بِزِنَةِ شَعْرِه فضةً فوزناه فكان وزنه درهما او بعض درهم (۵۳)

"علی ابن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہؓ سے فرمایا کہ اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن بھر چاندی صدقہ کر دو۔ ہم نے وزن

---

(۵۲) بخاری کتاب العقیقہ باب اماطة الاذى عن الصبى فى العقيقة /۹۷۴

(۵۳) مصنف ابن ابی شیبہ کتاب العقیقہ ۸/ ۴۷

(۵۴) النساء/ ۳۴

کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے"۔

عقیقہ میں بنیادی حیثیت استطاعت کی ہے اور اگر کوئی دو جانور ذبح نہیں کرسکتا تو ایک بھی کیا جاسکتا ہے۔ عقیقہ کو ایک اسلامی رسم کے طور پر منانا استحباب کے درجہ میں ہے اور ملت ابراہیمی کی رسم قربانی کا تسلسل ہے۔

ختنہ

ختنہ سنت ابراہیمی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی اپنے لڑکوں کا ختنہ کرواتے ہیں۔ ختنہ ساتویں روز کروانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ اسے سات سال تک موخر کیا جاسکتا ہے۔ ختنہ پر جو جدید طبی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کئی قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے اور خاص قسم کی (Infection) سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

حسن سلوک

حسن سلوک ایک جامع اصطلاح ہے جس میں ظاہری پرورش اور روحانی تربیت آجاتی ہے اور یہ والدین کا ایسا رویہ ہے جس سے اولاد کی شخصیت کی تذلیل و تحقیر نہ ہو بلکہ ان کی عزت نفس کو قائم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ مختلف معاشروں میں بعض اوقات بچوں کی حیثیت کو نظر انداز کر کے ان سے عمدہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا مگر اسلام نے تعلیم و تربیت اور پرورش و رہائش میں بچے اور بچی دونوں کو مساوی رکھا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے واضح ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان کی تکالیف برداشت کرنا بڑے اجر کا باعث ہے۔ قرآن میں ہے:

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (۵۴)

"اور ہر ایسے مال کے لیے جس کو والدین اور رشتہ دار لوگ چھوڑ جائیں ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں"۔

حدیث میں وہ تفصیلات موجود ہیں جن سے حسن سلوک کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حسن سلوک آگے بڑھ کر یتیموں بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کو اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے۔ حسن سلوک ایک ادارہ (institution) ہے والدین سے آگے بڑھ کر پورے معاشرے کو سمیٹ لیتا ہے یعنی ہر بڑا آدمی چھوٹے سے حسن سلوک کرے اور ہر چھوٹا ہر بڑے سے عزت و احترام سے پیش آئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا (۵۵)

"جو چھوٹے پر رحم نہیں کرتا اور بڑے کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں"۔

---

(۵۵) ترمذی ابواب البر و الصلہ باب ماجاء فی رحمۃ الناس ۲/۱۴

اہمیت

بچے قوم کا وجود اور مستقبل کے والدین ہیں۔ معاشرہ انہی سے تشکیل پاتا ہے۔ جو معاشرہ جس طرح اپنے بچوں کی تربیت کرے گا اسی طرح کے افراد اس معاشرے کا مرتب مواد ہوں گے۔ بچے کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک اسے ذمہ دار اور باشعور بنا دیتا ہے۔ اس کی اچھی تربیت اسے معاشرے کا اچھا فرد ثابت کرتی ہے۔ کوئی قوم جس طرح کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتی ہے اسے اس طرح کے افراد تیار کرنا ہوں گے اور افراد کی تیاری میں بچپن کی تربیت کو بڑا دخل ہے۔ اگر ہم عملی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اسلام نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو اصول دیے ہیں وہ زیادہ بہتر اور مناسب ہیں۔ آخر میں ہم چند اہم امور پیش کرتے ہیں جو بچوں کی تربیت میں ملحوظ خاطر رہنے چاہئیں۔

(i) بچوں کی نفسیات معلوم کر کے ان سے سلوک کیا جائے۔

(ii) ان کے لیے اچھے تعلیمی مراکز اور عمدہ تربیتی ماحول پیدا کیا جائے۔

(iii) عمدہ کتابیں مہیا کی جائیں۔

(iv) ان کے لیے اچھی اور صحت مند تفریح گاہیں مہیا کی جائیں۔

(v) ان کے لیے اخلاقی اصولوں کی خوبی اور عملی مشق کا انتظام کیا جائے۔

(vi) ان کے لیے ایسا نظام ہو جس میں اعتدال ہو (اس میں بہت سختی ہو نہ بہت نرمی) جس سے ان کی نفسیاتی الجھنوں کا سد باب ہو سکے۔

(vii) مخرب اخلاق اشیاء اور ماحول کو ختم کر دینا چاہیے تا کہ ان کے عمدہ اوصاف تشکیل پائیں اور معصوم ذہنوں پر برے اثرات مرتب نہ ہوں۔

......☆......

حقوق قرابت

7

علمائے معاشرت نے خاندانی نظم میں اقارب کو بھی بیان کیا ہے۔ خاندان کی ابتداء مرد و عورت کے تعلق سے ہوتی ہے' اولاد اس کے ارتقاء کا باعث بنتی ہے اور قرابت دار اسے وسعت بخشتے ہیں۔ معاشرتی نقطہ نظر سے خاندان کے عناصر ترکیبی میں والدین' زوجین' اولاد اور اقرباء نہایت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وہ قریبی اجزا ہیں جو خاندانی وحدت کو برقرار رکھتے ہیں۔ خاندان کے استحکام' ارتقاء' وسعت اور انتشار کا مدار ان اجزاء کے باہمی ربط و تعلق پر ہے' ایک اچھے خاندان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام متعلقہ افراد کو مربوط رکھے دور و نزدیک کے سب رشتہ دار اس وحدت کا جسے خاندان کہا جاتا ہے احساس رکھیں۔ خاندان کی تنظیم میں اولین طور پر یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ خاندان کے مختلف افراد کے باہمی روابط کیسے ہیں؟ اور ان حقوق و فرائض کے تعین میں کیا اصول وضع کئے جائیں؟ اور ان حقوق و فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کیسے کیا جائے؟ خاندان چونکہ پورے نظم اجتماعی کی بنیاد ہے اس لیے اس کا استحکام و انتشار بڑے دور رس نتائج کا حامل ہوگا۔ اقرباء کی باہمی عداوتوں سے خاندانی نظم تباہ ہوتا ہے اور انجام کار پورا معاشرہ اس تباہی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ معاشرے میں اقرباء کے ساتھ اجنبی اور عام افراد بھی زندگی گزارتے ہیں اور ان افراد کے باہمی تعاون پر اجتماعیت زندہ رہتی ہے اس۔ جس معاشرے کے لوگ اپنے خونی رشتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں ان سے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ عام افراد معاشرہ کا لحاظ کریں گے۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں اقرباء کو خصوصی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کئی مذہبی اور غیر مذہبی معاشروں نے خاندانی تنظیم میں اس اہم عنصر کو خصوصی توجہ سے دیکھا ہے۔ اسلامی معاشرے میں اقرباء کو عزت کا مقام دیا گیا ہے۔ والدین' اولاد اور زوجین کی طرح اہل قرابت کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ قرآن پاک نے اقرباء کے حقوق بیان کئے ہیں اور والدین کے بعد رشتہ داروں کا ذکر کیا ہے۔ ان حقوق میں حسن سلوک' مالی اعانت' عفو و درگزر اور عزت و احترام کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قرآن و سنت نے صلہ رحمی کو مستقل نیکی کا درجہ دیا ہے اور قطع رحمی کو اجتماعی جرم قرار دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے صلہ رحمی کے اچھے اخلاقی اثرات اور قطع رحمی کے برے عواقب سے آگاہ فرمایا ہے قرآن و سنت کی مندرجہ ذیل نصوص اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرتی ہیں۔

حسن سلوک

قرآن مجید نے حسن سلوک میں والدین کے بعد اقرباء کو بیان کیا ہے۔ حسن سلوک انسانی رویہ کا بہترین مظہر ہے۔ اس سے جذبہ حب و عقیدت اور احترام و لحاظ پیدا ہوتا ہے۔ اچھے روابط کے لیے ضروری ہے کہ حسن سلوک کا طریقہ کار رائج ہو۔ قرآن پاک نے اقرباء کو بہت صحیح مقام دیا ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی (۱) ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی (۲)

اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت داروں سے نیکی کرو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ (۳)

اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا تو وہ تم ہی میں داخل ہیں اور رشتہ دار اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حق دار وارث ہیں بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

عن ابی ایوب الانصاریؓ ان رجلا قال یا رسول اللہ ﷺ: اخبرنی لعمل یدخلنی الجنة فقال القوم ملہ؟ فقال رسو ل اللہ ﷺ ارب مالہ فقال البنی ﷺ: تعبد اللہ لا تشرک بہ شیئا وتقیم الصلوة وتوتی الزکوة وتصل الرحم ذرھا۔ قال: کأنہ کان علی راحلتہ (۴)

ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھ کو ایسا کام بتلائیں جو مجھے جنت میں داخل کرے۔ لوگوں نے کہا اسے کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: کیا ہے ایک حاجت ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: بلا شرکت اللہ کی عبادت کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا اور صلہ رحمی کرنا۔ (مہار) کو چھوڑ دو۔ اس نے کہا گویا حضورؐ اپنی سواری پر ہیں۔

عن ابی ھریرةؓ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من سرہ ان یبسط لہ فی رزقہ و ان ینسالہ فی اثرہ فلیصل رحمہ (۵)

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: جس کو یہ پسند ہو کہ اس کے رزق میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو اسے صلہ رحمی کرنی چاہیئے۔

مالی امداد

اقارب کے ساتھ حسن سلوک میں صرف اظہار محبت اور عقیدت و احترام کے رویہ ہی پر بس نہیں کی بلکہ ان کی مالی اعانت بھی لازم قرار دی۔ معاشرتی زندگی میں یہ ضروری ہے کہ دوسرے افراد معاشرہ کا بھی لحاظ رکھا جائے اگر کوئی شخص مالی

---

(۱) البقرہ/۸۳

(۲) النساء/۳۶

(۳) الانفال/۷۵

(۴) بخاری، کتاب الادب، ۲/ ۸۸۵

(۵) ایضاً، کتاب الادب، ۲/ ۸۸۵

وسائل میں کمی کا شکار ہے یا اسے اچھے مواقع میسر نہیں آرہے تو دوسرے افراد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مدد کریں۔
اسلام نے اعانت کا آغاز اقرباء سے کیا۔ اگر کسی شخص کے رشتہ دار بھوکے مر رہے ہیں اور وہ دوسروں کی اعانت کر رہا ہے تو اس نے حق تلفی کی ہے۔ وہ ہر قسم کی امداد کے لیے سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھے قرآن کی مندرجہ ذیل آیات نے اس فریضے کو بصراحت بیان فرمایا۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ (۶) پس قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (۷) اور اہل قرابت کو اس کا حق ادا کر۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (۸) مال کو اس کی محبت پر قرابت داروں کو دیا کر۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَ قْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (۹)
فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ، رشتہ داروں یتیموں اور غریبوں کے لیے ہے۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی (۱۰)
اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت داروں اور محتاجوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (۱۱)
اللہ تعالیٰ تمہیں عدل و احسان کرنے اور اقرباء کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

ان آیات میں مسلم معاشرے کے افراد کو اس فریضے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس کے بغیر نہ خاندانی نظم برقرار رکھا جا سکتا ہے نہ معاشرتی استحکام کی بنیاد ہی استوار کی جا سکتی ہے۔ خاندان کے مختلف افراد میں معاشی تفاوت کا علاج کنبے

---

(۶) الروم/۳۸

(۷) بنی اسرائیل/۲۶

(۸) البقرہ/۱۷۷

(۹) البقرہ/۲۱۵

(۱۰) النور/۲۲۔ اس آیت کے ضمن میں ابن کثیرؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ مسطح بن اثاثہؓ کو کوئی بھی نفع نہیں پہنچائیں گے کیونکہ انہوں نے عائشہؓ کے متعلق اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے صدیقہؓ کی براءۃ کا اعلان فرمایا اور ان مؤمنوں کو جنہوں نے واقعہ افک پر گفتگو کی تھی، معاف فرمایا۔ تو صدیق اکبرؓ کی توجہ اس احسان کی طرف مبذول کرائی جو پہلے فرمایا تھا۔ (مسطحؓ صدیقہؓ کے خالہ زاد تھے ان کی مالی حالت کمزور تھی اور صدیق اکبر ان کی مدد فرماتے تھے) حضرت صدیقؓ نے جب یہ آیت سنی (الا تحبون ان یغفر اللہ لکم) تو فرمایا بلی واللہ انا نحب ان تغفر لنا یا ربنا۔ چنانچہ حضرت صدیقؓ نے وہ امداد بحال کر دی (ابن کثیر ۳/۲۷۶) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرابت داروں کی غلطیوں کے باوجود ان سے حسن سلوک، اور مالی اعانت کے رویہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) النحل/۹۰۔ اس آیت میں حق قرابت کو عدل و احسان کے بعد تیسرے درجہ پر رکھا گیا ہے۔

کے معاشرتی وقار اور انسانی عزت کا باعث ہوگا۔ ہر خاندان اگر اپنے افراد کی معاشی حالت کا کفیل ہو جائے تو معاشرے کو وسیع پیمانے پر انسانی و معاشی ضرورتوں سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک خاندان مجموعی قوت کے ساتھ وسائل حیات حاصل کرنے کے لیے سعی و جہد کرے تو باہمی تعاون سے شاندار نتائج نکل سکتے ہیں۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ خاندان کا ایک فرد خوشحال ہو اور دوسرے اغیار کے رحم و کرم پر ہوں۔

قطع رحمی کی ممانعت

قرآن سنت نے تصریحاً بیان کیا ہے کہ خاندان کو نظر انداز کرنے والا مفسد ہے۔ اس نے خدا سے بدعہدی کی ہے۔ وہ قطع رحمی کا مرتکب ہے اور اسے دنیا و آخرت میں اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۝ اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ (۱۲)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے اور جو خدا کے ساتھ وعدہ کر کے توڑتے ہیں اور خدا نے جسے جوڑنے کو کہا ہے اس کو توڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔

قرآن وسنت نے اس رشتے کے لحاظ کو صلہ رحمی اور اسے نظر انداز کر دینے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا ہے۔ اسلام کی رو سے صلہ رحمی دنیا و آخرت کی فلاح کا باعث ہے اور قطع رحمی دنیا و آخرت کے خسارے کا موجب ہے۔ رسول کریم ﷺ سے قطع رحمی کے سلسلے میں کئی ارشادات مروی ہیں:

عن جبير بن مطعمؓ انه سمع البنی ﷺ يقول: لا يدخل الجنة قاطع (۱۳)

جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ کوئی قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں داخل ہوگا۔

عن عبدالله بن عمروؓ عن البنی ﷺ قال: ليس الواصل بالمكافى ولكن الواصل الذى اذا قطعت رحمه وصلها (۱۴)

عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کرنے والا بدلہ دینے والے کو نہیں کہتے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو اپنے ٹوٹے ہوئے رشتے کو ملائے۔

عن ابی هريرةؓ عن البنی ﷺ قال: ان الله خلق الخلق حتى اذا فرغ من خلقه قامت

(۱۲) البقرہ/۲۶۔۲۷

(۱۳) بخاری، کتاب الادب، ۲/۸۸۵

(۱۴) ایضاً، کتاب الادب، ۲/۸۸۶

الرحم هذا مقام العائذ بك من القطيعة قال: نعم، اما ترضين ان اصل من وصلك وأقطع من قطعك قالت: بلى يا رب! فقال: فهو لك. قال رسول الله ﷺ فاقرا وان شئم: فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا فى الارض وتقطعوا ارحامكم(۱۵)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے یہاں تک کہ جب سب کو پیدا کرنے سے فارغ ہو گیا تو رحم (رشتہ) نے کہا یہ قطع رحمی سے تیری پناہ میں آنے کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تو اس پر راضی نہیں کہ جو تجھ سے ملے میں اس کو ملوں اور جو تجھ سے تعلق توڑتے ہیں اس سے نہ ملوں رحم (رشتہ) نے کہا: اے میرے رب، میں اس صورت میں خوش ہوں۔ اللہ نے فرمایا تجھے یہ حیثیت مل گئی۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا اگر چاہو تو اس آیت کو پڑھو: ''تو کیا اگر پیٹھ موڑ و گے تو کیا فساد کرنے لگو گے یا رشتہ ناطہ چھوڑ و گے؟''

عن عائشةؓ عن البنى ﷺ قال: الرحم شجنة من الرحمان، قال الله: من وصلك وصلته و من قطعك قطعته (۱۶)

عائشہؓ نبی کریمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: رحم (رشتہ) رحمٰن سے لیا گیا ہے جس نے تجھ کو ملایا میں اس سے ملوں گا جس نے تجھ کو نہ ملایا میں اس سے نہ ملوں گا۔

عن عبدالله ابن اوفیؓ قال: سمعت رسول الله يقول: لا تنزل الرحمة على قوم فيه قاطع رحم(۱۷)

عبداللہ بن اوفیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے: اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قوم پر نہیں ہوتی جس میں قطع رحمی کرنے والا موجود ہوتا ہے۔

عن ابى بكرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: ما من ذنب اجدر ان يعجل الله تعالىٰ لصاحبه العقوبة فى الدنيا مع ما يدخره له فى الاخرة من البغى و قطيعة الرحم(۱۸)

ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی گناہ اس لائق نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے مرتکب کو بہت جلد دنیا ہی میں اس کا بدلہ یا عذاب دے اور آخرت میں بھی اس کے عذاب کو جمع رکھے مگر دو گناہ ہیں: امام وقت کے خلاف بغاوت اور قطع رحمی۔

عن عبد الله بن عمروؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لا يدخل الجنة منّان ولا عاق

(۱۵) ایضاً، کتاب الادب، ۲/ ۸۸۵

(۱۶) ایضاً، ۲/ ۸۸۵

(۱۷) شرح السنۃ، ۱۳/ ۲۹

(۱۸) شرح السنۃ، باب تحریم العقوق، ۱۳/ ۲۶؛ ترمذی، کتاب صفة القيامه، باب فى علم الوعيد على البغى و قطعية الرحم/ ۱۷

مُدمن خمر (۱۹)

عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی احسان جتلانے والا، قطع تعلق کرنے والا، اور شراب کشید کرنے والا جنت میں نہیں داخل ہوگا۔

عن ابی اسید الساعدیؓ قال: بین نحن عند رسول الله ﷺ إذ جاء رجل من بنی سلمة فقال یا رسول الله ﷺ: هل یبقی من برابوی شیء أبرهما به بعد موتها ؟ قال نعم! الصلوة علیهما والاستغفار لهما وانفاذ عهدهما من بعدهما وصلة الرحم التی لا توصل الا بهما و إکرام صدیقهما (۲۰)

ابواسید الساعدیؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول خدا ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جب قبیلہ بنوسلمہ کا ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کو میرے لیے کچھ باقی ہے کہ میں ان کے مرنے کے بعد اس کو کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ان کے لیے دعا کرنا، استغفار کرنا اور ان کی وصیت پوری کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا جو صرف انہی کی وجہ سے ہے اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا۔

ان آیات واحادیث سے صلہ رحمی وقطع رحمی کی سادہ سی کیفیت سامنے آگئی ہوگی۔ اسلام نے ان تعلقات کو جتنی اہمیت دی ہے وہ بھی اب محتاج بیان نہیں رہی اور جو تعلیمات دی ہیں انہیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی مثالیں زیادہ تقویت دیتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اگرچہ ان کے قرابت داروں کا سلوک اچھا نہ تھا مگر آپؐ نے زندگی بھر ان کا لحاظ رکھا اور انہیں ہر ممکن سہولت دینے کا اہتمام کیا اور اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں آنے دی۔ انسان کے سامنے حضور اکرم ﷺ کی وہ حدیث رہنی چاہئے کہ صلہ رحمی کا اصل کمال یہ ہے کہ انسان ناخوشگوار تعلق رکھنے والے سے بھی حسن سلوک کرے۔

اہمیت

معاشرتی زندگی میں انسانوں کے باہمی روابط کی حیثیت اس سلسلے کی سی ہوتی ہے جس کی مختلف چھوٹی موٹی کڑیاں باہم جڑی ہوئی ہیں۔ ان تعلقات میں مسلک، پیشہ، عمر، مذاق اور مکتب کی یکسانیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ مختلف اعتبارات سے ہم اس ہم آہنگی کو تسلیم کرتے ہیں اور تعلقات کی استواری و پائیداری میں انہیں عوامل کا درجہ دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تعلقات گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ علائق انسانی میں ان کو جو اہم مقام حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں۔ یہ ایک ایسا زوردار تعلق ہے جو ہر قسم کے معاشرتی اختلاف کے باوجود قائم رہتا ہے۔

(۱۹) شرح السنۃ، باب تحریم العقوق، ۱۳/ ۱۷؛ نسائی، کتاب الاشربہ، باب الروایة فی المومنین فی الخمر/ ۲۶۸
(۲۰) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، ۲/ ۷۰۰؛ ابن ماجہ، کتاب الادب، باب برالوالدین/ ۵۶۵

اقرباء کے حقوق کا لحاظ کرنا ایک فطری تقاضا ہے جسے معاشرتی احساس نے تقویت دی ہے۔ انسان سب سے پہلے گردوپیش کے جن لوگوں سے متعارف ہوتا ہے وہ اس کے اپنے رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔ اس کی ذات پر اسی قربی انس کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے اور وہ انہیں اپنے قریب محسوس کرتا ہے۔ اسلام نے اقرباء کے حقوق کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ اس کا معاشرتی ' اخلاقی اور معاشی اعتبار سے خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ قرار پاتا ہے۔ معاشرتی نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ باہمی محبت و خیر سگالی اور ہمدردی و ایثار کا مرکز ہو کیونکہ اس کے بغیر استحکام نہیں حاصل ہوتا اور معاشرے میں یہ صفات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب خاندان مستحکم ہو اور اس کے افراد میں یہی جذبات کارفرما ہوں۔ اقرباء کو نظرانداز کر کے نہ تو خاندانی نظم برقرار رہ سکتا ہے نہ اس کے استحکام کا تصور ہی قائم رہ سکتا ہے۔ رشتہ دار خاندان کا لازمی جزو ہیں۔ ان کے بغیر اس کی وسعت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی اقرباء کا لحاظ ضروری ہے۔ ہر انسان کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ حسن سلوک' نرم روی اور تعاون کا جذبہ رکھے۔ اس جذبے کے اظہار کا اولین موقعہ اقرباء ہی ہیں۔ انسانی تربیت کا یہ سب سے پہلا مرحلہ ہے اور یہیں سے وہ وسیع تر جذبہ خدمت حاصل ہوتا ہے جو پوری انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اقرباء کا لحاظ رکھنے' ان کی خدمت بجالانے اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنے سے اخلاقی و معاشرتی فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ اقرباء سے گہرا ربط اخلاقی تربیت کا باعث بنتا ہے۔

معاشی تعاون انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ معاشرے کے گرے پڑے افراد یا وہ لوگ جو معاشی جدوجہد کے قابل نہیں ہیں اس امر کے محتاج ہیں کہ ان کی نگہداشت کی جائے۔ اسی طرح وہ افراد بھی مدد کے محتاج ہیں جو معاشی جدوجہد میں بہتر نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ اس تعاون کا آغاز خاندان سے ہو کر پورے معاشرے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ خاندان کے معاشی استحکام سے معاشرتی استحکام پیدا ہوتا ہے اسی لیے اسلام نے معاشی تعاون میں اقرباء کو سرفہرست رکھا۔ اس کے بعد وسیع تر تصور تعاون کا موقعہ آتا ہے۔ غرض کہ اقرباء کا خصوصی لحاظ ایسے معاشرتی اخلاقی اور معاشرتی فوائد کا حامل ہے جس سے پورا معاشرہ مستحکم ہوتا ہے۔

......☆......

8

ہمسایوں کے حقوق

خاندان جو معاشرتی زندگی کی بنیادی اکائی ہے اگر چہ نسلی رشتوں کے لحاظ سے اقرباء پر ختم ہو جاتا ہے لیکن اجتماعی اعتبار سے اس کی پہلی توسیع ہمسایوں کا تعلق ہے۔ ہمسائیگی معاشرتی زندگی کی دوسری اکائی ہے جو رشتہ داروں سے جڑی ہوئی ہے۔ قبائلی زندگی میں ہمسایہ کی ایک حیثیت رہی ہے گو تمدنی زندگی میں ہمسائیگی کا تعلق حقیقی تعلق ہے۔ ہمسایہ وہ شخص یا خاندان ہے جو گھر کے ساتھ رہ رہا ہے۔ ہمسائے ایک دوسرے کے قریب رہنے کی وجہ سے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ انسان کی معاشرتی زندگی کا تعلق ساتھ رہنے، ساتھ چلنے اور ساتھ کام کرنے سے ہے۔ رہائش کا ساتھی، سفر کا ساتھی اور کام کا ساتھی ہمسایے کی تعریف میں آتا ہے قرآن مجید نے ان تینوں قسموں کو بیان کیا ہے:

وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (۱)

رشتہ دار پڑوسی، غیر رشتہ دار پڑوسی اور پہلو والے ساتھی سے حسن سلوک کرو۔

گویا ہمسایہ رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے اور محض ہمسایہ بھی اور تیسری قسم رفیق کار کی ہے۔ ان تینوں حیثیتوں میں ہمسایہ حسن سلوک کا مستحق ہے کیونکہ اسی سے معاشرتی استحکام کا آغاز ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں ہمسایہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

عن عائشۃؓ قالت: قال رسول اللہ ﷺ: ماز ال جبریل یوصِینی بالجار حتی ظننت انہ سیؤرثہ (۲)

عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے جبریلؑ ہمسایوں سے حسن سلوک کے بارے وصیت کرتے رہے کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ انہیں وراثت میں حصہ دار بنا دیں گے۔

اخلاقی حقوق

ہمسایوں سے خوشگوار تعلق معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔ کوئی معاشرہ اخلاقی اعتبار سے مستحکم نہیں ہو سکتا اگر پڑوسی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کا خیال رکھیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے اخلاقی حقوق کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور قانونی طور پر بھی حقوق کا تحفظ فراہم کیا ہے۔

---

(۱) النساء/۳۶

(۲) بخاری، کتاب الادب، باب الوصایا بالجار/۱۰۰۲؛ مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار/۱۱۴۵

ایذاء سے حفاظت

اخلاقی حقوق میں سرفہرست ہمسایہ کا یہ حق ہے کہ وہ ایذا رسانی سے محفوظ ہو۔کوئی پڑوسی ایذا رسانی سے محفوظ ہوئے بغیر مستحکم نہیں ہوسکتا۔حضور اکرم ﷺ سے پڑوسی کو ایذاء سے حفاظت پر کئی احادیث مروی ہیں مثلاً:

عن ابی شریحؓ: ان النبی ﷺ قال: "والله لا یومن والله لا یومن والله لا یومن" قیل: و من یا رسول الله؟ قال: الذی لا یامَنُ جارُہ بوآئقه:(۳)

ابوشریحؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، کسی صحابیؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کون؟ آپؐ نے فرمایا: جس کے شر سے پڑوسی محفوظ نہ ہوں۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من کان یومن بالله والیوم الآخر فلا یُؤذِ جارَہ (۴)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔

عن ابی هریرةؓ یقول: قیل للنبی ﷺ یا رسول الله! اِنّ فلانَةً تَقُوم باللَّیل و تصوم النهار و تَفْعَل و تَصَدق وتُوذِیُ جیرانها بلسانها فقال رسول الله: "لا خیرُ فیها هِی مِنْ اَهل النّار". قالواوفُلانَةٌ تُصَلّی للمکتوب و تُصَدِّق بالأثوار مِنَ الاقط ولا تُوذِی اَحَداً. فقال: "هی من اَهْلِ الجَنَّة (۵)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ فلاں عورت رات بھر نمازیں پڑھتی ہے اور دن کو روزہ رکھتی ہے اور صدقہ بھی کرتی ہے لیکن اپنے پڑوسی کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے۔آپؐ نے فرمایا: وہ جہنم میں جائے گی۔کچھ لوگوں نے کہا کہ فلاں عورت صرف نمازیں پڑھتی ہے، رمضان کے روزے رکھتی ہے کچھ خیرات بھی کر دیتی ہے لیکن کسی کو اذیت نہیں دیتی۔فرمایا: وہ جنت میں جائے گی۔

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ ہمسایہ کو اذیت پہنچانا کتنا بڑا گناہ ہے۔اس کے نتیجے میں اذیت دینے والا جہنم رسید ہوسکتا ہے۔اذیت رسانی کے اخروی نتائج کی طرف توجہ دلا کر دراصل اس اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے جس پر اخلاقی نظام کا دارومدار ہے۔اخروی حوالہ ہی اخلاقی عمل کی بنیاد ہے۔

---

(۳) ایضاً، باب اثم من لا یامن جارُہ بوائقه /۵۲

(۴) ایضاً، باب من کان یومن بالله والیوم الآخر فلا یوذ جارہ /۱۰۵۲

(۵) ادب المفرد، باب من لا یوذی جارہ/۱۳۲؛ کنز العمال حدیث: ۲۵۶۱۵؛ رواہ البیہقی فی شعب الایمان؛ مسند احمد، ۲/۴۴۰

حسن سلوک

حسن سلوک وہ مطلوب طرز عمل ہے جو والدین سے لے کر معاشرے کے عام فرد تک پھیلا ہوا ہے۔ حسن سلوک دلوں کو جوڑنے' تعلقات کو مضبوط کرنے اور معاشرتی روابط کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ حسن سلوک باہمی محبت کی فضا پیدا کرتا ہے اور نفرتوں کو زائل کرتا ہے حضور اکرم ﷺ نے پڑوسی کے لیے حسن سلوک کو پسند کیا اور بدسلوکی کو ناپسند فرمایا:

عن انسؓ بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ: والذی نفسی بیده لا یومن عبدحتی یحب لجاره. اوقال لاخیه مایحب لنفسه (٦)

انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اس وقت تک کوئی بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی یا پڑوسی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔

عن ابی هریرةؓ عن رسول الله ﷺ: قال: من کان یُومِنُ باللّٰه والیَومِ الآخِرِ فَلْیُکرِمْ جارَه (٧)

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔

عن عبداللّٰهؓ بن عمرو بن العاص عن رسول الله ﷺ قال: خیر الاَصحاب عند اللّٰه تعالیٰ خیر هم لِصاحبه و خیر الجیران عند اللّٰه خیر هم لجاره (٨)

عبداللہؓ بن عمر بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک پڑوسیوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔

مالی خدمت

ہمسایوں کی مالی خدمت کرنا اخلاقی حق ہے مسلمان معاشرے کی خصوصیت ہے کہ اس کے کھاتے پیتے لوگ مستحق لوگوں کی خدمت کرتے رہیں۔ مسلمانوں کی بستیاں امیر و غریب دونوں پر مشتمل ہوتیں اور امیر اپنے غریب پڑوسیوں پر خرچ کرتے۔ یہ مغربی تہذیب کا اثر ہے کہ امیروں نے اپنی الگ بستیاں اور کالونیاں بسانی شروع کی ہیں تاکہ ان تک کوئی حاجت مند نہ پہنچ سکے اور اڑوس پڑوس کھاتے پیتے لوگوں پر مشتمل ہوتا کہ کوئی کسی کی مدد کا محتاج نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ ہمسایہ کی خدمت کتنی اہم ہے:

---

(٦) مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه/٤٠

(٧) ایضاً' باب الحث علی اکرام الجار /٤١

(٨) ادب المفرد' باب خیر الجیران /١٣٠؛ مسند احمد ٢/ ١٦٨؛ مستدرک ١/ ٤٤٣

عن ابی عمرؓ قال: سَمِعْتُ النبی ﷺ یقول: کَمْ مِنْ جارٍ مُتَعَلِّقٍ بجاره یوم القیامة یقول: یا ربِّ هذا أَغْلَقَ بَابَه دونی ' فمنع معروفه (۹)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن بہت سے ایسے پڑوسی ہوں گے جو اپنے ہمسایوں کا دامن تھامے کہیں گے: یا ربؐ اس نے اپنا دروازہ مجھ پر بند کر رکھا تھا اور روزمرہ استعمال کی چیزوں کو روکے رکھتا تھا۔

عن ابن الزبیرؓ یقول: سمعت رسول الله یقول: لیس المومن الذی یشبع و جاره جائعٌ (۱۰)

عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص مومن نہیں جو خود تو شکم سیر ہو لیکن اس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔

عن ابی ذرؓ قال: قال النبی ﷺ: یا ابا ذر اذا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَکَثِّر ماءَ المَرَقَةِ و تعاهَد جیرانَك. او أَقْسِمْ فی جیرانِك (۱۱)

جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر دیا کرو تا کہ ہمسایہ کو بھی دے سکو۔

عن عائشۃؓ قالت: قلت: یا رسول الله ﷺ: اِنّ لی جارین فالی أیهما أهدی؟ قال: "الی أَقْرَبهما مِنْك باباً" (۱۲)

ام المومنین عائشہؓ فرماتی ہیں: ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ میرے دو پڑوسی ہیں ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجا کروں۔ آپؐ نے فرمایا: جس کا دروازہ تمہارے گھر کے قریب ہو۔

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کو اپنے ہمسایوں کے بارے میں کیسا رویہ رکھنا چاہیے۔

جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت

ہمسایہ کا حق ہے کہ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو اس کے ہمسایہ سے محفوظ ہو۔ ہمسایہ نہ صرف یہ کہ اسے نقصان نہ پہنچائے بلکہ اس کی حفاظت کرے۔ ہمسایہ کے حق کی حفاظت نہ کرنا اور اس کی جان و مال یا عزت و آبرو کو نقصان پہنچانا بڑا گناہ قرار دیا گیا اور حضور اکرم ﷺ نے اس پر شدید وعید سنائی ہے۔

عن عبداللهؓ قال: قلت یا رسول الله ای الذنب اعظم؟ قال: "ان تجعل لله ندّاً و هو خلقك قال: ثم اَیّ قال: ان تَقْتُلَ وَلَدَ ك خشیة اَنْ یاکُل معك "قال: ثُمَّ اَیّ؟ قال : "ان تزنی حَلِیْلَةَ

(۹) ادب المفرد، باب من اغلق الباب علی الجار/ ۱۲۷

(۱۰) ایضاً باب من لا یشبع دون جاره/ ۱۲۷

(۱۱) ایضاً باب یکثر ماء المرق فیُقسم فی الجیران /۱۲۹

(۱۲) بخاری، کتاب الادب، باب حق الجوار فی قرب الابواب/۱۰۵۲

جارک" (۱۳)

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا: اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جب کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے اس نے عرض کیا پھر کون سا؟ اپنی اولاد کو اس لیے قتل کر دینا کہ بڑے ہو کر تیرے ساتھ کھائیں گے۔ اس نے عرض کیا پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا: پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرنا۔

عن المقداد بن الاسود یقول: سأل رسول الله ﷺ: اَصْحَابه عن الزنا قالو: حرام حَرَّمَه الله و رسوله' قال: لَأَن يَزْنِیَ الرَّجُلُ بِعَشْرِ نِسْوَةٍ اَيْسَرُ عَلَيه مِنْ اَنْ يَزْنِیَ بِامْرَأَةِ جاره. وَ سَأَلَهُم عن السَّرَقَةِ؟ قالو: حرام' حرمه الله و جَلَّ وَ رَسُوله. فقال لِأَن يَسْرِق من عَشْرة اهل اَبْيات' اَيْسَرُ عليه مِنْ اَن يَسْرِق من بيت جارِه (۱۴)

آپؐ نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے زنا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ حرام ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ بدکاری کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔ پھر چوری کے بارے میں سوال کیا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ حرام ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ فرمایا: پڑوسی کے گھر میں چوری کرنا دس گھروں میں چوری کرنے سے زیادہ سنگین ہے۔

عن ابی موسیٰؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لا تقوم الساعة حتی یقتل الرَّجُل جاره و اخاه و اباه (۱۵)

ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہو گی جب تک لوگ اپنے ہمسایوں اور اپنے بھائیوں اور باپوں کو قتل نہیں کریں گے۔

ہمسایہ کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے سلسلے میں اس سے زیادہ سخت بات کیا ہو سکتی ہے؟ آپؐ کے یہ ارشادات ہمسایہ کے حق کی حفاظت کا عمدہ بیان ہے۔ اسی سے وہ اہمیت واضح ہوتی ہے جو اسلام' جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو دیتا ہے۔

---

(۱۳) بخاری' کتاب الادب' باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ/۱۰۵۰۔ مسلم' کتاب الایمان' باب کون الشرک اقبح الذنوب/۵۳

(۱۴) ادب المفرد' باب حق الجار/۱۰۴

(۱۵) ایضاً' باب الجار السوء/۱۳۱

بیمار پرسی

صحت و مرض انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ صحت کی حالت میں اس آگاہ رہنا اور بیماری کی صورت میں مدد کرنا اور بیمار پرسی کرنا انسانی تعلق کی جان ہے۔ ہمسایہ کے احوال سے آگاہ رہنا اور دکھ سکھ میں مددگار رہنا حسن معاشرت کا تقاضا ہے۔ ہمسایہ سے حسن سلوک میں مسلمان یا غیر مسلم ہونا برابر ہے۔ انسانی سطح پر خوشگوار تعلق رکھنا اسلام کے عین مطابق ہے۔ حسن معاشرت کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ غیر مسلم پڑوسی بھی اسی حسن سلوک کا مستحق ہے جس کا مسلمان مستحق ہے۔

بریدہؓ سے روایت ہے: ہم رسول کریمؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپؐ نے فرمایا ہمارے ساتھ چلو ہم اپنے یہودی ہمسائے کی عیادت کرنا چاہتے ہیں۔ بریدہؓ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پاس پہنچے تو آپؐ نے فرمایا: کیا حال ہے؟ تیرا دل کیسا ہے؟(۱۶)

آزادی کی حفاظت

آزادی ایک انسان کا بنیادی حق ہے جس کی ہر صورت میں حفاظت ہونی چاہیے۔ اپنی آزادی کی حفاظت کے ساتھ ہمسایہ کے حق آزادی کی حفاظت کرنا بے حد ضروری ہے۔

بشر بن حکیمؓ کی روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ ایک صحابیؓ نے خطبہ جمعہ کے دوران دریافت کیا: میرے ہمسایہ کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ سوال سن کر کوئی جواب نہ دیا تاکہ کوتوال شہر وضاحت کرے لیکن جب تیسری مرتبہ صحابیؓ نے سوال کیا اور کوتوال نے کوئی وضاحت نہ کی تو آپؐ نے حکم دیا: خلواله جیرانه۔ اس کے پڑوسی کو رہا کرو۔ ابوداؤد نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

عن بهزابن حكيم عن ابيه عن جَدّه انـه قام الى النبي ﷺ وهو يخطب فقال: جيراني بما أخذوا؟ فاعرض عنه مرّتين ثم ذكر شيئاً. فقال النبي ﷺ خلواله عن جيرانه (١٧)

قانونی حقوق

اسلامی قانون نے پڑوسی کی خصوصی حیثیت کا تحفظ کیا ہے اور بعض معاملات کو قانونی شکل دی جیسے قانونی شفعہ۔

شفعہ

شفعہ ہمسایہ کا شرعی و قانونی حق ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنی جائیداد فروخت کرنا چاہتا ہے تو

---

(۱۶) کتاب الآثار، کتاب الایمان

(۱۷) ابوداؤد، کتاب القضاء، باب فی الحبس فی الدین ۴/ ۴۷

اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ہمسایہ سے پوچھے کہ اسے اس جائیداد کے خریدنے میں دلچسپی ہے؟ اگر وہ دلچسپی کا اظہار کرے تو اسے خریدنے کا اولین حق ہے اگر وہ نہ خریدنا چاہے یا قیمت کے بارے میں امور طے نہ ہوں تو وہ کسی دوسرے خریدار کو بیچ سکتا ہے۔ اگر ہمسایہ کو پوچھے بغیر جائیداد فروخت کی تو ہمسایہ عدالت میں حق شفعہ کی بناپر مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے مروی ہے۔

عن جابرؓ قال: قضی النبیؐ بالشفعة فی کل مالَمْ یُقسَم فاذا وقعت الحدود و صرفت الطرق فلا شفعة (۱۸)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر منقسم چیز میں شفعہ کا حکم دیا۔ جب حدود متعین ہو جائیں تو اور رستے بند ہو جائیں تو کوئی شفعہ نہیں۔

عن جابرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ الجار حق بشفعته یُنتظَرُ لاوَ اِن کان غائباً، اذا کان طریقهما واحداً (۱۹)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اگر وہ غائب ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے تاہم یہ شفعہ اس وقت ہوگا جو دونوں کا راستہ ایک ہو۔

عن جابرؓ قال قضی رسول اللہ بالشفعة فی کُل شرکة لم تقسم ربعةٍ اوحائط لا یحل له ان یبیع حتی یُوذن شریکه فان شاء اخذ و ان شاء ترک و ان باع و لم یُوذنه فهوا حق به (۲۰)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ہر مشترک چیز میں جب تک وہ تقسیم نہ ہوئی ہو شفعہ کا حکم دیا ہے خواہ مکان ہو یا باغ، مالک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے شریک کو اطلاع دیئے بغیر اسے فروخت کر دے۔ شریک کو اختیار ہے کہ وہ اس جائیداد کو حاصل کرے یا چھوڑ دے۔ اگر مالک شریک کو اطلاع دیئے بغیر فروخت کر دے تو شریک اس کا زیادہ مستحق قرار پائے گا۔

رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ سعدؓ نے اپنا ایک گھر مجھے پیش کیا اور کہا کہ اسے لے لو اور یہ کہا کہ اگرچہ مجھے اس کی اس سے زیادہ قیمت ملتی ہے جو تم پیش کرتے ہو، تم اس کے زیادہ مستحق ہو کیونکہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا ہے کہ پڑوسی کے ہوتے ہوئے اجنبی آدمی خریدنے کا حق نہیں رکھتا۔ (۲۱)

......☆......

(۱۸) بخاری، کتاب الشفعہ، السلم فی الشفعہ/ ۳۵۹؛ نسائی، کتاب البیوع، باب ذکر الشفعہ واحکامھا/ ۶۴۶

(۱۹) ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی الشفعہ للغائب/ ۳۳۱؛ ابن ماجہ، ابواب الشفعہ، باب الشفعہ بالجوار/ ۳۵۷

(۲۰) نسائی، کتاب البیوع، باب الشرکۃ فی الرباع/ ۶۴۶؛ مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الشفعہ/ ۷۰۳

(۲۱) کتاب الآثار، باب الشفعہ؛ پڑوسی کے زیادہ حق دار ہونے کی روایت مختلف کتب حدیث میں آئی ہے مثلاً جار الدار احق بدار الجار اور الارض، ابن ماجہ، کتاب البیوع، باب الشفعہ/ ۵۰۶

9

خدمتگاروں کے حقوق

اب تک خاندان کے جن اجزاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت نسلی ہے۔ میاں بیوی کا تعلق اگر نسلی رشتوں پر مبنی نہ بھی ہو تو بھی افزائش نسل کا باعث ضرور ہے۔ والدین، اولاد اور اقربا یقیناً نسلی بنیادوں پر مرتبط ہوتے ہیں۔ خدمت گاروں کا اگرچہ نسلی تعلق نہیں تاہم خاندان کے استحکام میں ان کا بنیادی کردار ہے۔ گو تمام خاندان خدمت گزار رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تاہم اکثر صاحب حیثیت خاندانوں کے ہاں خدمت گار پائے جاتے ہیں۔ دور حاضر میں خدمت گار ملازم دو قسم کے ہیں جز وقتی اور کل وقتی۔ ان میں گھر کی صفائی کرنے والے، برتن اور کپڑے دھونے والے، ڈرائیور اور مستقل خدمت گزار شامل ہیں۔ اب ان کے لیے گھریلو ملازم (Domestic Servant) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ عام طور پر تنخواہ یا اجرت کے سوا ان کے کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ وقتاً فوقتاً مالی اعانت پرانے کپڑے، جوتے یا اشیاء ضرورت کا عطیہ کافی سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ معاشرتی بیداری پیدا ہوئی ہے اس لیے شہری خدمت گار اور ملازم اپنے کام، اوقات کار اور اجرتوں کے بارے میں مناسب سوداکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں تاہم دیہاتوں میں ابھی تک یہ شعور موثر نہیں اور استحصال کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں خدمت گاری کا روایتی تصور نہیں ہے۔ بہت اعلیٰ خاندانوں میں اس کی بعض صورتیں موجود ہیں۔ جیسے ڈرائیور، صفائی کرنے والے، مالی، بچوں کی نگہداشت کرنے والی عورتیں وغیرہ لیکن ان معاشروں میں اجرتوں کا ایک متعین نظام ہے اور اس کے لحاظ سے ان کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ البتہ حکمرانوں کے ہاں کام کرنے والوں کے معاملات قابل غور ہیں بالخصوص تیسری دنیا بشمول مسلم ممالک کے حکمرانوں کے ہاں کام کرنے والوں کے حقوق کا مسئلہ گھمبیر ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے ہاں وسائل رزق کی فراوانی ہوئی تو ان کی مڈل کلاس نے بھی گھریلو ملازمین رکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان ملازمین میں بیشتر غریب ملکوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان کی اجرتیں کم، استحصال زیادہ اور حقوق ندارد۔ ان کی اکثریت مقامی زبانوں سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اور ملک کے نظام عدل کی کوتاہی کے باعث بڑے مظالم کا شکار ہوتی ہے۔ انفرادی معلومات کی بنا پر بعض حیرت انگیز داستانیں سننے میں آئی ہیں مثلاً میاں بیوی کو ملنے کی اجازت نہیں، ماں کو بچوں سے الگ رکھا گیا۔ اجرت کم ہونے کے ساتھ کئی کئی ماہ اجرت کو مؤخر کر دیا گیا اور بعض کو محروم کر دیا گیا۔ پاسپورٹ وغیرہ اپنے قبضے میں رکھ کر درحقیقت ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ان میں سے بعض تشدد کا شکار بھی ہوئے اور بالخصوص خواتین کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود عصر حاضر کا ملازم نسبتاً آزاد اور خود مختار ہے۔

قدیم خاندان کا خدمت گار زرخرید غلام ہوتا تھا اس لیے کہ اس کے کوئی حقوق نہ تھے۔ وہ اپنے مالک کے رحم و کرم پر تھا وہ اسے جس طرح رکھے، جو کام لے اور جس طرح کا سلوک کرے اسے برداشت کرنا پڑتا، کیونکہ اس سے نکلنے کا کوئی

راستہ اس کے پاس نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ جرم کا ارتکاب کرے اور قتل ہو جائے۔ قدیم معاشروں میں غلام خاندان کا حصہ تھے۔ کیونکہ انہی کی خدمت گذاری پر خاندان کی نشو ونما اور اس کے استحکام کا دارو مدار تھا۔ یونانی، رومی، ایرانی، ہندی اور عربی معاشروں میں غلام ایک اہم جز کے طور پر موجود نظر آتے ہیں۔ غلام معاشرے کا سب سے پست طبقہ تھا۔ اس طبقہ میں اسیران جنگ، مجرم اور مقروض بھی اکثر غلام بنائے جاتے تھے۔ انسانوں کی باقاعدہ منڈیاں لگتیں جہاں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح بکتے۔ رومی معاشرے میں غلاموں کے کوئی انسانی حقوق نہ تھے حتیٰ کہ تفریح کے لیے انہیں درندوں سے لڑایا جاتا تھا۔ یونان میں غلامی کا عام رواج تھا۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح' اور ایک کھلونا ہے مگر جاندار۔ یونان میں دو قسم کے غلام تھے ایک وہ جو عسکری طور پر مغلوب ہو گئے اور دوسرے وہ جنہیں بازار سے باقاعدہ خریدا گیا۔ پہلی قسم کے غلام زمینوں کے تابع تھے اور وہ زمینوں کی خرید و فروخت میں ساتھ بکتے تھے جب کہ دوسری قسم کے غلام حقیقی معنوں میں بے بس انسان ہوتے جو مالک کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ مصر میں غلامی کا عام رواج تھا۔ حکمرانوں' عسکری افسروں اور کاہنوں کے ہاں غلام پائے جاتے اور ہر قسم کی خدمت گذاری کے لیے تیار رکھے جاتے۔ ایرانی معاشرے میں غلاموں کی کثرت کو وجاہت کا ذریعہ اور امارت کا اظہار سمجھا جاتا۔

ان معاشروں میں غلاموں کی معمولی خطا پر قتل تک کیا جاتا تھا۔ انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور غلام کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ ہندوؤں نے اپنے معاشرتی نظام میں خدمت گذاروں کا ایک طبقہ منظم کیا جن کا کام خدمت کرنا تھا اور ان کا کوئی انسانی حق نہ تھا۔ انہوں نے قانونی طور پر اس طبقے کو نچلی سطح پر رکھنے کے ضابطے بنائے۔ انہیں شودر کا نام دیا اور انہیں ہر قسم کے عز و شرف سے محروم کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ طبقہ اب بھی محرومی کے سائے میں زندگی گذار رہا ہے لیکن آزاد دنیا ہندو معاشرت کے اس ظالمانہ طرز عمل پر کوئی احتجاج نہیں کرتی۔ مغرب کی استعماری اقوام نے دیگر قوموں کو عسکری قوت کے بل بوتے پر سیاسی غلامی میں تو جکڑا ہی تھا اس نے افریقہ سے آزاد انسانوں کو پکڑ کر غلامی کی زنجیروں میں بھی جکڑا۔ امریکہ اور جزائر غرب الہند میں غلاموں سے آبادکاری کا کام لیا گیا۔ غلامی کو اگرچہ قانوناً ختم کر دیا گیا ہے لیکن ان غلاموں کی نسلیں ابھی تک انسانی حقوق کے حصول میں کوشاں ہیں۔ سفید اقوام کی بالادستی میں دیگر اقوام کی غلامی کے واضح آثار اب بھی نظر آ رہے ہیں۔

حسن سلوک

حضور اکرم ﷺ نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس میں بھی باندیاں اور غلام موجود تھے۔ بعثت نبویؐ سے قبل عرب معاشرے میں غلاموں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ ہر وقت محنت و مشقت پر مجبور کیا جاتا۔ اچھا کھانا مہیا ہوتا نہ تن ڈھانپنے کو پورے کپڑے میسر آتے ذرا سی غلطی پر مار پیٹ ہوتی۔ بعض اوقات غلام اپنی زندگی سے ہاتھ دھو

بیٹھتا۔ باندیاں نہ صرف اپنی عزت وآبرو کھو بیٹھتیں بلکہ بعض مالک ان سے قحبہ گری کرواتے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی دعوت میں معاشی استحصال اور انسانی تذلیل کو خصوصی موضوع بنایا۔ قرآن نے خاندان کے استحکام میں نہ صرف والدین اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے بلکہ خدمت گار غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا(۱)

اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قرابت داروں کے ساتھ بھی اور یتیموں مسکینوں، قریبی پڑوسی اور دور کے پڑوسی اور پاس والے ساتھی اور مسافر کے ساتھ بھی۔ اور ان کے ساتھ جو تمہارے دائیں ہاتھ کی ملکیت ہیں۔ اور اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا اور فخر کرنے والا ہے۔

حسن سلوک کا یہ مضمون قرآن پاک میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے(۱) مختلف ربط میں الگ الگ انداز سے اس کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ انسانی معاشرت کا استحکام حسن سلوک اور اچھے طرز عمل سے ہوتا ہے اس لیے معاشرے کے تمام اجزاء اس سلوک کے مستحق ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں حسن سلوک کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ آپؐ سے منقول ہے:

عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: ثلاث من كن فيه يسّر الله كنفه و ادخله الجنة رفق بالضعيف والشفقة على الوالدين والاحسان الى المملوك(۲)

جس میں تین صفات ہوں اللہ اس کی موت کو آسان کر دیتا ہے اور اسے جنت میں داخل کرتا ہے کمزور کے ساتھ نرمی، والدین کے ساتھ مہربانی اور غلاموں کے ساتھ احسان۔

حسن الملكة يمن وسوء الخلق شئوم. (۳) حسن سلوک باعث برکت ہے اور بد خلقی بدبختی ہے۔

ملازموں کے ساتھ حسن سلوک میں کئی چیزیں آتی ہیں۔ انہیں مناسب خوراک ولباس مہیا کرنا، ان کی غلطیوں کو معاف کرنا، سخت سزا سے اجتناب کرنا اور مختلف اخلاقی اور مالی معاملات میں مدد کرنا۔

خوراک ولباس

اسلام سے پہلے غلاموں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا تھا اس میں ان کے لباس اور خوراک کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ غلاموں / ملازموں کو وہی کھانا دیا جائے جو مالک خود کھاتا ہے اور اسی طرح کا لباس دیا جائے جو

---

(۱) النساء/۳۶ (۲) ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء في شدة الوعيد/۵۶۷

(۳) ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق المملوک/۷۶۵

مالک خود پہنتا ہے۔

عن ابی ذرؓ قال رسول اللہ ﷺ: ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل و لیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوھم ما یَغْلِبُھم فان کلفتموھم ما یَغْلِبُھم فا عینوھم(۴)

ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غلام اور باندیاں تمہارے بہن بھائی ہیں۔ اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے سو جس بہن بھائی کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے تصرف میں دیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ جیسا خود کھاتا ہے ویسا ہی ان کو کھلائے اور جیسا خود پہنتا ہے ویسا ہی ان کو پہنائے۔ ان کو ایسے کام پر مجبور نہ کیا جائے جو ان کی طاقت سے بالاتر ہو۔ اگر کوئی ایسا کام ہو تو مالک کو اس میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ چنانچہ ابو ذرؓ جو خود کھاتے اور پہنتے تھے وہی غلام کو کھلاتے اور پہناتے تھے۔

ابو ذرؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم لوگوں میں سے کسی کا خادم کھانا تیار کر کے لائے، چونکہ اس نے کھانا پکانے میں آگ کی گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے اس لیے اس کو ساتھ بٹھا کر کھلانا چاہیے اگر کھانا کم ہو تب بھی اس کے ہاتھ پر چند لقمے رکھ دینے چاہئیں(۵)

قال عمرؓ لحا اللہ قوماً یرغبون عن ارقائھم ان یاکلوا معھم(۶)

اللہ تعالیٰ برا کرے ان لوگوں کا جو اپنے غلاموں کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر یوں بھی ایک اخلاقی وصف ہے جو ہر مومن میں ہونا چاہیے اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں اس کا اظہار ہونا چاہیے لیکن غلاموں اور نوکروں کے ساتھ عفو و درگذر کا رویہ خصوصی طور پر پسندیدہ ہے۔ عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا کہ ہم خدمت گاروں کے قصوروں کو کتنی مرتبہ معاف کریں۔ آپؐ خاموش رہے۔ اس نے اپنی بات کو دہرایا تو بھی آپؐ خاموش رہے جب تیسری دفعہ اس نے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

کل یوم سَبْعِیْنَ مرۃ ۔ ہر روز ستر دفعہ معاف کیا کرو(۷)

آپؐ کے مختلف ارشادات میں غلاموں/ ملازموں کو بھائی بند قرار دیا گیا۔ آپؐ نے اخوت کے اسلامی اور انسانی

---

(۴) بخاری، کتاب العتق، باب قول النبیؐ العبید اخوانکم فاطعموھم مما تاکلون/۳۱۱

(۵) ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ، باب اذا اتاہ خادمہ بطعامہ/۴۷۷

(۶) ادب المفرد، باب ھل یجلس خادمہ اذا اکل/۱۷۲

(۷) ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی العفو عن الخادم/۳۵۳؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی حق المملوک/۳۵۷

رشتے کو غلاموں/ ملازموں تک پھیلایا ہے۔اس توسیع نے معاشرتی استحکام کو نئی طرح متعارف کرائی۔آپؐ سے اس سلسلے جو کچھ منقول ہے اس میں صرف دو بیانات نقل کیے جاتے ہیں:

قَال رسول اللهﷺ: انهم اخوانكم فضلكم الله عليهم فمن لم يلائمكم فبيعوه ولا تعذبوا خلق الله (٨)

تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت دی ہے۔جو تمہارے لیے مناسب نہ ہو اسے فروخت کر دو اللہ کی مخلوق کو اذیت نہ دو۔ایک اور روایت میں ہے:

اخوانكم خولكم جعلهم الله تحت ايديكم فمن كان اخوه تحت يده فليطعم مما يأكل وَلَيكسُه مماَ يلْبَس و لا يكلّفه ما يَغْلِبهُ ، فان كلفه ما يَغلبه فليعنه (٩)

تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے قبضہ میں دیا ہے۔جس کا بھائی اس کے قبضے میں ہو تو اسے چاہیے کہ اسی میں سے کھلائے جس میں سے خود کھاتا ہے اور اسی میں سے پہنائے جس میں سے خود پہنتا ہے۔اور ان پر اتنا کام نہ ڈالو جو ان کے بس سے باہر ہو سو اگر ان کو ایسا کام بتاؤ جو ان کے بس سے باہر ہو تو ان کی مدد کرو۔

ملازموں کو مارنے سے ممانعت

عربوں کے ہاں رواج تھا کہ معمولی معمولی خطاؤں پر غلاموں کو سخت مارا پیٹا جاتا تھا۔حضور اکرم ﷺ نے جہاں عفو و درگزر کا حکم دیا وہاں مار پیٹ کی ممانعت فرمائی۔کتب حدیث میں حضورؐ کے ارشادات اور عملی اقدامات کے واقعات منقول ہیں: مثلاً

عن ابی سعيد الخدريؓ قَال: قَال رسول اللهﷺ: اذا ضرب احدكم خادمه فذكر الله فارْفَعُوا ايديكم (١٠)

ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کو مارے اور وہ اللہ کو یاد کرے تو تم اپنے ہاتھ اٹھا لو۔

عن ابی مسعودؓ قال: كنت اضرب غلاماً فسمعت من خلفی صوتاً: اعلم ابا مسعود ا الله اقدر عليك منك عليه. فالتفت فاذا هو رسول الله. قلت : يا رسول ا فهو حُرٌّ لِوجه الله. فقال: اَما

---

(٨) ابوداؤد، كتاب الادب، باب فی حق المملوك ٢٢٣/٧

(٩) ایضاً ادب المفرد، باب سباب العبيد ١٧١/

(١٠) ترمذی، ابواب البر والصله ، باب ما جاء فی ادب الخادم ٣٥٣/

ان لولم تفعل لَمَسَّتْكَ النار اوللفحتك النار (۱۱)

ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی: ابو مسعودؓ جان لو! ابو مسعودؓ جان لو! مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تھے۔ آپؐ نے فرمایا: تم کو اپنے غلام پر جو قدرت ہے اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے بھی زیادہ قدرت حاصل ہے۔ ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یا رسول اللہؐ: یہ اللہ کے لیے آزاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرتے تو تمہیں آگ اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

عن جابرؓ بن عبداللہؓ یقول: کان النبی ﷺ یوصینی بالمملوکین خیراً و یقول: اطعِموھم مما تاکلون والبسوھم من لبوسکم۔ ولا تعذبوا خلق اللہ (۱۲)

جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ باندیوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے اور فرماتے: جو تم خود کھاتے اور پہنتے ہو وہی ان کو کھلاؤ اور پہناؤ اور اللہ کی مخلوق (غلام/ ملازم) کو سزا نہ دو۔

عن ابن ھانیٔ عن ابی امامۃ سمعتہ یقول: الکنودالذی یَمنَع رِفدہ، و ینزِلُ وَحدَہ و یضرب عَبْدہ (۱۳)

ابن ھانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوامامہؓ کو کہتے سنا کہ ناشکری کرنے والا وہ ہے جو اپنے عطیات روک لیتا ہے، لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اپنے غلام کو مارتا ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ، ان رسول اللہ ﷺ قال: الا انبئکم بِشرارکم الذی یاکل وحدہ و یجلد عبدہ و یمنع رِفْدَہ (۱۴)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو برے لوگوں کے متعلق نہ بتاؤں۔ برا وہ شخص ہے جو اکیلا کھائے اپنے غلام کو مارے اور اپنی خیرات روکے رکھے۔

ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے غلاموں اور ملازموں کے بارے میں ایک نئے کلچر کی بنیاد رکھی۔ ایک ایسا رویہ جو انسان دوستی پر مبنی ہے۔ رحمت و شفقت کا مظہر ہے اور عفو و درگذر کا نمونہ ہے۔ ایسا رویہ جو تاریخ انسانی میں نئی مثال قائم کرتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ انسان نے ان تابندہ مثالوں کو اپنانے کی زحمت نہیں کی ورنہ آج غلامی کے بارے میں نئے قوانین بنانے کی زحمت نہ پڑتی۔ اسلام نے غلاموں/ ملازموں کے حقوق کو معاشرے میں متعارف کرایا اور ان پر عمل درآمد کرانے کے لیے سارے وسائل استعمال کیے۔ جہاں قانون کی ضرورت محسوس کی وہاں قانون بنایا اور جہاں اخلاقی توجہ کی حاجت تھی وہاں اخلاقی دباؤ استعمال کیا۔

---

(۱۱) ادب المفرد، باب ادب الخادم/۱۹۲: ابوداؤد، کتاب الادب: یہاں آخر میں یہ الفاظ ہیں: قال ابو مسعود: فما ضربت مملوکالی بعد ذلک

(۱۲) ادب المفرد، باب اکسوھم مما تلبسون/ ۱۳۹: باب ما یطعم العبد مما یاکل/ ۱۷۵

(۱۳) ادب المفرد، باب سوء الملکۃ/ ۱۵۶

(۱۴) مشکوٰۃ، کتاب النکاح فی النفقات وحق المملوک/ ۲۹۲

آئینی حقوق

مالی حقوق

اسلام نے غلاموں اور خدمت گاروں کو بعض آئینی تحفظات عطا فرمائے تا کہ معاشرہ انہیں نظر انداز نہ کرے مثلاً غلاموں کو غنیمت میں ویسے ہی حق دار قرار دیا جیسے آزاد افراد ہیں۔ مال غنیمت کے متعلق جتنے احکام ہیں ان میں آزاد اور غلام کی تفریق نہیں۔ اسی بنا پر ابوبکرؓ اور عمرؓ بیت المال سے وظائف تقسیم کرتے وقت آزاد اور غلام میں فرق نہ کرتے۔ ام المومنین عائشہؓ فرماتی ہیں: کان ابی یقسم للحرّ والعبد (۱۵) میرے والد غلام اور آزاد دونوں میں تقسیم کرتے۔ عمرؓ نے فرمایا۔ میں نے ہر مسلمان کے لیے ہر ماہ دو پیمانے گیہوں اور دو پیمانے زیتون اور دو پیمانے سرکہ کے مقرر کیے ہیں تو ایک شخص نے کہا کہ غلام کو بھی؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں غلام کو بھی (۱۲)

اخلاقی تحفظ

اسلام نے ایک مومن کو اخلاقی معیار عطا کیا ہے۔ اس معیار پر قائم رہنا اس کا آئینی حق ہے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے کو بد اخلاقی پر مجبور کرے۔ عربوں میں رواج تھا کہ وہ اپنی باندیوں سے قحبہ گری کرواتے تھے۔ اسلام نے جب زنا کو حرام قرار دیا تو اسے غلاموں پر بھی نافذ کیا۔ اور باندیوں سے قحبہ گری کروانے کو ممنوع قرار دیا۔ اس اخلاقی برائی کو قانونی طور پر ختم کیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۷)

اپنی باندیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو اس لیے کہ تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور جو کوئی انہیں مجبور کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی اس مجبوری پر بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

امان کا حق

حالت جنگ میں جس طرح ایک آزاد شخص کسی کو امان دے سکتا ہے اور امیر لشکر اس کو تسلیم کرتا ہے اسی طرح

---

(۱۵) ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی قسم، الفئی/۴۲۹

(۱۲) فتوح البلدان/۴۳۶

(۱۷) النور/۳۳

غلام کی بات کو بھی معتبر سمجھا جائے گا۔عمرؓ نے ایک مرتبہ کہا:

ان عبد المسلمين من المسلمين و ذمته من ذمتهم يجوزا مانه (١٨)

مسلمانوں کا غلام مسلمانوں میں سے ہے اس کا عہد بھی مسلمانوں کے عہد ہی کی طرح کا ہے اس کا امان دینا درست ہے۔

تہمت لگانے کی ممانعت

غلام پر تہمت لگانا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح آزاد محض پر۔تمام آئمہ کی رائے ہے کہ ناجائز الزام پر مالک پر حد قذف لگائی جائے گی۔حدیث میں ہے۔

من قذف مملوكه وهو برىئٌ مما قال جلد يوم القيامة الا ان يكون كما قال (١٩)

جس نے اپنے غلام پر زنا کا الزام لگایا اور وہ بے گناہ تھا تو اسے قیامت کے دن کوڑوں کی سزا ملے گی الا یہ کہ معاملہ ایسا ہو جیسا کہ اس نے کہا۔

نصف سزا

جرائم کے سلسلے میں البتہ غلاموں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ ان کی سزا آدھی ہو کیونکہ ان کا اختیار محدود ہے۔شاہ ولی اللہؒ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

السِرُّ فى تنصيف العقوبة على الا رِقاء انهم يفوض امرهم الى مواليهم فلو شرع فيهم مزجرة بالبغة اقصى المبالغ لفتح ذلك باب العدوان بان يقتل المولىٰ عبده و يحتج بانه زان ولايكون سبيل المؤاخذة عليه فنَقَص من حَدِّهم و جَعَل ما لا يفضى الى الهلاك. (٢٠)

اگر ان کے لیے انتہائی سزا (جو آزاد انسانوں کے لیے ہے) شروع کردی جائے تو اس سے ظلم کا دروازہ کھل جائے گا۔اس طرح ایک مالک اپنے غلام کو قتل کردے گا اور دلیل یہ دے گا کہ اس نے زنا کیا تھا تاکہ اس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ اسی بنا پر غلاموں کے لیے حدود کو ایک حد تک کم کر دیا ہے کہ ہلاکت پر منتج نہ ہوں۔

---

(١٨) ابوداؤد، باب فی حق المملوك/٢٣٣/٧

(١٩) بخاری، کتاب الحدود، باب قذف العبيد/١١٨٢

(٢٠) حجۃ اللہ البالغہ، ٢/١٦٠

شہادت (گواہی) کا حق

اسلام سے پہلے غلام کی گواہی کو نا معتبر سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے اسے معتبر قرار دیا۔

انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ غلام کی شہادت جائز ہے بشرطیکہ عادل ہو(۲۱)

امام ابن تیمیہؒ غلام کی شہادت کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر کسی ایک فقیہہ نے کہا ہے کہ غلام کی گواہی قابل اعتبار نہیں تو اس نے رسول اللہ ﷺ پر کوئی الزام نہیں آتا اور نہ اس کا قول اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کے بالمقابل ہمارے لیے حجت ہو سکتا ہے۔ غلام کی گواہی کے خلاف حضور اکرم ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا آپؐ پر بہتان ہے۔ آپؐ کی طرف سے ایسی کوئی بات منقول نہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ غلاموں کی گواہی نا قابل اعتبار ہے اس کے برعکس کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع صحابہؓ اور میزان عدل سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ غلام کی شہادت ان تمام امور میں معتبر ہونی چاہئے جن میں آزاد کی شہادت قبول ہوتی ہے(۲۲)

اخلاقی حقوق

بعض ایسے حقوق جن کی حیثیت اخلاقی ہے۔ قانونی طور پر ان کو نافذ نہیں کیا جا سکتا تاہم معاشرے کا اجتماعی ضمیر ان اخلاقی حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔

تعلیم کا حق

غلام اور ملازم صرف خدمت ہی کے لیے نہیں بلکہ تعمیر شخصیت کے لیے بھی ہے۔ یہ اس کا اخلاقی حق ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے تعلیم و تربیت حاصل کرے۔ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ خدمت گار بہتر معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے طلب علم کو فریضہ قرار دیا(۲۳) اور اس میں آزاد اور غلام کی تمیز نہیں ہے اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی باندی کو اچھی تعلیم دے اور اچھا ادب سکھائے اس کے لیے اجر ہے(۲۴) ابن عباسؓ اپنے غلام عکرمہؒ کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے(۲۵) ابن عباسؓ کے علم کا بڑا حصہ عکرمہؒ ہی سے منقول ہے۔

---

(۲۱) بخاری، شهادة الاماء والعبید

(۲۲) القیاس فی الشرع الاسلامی/۱۲۸

(۲۳) ابن ماجہ، مقدمہ، باب فضل العلماء،۱/۸۱

(۲۴) بخاری، باب فضل من ادب جاریته و علمها/۴۱

(۲۵) دارمی، کتاب العلم، باب البلاغ من رسول اللہ و تعلیم السنن ۱/۹۲: عن عكرمة قال: كان ابن عباس كفع فجاب الكبل ويعلمني القرآن والسنة

حسن معاملہ کا حق

غلام اور ملازم معاشرے کا اہم حصہ ہیں ان کے ساتھ اخوت کے تعلقات کا رکھنا اخلاقی ذمہ داری ہے حضور اکرم ﷺ غلاموں کی دعوت قبول کرتے اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے۔ انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ غلاموں کی دعوت قبول کرتے۔ ایک مرتبہ آپ کو ایک درزی غلام نے ایک پیالہ پیش کیا جس میں کدو تھا آپؐ نے قبول فرمایا۔ (۲۶)

حسن معاملہ کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کی تربیت کا اثر تھا کہ عمرؓ غلاموں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کو انتظامی سلسلے میں خصوصی اہمیت دیتے۔ ان کے پاس کوئی وفد آتا تو علاقے کے گورنر کے بارے میں دریافت کرتے کہ کیسا ہے؟ غلاموں کی عیادت کرتا ہے کہ نہیں؟ ضعیفوں اور کمزوروں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے؟ ان غرباء کو اس کے دروازے پر بیٹھنے کی اجازت ہے کہ نہیں؟ اگر سوالات کا جواب نفی میں ہوتا تو اس گورنر کو معزول کر دیتے (۲۷)

اسلام نے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور معاشرے میں انہیں عزت دینے کا اہتمام کیا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے مالک کو اچھی رائے دینے اور نصیحت کرنے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں اسلامی حدود میں فکری و عملی آزادی ہے کہ وہ اپنے مالک کے کسی عمل پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کرے۔ حدیث میں ہے:

ان العبد اذا نصح لسیدہ و احسن عبادۃ اللہ فلہ اجرہ مرّتین (۲۸)

غلام اگر اپنے مالک کو نصیحت کرے اور اللہ کی اچھی عبادت کرے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔

سالمؓ ابوحذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ سالمؓ نماز کی امامت کرتے اور ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوسلمہؓ، زیدؓ اور عافر بن ربیعہؓ بھی ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے۔ (۲۹) عمرؓ نے جب عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو عمار بن یاسرؓ کو کوفہ کا امام صلوٰۃ اور قائد لشکر بنا کر بھیجا۔ (۳۰) غلاموں کو آزادی دے کر انہیں سیادت کے منصب پر فائز کرنے کا اعزاز بھی اسلام کو حاصل ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں غلاموں نے آزادی حاصل کی اور حکومتیں کی ہیں۔ مصر کے مملوک اور مسلم ہندوستان کا خاندان غلاماں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام زیدؓ بن حارثہ کو جنگ موتہ میں قائد لشکر مقرر کیا اور ان کے بیٹے اسامہؓ کو شام کی مہم کی قیادت بخشی جب کہ وہ صرف اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ اسلامی معاشرہ چونکہ مساوات پر مبنی ہے اس لیے تقویٰ اور صلاحیت کی بنا پر غلام اور ملازم بھی عزت کا مستحق ہے۔

---

(۲۶) شرح الشفاء، ۲/ ۷۷

(۲۷) تاریخ طبری، ۵/ ۳۳، بخاری، کتاب العتق، باب العبد اذا احسن عبادۃ/ ۳۱۱؛ ادب المفرد باب اذا نصح العبد لسیدہ/ ۱۷۷

(۲۸) ابوداؤد کتاب الادب باب فی المملوک اذا نصح/ ۲۷

(۲۹) بخاری، باب استقضاء الموالی و استعمالھم/ ۱۲۳۶

(۳۰) فتوح البلدان، یوم جلولاء الوقیعہ

(10)

کمیونٹی

کمیونٹی بنیادی طور پر افراد کے ایسے مجموعے کا نام ہے جنہیں مشترک مفادات نے باہم دگر مربوط کر دیا ہو۔ اگر غور کریں تو معاشرتی ارتقاء میں خاندان کے بعد اگلا مرحلہ وسیع اجتماعی تنظیم کی تشکیل کا ہے۔ اس میں کئی عوامل کارفرما ہیں۔ خاندان کی توسیع سے قبیلہ وجود میں آیا جو دراصل نسلی اور خونی رشتوں کی توسیع ہے۔ جغرافیائی اور ماحولیاتی عوامل نے اسے آگے بڑھایا اور مختلف قبائل و عناصر سے مل کر ایک اور اجتماعیت وجود میں آئی جو گاؤں یا شہر کہلائی اور پھر ایک جغرافیائی حد بندی کے اندر مختلف قصبوں یا شہروں پر مشتمل ایک اجتماعیت وجود پذیر ہوئی جو ریاست کہلائی۔ اس میں وسعت پیدا ہوئی تو سلطنتیں وجود میں آئیں۔ تمدن پروان چڑھے اور معاشرتی طاقتیں تشکیل پائیں۔ خاندان اور قبیلہ کی توسیع ہوئی تو قومیں منصۂ شعود پر آئیں۔ قوموں کی تشکیل میں نسل، رنگ اور جغرافیائی حدود کا بنیادی کردار تھا لیکن تمدن کی ترقی اور سلطنتوں کی قیام پذیری نے قوموں کو وسیع تر اجتماعیت میں مدغم کیا۔ یہ ادغام بعض اوقات سیاسی و تمدنی دباؤ کی وجہ سے تھا اور کبھی رضا کارانہ طور پر کسی نظریاتی ہم آہنگی کے باعث وجود میں آیا۔ ریاست اور قبیلہ یا خاندان کے درمیان ایک اور اجتماعیت ظاہر ہوئی جو ایک شہر پر مشتمل تھی۔ اس اجتماعیت میں وہ تمام عناصر جمع ہو گئے جو بالآخر ریاست کی تشکیل پر منتج ہوئے۔ بعض اوقات جدید علم المعاشرت میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا:

"A concentrated settlement of people in a limited Territorial area, within which they satisfy many of their daily needs through a system of interdependent relationships."(1)

''ایک محدود علاقے میں سکونت رکھنے والے لوگوں کا اجتماع جس میں وہ اکثر روزمرہ ضروریات کو باہمی منحصر آزادانہ تعلقات کے ذریعہ پورا کرتے ہوں۔''

کیمونٹی ایک خود آگاہ معاشرتی وحدت ہے جو گروہی شناخت پر مرتکز ہے۔ اگرچہ کیمونٹی ایک مقامی معاشی اور جغرافیائی وحدت کی حیثیت سے اپنے سکونتی لوگوں کو بنیادی ضروریات کا سامان اور خدمات مہیا کرتی ہے لیکن یہ ایک سیاسی وجود نہیں ہے اس لئے کہ یہ ضروری طور پر متعین قانونی حدود جیسے قصبہ یا شہر کے اندر متعین نہیں ہے۔ کیمونٹی ایک طرح کی شناخت بھی رکھتی ہے جیسے جغرافیائی حدود میں سکونت پذیر لوگ، مشترکہ مفادات اور مقاصد کا شعور رکھنے والے لوگ، ایک نوعیت کا باہمی تعاون اور کیمونٹی کے وجود کا شعور رکھتے ہوں جو انہیں بھی حاصل ہو جو جغرافیائی حدود کے اندر رہ رہے ہوں اور ان کو بھی جو اردگرد میں رہ رہے ہوں۔ اس لئے ایک میٹرو پولیٹن علاقہ جو ایک معاشی اور ماحولیاتی تعلق (Ecological) کی بنیاد پر وحدت ہو کیمونٹی نہیں کہلائے گا۔ جبکہ ایک نواحی علاقہ جو معاشی طور پر خود مختار نہیں ہے اگر

(1) G.A. Theoderson and A.G. Theoderson Modern Dictionary of Sociology / 63.

مذکورہ بالا معیار پر پورا اترتا ہو تو وہ کمیونٹی کہلائے گا۔(۲)

ایک اور تعریف کی رو سے ایسے افراد کا مجموعہ جو مشترک روایت یا مفادات کا حامل ہو کمیونٹی کہلائے گا جیسے سکالرز کی کمیونٹی۔ اس لحاظ سے یہ جغرافیائی حدود سے متعلق نہیں ہوگی کیونکہ اس کا امکان ہے کہ اس کمیونٹی کے افراد مختلف علاقوں میں منتشر ہوں(۳) جو چیز انہیں کمیونٹی بناتی ہے وہ ذوق اور دلچسپیوں کا اشتراک ہے۔

اقسام

جدید علم المعاشرت میں کمیونٹی کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں مثلاً بڑے شہر کی کمیونٹی، دیہی کمیونٹی، شہری کمیونٹی، کسانوں کی کمیونٹی وغیرہ۔

کسان کمیونٹی (Farmer Community)

انسانوں کی ایک دیہی زرعی وحدت جو سادہ ٹیکنالوجی پر انحصار کرتی ہے اور وسیع تر معاشرتی تنظیم میں، ایک واضح مخصوص روایت کی حامل ہے لیکن وسیع تر معاشرے کا حصہ ہے اور اس کی سیاسی، معاشی اور مذہبی ساختوں میں شریک ہے۔(۴) کسان کمیونٹی کہلاتی ہے۔

دیہی کمیونٹی (Rural-Community)

سینڈرسن (Dwight Sanderson) کے مطابق دیہی کمیونٹی کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

That form of association maintained between the people and their situations in a local area in which they live on dispersed formsteads and in a village which usually form the center of their common activities.(۵)

جیسا کہ تعریف سے واضح ہے کہ یہ کمیونٹی دیہی ماحول اور اس کے تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس کی سرگرمیاں اور اس کی خصوصیات کا تعلق دیہی ماحول سے ہوگا۔

شہری کمیونٹی (Urban Community)

شہری کمیونٹی سے مراد وہ کمیونٹی ہے جو گنجان آبادی پر مشتمل ہو اور ترجیحی طور پر غیر زرعی ہو۔ اعلیٰ سطح کا اختصاص رکھتی ہو جو تقسیم کار کے ایک پیچیدہ نظام پر مشتمل ہو جس میں مقامی حکومت کا نظام بھی ہو اور مختلف النوع آبادی پر مشتمل ہو جن کے درمیان دوہری سطح کے معاشرتی تعلقات ہوں اور سوشل کنٹرول پر انحصار کرتے ہوں"۔(۶) ظاہر ہے یہ کمیونٹی کئی

(۲) Ibid (۳) Ibid / 64 (۴) Ibid/ 294

(۵) D. Sanderson, Rural Sociology and Rural Social Organisation, Wilgran York 1942.

(۶) A Modern Dictionary of Sociology / 451

خاندانوں اور متنوع نسلی گروہوں پر مشتمل ہوگی۔ اس اجتماعیت کا انحصار معاشی ضرورتوں اور معاشرتی سہولتوں پر ہوگا۔ اس کے افراد کی اولین ترجیح معاشی وسائل کا حصول اور خوشحال زندگی کی دستیابی ہوگی۔ قدیم زمانے کی شہری ریاست میں اسی طرح کی معاشرتی صورت حال تھی۔ شہر کا انتظام' افراد کی خصوصی دلچسپیاں اور سرگرمیاں اور دوسرے شہروں کے ساتھ تعلقات اسی سطح پر طے ہوتے تھے۔

بڑے شہر کی کمیونٹی (Metropolitan Community)

Metropolis کی اصطلاح ایک بڑے شہر کے لئے استعمال کی گئی جو معاشی اور ثقافتی طور پر گردونواح کے علاقوں کو ملحقہ بستیوں اور قصبوں کے ذریعہ زیر تصرف رکھے۔ میٹروپولس (Metropolis) میٹرو پولیٹن علاقہ (Metropolitan area) کا مرکزی شہر ہوتا ہے۔ بڑے شہری علاقے کی کمیونٹی دراصل ایسی کمیونٹی ہے جو سیاسی اور معاشی وحدتوں کے تنوع کے باوجود اس علاقے کے لوگوں کو ایک وحدت عطا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو معاشی اور ثقافتی طور پر ایک بڑے شہر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ گردونواح کے تمام علاقے اس شہری وحدت کے ساتھ اس طرح منسلک ہوتے ہیں کہ ان کے معاشی مفادات اور معاشرتی مقاصد اسی سے پورے ہوتے ہیں۔ یہ کمیونٹی متنوع گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے جسے ایک ثقافت اور ایک معاشی نصب العین متحد رکھتا ہے۔ (۷)

کمیونٹی ایک ایسی معاشرتی وحدت ہے جسے جدید علم المعاشرت میں مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان تمام بحثوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرت کے ارتقائی سفر میں یہ ایک ایسی اکائی ہے جو ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس کی تشکیل میں بنیادی عنصر مفادات اور مقاصد کا اشتراک ہے۔ کمیونٹی خاندان سے اگلا لیکن جدید قوم سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ اس میں قبائلی وحدت' زرعی اجتماعیت' پیشہ ورانہ جمعیت اور ثقافتی و معاشی گروہ سب شامل ہیں۔

وسیع کمیونٹی

جب سے شہر وجود میں آئے ہیں فلسفیوں نے قبائلی دیہی اور شہری زندگی کے امتیازات پر بحثیں کی ہیں۔ انیسویں صدی میں قدیم تضادات کو معاشرتی انواع کے جوڑوں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے دیہی شہری (Rural-Urban) یا ابتدائی اور مہذب (Primitive-civilized) اور ان مخالف سمتوں کی انتہاؤں کی صورت میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ جیسے سوسائٹی میں رشتوں کی اہمیت یا تقسیم کار اس طرح کی خصوصیات کا تنوع ایک تصوراتی تسلسل پیدا کرتا ہے کیونکہ یہ انواع کمیونٹی کی طرف اشارہ کرتی ہیں یا سوسائٹی کی جانب۔ علمائے معاشرت نے اس کے لئے "Community-Society continua" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

---

(۷) Ibid / 254-55

یہ انواع کی ایک طرح کی مثالی قسم ہے جو ایک تصور پر مبنی ہے اور عملی طور پر تفصیلی جانچ پڑتال کے مرحلے سے نہیں گذری۔ کوئی سوسائٹی بھی ان مثالی اقسام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتی البتہ ان مثالی اقسام (Ideal types) کو خارجی تجزیہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جدید دور کے معاشرتی علوم میں انواع کے جوڑوں کا استعمال ڈارون (1859ء) کے نظریہ ارتقاء (Origin of species) اور ہنری مین (Henry Maine) کے قدیم قانون (Ancient law 1861) سے لیا گیا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ ہمارے لیے معاشرتی مطالعہ ممکن نہ تھا اگر رومی قانون نہ ہوتا۔ اس نے ہندوؤں، عبرانیوں، یونانیوں اور رومیوں کی پرانی تحریروں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا کہ ابتدائی معاشرت پدرسری خاندان (Patriacal family) پر مبنی تھی۔ بزرگ مرد کو مکمل اختیار حاصل تھا اور معاشرہ ان کے خاندانوں پر مشتمل تھا جن میں خونی رشتوں کا اشتراک تھا۔ رشتوں کی بنا پر ہی اجتماعیت متصور ہوتی تھی۔ اس معاشرت میں نو وارد کے لیے مصنوعی رشتہ داری تخلیق کی جاتی تھی۔ معاشروں میں توسیع ہوئی تو خونی رشتہ کی جگہ علاقیت (Locality) تنظیم کی بنیاد بن گئی۔ مین (Maine) کے نزدیک یہ تبدیلی نمایاں نظر آتی ہے جب کہ رشتوں کی بجائے باہمی اتفاق یا معاہدے سے بڑی اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔

مارکس اور ہابز سے متاثر ہو کر فرڈی ننڈ ٹونیز (Ferdinand Tonnis) نے مثالی قسم یا عام قسم (Ideal type or Normal type) کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور انہی پر اس نے اپنی کتاب کا نام رکھا ہے:

(Gemeincshoft and Gescll schaft, 1887)۔ اس کے نظریہ کی بنیاد انسان کے ارادے پر ہے جو دو قسم کا ہے (Wesen wille- natural or essentral will) یا (Kur Wille- raional will)۔ ایک فرد کا ارادہ ہے اور دوسرا کمیونٹی کا ارادہ۔ ٹونیز نے اپنی کتاب میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ (۸)

مشہور ماہر عمرانیات درخائیم (Emile Durkheim) نے اپنی کتاب (The Division of labour in Society 1893) میں ان تصورات کا جائزہ لیا ہے جن پر ان سے پہلے اگسٹ کامٹے (August Comte) اور ہربرٹ سپنسر (Herbert spencer) نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تقسیم کار معاشرتی استحکام (Solidarity) کا ذریعہ ہے اور ابتدائی معاشرے تقریباً یکسانی کردار کے حامل تھے۔ درخائیم نے قانون انواع کو استحکام کی مختلف اقسام کی علامت یا عکس سمجھا۔

مین (Maine) نے اسے مزید تجزیہ و مشاہدہ کی بنیاد فراہم کی۔ اس کے خیال میں قدیم قانون اپنی خصوصیت کے اعتبار سے فوجداری تھا جبکہ جدید معاشروں میں قانون کی نوعیت سول قانون کی ہے۔ درخائیم اس قانون کو ظالمانہ (Repressive) کہتا ہے اور اسے میکانکی استحکام (Machanical Solidarity)، جو وحدت یا ہم آہنگی پر مبنی ہے،

---

(۸) International Encyclopedia of Social Sciences, 3/ 175

سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ معاشرے کے تمام افراد میں جو مشترک اخلاقی جذبات پائے جاتے ہیں وہ ایک اجتماعی ضمیر (Collective Conscience) کو تشکیل دیتے ہیں اور جرائم وہ اعمال ہیں جو اس اجتماعی ضمیر کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے خلاف انتقامی ردعمل ہوتا ہے۔ ایک ہی طرح کی زندگی گزارنے والے معاشرے کو درخائیم Segmental society کہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دیوانی قانون (Civil law) مختلف گروہوں کے تعلقات سے بحث کرتا ہے اور وہ سزا کی بجائے مسائل کے حل پر زور دیتا ہے۔ اسے وہ سوشل سالیڈیرٹی (Social Solidarity) کہتا ہے جو معاشرے کے خصوصی اجزاء کے باہمی انحصار پر مبنی ہوتی ہے۔ درخائیم اسے عضویاتی استحکام (organic solidarity) کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے عضویاتی استحکام میکانکی استحکام سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کے ارتقاء کو میکانکی استحکام سے عضویاتی استحکام میں تبدیلی کے حوالے سے دیکھنا چاہیے۔(۹)

Redfield نے 1930ء میں میکسیکو کے کسانوں پر جو تحقیق کی اس کے نتیجے میں اس نے Folk Urban continuum کا نظریہ پیش کیا۔ اس کمیونٹی کے عناصر میں خود انحصاری، عدم تعلیم، مقامی اور روایتی مذہبی رجحانات شامل ہیں۔ اس نے اپنی کتاب (The folk culture of yucatan 1941) میں جو تفصیلات دی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مین، درخائیم اور ٹونیز سے متاثر ہے۔ ماہرین عمرانیات کا خیال ہے صنعتی دور سے پہلے کی شہری زندگی اور کمیونٹی ابتدائی معاشرت کے بہت سے اجزاء کی حامل تھی۔

صنعتی دور کے اثرات میں بدنظمی، سیکولرائزیشن اور ذاتی حیثیت کی نفی نمایاں ہیں۔ انسانی معاشرہ جب ترقی کرتا ہے تو وہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے اور ہر مرحلے کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور ہر مرحلے کا معاشرتی عمل مختلف ہوتا ہے۔ ٹیلکاٹ پارسن (Talcalt Parson) نے 1951ء میں جو تجزیاتی تجربات کئے ہیں اس کے نتیجے میں اس نے دو مختلف رویوں کو متعین کیا ہے اور اس کے لئے جو اصطلاحیں اس نے استعمال کی ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

ایک طرف بھر پور اثر اندازی (Affectivity) ہے تو دوسری طرف موثر غیر جانبداری (Affective neutrality) ہے۔ اگر ایک طرف متعین ہونا (Specificity) ہے تو دوسری طرف مختلف ہونا (Difference) ہے۔ مثلاً محدود تعلق جیسے کلرک اور گاہک کا یا وسیع جیسے میاں بیوی کا۔ اس طرح ایک طرف عالمیت (Universalism) ہے تو دوسری طرف مخصوصیت (Particularism) ہے۔ جیسے ایک منصوبہ عمومی ہے اور کوئی دوسرا خاص انسان یا گروہ سے متعلق ہے۔

اسی طرح خصوصی صفت (Quality) ہے اور دوسری طرف عملی اظہار (Performance) ہے اس کے لئے منسوب کرنا (Ascription) بمقابلہ حاصل کرنا (Achievement) کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ پارسن ان تضادات کے ذریعہ سوسائٹی کو بیان کرتا ہے۔(۱۰)

(9) . International Encyclopedia of Social Sciences..1/ 177 (10) Ibid, 3/ 178

ابن خلدون

کمیونٹی کے حوالے سے بات نامکمل ہوگی اگر ہم مشہور مسلمان مورخ اور سوشیالوجسٹ ابن خلدون کا ذکر نہ کریں۔ ابن خلدون دیہی اور شہری معاشرے کا تقابل کرتا ہے اور اس تقابل میں دو عنصر نمایاں نظر آتے ہیں ایک اخلاق کا اور دوسرا خاندان کا۔ اس کا تصور عصبیت ہر جگہ تحلیل و تجزیہ کی بنیاد ہے۔ شہری زندگی میں عصبیت کمزور ہوتی ہے دیہی زندگی میں مضبوط۔ شہری معاشرت میں قانون' حکمران اور وسائل کی فراوانی وہ عناصر ہیں جو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور عصبیت کمزور ہوتی ہے جبکہ دیہی زندگی میں عصبیت (Group solidarity) کو اولین حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ دیہی اور شہری معاشرت کا تقابل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دیہی معاشرت میں حوصلہ اور شجاعت نمایاں ہوتی ہے جبکہ شہری معاشرت میں خوف اور بزدلی کا غلبہ ہوتا ہے۔ دیہی معاشرت میں درشت مزاجی اور سخت دلی ہوتی ہے اور شہری معاشرت میں نرم مزاجی اور رحم دلی پائی جاتی ہے۔ دیہی زندگی میں آزادی شہری زندگی میں اطاعت' اخلاق و مذہب کو تفوق حاصل ہے یہاں کرپشن اور مذہب سے دوری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ دیہی زندگی میں خاندانی و قبیلوی وجاہت اور شہری زندگی میں انفرادیت اور مفاد پرستی۔ دیہی زندگی میں خونی رشتوں کی تکریم اور جبکہ شہری زندگی میں مخلوط رشتوں کا چلن ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ خاندان کے حوالے سے بھی تقابل کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی شہری زندگی میں ایک طرح کا تصنع ہے جبکہ دیہی معاشرت سادہ اور فطری ہے۔

ابن خلدون نے کمیونٹی کی نفسیات' اس کے ماحول اور اس کی خواہشات کا تجزیہ کر کے اس کی تشکیل' تغیر اور زوال پر شاندار بحثیں کی ہیں۔ کمیونٹی خاندان سے وسیع تر وحدت ہے لیکن ریاست سے کم تر' ریاست اگلا مرحلہ ہے۔

......☆......

ریاست

انسانی معاشرت کے تمام بنیادی اداروں میں ریاست کو کلیدی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کسی معاشرے کی اجتماعی اقدار اس کی سالمیت کا تحفظ، امن وسلامتی اور اس کا نظم وضبط ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جسے آج تک کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے آغاز ہی سے قیادت وسیادت اور اختیار واقتدار کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہا ہے۔ چونکہ معاشرتی نظم وضبط کی تمام تر ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے اس لیے اس کی ہیئت ترکیبی خاندان اور مذہبی ادارے سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ ریاست کے تصور میں جغرافیائی حد بندی کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس سے کسی قوم میں تنظیم کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ ریاست کسی خطہ، زمین پر رہنے والے افراد کے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کو منضبط اور ان کے مفادات ومقاصد کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ چونکہ ہر معاشرے میں ریاست کو مستقل حیثیت حاصل رہی ہے اس لیے علمائے سیاست کا بھی یہ مستقل موضوع رہا ہے۔ معاشرے کے ساتھ ریاست کے بنیادی تعلق کی وجہ سے علمائے معاشرت بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکے اور انہوں نے جابجا اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ معاشرے میں ریاست کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کے پیش نظر ضروری ہے کہ ریاست پر مفصل بحث سے پہلے اس کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالی جائے:۔

مفہوم

ریاست کی تعریف میں معاشرتی اور سیاسی نقطہ نظر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کیونکہ ریاست ایک سیاسی ادارہ بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق ریاست کی مختصر تعریف یہ ہے:

''یہ انسانوں کا ایک گروہ یا تنظیم ہے جو مشترکہ مقاصد کے لیے مل جل کر کام کرے''۔(۱)

جرمن قانون دانوں کے نزدیک ''ریاست ایک قانونی اکائی ہے۔''(۲)

علمائے سیاست کے نزدیک ریاست کی تعریفات مختلف ہیں۔ وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کی رائے میں ''ریاست سے مراد انسانوں کی وہ جمعیت ہے جو عموماً زمین کے ایک حصے پر موجود ہو جس میں اکثریت کی رائے اقلیت پر فوقیت رکھتی ہو۔''

پروفیسر گارنر کے نزدیک ''ریاست علم سیاست اور قانون کی رائے میں ایسے متعدد افراد کی جمعیت ہے جو مستقل

---

(1) Encyclopaedia of Social Sciences 14. / 328 Newyork.

(2) Ibid.

طور پر ایک خاص خطہ زمین پر قابض ہوں اور بیرونی دباؤ سے آزاد ہوں اور ان کی ایک منظم حکومت ہو جس کو باشندوں کی غالب اکثریت کی اطاعت حاصل ہو۔''(۳)

شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ریاست کے بارے میں تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اہل مدینہ سے مراد لوگوں کی وہ جماعت ہے جو ایک ہی نظام تمدن کے تابع اور پابند ہوں، اور باہم مل جل کر اجتماعی زندگی بسر کریں۔ اس جماعت کو اگرچہ وہ مختلف شہروں میں رہتے ہوں شخص واحد سمجھا جاتا ہے۔''(۴)

لاسکی کہتا ہے کہ ''ریاست کسی سیاسی معاشرے کی وہ اعلیٰ منظم قوت ہے جو افراد معاشرہ کے مقاصد کا تحفظ بھی کرتی ہے اور انہیں ترقی بھی دیتی ہے''۔(۵)

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا مقالہ نگار کہتا ہے کہ سیاسیات کی بحثوں نے ریاست اور حکومت کو باہم خلط ملط کر دیا ہے اور کئی ایک نظاموں میں انہیں ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے''(۶) حقیقت یہ ہے کہ ریاست کو مستقل ادارے کی حیثیت اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اسے معاشرتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اس اعتبار سے ریاست معاشرے کی ایک اعلیٰ صورت ہے جو اپنے مخصوص مقاصد و فرائض رکھتی ہے۔

آغاز وارتقاء

چونکہ معاشرتی ادارات کا آغاز معلوم کرنا بہت دشوار معاملہ ہے اس لیے ریاست کے آغاز کے متعلق بھی صحیح بات نہیں کہی جا سکتی تاہم علماء کی رائے یہ ہے کہ ریاست بھی معمولی تنظیم سے موجودہ حالت تک کئی ارتقائی مراحل سے گزری ہے۔ علمائے معاشرت کا کہنا ہے کہ معاشرہ کی ایک بنیادی ضرورت قانون ہے۔ کیونکہ قوت منتظمہ کے بغیر کوئی اجتماعیت وجود پذیر نہیں ہوتی۔ معاشرے میں مختلف حقوق کا تحفظ اسی قوت کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر معاشرے میں یہ قوت کسی نہ کسی طرح موجود رہی ہے خواہ اس کی حیثیت کتنی ہی کمزور ہو۔ بعض مغربی مفکرین کی رائے ہے کہ معاشرتی منتظمہ کی حیثیت سے ریاست بالکل ابتدائی معاشروں میں بھی موجود رہی ہے۔ جرمن ماہر انسانیات فریڈرک ریٹزل (Friedrik Ratzal) نے کہا ہے کہ آسٹریلیا کے ابتدائی باشندوں میں سردار کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا اسی طرح بعض اور قبائل کے متعلق بھی ماہرین کی یہی رائے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی معاشروں میں بھی ہیئت ناظمہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے، گو وہ وقتی اور ہنگامی ہی کیوں نہ ہو۔ رابرٹ ایچ لوئس (Robert H. Luice) اپنی کتاب

---

(3) W. garner, Political Science and government / 49, World Press Ltd. Calcutta 1955.

(۴) حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۴۴ مطبع مصر

(5) Laski-Grammer of Politics, / ii, Introduction.

(6) Encyclopaedia of Social Sciences, 14, / 329.

(An Introduction to cultural anthropolgy) میں ایک قبیلہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی کوئی مسلمہ قیادت نہیں لیکن وقت آنے پر وہ اپنا قائد منتخب کر لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی معاشروں میں بھی گروہ کے بڑے بوڑھوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ بعض ناخواندہ معاشروں میں بھی ریاست اچھی خاصی منظم صورت میں موجود تھی۔ مثلاً افریقہ کے زولو یوگنڈا کے قبائل اور یوشانگوان کے ہاں ریاست کی ایک صورت موجود تھی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی اجتماعیت نے تھوڑے بہت نظم کا مظاہرہ ہمیشہ کیا ہے۔(۷)

ای ایچ بارنیس (E. H. Barnes) کہتے ہیں کہ: ابتدائی منظم معاشرتی اکائی قبیلہ یا گاؤں ہے لیکن قبائلی حکومتوں کو بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کے ہاں مختلف نظام تھے(۸) ریاست موجودہ منظم صورت تک پہنچنے میں کئی ارتقائی منازل سے گزری ہے۔ بیگ ہاٹ (Beghat)(۹) کے نزدیک یہ معاشرتی ارتقاء تین مراحل سے گزرا ہے۔

(i) عہد رسم سازی (اس عہد میں عملی طور پر ریاست معدوم الوجود تھی)

(ii) نزاعی عہد (اس عہد میں مختلف قبائل میں کشمکش ہوتی اور بالآخر ایک گروہ غالب آجاتا جس سے ریاست کا آغاز ہوا)

(iii) عہد بحث و تمحیص (یہ وہ عہد ہے جس میں حکومت کی تشکیل بحث و تمحیص سے ہوتی ہے اور یہ آخری مرحلہ ہے)

سپنسر (Spencer) نے اسی سے ملتے جلتے مراحل بیان کیے ہیں۔(۱۰)

(i) قبیلوی دور (جب مختلف قبائل غیر منظم تھے اور ریاست کی کوئی صورت نہیں تھی)

(ii) فوجی عہد۔ جب ایک گروہ فوجی قوت کے ذریعے سے غالب آکر ریاست کی بنیاد رکھتا تو نتیجۃً موروثی بادشاہت وجود میں آتی۔

(iii) صنعتی دور (جب فوجی سرگرمیوں کی بجائے معاشی تگ و دو نے جگہ لے لی)۔

دور حاضر کے مشہور ماہر عمرانیات گڈنگز (Giddings) کے الفاظ میں یہ مراحل اس طرح بیان کئے جاسکتے ہیں۔

(i) مذہبی فوجی (ii) آزاد قانونی (iii) معاشی اخلاقی

ہاب ہاؤس (Hob hous) نے ان مراحل کو بادشاہت، آمریت اور شہریت کی ترتیب سے بیان کیا ہے۔(۱۱) بارنیس (Barness) کہتا ہے کہ قبیلوی نظام سے شہری ریاست میں ترقی ہوئی اور یہی شہری ریاست بڑی

---

(7) Samuel Koening, An Introduction to the Science of Sociology, / 89-90.

(8) E.H. Barness. Social Institutions / 201. Newyork.

(9) He discussed in his book; Physics and Politics.

(10) Principal of Sciology 2 / 266-67. villiam and Norgate London 1885.

(11) Samuel Koering An Introduction to the Science of Sociology / 90.

سلطنت کے پروان چڑھانے کا باعث بنی۔ مثلاً قدیم مصری سلطنت شہری ریاستوں کا نتیجہ تھی۔ اس طرح یونانی شہری ریاستیں بھی ابتدائی پختہ معاشرتی وحدت کا پتہ دیتی ہیں۔ ایرانی اور رومی سلطنتیں اپنی اکائیوں کی منظم صورتیں تھیں۔ (۱۲) ابتدائی بادشاہتوں میں ایسے قبائلی سرداروں کا وجود ضروری تھا جن کی حمایت سے بادشاہ حکمرانی کرتا لیکن رفتہ رفتہ ان سرداروں کی اہمیت ختم ہوگئی اور بادشاہ اتنے طاقتور ہوگئے کہ وہ جسے چاہتے سردار بنا دیتے۔ (۱۳)

ریاست کی تنظیم خاندان سے ابھری اور کئی عوامل کی بدولت پروان چڑھی۔ وہ کون سے محرکات ہیں جو ریاست کی تنظیم کا باعث ہیں؟ علمائے سیاست نے ان کے متعلق مختلف نظریات بیان کئے ہیں۔ مثلاً:

(i) **نظریہ تخلیق ربانی:** (ریاست انسانوں نے نہیں خدا نے بنائی ہے اور بادشاہ نائب خدا ہوتا ہے)۔ (۱۴)

(ii) **نظریہ معاہدہ عمرانی:** (۱۵) (افراد جماعت کا اندرونی معاہدہ ہے جس میں کچھ افراد اپنے حقوق سے دستبردار ہوکر دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ ایک تنظیم پیدا ہو سکے اور ہر فرد اپنے آپ کو زیادہ محفوظ پائے)۔

(iii) **نظریہ جبر** (طاقت سے ریاست قائم کرنا۔ مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش کے بعد غالب گروہ کی حکومت) (۱۶)

(iv) **نظریات پدرسری و مادرسری:** (آغاز کنبہ سے ہوا اور باپ کے بنیادی اختیار سے بات آگے بڑھی۔ پروفیسر جنکس (۱۷) کے بقول خاندان کا ابتدائی نظام باپ کی بجائے ماں کے پاس تھا اور بعد میں اسے تبدیل کر دیا

---

(۱۲) E. H. Barness - Social Institutions. / 201.

(۱۳) Encyclopaedia of Social Sciences, 14. / 329.

(۱۴) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ریاست خدا نے بنائی ہے تو اس میں کوئی بات خلاف عقل نہیں البتہ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ناظم ریاست خدا کا نمائندہ بن کر مطلق العنان اور واجب الاطاعت بن جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے اس نظریہ کی ہلاکت خیزیاں شروع ہوتی ہیں۔ اسلام ریاست کا اقتدار خدا تعالیٰ کی ذات ہی میں مرکوز سمجھتا ہے اور منتظم ریاست کو نائب خدا کہتا ہے لیکن وہ ناظم ریاست کو مطلق العنان نہیں قرار دیتا۔ اس کی اطاعت اسی وقت تک ضروری ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اور مصالح عامہ کے خلاف نہ چلے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست تھیا کریسی بھی نہیں اور لادینی بھی نہیں۔ معاہدہ تخلیق ربانی اپنے مضرات کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اب اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

(۱۵) نظریہ عمرانی ایک معروف سیاسی نظریہ ہے اور اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ آغاز کار میں فطری حالت پر مبنی تھا۔ یعنی اس میں کوئی تنظیم نہیں تھی باہمی کشمکش تھی، ایک دوسرے پر اعتماد نہ تھا، پھر افراد معاشرہ نے باہمی اجتماعیت کے لیے ایک نظم کی بنیاد رکھی۔ یہی معاہدہ جو افراد معاشرہ کے درمیان قائم ہوا معاہدہ عمرانی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نظریہ کو سب سے پہلے جس شخص نے منظم صورت میں لکھا وہ ابونصر فارابی (۸۷۰۔۹۵۰) ہے۔ اس نے بڑی تفصیل سے اس نظریہ کی وضاحت کی۔ مغرب کے جن سیاسی مفکرین نے اس نظریہ کو عام کیا ان میں ہوبز (Hobbs) لاک (Locke) اور روسو (Roussau) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس نظریہ نے بڑا انقلاب پیدا کیا لیکن دقت یہ پیش آئی کہ یہ نظریہ محض فکری و نظری ہے اس معاہدہ کے لئے کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں۔ پھر ہوبز، لاک اور روسو کے درمیان فطری حالت کے سلسلے میں بڑا بنیادی اختلاف ہے۔ بہر کیف اس نظریہ نے آزادی و قانون کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۱۶) تاریخ سیاست/۴ مطبوعہ حیدر آباد، دکن (۱۷) ایضاً

گیا۔ ماں اور باپ کے اس انتظام سے ریاست کی تنظیم کا تصور نکلا اور بڑھ کر وسعت اختیار کر گیا۔

(۵) تاریخی یا ارتقائی نظریہ: اس نظریہ کے مطابق ریاست تاریخ کے ارتقائی سفر کا نتیجہ ہے۔ مختلف ادوار میں معاشرتی نظم کی مختلف صورتیں رہی ہیں۔ ریاست کی تشکیل و ترقی میں مختلف عناصر نے اہم کردار ادا کیا ہے اور ریاست کی تنظیم میں ان سب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرابت داری' مذہب' طاقت' سیاسی بیداری اور اقتصادی مفاد سب کے سب عوامل کی حیثیت سے ریاست کی تنظیم کا باعث بنے ہیں۔ (۱۸)

علمائے معاشرت کا رجحان اس جانب ہے کہ ریاست کا تصور خاندانی نظم ہی سے ابھرا ہے۔ بیشتر مفکرین کی رائے یہ ہے کہ ریاست کا وجود و ارتقاء مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ابن خلدون (۱۹) نے اپنے مقدمہ میں تاریخی پس منظر پر بحث کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے۔ میکاولی (۲۰) کا نظریہ یہ ہے کہ جنگ ریاست کا آغاز ہے۔ سپنسر اور بیگ ہاٹ کے نزدیک یہ کشمکش امن کی صورت اختیار کرتی ہے۔ کشمکش کے اسی نظریہ کو مارکس نے خاص انداز میں پیش کیا۔ اس کے نزدیک ریاست معاشی اعتبار سے غالب گروہ کا ادارہ ہے تاکہ معاشی استحصال کر سکے۔ معاشرتی نقطہ نظر سے ریاست کے اسباب مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

ہمدردی' باہمی تعاون' ضرورت' تعاون کا احساس' قیادت کی قوت' کاروبار' تجارت' معاشرتی احساس' کشمکش وغیرہ۔ مولانا حامد الانصاری اپنی ''کتاب اسلام کا نظام حکومت'' میں فرماتے ہیں:

''انسانی معاشرہ کی تخلیق کا اولین ربط خدا تعالیٰ کے حکم سے آدم اور ان کی اولاد کی صورت میں پیدا ہوا'' (۲۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''معاشرہ کی تنظیم کے لیے بنیادی بات اللہ اور بندے کے درمیان معاہدۂ طاعت تھا''۔ (۲۲)

اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسانی جمعیت کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ اس اعتبار سے پوری انسانیت خلافت کی امین ہے۔ نظام خلافت کے عملی پروگرام کے لیے اس نے انبیاء و مصلحین کو بھیجا۔ ان مقدس نفوس نے صالح اور فاسد اجتماعیت میں فرق کیا۔ ابن خلدون اور دیگر علمائے معاشرت کا نظریہ کشمکش اس اعتبار سے بھی درست ہے کہ حق و باطل کی آویزش انسانی تاریخ کا مستقل باب ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

---

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ابن خلدون مقدمہ/۲۷ مطبوعہ مصر

(۲۰) میکاولی، بادشاہ/۷

(۲۱) اسلام کا نظام حکومت/۶۲، طبع ندوۃ المصنفین

(۲۲) ایضاً/۶۹

ریاست جن مراحل سے بھی گزری اور جن عوامل نے بھی اس کی تشکیل و تنظیم میں حصہ لیا کم از کم اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد خاندان ہے اور انتہاء منظم ریاست ہے۔ تاریخ انسانی نے ریاست کی کئی صورتیں دیکھی ہیں مثلاً شہری ریاست، اشرافیہ، بادشاہت، آمریت اور جمہوریت وغیرہ انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار کی زبان میں شہری ریاست کا آغاز خاندان اور انتہاء جمہوریت ہے۔ (۲۳)

ریاست کی حیثیت

ابتدائی معاشروں میں ریاست کی تنظیم سادہ تھی لیکن تہذیبی و تمدنی پیچیدگی کے باعث ریاست کی تنظیم وسیع اور پیچیدہ ہوگئی۔ مختلف ارتقائی مراحل میں ریاست کی حیثیت کیا رہی؟ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بعض معاشروں میں اسے بڑی اہمیت حاصل رہی اور بعض معاشرے اسے نظر انداز کرتے رہے۔ علمائے معاشرت کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ریاست انسانی جدو جہد کا نتیجہ ہے اور بس۔ لیکن جرمن ماہرین عمرانیات کہتے ہیں کہ ''ریاست ایک مستقل وجود رکھتی ہے''۔ مثلاً ہیگل کے نزدیک ''ریاست مکمل طور پر ایک خودمختار حقیقت ہے۔'' سپنسر کہتے ہیں کہ بعض جرمن ماہرین عمرانیات کی رائے میں ''ریاست خدائی اختیار رکھتی ہے۔'' اس کے مقابلے میں بارکس برلز اس طرف گئے ہیں کہ ریاست کی ضرورت ہی نہیں ابن خلدون کہتے ہیں: اس بحث سے یہ بات آشکارا ہوئی کہ بادشاہ کا ہونا انسان کے لیے خاصہ طبعی ہے جس سے اس کو مفر نہیں۔ حکماء نے کہا ہے کہ بعض حیوانات میں بھی بادشاہ کا وجود ہے .... مگر فرق یہ ہے کہ حیوانات میں بادشاہ کا ہونا مقتضائے فطرت وطبیعت ہے اور انسان میں مقتضائے عقل وسیاست۔ (۲۴) (رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ. (۲۵) ہمارے رب نے ہر شئے کو خلقت عطا کی پھر ہدایت دی۔ بیشتر مفکرین کی یہی رائے ہے کہ ریاست انسانی کوششوں کی ارتقائی صورت ہے ورنہ اس میں ردو بدل نہ ہوتا مثلاً بارنیس (Barness) کی رائے میں جمہوریت دور حاضر کی پیداوار ہے اور ابتدائی معاشروں میں اس کا تصور نہیں تھا۔ (۲۶) ریاست کے ارتقائی تصور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست خدائی وجود نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے ریاست سے احکام خداوندی کی قوت نافذ ہوتی ہے اور اس کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہوتی ہے جب تک وہ احکام خداوندی کی اطاعت کرے۔

عام طور پر ریاست کے عناصر ترکیبی میں آبادی، جغرافیائی حد بندی، منظم حکومت اور اقتدار اعلیٰ کو شمار کیا جاتا ہے۔

---

(۲۳) Encyclopaedia of Social Sciences 14. / 329

(۲۴) مقدمہ/۲۷

(۲۵) طٰہٰ/۵۰

(26) Barness. Social Institutions. / 201

ان عناصر کے بغیر ریاست کی تنظیم ممکن نہیں، ریاست کی بحث میں ریاست اور حکومت کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے حالانکہ حکومت ریاست کا ایک عنصر ہے۔

مقاصد و فرائض

دیگر ادارات کی طرح ریاست بھی چونکہ مختلف ثقافتوں اور متنوع ظاہری حالات کا نتیجہ ہے اس لیے حالات کے مطابق اس کے فرائض بھی بدلتے رہے ہیں۔ نمکوف اور آگبرن (Nimkoff & Ogburn) کے نزدیک ریاست کے فرائض کی نوعیت حالات کے مطابق ہوگی۔(۲۷) ریاست چونکہ معاشرتی نظم کا ادارہ ہے اس لیے یہ خاندان اور عبادت گاہ سے مختلف ہے کیونکہ اس کے پاس قانونی قوت ہوتی ہے اور اس کا دائرہ اختیار وسیع ہوتا ہے۔ علمائے معاشرت کے نزدیک ریاست ایک ناگزیر ادارہ ہے اور اس کے بغیر تنظیم معاشرت بھی ممکن نہیں لیکن اس کے فرائض پر سب کا اتفاق نہیں۔ تاہم فرائض کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ہم اسے نقل کرتے ہیں۔ مثلاً:

ابن خلدون کہتے ہیں کہ انسان کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنے کے لیے نظام ریاست کی ضرورت ہے۔"(۲۸)

لاسکی نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"In this aspect it becomes an organization for enabling the mass of men to realize Social good on the largest possible Scale".(۲۹)

انسائکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

"The state is. agency for Social controle having as its object the regulation of the outstanding external relationship of man in Society."(۳۰)

ابن تیمیہؒ کے نزدیک ریاست کا مقصد تقرب الٰہی اور اقامت دین ہے اگر سلطنت وحی کی رہنمائی سے محروم ہو یا خود دین حکومت کی پشت پناہی سے عاری ہو تو لوگوں کے احوال فاسد ہو جائیں گے۔(۳۱)

ریاست کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ ارکان ریاست کے باہمی تعلقات کی نگرانی کرے، ان کا تحفظ کرے اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرے۔ سمز کے نزدیک ریاست کا مقصد فرد کی خوشحالی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فرد

---

(27) Nimkoff's-Ogburn-Sociology / 510

(۲۸) مقدمہ/۷۲

(29) Laski Gramer of Politics p. 25.

(30) Encyclopaedia of Social Sciences, 14/328

(۳۱) ۳۳/السیاسۃ الشرعیہ

کے معاملات میں مداخلت کم ہو۔

لیکن (Ogburn & Nimkoff)(۳۲) کی رائے ہے کہ دور حاضر میں ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرد کے معاملات میں مداخلت کرے خواہ معاشی دائرہ کار ہو یا معاشرتی۔ اشتراکی تحریکوں کے نتیجے میں ریاست کی مداخلت بڑھ گئی ہے۔ آدم سمتھ (Adam Smith) نے اپنی کتاب (Wealth of Nations) میں تین مقاصد بیان کئے ہیں۔ (۳۳)

(۱) دوسری ریاستوں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھے۔

(۲) معاشرے کے ہر فرد کو دوسرے افراد کے ظلم سے بچائے۔

(۳) تعمیرات عامہ یا پبلک ادارے قائم کرے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں افادیت پسندی کا نظریہ تسلیم کیا گیا۔ بینتھم اور مل (Bentham and Mill) کے نزدیک ریاست کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ موجودہ دور میں ریاست کا مقصد معاشی اور معاشرتی بہبود قرار پایا ہے۔ ریاست کو معاشرتی سرگرمیوں کی نگہداشت کرنی چاہیے تاکہ انسانی بہبود و مسرت میں اضافہ ہو۔ دور جدید میں فلاحی ریاست (Welfare State) اور معاشرتی بہبود (Social Welfare) کا نعرہ عام رہا ہے۔ ریاست کا پہلا بنیادی اور فوری مقصد اپنے افراد کے درمیان امن و امان' سلامتی اور انصاف کا قیام ہے۔ کوئی ریاست جو ایک معقول حد تک ان مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے اپنے وجود کا جواز نہیں پیش کر سکتی۔ دوسرے ایک ریاست کو صرف فرد کی ضروریات سے ہٹ کر معاشرے کی اجتماعی ضروریات اور گروہ کی بھلائی کی طرف بھی دیکھنا چاہیئے۔ اسے عمومی مفادات کا خیال رکھنا چاہئے اور معاشرہ کے لیے ایسے کام کرنے چاہئیں جن کے مشترکہ مفادات متقاضی ہیں، اور جو افراد خود یا رضا کارانہ ایجنسیوں کے ذریعے انجام نہیں دے سکتے۔

(i) قومی ترقی کو فروغ دینا چاہئے کیونکہ اسے ریاست کا قانونی مقصد کہا جا سکتا ہے۔

(ii) بالآخر انسانی تہذیب کی ترقی ریاست کا آخری اور سب سے بلند مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ریاست کے تین مقاصد ہیں: اول اس کا مشن فرد کے مفاد کی ترقی ہے پھر اس کو افراد کی اجتماعی حیثیت میں ان کے مشترکہ مفادات کو ترقی دینا اور آخر کار اس دنیا کی ترقی اور تہذیب کے فروغ کو اپنا مطمع نظر بنانا چاہیئے۔ (۳۴)

عمرانی اور سیاسی علوم کی کتابوں میں ریاست کے فرائض کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(i) امن و امان کا قیام (ii) ملک کا دفاع

---

(32) Sociology / 512

(33) Wealth of Nations / 183

(34) Political Science and government / 67, 68

(iii) نظام عدل کا قیام (iv) بین الاقوامی تعلقات (اختیاری فرائض)
(v) تعلیم کا انتظام (vi) ذرائع آمدورفت
(vii) صنعت وتجارت (viii) خوراک وزراعت
(ix) معاشرتی تحفظ (x) صحت عامہ
(xi) سماجی واخلاقی اصلاح (xii) مالیاتی استحکام
(xiii) شہریوں کے لیے روزگار کے مواقع

موجودہ دور کی تقریباً تمام ریاستیں ان فرائض کی ذمہ داری لیتی ہیں اور انہیں پایہء تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرسکتی ہیں یا نہیں۔ کامیاب اور ناکام ریاستوں کا دارومدار انہی ذمہ داریوں کے پورا کرنے پر ہے۔

اسلامی ریاست

اسلامی تعلیمات چونکہ پوری انسانی زندگی پر حاوی ہیں اس لیے اسے مکمل دین کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِ سْلَامَ دِیْنًا(۳۵)

آج کے دن میں نے تمہارا لیے دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا۔

اس کامل دین میں انسان کی معاشی، معاشرتی، تمدنی وثقافتی، اخلاقی وروحانی نیز سیاسی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے اصول موجود ہیں۔ اسلام زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے تمام ادیان اور نظامہائے فکر سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام نے ریاست کے متعلق جو تعلیم دی ہے وہ بھی دیگر ریاستوں کے اصولوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے اور وہی تمام احکام وفرامین کا سر چشمہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۳۶) اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔

فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (۳۷) تو حکم تو اللہ ہی کا ہے جو (سب سے) اوپر اور (سب سے) بڑا ہے۔

اَلَا لَہُ الْحُکْمُ (۳۸) سن لو کہ حکم اسی کا ہے۔

---

(۳۵) المائدہ/۳ (۳۶) یوسف/۴۰
(۳۷) الانعام/۶۲ (۳۸) مؤمن/۱۲

کوئی فرد اور جماعت اقتدار اعلیٰ کی مالک نہیں ہے۔ دوسرے عناصر حکومت کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان اجتماعی انتظام کے لیے اللہ کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ریاست میں حکومت کی بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور منتظمین ریاست کو عظیم الشان نمائندگی کرنا ہوتی ہے۔ وہ خود مختار نہیں ہوتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ احکام خداوندی کو نافذ کریں۔ اسلامی ریاست ''معاہدۂ ربانی'' پر مبنی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے خدائے واحد سے معاہدۂ اطاعت کیا تھا۔ اسلامی ریاست اس معاہدہ پر مبنی معاشرہ منظم کرتی ہے۔ یہ معاہدہ ایسا ہے جس میں ریاست کا ہر فرد مسئول ہے۔ کوئی شخص اطاعت سے بالاتر نہیں اور کوئی شخص احکام خداوندی سے بغاوت کر کے اسلامی ریاست کی انتظامیہ میں نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی حکومت کی صرف وہ صورت درست ہے جس میں ریاست خدا اور رسولؐ کی قانونی بالادستی تسلیم کر کے اپنی حاکمیت سے دستبردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت خلافت (نیابت) کی حیثیت قبول کرے۔ اس کے اختیارات تشریعی ہوں یا عدالتی، انتظامی ہوں یا معاشی، لازماً اللہ اور اس کے رسولؐ کے تابع ہوں گے۔ قرآن مجید میں ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۳۹)

اے نبی ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان ہے ان پر۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی میں حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے پاس آیا ہے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴۰)

اے داؤد ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے تم لوگوں میں حق اور صداقت سے حکومت کرو۔ خواہش کے پیچھے نہ پڑ جانا ورنہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیارات دیئے ہیں انہیں وہ منشائے الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اسے خلیفہ کہا گیا اور اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ(۴۱)

اور یاد رکھو جب کہ تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

---

(۳۹) المائدہ/۴۸ (۴۰) ص/۲۶

(۴۱) البقرۃ/۳۰

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (۴۲)

(اے انسانوں) ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے اس میں سامان زیست فراہم کیے۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خالق کائنات کے پیش نظر محض فرد کی تخلیق نہیں بلکہ انسانیت کا اجتماعی نظام بھی تھا اس لیے اسلامی ریاست دراصل خدائی انتظام کی امین ہے کیونکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان منظم اجتماعی زندگی گزارے۔ اسلام اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کا اجتماعی شعور بعد کی پیداوار ہے۔ بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احساس اول روز ہی سے انسان کو عطا کیا گیا تھا پھر جس طرح کے حالات میسر آتے گئے اس کا شعور کام کرتا گیا۔ انبیاء علیہم السلام نے صالح معاشروں کے قیام اور عادلانہ ریاستوں کے وجود کے لیے جو کوششیں کی ہیں انہیں انسانی تاریخ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا نصب العین عوام کی انفرادی و اجتماعی بہبود ہے اور یہ بہبود محض دنیاوی ساز و سامان کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس میں اخروی زندگی کی فلاح بھی شامل ہے۔

مقاصد و فرائض

اسلامی ریاست کا مقصد ریاست کے تمام افراد کو احکام خداوندی کا پابند بنانا اور ان کی معاشی و معاشرتی بہبود کا خیال رکھنا ہے۔ اسلامی ریاست کے فرائض میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو جدید ریاست کے فرائض میں ہیں بلکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے ان سے بڑھ کر بھی کچھ فرائض رکھتی ہے جن کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(i) شریعت اسلام کا نفاذ۔

(ii) نظام شوریٰ کا قیام۔

(iii) اجتماعی عدل کا قیام۔

(iv) انسانی حقوق کا تحفظ۔

(v) مساوات۔

(vi) غیر مسلموں سے رواداری۔

اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان فرائض سے عہدہ برآ ہو۔ قرآن و سنت میں ان فرائض کے متعلق واضح ارشادات ملتے ہیں جن کا ہم یہاں ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

---

(۴۲) الاعراف/۱۰

شریعت اسلامی کا نفاذ

اسلامی ریاست کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ شریعت اسلام کو نافذ کرے' خلاف اسلام امور کو روکے' اسلامی اقدار کے احیاء و تحفظ کے لیے کوشاں رہے۔ نظام صلوٰۃ' زکوٰۃ قائم کرے' معروف و منکر کی تمیز کرے اور معروف کے قیام اور منکر کی روک تھام کے لیے مناسب انتظام کرے۔ قرآن پاک میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۴۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت) عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۴۴)

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے تم نیک کام کرنے کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۴۵)

تم میں ایک ایسی جماعت کا ہونا ضروری ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے۔ اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

ان آیات نے اسلامی ریاست کی اجتماعی ذمہ داری کی حیثیت بیان کر دی کہ اس کا کام صرف افراد کے دنیوی مفادات کا تحفظ ہی نہیں اخلاقی فساد کی روک تھام اور خیر و فلاح کا اہتمام بھی اس کے ذمہ ہے۔

نظام شوریٰ

اسلامی ریاست میں چونکہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور احکام بھی اسی کے نافذ العمل ہوتے ہیں اس لیے مجلس منتظمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ نفاذ احکام اور تعبیرات امور میں لوگوں سے مشورہ لے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا

---

(۴۳) الحج/۴۱ (۴۴) آل عمران/۱۱۰

(۴۵) آل عمران/۱۰۳'۱۰۴

ہے کہ منتظمین حاکمیت کے نشے میں بدمست نہیں ہوتے دوسرا یہ کہ مشورے سے کام زیادہ بہتر طریق پر ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں نبی ﷺ کو فرمایا گیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (۴۶)

خدا ہی کی رحمت کے سبب آپؐ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ تو آپؐ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے (اللہ سے) مغفرت مانگئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپؐ رائے پختہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیجئے۔

مومنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۷)

وہ اپنے معاملات مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: اگر آپؐ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی چیز نہ ہو تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا:

اجمعوا العابدين من امتي واجعلوا بينكم شورى ولا تمضوا فيه رأى خاصة (۴۸)

میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کر کے باہمی مشورہ کرو اور کسی ایک رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔

طبقات ابن سعد میں صحابہؓ کے استفسار پر حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ وہ کام کرو جس کی طرف رائے دینے والوں کی کثرت ہو اور یہ بھی ان ہی کا ارشاد ہے:

من دعا إلى امارة نفسه او غيره من غير مشورة من المسلمين فلا يحل لكم ان لا تقتلوه (۴۹)

جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور شخص کی امارت کے لیے دعوت دے تو تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ اسے قتل نہ کرو۔

---

(۴۶) آل عمران/۱۵۹

(۴۷) الشوریٰ/۳۸

(۴۸) اعلام الموقعین، ۱/۵۴

(۴۹) کنز العمال، ۵/۲۵۷۷

اجتماعی عدل کا قیام

اسلامی و غیر اسلامی مفکرین کی آراء سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ریاست کا سب سے بڑا مقصد اجتماعی عدل کا قیام ہے۔ اگر کوئی ریاست اجتماعی عدل کے قیام میں ناکام ہو تو وہ بیکار ہے۔ معاشرتی نقطہ نظر سے بھی ریاست کا سب سے اہم فرض یہی ہے کہ وہ اجتماعی عدل کو قائم کرے۔ اسلامی ریاست بھی اس اہم فریضہ پر خاص توجہ دیتی ہے۔ قرآن پاک میں عدل کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۰)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے اور کتاب و میزان وہ معتدل نظام ہے جس کے تحت اجتماعی عدل قائم ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۵۱)

اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لیے گواہ بنو اگر چہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو (فریق معاملہ) خواہ مالدار ہو یا غریب، تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہشوں کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۵۲)

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے

---

(۵۰) الحدید/۲۵

(۵۱) النساء/۱۳۵

(۵۲) الحجرات/۹

پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پھر اگر رجوع کرے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (۵۳)

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ (۵۴)

اور انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ تول کرو۔

اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (۵۵)

جب بات کہو تو انصاف کرو خواہ (فریق مقدمہ اپنا) رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ (۵۶)

اور آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان عدل رکھوں۔ اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی، ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، اور ہماری اور تمہاری کچھ بحث نہیں۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کے پاس جانا ہے۔

عائشہؓ سے حضور ﷺ کا ارشاد مروی ہے۔

ان اسامۃ حکم النبیؐ عن امرأۃ فقال: انما ھلک من کان قبلکم انھم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع ویترکون الشریف والذی نفسی بیدہ لو فاطمۃ (بنت محمد رسول اللہ) فعلت ذلک لقطعت یدھا (۵۷)

اسامہؓ نے نبی کریم ﷺ سے ایک عورت کے بارے میں سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا: تم میں سے جو پہلی امتیں گزری ہیں وہ اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ کم درجے کے لوگوں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو

---

(۵۳) النساء/۵۸ (۵۴) الانعام/۱۵۳
(۵۵) الانعام/۱۵۳ (۵۶) الشوریٰ/۱۵
(۵۷) بخاری، کتاب الحدود، ۲۷/۱۰۰۳

چھوڑ دیتے تھے قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہؓ (بنت محمدؐ) بھی ایسا کرتیں تو میں اس کا ہاتھ ضرور کاٹتا۔

حضور اکرم ﷺ نے سات آدمیوں کا ذکر فرمایا ہے جنہیں قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا ان میں سے ایک عادل حاکم بھی ہے۔

ان آیات و احادیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست پر اجتماعی عدل کی کتنی ذمہ داری ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے قرآن و سنت نے کتنا زور دیا ہے۔ اسلامی ریاست نظری اور عملی لحاظ سے اجتماعی عدل کی بہترین مثال ہے۔ مسلمان معاشرے اسی لیے فساد کا شکار ہوگئے کہ ان کی ریاستیں عدل اجتماعی کے قیام کو نظر انداز کر رہی ہیں۔ اسلامی ریاست میں قانون کی حکمرانی نہ ہو تو اسلامی ریاست کہلانے کی مستحق نہیں۔

حقوق انسانی کا تحفظ

اسلامی ریاست کے فرائض میں انسانی حقوق کا تحفظ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی نقطۂ نظر سے عدل اجتماعی کے ساتھ یہی وہ بنیادی بات ہے جس کے لیے یہ معاشرتی تنظیم وجود میں آئی۔ جہاں بھی چند انسانوں کی جمعیت ہوئی وہاں زیادتی ظلم اور جبر کا امکان ہے اور طاقتور لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں پر دست درازی کر سکتے ہیں۔ ریاست کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ کسی بھی رعایت کے بغیر ہر ایک کے حقوق کا تحفظ کرے۔

لاسکی کے بقول:

"Rights infact, are those conditions of Social life, without which no man can seek, in general to be at his best." (58)

بنیادی انسانی حقوق کا تعلق فرد کی ذات سے ہے اور جس معاشرے میں فرد کو یہ حقوق میسر نہیں وہاں اجتماعیت کی صحت مندی کا تصور ممکن نہیں۔ لاسکی کی زبان میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے۔

"We will build rights upon individual personality because, ultimately, the welfare of the community is built upon the happiness of individual."(59)

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اور اس کی تعلیمات انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہیں اس لیے اس نے حقوق انسانی کے متعلق بھی واضح تعلیمات دی ہیں۔ حقوق انسانی تو بہت بڑی بات ہے وہ تو نباتات کو بے مقصد کاٹنے اور حیوانات کو بے سبب تکلیف پہنچانے کے حق میں بھی نہیں۔ انسانی حقوق کے متعلق تو اس قدر تفصیلی ہدایات ہیں کہ غالباً

---

(58) Grammer of Politics / 91

(59) Grammer of Politics / 91

کسی مذہب اور کسی معاشرتی و سیاسی نظام میں نہیں پائی جاتیں۔ اسلام فرد سے لے کر اجتماعیت کے عروج تک کو سمیٹ لیتا ہے۔ وہ حقوق کی تعلیم دیتا اور ان کی ترتیب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے ہم حقوق کو اخلاقی، قانونی، سیاسی اور معاشی کہہ سکتے ہیں۔ فرد کے اپنے احساس سے لے کر ان حقوق تک جن کا تحفظ ریاست کرتی ہے سب اسلام کی تعلیم میں موجود ہیں اور وسیع پیمانے پر انسانی ہمدردی و خیر خواہی اور امداد و تعاون کی وہ تفصیلات بھی موجود ہیں جنہیں آج بنیادی انسانی حقوق کے نام سے یاد اور دور حاضر کی بڑی کامیابی تصور کیا جاتا ہے یہ حقوق اسلام ہمیں عطا کرتا ہے اور اسلامی ریاست ان کے تحفظ کی ذمہ دار ٹھہرتی ہے۔ وہ بنیادی حقوق جن کے متعلق قرآن وسنت کے ارشادات ملتے ہیں انہیں ہم یہاں اختصار سے بیان کرتے ہیں:

(i) جان و مال کی حفاظت

(ii) عزت و ناموس کی حفاظت

(iii) شخصی آزادی کی حفاظت (جو شریعت وسنت کی تابع ہو)۔

(iv) ذاتی ملکیت کی حفاظت

(v) عقیدے اور مسلک کی حفاظت

(vi) مساوات۔

(vii) قیام عدل۔

جان و مال اور آبرو کی حفاظت

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ اسلامی ریاست اللہ اور اس کے رسول کی نیابت میں ہر اس فرد کے جان و مال کی محافظ ہے جس نے اسکی شہریت قبول کی ہے' حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے:

من صلى صلاتنا و استقبل قبلتنا واكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذى له ذمةُ الله فلا تخفروا الله فى ذمته (٦٠)

جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی۔ ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ قائم ہو چکا ہے تو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغابازی نہ کرو۔

جس معاشرے کے افراد کو جان و مال کا خطرہ ہر وقت لاحق ہو وہاں نہ پائیدار اجتماعیت کبھی جنم لیتی ہے نہ ریاست اور شہریوں کے درمیان معاہدے پر مبنی جو اطاعت ہے وہ برقرار رہتی ہے اور ایسا معاشرہ خطرناک قسم کے انتشار اور ابتری کا

---

(٦٠) سنن نسائی، ۱۵/۹؛ بخاری، باب فضل استقبال القبلہ، ۱/۳/۱۰

شکار ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اسی کے پیش نظر حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا تھا:

فان دماء کم واموالکم و اعراضکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا (۶۱)

بلاشبہ تمہاری جان و مال اور آبرو ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں۔جس طرح آج کا یہ دن ہے۔حتیٰ کہ تم اللہ سے جاملو۔

آنجنابؐ سے مزید مروی ہے:

کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ و عرضہ (۶۲)

مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے۔اس کا خون بھی اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

کسی جائز قانونی وجہ کے بغیر شہری کو اس کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔یہ وہ اصول ہے جسے آنحضرتؐ نے مدینہ کی ریاست میں قائم کیا تھا۔

شخصی آزادی

اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے۔اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ کوئی بھی کسی کی آزادی کو مجروح نہ کرے حتیٰ کہ ریاست بھی اس کی آزادی کو سلب نہ کرے الا یہ کہ اس کی آزادی اجتماعی مفاد اور دینی اقدار کے لیے مضر ثابت ہو رہی ہو اور ایسی حالت میں بھی معروف طریقے پر جرم ثابت کئے اور صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کی آزادی سلب نہیں کی جاسکتی۔اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ محض شبہات اور اوہام کی بنیاد پر کسی آدمی کو دھر لیا جائے۔اللہ تعالیٰ نے جس آزادی کا حق انسان کو بخشا ہے اس کے حق سے محروم نہ کرے۔اس کی تصدیق حضور ﷺ کے ارشادات سے ہوتی ہے۔

عن مقدام بن معد یکرب وأبی امامۃؓ عن النبی ﷺ قال: ان الأمیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم (۶۳)

مقدام ابن معد یکربؓ اور ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: امیر جب لوگوں کے اندر شبہات کی تلاش کرے تو ان کو بگاڑ دیتا ہے۔

ریاست کو یہ حق نہیں کہ شہریوں کی شخصی آزادی کو حیلوں بہانوں سے ختم کردے۔مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم

---

(۶۱) ابن ہشام، ۴/۲۵۰

(۶۲) مسند احمد، ۳/۴۹۱؛ مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تحریم الظلم، ۸/۱۱

(۶۳) ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن التجسس، ۴/۵-۲

کے الفاظ ہیں:

''پھر اسلام کی رو سے' چونکہ حکومت کوئی مقصود بالذات شیٔ نہیں بلکہ وہ محض ایک ذریعہ ہے اس بات کا کہ شہریوں کو رائے وعمل کی وہ آزادی بہم پہنچائی جائے جو اسلام نے افراد معاشرہ کو بخشی ہے تا کہ آزمائش کی وہ غرض کماحقہ پوری ہو سکے جس کی خاطر ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا ہے۔ اس وجہ سے اسلام کسی غیر معمولی حالت (State of Emergency) میں بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کیے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کرے۔'' (۶۴)

حضور اکرم ﷺ ہی کا ایک واقعہ شخصی آزادی کے تحفظ کے لیے کافی ہے۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه انه (أي جده) قام الى النبی ﷺ وهو يخطب فقال: جيراني اخذوا؟ فأعرض عنه مرتين ثم ذكر ماشاء فقال النبی ﷺ: خلوا له عن جيرانه (٦٥)

بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے درآنحالیکہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے؟ نبی ﷺ نے دو مرتبہ اس سے صرف نظر کیا تو اس شخص نے پھر کچھ کہا اس پر آپؐ نے فرمایا: اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو۔

اسلامی ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدالتی ثبوت کے بغیر کسی کی شخصی آزادی میں مداخلت کرے دیکھئے امام ابو یوسفؒ کے اس قول سے اسلامی روح کا پتا چلتا ہے وہ فرماتے ہیں:

ولا يحل ولا يسع ان يحبس رجل بتهمة رجل له. كان رسول الله ﷺ لا يأخذ الناس بالقذف ولكن ينبغی ان يجمع بين المدعی والمدعی عليه فان كان له بينةٌ علی ما ادعی حكم بها و إلا اخذ من المدعی عليه كفيل و خلی عنه فإن اوضح المدعِی عليه بعد ذلك شيئاً والا لم يتعرض له (٦٦)

نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس بنا پر حوالات میں ڈالا جائے کہ کسی شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مجرد الزام کی بنا پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کرتے تھے لیکن مناسب یہ ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا

---

(۶۴) اسلامی ریاست/۱۶ مطبوعہ لاہور

(۶۵) ابوداؤد کتاب الاقضیہ ۳/۳۲۷ مطبعۃ السعادۃ مصر

(۶۶) کتاب الخراج/۱۰۷

جائے ورنہ مدعا علیہ سے ضمانت لے کر اس کو رہا کر دیا جائے اس کے بعد اگر مدعی کچھ ثبوت فراہم کرے تو خیر ورنہ مدعا علیہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاصؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یا عمرو! مُذکَمْ تعبد تم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احراراً (٦٧)

اے عمروؓ تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنایا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔

آپ کے اس قول کو مولانا ظفر علی خاں نے یوں بیان کیا ہے:

آدمی پیدا ہوا آزاد ماں کے پیٹ سے
کب سے تم لوگوں نے سمجھا ہے غلام آزاد کو

اس سے ریاست میں شخصی آزادی کی حفاظت کا بہترین معیار سامنے آتا ہے۔

رائے و مسلک کی آزادی

رائے اور مسلک کی آزادی دور حاضر میں بڑی اہمیت حاصل کر گئی ہے۔ لادینی ریاستوں میں چونکہ مذہبی عقیدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس لیے فرد ریاست کی وفاداری کے بعد ہر قسم کا عقیدہ و مسلک رکھ سکتا ہے۔ گو رائے اور مسلک کی آزادی کی یہ بات کاغذی کارروائی سے آگے نہیں بڑھی اور حکومت اپنی مرضی کے مطابق پابندیاں لگاتی ہے تاہم یہ ایک نعرہ کے طور پر بہت رائج ہے۔ آزادی رائے میں سیاسی رائے بھی آتی ہے اور دور حاضر کی کم ہی ریاستیں ایسی ہیں جن میں سیاسی مخالفین کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ عموماً ریاست کے مسلک اور اس کی رائے ہی کو تفوق حاصل رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی ریاست کا موقف منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ریاست کے موقف کو سمجھنے کے لیے ہمیں بعض امور کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

(i) اسلامی ریاست ایک اصولی ریاست ہے۔ اصولوں کے بارے میں وہ کسی قسم کی منافقت برداشت نہیں کرتی۔ جس بات کو پسند کرے اس کا اعلان کرتی ہے جسے ناپسند کرے اسے چھپاتی نہیں۔

(ii) اسلامی ریاست کے شہری دو قسم کے ہیں: مسلمان اور غیر مسلم اس لیے اسلامی ریاست کو انتظامی لحاظ سے اس امر کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ حقوق و فرائض میں دونوں کی اصولی حدود کیا ہیں؟

(iii) اسلامی ریاست ایک عادلانہ تنظیم ہے۔ یہ کسی شہری کے حقوق کو غاصبانہ طور پر نہیں چھین سکتی نیز اس کی حیثیت نیابت کی ہے۔ اس لیے وہ اللہ اور رسول کی دی ہوئی مراعات میں کمی بیشی کا اختیار نہیں رکھتی۔

(iv) مسلک اور رائے کو مذہبی اور سیاسی دائروں میں تقسیم کر لینے سے ریاست کی تنظیمی فعالیت کا اندازہ زیادہ بہترین طریق سے ہو سکتا ہے۔

---

(٦٧) کنز العمال ٦/ ٣٥٥؛ عمر الفاروق ٢/ ٢١٩ طبع مصر

اسلامی ریاست کے مسلم شہری

اسلامی ریاست اپنی تنظیم میں ظاہری امور کو مدنظر رکھے گی مثلاً اس کے سامنے یہ تو ہے کہ وہ نظام صلاۃ اور نظام زکاۃ قائم کرے لیکن وہ طریق صلاۃ پر کسی شہری کو مجبور نہیں کر سکتی۔ اسی طرح فقہی اور کلامی مسائل میں کسی شخص کا منتظمین ریاست سے مختلف ہونا وجہ تکلیف نہیں ہے۔ ہر شہری کو اجازت ہے کہ وہ اپنی اجتہادی بصیرت یا تقلیدی احساس کے ساتھ کوئی سا بھی فقہی و کلامی مسلک اختیار کرے۔ اسلامی ریاست اس بات کی کھلی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی رائے کو دلیل سے پیش کرے۔ اصل چیز کتاب وسنت ہے اس سے انحراف روح دین سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے ایک شہری کو اپنی رائے رکھنے اور ریاست کو مدلل طور پر منوانے کا حق ہے۔ حضرت عمرؓ نے زکاۃ کے سلسلے میں حضرت صدیقؓ سے اختلاف کیا مگر جناب صدیقؓ کے استدلال پر بات تسلیم کر لی۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے منیٰ میں قصر نہ کیا۔ لوگوں کو اس سے اختلاف تھا اور اب بھی ہے لیکن اس کو فتنہ وفساد کی صورت نہیں دی۔ لہٰذا اسلامی ریاست انفرادی رائے اور عقیدہ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی' ہاں اگر کوئی اختلاف اجتماعی فساد کی صورت اختیار کر رہا ہو تو اسے افہام وتفہیم اور تبلیغ وارشاد سے رفع کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر طاقت کا استعمال وہاں بھی نہیں کرتی۔ اس طرح اسلامی ریاست میں مسلمانوں کو سیاسی میدان میں اختلاف کا حق ملتا ہے۔ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں ہمیں اختلاف کی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سیاسی اختلاف کو برداشت کیا گیا مثلاً سعد بن عبادہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی نہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر۔ زندگی بھر ان کا ان حضرات سے اختلاف رہا لیکن اسلامی ریاست نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ابن قتیبہؒ نے ان کے متعلق یہ تصریح کی ہے:

فکان سعدؓ لا یصلی صلوتھم ولا یجمع بجمعتھم ولا یفیض با فاضتھم ولو یجد اعوانا لصال بھم و یبایعه أحدٌ علی قتالھم لقاتلھم فلم یزل کذلك حتی توفی ابو بکرؓ و ولی عمرؓ بن الخطاب فخرج الی الشام فمات بھا ولم یبایع لا حدھما۔(۶۸)

سعدؓ ان کی اقتداء میں نماز پڑھتے نہ ان کی امامت میں جمعہ ادا کرتے بلکہ اگر ان کو کچھ مددگار مل جاتے تو وہ ارباب اقتدار پر ہلہ بول دیتے اور اگر کوئی اُن سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بیعت کر لیتا تو وہ ان لوگوں سے جنگ بھی چھیڑ دیتے۔ وہ اپنے اس رویے پر قائم رہے یہاں تک کہ ابوبکرؓ نے وفات پائی اور عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ عمرؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد وہ شام چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ لیکن بیعت دونوں صاحبوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بھی نہیں کی۔

---

(۶۸) الامامۃ والسیاسۃ/۱۱

(اللہ ان پر رحم کرے)۔

عثمانؓ پر جس طریق پر تنقید ہوئی اور جس طرح ان سے سیاسی اختلاف کیا گیا وہ کوئی مخفی امر نہیں ہے انہوں نے شہید ہونا گوارا کیا لیکن طاقت کے استعمال سے سیاسی اختلاف کو کچلا نہیں حالانکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔علیؓ کے زمانے میں خوارج نے جو قضیہ پیدا کر دیا وہ ہماری تاریخ کا المیہ ہے۔"إن الحکم إلا لله" کے نعرے سے ابتداء کی اور علیؓ و معاویہؓ کے کفر پر انتہاء کی۔جلیل القدر صحابہؓ کو کافر کہنے کے ساتھ ریاست سے مستقل بغاوت کو اپنا مشن بنالیا۔علیؓ نے انہیں راہ راست پر لانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔عبداللہ بن عباسؓ کو کئی مرتبہ ان سے گفتگو کے لیے بھیجا گیا۔جب کوئی بات بنتی نظر نہ آئی تو علیؓ نے انہیں یہ پیغام بھجوایا:

فأرسل اليهم كونوا حيث شئتم و بيننا و بينكم ان لا تسفكوادماً و لا تقطعوا سبيلا و لا تظلموا احداً فان فعلتم نبذت اليكم الحرب (٦٩)

تم کو آزادی حاصل ہے۔جہاں چاہو رہو البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہیں بہاؤ گے۔بدامنی نہیں پیدا کرو گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔

اسلامی ریاست اپنے مسلم شہریوں کو سیاسی اور مذہبی معاملات میں وہ آزادی دیتی ہے جس میں کوئی فریب اور منافقت کارفرما نہیں ہوتی۔اسلامی ریاست یہ برداشت نہیں کرتی کہ کوئی مسلمان کتاب وسنت ہی کو نظر انداز کر دے کیونکہ یہ اسلامی ریاست کی بنیادیں ہیں۔یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی لادینی ریاست کے دستور اور انتظامی بنیاد ہی کو تسلیم نہ کرے۔اسلامی ریاست ایسے شخص کو مرتد قرار دیتی ہے اور اس کی سزا وہی ہے جو ایک لادینی ریاست میں باغی کی ہوتی ہے۔اسلامی ریاست اپنا نظم ظاہری بنیادوں پر استوار رکھتی ہے اس کو نیتوں اور دلوں کو ٹٹولنے کی ضرورت نہیں۔وہ ان اعمال سے تعلق رکھتی ہے جو شہریوں کی ظاہری زندگی کا نتیجہ ہیں اگر کوئی شخص ارکان اسلام کو ادا کرتا ہے تو اسلامی ریاست اسے مسلم شہری تصور کرے گی خواہ وہ اندرونی طور پر انہیں تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔اسلامی ریاست اپنے مسلم شہریوں کو ارتداد کی اجازت نہیں دیتی کہ اس سے نظم معاشرت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔اسلام چونکہ انفرادی عقیدہ ہی نہیں ایک اجتماعیت بھی ہے اس لیے اس سے انکار دراصل اجتماعیت کا فساد ہے۔کوئی شخص اگر انفرادی طور پر اسلامی عقیدہ وعمل سے انحراف کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن جب کوئی انکار کا اعلان کرتا ہے یا کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو گویا وہ عملاً اس اجتماعیت کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔دنیا کی کوئی ریاست ایسے شخص کو برداشت نہیں کرتی۔

اسلام چونکہ دوسرے مذاہب کی طرح ایک انفرادی معاملہ نہیں ہے جو محض بندے اور رب کے تعلق پر مبنی ہے بلکہ یہ ایک

(٦٩) نیل الاوطار، ۱۴۹/۷

صالح نظام بھی ہے جو دنیا میں الٰہی وفاداری کی اساس پر ایک اجتماعیت کو منظم کرتا ہے۔ کوئی شخص جب اس ناطہ کو توڑتا ہے تو عملاً وہ اس اجتماعیت سے بغاوت کرتا ہے اور اسے نقصان پہنچانے کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے شخص کو اجتماعیت کیسے برداشت کرے گی۔ ایسا شخص اگر اس اجتماعیت کو چھوڑ کر کفر کی اجتماعیت میں شامل ہو جاتا ہے اور اس ریاست اور وطن کو خیر باد کہہ دیتا ہے تو اسے اختیار ہے کہ ایسا کرے لیکن مسلمانوں کے معاشرے میں رہ کر کفر کی جمعیت کا حصہ بنے یہ ممکن نہیں۔

غیر مسلم شہری

اسلامی ریاست مذہبی معتقدات کے سلسلے میں اپنے غیر مسلم شہریوں سے زیادہ رواداری کا سلوک کرتی ہے۔ وہ انہیں ریاست کے بنیادی معتقدات سے اختلاف رکھنے اور اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی کھلی اجازت دیتی ہے۔ ریاست ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتی ہے نہ کسی شہری کو کرنے دیتی ہے۔ جس طرح مسلم رعایا کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرنا اسلامی ریاست کا فرض ہے اسی طرح غیر مسلم اقلیت کا تحفظ بھی اس کے لیے ازبس ضروری ہے' انہیں معاشی اور معاشرتی مساوات حاصل ہوگی اور اپنی مرضی کے مطابق جو پیشہ بھی چاہئیں اختیار کریں۔ وہ اپنے عام انسانی حقوق میں مسلم رعایا کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اسلام غیر مسلموں کی تہذیب و تمدن اور معاشرتی رسومات کی حفاظت کرتا ہے الا یہ کہ وہ پوری اجتماعیت کے لیے مہلک ثابت ہونے لگیں جیسے ہندوستان کی رسم ستی یا جاپان کی رسم خود کشی۔ چونکہ ان رسموں کو باقی رکھنے کے معنی پورے اجتماعی ڈھانچے کو برباد کرنے کے ہیں اس لیے ان کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں عیسائیوں نے صلیب کا جلوس نکالا تھا اور ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا تھا۔ قرآن پاک نے انفرادی مذہبی آزادی کے لیے (لا اکراہ فی الدین) کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اہل نجران کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے میں یہ امر بوضاحت موجود تھا کہ ان کے مذہب اور مذہبی اداروں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اسلامی ریاست نے اپنے آغاز کار ہی سے غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ آنحضورﷺ نے مدینہ کے یہودیوں کا اس وقت تک خاص لحاظ رکھا جب تک وہ بغاوت اور کھلی دشمنی پر نہیں اتر آئے۔ خلافت راشدہ میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک ایک ایسا اسلامی کردار بن گیا تھا کہ بعد کے مسلمان بادشاہ بھی اس میں رد و بدل نہیں کر سکے تھے۔ بعض غیر مسلم شہریوں نے مسلم ریاست کے احکام کی کھلی خلاف ورزیاں بھی کیں لیکن علمائے وقت نے منتظمین سیاست کو حسن عمل ہی کا مشورہ دیا۔ عہد بنی عباس میں قبرصیوں کی طرف سے شکایات موصول ہوئیں تو گورنر عبدالملک بن صالح نے علماء سے مشورہ کیا۔ علماء نے یہی رائے دی کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے کیونکہ وہ رومیوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ہمیں ان کی جان و مال کی حفاظت کرنی چاہئے اور ان کی بدعہدی کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔

مساوات

مساوات کے معنی یکسانیت کے ہیں۔ انسانی معاشروں میں اس یکسانیت کو درہم برہم کر دیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی مختلف ریاستوں نے اس مساوات کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہوئیں۔ اسلامی ریاست بھی مساوات قائم کرتی ہے لیکن اس کے متعلق اس کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ علمائے شہریت نے مساوات کی بہت سی قسمیں بیان کی ہیں: پیدائشی مساوات، معاشرتی مساوات، سیاسی مساوات، معاشی مساوات۔

اسلامی ریاست مساوات کے اصول کی نقط قائل ہی نہیں بلکہ اسے نافذ بھی کرتی ہے۔ اسلام انسانی اور سماجی نقطۂ نظر سے سب کو برابر سمجھتا ہے اس لیے اسلامی ریاست کو اسے پالیسی کے طور پر اپنانے میں کوئی دقت نہیں۔ ہم یہاں قانونی، معاشرتی اور معاشی مساوات کے متعلق صرف چند خصوصی پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے۔

قانونی مساوات

اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کی عام حکمرانی کو قائم رکھے۔ ہر شخص اور ہر طبقہ کے لوگ ایک ہی نظامِ عدالت کے تحت ہوں۔ غریب و امیر اور راعی و رعایا سب قانون کی نظر میں برابر ہوں۔ اسلامی ریاست قانونی مساوات کی علمبردار ہے۔ اسلامی ریاست کا کوئی شہری قانون سے بالاتر نہیں حتیٰ کہ منتظمِ اعلیٰ بھی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ قرآن پاک نے نبیؐ کو قانون پر ایمان لانے والا کہا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۰)

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے۔

قانون کی اطاعت اور قانون کی تنفیذ میں بھی نبی اکرمؐ کا طرزِ عمل اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کا اندازہ کتبِ حدیث میں مذکور اس واقعہ سے ہوتا ہے جسے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ قریش کی ایک معزز خاتون نے چوری کی۔ معاملہ حضور اکرم ﷺ تک پہنچا تو آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کو کہا۔ قبیلہ کے باعزت لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ کی سفارش کرائی۔ آنحضور ﷺ نے اسے ناپسند کیا اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کے الفاظ قانونی مساوات میں تاریخی عظمت کے حامل ہیں۔

اِنّما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع ويتركون الشريف والذى نفسى بيده لو فاطمة (بنت محمد) فعلت ذلك لقطعت يدها (۷۱)

تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کمتر درجہ کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا

---

(۷۰) البقرہ/۲۸۵

(۷۱) بخاری، کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع ۲/۱۰۰۳؛ مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف، ۵/۱۱۴

دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اسلامی نظام میں غریب اور امیر کے لیے دو مختلف عدالتی نظام نہیں پائے جاتے۔ یہاں اللہ اور رسول نے جو قانون دیا ہے وہ سب پر یکساں جاری و نافذ ہوتا ہے خواہ وہ امیر المؤمنین ہو یا بوجھ اٹھانے والا مزدور۔ اسلامی ریاست عام شہری اور خاص شہری کی تفریق نہیں کرتی۔ عمرؓ کا طریق کار یہ تھا کہ عام مجلس میں لوگوں کو اپنے عمّال کے خلاف شکایت کرنے کا موقعہ دیتے۔ جبلہ بن ایہم غسّانی کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس نے ایک بدو کو تھپڑ مارا اور جب اسے پتہ چلا کہ میں قانونی سزا سے بچ نہیں سکوں گا تو بھاگ گیا۔ اسے یہ احساس تھا کہ یہاں غریب و امیر میں فرق نہیں کیا جائے گا۔

عمرو بن العاصؓ نے کہا۔

یا امیر المومنین ارأیت ان کان رجل من المسلمین والیا علی رعیتہ تأدب بعضھم انك لتقصیہ منہ؟ فقال ای والذی نفسی بیدہ لأقصیہ منہ وقد رأیت رسول اللہ ﷺ یقص من نفسہ الا لا تضربوا المسلمین فتذلوھم (۷۲)

اے امیر المومنینؓ اگر ایک شخص کسی جگہ کا گورنر ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اس سے بھی مظلوم کو قصاص دلواؤں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لیے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ خبردار مسلمانوں کو نہ مارو ورنہ تم انہیں ذلیل کرو گے۔

پھر عمرو بن العاصؓ کے ساتھ عملاً ایک معاملہ پیش آ گیا اور جب تک انہوں نے شکایت کرنے والوں کو راضی نہ کر لیا اس وقت تک ان کی جان نہ چھوٹی۔ (۷۳)

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست قانونی مساوات کو کس طرح برقرار رکھتی ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ ریاست کا ایک فوجداری قانون ہے اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں لیکن شخصی قانون میں غیر مسلم شہری کے ساتھ اپنے قانون کے مطابق معاملہ کیا جائیگا اسے یہ آزادی حاصل ہے۔ مسلم شخصی قانون کی پیروی پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

---

(۷۲) کتاب الخراج/۶۶ مطبوعہ مصر

(۷۳) کتاب الخراج /۶۶۔

معاشرتی مساوات

اسلامی ریاست اپنے شہریوں میں معاشرتی مساوات کی قائل ہے۔ وہ ان تفریقات کو تسلیم نہیں کرتی جو رنگ و نسل اور خون و پیشہ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہیں۔ اسلامی ریاست ان تمام جاہلی امتیازات کو یکسر مٹا دینے کے لیے قائم ہوئی ہے۔ اس کی نظر میں وہ تمام شہری یکساں حیثیت کے مالک ہیں جو شہریت کی شرائط پوری کر رہے ہیں۔ معاشرتی اعتبار سے یہ سب لوگ برابر ہیں۔ اسلامی ریاست چونکہ ظاہری اعمال سے متعلق مکلف ہے اس لیے اگر امتیاز کرتی بھی ہے تو اس خدائی معیار کے مطابق جسے نیکی و بدی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۷۴)

اور تمہیں مختلف شاخوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا ہے کہ تم میں آپس میں شناخت ہو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے عزت والا وہ ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ کسی گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ (۷۵)

عمرؓ کا مشہور قول ہے جو اسلامی نقطۂ نظر کی عملاً تشریح ہے:

ليس بين الله و بين احد نسب الا بطاعة الناس، شريفهم و وضيعهم فى دين الله سواء (۷٦)

اللہ اور کسی شخص کے درمیان اطاعت کے سوا کوئی رشتہ نہیں اس لیے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

اسلامی ریاست معاشرتی مساوات کو قائم رکھتی اور اپنے انتظامی اختیارات سے مصنوعی ممیزات کو ختم کرتی ہے۔

معاشی مساوات

اسلامی ریاست معاشی مساوات کا بھی لحاظ رکھتی ہے۔ لیکن معاشی مساوات میں اس کا نقطۂ نظر عام ریاستوں سے مختلف ہے۔ دور حاضر میں بعض ریاستیں مساوات کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن حقیقی مساوات ان میں موجود نہیں۔ اسلامی مساوات سے مراد یہ ہے کہ معاشی میدان میں کام کرنے کے مساوی مواقع مہیا کیے جائیں اور تقسیم زر میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ عدل اجتماعی کا تقاضا ہے کہ ریاست ان افراد کی کفالت کرے جن کا کوئی کفیل نہیں۔ یہ ایک اجتماعی حق ہے جسے یوں بیان کیا گیا ہے: جس کا کوئی وارث نہیں ریاست اس کی وارث ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

(۷۴) الحجرات/۱۳

(۷۵) ابن ہشام/۴/۲۵۰

(۷٦) عمر الفاروق/۱۵٦۔۱۵٦ مطبوعہ مصر

عن المقدامؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ......انا وارث من لا وارث له اعقل له و أرثه(۷۷)

میں اس کا وارث ہوں جس کا وارث نہیں اس کی جانب سے دیت دوں گا اور اس کا وارث ہوں گا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وقالوا كما يرثه اذا مات ولم يدع وارثا فكذالك يقضى عنه دينه اذا مات ولم يدع وارثا وكذلك ينفق عليه فى حياته اذا لم يكن من ينفق عليه

اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز ایسی صورت میں جب اس کی زندگی میں اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔

ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ جس طرح وہ لاوارث کی جائیداد کی مالک بنتی ہے اسی طرح وہ قرض اور دیت کی صورت میں بھی ذمہ دار ہو اگر بیوی بچے چھوڑ کر مرتا ہے تو ریاست ان کی بھی کفیل ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ کی ان تعلیمات ہی کا اثر تھا جو اسلامی ریاست کے اولین منتظمین اس کا اتنا خیال رکھتے تھے جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے:

اسمعيل بن عبد الله قال حدثنى مالك عن زيد بن اسلم عن ابيه قال خرجت مع عمر بن الخطابؓ اليه السوق فلحقت عمر امرأة شابة فقالت: يا امير المئومنين هلك زوجى و ترك صبية صغاراً والله ما ينفجون كراعاً ولا لهم زرع ولا ضرع و خشيت ان تأكلهم البضع وانا بنت خفاف بن ايماء الغفارى وقد شهد أبى حديبية مع رسول الله فوقف معها عمر ولم يمض ثم قال مرحبا بنسب قريب ثم انصرف الى بعير ظهير كان مربوطاً فى الدار فحمل عليه غرارتين ملأ هما طعاماً وحمل بينهما نفقةً وثياباً ثم ناولها بحطامه ثم قال اقتاديه فلن يفنى حتى يأتيكم الله بخير(۷۸)

زید بن اسلمؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ایک مرتبہ عمرؓ کے ساتھ بازار کی طرف جانکلا وہاں ایک نوجوان عورت ان کے پاس آئی اور بولی کہ اے امیر المومنینؓ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے بچے چھوڑے ہیں جو ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ اپنا لقمہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے باپ نے نہ زمین چھوڑی ہے نہ مویشی۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ بچے میری کس مپرسی کی نذر نہ ہو جائیں۔ میں خفاف بن ایماء غفاریؓ کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ رسول کریمؐ کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے۔ عمرؓ اس کی بات سن کر وہیں کھڑے ہو گئے اور اس قریبی تعلق پر اظہار مسرت فرمایا پھر گھر

---

(۷۷) ابوداؤد، کتاب الفرائض، ۳/۱۴۹

(۷۸) بخاری، كتاب المغازى، باب غزوة الحديبيه، ۵۷/۲۶۲

میں بندھے ایک اونٹ پر گیہوں کی بوریاں لدوائیں اور کچھ نقدی اور کپڑے اس کے ساتھ رکھوائے اور پھر اس کی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر فرمایا کہ اس کو لے جاؤ۔ اس کے ختم ہونے سے پہلے تیرے پاس مزید سامان پہنچ جائے گا۔

اسلامی ریاست معاشی مساوات میں لوگوں کی صلاحیتوں اور ان کی مجبوریوں کا لحاظ رکھتی ہے اگر کوئی شہری اعلیٰ صلاحتیں رکھتا ہے تو اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق فوائد حاصل ہوں گے اور اگر بے یار و مددگار ہے تو اسلامی ریاست اس کی کفالت کرتی ہے۔ اسلامی ریاست اس معاشی مساوات کی قائل نہیں جس میں ہر شخص کو جبراً ایک معیار پر لایا جائے اور زائد اشیاء پر ریاست قبضہ کر لے۔ اس کے علاوہ بھی اسلامی ریاست کے فرائض ہیں جنہیں اسلامی سیاسیات کی بڑی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ریاست ایک معاشرتی ادارے کی حیثیت سے کتنی اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس تفصیلی بحث سے بخوبی ہوسکتا ہے جو ہم نے ریاست کے ضمن میں کی ہے۔ علمائے معاشرت کے نزدیک ریاست معاشرتی تنظیم کا نقطۂ عروج ہے اور کسی معاشرے کی ہیئت اجتماعیہ کا صحیح اندازہ اس کی تنظیم ریاست ہی سے ہوسکتا ہے۔ ریاست ایک اہم معاشرتی ادارہ ہے۔ جو انسانی تنظیم میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور اسلام نے اس کی تنظیم و تنفیذ کی طرف خصوصی توجہ دی حضور اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین کے مبارک ادوار میں اس کے لیے جو اصول وضع کئے گئے اور جو معیار قائم کیا گیا وہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ ایک ماڈل کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

......☆......

امت

اسلام نے حیاتِ انسانی کو ایک انوکھا تجربہ عطا کیا ہے۔ اس نے ایک طرف خاندان کے ادارے کو مستحکم کیا' اس کی حفاظت اور استحکام کے لیے اصول وضوابط طے کئے اور ان عوامل کی حوصلہ شکنی کی جو اس کے انتشار کا باعث ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کی توسیع' بڑی معاشرتی وحدتوں کی تشکیل اور استحکام کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ انسانی اور ماحولیاتی عوامل کو تسلیم کرتے ہوئے صحت مند معاشرتی ارتقاء میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔ اسلام کی وسعت پذیری اور ہمہ گیری نے جب مختلف قوموں' گروہوں اور علاقوں کو اپنے دامن میں سمیٹا تو ان کی انفرادی شناختوں کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ایک بڑی معاشرتی شناخت عطا کی۔ یہ معاشرتی شناخت نسلی' گروہی' علاقائی اور لسانی علامتوں سے متصادم نہیں تھی بلکہ ان پر محیط تھی اور ان کو اپنے جلو میں لے کر چلنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس لیے کہ یہ شناخت مادی نہیں روحانی اور ماحولیاتی نہیں' نظریاتی تھی۔ قرآن نے اس شناخت کی بنیاد رکھ دی تھی جب اس نے یہ اعلان کیا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ(۱)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے پھر تمہیں مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ قابل تکریم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

انسانی معاشرت کا ارتقاء مشیت ایزدی کو مطلوب ہے۔ معاشرت کی مادی تنظیم اور اس کا تنوع انسان کی محنت ضرورت اور تسکین کا ذریعہ ہے۔ اسے اس نے اپنے ماحول کے مطابق پروان چڑھانا ہے۔ اس کا استحکام وزوال اور اس کی ترقی وانتشار خالصتاً قوانین فطرت کے مطابق ہے۔ الٰہی مداخلت اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی بڑا انقلاب مطلوب ہوتا ہے۔ انسانی معاشرت منظم ہوتی ہے ترقی کرتی ہے اور زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ نئی معاشرت وجود میں آتی ہے اور یوں یہ سلسلہ چلتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک پہلو ایسا رکھا ہے جس کا تعلق اخلاقی وروحانی قوانین سے ہے۔ یہ وہ بنیادی ضوابط ہیں جن سے کسی معاشرے کی صحت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ربانی اصطلاح میں یہی ضوابط وہ معیارات ہیں جن کو نظرانداز کر کے معاشرے بالآخر زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ انسانی معاشرت کے مختلف مراحل ہیں۔ ایک مرحلہ وہ ہے جہاں معاشرہ تمام مادی شناختوں سے بالاتر ہو کر ایک اخلاقی وروحانی اور فکری ونظریاتی مقام حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نسلی' لسانی' گروہی اور علاقائی نسبتیں ایک بڑی نسبت میں گم ہو جاتی ہیں یہ ایک مثبت' نفع بخش اور تعمیری نظم

(۱) الحجرات/۱۳

معاشرت ہے جو وسیع تر انسانی بنیادوں پر منظم و مستحکم ہوتی ہے۔ یہی وہ تنظیم ہے جسے قرآن امت کہتا ہے۔ اسلام نے انسانی اجتماعیت میں اس تنظیم کو متعارف کرایا جو نظریاتی و روحانی ہے۔ اور یہ حیات انسانی میں تعمیری کردار ادا کرنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ اسے اسلام کا اختصاص اور اس کی انفرادیت سمجھنا چاہیے آئندہ صفحات میں ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کریں گے۔

امت کا تصور

امت ایک خصوصی اسلامی تصور ہے جو اسلام کے نظریاتی و معاشرتی پہلوؤں کا مظہر ہے۔ اس خصوصی تصور کی بنا پر مسلمان دنیا میں منفرد اجتماعیت کے حامل ہیں۔ چونکہ امت عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن و سنت نے اسے خصوصی معنوں میں استعمال کیا ہے اس لیے لغت اور قرآن و سنت کے حوالے سے اسے جاننا مناسب ہوگا۔

امت کے لغوی معنی جماعت، گروہ اور طریقہ کے ہیں۔ ابن منظور کے بقول

الامة: الجيل والجنس من كل حى۔(۲) امت کے معنی ہر جاندار کے گروہ یا جنس کے ہیں۔

كل جيل من الناس هم امة على حدة وقال غيره: كل جنس من الحيوان غير بنى آدم على حدة(۳)

لوگوں کا ہر گروہ علیحدہ امت ہے بعض اور لوگوں نے کہا بنی آدم کے علاوہ حیوانات کی ہر جنس علیحدہ ہے۔

الأمة والإ مة: الشرعة والدين وفى التنزيل انا و جدنا آباء نا على أُمة(۴)

امت کے معنی شریعت اور دین کے ہیں جیسے قرآن مجید میں ہے: ہم نے اپنے آباء کو ایک دین پر پایا۔

قرآن مجید میں امت اور اس کے متعلقات چونسٹھ دفعہ استعمال ہوئے ہیں۔ اور اسے کئی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مطلق جماعت یا گروہ کے معنی میں بھی اور جو زندگی کی علامت رکھتے ہیں جیسے انسانوں کی جماعت یا گروہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے قرآن میں ہے: **لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ**(۵)

ہر گروہ کے لیے ایک وقت مقرر ہے وہ وقت جب آجاتا ہے تو ایک گھڑی بھی دیر نہیں کر سکتے ہیں اور نہ جلدی کر سکتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ(۶)

اور زمین پر جو چلنے پھرنے والا یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔

---

(۲) لسان العرب (الام) ۱۲/ ۲۷ (۳) ایضاً

(۴) ایضاً ۱۲/ ۲۳ (۵) یونس/ ۴۹ ، انعام/ ۳۸

(۶) انعام / ۳۹

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷)

یہ جماعت گزر چکی ان کو وہ ملے گا جو انہوں نے کیا اور جو تم نے کیا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہوگی۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ (۸)

اور اگر تم تکذیب کرو تو تم سے پہلے بھی امتیں (اپنے پیغمبروں) کی تکذیب کر چکی ہیں۔

خاص گروہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹)

اور تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔

قرآن نے مختلف گروہوں کا ذکر کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو کہا ہے کہ آپ سے پہلے کئی امتیں گذر چکی ہیں۔ مثلاً:

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (۱۰)

اور اسی طرح ہم نے آپؐ کو ایک امت میں جس سے پہلے کئی امتیں گذر چکی ہیں بھیجا تا کہ آپؐ ان کو وہ کتاب جو ہم نے آپؐ کی طرف بھیجی پڑھ کر سنائیں اور وہ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔

امت کا لفظ صرف افراد کے مجموعہ کے لیے ہی نہیں استعمال کیا گیا بلکہ ان کے عقیدے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مشرکین اپنے عقائد کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۱۱)

بلکہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رستے پر پایا ہے اور ہم انہی کے قدم پر قدم چل رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ہدایت کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے

---

(۷) البقرہ/۱۴۱

(۸) العنکبوت/۱۸

(۹) آل عمران/۱۰۴

(۱۰) الرعد/۳۰

(۱۱) الزخرف/۲۲۔۲۳

باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم قدم بہ قدم ان ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔

اسی طرح نظریاتی گروہ کے لیے امت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔قرآن ابراہیم علیہ السلام کو ایک امت قرار دیتا ہے۔یعنی ربانی ہدایت پر چلنے والا گروہ۔

اِنَّ اَبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۲)

بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھے اللہ کے فرمانبردار اور اس کی طرف یکسو اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں وہ صفات رکھتے تھے جو ربانی ہدایت یافتہ خدا ترس امت میں پائی جاسکتی ہیں۔لہٰذا وہ فرد ہونے کے باوجود ایک امت کا نمونہ تھے اس لیے انہیں امت کہا گیا۔

امت کا لفظ ایک مخصوص مدت کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ (۱۳)

اگر ایک مدت معین تک ہم انسانوں سے عذاب روک دیں تو کہیں گے کونسی چیز عذاب کو روکے ہوئے ہے۔

قرآن نے یہاں مدت معینہ کا استعمال اس لیے کیا ہے کہ ہر امت کے لیے ایک مہلت ہے اور مدت متعین کر دی گئی ہے جس کے اندر اس نے زندہ رہنا ہے۔

امت کے اس تصور میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں ایک یہ کہ اس کی اساس نظریہ اور تصور پر قائم ہے۔اس میں نسل، خاندان یا جغرافیائی وحدت فیصلہ کن نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ اس کے لیے ایک شخصی قیادت کا وجود ضروری ہے جو اس کے مادی وجود کو مجتمع رکھتا ہے۔مسلمانوں کے لیے محمد کریم ﷺ کی شخصیت امت کے اجتماعی وجود کے لیے ناگزیر ہے۔ امت کے لیے نسل، رنگ یا جغرافیائی حدود ضروری نہیں کیونکہ یہ اجزاء قومیت کے وجود کے لیے ناگزیر قرار دیئے گئے ہیں۔ قوم کی نظریاتی سمت بعد میں متعین ہوتی ہے نسلی اور وطنی اساس پہلے طے ہوتی ہے۔امت کا مادی تشخص اس کی نظریاتی اساس کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اس لیے نظریاتی وحدت اور عقیدہ کی یگانگت امت کے وجود کے لیے ناگزیر ہے۔

قرآن یہ بتاتا ہے کہ آغاز میں انسانیت ایک امت تھی۔ بعد میں اختلافات پیدا ہوئے اور ایک امت مختلف امتوں میں تبدیل ہوگئی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۴)

---

(۱۲) النحل/۱۲۰

(۱۳) ہود/۸

(۱۴) یونس/۱۹

اور سب لوگ پہلے ایک ہی امت تھے پھر جدا جدا ہو گئے اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکی ہی نہ ہوتی تو جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

یعنی مشیت الٰہی میں یہ طے شدہ ہے کہ انسانیت امتوں میں تقسیم ہوگی وہ بہ جبر تمام لوگوں کو ایک امت نہیں بنانا چاہتا۔ انسانوں کے اختیار و ارادہ کی آزمائش ہے کہ وہ کس طرح عمل کرتے ہیں وہ فرماتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۵)

اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو عمل تم کرتے ہو ان کے بارے میں تم سے ضرور پوچھے گا۔

اللہ کے اس نظام میں جہاں کئی امتیں اپنا اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں ایک نئی امت تشکیل دی گئی یہ امت سب سے آخری امت ہے اسی امت کی آرزو اور دعا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔ کعبۃ اللہ کی بنیاد کو اٹھاتے ہوئے یہ دعا ان الفاظ میں کی گئی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۶)

اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رکھیو اور پروردگار ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا اور ہمارے حال پر توجہ فرما بے شک تو توجہ فرمانے والا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے سلسلے میں دعا کا ذکر ہے۔ گویا مشیت الٰہی نے ایک نئی امت کی تشکیل کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے لیے ابراہیمؑ کی آرزومندی کو بنیاد بنایا۔ قرآن مجید نے اس امت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۱۷)

جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان میں سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

---

(۱۵) النحل/۹۳

(۱۶) البقرۃ/۱۲۸

(۱۷) آل عمران/۱۱۰

دوسری جگہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۱۸)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

امت مسلمہ کی تشکیل

ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور مشیت ایزدی کے فیصلے کا نتیجہ بعثت نبویؐ تھا۔ محمد کریم ﷺ کے اعلان نبوت سے ایک نئی جماعت وجود میں آنی شروع ہوئی۔ مکہ مکرمہ میں یہ جماعت نشو ونما پاتی اور تربیت کے مراحل سے گزرتی رہی۔ ہجرت مدینہ نے امت کے استحکام کو نیا موقعہ عطا کیا۔ یہیں پر یہ امت تکمیل پذیر ہوئی۔ اس کے تمام خدو خال واضح ہوئے۔ یہ ایک منفرد امت کی حیثیت سے پروان چڑھی۔ اس کی تشکیل میں ان تمام عوامل کو دخل ہے جو کسی بھی امت کی تشکیل کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس وقت گردوپیش میں جتنی جماعتیں، گروہ یا امتیں تھیں وہ تمام مادی عوامل پر مبنی تھیں۔ رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ کے عوامل ان کی تشکیل جماعت کا باعث تھے۔ یہ ایک الگ تجربہ تھا۔ یہ امت ایک روحانی اساس پر منظم ہو رہی تھی۔ جس کو خاتم النبیین ﷺ کی پیغمبرانہ شخصیت کی قائدانہ رہنمائی اور سرپرستی حاصل تھی۔ یہودیوں کی مذہبیت نسل پرستی پر مبنی تھی اور ان کا اجتماعی تشخص نسلی تھا۔ عیسائی البتہ ایک امت کہلا سکتے تھے کیونکہ ان کے اجتماعی تشخص میں مسیحؑ کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور کلیسا اجتماعیت کی علامت تھا تاہم اختلافات نے اس کی روحانی وحدت کو ختم کر دیا تھا اور وہ نسلی اور جغرافیائی وحدتوں میں بٹ چکی تھی۔

امت کے تشکیلی اجزاء

ہر امت کی تشکیل میں بعض اجزاء بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی امت وجود پذیر نہیں ہوتی۔ امت مسلمہ کے بھی تشکیلی اجزاء ہیں اور انہی پر اس امت کے وجود کا انحصار ہے چونکہ امتوں کی تشکیل اور شناخت میں شخصیتوں کا مرکزی کردار ہوتا ہے اس لیے امت مسلمہ کے لیے محمد کریم ﷺ کی شخصیت کی حیثیت مرکزی ہے۔ انہی کے نام پر اس امت کا تشخص اور اس کی پہچان قائم ہے۔ شخصیت کے علاوہ نظریہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر امت مسلمہ کے تشکیلی اجزاء کو بیان کیا جائے تو وہ تین بنتے ہیں: نظریہ۔ شخصیت اور مادی مرکز اجتماعیت۔ اگر غور کیا جائے تو نظریہ اساس فراہم کرتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت ایک انسانی نمونہ مہیا کرتی ہے۔ اور کعبۃ اللہ اجتماعیت کو مرکزیت عطا کرتا ہے۔ ذیل میں ان اجزاء کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔

---

(۱۸) البقرہ/۱۴۳

نظریہ

امت مسلمہ چونکہ نظریاتی گروہ ہے اس لیے نظریہ کو اس کی تشکیل میں اساسی حیثیت حاصل ہے اس نظریہ کے دو اجزاء ہیں ایک توحید اور دوسرے آخرت۔ توحید اسے فکری اساس مہیا کرتی ہے جس سے اس کا نصب العین متعین ہوتا ہے اور آخرت اس کی اخلاقی زندگی کو بنیاد عطا کرتی ہے۔ قرآن مجید نے ان دونوں اجزاء کو متنوع اسالیب میں بیان کیا ہے۔ ان کے ثبوت میں دلائل مہیا کئے ہیں اور انکار کے اسباب و دلائل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ عقلی و منطقی اور حسی و مشاہداتی براہین سے توحید و آخرت کا اثبات کیا ہے اور انکار الوہیت، شرک اور انکار آخرت کے غیر منطقی و عقلی ہونے اور انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے مہلک ہونے کو مبرہن کیا ہے۔

توحید

توحید اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کی وہ ذات ہے جو الوہیت کی مستحق ہے کائنات کی کوئی شئی الوہیت کا شائبہ رکھتی ہے اور نہ استحقاق۔ قرآن کے مطابق الوہیت صمدیت ہے، قیومیت ہے۔ قدرت علی الاطلاق ہے اور حکم علی الاطلاق ہے وہ علم محیط ہے، حیات بخشی ہے، وسیع رحمت ہے، غلبہ ہے، بے نقص حکمت ہے، نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت ہے۔ غیر محدود اختیار ہے، ابدیت ہے ازلیت ہے اور غیر محدودیت ہے۔ قرآن کی رو سے الوہیت کی یہ صفات صرف اللہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اور کائنات کی کسی شئے میں یہ صفات موجود نہیں۔ الوہیت کی یہ صفات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہیں۔ جب کائنات کی ہر شئی اس کے سامنے مسخر ہے، اس کی محتاج ہے تو پھر الوہیت کا مستحق صرف وہی ہے۔ قرآن کی بے شمار آیات میں سے صرف ایک آیت اور ایک مختصر سورت اس تصور کو واضح کرنے کے لیے نقل کی جاتی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۱۹)

اللہ کہ اس کے سوا کوئی الوہیت کے لائق نہیں۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا، اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس سے سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔ وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے۔ اس کا اختیار و اقتدار آسمان و زمین سب پر حاوی

(۱۹) البقرہ/۲۵۵

ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں۔ وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے۔

اب ایک مختصر سورت ملاحظہ کیجئے جو اس کی توحید کا جامع بیان ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۲۰)

آپ کہہ دیں وہ جو اللہ ہے ایک ہے، وہ معبود برحق بے نیاز ہے۔ نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

ان آیات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ خدا کا ایسا تصور اور اس کی صفات کا ایسا بیان دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں موجود نہیں۔ وہ کائنات کا خالق اور مدبر و منتظم ہے سب جاندار مخلوق بشمول انسان اس کی تخلیق کردہ اور اس کے قوانین میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کی قوت قاہرہ ہر شئے پر حاوی ہے۔ اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کا کوئی حصہ نہیں۔ توحید کے اس تصور نے امت مسلمہ کو ایک انوکھی شان دی ہے۔ اس کے افراد کو عزت نفس عطا کی ہے ایک مسلمان صرف اپنے رب کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے اور کائنات کی قوتوں کو اللہ کا تابع مانتا ہے۔ اسی کو رزاق اور اسی کو زندگی و موت کا مالک سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ باقی ہر شئی اسی کی طرح کی مخلوق ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حقیقی طاقت کا مالک وہی ہے۔ اسی سے امیدیں وابستہ کرتا ہے اور اسی سے خوف کھاتا ہے۔ اور اسی کی محبت اس پر غالب ہوتی ہے قرآن کے مطابق

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲۱)

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو غیر اللہ کو اللہ کا شریک بناتے اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں لیکن جو اہل ایمان ہیں وہ اللہ ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں۔

اسلام میں توحید کا اعلان اس مشہور اصول کی صورت میں کیا جاتا ہے جو شہادت (ایمان کی گواہی) سے ہوتا ہے۔ اس کلمہ کی عبارت ہے:

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله:

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

شہادت اسلام کا مقدس ترین اصول ہے اور اس کی مابعد الطبیعاتی اور روحانی بنیادوں کی اصل ہے۔ اس کے دو جز ہیں: نفی اور اثبات۔ نفی سے مراد کائنات کی ہر شے سے الوہیت کی نفی ہے اور اثبات سے مراد اللہ کے الوہیت کا اثبات ہے۔ اسلامی عقیدے کا بیان اس مختصر کلمہ میں ہے جسے اسلامی اصطلاح میں کلمہ طیبہ کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدے کا مختصر اور جامع بیان ہے۔ یہ کلمہ ذکر و فکر اور دعا و مراقبہ کی جان ہے یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

---

(۲۰) الاخلاص ۱/۱۔۴

(۲۱) البقرۃ ۲/۱۶۵

ہندوؤں کے ہاں تت توام اسی (وہ تم ہو) یا بدھ مت والوں کے ہاں نمو ایتابھ بدھ کا بدل ہے لیکن جو بات کلمہ طیبہ میں ہے وہ ان میں نہیں پائی جاتی۔ کلمہ طیبہ بیک وقت عقیدے کا بیان بھی ہے اور ذات الٰہی سے رشتہ استوار کرنے کا وسیلہ بھی۔ ذاتی نیکی و تقویٰ میں اسے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ اس کی اجتماعی اور تہذیبی اہمیت بھی ہے کیونکہ محض مابعد الطبیعاتی حقیقت کے بطور یہ ایک فکری اور روحانی اساس ہے جبکہ عقیدے کے طور پر یہ ایک تہذیبی شناخت کا اظہار ہے۔

توحید کے ذریعہ امت مسلمہ کے افراد میں وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جن سے دوسری امتیں محروم ہیں جیسے شجاعت، اللہ کی راہ میں جان کی قربانی، قناعت، استغنا، صبر و توکل، انکسار و تخشع اور غیر اللہ سے بیزاری وغیرہ۔ قرآن مجید نے ان تمام صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ صفات ان افراد کو اجتماعی زندگی میں بے پناہ قوت عطا کرتی ہیں اور انہیں اطاعت امر اور نظم و ضبط کا حوصلہ دیتی ہیں۔ توحید کی قوت ان افراد کو ایک پاکیزہ اور منظم معاشرہ تشکیل دینے میں باطنی قوت کا کام کرتی ہے۔ توحید پر ایمان انسان کے اندر اصلاحی و تنظیمی قوتوں کا استحکام پیدا کرتا ہے اور ایک ایسی جماعت اور ایسی سوسائٹی تشکیل پاتی ہے جو اپنی اخلاقی صفات کے باعث انسانیت کے نمونہ بننے کے قابل ہوتی ہے۔

توحید پر ایمان سے ایک ایسی امت تشکیل پاتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے مستحکم، روحانی طور پر مضبوط اور معاشرتی لحاظ سے مثالی ہوتی ہے۔ ایسا رب جس سے کوئی شئی مخفی نہیں انسان کو ذمہ دار اور اعتدال پرور بناتا ہے کہ وہ قانون کے بغیر بھی حدود کے اندر رہتا ہے اور کسی غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ افراد امت کا احساس ذمہ داری دراصل خدائے علیم بصیر پر ایمان ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ہر لحہ یہ تصور رہتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَ يَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۲۲)

اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے اس سب کو وہ جانتا ہے ایک پتا بھی اگر زمین پر گرتا ہے تو اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے اندر زمین کی تاریک تہوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جو ایک کتاب مبین میں لکھی ہوئی نہ ہو۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۲۳)

خواہ تم میں سے کوئی چھپا کر بات کرے یا بآواز بلند اور خواہ کوئی رات کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو بہر حال اس کے آگے اور پیچھے نگران لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے ان کی نگہبانی کر رہے ہیں۔

---

(۲۲) الانعام/۵۹

(۲۳) الرعد/۱۰-۱۱

رسالت محمدی ﷺ

امت مسلمہ کا دوسرا تشکیلی عنصر رسالت ہے۔ رسالت دراصل ایک انسانی ادارہ ہے جو الٰہی مصدر سے وابستہ ہونے کی بنا پر حیات انسانی میں رہبر کا کردار ادا کرتا ہے۔ توحید اگر امت مسلمہ کی غیر مری اساس ہے تو رسالت ایک نظر آنے والی انسانی بنیاد ہے۔ انسانیت کے سلسلہ وجود میں انبیاء اور رُسُل بلند و بالا چوٹیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رواں دواں انسانی تاریخ میں وہ ایک خاص ساعت ہوتی ہے جب نبی ظاہر ہوتا ہے۔ اس مخصوص ساعت میں اس کا ظہور پوری مخلوق کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ انبیاء انسان کی ارضی تاریخ کے عمل میں آسمانی رحمت کے ظہور کی شان رکھتے ہیں۔ ان کے ظاہر ہونے کا مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ دنیا کے ایک مخصوص خطے میں انحطاط کے ذوری حالات کیا ہیں۔ اپنا فریضہ نبوت پورا کرنے کے بعد وہ مستقبل کے ان حالات کے سلسلے میں بھی جو آگے چل کر ان کی امت کو پیش آنے والے ہیں ایک فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ انبیاء روئے ارض پر انسانی تاریخ کے موجیں مارتے اور گردش کرتے سمندر میں چڑھتی موجوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو تاریخ روحانی اثرات سے خالی ہوتی اور کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی (۲۴) قرآن یہی کہتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا (۲۵)

اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے۔ سو جب ان کا وقت آ جائے گا (تو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا) اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی قوم کی مہلت کا تعلق اس رویے سے منسلک ہوتا ہے جو اپنے نبی کے ساتھ روا رکھتی ہے۔ رسول رہبری اور قیادت کا ایک ایسا کردار ہے جو ایک طرف ماوراء الطبیعی مصدر سے جڑا ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ یہ خصوصی تعلق اسے ایک بے خطا قیادت کے مقام پر فائز کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے رسول انسانی زندگی کا ایک کامل اور بے خطا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات اور ہر عمل حجت اور قابل اتباع ہوتا ہے۔ رسول کو جو علم اور معرفت حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور انسان کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسے جو نور بصیرت عطا ہوتا ہے وہ انسانی ظن و تخمین سے کہیں زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے اور عام انسانی عقل سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ جو بات کرتا ہے وہ یقینی علم کی بنا پر کرتا ہے تا کہ انسانوں کو سیدھی راہ اور

---

(۲۴) اسلامی روایت/۳۱

(۲۵) الفاطر/۴۵

درست عمل کی طرف۔ سچی رہنمائی عطا کرے۔ رسالت ربانی ہدایت کا واحد مستند ذریعہ ہے اور اس کے بغیر الٰہی علم و رہنمائی کے حصول کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ نہیں۔ رسالت ہی امت کی تشکیل کا مادی اور وجودی ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ(۲۶)

اے رسولان رب پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں اور یقیناً تمہارا گروہ دراصل ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ مگر بعد میں لوگوں نے آپس میں اختلاف کر کے اپنے مذہب الگ الگ بنائے اور اب حال یہ ہے کہ جس گروہ کے پاس جو چیز ہے اسی پر وہ خوش ہے۔

قرآن کے مطابق رسالت کا ادارہ حیات انسانی کا واحد ادارہ ہے جو پوری انسانی تاریخ میں موجود رہا ہے اور انسان اور اس کے خالق کے درمیان تنہا قابل اعتماد ذریعہ ہے قرآن نے اس ادارے کی تاریخی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے کہا:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔(۲۷)

اے محمدؐ! ہم نے اسی طرح تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نوحؑ اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیج چکے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ' اسمٰعیلؑ' اسحٰقؑ' یعقوبؑ' اور آل یعقوبؑ اور عیسیٰؑ' ایوبؑ' یونسؑ' ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا کی۔ اور ہم ہی نے وہ رسول بھی بھیجے جن کا حال ہم اس سے پہلے تمہیں بتا چکے ہیں اور وہ رسول بھی جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔ اور آپ سے پہلے اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے بھی کلام کر چکا ہے۔

رسالت کی تہذیبی اہمیت

رسالت اسلامی تہذیب کی اساس ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں سے فکری' اخلاقی اور قانونی پہلوؤں میں رہنمائی ملتی ہے۔ چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی ایک مصدر سے مہیا ہوتی ہے اس لیے اسلامی تہذیب اپنی یکجہتی اور استحکام کے اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ امت مسلمہ کی تشکیل کا اصل حوالہ حضور اکرم ﷺ کی رسالت ہی ہے۔ امت کا مادی وجود اس کا تشخص اور اس کی انفرادیت کا دارومدار اس شخصیت پر ہوتا ہے جو اسے منظم کرتی ہے۔ چونکہ امت مسلمہ

(۲۶) المومنون/۵۱۔۵۳

(۲۷) النساء/۱۶۳۔۱۶۴

حضور اکرم ﷺ کی ذات کے باعث وجود میں آئی ہے اس لیے آپ ؐ کی رسالت اس کی تشکیل کا بنیادی حوالہ ہے۔ آپ ؐ کے ساتھ وفاداری اور آپ ؐ کا اتباع اس امت کی پہچان اور اس کے الگ تشخص کی ضمانت ہے۔ آپ ؐ ہی کی ذات' فکری' اخلاقی اور قانونی معاملات میں واجب الاتباع ہے قرآن مجید نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ. وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ. إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۲۸)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اور اس سے ہرگز روگردانی نہ کرو جبکہ تم اس کا حکم سن چکے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ کچھ نہیں سنتے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (۲۹)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے درست نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول ؐ کر دے تو ان کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳۰)

اے پیغمبر ﷺ! کہہ دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دیں کہ اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کرو۔ پھر وہ اگر روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

حضور اکرم ﷺ کی رسالت پچھلی تمام رسالتوں کی جامع ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے خصوصی امتیازات سے نوازا ہے۔ ان امتیازات میں سے تین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک عالمیت' دوسرا ختم نبوت اور تیسرا عالمی پیغام یہ تینوں وہ امتیازات ہیں جن سے آپ کو خصوصی طور پر نوازا گیا۔ قرآن مجید نے بھی ان تینوں کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

---

(۲۸) الانفال/۲۰ تا ۲۲

(۲۹) الاحزاب/۳۶

(۳۰) آل عمران/۳۱-۳۲

عالمی رسالت

حضور اکرم ﷺ سے پہلے کے انبیاء خاص اقوام و ادوار کے لیے تھے اللہ نے آپؐ کی نبوت و رسالت کو زمان و مکان کے قیود سے مبرا کر دیا۔ آپؐ کی رسالت بنی نوع انسان کے لیے ہر زمانے اور ہر خطے کے لیے ہے۔ فرمایا:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (۳۱)

اے محمدؐ! آپؐ کہہ دیں کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسولؐ ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرنے اور مارنے والا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جو نبی امی ہے اور جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۳۲)

اے پیغمبرؐ! ہم نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۳۳)

اے محمد! ہم نے آپؐ کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۳۴)

پاک ہے وہ ذات جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تا کہ تمام اہل عالم کے لیے متنبہ کرنے والا بنے۔

آپؐ کی رسالت کی عالمگیریت نے ایک عالمگیر امت تشکیل دی جس کی عالمگیریت اور آفاقیت اس آفاقی عقیدہ رسالت پر مبنی ہے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ کی رسالت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے اسی طرح آپؐ کی امت عالمی امت اور تمام بنی نوع انسان پر مشتمل ہے اور اسی تصور سے وہ اسلامی تہذیب تشکیل پذیر ہوئی جو عالمگیر اور آفاقی ہے۔

---

(۳۱) الاعراف/۱۵۸

(۳۲) سبا/۲۸

(۳۳) الانبیاء/۱۰۷

(۳۴) الفرقان/۱

آخری نبوت

رسالت و نبوت کا جو سلسلہ انسانی رہنمائی کے لیے قائم کیا گیا تھا اسے حضور اکرم ﷺ کی ذات پر مکمل کر کے ختم کر دیا گیا۔ اب آپ ہی کی ذات عالمی و آفاقی طور پر منبع ہدایت ہے۔ آپ ہی کا اسوہ قیامت تک کے لیے نمونہ اور معیار ہے جس پر انسانی شخصیتوں کی تعمیر و تشکیل ہوتی رہے گی۔ قرآن مجید نے اعلان کیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ (۳۵)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ اور نبیوں کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

پھر اسی نمونہ کمال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۳۶)

تمہارے لیے رسول اللہؐ کی زندگی میں ایک قابل تقلید نمونہ ہے اس شخص کے لیے جسے اللہ سے ملنے کی اور یوم آخر کی امید ہو اور وہ اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

چونکہ حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں اس لیے یہ امت بھی آخری امت ہوگی۔ اس کے بعد کوئی امت مبعوث نہیں ہوگی۔ آپؐ کا اسوہ عالمی ہے اور آنے والے زمانوں کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر مستند حوالہ۔ آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کا لایا ہوا دین بھی آخری ہے اس لیے اب اسی نبوت کا دور دورہ ہوگا اور اسی دین کی مستند حیثیت ہوگی۔ آنحضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد تمام نبوتیں نبوت محمدیؐ میں ضم ہوگئیں اور تمام دین آپؐ کے لائے ہوئے دین کے مطابق ڈھل جائیں گے۔ اب اللہ کے نام پر صرف وہی حکم نافذ ہوگا جو اس دین کے مطابق ہوگا۔ تمام سابقہ ادیان کے احکام و بیانات کی اس دین سے تصدیق کرانا ہوگی جو اس کے مطابق ہے وہ ٹھیک ہے جو اس کے خلاف ہوگا وہ منسوخ تصور کیا جائیگا۔ پہلی نبوتوں پر ایمان اجتماعی ہوگا اور پہلے احکام میں سے وہی قابل اتباع ہونگے جن کی تصدیق قرآن کرے گا۔ اب اطاعت و اتباع صرف حضور اکرم ﷺ کی ہوگی اور آپؐ ہی کا اسوہ واجب الاتباع ہوگا۔ قرآن اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اہل کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ

---

(۳۵) الاحزاب/۴۰

(۳۶) الاحزاب/۲۱

كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ. يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.(۳۷)

اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسولؐ آ گیا ہے جو تم سے بہت سی ایسی باتیں بیان کرے گا جن کو تم کتاب میں سے چھپاتے ہو۔ نیز وہ بہت سی باتوں سے معاف بھی کر دے گا۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب آ گئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کا اتباع کریں گے سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت بخشے گا اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے گا اور سیدھے رستے کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

آپؐ کی مستند پیغمبرانہ حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.(۳۸)

اہل کتاب میں سے ایمان دار وہ ہیں جو اس امی رسول و نبیؐ کا اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے۔ پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان کے سر سے اس بوجھ کو اور ان بندشوں کو اتار دیتا ہے جو ان پر مسلط تھیں۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اسؐ کی حمایت اور امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی فلاح پانے والے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا: **لو كان موسى حيا لماوسعه الا اتباعي**'(۳۹)۔

یعنی اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے سوا چارہ نہ ہوتا۔

گویا اسلام کے سوا اب کوئی اور مستند دین نہیں اور آنحضور ﷺ کی نبوت کے سوا کوئی اور نبوت واجب الاتباع نہیں۔ آپؐ کی اطاعت اور اتباع کا حکم صرف قرآن ہی نہیں دیتا آپؐ بھی بحکم الٰہی اس کا اعلان کرتے ہیں۔ آپؐ کو اپنی نبوت و رسالت کا جو ادراک و ایقان حاصل تھا اس کی بنیاد پر آپؐ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ آپؐ کی اطاعت ہی معیار حق ہے۔ آپؐ کی ذات حق و باطل کے درمیان حد فاصل ہے۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سو

---

(۳۷) المائدہ/ ۱۵-۱۶

(۳۸) الاعراف/ ۱۵۷

(۳۹) مسند احمد ۳/ ۳۳۸، حدیث ۲-۱۴۶۳؛ شعب الایمان للبیہقی ۱/ ۲۰۰، حدیث ۱۷۷؛ دارمی نے اسے ذرا مختلف الفاظ سے نقل کیا ہے والذی نفس محمد بیده، لو بدا لكم موسى فاتبعتموه و تركتموني لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان موسى حياً وأدرك نبوتي لاتبعني۔ سنن الدارمي، باب ما يتقى من تفسير حديث النبي ۱/ ۱۸۰۔

رہے تھے کہ فرشتے آئے اور آپ کے بارے میں اظہار خیال کرتے رہے۔ اس میں انہوں نے یہ جملہ بھی کہا:

والداعی محمد فمن اطاع محمداً فقد اطاع الله ومن عصی محمداً فقد عصی الله و محمد فرق بین الناس (۴۰)

اور محمدؐ داعی ہیں۔ جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمدؐ انسانوں کے درمیان حق و باطل کا معیار ہیں۔

عالمی پیغام

رسالت محمدیؐ کا تیسرا امتیاز اس کے پیغام کی عالمیت ہے۔ جس طرح آنجناب ﷺ کی نبوت عالمی ہے اور زمان و مکان کی حدود و قیود میں محدود نہیں اسی طرح آپؐ کا لایا ہوا پیغام بھی عالمی ہے۔ جس طرح آپؐ کی نبوت آخری ہے اسی طرح آپؐ کا لایا ہوا پیغام بھی آخری ہے۔ اب اس کے بعد کوئی دین اور کوئی ضابطہ حیات وحی نہیں کیا جائے گا۔ یہ پیغام قرآن کی صورت میں محفوظ اور انسانوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔ ارشاد باری ہے

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (۴۱)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (حق و باطل میں) فرق کرنے والا ہے۔

یہ دین ایک کامل دین ہے اور اس میں حیات انسانی کے بارے میں بنیادی اصولوں کو مکمل طور پر بیان کیا گیا ہے لہٰذا اب آنے والے زمانوں میں اسی کو غالب ہونا ہے۔ چونکہ یہ مکمل دین ہے اور عالمی نوعیت کا ہے اسی لیے اس کو غالب کرنے کے لیے امت بھی عالمی اور کامل ہے۔ ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے ربانی حکم کو نقل کیا اور تکمیل دین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۴۲)

آج میں نے تمہارے لیے دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

غلبے کے حوالے سے ارشاد ہوا۔

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ

---

(۴۰) بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن الله/۱۲۵۲

(۴۱) البقرۃ/۱۸۵

(۴۲) المائدہ/۳

الْمُشْرِكُوْنَ(۴۳)

یہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے اگر چہ مشرک ناخوش ہوں۔

رسالت محمدیؐ کے امتیازات کی بنا پر آپؐ کی امت بھی آخری، عالمی اور حق کی امین ہے۔ یہ امت اس صالح فکر کی امین ہونے کی وجہ سے قیامت تک کے لیے داعی حق کا کردار ادا کرے گی اور حق کی امانت لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ہوگی۔ یہ پیغام آسمان سے اترنے والی آخری وحی ہے جس کے اثر سے عالم میں ایک دین پروان چڑھا۔ یہ حرف آخر ہے جو روئے ارض پر رحمت خداوندی کا آخری ظہور عظیم ہے۔

عقیدہ آخرت

امت مسلمہ کا تیسرا تشکیلی عنصر آخرت کا عقیدہ ہے۔ آخرت کا عقیدہ بنیادی طور پر دنیوی زندگی کے تصور سے متعلق ہے۔ کئی مذاہب اور قوموں کے ہاں دنیا اور اس میں ہونے والے اعمال کے نتائج کے بارے میں مختلف تصورات موجود ہیں۔ ان تصورات کی روشنی میں مرنے کے بعد حالات کی کوئی قابل یقین اور با اعتماد تصویر سامنے نہیں آتی۔ آخرت کے بارے میں واضح تصور نہ ہونے کی وجہ سے دنیوی زندگی کے معاملات خراب ہوتے ہیں۔ دنیا کی مختلف قومیں آخرت کا واضح تصور نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی دنیوی زندگی کو خراب کر بیٹھی ہیں۔ امت مسلمہ خوش نصیب ہے کہ اسے آخرت کا ایک نکھرا ستھرا تصور ملا۔ ایسا تصور جس سے اس کی دنیوی زندگی میں تنظیم پیدا ہوئی ہے۔ قرآن نے آخرت کا جو تصور دیا ہے اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

کائنات کا موجودہ نظام ایک معینہ مدت کے لیے ہے اور جب یہ مدت ختم ہوگی تو اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اس کی جگہ پر ایک نیا نظام لایا جائے گا جس کے قوانین مختلف ہونگے۔ اس روز انسان کو پھر نئی جسمانی زندگی ملے گی۔

نئے نظام میں خالق کائنات عدالت قائم فرمائے گا اور انسان اپنے اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا اور اپنی پہلی زندگی میں کیئے اعمال کی جانچ پڑتال، حساب و کتاب اور جانچ تول کے مرحلے سے گزر کر جزا و سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ یہ نظام عدل کا کامل نمونہ ہوگا اور یہاں کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

دنیوی زندگی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور ناقص۔ اس لیے اس میں تمام اعمال کے نتائج پوری طرح مرتب نہیں ہوتے۔ اخروی زندگی پائیدار اور کامل ہے اور اس نئے نظام میں اعمال کے نتائج مکمل طور پر ظاہر ہو سکیں گے۔ اس لیے انسان کو نہ صرف اس زندگی کے ثمرات پر ہی نظر نہیں رکھنی چاہئے بلکہ آخرت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے

---

(۴۳) التوبہ/۳۳

جو ابدی ہے اور جہاں اعمال کے پورے نتائج مرتب ہونگے۔ قرآن مجید نے جس طرح توحید و رسالت اور وحی و قرآن کو مدلل طور پر بیان کیا ہے اسی طرح تصور آخرت پر بھی تسلی بخش دلائل فراہم کئے ہیں۔ اس پر قائم ہونے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اس کے امکان کو بہ دلائل ثابت کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ نئے نظام کے بعض اہم پہلو بھی بیان کئے۔ ان آیات کو پڑھنے سے اخروی نظام اور آخرت کی زندگی کا مکمل نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہاں صرف چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

دوبارہ جی اٹھنا منکرین آخرت کو بہت مشکل نظر آتا تھا اور قرآن نے ان کے اعتراضات کو نقل کیا ہے:

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۴۴)

اور انہوں نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرنو اٹھائے جائیں گے؟

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۴۵)

اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا ہونگے؟

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۴۶)

کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے؟ یہ واپسی تو بعید از عقل ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۴۷)

قرآن ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے اور اس جواب کا لب لباب یہ ہے کہ جس خالق نے کائنات اور اس کی اشیاء بشمول انسان تخلیق کی ہیں اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ دوبارہ بھی پیدا کر سکے۔ اس نے اس کائنات میں تغیر اور فنا کے اصول رکھے ہیں۔ چیزیں وجود میں آتی ہیں نشوونما پاتی ہیں کمزور ہوتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ جس خالق نے تغیر و فنا کے یہ قوانین نافذ کر رکھے ہیں وہی تغیر و فنا کا آخری مرحلہ بھی نافذ کرے گا۔ کائنات کا یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور تخلیق پر قادر رب دوبارہ زندگی عطا کر دے گا۔ اس استدلال کے لیے قرآن نے مختلف اسالیب میں حیرت انگیز حقائق بیان کئے اور مسکت دلائل دئے ہیں۔ قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ آخرت کے عقلی اور کونیاتی دلائل پر مشتمل ہے۔ اگر انسان کی عقل بالکل جواب نہ دے گئی ہو تو ان میں سے ایک دلیل ہی مطمئن کرنے لیے کافی ہے۔ ہم یہاں صرف چند آیات نقل کرتے ہیں۔

---

(۴۴) الاسراء/۴۹

(۴۵) السجدہ/۱۰

(۴۶) ق/۳

(۴۷) سبا/۷

جن سے عقیدہ آخرت پر روشنی پڑتی ہے۔ تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۴۸)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کر رکھا ہے جو تم کو نظر آسکیں۔ پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک مدت مقرر تک کے لیے حرکت کر رہا ہے۔ وہی تمام عالم کا انتظام کرتا ہے اور وہ اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین لاؤ۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ فَاَبَی الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۴۹)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

زمین کی پیداوار اور اس کی بدلتی کیفیتوں کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے مُردوں کے جی اٹھنے پر استدلال کیا:

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵۰)

زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی ہے اور پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ آیَاتِهِ اَنَّكَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِیْ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی اِنَّهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سونی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ پھبک اٹھی اور لہلہانے لگی۔ تو جس نے اس کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۵۲)

تم مردہ تھے تو اللہ نے تمہیں زندہ کیا پھر وہ تم کو مردہ کر دے گا پھر زندہ کر دے گا پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا قُلِ

---

(۴۸) الرعد/۲

(۴۹) بنی اسرائیل/۹۹

(۵۰) العنکبوت/۲۰

(۵۱) فصلت/۳۹

(۵۲) البقرہ/۲۸

الَّذِی فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۵۳)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت بعید از عقل ہو۔ پھر وہ پوچھیں کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔

اس کے بعد قرآن نظام عالم کے خاتمہ اور نئے نظام کے بارے میں مفصل بات کرتا ہے یہاں ہم صرف چند آیات نقل کریں گے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ. وَ اِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ. وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۵۴)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائیں گے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّةً وَّاحِدَةً (۵۵)

اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ٹکرا دیا جائے اور ایک ہی ٹکر میں وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۵۶)

جس روز زمین بدل کر دوسری طرح کی زمین کر دی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

وہ نظام عدل وانصاف پر مبنی ہوگا اور کوئی سفارش یا رشوت نہیں چلے گی۔ کیونکہ یہ سب چیزیں دنیوی نظام کا حصہ تھیں۔ قرآن اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۵۷)

اور ڈرو اس دن سے جب کہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کے حق میں کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۵۸)

اور ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

---

(۵۳) بنی اسرائیل/۵۰-۵۱

(۵۴) الانفطار/۱-۴

(۵۵) الحاقہ/۱۴

(۵۶) ابراہیم/۴۸

(۵۷) البقرہ/۴۸

(۵۸) آل عمران/۲۵

اخلاقی بنیاد

آخرت کا عقیدہ امت مسلمہ کو اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔اس سے احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے اور جواب دہی کا تصور مستحکم ہوتا ہے۔یہ محض مابعد الطبیعیاتی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے دنیوی پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے۔اس دنیا میں تمام اخلاقی برائیاں اور تمام فساد اور ظلم اس وجہ سے ہیں کہ بعض انسان اپنے آپ کو کسی قسم کی جواب دہی کے پابند نہیں سمجھتے۔دنیا کی جوابدہی ایک محدود سا عمل ہے جسے اول تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور اگر کبھی اس پر عمل درآمد ہو تو جزا و سزا کا تناسب نہیں متعین کیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ میں دوسرے گروہوں کے مقابلے میں ایسے لوگوں کا تناسب زیادہ ہے جو اخلاقی و روحانی اعتبار سے بلند درجہ کے حامل ہیں۔اسی طرح امت مسلمہ مجموعی طور پر اخلاقی و روحانی مزاج کی حامل ہے۔اس وقت جو انتشار ہے اس کا سبب مغربی تہذیب کے اثرات اور تعلیمات اسلامی سے بے خبری ہے۔

نصب العین

امت مسلمہ کی انفرادیت کا ایک پہلو اس کا نصب العین ہے۔دنیا کے تمام مذہبی و غیر مذہبی گروہ محدود نصب العین کے حامل ہیں۔کچھ گروہ کسی شخصیت کی عظمت کے لیے کام کرتے ہیں تو کچھ قومی مفادات کے لیے منظم ہوتے ہیں۔نسلی، لسانی اور وطنی عصبیتوں پر منظم ہونے والی جمعیتیں انہی محدود مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں۔بعض افراد کی زندگی کا نصب العین ذاتی تسکین ہوتا ہے۔یہ مادی تسکین بھی ہو سکتی ہے اور روحانی تکمیل بھی۔

امت مسلمہ کا نصب العین اقامت دین ہے۔قرآن مجید نے اسے متعین کر دیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ(۵۹)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا اور جو ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی اور جس کا ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اقبال نے غالباً اس سے متاثر ہو کر کہا تھا:

زانکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لاالہ تقدیر تست
تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے
تا مسلمانے نیاسائی دمے

---

(۵۹) الشوریٰ/۱۳

اس نصب العین کا گہرا تعلق اس تصور سے ہے کہ انسان روئے زمین پر اللہ کا نمائندہ ہے۔ اگر وہ اللہ کا نائب اور نمائندہ ہے تو اسے ہمیشہ اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کے حصول میں لگے رہنا چاہئے۔ چونکہ اس کی زندگی کا ہر اقدام اس کی رضا کے لیے ہے اس لیے اس کا نصب العین رب تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ انسان کی اپنی حیثیت مطیع وفرمانبردار بندے کی ہے خودمختار مالک کی نہیں۔ قرآن نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ. لَاشَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (٦٠)

اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیں کہ میری نماز میری عبادت' میرا مرنا اور میرا جینا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ...... فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (٦١)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں جن کے معاوضہ میں ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں...... پس اس سودے پر جو تم نے اپنے رب سے کیا ہے خوشی مناؤ۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسی نصب العین کے حوالے سے قرآن نے کہا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (٦٢)

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اللہ تعالیٰ سے وابستگی کے نتیجے میں امت مسلمہ کے افراد میں باہمی مقابلہ کی بجائے تعاون' موالات' اخوت اور بھائی چارے کی روح پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نصب العین رنگ ونسل' زبان اور جغرافیائی حدود کے امتیازات کو مٹا کر ایک عالمگیر قومیت کی تعمیر اور ایک بین الاقوامی انسانی جمعیت کی شیرازہ بندی پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک طرف فرد کی انفرادیت کو بالکل فنا نہیں کرتا اور دوسری طرف انفرادیت کے تمام دافع المرکز میلانات کو مٹا کر اسے ایک خالص بڑی

---

(٦٠) الانعام/١٦٢-١٦٣

(٦١) التوبہ/١١١

(٦٢) البقرہ/١٤٣

اجتماعیت میں پوری طرح ضم کر دیتا ہے (۶۳)

امت مسلمہ کے امتیازات

امت مسلمہ ایک خصوصی جماعت ہونے کی وجہ سے بعض امتیازات کی حامل ہے جو کسی اور جماعت کو حاصل نہیں۔ ان امتیازات کے باعث یہ امت اپنا تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے گو اسے کئی مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ بالخصوص دور حاضر میں اسے شدید بحرانوں کا سامنا ہے۔ دور حاضر کے نظریات میں سے سیکولرزم اور نیشنلزم نے امت کے لیے خطرناک مسائل پیدا کیے ہیں لیکن امت کی روحانی اساس کی قوت ان شاء اللہ اس بحران پر بھی قابو پا لے گی۔ ذیل میں ہم ان امتیازات کو بیان کریں گے جن کی بناء پر یہ امت دوسری اقوام سے مختلف' منفرد اور ممتاز ہے:

ربانی اساس

امت مسلمہ کی اولین خصوصیت ربانی رہنمائی ہے۔ یہ امت وحی الٰہی کی رہنمائی پر مستحکم ہوئی ہے دنیا کی کسی جماعت کو یہ اساس میسر نہیں ہے۔ ایک رب' ایک رسول اور ایک قبلہ اسے ایک وحدت عطا کرتا ہے۔ وحی الٰہی کا اتباع ایک واجب امر ہے جو پیغمبر سے لے کر عام مومن تک ہر شخص کے ایمان کا جز ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زبان سے قرآن کہتا ہے:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَایُوْحٰی اِلَیَّ (۶۴) اس کے مطابق چلتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

وَاتَّبِعْ مَایُوْحٰی اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ (۶۵)

اے پیغمبر ﷺ! آپ کو جو حکم بھیجا جاتا ہے اس کی پیروی کیے جاؤ۔ اور صبر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (۶۶)

اور اسی طرح آپ کے پاس قرآن عربی بھیجا تا کہ آپ بڑے گاؤں (مکہ) کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں خبردار کریں۔

وحی الٰہی کا ادارہ پوری انسانی تاریخ میں موجود رہا ہے۔ ربانی ہدایت کا یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو وحدت فکر انسانی مہیا کرتا ہے قرآن نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

---

(۶۳) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی/۹۶

(۶۴) الانعام/۵۰

(۶۵) یونس/۱۰۹

(۶۶) الشوریٰ/۷

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (٦٧)

غالب ودانا اسی طرح تمہاری طرف وحی بھیجتا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں کی طرف وحی بھیجتا رہا۔

چونکہ وحی الٰہی فکری وحدت کا منبع ہے اس لیے حضور اکرم ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی کریں:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَاكُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٦٨)

اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپؐ کی طرف روح القدس کے ذریعے سے پیغام بھیجا۔ آپؐ نہ تو کتاب جانتے تھے نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اور بلاشبہ آپؐ سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ تمام بڑے فیصلے ہدایت ربانی کے مطابق کئے گئے قرآن نے اس طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (٦٩)

وہ خواہش نفس سے منہ سے کوئی بات نہیں نکالتے۔ یہ قرآن تو صرف حکم الٰہی ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

وحی الٰہی واجب الاتباع ہے اور امت کی خصوصیت ہے کہ اس کی تمام فکری اٹھان اسی اساس پر قائم ہے

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (٧٠)

رسولؐ اس کتاب پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی سب اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ ہم نے تیرا حکم سنا اور قبول کیا اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری طرف لوٹ کر جانا ہے۔

قرآن مجید وحی الٰہی کا آخری ایڈیشن اور ہدایت ربانی کا جامع مجموعہ ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اسی سے وابستہ

---

(٦٧) الشوریٰ/٣

(٦٨) الشوریٰ/٥٢

(٦٩) النجم/٣-٤

(٧٠) البقرہ/٢٨٥

رہیں اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے پر ان کی مستند دینی زندگی کا دارومدار ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۷۱)

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور گروہ گروہ تقسیم نہ ہو جاؤ۔

مفسرین کے مطابق حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے جو مسلمانوں کی فکری وحدت کی شاہ کلید ہے۔

انسانی وحدت ومساوات

اس امت کی دوسری خصوصیت ہے کہ یہ نسلی تفریق کو ناجائز سمجھتی ہے۔قرآن نے اس کی رہنمائی کرتے ہوئے بتایا کہ تمام انسانوں کی تخلیق کا نقطہ آغاز ایک جوڑے کی پیدائش سے ہے۔اس سے پوری انسانیت کی تخلیق وتوسیع ہوئی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۷۲)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہیں مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔اللہ کے ہاں تم میں سے وہ شخص زیادہ قابل تکریم ہے جو زیادہ متقی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۷۳)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد پھیلا دی۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا:

ایها الناس! الا ان ربکم واحد وان ابلکم واحد (۷۴)

لوگو سنو! بلاشبہ تمہارا رب ایک اور تمہارا باپ ایک ہے۔

اسی خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لا فضل لعربی علی اعجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی

---

(۷۱) آل عمران/۱۰۳

(۷۲) الحجرات/۱۳

(۷۳) النساء/۱

(۷۴) مسند احمد،۵/۴۱۱ حدیث نمبر ۲۳۴۷۹

احمر الا بالتقویٰ (۷۵)

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں نہ عجمی کو عربی پر نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سوائے تقویٰ کے۔

اسی طرح آپؐ سے منقول ہے۔

اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید أن العباد کلھم اخوۃ (۷۶)

اللہ! جو ہمارا رب اور ہر شئی کا رب ہے میں گواہ ہوں کہ انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اگر چہ امت میں جغرافیائی' لسانی اور نسلی تعصبات در آئے ہیں اور ان کی وجہ سے امت مسلسل نقصان اٹھا رہی ہے تاہم اس کے اجتماعی ضمیر نے ان تعصبات کو قبول نہیں کیا اور فکری لحاظ سے یہ امت اب بھی دنیا کی سب سے زیادہ روادار اور انسان دوست جماعت ہے۔ ان تعصبات کا سبب دین سے دوری' جہالت اور اغیار کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ مغربی استعمار نے اپنے تسلط کو مستحکم رکھنے کے لیے اپنی مستعمرات میں قومیت کے تصور کو فروغ دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اور مسلمان ممالک میں محدود قومیتوں کے تصور کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افتراق وتشتت کا شکار ہو کر امت استعماری قوتوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن الحمد اللہ امت کے اندر ایسے افراد موجود ہیں جو ان ریشہ دوانیوں کے خلاف امت کے اندرونی استحکام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

عالمگیر اخوت

امت مسلمہ کی خصوصیت ہے کہ وہ ایمان رکھنے والے لوگوں کو عالمگیر اخوت کا احساس دلاتی ہے۔ ایمان کی اور نظریہ کی بنیاد پر تمام مسلمان آپس میں بھائیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ اخوت ایک روحانی اور ایمانی رشتہ ہے جو مادی رشتوں سے زیادہ اہم ہے۔ قرآن مجید نے کہا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۷۷) بلاشبہ تمام مومن بھائی بھائی ہی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ معاشرتی برائیوں میں مبتلا ہو کر باہمی تعلقات کو خراب کرنے کی بجائے رشتہ اخوت کو مضبوط کریں:

کُوْنُوا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا (۷۸) اللہ کے بندو سب بھائی بھائی بن جاؤ۔

آپؐ تو مومنین کی اخوت سے آگے بڑھ کر انسانی اخوت کی بات کرتے ہیں اور تمام انسانوں کو اخوت کی لڑی میں

---

(۷۵) ایضاً

(۷۶) ابوداؤد کتاب الوتر، باب مایقول اذا سلم/۲۲۳

(۷۷) الحجرات/۱۰

(۷۸) بخاری، کتاب الادب، باب ماینھی من التحاسد ،۱۰۵۹؛ مسند احمد،۱/۴۵،۴۳، ۷۴؛ ۲/۱۵۶؛
مسلم کتاب البرو الصلۃ، باب التحاسد والتباغض /۱۱۲۲؛ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی ھجرۃ الرجل اخاہ ،۶۹۲

جڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اللھم رَبَّنا وَربُّ کُلّ شَئی انا شھیدٌ ان العِبَاد کُلُّھم اِخوۃٌ(۷۹)

اے ہمارے اللہ ہر شے کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس امت کی یہ خصوصیت اپنے اثرات کے باعث آج بھی باقی ہے۔اگرچہ دور حاضر کے شیطانی تصور قومیت نے امت مسلمہ کو لسانی و نسلی گرہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔اس کی بنا پر وہ قومی ریاستوں میں منقسم ہیں اور باہم دگر آویزشوں اور مسابقتوں میں مبتلا ہیں لیکن اب بھی انہیں مسلمان بھائیوں پر ہونے والے مظالم پر دکھ ہوتا ہے۔وہ دل گرفتہ ہو کر احتجاج کرتے ہیں۔ان کی ہر ممکن امداد کا اہتمام کرتے ہیں اور کچھ نہیں تو ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ایسا کرنے میں وہ حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا مصداق بن جاتے ہیں۔

(۱) عن النعمان بن بشیر قال: قال رسول اللہؐ: تری المومنن فی تراحمھم وتوادھم وتعاطفھم کمثل الجسدا ذا شتکیٰ عضو تداعی له سائر الجسد بالسھرو الحُمی (۸۰)

نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تو ایمان والوں کو آپس کی رحمت، محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا۔جب کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو تمام بدن کے اعضا بیداری اور تپ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۲) وعنه قال: قال رسول اللہؐ: المومنون کرجل واحد ان اشتکی عینه اشتکی کله وان اشتکی راسه اشتکی کله (۸۱)

انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تمام مسلمان ایک آدمی کی مانند ہیں۔اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے۔اگر سر دکھتا ہے تو سارا بدن دکھنے لگتا ہے۔

(۳) عن ابی موسیٰؓ عن النبی قال: المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضا ثم شبك بین اصابعه (۸۲)

ابو موسیٰؓ نبی کریمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: مومن مومن کے لئے مکان کی مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔پھر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں۔

---

(۷۹) ابوداؤد، کتاب الوتر، باب مایقول اذ سلم الرجل/۲۲۳

(۸۰) بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبھائم/۱۵۵۱

(۸۱) مسلم، کتاب البر، باب تراجم المومنین/۱۱۳۱

(۸۲) بخاری، کتاب الصلاۃ، باب تشبیك الاصابع/۳۸

اعتدال پر ور امت

امت مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انتہا پسندی نہیں ہے۔ یہ اعتدال پر ور امت ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۸۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک میانہ رو امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور رسول ﷺ تم پر گواہی دے۔

اسی اعتدال اور میانہ روی اور خیر و بھلائی کے فروغ اور بدی کو روکنے کی صلاحیت کے باعث اسے بہترین امت قرار دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۸۴)

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے تشکیل دیا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

اعتدال افراط و تفریط کی درمیانی راہ ہے۔ قرآن نے امت مسلمہ کو اعتدال پر ور امت (Moderate) قرار دیا ہے۔ اعتدال اس امت کی خصوصیت ہے کیونکہ حضور اکرمؐ کے وقت یہودی اور عیسائی مذہبی انتہا پسندی پر قائم تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ خدا ہمارا ہے اور ہم اس کے چہیتے ہیں لہٰذا نجات ہماری ہوگی۔ قرآن نے ان کے دعووں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ (۸۵)

اور یہود و انصاری کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ آپؐ کہیں کہ پھر وہ تمہاری بداعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے۔ بلکہ تم اس کی مخلوقات میں سے (دوسروں کی طرح کے) انسان ہو۔ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶)

---

(۸۳) البقرہ/۱۴۳

(۸۴) آل عمران/۱۱۰

(۸۵) المائدہ/۱۸

(۸۶) البقرہ/۸۰

اور کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دن کے سوا چھو نہ سکے گی۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اقرار لے رکھا ہے کہ اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرے گا (نہیں) بلکہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں مطلق علم نہیں۔

عیسائیوں نے خدا کو درمیان سے ہی نکال دیا اور صرف مسیح پر اکتفاء کر بیٹھے۔ ان کا عقیدہ ہے:

He is the gateway to salvation۔ قرآن نے ان کا قول نقل کیا:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ۔ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۸۷)

یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اس طرح کی باتیں کہا کرتے تھے یہ بھی انہی کی ریس کرتے ہیں۔ اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

قرآن نے ان دونوں انتہاؤں کی اصلاح کی اور کہا اللہ رب العالمین ہے وہ کسی خاص قوم کا پابند نہیں اور مسیح اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

ان کی انتہا پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۸۸)

اے اہل کتاب حد سے نہ گزرو اور اللہ کی طرف ایسی بات منسوب نہ کرو جو حق نہیں۔ مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھے کہ وہ اللہ کے رسول اور ایک فرمان جو مریم کی طرف بھیجا گیا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔ سو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آجاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اللہ تو بس ایک ہی ہے وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

امت مسلمہ ہر قسم کی انتہا پسندی سے پاک اعتدال پر رہنے اور درمیانی راہ پر چلنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو خصوصیت کے ساتھ اس امت کے مسلک اعتدال کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اسے انتہا پسندی سے محفوظ کر کے اعتدال پر در بنایا گیا ہے۔

---

(۸۷) التوبہ/۳۰

(۸۸) النساء/۱۷۱

آخری امت

انسانی تاریخ میں اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ وہ ہر رسول کی بعثت کے ساتھ ایک امت کی تشکیل بھی کرتا رہا ہے۔ یہ امت اس پیغام کی امین ہوتی اور پیغمبر کی عطا کردہ تعلیمات کے مطابق نظام تشکیل دیتی۔ حضور اکرم ﷺ چونکہ اس سلسلے کی آخری کڑی اور انبیاء کی جماعت میں آخری نبیؐ ہیں اس لیے آپ کی امت بھی آخری امت قرار پائی۔ آپؐ کا ارشاد ہے۔

نحن اخر الامم (۸۹) ہم آخری امت ہیں۔

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے۔

انا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم (۹۰)

میں آخری نبیؐ ہوں اور تم آخری امت ہو۔

آخری امت ہونے کی وجہ سے یہ آخری پیغام کی بھی امین ہے اسی لیے اس نے نہ صرف اس پیغام کو تھامے رکھنا ہے بلکہ اسے آگے پہچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہنا ہے۔ چونکہ حضور اکرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آنا اس لیے اب امت کو کار پیغمبری انجام دینا ہے۔ اللہ کے پیغام کی حفاظت بھی کرنا ہے اور اسے دنیا تک پہنچانے کا اہتمام بھی کرنا ہے۔

اجتماعی گمراہی سے حفاظت

اس امت کی ایک خصوصیت ہے کہ یہ مجموعی گمراہی میں مبتلا نہیں ہوگی۔ اس میں معروف افراد اور گروہ تو پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ہدایت ربانی ضائع ہو جائے اور امت بالجملہ گمراہ ہو جائے۔ ان میں ہمیشہ ایسے افراد اور گروہ رہیں گے جو حق پر قائم ہونگے اور حق کا پرچار کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان امتی لاتجتمع علی ضلالۃ فاذا رایتم الاختلاف فعلیکم بالسواد الاعظم (۹۱)

بلاشبہ میری امت گمراہی پر کبھی مجتمع نہ ہوگی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کے ساتھ ہو۔

چونکہ اللہ کی کتاب محفوظ ہے اور حضور اکرم ﷺ کی سیرت موجود ہے اس لیے ہر زمانے میں یہ فریم ورک رہنمائی کا کام دیتا رہے گا۔ پچھلی امتیں اس لیے گمراہ ہوگئیں کہ وہ ہدایت ربانی کو ضائع کر بیٹھیں۔ جسے وہ سنبھال کر ہدایت کا ذریعہ قرار دیتی رہیں وہ بھی تحریف شدہ اور انسانوں کے تصنیف کردہ بیانات تھے۔ اسی لیے آنجناب ﷺ نے ہدایت کا نسخہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

---

(۸۹) ابن ماجہ کتاب الزہد، باب صفۃ محمد/ ۶۲۵؛ مسند احمد ۵/ ۳

(۹۰) ایضاً

(۹۱) ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم/ ۵۶۷

عن مالك انه بلغه أن رسول اللہؐ قال: ترکت فیکم امرین لن تضلوا ان تمسکتم بهما کتاب الله و سنة نبیه (۹۲)

امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر انہیں پکڑے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت۔

یہ امت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس سے صراط مستقیم کبھی نہیں چھوٹے گا۔

اس امت کی اصلاح کا ایک خود کار طریقہ موجود ہے جو اسے غیر متعلقہ اور غیر مطلوب اجزاء سے پاک کرنے کا عمل جاری رکھے گا۔ ہر دور میں ایسے افراد اور گروہ موجود رہیں گے جو اس خود کار نظام کی تنظیم نو اور تعمیر نو کرتے رہیں گے آنحضور ﷺ نے اس حدیث میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا:

ان الله یبعث علی رأس کل مأة من یجدد لها دینها۔(۹۳)

اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر کسی کو ذمہ دار بنائے گا کہ دین کی تجدید کریگا۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

دنیا کے ہر گروہ کی ذمہ داریاں ان کے نصب العین اور نظریہ حیات سے وابستہ ہوتی ہیں۔ امت مسلمہ کی ذمہ داریاں بھی اس کے نصب العین اور نظریہ حیات سے وابستہ ہیں۔ اس نصب العین کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں بھی خصوصی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں سے چند ایک کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

نیابت رسول ﷺ

اس امت کی سب سے اہم ذمہ داری نیابت رسولؐ ہے۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے پیغمبرانہ کام کو جاری رکھنا اور رسالت کے فرائض کو انجام دینا مجموعی طور پر امت کی ذمہ داری ہے۔ پیغمبر ﷺ کے فرائض میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت، تزکیہ نفس، اقامت دین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور عمومی طور پر شریعت الٰہیہ کا نفاذ شامل ہے اس لیے امت مسلمہ اس کار پیغمبری کی مکلف ہے۔ عقیدہ، ختم نبوت کا لازمی نتیجہ ہے کہ امت کار نبوت کو جاری رکھے اور اس میں کوتاہی نہ کرے۔ کوتاہی کرنے والے کے لیے حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ (۹۴) ارشاد الٰہی ہے۔

---

(۹۲) الموطا (مترجمہ) کتاب القدر، باب النہی عن قول القدر/۳ ۵۷۔ حاکم نے عبداللہ بن عمار الکلابی سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: فان اللہ لایجمع هذه الامة علی الضلالة ، المستدرک، ۴/ ۵۰۷

(۹۳) ابوداؤد، کتاب الملاحم ، باب ما یذکر فی قرن المائة، ۳/ ۳۴۸

(۹۴) ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر، ۲/ ۳۹

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۹۵)

اس نے تمہیں چن لیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب ہے اس نے پہلے سے تمہارا نام مسلم رکھا اور اس دین میں بھی یہی نام ہے۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم تمام لوگوں پر گواہ ہو۔

نیابت رسولؐ کے سلسلے میں عائد شدہ تمام ذمہ داریوں کو دو عنوانات کے تحت سمیٹا جا سکتا ہے اور تمام پیغمبرانہ سرگرمیاں ان تین عنوانات کے تحت بیان کی جاسکتی ہیں۔ ایک دعوت و تبلیغ دوسرا تزکیہ نفس اور تیسرا اقامت دین۔

دعوت و تبلیغ

دعوت الی اللہ انبیاء کی پہلی ذمہ داری ہے بلکہ کار رسالت کا آغاز ہی اسی سے ہوتا ہے اور یہ ایسی سرگرمی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ قرآن و سنت نے اسے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہیں ورنہ وہ اللہ کی تائید و نصرت اور رحمت و برکت سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن و سنت نے اسے مختلف اسالیب سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہیں اسے تبلیغ، کہیں دعوت، کہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور کہیں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا نام دیا ہے۔ مندرجہ ذیل نصوص سے اس کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹۶)

تم بہترین امت ہو۔ تمہیں لوگوں کے لیے بنایا گیا۔ معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

یہ وہ عمومی حکم ہے جس کے تحت پوری امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ دار ہے۔ ہر انسان کو اپنی بساط کے مطابق یہ فریضہ انجام دینا ہے۔ گویا امت مسلمہ کا عمومی مزاج معروف کو اختیار کرنا اور منکر سے گریز کرنا اور معاشرے میں اس کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ امت مسلمہ کا مجموعی ماحول منکرات کو قبول نہیں کرے گا اور ہر شخص اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرے گا تاکہ منکرات کی موثر روک تھام ہو سکے۔ معروف کے چلن کے لیے خصوصی ٹاسک فورس قائم کی جائے گی جو معاشرے کے احوال پر نظر رکھے گی اور منکرات کو روکنے کے لیے اور معروف کو قائم رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کرے گی۔ اس ٹاسک فورس کا ذکر قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے:

---

(۹۵) الحج/۷۸

(۹۶) آل عمران/۱۱۰

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹۷)

تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیے جو بھلائی کی دعوت دیں معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں یہی فلاح پانے والے ہیں۔

مسلم معاشرے کی مجموعی فضا خیر اور معروف کی فضا ہے اور اسے قائم رکھنا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے ورنہ ان کے معاشرے میں اور غیر مسلم معاشرے میں امتیاز ختم ہو جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کی صفات بیان کرتے ہوئے قرآن نے معروف و منکر کا خصوصی ذکر کیا ہے:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹۸)

انہیں نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السّٰٓائِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۰)

توبہ کرنے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا امر کرنے والے، بری باتوں سے منع کرنے والے، اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے۔ اے پیغمبر مومنوں کو خوشخبری سنائیں۔

مسلمان اصحاب اختیار کا ذکر کرتے ہوئے امر بالمعروف کا خصوصی تذکرہ کیا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۱۰۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو صلوٰۃ قائم کریں زکوٰۃ دیں، نیک کام کرنے کا حکم دیں اور

---

(۹۷) آل عمران/۱۰۴

(۹۸) الاعراف/۱۵۷

(۹۹) التوبہ/۷۱

(۱۰۰) التوبہ/۱۱۲

(۱۰۱) الحج/۴۱

رے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

لقمان نے بیٹے کو جو نصیحتیں کیں ان میں امر بالمعروف کا بھی ذکر ہے۔ قرآن اسے نقل کرتے ہوئے کہتا ہے:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۰۲)

بیٹا نماز قائم کرنا' لوگوں کو اچھے کاموں کا امر اور برے کاموں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت آ جائے اس پر صبر کرنا۔ بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک امر بالمعروف کی کتنی اہمیت ہے۔ ایک اچھا شہری' ایک مخلص مومن اور ایک مسلمان صاحب اختیار اس بات کا پابند ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اس کے بغیر فرد کی نیکی کا حصول اور معاشرے کی فلاح ممکن نہیں۔

تواصی بالحق

چونکہ مسلم معاشرہ خیر و بھلائی پر قائم ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ شعور ہمیشہ تازہ رہے اور اسے تازہ رکھنے کا سب سے اچھا ذریعہ یہ ہے لوگ ایک دوسرے کو حق اور صبر پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہیں کہ حیات انسانی کا اصلی معیار حق ہے اور اس پر قائم رہنے کے لیے صبر کی صفت کو اپنانا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو ایک مختصر صورت میں بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ سورت اتنی جامع ہے کہ اگر صرف یہی نازل ہوتی تو اللہ اپنے بندوں سے حساب کتاب لینے میں حق بجانب ہوتا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳)

زمانے کی قسم کہ انسان یقیناً گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں' اچھے عمل کرتے ہیں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

انسان کا صرف حق پر قائم رہنا ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حق پر قائم رہنے پر آمادہ کرے۔ یہ وہ پیغمبرانہ کام ہے جو ختم نبوت کی وجہ سے امت مسلمہ کے ذمہ آن پڑا ہے۔

---

(۱۰۲) لقمان/ ۱۷

(۱۰۳) العصر/ ۱۔۳

تبلیغ

تبلیغ پیغام حق کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ہر نبی کے فرائض میں فریضہ تبلیغ بھی شامل تھا۔ حضور اکرم ﷺ کو حکم ہوا:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۱۰۴)

اے رسولؐ جو کچھ آپؐ پر نازل ہوا ہے اسے آگے پہنچائیں اگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا تو آپ ﷺ نے رسالت کا ابلاغ نہیں کیا۔

آپؐ نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ فریضہ تبلیغ ادا کریں۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

بَلِّغُو اعَنِّي وَلَو آيَةً (۱۰۵) آگے پہنچاؤ گو مجھ سے سنی ہوئی ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح آپؐ سے ایک حدیث منقول ہے جس کے الفاظ مختلف روایات میں مختلف ہیں لیکن مفہوم ایک ہے۔ اور یہ اتنی کثرت سے روایت کی گئی کہ بعض لوگ اسے متواتر کہتے ہیں۔

نضر الله امرأ سمع منا حديثا فبلغه كما سمعه فرب مبلغ احفظ من سامع (۱۰۶)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے ہمؐ سے کوئی بات سنی اور اسے اس طرح آگے پہنچایا جیسے سنا چونکہ بعض اوقات وہ شخص جس تک بات پہنچتی ہے اس سے زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے جس نے پہلے سنی تھی۔

خطبہ حجۃ الوداع پر خصوصیت سے اور بعض دوسرے مواقع پر عمومی طور پر یہ فرمایا:

فليبلغ الشاهد الغائب (۱۰۷)

جو حاضر ہے وہ اس شخص تک میرا پیغام پہنچا دے جو اس وقت غیر حاضر ہے۔

مندرجہ بالا نصوص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ امت مسلمہ کا فریضہ ہے جو پیغام رسالت اس تک پہنچا ہے اسے آگے پہنچانا اس کے فرائض میں سے ہے۔ رسالت کی جانشینی کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ امت اسی طرح دین کی تبلیغ کرتی رہے جس طرح رسول اکرم ﷺ اپنے وقت میں کرتے تھے۔ آپؐ کی حیات طیبہ کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔

تزکیہ نفس

حضور اکرمؐ کی ذمہ داریوں میں جہاں تلاوت آیات تعلیم کتاب و حکمت کو متعین کیا گیا وہیں ایک تزکیہ نفس کو شامل کیا گیا۔ تزکیہ کے لغوی معنوں میں بڑھانا نشوونما دینا' میل کچیل' زنگ اور گندگی وغیرہ سے پاک صاف کرنا ہے۔ (۱۰۸)

---

(۱۰۴) المائدہ/ ۶۷

(۱۰۵) بخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل/۵۸۲۔

(۱۰۶) ابن ماجہ، مقدمہ، باب من بلغ علما/ ۳۵

(۱۰۷) بخاری، کتاب الحج، باب الخطبۃ ایام منی/ ۲۸۵، مسلم، کتاب القیامہ، باب تغلیظ تحریم الدماء/ ۷۴۳

(۱۰۸) لسان العرب ۱۱۴/ ۳۰۹

حدیدہ اصطلاحوں میں جسے ہم تعمیر سیرت اور تعمیر شخصیت کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں وہ یہی تزکیہ نفس ہے۔قرآن نے مناصب نبوت بیان کرتے ہوئے تزکیہ نفس کو شامل کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۱۰۹)۔

جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسولؐ بھیجا ہے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ سکھاتا ہے جس کا تمہیں علم نہیں۔

ابراہیمؑ کی دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن بیان کرتا ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۱۰)۔

اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجئے جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب و دانائی سکھایا کرے اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے۔بے شک تو غالب صاحب حکمت ہے۔

اس مضمون کو سورہ آل عمران (۱۱۱) اور سورہ الجمعہ (۱۱۲) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔حضور اکرم ﷺ کی دعاؤں میں تزکیہ نفس کی آرزو شامل ہے حدیث میں آتا ہے:

قال النبیؐ: اللهم آت نفسی تقوٰها وزكها انت خير من زكها۔(۱۱۳)

نبی اکرمؐ نے فرمایا: اے اللہ! میری ذات کو تقویٰ عطا فرما اور اسے پاکیزہ بنا کہ تو تزکیہ کرنے والا ہے۔

اگر تزکیہ نفس سے مراد تطہیر ذات اور تعمیر شخصیت ہے تو پھر اسے امت کے استحکام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔چونکہ امت ایک خصوصی اجتماعیت ہے لہٰذا اس کی تشکیل میں خصوصی افراد ہی کارآمد ہو سکتے ہیں اور یہ خصوصی افراد وہی ہو سکتے ہیں جن کا تزکیہ نفس ہوا ہے۔امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ تزکیہ نفس کے نظام کو قائم رکھے۔یہ وہ نظام تربیت ہے جو امت کے نظام تعلیم کا حصہ رہا ہے۔حضور اکرمؐ کے عہد میں تعلیم وتربیت کا نظام آپؐ کی نگرانی میں ہوتا تھا جسے آپؐ کے بعد امت کے معلموں اور مربیوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا اور ہر گروہ نے ایک ذمہ داری اپنے حصہ میں لے لی۔علماء اور قراء نے تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور صوفیاء نے تزکیہ نفوس اور تربیت افراد کا ذمہ لیا۔

(۱۰۹) البقرہ/۱۵۱

(۱۱۰) البقرہ/۱۲۹

(۱۱۱) آل عمران/۱۴۶

(۱۱۲) الجمعہ/۲

(۱۱۳) مسلم، کتاب الذکر، باب الادعیہ/۱۸۱/ ؛ مسند احمد ۴/ ۳۷۱، ۶/ ۲۰۹ ؛ نسائی، کتاب الستعاذہ، باب الاستعاذہ من العجز/ ۴۴۳/ ۷

مسلمان حکومتیں تعاون کرتی رہیں لیکن ارباب علم اور اہل صفا نے رضا کارانہ طور پر دونوں خدمات انجام دیں کہ امت مسلمہ کا اسلامی تشخص محفوظ رہا۔ اشرارِ زمانہ کی غارت گری کے باوجود تعلیم و تربیت کا یہ نظام قائم رہا اور اسی نے امت کی اجتماعی شخصیت کی حفاظت کی۔ بدقسمتی سے عہد حاضر کا شر اس رضا کارانہ نظام تعلیم و تربیت کو تباہ کرنا چاہتا ہے جسے امت کی محبوب شخصیتوں نے اپنی قربانیوں سے پروان چڑھایا تھا۔

صوفیاء کا کردار

تزکیہ نفوس اور تربیت افراد میں مسلم صوفیاء کا شاندار کردار ہے۔ حضور اکرمؐ کے زہد و عبادت اور تقویٰ و طہارت پر مبنی یہ نظام ابتداء میں زہد و تقویٰ اور بعد میں تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔ اگرچہ بعض فلسفیانہ تصورات اور انحرافی نظریات در آنے کی وجہ سے اس کے بعض پہلو متنازع ہوئے لیکن بحیثیت مجموعی اس ادارے نے امت کے اسلامی تشخص کی حفاظت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی زندگیوں میں زہد و تقویٰ کے جو نمونے تھے وہ نسل در نسل امت میں منتقل ہوتے رہے۔ تیسری صدی ہجری تک ایک مسلسل طرز عمل رہا ہے جس کی شعاعیں امت مسلمہ کی اجتماعی زندگی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ تیسری صدی میں جو تصوف ظہور پذیر ہوا اس کی اساس انہی ربانی شخصیتوں کا عمل ہے جو تزکیہ نفس کے مثالی کردار کے طور پر جلوہ فگن رہیں۔ تزکیہ نفس کے اس استحکام نے غیر معمولی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ عبد الرحمٰن السلمیؒ (۴۱۲ھ)، ابو نعیم اصفہانیؒ (۴۳۹ھ)، عبد الکریم القشیریؒ (۴۶۵ھ)، ابو الحسن علی ہجویریؒ (۴۶۵ھ)، ابو حامد الغزالیؒ (۵۰۵ھ)، فرید الدین عطارؒ (۶۲۰ھ)، معین الدین اجمیریؒ (۶۳۳ھ)، ابو الحسن شاذلیؒ (۶۵۶ھ)، جلال الدین رومیؒ (۶۳۳ھ)، بہاؤ الدین نقشبندؒ (۶۹۱ھ)، مجدد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ) شاہ ولی اللہؒ (۱۱۷۴ھ) وغیرہ صرف چند نام ہیں۔ ان کے کام کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوگا کہ امت کے استحکام میں انہوں نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

تزکیہ نفس کا اسلوب

افراد کی تربیت اور ان کی سیرت کی تعمیر کے بغیر امت کی اجتماعیت کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب مسلم افراد تک پہنچ کر ان کے قلوب و اذہان کو مسخر کرنے اور مسخ کرنے کا کام شروع کر چکا ہے۔ امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے نظام تربیت کو مستحکم کرے اور اپنے افراد کی حفاظت کرے۔ تزکیہ نفس کے لیے جہاں مربی کی شخصیت ضروری ہے وہاں ایک ڈھیلا ڈھالا نظام تربیت بھی ضروری ہے جو مخصوص صف بندی اور گروہی عصبیت کی بجائے فرد کی روحانی شخصیت کو مستحکم کرے۔ دور حاضر کے تقاضوں میں ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ امت مسلمہ کے افراد مضبوط شخصیت کے

مالک ہوں اور نامساعد حالات میں لرزاں و خیزاں نہ ہوں۔ایسا کردار روحانی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔حضور اکرمؐ نے اس کے لیے واضح ہدایات دی ہیں۔ان کو پیش نظر رکھنے سے مضبوط شخصیتیں تعمیر کی جا سکتی ہیں اور انہی شخصیتوں کی امت کو ضرورت ہے۔آنجنابؐ نے جن بنیادوں پر اپنے اصحاب کی تربیت کی وہی بنیادیں اب بھی کارآمد ہیں بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ان کو اپنایا جائے۔ان بنیادوں میں سے تین بے احد اہمیت رکھتی ہیں:۔

عقیدہ۔ عبادت۔ اخلاق حسنہ

توحید کا شعور انسان میں اللہ کی محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔صوفیاء کے ہاں اسی جذبہ محبت کی آبیاری ہوتی ہے۔ مومن حب الٰہی سے ایسا سرشار ہوتا ہے کہ باقی ہر شے کی نفی ہو جاتی ہے۔نقشبندی مشائخ کے ہاں ''الٰہی انت مقصودی ورضاک مطلوبی'' کو پختہ کرایا جاتا ہے۔جس سے شخصیت مستحکم ہوتی ہے قرآن کثرت ذکر کا حکم دیتا ہے کیونکہ ذکر الٰہی سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔حضور اکرم ﷺ کی محبت، اطاعت اور اتباع ایک اور پہلو ہے۔جس سے شخصیت کو استحکام ملتا ہے۔

امت کا وجود حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ان کی ذات حیات انسانی کے عملی پہلوؤں کا محور ہے۔ایک انسان ہر لمحہ ان کے اسوہ کو سامنے رکھتا ہے اور یوں اس کی شخصیت اسلامیت کے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے۔ حضور اکرمؐ سے تعلق کی پختگی شخصیت کی قوت کا مظہر ہے۔آپؐ کی ذات تزکیہ نفس کا نمونہ ہے۔کثرت درود سے ایک امتی کا نہ صرف آپؐ سے رابطہ بڑھتا ہے بلکہ اس وابستگی سے تزکیہ نفس بھی حاصل ہوتا ہے۔آپؐ کا ارشاد ہے:

صلّو اعلّی فا نہا زکاۃ لکم (۱۱۴)۔مجھ پر درود بھیجا کرو کہ اس سے تمہارے نفس کا تزکیہ ہوگا۔

عبادت بندے کو اپنے رب کے نہ صرف قریب کرتی ہے بلکہ انوار الٰہی کا مرکز بناتی ہے۔عبادت تزکیہ نفس کا دوسرا بڑا ذریعہ ہے۔آنجنابؐ نے ایک حدیث میں عبادت کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

الاحسان ان تعبد اللہ کا نک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (۱۱۵)

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی ایسے عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھ رہا ہو تو وہ تو یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔

نظام عبادات معاشرے کی روحانی تربیت تطہیر قلوب اور تعمیر شخصیت کا بہترین ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات نے مومنین کے ارباب اختیار کو نظام عبادات کے قیام کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۱۱۶)

---

(۱۱۴) مسند احمد ۴/۳۶۵

(۱۱۵) بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل/۱۲

(۱۱۶) الحج/۴۱

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں حکومت عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

عبادت کو ان کی روح کے مطابق ادا کرنا تزکیہ نفس کا بڑا ذریعہ ہے۔ بندے کی عبودیت کا الوہیت کے ساتھ گہرا تعلق اسے ایک ذمہ دار اور متوازن انسان بناتا ہے۔ اسی قسم کے افراد جن کے لیے روئے زمین کا ذرہ ذرہ آرزو مند ہے۔ ایسے پاکیزہ افراد صرف امت مسلمہ ہی پیدا کرسکتی ہے۔

تزکیہ نفس کا تیسرا بڑا ذریعہ اخلاق حسنہ ہیں۔ یہ اخلاق انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ ایک شخص کا اگر اپنے رب کے ساتھ درست تعلق مستحکم ہوتا ہے تو وہ خلق خدا کے لیے بھی باعث رحمت ہوتا ہے۔ دنیوی زندگی میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی رویے اس کی حیثیت کو متعین کرتے ہیں۔ خدمت خلق اور انسانوں پر شفقت و رحمت قلوب انسانی کو مزین کرنے والے اعمال ہیں۔ حضور اکرمؐ نے حسن خلق کو تکمیل شخصیت کا بڑا ذریعہ قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

ان الرجل ليدرك بحسن خلقه درجة قائم الليل وصائم النهار (۱۱۷)

بلاشبہ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح آپؐ سے منقول ہے:

اِنَّ خِيَارَكُمْ اَحَاسِنُكُمْ اخلاقاً (۱۱۸)

تم میں سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک اللہ کو مطلوب ہے اور حضور اکرمؐ نے ایک روایت کے مطابق اسے اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ آپؐ سے منقول ہے۔

الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن اِلىٰ عَياله (۱۱۹)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے سے اچھا سلوک کرے۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ افراد کی تیاری میں ان کی تربیت، تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کا خصوصی خیال رکھے کیونکہ اسی کے ذریعے وہ دنیا کی تمام اقوام سے بہتر امت بن سکے گی۔

---

(۱۱۷) ابوداؤد، کتاب الادب، باب حسن الخلق، ۳۰/۴

(۱۱۸) بخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق، ۸۲/۷

(۱۱۹) مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، ۲۱۳/۲

اقامت دین

حضور اکرم ﷺ کا ایک فریضہ اقامت دین تھا۔ اقامت دین میں جہاں انفرادی طور پر اسلامی احکام کو بجالانا ہے وہاں اجتماعی طور پر اسلامی نظام کو قائم کرنا بھی ہے۔ ایک ایسا اجتماعی نظام جو احکام الٰہی کی بجا آوری کو آسان بنائے اور اس کی معصیت کو مشکل بنائے۔ یہ اجتماعی نظام اسلام کی ہیئت حاکمہ سے قائم ہوگا۔ ایسا نظام جس میں رسول ﷺ کی نیابت میں یہ ہیئت حاکمہ شریعت الٰہی کو نافذ کرے۔ اللہ کی حاکمیت اور رسول اکرمؐ کی نیابت میں اسلامی ریاست قائم ہو جو معاشرے کو خیر و فلاح اور معروف پر قائم کرے اور اس سے منکرات، فواحش اور معصیت شعاری کو ختم کرے۔ ریاست کا ادارہ انسانی معاشرے کا سب سے اہم اور موثر ادارہ ہے۔ قانون کا نفاذ اور جان و مال کا تحفظ اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر یہ ادارہ گمراہی پر مبنی ہو تو معاشرے میں خیر کا فروغ مشکل ہو جائیگا اور فواحش و منکرات کی اشاعت آسان ہو جائیگی۔ ریاست کی گمراہی کی صورت میں ذاتی نیکی کا خواب کبھی پورا نہیں ہوتا۔

قیام عدل

قیام عدل اقامت دین کا ایک اہم پہلو ہے۔ ظلم اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ عمل ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔

الظلم ظلمات یوم القیامة (۱۲۰)

قیامت کے روز ظلم تاریکیوں کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

قیام عدل انبیاءؑ کی دعوت کا بہت اہم حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۱۲۱)

ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب ہدایت اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

عدل اس قدر اہم ہے کہ اس سے دشمنوں کو بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ہر حال میں عدل سے کام لیں۔

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا. اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۱۲۲)

کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

---

(۱۲۰) بخاری کتاب المظالم، باب الظلم ظلمات یوم القیامة/ ۳۹۵؛ ترمذی، کتاب البر والصله، باب ماجاء فی الظلم / ۴۶۶

(۱۲۱) الحدید/ ۲۵

(۱۲۲) المائدہ/ ۸

تعاون علی البر کا فروغ

اقامت دین کا ایک اور اہم پہلو معاشرے میں خیر کا فروغ ہے۔شر کی سرگرمیاں معاشرے کے امن وسکون کے لیے مضر ہیں اس لیے معاشرے کے افراد کو اس امر پر آمادہ کرنا کہ وہ ہمیشہ خیر کے فروغ اور شر کو روکنے کے لیے سرگرم رہیں۔قرآن اسے تعاون علی البر کہتا ہے:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۱۲۳)

نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسری کی مدد کرو۔گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

تعاون علی البر کا ہی ایک پہلو ہے کہ لوگوں کے درمیان اختلافات کو دور کیا جائے۔جہاں باہمی مصالحت ممکن ہو وہاں مصالحت کرائی جائے جہاں یہ ممکن نہ ہو تو نظام عدل کے ذریعہ معاملات کو حل کیا جائے۔اگر دو گروہوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے تو حتی الامکان کوشش کی جائے کہ مصالحت ہو جائے۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو ظالم کے خلاف اس کی مدد کی جائے جو حق پر ہو۔ارشاد الٰہی ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۱۲۴)

اگر مومنوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرواد و اگر ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرے اس سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے۔

صلح و جنگ اور قیام خیر و رفع شر کے لیے ہیئت حاکمہ کا قیام اور استحکام ضروری ہے۔یہ نظام احکام الٰہی کے مطابق ہو تو یہی اقامت دین ہے۔اقامت دین ایک فریضہ ہے جو اجتماعی طور پر پوری امت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے۔اگر امت اس میں کوتاہی کرے گی تو اس کے خطرناک اجتماعی اثرات ظاہر ہوں گے۔

یہ مختصر سی فہرست ہے جو امت کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں دی گئی ہے۔اس باب میں کئی اور کا اضافہ ہو سکتا ہے جسے اہل علم متعین کر سکتے ہیں۔

......☆......

---

(۱۲۳) المائدہ/۲

(۱۲۴) الحجرات/۹

13

مارکیٹ

منڈی سے عام طور پر وہ جگہ مراد لی جاتی ہے جہاں اشیاء کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے مارکیٹ عربی میں سوق اور اردو میں بازار یا منڈی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر جغرافیائی حدود سے متعین ایک مقام ہوتا ہے جہاں اشیاء کی خرید وفروخت، مال کا لین دین اور معاشی کاروبار ہوتا ہے۔ انسان نے جب سے مل جل کر رہنا سیکھا ہے اس وقت سے مارکیٹ موجود ہے۔ زرنقد کے وجود میں آنے سے پہلے انسان اشیاء کے تبادلے پر انحصار کرتا تھا اور مارکیٹ وہ جگہ تھی جہاں مختلف اشیاء جمع ہوتیں اور ضرورت مند اپنی ضرورت کی اشیاء اپنی پیداواری جنس کے بدلے حاصل کرتا۔ زرنقد نے اشیاء کے تبادلے میں نئے عنصر کا اضافہ کیا اور یوں نقدی کے بدلے اشیاء کی خرید وفروخت شروع ہوئی۔ مارکیٹ کی حیثیت جیسی صدیوں پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے۔ آج اگر فرق ہے تو صرف اشیاء کے تنوع اور ان کی وافر مقدار کا ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے اشیاء کی پیداوار اتنی بڑی سطح پر کی ہے اور اس میں اتنا تنوع متعارف کرایا ہے کہ وہ انسان کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔

مارکیٹیں سامان سے بھری پڑی ہیں اور مال کو پرکشش بنانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے تشہیر کا ایسا جال پھیلایا' انسان کے اندر آرزوؤں کی بیداری کا ایسا سلسلہ شروع کیا ہے اور مال کو پرکشش بنانے کے ایسے طریقے اختیار کیے ہیں کہ انسان محض نمائش کے لیے اشیاء خریدتا ہے۔ ضرورت کے بجائے شوق پورا کرنے کے لئے خریداری ہوتی ہے۔ دور حاضر میں مارکیٹ ایک زندہ اور فعال جگہ ہے۔ اس کا ایک کردار ہے اور معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات ہیں۔ انسانی تاریخ اس مارکیٹ سے آشنا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی اہمیت رہی ہے۔ مسلمانوں نے تجارت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور مختلف سطح کی منڈیاں اور بازار منظم کرنے میں موثر کام کیا ہے۔

جغرافیائی مارکیٹ کی اقسام

جغرافیائی مارکیٹ کا چھوٹا یونٹ دکان ہے جو کسی گاؤں میں یا شہر کے کسی حصے میں قائم ہوتی ہے۔ اور وہ علاقے کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتی ہے پھر شہر یا علاقے میں مختلف دکانوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جس میں مختلف قسم کی اشیاء مہیا ہوتی ہیں۔ یہ دکانیں مخصوص علاقے میں قائم ہوتی ہیں اور آبادی کو علم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ پر اشیاء ضرورت موجود ہیں۔ یہی بازار یا سوق ہوتا ہے جس کا ذکر کتب حدیث میں ملتا ہے۔ یہ مارکیٹ مستقل نوعیت کی سرگرمی ہے اور جب تک شہر آباد رہتے ہیں مارکیٹیں موجود رہتی ہیں۔ مارکیٹ کی ایک اور قسم متحرک یا وقتی وموسمی ہوتی ہے یہ منڈی مختلف اوقات میں مختلف

مقامات پر لگتی ہے۔ یورپ میں اب بھی مختلف مقامات پر ہفتہ وار مارکیٹیں لگتی ہیں۔ ان کی جگہیں متعین ہوتی ہیں اور دن مقرر۔ دوکاندار جگہ کرایہ پر لیتا ہے اپنا سٹال لگاتا ہے۔ دن بھر کاروبار کرتا ہے شام کو سٹال کو اکھاڑتا ہے، سامان کو سمیٹتا ہے، اپنی وین میں ڈالتا ہے اور گھر کو روانہ ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ میں تجارت کے کاروان چلتے تھے اور وہ اپنا سامان کسی علاقے میں بیچنے کے لیے چند دن کا پڑاؤ کرتے تھے اور ایک متعین جگہ پر اس مال کی نمائش ہوتی اور لوگ خریدنے کے لیے اس جگہ پر آتے تھے۔ اسی طرح بعض مواقع پر میلے لگتے جہاں تفریحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اشیاء کی خرید و فروخت کا سامان بھی ہوتا اور لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء خریدتے۔ عرب میں قبل از اسلام ایسے میلوں اور بازاروں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اب بھی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایسی نمائشوں کا انتظام ہوتا ہے جہاں ایک ملک یا کئی ملکوں کی اشیاء پیداوار کی نمائش اور تشہیر ہوتی ہے اور خرید و فروخت کا انتظام ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Exhibition کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو منڈی کی تین قسمیں بنتی ہیں۔ مقامی منڈی، ملکی منڈی اور بین الاقوامی منڈی۔ اسی طرح وقت کے لحاظ سے قلیل المیعاد اور طویل المیعاد منڈی کہی جاسکتی ہے۔

یومیہ مارکیٹ

قلیل المیعاد مارکیٹ وہ ہوتی ہے جس میں جلدی ضائع ہونے والی اشیاء یا روزمرہ کی اشیاء بکتی ہیں جیسے سبزی پھل پھول وغیرہ۔ یہ اشیاء روز کے روز مہیا ہوتی ہیں اور فروخت ہوتی ہیں۔ اگر فروخت نہ ہوں تو گل سڑ جاتی ہیں۔ اس طرح سبزی اور پھل منڈیوں کے نام سے یہ ہر شہر میں منظم ہوتی ہیں۔ دوکاندار آتے ہیں۔ سبزی اور پھل خریدتے ہیں اور پرچون کے حساب سے اپنی دکانوں پر بیچتے ہیں۔ یہ مارکیٹ ہر روز نیا مال مہیا کرتی ہے اور دن کے پہلے پہر میں بیشتر مال فروخت ہو جاتا ہے۔

طویل المیعاد مارکیٹ

اس سے مراد ان اشیاء کی مارکیٹ ہے جن کے فوری ضیاع کا خطرہ نہیں ہوتا اور طلب و رسد کے توازن سے قیمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ فروخت کنندہ ان اشیاء کو زیادہ دیر تک رکھ سکتا ہے۔ اور خریدار اپنی ضرورت کے مطابق جب چاہے جا کر خرید سکتا ہے۔

منڈیوں کی ایک اور تقسیم بھی کی جاتی ہے اور اس کا تعلق اشیاء صرف کی نوعیت سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دو قسم کی مارکیٹیں وجود میں آتی ہیں ایک عمومی اور دوسری خصوصی۔

عمومی مارکیٹ

عمومی مارکیٹ ایک عام اور مخلوط منڈی ہوتی ہے اس میں ہر قسم کی اشیاء مہیا ہوتی ہیں اور خریدار کو ایک بازار میں ضرورت کی مختلف چیزیں فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ قسم انسانی تاریخ کی قدیم ترین مارکیٹ ہے اور ہر زمانے میں انسان کو خدمت فراہم کرتی رہی ہے۔ جدید یورپ اور امریکہ میں سپر مارکیٹ، سپر سٹور یا جنرل سٹور کے نام سے جو بڑے بڑے سٹور قائم ہیں جن میں ہر قسم کی اشیاء ایک ہی چھت تلے مہیا ہو جاتی ہیں عمومی مارکیٹ کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ یورپ و امریکہ کے یہ سٹور تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے بڑی کشش کا باعث ہیں۔ زائرین اور سیاح ان سٹورز کی چمک دمک سے ایسے مرعوب ہوتے ہیں کہ ضروری اور غیر ضروری اشیاء سے اپنے صندوق بھر لیتے ہیں اور بعض اوقات ان کی قیمت سے زیادہ کرایہ ادا کرتے ہیں۔

خصوصی مارکیٹ

مخصوص منڈی کسی ایک شے کی خرید و فروخت سے متعلق ہوتی ہے۔ خصوصی منڈی میں عموماً ایک جنس یا متشابہ اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ جیسے غلہ منڈی، سونے کی منڈی، صرافہ بازار وغیرہ۔ اسی طرح تھوک کے کاروبار کی مخصوص مارکیٹیں ہوتی ہیں جہاں صرف دوکاندار ہی اشیاء کی خریداری کرتے ہیں اور پرچون کے حساب سے بیچتے ہیں۔ یورپ میں cash and carry کے نام سے بڑے سٹور ہیں جہاں سے صرف دکاندار خرید سکتے ہیں۔ انہیں خاص کارڈ مہیا کئے جاتے ہیں اسی حوالے سے خرید و فروخت ہوتی ہے عام آدمی اس مارکیٹ میں نہیں جا سکتا۔ ایسی مارکیٹ جہاں تھوک کے حساب سے مال فروخت کیا جاتا ہے تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ خصوصی مارکیٹ کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں صرف نمونے (Sample) رکھے جاتے ہیں اور خریدار اُن کے مطابق آرڈر دیتا ہے اور سٹور میں رکھے مال سے اسے مطلوبہ مال مہیا کیا جاتا ہے۔

مارکیٹ کی وسعت

مارکیٹ کی حیثیت اپنے محل وقوع اور اشیاء فروخت کے باعث متعین ہوتی ہے۔ اگر اشیاء کی خرو ید و فروخت محدود پیمانے پر ہے یعنی ان کی پیداوار بھی مقامی ہے اور ان کی کھپت بھی مقامی ہے تو مارکیٹ محدود ہو گی۔ لیکن اگر اشیاء فروخت کی مانگ وسیع ہے اور دوسرے علاقوں تک ان کی پہنچ ہے تو مارکیٹ وسیع ہو گی یعنی اشیاء فروخت اپنی پیداواری جگہ سے دور دراز علاقوں تک منتقل ہونگی۔ ملکی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر منتقل ہونے والی اشیاء وسیع مارکیٹ کا حصہ ہیں۔ جن اشیاء کی حیثیت آسانی سے متعین کی جا سکتی ہے جیسے نمونوں کے ذریعہ یا درجوں کی وجہ سے اور خریدار آسانی سے ان کی شناخت بھی کر سکتا ہے یا ان کی حیثیت بھی متعین کر سکتا ہے تو ایسی اشیاء کی مارکیٹ وسیع ہو گی۔ جیسے دھاتیں سرکاری تمسکات، صنعتی مصنوعات، مشینیں، حصص وغیرہ۔ جن اشیاء کی درجہ بندی ہو چکی ہوتی ہے ان کی مارکیٹ بھی وسیع ہو گی جیسے کپاس، پٹ

سن، چائے، تمباکو، کافی وغیرہ۔ مارکیٹ کی وسعت کا دارومدار اشیاء کی پائیداری پر بھی ہے وہ اشیاء جنہیں ذخیرہ کیا جا سکے اوران کے ضائع ہونے کا امکان کم ہوان کی مارکیٹ وسیع ہوتی ہے لیکن جو ضیاع پذیر اشیاء ہوں ان کی مارکیٹ محدود ہوگی جیسے سبزیاں، پھل، دودھ، وغیرہ۔ اگر چہ اب ریفریجریٹر کی ایجاد سے گوشت، مکھن، دودھ، اور دیگر ضیاع پذیر اشیاء کو ذخیرہ کرنے کے امکانات بڑھ گئے ہیں لہٰذا اب یہ بھی وسیع مارکیٹ کا حصہ بن گئے ہیں تاہم مالکان کے وسائل اوران کی حیثیت پر منحصر ہے کہ وہ کتنا اور کیسا مال ذخیرہ کر سکتے ہیں تکنیکی ترقی کی وجہ سے اب اشیاء کو ذخیرہ کرنا مشکل مسئلہ نہیں رہا۔ کولڈ سٹوریج کے نام سے ایسے سٹورز کا انتظام ہے جہاں کافی عرصہ کے لیے سامان رکھا جاتا ہے اور دکانداروں نے دکانوں کے ایک حصے کو ایک طرح کے کولڈ سٹوریج میں تبدیل کیا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر تاجر اپنے سامان کی حفاظت کا انتظام کر سکتا ہے۔

ذرائع نقل وحمل

مارکیٹ کی وسعت میں ذرائع نقل وحمل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قدیم زمانوں میں اونٹوں، گھوڑوں، خچروں، گدھوں اور بحری کشتیوں کے ذریعہ اشیاء فروخت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کیا جاتا تھا۔ پہیہ کی ایجاد نے وسعت میں مدد دی اور دور حاضر میں ریل، بحری جہاز، ہوائی جہاز اور ٹرکوں نے نقل وحمل میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اور پھر ذرائع ابلاغ میں ڈاک، تار، ٹیلیفون اور اب ای میل، فیکس اور انٹرنیٹ نے دنیا کے فاصلے سمیٹ دیئے ہیں۔ ذرائع نقل وحمل اور رسل رسائل میں نئی ایجادات نے مارکیٹ کی وسعت میں لامحدود اضافہ کیا ہے۔ مقامی سے ملکی اور ملکی سے بین الاقوامی سطح تک خرید وفروخت کا ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ مارکیٹ کی وسعت نے تو زمین کی طنابیں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ عالمی سرمایہ داری نے پوری دنیا کو ایک محدود مارکیٹ میں تبدیل کر دیا ہے جسے اب عالمی گاؤں (Global village) کا نام دیا گیا ہے۔

بنک

بینکنگ کا نظام مارکیٹ کی وسعت میں اضافے کا ایک اور سبب ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی تجارت میں اس کا کردار بہت اہم ہو گیا ہے۔ انتقال زر، استحکام زر، اور زر مبادلہ کے تعین میں مثبت سرگرمی وہ عناصر ہیں جو مارکیٹ کی وسعت میں ممد ومعاون ہیں بنکوں کا منفی رویہ نہ صرف معاشی عدم استحکام کا باعث بنتا ہے بلکہ تجارت کی ناکامی کا ذریعہ بھی اسی لیے ترقی یافتہ ممالک اپنے بنکوں کے نظام پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ بنکوں کی تنظیم، اس کے مالیاتی استحکام، شرح سود کا تعین، قرضوں کی وصولی اور کاروبار میں شمولیت وغیرہ وہ معاملات ہیں جو بنکوں کے نظام میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

تشہیر (Advertisement)

مارکیٹ کی وسعت اور تجارت کے استحکام میں تشہیر کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے بلکہ یوں کہیے کہ تشہیر جدید سرمایہ دارانہ

نظام کا اہم ستون ہے۔ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تشہیر کے ذریعہ اشیاء پیداوار کی طلب پیدا کی جاتی ہے اور اگر موجود ہو تو اسے بڑھایا جاتا ہے۔ حیات انسانی میں اخلاقی قدروں کی حفاظت کا خیال رکھنے والوں کے نزدیک یہ ایک شیطانی چال ہے جو انسان کے اندر ہوس، لالچ، خود آرائی اور خود نمائی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ سرمایہ داروں نے انسان کی قناعت پسندی اور اعتدال پسندی کی اخلاقی صفات کو تشہیر کے ذریعہ تباہ کیا ہے۔ تشہیر کے فحش اور غیر اخلاقی طریقے اختیار کر کے انسان کے سفلی جذبات اور مادی رجحانات کو ابھارا ہے۔ عورتوں کی عریاں و نیم عریاں پیش کاری و تصاویر، فوائد کے مبالغہ آمیز بیانات، جوئے اور لاٹری جیسے اقدامات سب اسی مقصد کے لیے ہیں کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ خریداری پر آمادہ کیا جا سکے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے تشہیر کے سادہ تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ تشہیر میں وہ تمام نفسیاتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں جن سے آرزوؤں اور امنگوں کو ابھارا جا سکے اور ان کو تسکین پر آمادہ کیا جا سکے۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے خریداری بڑھتی ہے اور سرمایہ دار پھلتا پھولتا ہے۔

فیشن اور نئے نمونے

مارکیٹ کی وسعت میں نئے فیشن، نئے ڈیزائن اور نئے نمونوں نے بھی کردار ادا کیا ہے۔ تشہیر میں کپڑوں کے نئے فیشن، لباس اور زیورات میں نئے ڈیزائن اور مشینری اور کاروں میں نئے ماڈل کو مارکیٹ کی وسعت میں اہم عنصر شمار کیا جاتا ہے۔ فیشن شوز (Fashion Shows) اور ماڈلنگ جدید تجارتی سرگرمیوں کا حصہ ہے اور تشہیر کا سارا دارومدار ماڈلنگ کی دلکشی پر ہے۔ انسان کی بہت سی نفسیاتی کمزوریاں اور مادی و جسمانی محرومیاں ان تشہیری حربوں کا ہدف ہوتی ہیں۔ تشہیر مال کی کھپت، طلب کے اضافے اور فروخت میں وسعت کا اہم ذریعہ ہے۔ جدید تجارتی حکمت عملی میں مارکیٹنگ (Marketing) ایک اہم شعبے بلکہ علم کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ علم تجارت میں اسے اہم نصابی جز قرار دیا گیا ہے۔

مسابقت

تشہیر کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ اچھا لگنا اور اچھا محسوس کرنا۔ (Looking good and feeling good) موجودہ سرمایہ دارانہ کلچر کا نعرہ ہے۔ انسان میں دوسروں سے بہتر ہونے کے اس احساس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ شخصیت کے سنوارنے، گھر کو آراستہ کرنے، اچھی سواری رکھنے، اچھا لباس پہننے اور مہنگے ہوٹلوں' کلبوں میں جانے کی آرزو نے مسابقت کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ انسان نہ بجھنے والی نار اشیاق، نہ محدود ہونے والی آرزوؤں اور تمناؤں اور نہ ختم ہونے والی معاشرتی سطحوں کے حصول میں سرگرداں رہتا ہے اور یہ تشہیر اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکاتی اور اس کے جذبہ مسابقت کو مہمیز لگاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں انسان نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا ہے اور خواہاں نخواہاں خریداری کے مرض

میں مبتلا ہوتا اور ابتلاء میں اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں سرمایہ دار کے لیے مارکیٹ کی وسعت کا باعث بنتا ہے۔ مارکیٹ کی وسعت سرمایہ دار کی ہوس زر کی تسکین کا ذریعہ اور عام آدمی کے لٹنے کا وسیلہ ہے۔ دونوں اپنے اپنے شوق میں مارکیٹ کی وسعت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور اب تو اس لوٹ میں ملک اور سلطنتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ منافع کمانے اور لٹنے کا یہ عمل عالمی سرمایہ داری کا سنہری جال ہے جس سے بچ نکلنا آسان نہیں ہے۔

معاشرتی استحکام

معاشرے میں امن وامان، ملک کے معاشی نظام میں استحکام اور لوگوں کے وسائل رزق میں اضافہ بھی مارکیٹ کی وسعت کا باعث بنتا ہے۔ اگر ملک اندرونی انتشار اور بیرونی خطرات سے محفوظ ہو۔ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو تو تجارت بڑھے گی۔ لوگ اپنا سرمایہ کاروبار میں لگائیں گے۔ پیداوار بڑھے گی تو منڈی میں وسعت پیدا ہوگی۔ حکومت کی پالیسی، ٹیکسوں کا نظام، ملکی استحکام اور بین الاقوامی تعلقات منڈی کو وسعت دینے کا باعث بنیں گے۔ حکومتوں کی غلط پالیسی، ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام، غیر ملکی قرضوں پر انحصار اور ملکی پالیسوں کی تشکیل میں بین الاقوامی اداروں کی مداخلت مارکیٹ کے لیے نقصان دہ ہے۔ جتنی پابندیاں لگیں گی، جتنے غیر یقینی حالات ہونگے اور جتنی غیر ملکی مداخلت بڑھے گی اتنی مارکیٹ محدود ہوگی۔ یہ استحکام حقیقی ہو تو ملک کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن یہ استحکام مصنوعی ہو تو ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ مصنوعی استحکام بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے قرض اور جابرانہ سیاسی پالیسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مارکیٹ کا ارتقاء

انسان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جو تحقیقات سامنے آئی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت سادہ سی زندگی سے آغاز کیا۔ قدرتی خوراک پر اکتفا کیا اور پھر آہستہ آہستہ خوراک اور رہائش کے بارے میں نئی راہیں اپنائیں۔ سادہ زندگی میں ضروریات سے شروع کیا اور بالآخر ایک پیچیدہ نظام زندگی پر آٹھہرا۔ تبادل اشیاء کا سلیقہ سیکھا پھر زر نقد کا تعین کیا اور اب کاغذی کرنسی پر اکتفا کیے ہوئے ہے۔ ان سب مراحل کو طے کرنے میں ان گنت مسائل و مشکلات کا سامنا کیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

Never the less trade, a regular series of acts of exchange is distinct feature in the life of primitive people, even the lowest, who lived by hunting and collecting forest products. The principle of reciprocal transfer of good, of giving and taking seems in fact to be deep rooted in human nature. (1)

---

(1) Encyclo Peadia of Britanica, 2/345

کرنسی بھی زر نقد ہی کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور اصل انقلابی قدم زر نقد کا تعین ہی ہے۔ اسی سے مارکیٹ کا استحکام شروع ہوا۔ مارکیٹ کے ارتقاء میں یہ سارے مرحلے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مراحل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جغرافیائی حدود مارکیٹ کے لیے ہمیشہ اہم رہی ہیں بلکہ مارکیٹ کا تعین اور اس کی محدودیت و وسعت کا دارومدار انہی جغرافیائی حدود پر تھا۔ اسی بنا پر مقامی، علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹ وجود میں آئی۔ دور حاضر میں مارکیٹ نے ایک نئی صورت اختیار کی ہے جو جغرافیائی حدود کی پابند نہیں اسے معاشی مارکیٹ کہتے ہیں۔

معاشی مارکیٹ

معاشی مارکیٹ ایک موہوم تصور ہے جو جغرافیائی حدود سے آزاد ہے اس میں فروخت کنندہ اور خریدار کسی خاص علاقہ میں محدود نہیں ہوتے بلکہ اس سے مراد عام رابطہ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ معاملات طے کرتا ہے۔ معاشی مارکیٹ جدید سرمایہ دارانہ نظام کی روح ہے۔ اس کی اساس اور اس کی قوت کا مظہر سٹاک ایکسچینج یا بازار حصص ہے جو بچت و تخمین پر مبنی ہے۔ جدید معاشی اصطلاح میں مارکیٹ قوتیں ہی قیمتوں کا تعین کرتی ہیں۔ اس کھیل کے کھلاڑی چند سرمایہ دار اور بینکار ہوتے ہیں جن کی مرضی سے بازار حصص کی قیمتوں کا تعین ہوتا ہے اور اسی سے معاشی سرگرمیوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ نظام ہے جس کی حقیقت کا ادراک صرف چند کھلاڑیوں کو ہے بقیہ دنیا کی حیثیت محض تماشائی یا پیداواری شئی کی ہے جسے سرمایہ تخلیق کرتا ہے اور اس کو منظم کرتا یا منتقل کرتا ہے۔ مارکیٹ کی یہ صورت فریب، دھوکہ دہی اور استحصال پر مبنی ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ پوری دنیا سے وسائل حیات کھینچ کر ترقی یافتہ ممالک تک پہنچ جائیں۔

مارکیٹ کا اسلامی تصور

اسلام انسانی تجربے کا ایک حصہ ہے تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اسلام ایک موثر قوت کے طور پر داخل ہوا اور اس نے حیات انسانی کو سنوارنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسلام جغرافیائی مارکیٹ کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی تنظیم و اصلاح میں مثبت کردار ادا کرتا ہے مارکیٹ میں لین دین اور معاملات طے کرنے میں فریب، استحصال اور جھوٹ کا کافی عمل دخل ہو چکا تھا اس لیے بازاری کلچر کی اپنی خصوصیات تھیں۔ حضور اکرمؐ نے اس کی اصلاح کے لیے عملی اقدامات کئے اور تجارت کو ایک معزز پیشہ قرار دیا۔ آپؐ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بازار ایک ناپسندیدہ جگہ بن گئی تھی اور شریف آدمی کے لیے وہاں جانا ایک مجبوری تھی۔ حدیث میں آتا ہے۔

اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ مَسَاجِدُ ھَا وَ اَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَا قُھَا۔ (۲)

---

(۲) مسلم، کتاب المساجد باب فضل الجلوس، ۲/۱۳۲

اللہ کے نزدیک محبوب ترین جگہیں مساجد ہیں اور مبغوض ترین جگہیں بازار ہیں۔

یہ بات اس لیے فرمائی کہ بازار میں جھوٹ کا چلن، بدی کا دور دورہ اور استحصال کا راج ہوتا ہے۔ ان اخلاقی کمزوریوں کا علاج کرلیا جائے تو تجارت ایک مقدس پیشہ بن جاتا ہے اور مارکیٹ ایک پسندیدہ جگہ۔ حضور اکرمؐ نے مارکیٹ کی اصلاح کے احکام عطا فرمائے جن سے صورت حال بدل سکتی ہے۔ عبداللہ بن رفاعہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

التجار يُحشَرُون يوم القيامة فُجاراً اِلّا مَنِ اتقى الله وَبَرَّ و صَدَقَ (۳)

قیامت کے دن تاجر فاسق کے طور پر اٹھیں گے الا یہ کہ انہوں نے اللہ کے تقویٰ، بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا ہو۔

جھوٹی قسموں کی ممانعت

آپؐ بازار میں تشریف لے جاتے اور ناپ میں کمی اور دھوکہ دفریب دہی سے عملاً ممانعت فرماتے۔ آپؐ نے جھوٹی قسموں سے منع فرمایا:

عن ابی قتادة قال: قال رسول الله ﷺ: اِيَّاكُم وَكَثْرَةُ الحَلف فى البَيْعِ فاِنّه يُنَفّق ثم يمحق (۴)

ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تمہیں خرید و فروخت میں زیادہ قسموں سے بچنا چاہیے کیونکہ اس سے بظاہر تجارت چلتی نظر آتی ہے مگر ایسا کرنا برکت کو مٹا دیتا ہے۔

کم تولنے اور ماپنے کے بارے میں قرآن نے واضح ہدایات دیں:

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ وَلَا تَبْخَسُو النَّاسَ اَشْيَاءَ هُمْ وَلَا تَعْثَوْافِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۵)

پیمانہ پورا بھرا کرو اور نقصان نہ کیا کرو اور ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو۔

صداقت اور ایفاء عہد

تجارت میں صداقت اور ایفاء عہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لیکن مارکیٹ میں بالعموم جھوٹ اور بدعہدی کا چلن ہوتا

---

(۳) دارمی، کتاب البیوع، باب فی التجار ۲/ ۲۴۷

(۴) مسلم، کتاب البیوع، باب النھی عن الحلف ۵/ ۵۶۔۵۷

(۵) الشعراء/ ۱۸۱۔۱۸۲

ہے حضور اکرمؐ نے صداقت اور ایفاء عہد پر زور دیا اور لین دین میں اس کا خیال رکھنا مفید قرار دیا۔ قرض تجارتی معاملات کا ایک حصہ ہے لیکن اس سلسلے میں عموماً کوتاہی ہوتی ہے۔ اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَرِمَ حَدَثَ فَكَذِبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ (٦)

آدمی جب مقروض ہوتا ہے، بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔

عن ابی سعیدؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ والصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ (٧)

ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: سچا اور امین تاجر (قیامت کے دن) نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا

ایفاء عہد کے بارے میں فرمایا!

لا دِيْنَ لِمَنْ لا عَهْدَ لَه (٨) جس کو عہد کی پاس داری نہیں اس میں ایمان نہیں۔

فاسد بیع

ایک مدت سے تجارت میں غلط طریقے در آئے تھے اور عرب تجار ان غلط طریقوں کو کاروباری زندگی کا حصہ کہتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان تمام طریقوں کو جن میں دھوکہ یا ایک فریق کا نقصان شامل ہو ممنوع قرار دیا۔ مارکیٹ کا سب سے فاسد طریقہ سود کا لین دین تھا جسے آپؐ نے حرام قرار دیا قرآن وسنت میں اس بارے میں جتنی وعید آئی ہے وہ نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ بدقسمتی سے دور حاضر کی مارکیٹ ان فاسد طریقوں سے بھری پڑی ہے۔ بنکوں کا پورا نظام سود پر قائم ہے۔ سٹہ اور جوا معاشی سرگرمیوں کا اہم حصہ ہے۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ

لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ آكِلَ الربا وَ مُوكِلَه وَ كَاتِبه وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ (٩)

رسول اللہؐ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، سود لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ تینوں برابر ہیں۔

احتکار کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

الْجَالِبُ مَرْزُوقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُونٌ (١٠) تاجر کو اللہ کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے۔

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: مَنِ احْتَكَرَ طَعَاماً أَرْبَعِيْنَ يَوْماً يُرِيْدُ الغَلاءَ فَقَدْ

---

(٦) بخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، ١/٢٠٢

(٧) ترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی التجار، ٣/٥١٥

(٨) مسند ٣، ١٣٥۔١٥٤

(٩) مسلم، کتاب البیوع، باب لعن اکل الربوا، ٥/٥٠

(١٠) ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الحکرة، ٢/٧٢٨

بَرِئی مِنَ اللّٰہ و برِیٔ اللّٰہ مِنہ (۱۱)

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص گرانی کی غرض سے چالیس دن تک غلہ کو روکے رکھے اس نے اللہ کے عہد کو توڑا اور اللہ بھی اس سے بیزار ہو گیا۔

رسول اکرم ﷺ نے ان تمام فاسد اور باطل راہوں کو بند کر کے صرف جائز اور پاکیزہ تجارت کو رہنے دیا تا کہ اسلامی معاشرے میں غیر صالح اجزاء راہ نہ پا سکیں۔ آنحضرتؐ کا انسانیت پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے تجارت کو پاکیزہ کیا اور اسے اخلاقی اور انسانی قدروں سے مالا مال کیا۔ حضور اکرمؐ کی اصلاحات سے مسلم مارکیٹ پر اخلاقی قدروں کا اثر غالب رہا۔ مسلمانوں نے تجارت میں صداقت اور حسن عہد کے شاندار نمونے چھوڑے ہیں۔ تاجروں کی اخلاقی تاثیر کی وجہ سے کئی قوموں نے اسلام قبول کیا اور کئی ملکوں کا اسلامی تشخص انہی سچے اور امانت دار تاجروں کا رہین منت ہے۔

عصر حاضر کی تجارت اور مارکیٹ حرام خوری، احتکار اور استحصال پر مبنی ہے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام فاسد بیع و شراء کے فروغ پر مبنی ہے اور بدقسمتی سے مسلمانوں نے بھی اس خوئے بد کو اپنا لیا ہے بلکہ فریب اور بدعہدی میں یہ غیر مسلم اقوام سے بھی بازی لے گئے ہیں اور خَسِرَ الدنیا والآخِرہ کا مصداق بن گئے ہیں۔ مارکیٹ کی اصلاح پر معاشرے کی اصلاح کا انحصار ہے۔ جو معاشرہ معاشی سرگرمیوں میں دیانت و امانت اور صداقت و حسن عہد کا خیال نہیں رکھتا اسے اخلاقی بگاڑ اور روحانی فساد سے کوئی چیز نہیں روک سکتی، بلکہ اس معاشرے کی عبادتیں بے روح اور دعائیں تاثیر سے محروم ہو جاتی ہیں۔ مارکیٹ کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے اور یہ عبادت سے کم نہیں۔ مارکیٹ دیانتداری کی تجربہ گاہ ہے۔ مارکیٹ افراد کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہے اور اخوت، انسان دوستی، شفقت و رحمت اور باہمی انس و محبت کا مرکز ہے۔ مارکیٹ ایک ایسا ادارہ ہے کہ اس کی درست تنظیم سے صحت مند ثقافت اور تمدن کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے مثبت اثرات سے معاشرے میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ باہمی اعتماد، اخوت اور دیانتداری پر مبنی مارکیٹ افراد اور معاشرے کو صالح بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ معاشرے سے ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، چور بازاری اور لوٹ کھسوٹ جیسی اخلاقی برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر مارکیٹ فساد زدہ ہے تو معاشی ناہمواریاں پیدا ہوں گی، حرص و ہوس کا دور دورہ ہوگا اور دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگی، غربت بڑھے گی طبقاتی کشمکش پیدا ہوگی، نفرتیں بڑھیں گی اور معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہوگا، مارکیٹ کسی معاشرے کی صحت و بگاڑ کی کسوٹی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں نے ہمیشہ تجارتی اخلاق اور کاروباری دیانت پر زور دیا ہے۔

......☆......

(۱۱) مشکاۃ، کتاب البیوع، باب الاحتکار ۲/ ۱۰۷؛ انسان کامل/ ۱۱۱

14

مسجد

مذہب انسان کا انفرادی تجربہ ہے اور اس کی تنظیم انسان کی اجتماعی سرگرمی ہے۔ انسان نے اپنی طویل اجتماعی زندگی میں توہم پرستی، مذہبی رسوم و رواج، خداؤں کی عبادت، مذہبی رہنماؤں کی تعظیم اور عبادت گاہوں کی تعمیر اور تزئین و آرائش کا انتظام کیا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے استھانوں سے لے کر عبادت گاہوں اور خانقاہوں تک مذہب کی اجتماعی سرگرمی کے کئی مظاہر ہیں۔ انسان نے اپنے توہمات کی تسکین اور روح کی تشفی کے لئے کئی مذہبی ادارے تشکیل دیئے ہیں۔ مندر، صومعہ (Simigog) کلیساء اور خانقاہوں کا وجود اس کی دلیل ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اسلام کو متعارف کرایا تو انسانوں کو یہ بتایا کہ پوری انسانی زندگی اور اس کی سرگرمیاں مذہبی علامت رکھتی ہیں لیکن مذہب کے تربیتی و تعمیری پروگرام کے لئے ایک مرکز کی حیثیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن و سنت نے اس مرکز کو مسجد کا نام دیا ہے۔ ہم اختصار کے ساتھ مسجد کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ مسجد: سَجَدَ یَسْجُدُ سے ظرف مکان ہے۔ ابن منظور نے لسان العرب میں مسجد کے تحت مختلف اقوال دیئے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک مسجد جیم کی زیر کے ساتھ ہے اور بعض اسے مسجد جیم کی زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں ابن العربی کہتے ہیں کہ مسجد بفتح الجیم ''محراب البیوت'' کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے سیبویہ کا خیال ہے کہ یہ مکان کا نام ہے اور اسم ہے اسے فعل یفعل کے وزن پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ زجاج نے مسجد کے معنی یہ بیان کئے ہیں۔

کل موضع یعبد فیه فهو مسجد قال النبی ﷺ جعلت لی الأرض طهوراً و مسجداً(۱)

ہر وہ جگہ جہاں عبادت ہوتی ہے وہ مسجد ہے نبی ﷺ نے فرمایا ہے زمین میرے لیے مسجد اور طاہر بنائی گئی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار کہتا ہے کہ مسجد کا لفظ یہودیوں کے ہاں مستعمل تھا یہ اصل میں آرامی زبان کا لفظ ہے۔ نبطیوں کے ہاں بھی اس لفظ کا استعمال پایا جاتا ہے اگرچہ نبطی اور قرآنی لفظ میں کوئی واضح رشتہ موجود نہیں۔ مقالہ نگار کے خیال میں یہ لفظ اسلام سے پہلے عبادت گاہوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بخاری کی کتاب الصلوٰۃ میں حبشہ کے گرجا کو مسجد کے نام سے پکارا گیا ہے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں مسجد کو عام عبادت گاہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک یہ مسلمانوں کی اصطلاح نہیں ہے بلکہ انہوں نے اہل کتاب سے لی ہے وہ لکھتا ہے۔

There is, therefore no question of word of specially Muslim creation. This is an entire agreement with Mohammad's original attitude to earlier religions just as Abraham was a Muslim. So David had a Masjid.(2)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ۱/۱۹۹ (۲) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مقالہ مسجد

مستشرقین کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر چیز کو اہل کتاب کی اصطلاح ثابت کریں اور اسلام کو اس کی نقل بتائیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اسلام سے پہلے مذاہب میں عبادت ہوتی تھی ان کے معبد تھے اور اگر ان معبدوں کو مسجد کے نام سے پکارا جاتا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں اور اگر ان کی اصطلاح اسلام میں آ گئی ہو تو بھی کوئی جرم کی بات نہیں اس لیے کہ ہم تمام مذاہب کا منبع خدا کی ذات مانتے ہیں لہٰذا ہر وہ چیز جو اس خدا سے صحیح نسبت رکھتی ہے وہ اسلام کی ہے اور اسلام اسے اپنانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ لیکن قرآن پاک نے معبدوں کے لیے جو اصطلاحی الفاظ استعمال فرمائے ہیں ان سے تو کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حج میں ان اصطلاحات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۳)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور گھٹواتا رہتا تو (اپنے اپنے زمانہ میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے۔

قرآن پاک میں مسجد کی اصطلاح کو مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسلمانوں کی مطلق عبادت گاہ۔ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسراء کے ذکر میں فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (۴)

پاک ہے وہ ذات جس نے ایک رات اپنے محبوب ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی۔

مسجد کی اہمیت و فضیلت

نبی کریم ﷺ کے ہاں مسجد کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مکی زندگی میں مسلمان مسجد حرام سے وابستگی رکھتے تھے لیکن کفار کی شدت کی وجہ سے وہ مسجد میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے اس لیے نماز کے واسطے انہوں نے مختلف جگہیں بنائی تھیں۔ نماز کو اسلام میں چونکہ بنیادی حیثیت حاصل ہے لہٰذا اس کے واسطے مسجد کا ہونا ضروری بات ہے۔ اگرچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے

جعلت لی الأرض مسجداً و طهورا (۵) میرے لیے زمین مسجد اور طاہر بنائی گئی۔

لیکن نظم اجتماعی کے لیے ایک مرکز کا ہونا ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلا کام تعمیر مسجد ہی کا کیا۔ مسجد بننے سے پہلے آپ ﷺ کی نماز کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔

(i) ایک یہ کہ جہاں نماز کا وقت آتا وہیں ادا فرماتے جیسا کہ مسلم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

---

(۳) الحج/۴۰ (۴) بنی اسرائیل/۱ (۵) مسند احمد ۴/۲۸۱ (حدیث/۲۷۴۲)

عن انس بن مالکؓ قال: کان النبی ﷺ یصلی قبل ان یبنی المسجد حیث ادرکته الصلوٰۃ(۶)

(ii) یہ کہ آپؐ ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں نماز ادا فرماتے تھے۔

(iii) آپؐ ابوامامہ کے گھر نماز پڑھتے جہاں انہوں نے چھوٹی سی مسجد بنا رکھی تھی۔

(iv) مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے آپ مسجد قبا میں نماز پڑھتے اور غالباً یہ عہد اسلامی کی پہلی مسجد ہے۔ مفسرین نے اسی مسجد کو اس آیت کا مصداق ٹھہرایا ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ(۷)

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس امر کی یقیناً زیادہ مستحق ہے کہ آپؐ اس میں قیام صلاۃ کریں۔

اس کے بعد مسجد نبویؐ کے لیے جگہ خریدی گئی اور آپؐ اپنے رفقاء سمیت اس کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کے اس طرز عمل کے نتیجے میں امت مسلمہ کے ہاں مسجد کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ مسلمان جہاں جہاں بھی گئے انہوں نے سب سے پہلے مسجدیں بنائیں۔ اسلامی معاشرے میں مسجد تمدنی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اس اہمیت میں بیت اللہ کو بڑا دخل ہے جسے قرآن پاک نے اولین معبد قرار دیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۸)

یقیناً وہ گھر جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ گھر جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں کے لوگوں کا رہنما ہے۔

ای مسجد وضع فی الارض اولاً قال: المسجد الحرام (۹)

ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلے مسجد حرام کو تیار کیا گیا۔

شہرستانی نے الملل والنحل میں بیت اللہ کے متعلق بحث کی ہے اس کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام جب زمین پر اترے تو انہوں نے اللہ کے حکم سے گھر بنایا۔ وہ لکھتے ہیں:

قد اختلفت الروایات فی اول من بناہ قیل انّ آدم لما ھبط إلی الأض (قلنا اھبطو) وقع إلی سراندیب إلی ارض الھند وکان یتردد فی الأض متحیراً بین فقدان زوجته و وجدان توبته حتی وافی حواء بجبل الرحمۃ من عرفات فعرفھا وصار الی أرض مکة و دعا و تضرع إلی الله حتی یأذن له فی بناء بیت یکون قبلة لصلاته و مطافاً لعبادته کما کان قد عھد فی

---

(۶) مسلم، کتاب المساجد، باب ابتناء مسجد النبی/۲۱۴؛ نسائی، کتاب المساجد، باب نبش القبور و اتخاذ ارضھا مسجداً/۹۶

(۷) التوبہ/۱۰۸ (۸) آل عمران/۹۶

(۹) بخاری، کتاب الانبیاء، باب ۱۰/۵۶۴؛ مسلم کتاب المساجد، مواضع الصلوٰۃ، باب المساجد/۲۱۲

السماء يعنى البيت المعمور الذى هو مطاف الملائكة و مزار الرو حانيين فأنزل الله عليه على مثل ذلك البيت على شكل سرادق من نور (۱۰)

اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ کعبہ کو پہلے کس نے بنایا؟ کہا گیا ہے کہ آدم علیہ اسلام جب زمین پر اترے تو ہندوستان کے علاقے سراندیپ میں ٹھہرے اور وہ اپنی بیوی کے نہ ہونے اور توبہ کے حصول کے لیے سرگرداں پھرتے تھے حتیٰ کہ عرفات میں جبل رحمت کے قریب انہوں نے حواء کو پالیا۔ اور اسے پہچان لیا۔ اور مکہ کی جانب چل دیئے۔ آپؑ نے اللہ سے دعا کی اور گریہ وزاری کی اللہ نے انہیں ایک گھر بنانے کی اجازت دی جو ان کی نماز کا قبلہ اور ان کی عبادت کا مطاف ہو۔ جیسا کہ وہ آسمان میں معمور تھا یعنی بیت المعمور: ملائکہ کا مطاف اور روحانیوں کی زیارت گاہ۔ تو اللہ نے اس گھر کو نور کی صورت میں ان پر نازل کیا۔

قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات میں مسجد کا یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۱۱)

ہم آپؐ کے چہرے کا (یہ) بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں اس لیے ہم آپؐ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے (تو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہروں کو اسی کی طرف کیا کرو۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ (۱۲)

اور ان بیبیوں سے اپنا بدن بھی مت لگنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف کرنے والے ہو مسجدوں میں۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ (۱۳)

اور ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب و (نواح) میں (کہ حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۴)

اور ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے جب کہ وہ لوگ (مسلمانوں کو) مسجد حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولی نہیں اس کے متولی تو متقیوں کے سوا اور کوئی بھی اشخاص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔

---

(۱۰) الملل والنحل، ۳/۲۵۰

(۱۱) البقرہ/۱۴۴ (۱۲) البقرہ/۱۸۷

(۱۳) البقرہ/۱۹۱ (۱۴) الانفال/۳۴

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَاللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۵)

مشرکین کی یہ لیاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جس حالت میں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کا اقرار کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے سب اعمال اکارت ہیں اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ ہاں اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں تو ایسے لوگوں کی نسبت توقع (یعنی) وعدہ ہے کہ اپنے مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو۔ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں۔ اور جو لوگ بے انصاف ہیں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ نہیں دیتا۔

سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِىْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۶)

وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ (محمدؐ) کو شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھ رکھی ہیں لے گیا تا کہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلائیں بے شک اللہ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِىْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۱۷)

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کے رستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے تمام آدمیوں کے واسطے مقرر کیا ہے کہ اس میں سب برابر ہیں اس میں رہنے والے بھی اور باہر سے آنے والے بھی اور جو شخص اس میں کوئی خلاف دین کا قصد ظلم (یعنی شرک وکفر) کرے گا تو ہم عذاب دردناک (کا مزہ) چکھائیں گے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ (۱۸)

---

(۱۵) التوبۃ/۱۷۔۱۹ (۱۶) بنی اسرائیل/۱

(۱۷) الحج/۲۵ (۱۸) الحج/۴۰

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ توڑتا رہتا تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کے دین کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے۔

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۹)

مسجدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲۰)

اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے منع کرے اور ان کے ویران ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے۔ ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم بھی نہ رکھنا چاہیے تھا (بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

مسجد کی اس اہمیت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے مسجد کی تعمیر، مسجد میں بیٹھنے اور مسجد میں آنے کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے بلکہ اسلامی معاشرے میں مسجد کو عزت و توقیر کا بلند تر مقام دیا ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: احب البلاد الی الله مساجد ها وابغض البلاد الی الله اسواقها (۲۱)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک تمام آبادیوں میں محبوب ترین مقامات مساجد ہیں اور بدترین بازار ہیں۔

عن عثمانؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من بنی مَسْجداً لِلّٰه له بنی الله له مثله فی الجنة و فی روایة بیتاً فی الجنة (۲۲)

حضرت عثمانؓ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے خداوند کریم اس کے لیے جنت میں ویسا ہی گھر بنائے گا۔ اور ایک روایت میں صرف گھر کا ذکر ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من غدا إلی المسجد أو راح أعد الله له نزلة من الجنة كلّما غدا أو راح (۲۳)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص دن کے اول حصہ میں یا آخری حصہ میں مسجد جائے اللہ

---

(۱۹) الجن/۱۸ (۲۰) البقرة/۱۱۴ (۲۱) مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ۱/۴۶۴
(۲۲) بخاری، کتاب الصلوٰۃ، ۱/۶۵ (۲۳) بخاری، کتاب الاذان، ۱/۹۱

تعالیٰ جنت میں اس کی مہمانی کا سامان کرتا ہے خواہ وہ صبح کو جائے یا شام کو۔

عن ابی موسی الأ شعریؓ قال: قال رسول الله ﷺ: اعظم الناس أجراً فی الصلوة أبعدهم إلیها ممشی فأ بعدهم والذی ینتظر الصلوة حتی یصلیها مع الامام اعظم أجراً من الذی یصلی ثم ینام (۲۴)

ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے زیادہ نماز کا ثواب اس کو ملتا ہے جس کا گھر سب سے دور ہو باعتبار مسافت کے اور جو شخص انتظار کرے نماز کا اور امام کے ساتھ نماز پڑھ کر جائے اس کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو (تنہا) نماز پڑھ کر سو رہے۔

عن کعب بن مالکؓ قال: کان لا یقدم النبی ﷺ: من سفر إلا نهاراً فی الضحی فاذا قام بدأ بالمسجد فصل فیه رکعتین ثم جَلَس فیه (۲۵)

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو عموماً چاشت کے وقت آتے اور سب سے پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے اور دو رکعت نماز پڑھتے پھر مسجد میں بیٹھتے۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال: قال رسول الله ﷺ: لا تشد الرحال الاالی ثلاثة مساجد: مسجد الحرام والمسجد الاقصی و مسجدی هذا (۲۶)

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم کجاووں کو نہ باندھو (یعنی ہرگز سفر نہ کرو) مگر تین مسجدوں کی طرف ایک مسجد حرام کی جانب دوسرے مسجد اقصیٰ کی طرف اور تیسرے میری اس مسجد (نبویؐ) کی طرف۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: مابین بیتی و منبری روضة من ریاض الجنة و منبری علی حوضی (۲۷)

ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ایک باغ ہے جنت کے باغوں میں سے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔

ان آیات واحادیث میں مسجدوں کی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے اور مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبویؐ کے متعلق خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ آنجناب ﷺ کو مسجد سے کس قدر تعلق تھا اس کا اندازہ کعب بن مالکؓ کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس میں آپؐ کے سفر سے واپسی کے بعد مسجد میں بیٹھنے کا ذکر ہے پھر آنحضرت ﷺ نے اپنی رہائش گاہ بھی مسجد کے ملحق بنائی گویا حضورؐ کسی صورت بھی مسجد سے دوری پسند نہیں کرتے تھے۔ مسجد کی اہمیت وفضیلت کے متعلق ہمیں کچھ ارشادات ان آداب میں بھی ملتے ہیں جو آپؐ نے مسجد کے ضمن میں بیان فرمائے ہیں۔

---

(۲۴) مسلم، کتاب الصلوٰۃ ۱، ۲۳۵/
(۲۵) مسلم، کتاب الصلوٰۃ ۱، ۲۴۸/
(۲۶) شرح السنۃ ۲، ۳۳۷/
(۲۷) بخاری ۲، ۷۷/

آداب مسجد

مسجد ابتداء سے ایک قابل احترام جگہ بن گئی تھی اور اس کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے خصوصی ہدایات فرمائیں۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار کہتا ہے:

''آغاز میں مسجد مسلمانوں کے ہاں عبادت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کے تقدس کا تصور دوسری صدی کی پیداوار ہے۔ جب کہ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے قریبی ربط ہوا تو مسلمانوں نے دیکھا کہ اہل کتاب اپنی عبادت گاہوں کا کس قدر احترام کرتے ہیں۔ اہل کتاب کے اس رویے نے مسلمانوں کے اندر احترام مسجد کے جذبات پیدا کئے۔''

فاضل مقالہ نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے مسجد کا تقدس تو مسلمانوں کے ہاں روز اول ہی سے تھا البتہ تقدس کی جو صورتیں اہل کتاب کے ہاں تھیں وہ مسلمانوں کے ہاں نہیں تھیں۔ اہل کتاب غلو کا شکار تھے اور ظاہر پرستی نے انہیں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں عبادت گاہوں کو سجانے اور سنوارنے کا دستور عام تھا جبکہ اسلام میں اعتدال اور سادگی تھی۔ اسلام معبد برائے معبد کا قائل ہی نہیں ہے وہ اس جگہ کو روحانی سکون کے لیے ضروری سمجھتا ہے ورنہ نبی کریم کا تو یہ ارشاد ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے اور ساری زمین کو میرے لیے مسجد بنا دیا گیا ہے اور سادگی اس لیے بھی کہ نگاہیں اگر عمارت کے رنگ و روغن میں الجھ جائیں تو ساری ریاضت و عبادت اکارت چلی جائے گی۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے مسجدوں کو یہود و نصاریٰ کے معبدوں کی طرح سجانے سے منع فرمایا ہے۔

مسجد کو جو تقدس حاصل ہے اس کے پیش نظر مسلمانوں کو وہ آداب بھی سکھائے گئے جن کے ذریعہ وہ مسجد میں داخلے، عبادت، اس کے احترام اور اس کے اندر جاری سرگرمیوں تک کے امور کو جان سکیں گے۔ مسجد سے تعلق اسلامی زندگی کی روح ہے اسی لیے حضور اکرمؐ نے اس تعلق کے تقاضوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

کتب حدیث میں مسجد کے آداب کے سلسلے میں یہ تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ ہم یہاں صرف چند امور کو بیان کریں گے:

بدنی طہارت

مسجد میں جانے کا اولین مقصد چونکہ عبادت ہے اس لیے ظاہری طہارت شرط ہے۔ جسم کا پاک ہونا اور کپڑوں کا پاک ہونا نماز کی شرط ہے اسی لیے مسجد کا پہلا ادب ہے کہ انسان پاک و صاف ہو۔ قرآن مجید میں آنجناب ﷺ کو جس طہارت کا حکم دیا گیا، اس سے یہ طہارت مستنبط کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۲۸)

اے جو چادر میں لپٹے ہوئے ہو اٹھو اور آگاہ کرو اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور

(۲۸) المدثر/۱۔۵

ناپاکی سے دور رہو۔

اسی لیے کسی جنبی کو مسجد میں داخلے کی اجازت نہیں جب تک کہ وہ غسل نہ کرے۔ چونکہ نماز کے لیے وضو لازمی شرط ہے اس لیے عام داخلے کے لیے بھی وضو مستحب ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت دی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ (۲۹)

اے ایمان والو جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔

مسجد میں داخل اور خارج ہوتے دعا پڑھنا

حضور اکرمؐ نے مساجد کو ریاض الجنۃ کہا ہے۔ مسجد روح کی بالیدگی کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا وسیلہ ہے اس لیے داخلے کے وقت اس کی رحمت اور نکلتے وقت اس کا فضل طلب کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ دعا کے الفاظ پر غور کرنے سے عبادت کی روح کا ادراک ہوتا ہے۔ آنجنابؐ سے منقول ہے:

عن ابی اسیدؓ قال: قال رسول اللهؐ: اذا دخل احدكم المسجد فليقل اللهم افتح لی ابواب رحمتك و اذا خرج فليقل اللهم إنی اسئلك من فضلك (۳۰)

ابو اسیدؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ دعا کرنا چاہیے۔ اے اللہ اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول۔ اور جب مسجد سے باہر نکلے تو یہ کہے: اے اللہ میں تجھ سے تیرا فضل چاہتا ہوں۔

مسجد کی صفائی

مسجد کو صاف ستھرا رکھنا اور اس کے پاکیزہ ماحول کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ مسجد کو ہر قسم کی گندگی اور میل کچیل سے محفوظ رکھیں نیز اس میں کوئی ایسی سرگرمی بھی نہ ہونے دیں جو اس کے روحانی ماحول اور دینی تشخص کو مجروح کرے۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ آؤ نیز فضول باتوں اور تفریح اور کاروباری سرگرمیوں سے اسے محفوظ رکھو۔

---

(۲۹) المائدہ/۶

(۳۰) ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، ۱/ ۔۶

عن جابرؓ قال قال: رسول الله ﷺ: من قال من اکل من ھذہ البقلۃ والثوم۔ و قال مرۃ من اکل البصل والثوم والکرّاث فلا یقر بن مسجدنا فان الملائکۃ یتاذی مما یتاذی منہ بنوآدم(۳۱)

جابرؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: جس شخص نے لہسن کو استعمال کیا اور ایک مرتبہ فرمایا: جس نے پیاز اور لہسن کھایا تو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتے اس چیز سے اذیت محسوس کرتے ہیں جس سے انسان اذیت محسوس کرتے ہیں۔

عن جابرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من اکل من ھذہ الشجرۃ المنتنۃ فلا یقربن مسجدنا فان الملائکۃ تتأذی منہ مما یتأذی منہ الناس(۳۲)

جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس بدبودار درخت میں سے کچھ کھائے یعنی لہسن اور پیاز میں سے تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے اس لیے کہ فرشتے بھی اس چیز سے اذیت پاتے ہیں جس سے انسان اذیت پاتے ہیں۔

عن انسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: البذاق فی المسجد خطیئۃ و کفار تہا دفنہا(۳۳)

انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔

عن ابی ذرؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: عرضت علی اعمال أمتی حسنہا و سیئہا فوجدت فی محاسن أعمالہا الأذی یماط عن الطریق و وجدت فی مساوی اعمالہا النخاعۃ تکون فی المسجد لا تدفن (۳۴)

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کے نیک و بد اعمال میرے سامنے پیش کیے گئے میں نے اس کے نیک اعمال میں راستہ سے اذیت دینے والی چیز کو دور کر دینا پایا اور بد اعمال میں مسجد کے اندر تھوکنا جس کو دفن نہ کیا گیا ہو۔

عن عمرو بن شعیبؓ قال: نہی رسول اللہ ﷺ عن تناشد الاشعار فی المسجد و عن البیع و الشراء۔(۳۵)

عمرو بن شعیبؓ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں اشعار

---

(۳۱) مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی من اکل ثوماً، ۱/۲۰۹ (۳۲) مسلم، کتاب المساجد، باب من اکل ثوماً او تصبلاً/۶۸

(۳۳) بخاری، کتاب الصلوٰۃ، ۱/۵۹ (۳۴) مسلم، کتاب الصلوٰۃ، ۱/۲۰۷

(۳۵) ترمذی، ابواب الصلوٰۃ، ۱/۴۳

پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور خرید و فروخت سے بھی۔

عن حسنؓ قال: قال رسول الله ﷺ: یاتی علی الناس زمان یکون حدثیهم فی المساجد فی امر دنیاهم فلا تجالسوهم فلیس لله فیهم حاجة (۳۶)

حسنؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ دنیا کی باتیں مسجدوں کے اندر کریں گے تو اس وقت تم ان لوگوں میں نہ بیٹھنا خدا کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔

غیر ضروری تزئین و آرائش کی ممانعت

مسجد کی عمارت سادہ اور پرشکوہ ہونی چاہئے کیونکہ مسجد کا ماحول ایک ان دیکھے معبود کے ساتھ ہم کلامی کا ذریعہ ہے۔ زیب و آرائش اور زینت و زیبائش اس روحانی تعلق میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی ہیبت اس کا جلال اور بندے کی عاجزی و انکساری اس ماحول کا تاثر ہے۔ عبادت میں اصل توجہ اس کی ذات تقدس مآب پر مطلوب ہے نہ کہ انسانی آراستگی و زیبائش پر۔ پہلے مذاہب کے پیروؤں نے اپنے معبدوں کو جس طرح مزین و زیبا کیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں مسجد کے شکوہ اس کی وسعت اور سادگی پر توجہ دی گئی یہی اسلام کی روح ہے۔ آنجناب ﷺ کے ارشادات سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے۔

لاتقوم الساعة حتی یتباها الناس فی المساجد (۳۷)

اس وقت تک قیامت نہیں قائم ہوگی جب تک لوگ مسجدوں کے بنانے پر باہمی تفاخر کا اظہار نہیں کریں گے۔

ماساء عمل قوم قط الا زخرفوا مساجدهم (۳۸)

کسی قوم کا عمل اس وقت تک خراب نہ ہوگا الا یہ کہ وہ مساجد کی زیبائش و زینت میں لگ جائیں۔

مسلمانوں نے بلاشبہ پرشکوہ اور شاندار مساجد تعمیر کی ہیں جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن کسی مسجد میں بھی اس طرح آرائش و زیبائش نہیں ملے گی جو دیگر مذاہب کے معابد میں پائی جاتی ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی تاثیر اور عقیدہ توحید کا مظہر ہے۔ آپؐ کے ایک ارشاد سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے:

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول اللهؐ: ما امرت بتشیید المساجد. قال: ابن عباس لتزخرفنها کما زخرفت الیهود و النصاریٰ (۳۹)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ کو مسجدوں کے بلند کرنے اور آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا

---

(۳۶) مشکاۃ، باب المساجد و مواضع الصلاۃ
(۳۷) ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب بناء المسجد
(۳۸) ابن ماجہ، باب تشیید المساجد ۱۰۶
(۳۹) [illegible]، کتاب الصلوۃ، ۱/۶۵

گیا۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے البتہ تم مساجد کی اسی طرح زینت کرو گے جس طرح کہ یہود و نصاریٰ اپنے عبادت خانوں کی کرتے ہیں۔

عن حکیم بن حزامؓ قال: نهی رسول الله ﷺ ان یستقاد فی المساجد و ان ینشد فیه الأشعار و ان تقام فیه الحدود۔(۴۰)

حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں قصاص لینے' اشعار پڑھنے اور حدود قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله: من سمع رجلا ینشد ضالة فی المسجد فلیقل فلا ردها الله علیك فان المساجد لم تبن لهذا(۴۱)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص یہ سنے کہ کوئی آدمی اپنی گمشدہ چیز کو مسجد میں ڈھونڈ رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ یہ کہے خدا اس کی چیز کو واپس نہ دے اس لیے کہ مسجدیں اس کام کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔

مسجد کا احترام

مسجد کے احترام کا تقاضا ہے کہ انسان اس میں سکون و اطمینان سے داخل ہو۔ حضور اکرمؐ کے ارشاد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں شامل ہوتے وقت بھی وقار و اطمینان کا لحاظ رکھا جائے بھاگ دوڑ نہ کی جائے۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔

وعلیکم بالسکینة فما ادرکتم فصلّوا(۴۲)

سکون وقار اختیار کرو اور جتنا حصہ نماز سے مل جائے اسے ادا کرو۔

جو چیزیں مسجد کے احترام اور اس کے وقار کے خلاف ہیں ان سے احتراز کیا جائے جیسے لڑائی جھگڑا فضول باتیں' شور شرابا وغیرہ۔ حدیث میں آتا ہے:

خصال لاتنبغی فی المسجد: لا یتخذ طریقاً ولا ینتهر فیه سلاح ولا یقبض فیه بقوس ولا ینشر فیه نبل ولا یسر فیه بلحم ولا یضرب فیه حدود ولا یقتصّ فیه من احد ولا یتخذ سوقاً (۴۳)

---

(۴۰) ابوداؤد،۳/۶۲۹ (۴۱) ابوداؤد، کتاب الصلوۃ/۶۸

(۴۲) مسلم، کتاب الصلوۃ، باب استحباب اتیان الصلوة بوقار وسکینه/۲۲۳

(۴۳) ابن ماجه، کتاب الصلوۃ، باب مایکره فی المساجد/۱۰۷

چند باتیں ایسی ہیں جنہیں مسجد میں کرنے کی اجازت نہیں: اس کو رستہ نہ بنایا جائے۔ ان میں ہتھیار تیز نہ کیے جائیں، کمان نہ پکڑی جائے اور تیر نہ پھیلائے جائیں، کچا گوشت لے کر نہ گذرا جائے، حد نہ قائم کی جائے، قصاص نہ لیا جائے اور اسے بازار نہ بنایا جائے۔

ایک حدیث میں ہے:

جنبوا مساجدکم صبیانکم و مجانینکم و شرائکم و بیعکم و خصوماتکم و رفع اصواتکم و اقامۃ حدودکم ورُسل سیوفکم (۴۴)

اپنی مسجدوں کو اپنے بچوں، فاترالعقل لوگوں، خرید و فروخت کے جھگڑوں، شور وغل، اقامت حدود اور سونتی ہوئی تلواروں سے بچا کر رکھو۔

مسجد کے اس احترام کے پیش نظر آپؐ نے فرمایا کہ مسجد میں چھوٹے بچوں کو ساتھ نہ لایا جائے۔ فقہاء حنفیہ کے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے اس طرح بعض مخصوص حالات میں عورتوں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں گو لوگ مسجد میں سوتے تھے لیکن یہ سب کچھ ضرورت کے تحت تھا یوں مسجد کو آرام گاہ بنا لینا درست نہیں ہے۔

مسجد کی آبادی

آداب مسجد میں سے ایک اہم ادب مساجد کی آبادی ہے۔ محض تعمیر و تزئین و آرائش پر توجہ دینے سے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہوتے۔ مسجدیں اس لیے بنائی گئیں کہ وہاں عبادت، تلاوت، ذکر اور تعلیم دین ہو۔ مسلمانوں کی غفلت شعاری کی وجہ سے اصل مقاصد گم ہو گئے۔ مسلمان معاشرے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے لہٰذا ہماری مسجدیں مقفل ہو گئیں حالانکہ مسجد سب سے بڑی پناہ گاہ اور جائے امن ہے۔ مسجدوں کا عبادت گزاروں، ذاکرین اور معتکفین کے لیے کھلا رہنا ہماری تہذیبی شناخت ہے۔ مسلمان معاشرے داخلی تضادات اور فرقہ پرستانہ نفرتوں کے باعث عدم تحفظ کا شکار ہیں اور عالمی کفر نے اپنی جارحانہ حکمت عملی سے انہیں خوف زدہ کر رکھا ہے۔ اس کا اثر مساجد پر بھی پڑا ہے۔ مساجد کی آبادی مسلم معاشرے کی روحانی قوت کی علامت ہے۔ جب تک مسجدیں آباد ہو کر اپنا کردار ادا نہ کریں گی اس وقت تک معاشرتی استحکام ممکن نہیں ہوگا۔

مسجد کی اقسام

اگرچہ مسجد بنیادی طور پر عبادت گاہ ہے اور اس اعتبار سے یکساں اہمیت کی حامل ہے تاہم مقام و مرتبہ کے اعتبار سے مساجد میں کچھ تفاوت ہے مثلاً مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبویؐ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس کے بعد مسجد قبا کو پھر

(۴۴) ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، باب مایکرہ فی المساجد/ ۱۰۷

جامع مسجد کو، پھر محلہ کی مسجد کو اس کے بعد مسجد البیت کو۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں مسجد کی یہ قسمیں پائی جاتی ہیں۔

(i) بنیادی مساجد (مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبویؐ)

(ii) قبیلوی مسجدیں۔

(iii) اہل کتاب کے معبد۔

(iv) یادگار مسجدیں۔

(v) مقابر اولیاء کی مسجدیں۔

(vi) مصلیٰ...... کھلی مسجدیں جہاں نماز استسقاء وغیرہ ادا کی جاتی ہے۔

مسجد کی حیثیت

قرآن وسنت سے مسجد کی اہمیت واضح ہو جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طویل تمدنی اور معاشرتی زندگی میں مسجد کی حیثیت بہت اہم رہی ہے۔ آنحضورؐ کے وقت سے لے کر موجودہ دور تک مسجد کا ادارہ (Institution) بعض اہم تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے اور اب اس کی وہ حیثیت نہیں رہی جو اسے حاصل تھی تاہم مسلمانوں کی پوری زندگی پر اس کی گہری چھاپ ہے۔ مسلمانوں کے ہاں مسجد کی حیثیت وہ نہیں رہی جو دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کی ہے۔ اسلامی معاشرے میں مسجد مختلف اعتبار سے مرکزی حیثیت کی حامل رہی ہے اور اس کی اس حیثیت میں مندرجہ ذیل چیزیں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں:

(i) مرکز عبادت (ii) سیاسی مرکز

(iii) انتظامی مرکز (iv) عدلیہ کا مرکز

(v) تعلیمی مرکز

ان تمام امور میں مسجد کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس کی دو وجوہ ہیں:

(i) مسلمانوں کے رہنمائے اول پیغمبر انسانیتؐ چوں کہ زندگی کے جملہ پہلوؤں میں واجب الاتباع ہیں اور آپؐ نے اپنے طرز زندگی میں مسجد کو مرکزی حیثیت دے کر رکھی تھی اور آپؐ کے ہر کام میں مسجد کا عمل دخل صاف دکھائی دیتا ہے اس لیے مسجد کے ساتھ آپؐ کی اس گہری وابستگی نے مسلمانوں کی زندگی کے پورے ماحول کو مسجد سے وابستہ کر دیا۔

(ii) دوسری وجہ اسلام کی انتظامی انفرادیت ہے اسلام پوری زندگی کو اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کے مطابق ڈھالنے کا نام ہے۔ یہاں مراسم عبودیت علیحدہ اور مستقل وجود کی حیثیت سے نہیں چلتے بلکہ انہیں زندگی کے جملہ پہلوؤں کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اسلام پوری زندگی کو اخلاق کے معیار پر قائم رکھنا چاہتا ہے یہاں جملہ اعمال کی بنیاد اخلاق ہے اور مسجد چونکہ دین و اخلاق کا نشان ہے اس لیے اسے مرکز بنا دینے کے معنی یہ ہیں کہ پوری زندگی اخلاقی رنگ میں رنگی جا چکی ہے۔ گو سیاسی زوال اور اخلاقی احساس کی کمی کے باعث مسجد کی یہ حیثیت اب برقرار نہیں رہی لیکن قرن اول میں یہ بہت نمایاں تھی۔ ذیل میں ہم ان حیثیتوں کا مختصر جائزہ لیں گے۔

مسجد مرکز عبادت کی حیثیت سے

مذہبی مرکز کی حیثیت سے مسجد کی سب سے بڑی خصوصیت نظام صلوٰۃ کا قیام ہے جس میں دن میں پانچ مرتبہ اجتماع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی جمعہ کا ہفتہ وار اجتماع ہے جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن و سنت میں نماز با جماعت اور نماز جمعہ کی جو فضیلت آئی ہے اس سے مسجد کی یہ حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات و احادیث سے اس کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

آیات

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۵)

اور تم لوگ نماز کو قائم کرو اور زکوۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (۴۶)

اور مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان کو دشوار نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ (۴۷)

اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز کے لیے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد میں (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید و فروخت اور ہر طرح کے دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں چھوڑ دو۔

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا (۴۸)

---

(۴۵) البقرۃ/۴۳ (۴۶) البقرہ/۴۵

(۴۷) الجمعہ/۹ (۴۸) المائدہ/۵۸

جب تم نماز کے لیے اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (۴۹) البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۵۰) اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔

احادیث

عن بريدةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: بشر المشائين فى الظلم إلى المساجد بالنور التام يوم القيامه (۵۱)

بریدہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں کو خوشخبری پہنچاؤ جو اندھیرے میں مسجدوں کی طرف جاتے ہیں کہ قیامت کے دن اس کے سبب ان کو کامل روشنی نصیب ہوگی۔

عن عثمان بن مظعونؓ قال يا رسول الله ﷺ: إئذن لنا فى الا ختصاء فقال رسول الله ﷺ ليس منا من خصى ولا اختصى إن خصاء امتى الصيام فقال إئذن لنا فى السياحة. قال: ان سياحة امتى الجهاد فى سبيل الله. فقال ائذن لنا فى الترهب قال: إن ترهب امتى الجلوس فى المساجد و انتظار الصلاة (۵۲)

عثمان بن مظعونؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو خصی ہونے کی اجازت دیجئے اس لیے کہ مجھ کو زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے) آپؐ نے فرمایا وہ شخص ہماری جماعت میں سے نہیں ہے جو کسی کی جنسی قوت ضائع کرے یا اپنی قوت ضائع کرے۔ میری امت کے لیے جنسی کنٹرول کرنا روزہ رکھنا ہے (روزہ رکھنے سے شہوت جاتی رہتی ہے) پھر عثمان بن مظعونؓ نے عرض کیا کہ مجھ کو سیر و سیاحت کی اجازت دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: میری امت کے لیے سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ پھر عثمانؓ نے عرض کیا مجھ کو ترک دنیا کی اجازت دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا میری امت کے لیے ترک دنیا صرف یہ ہے کہ وہ مسجدوں میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرے۔

عن ابى امامةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من خرج من بيته متطهرا الى صلوة مكتوبة فأجره كأجر الحاج المحرم ومن خرج الى تسبيح الضحى لا ينصبه إلا إياه فاجره كأجر المعتمر وصلوة على اثر صلاة لا لغو بينهما كتاب فى عليين (۵۳)

---

(۴۹) التوبہ/ ۱۰۸ (۵۰) آل عمران/ ۹۷

(۵۱) ترمذی، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فى فضل العشاء: ابن ماجه، كتاب الصلوة، باب المشى الى الصلوة/ ۱۱۱

(۵۲) شرح السنہ، ۲/ ۳۷۱ (۵۳) ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی فضل المشی/ ۹۲

ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص وضو کر کے اپنے گھر سے نکلے اور فرض ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف جائے اس کو اتنا ثواب ملے گا جتنا کہ احرام باندھنے والے حج کرنے والے کو ملتا ہے اور جو شخص کہ چاشت نماز کے لیے گھر سے نکلا اور خالص نماز چاشت کی نیت سے مسجد میں گیا اس کا ثواب عمرہ کرنے والے کے برابر ہے اور نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کر کے نماز پڑھنا اور اس درمیانی وقت میں بے ہودہ کلام نہ کرنا ایسا عمل ہے جو علیین میں لکھا جاتا ہے۔

المؤمن فی المسجد کالسمك فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفس (۵۴)

یعنی مؤمن مسجد میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں اور منافق مسجد میں اس طرح ہوتا ہے جیسے پرندہ پنجرے میں۔

ان آیات واحادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسجد مرکز عبادت ہے اور مرکز عبادت ہونے کی حیثیت سے اسے مندرجہ ذیل امور حاصل ہوتے ہیں:

(۱) روزانہ پانچ مرتبہ نماز کے لیے اور ہفتہ میں ایک دفعہ جمعہ کے لیے مسلمانوں کے اجتماع سے ان میں تنظیم، مساوات ہمدردی وشناسائی پیدا ہوتی ہے اور وہ پیش آمدہ جزوی مسائل باہم مل جل کر حل کر سکتے ہیں۔

(۲) گوشۂ سکون وطمانیت ہے۔

(۳) مقام ذکر ہے۔

(۴) شوکت اسلام کا اظہار ہے۔

(۵) یہاں مسلمان ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے غموں اور خوشیوں میں شریک ہوتے اور ایک دوسرے کی مشکلات کا ازالہ کرتے ہیں۔

(۶) مجلس وعظ ہے، قرآن پاک کی حفاظت کی جگہ ہے کہ رمضان المبارک میں یہاں پورا قرآن پاک سنایا جاتا ہے۔

عہد نبویؐ میں مسجد میں اصحابؓ صفہ اور دیگر صحابہؓ کے تعلیم وذکر کے حلقے ایک معروف امر ہے۔ ابن جبیر کہتے ہیں کہ مسجد نبویؐ میں صبح اور عصر کے وقت قراء کے حلقہ تلاوت قائم ہوتے تھے۔ اس وقت سے اب تک یہ مرکزیت قائم ہے۔

مسجد سیاسی مرکز کی حیثیت سے

سیاسی انتظام چونکہ دین کا لازمی جزء تھا اس لیے نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں سیاسی گفتگوئیں اور معاہدے یہیں کرتے۔ نیز کسی اہم سیاسی امر کی طرف توجہ دلانا ہوتی تو بھی مسجد ہی میں خطبہ ارشاد فرماتے۔ آپؐ کی اسی سنت کے اتباع میں صدر اول کے مسلمانوں میں نماز کی اقامت اور منبر پر بیٹھنا زمام اقتدار سنبھالنے کے مترادف تھا۔ ابوبکر صدیقؓ نے

---

(۵۴) کشف الخفا، ۲/ ۲۰۶

بیعت کے بعد پہلا خطبہ مسجد نبویؐ میں دیا اور اس کے بعد یہ طریق کار عام ہوا کہ برسر اقتدار آنے والا پہلے مسجد میں خطبہ دیتا پھر اس کے بعد انتظامی امور کی طرف توجہ دیتا بلکہ یہ خطبہ اس کے سیاسی طرز عمل کا آئینہ دار ہوتا۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتا ہے:

"It was inherited in the character of Islam that religion and politics could not be separated. The same individual was ruler and chief administrater in the two fields, and same building the Mosque was the center of gravity for both, politics and religion. This relationship found expression in the fact that the Mosque was placed in the center of the camp".(55)

بلاذری نے فتوح البلدان (۵۶) میں لکھا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے رملہ میں اپنا محل مسجد کے سامنے تعمیر کرایا تھا۔ مقریزی (۵۷) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صلاح الدین نے جامع عمرو میں عظیم مینار کے نیچے ایک منظرہ بنایا۔ خلیفہ مسجد کا خطیب ہوا کرتا تھا۔ ابن ہشام اور طبری (۵۸) نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ مسجد ہی سے عسا کر روانہ فرماتے اور یہیں پر جنگی مجالس کا انعقاد ہوتا۔ حاکم وقت کا خطبہ جنگ وصلح کے بارے میں مکمل ہدایات پر مشتمل ہوتا۔ عقد الفرید (۵۹) میں ہے: نتائج سے آگاہی بھی منبر ہی سے کی جاتی۔ قصاص عثمانؓ کے مطالبہ کی مہم مسجد ہی سے شروع کی گئی۔ مسجد کی یہ اہمیت گئے گزرے دور میں بھی قائم تھی اور وہ لوگ جن کے ظلم وفسق کی داستانیں ہماری تاریخ میں نمایاں ہیں وہ بھی مسجد سے بے نیاز نہ ہو سکے چنانچہ عبدالملک بن مروان نے عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف جنگی تیاری کے وقت مسجد ہی میں لوگوں سے امداد طلب کی تھی۔

حجاج اور زیاد کے مشہور خطبے بھی مسجد ہی میں دیئے گئے تھے۔ اس ساری تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسجد سیاسی مرکز کی حیثیت سے مسلمانوں کے زوال پذیر دور میں بھی مسلم رہی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

"In general the Mosque and particularly the Mimber was the Place where official proclamation were made, of course as early as the time of Prophet. Although the Mosque lost its old political importance in later history. It has never quite lost its character as the assembly or occasions of public importance".(60)

---

(۵۵) Encyclopaedia of Islam "Masjid".

(۵۶) ایضاً

(۵۷) ایضاً

(۵۸) ایضاً

(۵۹) ایضاً

(۶۰) ایضاً

مسجد عدالتی و انتظامی مرکز کی حیثیت سے

عوامی انتظام میں حضورؐ کے عہد میں دو چیزیں سب سے زیادہ اہم تھیں:

(i) بیت المال کی تنظیم

(ii) شکایات کا فیصلہ اور ازالہ۔

آنحضرتؐ کے عہد میں مال کی تقسیم' ہنگامی حالات میں رقم کی فراہمی' غرباء کی امداد اور انتظامی امور کے متعلق مختلف وفود سے مسجد میں گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ دینی طور پر مسلمانوں کے عہد زرین میں مسجد کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ حضورؐ نے مختلف غزوات کے لیے چندہ یہیں اکٹھا کیا تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم پر اعتراض کی صورت میں آپؐ نے یہیں وہ دلنشین خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس سے مسلمانوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔ دوسری اہم چیز شکایات کا ازالہ اور خصومات کا فیصلہ ہے۔ بخاری کی کتاب الخصومات میں وہ واقعات مذکور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ قانونی مسائل کا فیصلہ مسجد ہی میں فرمایا کرتے تھے۔ ابن قتیبہؒ نے معارف میں لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے عہد میں عبداللہ بن مسعود کوفہ کے منتظم مالیات اور جج تھے اور فیصلے مسجد ہی میں کیا کرتے تھے۔ بنی مخزوم کی اس خاتون کا فیصلہ بھی نبی کریم ﷺ نے مسجد نبویؐ ہی میں کیا تھا جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا۔ طبری (۶۱) نے لکھا ہے کہ ۱۲۳ھ میں مدینہ کے قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعقوبی کے بقول بغداد میں مشرقی حصے کا قاضی مسجد میں فیصلے کیا کرتا تھا۔ دولت فاطمیہ میں جامع عمرو (۶۲) کی شمالی ملحقہ عمارت قاضی کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ شیراز میں اسے جس عدالت میں پیش ہونا پڑا وہ مسجد میں منعقد ہوئی اور قاضی ایک نامور فقیہ تھا اس سلسلے میں کئی اور واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مسجد تعلیمی مرکز کی حیثیت سے

گردش زمانہ سے مسلمانوں کی حالت بدلتی رہی ہے اور اس کی وجہ سے نظام مساجد میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مسجد کی سیاسی' انتظامی اور عدالتی حیثیت کم ہوتی چلی گئی لیکن مسجد کی جن دو حیثیتوں پر کوئی فرق نہیں پڑا وہ اس کی مذہبی اور تعلیمی مرکزیت ہے۔ زوال پذیر دور میں بھی لوگ نماز پنجگانہ' نماز جمعہ اور عیدین کے لیے یہاں جمع ہوتے رہے اسی طرح تعلیمی سلسلے کا آغاز بھی مسجد ہی سے ہوتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر اسلام کی اگرچہ وہ حیثیت نہ رہی جو حضور ﷺ کے عہد میں تھی اور وسعت کار اور دیگر تمدنی' سیاسی اور معاشی اثرات کی وجہ سے انتظامیہ اور عدلیہ پر بھی مسجد کی گہری چھاپ قائم رہی۔ مسجد کی تعلیمی حیثیت کو اگر نقصان پہنچا ہے تو مغربی اقوام کے تسلط سے پہنچا ہے جنہوں نے لادینی

---

(۶۱) ایضاً

(۶۲) ایضاً

نظام تعلیم (Secular System of Education) کو رائج کر کے مسجد کی تعلیم کے طریق کار کو بیکار کر دیا حالانکہ ان کے اپنے نظام تعلیم میں چرچ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا کوئی مدرسہ اور کوئی یونیورسٹی چرچ سے خالی نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمان اپنی تعلیم و تربیت میں مسجد سے دور ہوا اور اس پر لادینی رجحانات غالب آئے اور اگر وہ مسیحی اسکولوں میں پڑھا تو عیسائی اثرات کے مطابق آدھا عیسائی اور آدھا مسلمان بنا۔ ابتدائی تعلیم کے نتیجے میں جو نقوش مرتب ہوتے ہیں وہ زندگی بھر سیرت کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک مفکر کے بقول جو بچہ ایک مرتبہ مسجد کے ماحول سے گزر جاتا ہے اس کے اندر کبھی نہ کبھی جذبہ خیر ضرور ابھرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد میں مسجد کی تعلیمی حیثیت بالکل واضح تھی اور وہی طرز عمل مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنا' مثلاً عہد نبویؐ میں مسجد نبوی کے اندر قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی' قرآنی آیات والفاظ کے معانی و مفہوم بیان کئے جاتے۔ حدیث کی تحصیل کے لیے لوگ دور دراز سے حاضر ہوتے۔ ابن ماجہ کی کتاب العلم (۶۳) کی ایک حدیث میں ہے کہ مسجد نبویؐ میں دو حلقے قائم تھے ایک حلقہ عابدوں زاہدوں کا تھا اور دوسرا علم حاصل کرنے والوں کا۔ آنجناب ﷺ کا گزر ہوا تو آپؐ زاہدوں کے حلقے کو چھوڑ کر متعلمین میں جا بیٹھے۔ اور فرمایا "انما بعثت معلماً"، تعلیم کتاب و حکمت آپ کو فرائض منصبی میں ملی تھی۔ لوگ عقائد' عبادات اور دوسرے معاملات کے بارے میں آپؐ سے علم حاصل کرتے۔ عمرؓ نے ۱۷ھ میں تمام ممالک کے اندر معلم روانہ کر کے ایک منظم تعلیمی نظام رائج کیا۔ تیسری چوتھی ہجری تک مسجدیں اہل علم سے بھری نظر آتی ہیں۔ مصر کی جامع عمرو میں ۴۳۹ھ کے لگ بھگ پانچ ہزار اشخاص روزانہ موجود رہتے۔ ان میں علماء طلبہ' قراء اور اجنبی لوگ شامل تھے۔ مسجد کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس کے ساتھ ملحقہ کمرے بنائے گئے جنہیں مکتب کا نام دیا گیا۔ اس دور میں مکتب اور مسجد ایک ہی چیز شمار ہوتے تھے۔ مدرسہ نظامیہ سے لے کر جامع ازہر تک' حسن بصریؒ کی مجلس علمی سے لے کر جامع نیشاپور تک مسجد بنیادی حیثیت کی حامل رہی ہے۔ ہم اپنی اس بات کو انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ کے ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

"We can therefore say definitely that Mosques was, from the beginning through centuries, educational institution. The learned men occasionally used to live in Mosques. The Mosques therefore, corresponded to Church, Town Hall and school and sometime Hostels.(64)

---

(۶۳) ابن ماجہ، مقدمہ، باب فضل العلماء/۳۵

Encyclopaedia of Islam "Masjid". (64)

انتظام مساجد

مسجد کی اس اہمیت کے پیش نظر اس کا انتظام بھی ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ تعمیر و انتظام مساجد میں بقول الماوردی افراد اور حکومتیں دونوں دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ شاہی مساجد براہ راست خلیفہ یا بادشاہ کے انتظام میں ہوتیں۔ بیت المال سے ان کے اخراجات پورے ہوتے۔ عام مساجد کے انتظام میں اجتماعی انفرادی طور پر معاشرہ شریک ہوتا۔ مسجد کے متعلق ایک واضح حکم یہ بیان کیا گیا کہ یہ وقف ہیں کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتیں۔ صرف انتظامی حد تک ایک آدمی یا چند اشخاص کچھ اختیارات کے مالک ہوسکتے ہیں۔ مسجد کے انتظام میں سب سے اہم شخصیت امام کی ہے جس کی ذات سے مسجد کی آبادی اور مسجد کی بہتری وابستہ ہے۔ احادیث میں امام کی یہ صفات بیان ہوئی ہیں:

(i) امام تعلیمی اعتبار سے بلند مقام پر فائز ہو **(اعلمهم و اقرأهم)** تعلیم سے مراد دینی تعلیم ہے اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ وقت کے متداول علوم پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

(ii) صورت اور سیرت کے اعتبار سے بہتر ہو۔

(iii) لوگوں پر اس کا اثر ہو۔ یعنی اسے معاشرتی مقام حاصل ہو۔ امام کے علاوہ موذن اور خدام وغیرہ بھی مساجد کے نظم کا لازمی جزء ہیں۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں مساجد کے ساتھ وقف جائدادیں تھیں تاکہ یہ خود کفیل ہوں۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اوقاف کے اعتبار سے سب سے زیادہ نمایاں مصر ہے وہاں سب سے زیادہ اوقاف پائے جاتے ہیں۔

دور حاضر میں انتظام مساجد کئی مرحلوں سے گذرا ہے۔ گذشتہ تین صدیاں مسلمانوں کے سیاسی و عسکری زوال اور استعماری طاقتوں کے غلبے کی صدیاں ہیں۔ ان ادوار میں مسجدیں ریاستی سرپرستی سے محروم ہوگئیں۔ مسلم اوقاف ضبط کر لیے گئے اور بیشتر مسجدیں مسلمانوں کی انفرادی توجہ کی محتاج ہوگئیں۔ الحمد اللہ اس دور میں مسلمان علماء وائمہ اور اصحاب خیر کے تعاون سے مسجدوں کو آباد رکھنے میں کامیاب رہے۔ محلہ کی مسجدوں کی دیکھ بھال اہل محلہ کرتے رہے اور بڑی مسجدوں کے لیے کمیٹیاں اور انجمنیں تشکیل پاتی رہیں۔ رضا کارانہ مدد کے تحت یہ مسجدیں چلتی رہیں۔ جہاں اوقاف استعماری دست برد سے بچ گئے وہاں ان کے انتظام کے لیے انجمنیں کام کرتی رہیں۔ برصغیر میں سب انتظام انہی خطوط پر چلتا رہا۔ نئی مسجدیں بھی تعمیر ہوتی رہیں اور پرانی مسجدوں کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہی۔ البتہ عالم عرب کے حالات نسبتاً بہتر ہیں۔ جزیرہ نما عرب استعماری تسلط سے محفوظ رہا لیکن جہاں استعماری تسلط تھا وہاں بھی مسلمان اپنی مسجدوں کی حفاظت میں کامیاب رہے۔ صرف فلسطین ایک ایسا خطہ ہے جہاں صیہونیوں نے کسی اخلاقی و دینی قدر کا لحاظ نہیں رکھا اور مسجد اقصیٰ جیسی جگہ کی بھی ناکہ بندی کی۔

استعمار سے آزادی کے بعد مسلمان ریاستوں نے تھوڑی بہت دلچسپی لی ہے اور بعض مساجد کے انتظام میں مساعدت کی ہے۔ چونکہ جدید مسلم ریاستیں قومی ریاستیں ہیں، منتظمین اور حکمران اکثر و بیشتر سیکولر ہیں اس لیے مسجدوں کی خدمات بھی اسی طرح کی نہیں ہیں جو مسلمانوں کے غالب سیاسی نظام میں تھیں۔ محراب و منبر کی آزادی حکمرانوں کو ہمیشہ کھلتی رہی ہے اور خطباء دائمہ مساجد پر حکمرانوں کی طرف سے ہمیشہ ایک طرح کی نگرانی رہی ہے۔ قومی ریاستوں کے حکمران مسجد کے ادارہ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کے کردار کو محدود کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ پاکستان میں ایوبی دور میں محکمہ اوقاف قائم کیا گیا اور تمام بڑی مساجد کو اوقاف کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ خطباء کو ہدایات دی گئیں کہ وہ حکومتی پالیسیوں کی تشہیر کریں۔ حریت پسند خطباء نے ان ہدایات کو ناپسند کیا اور حتی الامکان محراب و منبر کی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس دور میں حکومت کی طرف سے خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں تقریریں کرنے کی ہدایات آئیں تو لاہور کے بعض خطباء نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس پر بعض نوجوان خطباء کو اوقاف کی ملازمت سے فارغ کیا گیا اور خطبہ دینے سے روک دیا گیا۔

برصغیر پاک و ہند کے علماء کی روایت حریت اور آزادی فکر کی روایت ہے لہٰذا ابھی تک کوئی حکومت مسجدوں کو پوری طرح کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اب انتہا پسندی کے الزام کی آڑ میں بین الاقوامی لادینی قوتوں کے دباؤ سے ارباب اختیار بعض اقدامات کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں لیکن امید ہے کہ مسجد کی آزادی برقرار رہے گی۔ عالم عرب میں مسجدیں مکمل طور پر حکومتوں کے کنٹرول میں ہیں وہاں خطیب سرکاری ملازم ہوتا ہے اور کسی سرکاری پالیسی پر لب کشائی نہیں کر سکتا۔ سرکاری انتظام میں مساجد کی ظاہری حالت بہت اچھی ہے لیکن ان کا قائدانہ کردار اور رہنمائی کی حیثیت صفر ہے۔ پاکستان کی مساجد کا ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ تقسیم ہے۔ ہر مسجد لازماً کسی فرقہ کی ہوتی ہے اور وہ فرقہ اپنی مسجد کو دوسرے فرقے کے خلاف مورچے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ جدلیاتی مسائل اور نفرت انگیز تقاریر ان مساجد کے روحانی کردار کو مجروح کر رہی ہیں۔ اہل دین کی دل آزار تقریریں، طعن آمیز خطبات اور سوقیانہ زبان نے لادین عناصر کو جرأت دی کہ وہ مساجد کو پابند کریں۔ خدا کرے کہ اہل دین ہوشمندی کا مظاہرہ کریں اور مساجد کی آزادی محفوظ رہے۔

......☆......

مدرسہ

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے جن اداروں کو منظم کیا اور ان کے ذریعہ اجتماعی زندگی کے تسلسل کو قائم رکھا ان میں تعلیم کا ادارہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تعلیم دراصل ایک نسل کے تجربات کو دوسری نسل میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ معلومات بہم پہنچانے کے سادہ سے عمل نے ایک انتہائی پیچیدہ اور وسیع نظام کو بنیاد فراہم کی ہے۔ تعلیم کی ایک سطح تو خاندانی معلومات اور مہارتوں کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے تک محدود تھی۔ دوسری سطح عام معلومات کو معاشرے تک پہنچانے پر مشتمل تھی اور تیسری سطح خاص معلومات کو خاص لوگوں تک پہنچانے سے متعلق تھی جیسے حکمران گروہ اور مذہبی گروہ کی تعلیم۔ حضور اکرم ﷺ تاریخ انسانی میں منفرد تحریک تعلیم کے شروع کرنے والے ہیں۔ آپؐ نے تعلیم کو انسان کا بنیادی حق اور مسلمان کا بنیادی فریضہ قرار دیا۔ آنجنابؐ نے تعلیم کو عام کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی امت مسلمہ نے اسے ایک ادارے کی صورت میں منظم کیا۔ مکتب اور مدرسہ اس کی اداراتی صورت ہے۔ مسلمانوں نے تعلیم کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا اور مدرسہ کی تنظیم کے سلسلے میں جو کام کیا اسے ہم آئندہ صفحات میں قدرے تفصیل سے بیان کریں گے۔

مکتب اور مدرسہ مسلم اجتماعی ادارات میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مکتب اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لکھا پڑھا جاتا ہے کسی معاشرے کے اجتماعی شعور اور انفرادی تشخص کے ارتقاء کا دارومدار زیادہ تر مکتب و مدرسہ پر ہے۔ جو ماحول مکاتب و مدارس کا ہوگا وہی ماحول کسی نہ کسی طرح پورا معاشرہ اپنائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے تعلیمی نظام اور تعلیمی درسگاہوں کی عظمت پر بہت زور دیتی ہے۔ مکتب اور مدرسہ میں چونکہ بنیادی چیز علم ہے اس لیے ہم سب سے پہلے علم کا اسلامی تصور واضح کرتے ہیں۔

علم اور اس کی فضیلت

قرآن وسنت میں علم کی فضیلت و اہمیت کا ذکر بکثرت موجود ہے اللہ تعالیٰ معلم ہے اور انبیاء کرامؑ معلمین ہیں۔ انسانی فضیلت اور عظمت کا راز بھی علم میں ہے۔ آدمؑ کو فرشتوں پر فوقیت دینا اس کے علم ہی کی بنیاد پر تھا۔ قرآن پاک میں ہے کہ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے وہ علم دیا تھا جو فرشتوں کو حاصل نہیں تھا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱)

اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے اسماء کا علم دیا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں پھر فرمایا کہ مجھ کو ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے عرض کیا آپ تو پاک ہیں ہم کو تو وہی کچھ علم ہے جو آپ نے

(۱) البقرہ ۲:۳۱-۳۲

ہمیں سکھایا بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق ارشاد فرمایا کہ میں علم دیتا ہوں۔

اَلرَّحْمٰنُ۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۲)

رحمان نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (۳)

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنے رب کا نام لے کر پڑھیں جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ آپ قرآن پڑھیں اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصب نبوت میں تعلیم دینے کے منصب کو خصوصی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴)

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی (کی باتیں) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۵)

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کا تزکیہ کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶)

---

(۲) الرحمٰن/۱۔۴ (۳) العلق/۵۔۱

(۴) الجمعہ/۲ (۵) ال عمران/۱۶۴

(۶) البقرۃ/۱۲۹

اے ہمارے پروردگار اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجیے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب کی اور حکمت کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں بلاشبہ آپ ہی غالب القدرۃ کامل الانتظام ہیں۔

قرآن پاک میں انسانوں کے فرق مراتب کو بیان کرتے ہوئے صاحبان علم کو فضیلت دی گئی اور جہالت کو ناپسند کیا گیا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ (۷)

آپ کہیے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۸)

اللہ تعالیٰ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کرے گا اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا (۹) آپ یہ دعا کیجیے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا دیجیے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۱۰)

پھر ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ (یہ) لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ یہ لوگ اپنی (اس) قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس واپس آئیں ڈرائیں اور تا کہ وہ احتیاط رکھیں۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۱۱)

اور خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں واقعی اللہ زبردست ہے بڑا بخشنے والا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۱۲)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں علم والے ہی سمجھتے ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۱۳)

بلکہ وہ کھلی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا۔

کتب احادیث میں حضور اکرم ﷺ کے بہت سے اقوال مروی ہیں جن سے علم کی فضیلت واہمیت واضح ہوتی ہے۔

---

(۷) الزمر/۹ — (۸) المجادلہ/۱۱
(۹) طٰہٰ/۱۱۴ — (۱۰) التوبہ/۱۲۲
(۱۱) فاطر/۲۸ — (۱۲) العنکبوت/۴۳
(۱۳) العنکبوت/۴۹

ان میں سے چند ایک کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عن عبداللہ بن عمروؓ ان رسول الله ﷺ مر بمجلسين فى مسجده فقال: كلاهما على خير و أحدهما أفضل من صاحبه أما هئو لاء (عباد) فيدعون الله ويرغبون اليه فان شاء اعطاهم وان شاء منعهم. وأما هئو لاء (علماء) فيتعلمون الفقه و يعلمون الجاهل فهم افضل و انما بُعِثتُ معلما (يعلمهم الكتاب ثم جلس فيهم) (۱۴)

عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد نبویؐ میں منعقد تھیں۔ آپؐ نے فرمایا دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں مجلسوں یا جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے دوسری جماعت سو وہ دینی بصیرت حاصل کر رہی ہے اور جاہلوں کو علم سکھا رہی ہے لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں (یہ کہہ کر) پھر آپؐ بھی ان میں بیٹھ گئے۔

عن امامة الباهلیؓ قال: ذكر لرسول الله ﷺ رجلان احدهما عابد والآ خر عالم. فقال رسول الله ﷺ فضل العالم على العابد كفضلى على ادنا كم. ثم قال رسول الله ﷺ: إن الله وملائكة واهل السماوات والا رض حتى النملة فى جحرها و حتى الحوت لَيُصَلُّون على معلم الناس الخير (۱۵)

ابو امامۃ الباہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جن میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عالم عابد پر ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ میں تم میں سے ادنیٰ آدمی پر فضیلت رکھتا ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور مچھلیاں اس کے لیے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی سکھاتا ہے۔

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد (۱۶)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک فقیہ (عالم دین) شیطان کے مقابلے میں ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔

عن ابى هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: خصلتان لا تجتمعان فى منافق: حسن سمت و فقه فى الدين. (۱۷)

ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو عادتیں ایسی ہیں جو منافق میں یکجا نہیں ہوتیں۔ ایک تو خلق

---

(۱۴) سنن الدارمی، باب فضل العلم والعالم، ۱/۲۹ (۱۵) ترمذی، ابواب العلم، ۲/۹۳

(۱۶) ایضاً (۱۷) ایضاً

نیک ہے اور دوسری دینی سمجھ۔

عن أنسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع (۱۸)

حضرت انسؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے (گھر سے) نکلے وہ جب تک کہ گھر واپس نہ آجائے خدا کی راہ میں ہوتا ہے۔

قال رسول الله ﷺ خیر کم من تعلم القرآن و علمه (۱۹)

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

عن قیس بنؓ کثیر قال: کنت جالساً مع ابی الدرداءؓ فی مسجد دمشق فجاء رجل فقال: یا اباالدرداء انی جئتك من مدینة الرسول لحدیث بلغنی انك تحدث عن رسول الله ﷺ ما جئت لحاجة. قال: فانی سمعت رسول الله ﷺ یقول: من سلك طریقاً یطلب فیه علماً سلك به طریقاً من طرق الجنة. وان الملائكة لتضع اجنحتها رضاً لطالب العلم و ان العالم لیستغفرله من فی السموات و من فی الأرض والحیتان فی جوف الماء. و إن فضل العالم علی العابد كفضل القمر لیلة البدر علی سائر الكواكب. وان العلماء ورثة الأنبیاء و ان الأنبیاء لم یورثوا دیناراً و لا درهماً و إنما ورثوا العلم فمن أخذه أَخَذَ بحظ وافر (۲۰)

قیس بن کثیر کہتے ہیں میں دمشق کی مسجد میں ابو درداءؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا اے ابو درداءؓ! میں رسول اللہ ﷺ کے شہر مدینہ سے یہ سن کر آیا ہوں کہ تمہارے پاس ایک حدیث ہے جس کو تم رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہو اور کوئی غرض بجز اس کے میرے یہاں آنے کی نہیں ہے (ابو درداءؓ نے) کہا۔ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کے لیے سفر اختیار کرے اللہ اس کو بہشت کے راستہ پر چلاتا ہے اور فرشتے (دین کے) طالب علم کی رضامندی کے لیے اپنے پروں کا اس پر سایہ ڈالتے ہیں اور عالم کے لیے ہر وہ چیز جو آسمانوں کے اندر ہے اور جو زمین پر ہے استغفار کرتی ہے اور (یہاں تک کہ) مچھلیاں بھی پانی کے اندر مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی کہ چودھویں رات کا چاند ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ عالم پیغمبروں کے وارث اور جانشین ہیں اور انبیاء کا ورثہ دینار اور درہم نہیں ہیں بلکہ ان کا ورثہ علم ہے جس کا وارث (انہوں نے) عالم کو بنایا ہے تو جس شخص نے علم کو حاصل کیا اس نے کامل حصہ پایا۔

---

(۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً

(۲۰) ترمذی، ابواب العلم، ۲/۹۳

کتاب و سنت میں معلمین کی فضیلت اور علم کی عظمت کا کافی ذکر موجود ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلیم و تعلم کی طرف رجوع تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے واضح ارشادات نے اس جذبہ کو اور تقویت دی۔ سب سے پہلا مکتب اور مدرسہ مسجد نبویؐ تھی۔ صحابۂ کرامؓ وہاں بیٹھ کر نبی کریم ﷺ سے بھی علم حاصل کرتے تھے اور ایک دوسرے سے بھی۔ اصحاب صفہؓ تو تعلیم و تعلم کے لیے معروف تھے اور مسجد نبویؐ بھی درسگاہ کا نمونہ پیش کرتی تھی۔

آغاز و ارتقاء

اسلام کے دور اول میں مسجد نبویؐ مدرسہ بھی تھی اور اس کا یہ فریضہ بہت نمایاں تھا۔ تمام تعلیمی کوششیں مسجد کے ساتھ وابستہ تھیں۔ مساجد میں حلقۂ درس ہوتا۔ مساجد کے ساتھ کتب خانوں کا بھی انتظام ہوتا۔ مسجد کے ساتھ ملحقہ کمروں میں طلبہ کی رہائش کا اہتمام ہوتا اور علماء کا بیشتر وقت مساجد ہی میں گزرتا تھا۔ مسجد نبویؐ تو پہلی درسگاہ تھی ہی اس کے بعد بھی کئی ایک مساجد علمی مرکز کے اعتبار سے بہت مشہور ہوئیں خصوصاً جامع منصور، جامع دمشق اور جامع عمروؓ ان تینوں مساجد میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ علم حاصل کرنے آتے۔ جامع منصور کا مدرسہ اتنا اہم تھا کہ خطیب بغدادی نے حرم شریف میں تین چیز دل کی دعا مانگی تھی ان میں سے ایک یہ تھی کہ اسے جامع منصور میں تدریس کا موقع ملے۔ (۲۱) مشہور نحوی امام الکسائی بھی یہیں درس دیتے تھے اور ان کے درس میں الفراء الاحمر اور الاخفش شریک ہوا کرتے تھے۔ (۲۲) جامع دمشق بھی اسی طرح کا علمی مرکز تھا۔ ابن جبیر کہتے ہیں کہ اس مسجد میں درس کے متعدد حلقے قائم تھے اور اساتذہ کے لیے معقول مشاہرے کا انتظام تھا۔ انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ مسجد کے مختلف حصوں میں مالکی اور شافعی حلقہ ہائے درس علیحدہ تھے۔ (۲۳) جامع عمرو کی تعمیر ۲۱ھ میں ہوئی۔ ۳۸ھ میں یہاں مجالس درس کے ساتھ عدالتی فیصلے بھی ہوتے تھے۔ مقریزی (۲۴) نے لکھا ہے کہ شہر میں ایک وباء پھوٹ پڑی تھی اور اس حادثے سے پہلے اس مسجد میں درس کے کوئی چالیس حلقے تھے۔ اس مسجد کے آٹھوں زاویوں میں مختلف علمی مجلسیں ہوتی تھیں تین زاویے بالخصوص مشہور تھے: زاویۂ امام شافعی، زاویۂ مجدیہ، زاویۂ صاحبیہ، شافعی اور مالکی اساتذہ کے درس زیادہ تھے۔ حدیث اور فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں ادبی مجلسیں بھی قائم ہوتی تھیں۔ طبری نے ۳۵۳ھ میں یہاں ایک حلقہ قائم کیا تھا جہاں مشہور شاعر الطرماح کے کلام سنانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ (۲۵)

ایک مدت تک یہ نظام چلتا رہا کہ مسجدیں ہی مدرسہ کا کام دیتیں اور پورا نظام تعلیم مسجد ہی کے گرد گھومتا تھا پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ مستقل درسگاہیں معرض وجود میں آگئیں۔ گو مسجدیں اپنا یہ کردار برابر ادا کرتی رہیں لیکن مستقل

---

(۲۱) تاریخ بغداد، ۱/ ۱۰۸

(۲۲) معجم الادباء، ۴/ ۲۷۳

(۲۳) الرحلہ/ ۲۷۳

(۲۴) الخطط، ۲/ ۲۱۶

(۲۵) معجم الادباء، ۴/ ۲۷۳

مدارس نے اپنا کام بالکل علیحدہ طریق پر شروع کیا۔ وان کریمر نے اس تفریق کا سبب ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''علم کی ترقی وتوسیع کے باعث ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جس کے لیے مجرد علمی فضیلت کی خاطر معقول زندگی بسر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ علم کی مزید توسیع کی غرض سے اور ایسے حضرات کے لیے وظائف کا انتظام کرنے کی خاطر مدرسے قائم کئے گئے۔ مسجدوں میں عام طور پر قرآن وحدیث اور فقہ وفلسفہ سے متعلق تعلیم وتدریس ہوتی لیکن علمی ترقی کے پیش نظر دنیوی علوم کو بھی ساتھ ملانا تھا اس لیے ضرورت پیش آئی کہ علیحدہ مدارس قائم کئے جائیں''۔ (۲۶)

علیحدہ مدارس

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کے مطابق پہلا مستقل مدرسہ الحاکم نے ۳۹۵ھ میں بنایا جسے وہ دارالحکمۃ کہتا تھا۔ الحاکم چونکہ فاطمی تھا اس لیے شیعہ نظم میں دارالعلم یا دارالحکمۃ کی اصطلاح علمی ادارے کی حیثیت سے چل نکلی۔ الازھر بھی اسی فاطمی دور کی یادگار ہے شیعہ سنی اختلاف کی وجہ سے یہ مدارس مناظرانہ کوششوں کا مرکز بن گئے اس لیے سنی ریاست کو مدارس کا علیحدہ انتظام کرنا پڑا۔ انسائیکلو پیدیا آف اسلام کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔

While the institution called Dar-al-ilm developed in Fatimide Countries into center of Shia propaganda the Madrasa grew up in the cast out of similar institution(۲۷)

ڈاکٹر احمد شبلی اپنی کتاب تاریخ تعلیم وتربیت میں لکھتے ہیں:

''ضرورت زمانہ اس کا باعث تھی۔ عراق، شام اور مصر میں بویہ اور فاطمی خاندانوں کو اقتدار حاصل تھا چونکہ یہ دونوں خاندان عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھے لہٰذا وہ شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور بعض حالات میں اپنے عقائد اپنی رعایا پر زبردستی ٹھونستے تھے (۲۸) ان دونوں خاندانوں کے زوال کے بعد سلجوقی اور ایوبی خاندان برسراقتدار آئے یہ دونوں عقائد اہل سنت والجماعت پر عامل تھے۔ انہوں نے ردعمل میں ایسے مدرسے جاری کئے جہاں دین حق کی صحیح تعلیم دی جاتی تھی اور یہ قدرتی بات ہے بیشتر مدارس میں دینی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔'' (۲۹)

محرم ۴۴۷ھ میں سلجوقیوں نے بغداد فتح کیا تو سنی عقائد کا غلبہ ہوا۔ سلجوقی بادشاہوں نے عقائد کی تعلیم وتبلیغ کے ساتھ ساتھ دنیوی تربیت کا بھی انتظام کیا۔ اسلامی دنیا میں مدارس کی توسیع وترقی میں الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر نظام الملک کا بڑا دخل ہے۔ اس نے بغداد اور نیشاپور میں شاندار کالج قائم کئے۔ نظام الملک کی پیروی میں نورالدین زنگی

(۲۶) Khuda Bakhsh, Islamic Civilization/258

(۲۷) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مقالہ مکتب

(۲۸) الذھبی، تاریخ دول الاسلام، ۱/۱۷۱

(۲۹) احمد، تاریخ تعلیم وتربیت اردو ترجمہ/ ۱۰۲

نے دمشق اور اس کے نواح میں مدارس کا سلسلہ شروع کیا۔ ایوبی خاندان کے تحت مصر میں مدارس کا جال بچھ گیا جغرافیہ کی کتابوں اور سفرناموں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ مقدسی نے چار مدارس کی بڑی تعریف کی ہے۔ لیکن ان مدارس کے ساتھ مسجد کا الحاق لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ (۳۰)

(i) البیہقیہ۔ نیشاپور ۴۸۳ھ میں امام بیہقی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔

(ii) سعیدیہ۔ نصر بن سبکتگین نے ۳۸۹ھ میں جب وہ اس علاقے کا گورنر تھا، اسے قائم کیا۔

(iii) اصفہانیہ۔ ابو اسحاق اصفہانی کے نام سے موسوم ہوا۔

(iv) نظامیہ۔ نظام الملک طوسی نے امام الحرمین کے لیے بنوایا تھا۔

یہ مدارس نیشاپور، بغداد اور بلخ میں بہت مشہور ہوئے اسی طرح خلیفہ مستنصر کا مدرسہ مستنصریہ ۶۳۱ھ میں قائم ہوا۔ اس میں چاروں فقہی مسالک پڑھائے جاتے تھے۔ ایک استاد کے پاس کم از کم پچھتر طالب علم ہوتے۔ قرآن و حدیث کے علاوہ اس میں دیگر تمام علوم و فنون کے شعبے قائم تھے۔ اس مدرسہ کی انتظامی کیفیت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس میں ہسپتال، لائبریری، باورچی خانہ، حمام اور تفریح کے لیے ایک باغ کا ذکر ملتا ہے تفصیلات میں یہ بھی ملتا ہے کہ اس کے مرکزی دروازے پر ایک بہت بڑی گھڑی کا انتظام تھا جس سے اوقات کے تعین کا اہتمام کیا جاتا۔ اسی طرح دمشق میں مدرسۃ النوریہ الکبری چھٹی صدی ہجری میں قائم ہوا تھا اس کی تفصیل احمد شلبی نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ انہوں نے ابن جبیر کے الرحلہ سے ایک بیان نقل کیا ہے، جو اس مدرسے سے متعلق ہے۔

یہ دنیا کے بہترین کالجوں میں سے تھا اور اس کے انتظام میں مندرجہ ذیل شعبے تھے۔ (۳۱)

ایوان، مسجد، اساتذہ کی آرام گاہ، طلبہ کے کمرے، منتظم کا مکان اور اس کے ساتھ باورچی خانہ اور اجناس وغیرہ اشیاء کے گوداموں ایسے ضروری امور کا بھی انتظام تھا، ان مدارس میں مشہور اساتذہ آکر پڑھاتے تھے۔ (۳۲) ان کے علاوہ جید علماء نے اپنے مکانوں میں درس و تدریس کا کام شروع کر کے نئی قسم کے مدرسوں کی بنیاد رکھی جہاں طالبان علم طویل منزلیں طے کر کے دور دراز علاقے سے پہنچتے تھے۔ بعض اوقات ان مدارس میں بھی درس و تدریس کے الگ کمرے ہوتے جہاں علمی بحثیں ہوتیں۔ فاصلیہ، جیلانیہ، قطبیہ اور ناصریہ وغیرہ اکثر مدارس کے نام ان اساتذہ ہی کے نام سے مشہور ہیں جنہوں نے انہیں قائم کیا تھا۔ جن مدارس نے ہماری تہذیبی و تمدنی زندگی میں اہم مقام حاصل کیا انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(i) سرکاری (ii) غیر سرکاری

ان مدارس کی درجہ بندی بھی تھی، مثلاً:

(i) ابتدائی مدارس (ii) ثانوی مدارس (iii) تخصص کے مدارس

---

(۳۰) ایضاً (۳۱) ایضاً/۱۱۳ (۳۲) ایضاً/۱۱۵۔۱۱۶

مدارس ابتدائیہ

مدارس ابتدئیہ میں دو شعبے تھے ایک وہ جہاں قرآن پاک حفظ کرایا جاتا اور دوسرے وہ جہاں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا۔ بچوں کے ان مدارس میں انہی دو امور کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ دلائی تو ابتداء میں اکثر معلم یہودی تھے لیکن جلد ہی مسلمانوں نے اسے سنبھال لیا۔ کتابت کا کام آپؐ نے بڑے لوگوں کے سپرد کیا تھا۔ عرب معاشرے میں بچوں کے استاد کی حیثیت اونچی نہ تھی۔ اسے غلام سمجھا جاتا تھا اسلام نے اس میں اصلاح کی اور بچوں کے بعض اساتذہ بہت اونچے مقام پر پہنچے مثلاً جبیر بن حیاء، حجاج بن یوسف اور مشہور شاعر طرماح وغیرہ۔ ان اساتذہ کی عزت میں اس وقت خاطر خواہ اضافہ ہوا جب آزاد مدرسے قائم ہوئے۔ ان ابتدائی مدارس میں زبان اور قرآن کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ بچوں کے مدرسے کو عام طور پر مکتب کہا جاتا تھا۔

مدارس ثانویہ

ثانوی مدارس میں ذرا اونچے درجے کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا۔ اس درجہ سے علوم متداولہ کی تدریس کا آغاز ہوتا تھا۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں دو قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ۔ علوم کی اس تقسیم سے یہ متعین کیا جا سکتا تھا کہ اس مدرسے کا مزاج کیا ہے۔ چنانچہ اس نظام میں مندرجہ ذیل مدارس پائے جاتے ہیں۔

دینی مدارس

جن مدارس میں علوم عقلیہ ونقلیہ پڑھائے جاتے تھے انہیں دینی مدارس کہا جاتا تھا۔ ان علوم عقلیہ ونقلیہ میں سے یا تو کسی ایک پر زیادہ زور دیا جاتا تھا یا دونوں کو یکساں اہتمام کے ساتھ پڑھایا جاتا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تربیت کا بھی انتظام تھا۔ بعض اوقات انہی مدارس میں تربیت کا مخصوص اہتمام ہوتا اور بعض اوقات اس کے لیے مستقل مراکز قائم کئے جاتے۔

خانقاہیں

ایسے مستقل مراکز کو خانقاہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا جہاں قرآن وسنت کے عملی پہلو کو اپنا کر افراد کے اندر نافذ کرنا تھا گو سیوطی نے خانقاہ اور مدرسہ کو ایک ہی عنوان کے تحت درج کیا ہے تاہم ان کا الگ تشخص قائم رہا صلاح الدین ایوبی نے ۵۶۹ھ میں ''دار السعد السعداء'' بنائی جس میں کم وبیش چار سو صوفی رہتے تھے۔

فنی مدارس

جن مدارس میں طب، ہندسہ اور تعمیرات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی انہیں فنی مدارس کا نام دیا جاتا تھا۔ اگرچہ نصاب تعلیم ایسا تھا کہ وہ بیک وقت دینی و دنیوی ضروریات کو پورا کرتا تھا تاہم تخصص کے لیے کچھ فرق رکھا جاتا تھا۔

تخصص کے مدارس

مدارس کی ایک قسم وہ تھی جہاں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی، جیسے حدیث و رجال کی خصوصی تعلیم یا لغت و زبان پر تحقیقی کام۔ اس قسم کے مدارس دراصل شخصیات کے ساتھ وابستہ تھے ہر فن کا کوئی بلند پایہ عالم ہوتا جو اس فن پر خصوصی حلقہ قائم کرتا اور طلبہ اس سے استفادہ کرتے۔

اساتذہ کا مقام

ان مدارس میں استاد کو کیا مقام حاصل تھا؟ اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوتا ہے جو اساتذہ کے احترام ان کی تنخواہوں اور ان کی رہائش کے متعلق بیان ہوئے ہیں۔ اس نظام تعلیم میں یہ ضروری تھا کہ طلبہ کسی نہ کسی استاد کی خدمت میں رہ کر براہ راست علم حاصل کریں اور بعض حضرات تو یہاں تک کہتے تھے کہ بے استاد طالب علم بے دین ہے۔ احمد شلبی نے مصعب بن زبیر، امام شافعیؒ اور اخوان الصفاء کے وہ اقوال نقل کئے ہیں جو انہوں نے استاد کی اہمیت و ضرورت پر کہے ہیں۔

(i) لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس میں سے بہترین بات منہ سے نکالتے ہیں، جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بہترین چیز سیکھ لیتے ہیں اور جو کچھ سنا اس میں سے بہترین بات لکھ لیتے ہیں لہٰذا اگر تمہیں علم کی تلاش ہے تو اسے کسی کے ہونٹوں سے حاصل کرو اس طرح تمہیں چیدہ چیدہ اور برگزیدہ علم حاصل ہوگا (مصعب بن زبیر)۔ (۳۳)

(ii) جو شخص صرف کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے اسے وہ امتیاز حاصل نہ ہوگا جس کی اسے ضرورت ہے (امام شافعیؒ) (۳۴)

(iii) کیونکہ ہر شخص کی قوت سے باہر ہے کہ وہ صرف اپنی ہی کوشش سے علم حاصل کرے، اس لیے ہر طالب علم کے لیے اس استاد کی ضرورت ہے جو حصول علم، تعمیر سیرت اور عقائد و اعمال میں رہنما کا کام دے۔ (۳۵)

آغاز کار میں اساتذہ رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین بلکہ بعد تک کے علماء اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہ لیتے اور مفت تعلیم دیتے۔ کچھ مدت کے بعد جب تعلیم کا انتظام حکومتوں نے اپنے ذمہ لیا تو مخصوص

---

(۳۳) المحاضرات الابیار بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ/۱۶۶

(۳۴) تذکرۃ السامع (ابن جماعہ)/ ۸۷، بحوالہ تاریخ و تربیت اسلامیہ/۱۶۶

(۳۵) ایضاً

نظریات کی تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ چنانچہ الازہر اور دار الحکمۃ وغیرہ اس ضرورت کی پیداوار ہیں۔ اسی زمانے سے مدارس کے لیے تنخواہ دار علماء اور لائبریرین رکھے گئے لیکن اس وقت علماء مجبوراً تنخواہیں قبول کرتے۔ نظامیہ کالج کی صدارت کے لیے جب ابو اسحاق شیرازیؒ کو نامزد کیا گیا تو وہ افتتاح کے دن تشریف نہ لائے بلکہ بیس روز کے بعد آئے جب کہ نظام الملک نے ان کے شکوک و شبہات دور کیے۔ اس وقت سے تعلیم و تعلم میں حکومت کا عمل دخل شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی تنخواہوں کا انتظام رائج ہوا۔ اب بھی تاریخ میں وہ دستاویزات محفوظ ہیں جن کے ذریعہ مبلغین، مدرسین اور علماء سے کیے گئے وعدوں کا پتہ چلتا ہے۔

اساتذہ کی معاشرتی حیثیت

اساتذہ کی معاشرتی حیثیت کا تعین بھی اس امر میں ہے کہ اساتذہ کس قسم کے تھے۔ یہ بھی انسانی زندگی کا المیہ ہے کہ عملی میدان میں اس گروہ کو، جو انسانی ذہن کے ارتقاء اور انسانی شعور کے نشوونما کا باعث ہے، کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ قرآن وسنت نے استاد کی حیثیت کو بہت نمایاں کر کے بیان کیا ہے لیکن مسلمانوں کی ابتدائی علمی تاریخ میں اساتذہ کے بارے میں ہمیں وہ معلومات نہیں ملتیں جن کی بنیاد پر ان کی معاشرتی حیثیت کو بلند اور ان کے مقام و مرتبہ کو قابل رشک قرار دیا جا سکے۔ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں اساتذہ کی تین قسمیں ملتی ہیں۔

(i) معلمین اطفال۔ جو معلم یا کتاب کہلاتے ہیں۔

(ii) اتالیق۔

(iii) معلمین مساجد و مدارس: مسجد و مدرسہ میں تعلیم دینے والے۔

ان میں سے سب سے کم حیثیت بچوں کے مدرس کی تھی۔ جاحظ نے البیان والتبیین (۳۶) میں معلمین اطفال کے متعلق لکھا ہے۔

(i) مدرسوں، گڈریوں اور ان لوگوں سے جو عورتوں میں بیٹھتے اٹھتے ہیں مشورہ نہیں لینا چاہیے۔

(ii) حماقت تین جگہ پائی جاتی ہے۔ درزیوں میں، مدرسوں میں اور جولاہوں میں۔

(iii) مدرسہ کے میاں جی سے بھی زیادہ احمق۔

ان اقوال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ معلموں کے متعلق عام رجحانات کیا تھے۔ ان کی معاشرتی حیثیت اونچی نہیں تھی کیونکہ وہ دست نگر تھے۔ معاشرے کا ردی عنصر اس پیشے کو اختیار کرتا تھا، یہ دراصل جاہلی معاشرے کا اثر تھا ورنہ اسلام نے تو اس کو ختم کر کے اساتذہ کی حیثیت کو بلند کیا تھا۔ اتالیق کا مقام نسبتاً اونچا تھا۔ اعلیٰ مضامین کے اساتذہ اور نظامیہ کالجوں کے پروفیسروں کا بڑا اعزاز تھا اور وہ لوگ بھی بہت بلند تصور کیے جاتے تھے جو بے نیازی سے درس و تدریس

---

(۳۶) البیان والتبیین، ۱/۱۴۵

کا کام کرتے تھے۔ ان سے تو امراء تک خوف کھاتے تھے۔ دراصل قرن اول میں قرآن و حدیث پر معاوضہ لینا ناپسند کیا جاتا تھا۔ اور وہ لوگ جو معاوضہ لیتے تھے گھٹیا سمجھے جاتے تھے۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ چاپلوسی اور فرماں پذیری حصول دولت اور خوشحالی کے ذرائع ہیں اور ایک خوددار انسان ہمیشہ افلاس کی زندگی بسر کرسکتا ہے لیکن ضمیر فروشی نہیں کرسکتا۔ (۳۷) جب نظام الملک طوسی نے نظامیہ کالجوں کے لیے تنخواہوں اور اوقاف کا سلسلہ شروع کیا تو علماء کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا بہرکیف تنخواہوں کا یہ سلسلہ چلا اور مدارس میں خوشامدی اور خوددار ہر قسم کے اساتذہ اپنی شخصی صلاحیتوں اور ذاتی کردار کی خوبیوں کی وجہ سے بلند تر معاشرتی مقام پر بھی فائز رہے اور اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے سبب کم تر درجہ پر بھی برقرار رہے۔ لیکن ایک بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ سب کچھ ناقص معاشرتی نظام کے سبب تھا ورنہ معلم کی حیثیت قرآن و سنت کے ارشادات کے مطابق بہت ہی بلند ہے کیونکہ خدا اور اس کا رسول ﷺ بھی معلم ہیں۔

اساتذہ کے فرائض

قلقشندی نے "صبح الاعشیٰ" میں مقرر (استاذ کے ہم معنی) کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ تیاری کے بغیر کوئی بات نہ کرے۔ پہلے خیالات کو مرتب کرے پھر ایسے الفاظ کا انتخاب کرے جو فصیح، سلیس اور شائستہ ہوں (۳۸) امام غزالی نے معلم کے یہ فرائض بیان کیے ہیں:

(i) طلبہ کے ساتھ شفقت سے پیش آئے اور ان کے ساتھ اپنی اولاد جیسا سلوک کرے۔ (۳۹)

(ii) آنحضرت ﷺ کی مثال سامنے رکھ کر ترویج علم میں کوشش کرے اور کسی معاوضے کی توقع ہرگز نہ کرے۔ (۴۰)

(iii) حتی الوسع اپنے شاگردوں کو بھی یہی نصیحت کرے کہ وہ اس وقت تک سند (۴۱) فضیلت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں جب تک اس کے اہل نہ ہو جائیں۔ (۴۲)

(iv) اپنی توجہ طلبہ کی فضیلت علمی ہی پر مرتکز نہ کرے بلکہ ان کے کردار پر بھی پوری پوری توجہ دے اور ان کی کسی بے جا حرکت کی صورت میں ان کو نرمی سے سرزنش کرے۔ (۴۳)

---

(۳۷) مقدمہ/۲۷۵

(۳۸) قلقشندی، صبح الاعشیٰ، ۲/۳۱۶

(۳۹) احیاء علوم الدین، ۱/۴۶

(۴۰) ایضاً

(۴۱) سند کا سلسلہ سب سے پہلے حدیث میں شروع ہوا۔ بعد میں دیگر فنون میں بھی سند چل نکلی۔ دسویں صدی کے اوائل میں طبیبوں کو بھی سند حاصل کرنا پڑتی ورنہ وہ علاج نہیں کرسکتے تھے۔

(۴۲) احیاء علوم الدین، ۱/۴۶

(۴۳) ایضاً، ۱/۴۶

(v) اپنے شاگردوں کے سامنے دوسرے اساتذہ کے مضامین کی برائی نہ کرے۔ بہ خلاف اس کے اس بات پر اصرار کرے کہ وہ حتی الوسع زیادہ شعبہ ہائے علوم کی تحصیل پر توجہ دیں۔(۴۴)

(vi) مبتدی اور محدود قابلیت کے شاگردوں کے لیے سہل مسائل منتخب کرلے۔ ایسا کرے گا تو رسول کریم ﷺ کی اس حدیث پر عمل ہوگا کہ جو شخص اپنے مخاطب کے معیار سے بلند زبان میں نصیحت کرتا ہے اس کی گفتگو سے بعض لوگوں کے گمراہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔(۴۵)

(vii) استاد کو چاہیے کہ وہ اپنے قول و فعل میں توافق پیدا کرے ورنہ صحیح افادہ ممکن نہ ہوگا کیونکہ اقوال دل میں اترتے ہیں لیکن اعمال کو آنکھیں دیکھتی ہیں (۴۶) ابن المقفع کا قول ہے کہ جو شخص امام بننا چاہتا ہے اسے پہلے اپنے نفس کی تربیت کرنی چاہیے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی زبان سے زیادہ اپنی شہرت سے لوگوں کی تعلیم و تربیت کر سکے گا۔(۴۷)

(viii) شاگرد کی ہمت افزائی کرے اس طرح کہ وہ خود اپنے فہم و عقل کو کام میں لائے محض استاد کی نقالی نہ کرے۔

اسی قسم کے آداب و فرائض نواب صدیق حسن خانؒ نے ابجد العلوم میں بیان فرمائے ہیں یہ تمام فرائض حضور اکرم ﷺ کے بعض ارشادات سے مستنبط ہیں۔ آپؐ نے معلمین کو خصوصی ہدایات دی ہیں۔ اس سلسلے کی چند ایک احادیث پیش کی جاتی ہیں:

عن ابی سعید الخدریؓ قال: قال رسول الله ﷺ: ان الناس لکم تبعاً و ان رجالاً یأتونکم من أقطار الأرض یتفقهون فی الدین فاذا أتوکم فاستوصوا بهم خیراً (۴۸)

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ تمہارے تابع ہیں اور بلاشبہ بہت سے لوگ تمہارے پاس اطراف زمین سے علم دین سمجھنے آئیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کو بھلائی کی وصیت کرنا۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من سئل عن علم علمه ثم کتمه الجم یوم القیامة بلجام من نار (۴۹)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا

---

(۴۴) ایضاً، ۱/۴۶

(۴۵) الجام العوام عن علم الکلام بحوالہ الغزالی/۳۳، نحن معاشر الانبیاء امرنا أن ننزل الناس منازلهم و نکلمهم علی قدر عقولهم

(۴۶) احیاء علوم الدین، ۱/۴۸

(۴۷) ابن المقفع الادب الصغیر/۱۴، رسائل البلغاء

(۴۸) ترمذی، ابواب العلم، ۲/۸۹

(۴۹) ایضاً

ہے اور وہ اس کو چھپالے (یعنی نہ بتلائے) تو قیامت کے دن (اسے) آگ کی لگام دی جائے گی۔

عن کعب بن مالکؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من طلب العلم لیجاری به العلماء اولیمازی به السفهاء اویصرف به وجوه الناس ادخله الله النار (۵۰)

کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء پر فخر کرے یا جاہلوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من تعلم علماً ما یبتغی به وجه الله لا یتعلمه إلا لیصیب به عرضاً من الدنیا لم یجد عرف الجنة یعنی رِیْحَها (۵۱)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایسا علم سیکھا جس سے خدا کی خوشنودی طلب کی جاتی ہے لیکن سیکھا اس غرض سے کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو میسر نہ ہوگی۔

عن ابن مسعودؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: نضرالله امرءً سمع منا شیئاً فبلغه کما سمعه فرب مبلغ اوعی له من سامع (۵۲)

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کہ تازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے ہم سے کسی بات کو سنا اور جس طرح سنا تھا اسی طرح پہنچا دیا تو اکثر وہ لوگ جن کو پہنچایا جاتا ہے سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔

عن أبی الددرداءؓ قال: إن من أشر الناس عند الله منزلةً یوم القیامة عالم لا ینتفع بعلمه (۵۳)

ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ خدا کے نزدیک قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے سب سے بدترین شخص وہ عالم ہے جس کے علم سے نفع حاصل نہ کیا جائے۔

عن علیؓ قال: قال رسول الله ﷺ: یوشك أن یأتی علی الناس زمان لایبقی من الاسلام الا اسمه ولا یبقی من القرآن إلا اسمه مساجد هم عامرة وهی خراب من الهدی علماء هم شر من تحت أدیم السماء من عندهم تخرج الفتنة وفیهم تعود (۵۴)

علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قریب ہی لوگوں پر ایسا وقت آئے گا کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام رہ

---

(۵۰) ایضاً

(۵۱) ابوداؤد، کتاب العلم ۲/۵۱۵

(۵۲) ترمذی، ابواب العلم ۲/۹۰

(۵۳) دارمی ۱/۷۱

(۵۴) المستدرک ۴/۴۵۷

جائے گا اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش۔ ان کی مسجدیں ظاہر میں آباد ہوں گی لیکن حقیقت میں خراب ہوں گی ہدایت کے لحاظ سے ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سب سے بدتر ہوں گے انہی سے دین میں فتنہ برپا ہوگا اور انہی میں لوٹ آئے گا۔

عن أبی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: مثل علم لا ينفع به كمثل كنز لا ينفق منه فی سبیل الله (۵۵)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے اس خزانہ جیسی ہے جس میں سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا جائے۔

عن عبدالله بن عمروؓ قال: قال رسول الله ﷺ: ان الله لا يقبض العلم انتزاعاً ينتزعه من العباد لكن بقبض العلم يقبض العلماء حتى اذالم يبق عالما اتخذوا الناس رؤوساً جهالا فسئلوا فافتوا بغير علم فضلوا وأضلوا(۵۶)

عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ لوگوں کے دل و دماغ سے اس کو نکال لے بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے ان سے (دین کی باتیں) پوچھا جائے گا اور وہ علم کے بغیر فتویٰ دیں گے پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: إن اول الناس يقضى عليه يوم القيامة رجل استشهد فأتى به فعرفه نعمته فعرفها فقال فما عملت فيها؟ قال قاتلت فيك حتى استشهدت. قال: كذبت ولكنك قاتلت لأن يقال جرئ فقد قيل. ثم أمر به فسحب على وجهه حتى ألقى فى النار. و رجل تعلم العلم و علمه وقرأ القرآن فأتى به فعرفه نعمته فعرفها فقال: فما عملت؟ قال تعلمت العلم وعَلَّمته وقرأت فيك القرآن. قال: كذبت. ولكنّك تَعَلَّمَت العلم ليقال انك عالم و قرأت القرآن ليقال هو قارىء فقد قيل. ثم امر به فسحب على وجهه حتى القى فى النار. ورجل وسع الله عليه و اعطاه من اصناف المال كله فأتى به فعرفه نعمته فعرفها: فقال: فما عملت؟ قال ماتركت من سبيل تحب أن ينفق فيها إلا أنفقت فيها لك. قال: كذبت ولكنك فعلت ليقال هو جواد فقد قيل. ثم أمر به فسحب على وجهه ثم القي فى النار (۵۷)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلا شخص جس پر قیامت کے دن (خلوص نیت کے ترک کا)

---

(۵۵) دارمی، ۱/۱۳۸ (۵۶) ترمذی، باب العلم ۲/۹۰ (۵۷) مسند احمد ۲/۳۲۲، المکتب الاسلامی، بیروت

حکم لگایا جائے گا وہ شخص ہوگا جو شہید کیا گیا ہوگا۔ پس اس کو میدان قیامت میں لایا جائے گا اور اللہ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ سب اس کو یاد آ جائیں گی پھر خداوند تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں میں کیا کام کیا؟ وہ کہے گا میں تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ شہید کیا گیا۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے۔ تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں چنانچہ تجھ کو بہادر کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا اس کو منہ کے بل کھینچا جائے اور آگ میں ڈال دیا جائے۔ پھر وہ شخص ہوگا جس نے علم حاصل کیا اور سکھایا اور قرآن پڑھا۔ پس اس کو اللہ کے حضور میں لایا جائے گا اللہ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا وہ ان کو یاد کرے گا پھر خدا اس سے پوچھے گا تو نے ان نعمتوں کا شکر کیوں کر ادا کیا؟ یعنی کیا کام کیا وہ کہے گا میں نے علم سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا تھا اور تیرے ہی لیے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو نے علم اس لیے سیکھا تھا کہ لوگ تجھ کو عالم کہیں اور قرآن اس لیے پڑھا کہ لوگ تجھ کو قاری کہیں' چنانچہ تجھ کو عالم اور قاری کہا گیا۔ پھر حکم دیا جائے گا تو اس کو منہ کے بل کھینچا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا پھر وہ شخص ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور اس کی روزی کو زیادہ کیا اور طرح طرح کا مال عطا کیا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر کیا جائے گا اور اللہ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا اور وہ ان نعمتوں کو یاد کرے گا پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا ان نعمتوں کے شکر میں تو نے کیا کام کیا؟ وہ کہے گا میں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جس میں تو پسند کرتا ہے کہ خرچ کیا جائے مگر میں نے اس میں خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے' تو نے اس لیے خرچ کیا کہ تجھ کو سخی کہا جائے چنانچہ تجھ کو سخی کہا گیا۔ پس حکم دیا جائے گا اس کو منہ کے بل کھینچا جائے پھر آگ میں ڈال دیا جائے۔

متعلم کے فرائض

مدرسہ و مکتب میں استاد کے ساتھ طالب علم کو بڑی اہمیت حاصل ہے' کیونکہ اساتذہ اور مدارس فقط طالب علم کی تربیت اور خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ طلبہ ہی کسی قوم کا اصل جوہر ہوتے ہیں کیونکہ یہی آگے چل کر کسی نہ کسی صورت میں انسانی اور معاشرتی حرکت کو برقرار رکھتے ہیں۔ آج کے طالب علم کل کے اساتذہ' افسر' کارکن' وزیر' صنعت کار اور تاجر ہوں گے اس لیے اسلامی مدارس میں طلبہ کی صلاحیتوں کے مطابق ان کی تربیت اور تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دور تربیتی اور تعلیمی ہوتا ہے اس لیے اس میں سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ طالب علم زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ اپنے کردار کا تحفظ کرے۔ نواب صدیق حسن خانؒ نے ابجد العلوم میں وہ آداب و فرائض گنوائے ہیں جو ایک طالب علم کے لیے ضروری ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم وہ آداب گنوائیں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں غالب عنصر دینی تعلیم کا تھا۔ دنیوی امور میں دلچسپی لینے والے بھی دینی علوم سے بیگانہ نہیں رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آداب میں اخلاص' بے نیازی' توجہ الی اللہ اور اس طرح کی دوسری صفات کا ذکر ملے گا جو بے دین معاشرے اور لادینی نظام تعلیم میں شاید نہ چل سکیں۔ اسلام چونکہ بنیادی طور پر اچھے انسان اچھے مسلمان کی صورت میں پیدا

کرنا چاہتا ہے اس لیے وہ کسی انسان میں جب تک اسلام اور انسانیت نہیں پاتا اس کے علم فن اور ہنرمندی کو بے سود سمجھتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان کے ہاں ایک متعلم کو مندرجہ آداب سے متصف ہونا ضروری ہے۔

(i) متعلم کے لیے سب سے زیادہ ضروری پاکیزگی نفس ہے۔

(ii) وہ دنیاوی اور مادی اغراض کو زیادہ مدنظر نہ رکھے۔

(iii) اپنے علم پر متکبر اور مغرور نہ ہو۔

(iv) تحصیل علم میں دلچسپی قائم رکھے، اختلافی مسائل میں الجھے نہیں۔ بلکہ ہر دم سمجھنے کی کوشش کرے۔

(v) جتنے بھی عمدہ علوم ہیں سب کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

(vi) کسی ایک علم ہی کی تحصیل میں زندگی ختم نہ کر دے کہ اس سے فارغ ہو کر ہی کوئی دوسرا علم حاصل کرے گا بلکہ اسے تمام علوم کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔

(vii) جب تک کسی ایک فن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل نہ کرلے کسی دوسرے فن کی طرف توجہ نہ دے۔

(viii) تمام علوم کی تحصیل کا مقصود خوشنودی خدا ہے۔

طالب علم کے لیے اصل چیز علم حاصل کرنا ہے جن اعلیٰ مقاصد کے لیے متعلم کو جدوجہد کرنی چاہیئے وہ مادی سہولت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی بھی ہونے چاہئیں۔ متعلم کی زندگی بندھی اور مرتب ہونی چاہئے کیونکہ اس کی زندگی کا خلفشار مستقبل کے پورے نظام کو متاثر کردے گا۔ طالب علم کا علمی ماحول ایسا ہو جس میں مخرب اخلاق حرکات کی گنجائش کم ہو۔ علم و دین کی پاکیزگی اور روحانیت کی لطافت برقرار رہے۔ اچھے ماحول اور مرتب زندگی کا فائدہ یہ ہوگا کہ طالب علم کی شخصیت متوازن طریق پر نشوونما پائے گی۔ ورنہ ادھورے اور خام خیال لوگ تعلیمی ماحول سے نکل کر پورے معاشرے کو خراب کردیں گے۔

نظریۂ تعلیم

تعلیم کے متعلق مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اختلاف کی بنیاد یہ سوال ہے کہ تعلیمی نظام کو کس نظریہ پر مبنی ہونا چاہیئے سر پرسی نن (Sir Percy Nun) نے اپنی کتاب (Education its data and First Principles) میں کہا ہے:

(i) تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما ہے۔ تعلیم کو کسی نصب العین کے تحت نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ جتنے اشخاص ہیں اتنے ہی نصب العین ہو سکتے ہیں۔

(ii) دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ تعلیم نصب العین کے تحت ہونی چاہیئے کیونکہ ہر معاشرہ ایسے افراد چاہتا ہے جو اس

ہے۔ قومی و اجتماعی نصب العین کی سربلندی کے لیے مفید بن سکیں اور اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کوئی قوم اجتماعی وملی نصب العین رکھتی ہے دور حاضر کی جمہوری اور اشتراکی قومیں چونکہ ایک نصب العین رکھتی ہیں اس لیے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا نظام تعلیم رائج کریں جو ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔ مغربی اور اشتراکی نظم کے نصاب پر نظر ڈالنے سے عیاں ہوتا ہے کہ کس طرح یہ اقوام اپنی نئی پود کو مخصوص طریق پر تربیت دینا چاہتے ہیں۔ عام طور پر تعلیم کو سیاسی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ برٹنڈرسل اپنی کتاب ''نظام معاشرہ اور تعلیم'' کے دوسرے باب ''تعلیم کا سلبی نظریہ'' میں نظریہ تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

''عہد حاضر میں تعلیم کے تین مختلف نظریے ہیں اور تینوں کے حامی موجود ہیں ان میں سے پہلی جماعت کا خیال یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد وحید ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور رکاوٹوں کو مٹانا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ افراد کو ثقافت سے بہرہ ور کر کے ان کی تمام استعدادوں کو انتہائی نقطے تک تربیت دینا ہی تعلیم کی غایت ہے۔ تیسری جماعت کہتی ہے کہ تعلیم پر فرد کے زاویہ نگاہ سے غور کرنے کی بجائے اجتماعی زاویہ نگاہ سے غور کرنا چاہئے اور اس کا کام یہ ہونا چاہئے کہ شہریوں کی مفید تربیت کرے آگے چل کر دنیا کے مختلف نظاموں کے متعلق وہ لکھتے ہیں: فی الواقع کہیں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی جو ان تینوں نظریوں میں سے کلی طور پر کسی ایک کے مطابق ہو۔ بلکہ یہ تینوں نظریے کم وبیش ان تمام نظامہائے تعلیم میں موجود ہیں جو حقیقتاً مروج ہیں۔''

''دراصل جو لوگ اس نظام تعلیم کو معاشرتی نظام اور مذہب سے وابستہ کرتے ہیں انہوں نے مذاہب کی تقسیم سیاسی اور غیر سیاسی لحاظ سے کی ہے مثلاً عیسائیت کو وہ غیر سیاسی مذہب کہتے ہیں جب کہ کنفیوشس کے دین، اسلام اور اشتراکیت کو سیاسی مذاہب کہتے ہیں اسی طرح یہ لوگ فرد اور شہری میں بھی اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ شہریت میں سیاسی عنصر آ جاتا ہے جب کہ فرد میں خالص انفرادی اخلاق واعمال اور تعمیر شخصیت آتی ہے اس لیے اگر تعلیم کا مقصد انفرادی ہے تو پھر اسے اچھے فرد کی حیثیت سے تربیت دینی چاہیئے۔ اور اگر اسے ریاست کا ایک اچھا شہری بننا ہے تو پھر اس کے اندر وہ اوصاف پیدا ہونے چاہیں جو اس کی شہری صلاحیتوں کو جلا دیں۔ رسل ذاتی طور پر شہری کی حیثیت کو پسند نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ تمام مغربی اقوام مسیح کی مداح ہیں لیکن اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو برطانوی پولیس انہیں مشتبہ خیال کرتی پھر چونکہ وہ اسلحہ باندھنے سے انکار کرتے اس لیے حکومت امریکہ انہیں حقوق شہریت دینے سے انکار کر دیتی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شہریت بہ حیثیت نصب العین کس قدر ناکافی ہے۔ کیونکہ شہریت کو زندگی کا نصب العین قرار دینے سے انسان کی تمام تخلیقی قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مذہب کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ مذہب ایک ادارے کی حیثیت سے تعلیم پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن مذہب بھی اپنی حیثیت سے اثر انداز ہوگا مثلاً شرافت اور خدا پرستی مذہبی آدمی کے اوصاف ہیں نہ کہ شہری کے۔''(۵۸)

(۵۸) نظام معاشرہ اور تعلیم/ ۶، مترجم جی۔ آر عزیز، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

خواجہ غلام السیدین اپنی کتاب (Education Culture and Social Order) میں تعلیم کا مقصد معاشرتی نظم کی کامیابی قرار دیتے ہیں۔(۵۹) ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب (First Principal of Education) کے پہلے باب میں تین مشہور ماہرین تعلیم کی آراء دی ہیں۔ سر پرسی نن کے حوالے سے انہوں نے تین مقاصد تعلیم بیان کیے ہیں۔

(i) تعمیر کردار (ii) مکمل زندگی کے لیے تیار کرنا (iii) اچھے وجود میں اچھے ذہن کو نشو ونما دینا۔

پرسی نن نے ان مقاصد پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ مقاصد تعلیم یہ ہو سکتے ہیں۔ ''فرد کی اس بلند ترین فلاح کو ترقی دینا جس کے لیے لوگ تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں'' ''تعلیم ایک معاشرتی طرز عمل ہے جس کے ذریعے ایک معاشرتی وحدت اپنے وجود کی بقاء اور اس کے ارتقاء کو قائم رکھ سکے''۔

''اس کتاب کا عام استدلال یہ ہے کہ تعلیم کے اہم ترین مقاصد اور محرکات وہ ہیں جن کا خمیر قومیت پرستی اور نظریہ عملیت کی بجائے اقدار کے نظریاتی فلسفہ سے اٹھا ہے۔ صداقت' حسن اور نیکی روحانی دنیا کے نظم میں مکمل طور پر سمودی گئی ہوں اور انسان اپنے مقصد کی تکمیل صرف اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ ان مطلق حقائق کی جستجو کرے اور انہیں حاصل کرے۔''

ان تمام مقاصد تعلیم پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ماہرین تعلیم ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ تعلیم کا صحیح مقصد کیا ہے بلکہ اس اختلاف کے نتیجے میں تعلیم خود ایک مسئلہ بن گئی ہے۔

دور حاضر میں عام طور پر سیاسی نظریات کو تفوق حاصل ہے اس لیے تعلیم بذات خود کوئی شے نہیں فقط سیاسی نظریات کی خادمہ ہے بلکہ اب تو تعلیم ایک صنعت ہے اور افراد مارکیٹ کی اشیاء ہیں جو قابل خرید و فروخت ہیں۔ ان افراد کی قیمت کا تعین مارکیٹ کرے گی۔ اسی طرح مارکیٹ تعلیمی مضامین کا بھی تعین کرے گی جن مضامین اور جس طرح کی صلاحیت مطلوب ہوگی وہی تعلیمی نصاب ہوگا اور جو مضامین مارکیٹ میں قیمت نہیں رکھتے ان کے لیے طلبہ میسر نہیں آئیں گے۔

اسلامی نظریۂ تعلیم

اسلامی نظریۂ تعلیم جامع ہے کہ اس میں انسان کی انفرادی خودی کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی قوت بن کر معاشرتی اجتماعیت کو نشو ونما دے۔ اسلامی نظریہ تعلیم میں تعلیم کے دو پہلو ہیں:

(i) ایک پہلو کے اعتبار سے وہ مختص فرد کی اصلاح ہے۔

(ii) لیکن دوسرے پہلو کے لحاظ سے وہ ایسی اصلاح ہے جس کا نتیجہ معاشرتی بہبود ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد محبت الٰہی کے نصب العین کو آگے بڑھانا ہے۔ رسل نے ٹھیک کہا ہے کہ اسلام آغاز ہی سے ایک سیاسی مذہب ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ایک دین ہے اور وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی گرفت رکھتا ہے وہ فرد کی انفرادی زندگی اور اس کی حیات اجتماعیہ دونوں کی اصلاح کا دعوے دار ہے وہ با مقصد زندگی کا داعی ہے۔ اس

---

(۵۹) [illegible]ucatio[illegible] [illegible]lture .. Social Order / 23

لیے وہ کسی ایسے نظام تعلیم کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس مقصد کے لیے مفید ثابت نہ ہو قرآن پاک نے انسان کا انفرادی اور اجتماعی مقصد واضح کر دیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۶۰)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۶۱)

تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔ تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اَلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (۶۲)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکاۃ دیں اور (دوسروں کو بھی نیک کاموں کے کرنے کا کہیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

اس اعتبار سے تعلیم کا مقصد فرد کی ایسی تعمیر سیرت ہے جس سے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کائنات کے لیے رحمت ثابت ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی تعلیم اور ایسے علم سے پناہ مانگی ہے جس کا اثر انسان کی عملی زندگی پر نہ ہو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔

اللهم انی أعوذبك من علم لا ينفع (۶۳)

اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔

اسلام تعلیم کو ایک نصب العین سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں اول و آخر تک مقصدیت پوری طرح کارفرما ہوتی ہے۔ اسلام ایسے افراد چاہتا ہے جو انفرادی طور پر اس عظیم مقصد کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں اور اجتماعی طور پر اسلامی ریاست کے اچھے شہری ثابت ہو سکیں کیونکہ وہ نظام تعلیم جس سے مقاصد ریاست پورے نہ ہوں اجتماعی نظم کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مغربی نظام تعلیم کی اس خرابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

......☆......

(۶۰) الذاریات/۵۶

(۶۱) آل عمران/۱۱۰

(۶۲) الحج/۴۱

(۶۳) مشکوۃ المصابیح باب الاستعاذۃ/۲۱۶

16

ابلاغ عامہ

معاشرتی اداروں میں نشو وارتقاء اور شکست وریخت ایک معمول کا انتظام ہے۔ روایتی ادارے جو انسانی معاشرت کا حصہ ہیں اور طویل عرصے سے معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں کسی نہ کسی صورت میں قائم ہیں۔ دورِ حاضر میں ان اداروں کے اندر ایک نئے ادارے کا اضافہ ہوا ہے جسے ابلاغ عامہ کہا جاتا ہے۔ عصرِ جدید میں اس کی وسعت اور غیر معمولی تاثیر کے سبب اسے ریاست کے بعد سب سے زیادہ اہم اور موثر ادارہ مانا گیا ہے۔ بلکہ اسکی تاثیر اور گرفت اتنی بڑھی کہ ریاست کا استحکام وانتشار اس سے منسلک ہو گیا ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں انتخابات، حکومتوں کی کارکردگی اور ان کے عزل ونصب میں ابلاغ عامہ کا بنیادی کردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مختلف شخصیتوں کے امیج بنانے یا ان کی شخصیت کو تباہ کرنے میں ابلاغ عامہ کا بنیادی کردار ہے۔ مغرب میں اسے جو فروغ اور استحکام ملا اسکی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابلاغ عامہ کے کارکن اسے عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے ساتھ چوتھا ستون کہتے ہیں۔ اس کی تاثیر کا اندازہ اس کی ہیبت اور اس کے خوف سے کیا جا سکتا ہے۔ ہر معاشرتی اور سیاسی شخصیت ابلاغ عامہ کے حوالے سے اپنے آپ کو معرض خطر میں سمجھتی ہے۔ ابلاغ عامہ کی شخصیتوں سے رابطہ۔ ان کی خاطر داری اور ان سے خوشگوار تعلقات ہر بااثر شخصیت کے فرائض میں شامل ہے۔ اس سے غفلت اور کوتاہی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ابلاغ عامہ اپنی تاثیر کی وجہ سے ریاست کے ادارے کے مساوی مقام رکھتا ہے۔

ذیل میں ہم اس ادارے کے نشو وارتقاء، اقسام، فرائض اور تاثیرات کے حوالے سے بات کریں گے اور آخر میں اسلامی نقطہ نظر کو دیکھیں گے۔

ابلاغ کیا ہے

ابلاغ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہنچانا ہے۔(۱) اسلامی روایت میں اسی مادہ سے لفظ تبلیغ ہے جو کسی اچھی بات اور بالخصوص دینی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو حکم ہوا۔

يَـٰٓأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۲)

اے رسول ﷺ آپؐ کے پروردگار کے پاس سے جو کچھ آپؐ کی طرف اترا ہے اس کو پہنچا دو اگر آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تو آپؐ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور آپؐ کو اللہ لوگوں سے بچائے گا۔

قرآن نے بلاغ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جو ابلاغ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) لسان العرب، ۸/ ۴۱۹

(۲) المائدہ/ ۶۷

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۳)

اگر منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبرؐ کے ذمے تو صرف پیغام کھول کر پہنچا دینا ہے۔

ابلاغ اپنے مفہوم کے لحاظ سے عام ہے اور اس میں دینی یا غیر دینی اچھی یا بری بات کی کوئی قید نہیں۔ مطلق پہنچانا ہے، کوئی پیغام، کوئی بات اور کوئی خبر بھی ابلاغ کا موضوع بن سکتی ہے۔ جب کسی بات، خبر یا پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے تو وہ ابلاغ عامہ کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Communication کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں: (۴)

(i) An Act or Instance of Transmission

(ii) Verbal or Written Message

(iii) A technique of expressing ideas affectively especially in speech and writing

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کا مقالہ نگار کمیونیکشن کو متعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے۔

Communication devived from the Latin word "Communicate" means to make common to share, to impart and transmit.(5)

گویا ابلاغ / کمیونی کیشن ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ کوئی خبر، نظریہ یا رویہ ایک شخص سے دوسرے شخص یا کئی لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ سادہ سی خبر کو پہنچانے سے لے کر دور حاضر کے پیچیدہ نظام تک سب کچھ ابلاغ سے تعلق رکھتا ہے۔ عصر حاضر میں اس کے تنوع اور پیچیدہ نظام سے اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کیسے شروع ہوا ہوگا۔ تاہم اب یہ ایک بے قابو اور طاقتور ادارے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

آغاز وارتقاء

ابلاغ انسان کی ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ ساری مخلوق سے ممتاز ہے کیونکہ ابلاغ کے جو وسائل انسان کو میسر ہیں وہ کسی اور مخلوق کو میسر نہیں۔ جیسے بیان ہوا ہے کہ ابلاغ دراصل اپنے مافی الضمیر کو آگے پہنچانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قدرت نے ہر مخلوق کو فطری طور پر اپنی نوع میں پیغام پہنچانے کا سلیقہ ودیعت کیا ہے لیکن وہ آوازیں، اشارات اور حرکات فطری اور جبلی اظہار کا ذریعہ ہیں۔ علم الحیوانات میں ہونے والی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ حیوانی دنیا میں ابلاغ کا فطری طریقہ موجود ہے لیکن یہ محدود اور فطری دائرے میں ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف

---

(۳) المائدہ/۹۲

(۴) Webster new Collage Dictionary/283 Third Edition.

(۵) Encyclopedia Britanica

زبان عطا کی ہے بلکہ عقل سے بھی نوازا ہے جس کی بناء پر وہ اظہار اور ابلاغ کے متنوع اسالیب اختیار کرتا ہے۔

انسان کو اللہ نے جو صلاحیت دی ہے قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (۶)

اللہ جو نہایت مہربان ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔

بات صرف بولنے ہی تک محدود نہیں اس نے لکھنا بھی سکھایا۔ وہ فرماتا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o (۷)

اے محمدؐ اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے کائنات کو پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔

نسل انسانی کے فروغ اور تنوع میں انسان نے مختلف زبانیں ایجاد کیں، اظہار کے مختلف پیرائے اختیار کئے۔ اور ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کے متنوع اسالیب اختیار کئے۔ قرآن مجید انسانوں کی مختلف زبانوں کو آیات الٰہی قرار دیتا ہے کیونکہ یہ زبانیں اس کی قدرت اظہار اور اسلوب ابلاغ کا وسیلہ ہیں۔ وہ فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (۸)

اور اس کے نشانات اور تصرفات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لیے ان باتوں میں نشانیاں ہیں۔

انسانی ابلاغیات کا اگر جائزہ لیں تو اس کا آغاز پہلے انسان سے ہوتا ہے تخلیق آدم میں علم اور ابلاغ کی صلاحیتیں بنیادی عناصر کے طور پر شامل تھیں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جو علم سکھایا وہ ابلاغ الٰہی کا پہلا سبق تھا پھر فرشتوں کو مخاطب کر کے انہیں علم الٰہی کے امین آدمؑ کی توقیر کا حکم دیا۔ قرآن اس واقعہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ o قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاَعْلَمُ

---

(۶) الرحمٰن/۱/۴

(۷) العلق/۱۔۵

(۸) الروم/۲۲

مَاتُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ○ (۹)

اور اس نے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا اور حکمت والا ہے۔ تب اللہ نے آدمؑ کو حکم دیا کہ آدم تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ جب انہوں نے فرشتوں کو چیزوں کے نام بتائے تو فرمایا کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین سب پوشیدہ باتوں کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو سب مجھ کو معلوم ہے۔

پھر آدمؑ شیطان کے بہکاوے میں نافرمانی کر بیٹھتے ہیں تو انہیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کیسے کریں اور اپنے رب سے اپنی بات کا ابلاغ کس طرح کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت پھر رہنمائی کرتی ہے آدمؑ کو ابلاغ کا طریقہ سکھاتی ہے قرآن میں ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَالتَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۰)

پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کلمات سیکھے اور معافی مانگی تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بیشک وہ معاف کرنے والا صاحب رحم ہے۔

قرآن ہمیں وہ کلمات بھی بتاتا ہے جنھیں آدمؑ نے توبہ کے لیے ادا کیا تھا۔ یہ انسان کا پہلا ابلاغ تھا جس میں اس نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۱۱)

دونوں عرض کرنے لگے کہ پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔

آدمؑ وحواؑ نے اپنے رب کے سکھلائے ہوئے کلمات سے معافی کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور رب تعالیٰ کی طرف سے وہ اعلان ہوا جو انسانی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے ابلاغ اور پیغام رسانی کی بنیاد بنا۔ بندے کا اپنے رب کا پیغام وصول کرنا اور اسے آگے دوسرے انسانوں تک پہنچانا کار نبوت ٹھہرا اور حیات انسانی میں وحی کا ادارہ قائم ہوا۔ آدمؑ کو معافی نامہ کے نتیجے میں اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا گیا جسے ہر پیغمبر نے ادا کرنا تھا۔ بندے اور رب کے درمیان کمیونیکیشن کا یہ ادارہ نبوت اور رسالت کہلاتا ہے۔ نبی اور رسول تاریخ انسانی کے پہلے کمیونیکیٹر (Communicater) ہیں۔ ارشاد ہوا۔

---

(۹) البقرہ/۳۱۔۳۳

(۱۰) البقرہ/۳۷

(۱۱) الاعراف/۲۳

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۱۲)

ہم نے فرمایا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرنا۔ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہونگے۔

اس واقعہ کا ایک اور کردار بھی ہے اور وہ ہے ابلیس اس نے بھی اللہ کی نافرمانی کی اور آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ صرف انکار ہی نہیں کیا اللہ کو یہ چیلنج بھی دیا کہ وہ آدمؑ کی نسل کو گمراہ کرے گا اور ابلاغ کے سارے وسائل استعمال کرے گا۔ قرآن نے اس کے چیلنج کو مختلف جگہوں پر نقل کیا ہے مثال کے طور پر ذیل کی آیت ملاحظہ فرمائیں۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۳)

اور کہنے لگا کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی تمام اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا۔

اس پر باری تعالیٰ نے فرمایا

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۱۴)

تو چلا جا، جو شخص ان میں سے تیری پیروی کریگا تو سب کی جزا جہنم ہے جو پوری سزا ہے۔

انسان کو آغاز ہی میں زبان، تکلم، علم اور عقل کی صفات حاصل تھیں۔ لادین علماء بشریات و معاشرت نے اشاروں، کنایوں، تصویروں اور جانے کیا کیا طریق ابلاغ کا ذکر کیا۔ ابتدائی اظہار یقیناً سادہ ہوگا۔ ممکن ہے اس میں اشاروں کا استعمال بھی ہو۔ اسی طرح لکھائی میں تصویروں کے ذریعے بعض مفاہیم و معانی ادا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہو لیکن اظہار و ابلاغ کے یہ سب طریقے زبان ہی کے ضمن میں آتے ہیں اور زبان و تکلم اللہ نے پہلے دن سے ہی انسان کو عطا کیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے مندرجہ بالا آیات کافی ہیں۔ آثار قدیمہ میں تصویروں کی موجودگی سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ لازماً تصویروں کے ذریعے ہی اظہار مافی الضمیر ہوتا تھا درست نہیں ہے یہ محض ظن و تخمین کی بات ہے حتمی نتیجہ نہیں ہے۔ مغربی محققین چونکہ سیکولر لادین ہیں اس لیے وہ اندازوں اور تخمینوں سے نتائج نکالتے ہیں۔ نطق انسان کی خصوصیت ہے۔ زبان کا استعمال اور الفاظ کا انتخاب یقیناً ارتقائی منازل سے گذرا ہوگا۔ انسان جو علامتیں متعین کرتا رہا وہ

(۱۲) البقرۃ/۳۸

(۱۳) بنی الاسرائیل/۶۲

(۱۴) بنی الاسرائیل/۶۳

بالآخر زبان کی بنیاد بنیں اور الفاظ، جملے اور کلمات تشکیل پاتے رہے اور یوں مختلف زبانیں وجود میں آئیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا اور جن کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے۔ ابلاغ کا سب سے بڑا سلسلہ رب تعالیٰ اور بندے کے درمیان مکالمہ ہے۔ ہدایت ربانی زبانی بھی پہنچتی رہی اور لکھی ہوئی صورت میں بھی۔ قرآن انبیاء ورسل کے صحف وکتب کا ذکر کرتا ہے۔ موسیٰ کے سلسلے میں لکھی ہوئی تختیوں کی بات آتی ہے۔

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۵)

اور ہم نے تختیوں میں ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت کی تفصیل لکھ دی۔

تمدنی ترقی میں زبانوں کا ارتقاء اور ضبط وکتابت کا فروغ بھی شامل ہے۔ زبانیں ترقی کرتی رہیں اور لکھنے کے وسائل بھی بڑھتے رہے۔ پتھر، لکڑی، ہڈی، کپڑا اور پھر کاغذ اس ارتقائی سفر کی مختلف منازل ہیں۔ انسانوں نے ضرورتوں کے تحت ایجادات کیں اور اللہ کی دی ہوئی فراست اور بصیرت نے اظہار وابلاغ میں شاندار مثالیں قائم کیں۔ ابلاغ میں زبانی اور تحریری وسائل ہمیشہ بروئے کار لائے جاتے رہے۔ بعض اقوام صرف زبانی روایت پر اعتماد کرتی تھیں لہٰذا ان کے خطیب، شعراء اور قصہ گو وسائل ابلاغ تھے۔ قبائل واقوام کی تاریخ ان کے عسکری، معاشرتی ومعاشی تجربات انہی ذرائع سے آگے پہنچتے اور محفوظ ہوتے رہے۔ عرب خطباء، شعراء کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اس زبانی روایت کو زندہ رکھا اور ان کے ہاں علوم کے حفظ اور روایت کو زبانی یاد رکھنے کا طریق مستحکم رہا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان نے اپنے تہذیبی تجربے میں صرف زبانی روایت پر اعتماد نہیں کیا بلکہ تحریر کو بھی ابلاغ کا وسیلہ بنایا۔ حکمرانوں نے اپنے فرامین اور احکام تحریری طور پر منضبط کرنے اور مشتہر کرنے کا انتظام کیا۔ آثار قدیمہ سے جو کتبات ملے ہیں وہ تحریری سرگرمیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ مصریوں، عبرانیوں، بابلیوں، ہندوؤں، رومیوں اور چینیوں کے ہاں تحریری سرمایہ کے واضح آثار ملتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے تحریر پر جو زور دیا ہے وہ ایک تاریخی شہادت ہے۔ حکمرانوں کو خطوط، معاہدات کی تحریریں، قرآن وحدیث کو ضبط تحریر میں لانا۔ کتابت کے لیے اہتمام فرمانا ایک تاریخی حقیقت ہے۔

ابلاغ میں جہاں انفرادی رابطے اہم کردار ادا کر رہے تھے وہاں حکومتیں بھی مختلف طریقوں سے احکام، خبریں اور معلومات پہنچانے اور حاصل کرنے کا اہتمام کرتی رہیں۔ معلومات کی فراہمی حکمرانوں کے لیے ہمیشہ اہم رہی ہے۔ ملکی استحکام، دشمنوں کے عزائم اور مخالفین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں معلومات کا حصول بہت ضروری ہوتا ہے۔ حکومتیں ہمیشہ سراغرسانی، جاسوسی کے خفیہ ادارے، مخبری کا نظام اور پیغام رسانی کے شعبے قائم رکھتی تھیں۔ تمدنی ترقی کے ساتھ حکومتوں نے خبر رسانی کے نظام کو بھی بہتر بنایا۔

عسکری نوعیت کی معلومات کے لیے خبر رسانی کے مستعد نظام کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے تیز

---

(۱۵) الاعراف/۱۴۵

رفتار گھوڑوں کا انتظام کیا جاتا تھا اور حدود سلطنت میں مختلف پڑاؤ اور چوکیاں قائم ہوتیں جہاں تازہ دم گھوڑے حاضر ہوتے۔ گھوڑ سوار ہر چوکی سے تازہ دم گھوڑے سے کام لے کر منزل مقصود پر پہنچ جاتا۔ خبر رسانی میں اصل اہمیت برق رفتاری کی رہی ہے اور ہر دور میں اس کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ بحری پیغام رسانی میں عمرؓ کے دور میں کافی کام ہوا۔ آپ نے ڈاک کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ آپ نے بے شمار سڑکیں بنوائیں۔ ان پر اطلاعات اور پیغام رسانی کے لیے چوکیاں قائم کی گئیں۔ مسلم ہندوستان میں حکمرانوں نے اطلاعاتی نظام میں استحکام پیدا کیا تھا۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں اس مقصد کے لیے تیز رفتار گھوڑے اور سوار تیار کیے گئے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغامات کو لے کر جاتے۔

ابلاغ میں کاغذ اور طباعت کا استعمال

چین میں کاغذ کی ایجاد ہوئی تو اس سے تحریری پیغام رسانی میں انقلاب آیا۔ اس میں مزید تیزی اس وقت آئی جب طباعت کا آغاز ہوا۔ طباعت کی وجہ سے ابلاغ کے میدان میں انقلاب اس لیے آیا کہ اس کے ذریعے نہ صرف عام معلومات کی حفاظت ہوئی بلکہ علوم وفنون میں بھی ترقی ہوئی۔ انیسویں صدی کا صنعتی انقلاب ابلاغ کی دنیا میں ہمہ گیر ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا اس صدی کے نصف آخر میں ذرائع مواصلات میں بڑی ترقی ہوئی۔ کسی وقت گھوڑے اور بادبانی جہاز تیز ترین مواصلاتی ذریعہ تھے۔ اب ریل گاڑی، دخانی جہاز تار اور ٹیلیفون آ گئے۔ موٹر سائیکل، کاریں اور بسیں چلنے لگیں اور بیسویں صدی کے ربع اول میں ریڈیو، ٹیلیوژن آئے۔ اور اب مصنوعی سیارے کمپیوٹر، فیکس، ای میل وغیرہ کے ذریعے سیکنڈوں میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ابلاغ کی تاریخ میں جدید دور کی دریافتوں نے نئی جہتیں متعارف کرائی ہیں۔ کیمرہ ٹیلی پرنٹر، ٹیلی فون کمپیوٹر، فیکس، ای میل، انٹرنیٹ وہ ذرائع ہیں جن کی وجہ سے ابلاغ کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ کبوتر سے پیغام رسانی سے ڈاک کے نظام تک اور ٹیلی پرنٹر اور وائرلیس سے ٹیلیفون اور الیکٹرانک مواصلات تک ابلاغ کا عمل اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اسے برق رفتاری سے بھی کوئی اگلا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ابلاغ عامہ

ابلاغ کے ارتقاء میں جہاں ذرائع کا انقلاب دلچسپی کا سامان لایا ہے وہاں انفرادی خصوصی ابلاغ سے ابلاغ عامہ تک کا سفر بھی حیران کن ہے۔ کسی زمانے میں خبر تک رسائی صرف مراعات یافتہ طبقہ کا استحقاق تھا لیکن اب عام آدمی کو بھی رسائی حاصل ہے۔ فلم، اخبارات ورسائل، ریڈیو اور ٹیلیویژن نے ابلاغ کو ابلاغ عامہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب بات محض ابلاغ کی نہیں بلکہ ابلاغ عامہ کی ہے۔ ابلاغ عامہ کی بات کے معنی ذرائع ابلاغ کی عمومیت کے ہیں۔ ابلاغ کے

ارتقاء کی تاریخ انسان کی جستجو کی تاریخ ہے۔اس کی تہذیبی ترقی اور تمدنی شعور کی تاریخ ہے۔انسان نے اس میدان میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ اس کی محنت، ذوق جستجو اور آرزوئے کمال کا حسین نمونہ ہے۔اس وقت جب ذرائع ابلاغ کی بات ہوتی ہے تو اخبارات ورسائل، فلم وٹیلیویژن اور ریڈیو وکمپیوٹر فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔لیکن اس کے پس منظر میں جو کچھ موجود ہے اسے انسان کی امنگوں کی دنیا کہنا چاہیے۔

ذرائع ابلاغ کی اہمیت

ذرائع ابلاغ نے انسانی زندگی کو نئی رفتار اور نئی معرفت عطا کی ہے انسان کو گردوپیش کا شعور دیا ہے اور زندگی کے مسائل کی نقاب کشائی کی ہے۔اگر غور کریں تو دور حاضر کی تمام تر علمی ترقی وخوشحالی، سائنسی ایجادات اور علمی تحقیقات کا ادراک انہی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔سٹیلائٹ کی ایجاد نے پوری دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔دنیا میں ہونے والے تمام واقعات وحادثات ٹیلیویژن سکرین پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ذرائع ابلاغ نے معلومات اور آگہی میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ذرائع ابلاغ صرف معلومات ہی کا نہیں تفریح کا ذریعہ بھی ہیں۔سائنسی تحقیقات، تازہ خبریں وتبصرے، کھیلوں کے مناظر، موسیقی اور تعلیمی پروگرام وہ پہلو ہیں جن سے ذرائع ابلاغ نے روزمرہ زندگی کی رونقیں بڑھائی ہیں۔عالمی آگہی کا یہ عالم ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا ہے تو ہر شخص اس سے واقف ہوتا ہے۔افغانستان اور عراق پر حملے، اسرائیل اور ہندوستان کی دہشت گردی اور چیچنیا میں روسی خونخواری سے پوری دنیا واقف ہے۔یہ ذرائع ابلاغ کا کمال ہے کہ اب کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس وقت دنیا میں ہزاروں اخبارات ورسائل اور لاکھوں جرائد وکتب شائع ہوتے ہیں ٹرانسسٹر کے ذریعہ تمام دنیا کی خبریں سنی جاسکتی ہیں اور پھر ٹیلیویژن نے تو پوری دنیا کا منظرنامہ پیش کردیا ہے کیبلز، سیٹلائٹ اور ڈش انٹینا نے تمام ثقافتی وغیر ثقافتی سرگرمیوں کو سمیٹ کر ہمارے دامن میں لا ڈالا ہے۔اطلاعات، معلومات اور تفریح کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس سے آج کا انسان متمتع ہورہا ہے۔

ان کی افادیت مسلّم ہے لیکن ایک منفی پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور وہ ہے مخصوص مفادات کے حصول کے لیے ان کا استعمال۔تشہیر کے لیے جو اشتہار دیئے جاتے ہیں وہ اکثر مبالغہ پر مبنی ہوتے ہیں اور مارکیٹنگ کے لیے جو نفسیاتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں وہ مخصوص گروہوں کے مفادات لیے ہوتے ہیں اور عام آدمی کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔پھر حکومتیں کثیر القومی کمپنیاں اور قومی وبین الاقوامی ایجنسیاں انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں۔قومی حکومتیں اور بین الاقوامی طاقتیں اپنے عوام کو مطیع رکھنے کے لیے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعے ایک خاص نقطۂ نظر پروان چڑھاتی ہیں اور رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جاتا ہے۔لوگوں کی ذہنی تغسیل (Brain Washing) کے لیے ذرائع کو ابلاغ ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔11 ستمبر کے حادثے

ے بعد بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے مسلمانوں کے خلاف جس قدر غلیظ مہم چلائی ہے اس سے مسلمانوں کے امیج کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ پھر ذرائع ابلاغ کو فحاشی اور بداخلاقی پھیلانے کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے جو معاشروں کی عمومی اخلاقی فضا کو تباہ کرنے کا ایک مہلک طریقہ ہے۔ دنیا کی طاقتور لابیاں اپنے مقاصد کیلئے ذرائع ابلاغ کو ڈھٹائی سے استعمال کر رہی ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہیں۔ مغربی ممالک نے ان ذرائع کے استعمال میں نہ صرف باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیا ہے بلکہ اسے ایک سائنس کا درجہ دیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں کے تعارف اور قبولیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

دور حاضر کی تنظیم معاشرت، استحکام ریاست اور معاشی شیرازہ بندی میں ذرائع ابلاغ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع قومی ضروریات اور مقاصد کی تشہیر و تکمیل میں بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو حکومتوں اور عوام کے درمیان ایک موثر رابطے کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے ذریعے باہمی اعتماد کی فضا پیدا ہوسکتی ہے۔ اور عوام حکومت کی پالیسیوں کو سمجھ کر موافق یا مخالف ردعمل کا اظہار کر سکتے ہیں۔ آزاد پریس حکومتوں اور معاشروں کے نگران کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ معاشرے کی خرابیاں بعض افراد/اداروں کی معاشرت اور اخلاق دشمن سرگرمیاں اور حکومتوں کی چیرہ دستیاں پریس کے ذریعہ ہی بے نقاب ہوتی ہیں۔ آزاد پریس کسی معاشرے کا بیدار دماغ اور بینا آنکھ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے کسی معاشرے کے استحکام وانتشار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس کے وسیلے سے حکومتوں کے استحکام وزوال کا پتہ چلتا ہے۔

جدید دور میں ابلاغ عامہ کے ذرائع

ابلاغ عامہ میں روایتی زبانی روایت سے تحریری لوازمہ تک انسان نے جو کاوشیں کی تھیں وہ جدید دور میں ایک نئی تکنیک کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہیں دونوں صورتیں نئی تشکیل کے ساتھ پیش ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ تحریر کے وجود میں آنے سے زبانی روایت کی حوصلہ شکنی ہوئی لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ تحریر کی مطبوعہ طاقت کے باوجود زبانی روایت کی سخت جانی نے اسے زندہ رکھا۔ دور جدید میں ذرائع ابلاغ کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک مطبوعہ اور دوسرے الیکٹرانک۔ مطبوعہ ذرائع نے اگر تحریر کی قوت کو بڑھایا ہے تو الیکٹرانک میڈیا نے زبانی روایت کو زندگی بخشی ہے۔ ذیل میں دونوں اقسام کے بعض پہلوؤں پر بات کی جائے گی۔

مطبوعہ ذرائع

مطبوعہ ذرائع سے مراد تحریر کی وہ تمام انواع ہیں جو چھپ کر عوام تک پہنچتی ہیں۔ چھاپے خانے کی ایجاد نے تحریر کو مستقل وجود بخشا ہے اور اس کے ضیاع کے خطرے کو کم کیا ہے۔ مطبوعہ ذرائع ابلاغ میں اخبارات، رسائل اور کتب وغیرہ

شامل ہیں۔ اخبار چونکہ روز شائع ہوتا ہے اور بڑی تعداد میں شائع ہوتا ہے اس لیے اسے تمام مطبوعہ ذرائع ابلاغ میں برتری اور زیادہ قوت حاصل ہے۔ اخبار روزانہ چھپتا ہے اس لیے روزمرہ زندگی کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

اخبارات

اخبارات روزانہ معلومات کے حصول کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اخبارات میں وقت گذرنے کے ساتھ کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ لوازمے کے لحاظ سے بھی اور پیش کش کے اعتبار سے بھی۔ اب اخبارات محض خبر رسانی کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ تجزیے اور تبصرے بھی اس کا حصہ ہیں۔ اخبارات کے اداریے اور کالم رائے عامہ کی تیاری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اب یہ بات اخبارات کے فرائض میں شامل ہوگئی ہے کہ وہ نہ صرف معلومات فراہم کریں بلکہ حکومت اور معاشرے پر نظر رکھتے ہوئے ان کی خرابیوں کی نشاندہی بھی کریں اور اصلاح احوال کے لیے تجاویز بھی دیں۔ اخبارات سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے سلسلے میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اخبارات اشتہارات کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔ خرید و فروخت کے اشتہار مختلف قسم کی مصنوعات کے اشتہار، ملازمتوں اور رشتوں کے اشتہار عدالتی نوٹس اور حکومتی اعلانات وغیرہ اخبارات کے وہ پہلو ہیں جن سے عوام کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ اخبارات حکومت اور عوام کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں حکومت کی مختلف پالیسیاں اور پروگرام اخبارات کی وجہ سے عوام تک پہنچتے ہیں۔ اخبارات حکمران طبقات کی بدعنوانیاں دھاندلیاں، کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی منظر عام پر لاتے ہیں۔ دنیا کے حکمرانوں کے بڑے بڑے سیکنڈل اخبارات ہی کی وجہ سے منظر عام پر آئے۔ امریکی صدر نکسن کا واٹر گیٹ، بھارت کا بوفور سیکنڈل اور پاکستانی افسروں کی بدعنوانیاں پریس ہی کے ذریعہ مشتہر ہوئے۔ سیاستدانوں اور سیاسی پارٹیوں کے پروگرام اور منشور بھی اخبارات کی وجہ سے عام تک پہنچے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کی خرابیوں اور منفی سرگرمیوں کی معلومات اخبارات ہی کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتی ہیں۔

اخبارات میں تنقیدی مضامین فیچر اور خاص موضوعات کے حوالے سے بہت مواد چھپتا ہے۔ کھیل، ادب، خواتین اور بچوں کے لیے الگ ایڈیشن چھپتے ہیں قومی اور اسلامی اہمیت کے دنوں پر خصوصی ایڈیشن چھپتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اخبارات ایک صنعت بن گئے ہیں۔ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے اور مالی طور پر مستحکم ہونے کی وجہ سے اخبارات بلیک میلنگ کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ کسی کی شہرت کو نقصان پہنچانے اور کسی کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں اخبارات کو رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے سیاسی عزائم رکھنے والے اور معاشی مفادات والے لوگ اخباروں سے ہمیشہ بنا کر رکھتے ہیں اور حکومتیں خاص طور اپنے مقاصد کے حصول اور اپنے حق میں تشہیری مہموں کی وجہ سے اخبارات پر کنٹرول رکھتی ہیں انہیں فائدے بھی پہنچاتی ہیں۔

رسائل ومجلات

رسائل و مجلّات کا کردار اخبارات سے ذرا سا مختلف ہے۔ اخبارات کا کام روزانہ کام آنے والی خبروں، اشتہاروں اور تبصروں کو فراہم کرنا ہوتا ہے جب کہ رسالے اور مجلّات ذرا زیادہ دیر پا معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ان میں ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل و مجلّات ہوتے ہیں۔ ہفتہ وار رسالے ہفتہ بھر کی خبروں اور واقعات کے تبصروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جبکہ ماہوار رسالے زیادہ تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زیادہ پائیدار مواد ہونے کی وجہ سے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے زیادہ دیر تک پڑھے جاتے اور محفوظ کئے جاتے ہیں۔ مستقل ہفتہ وار رسالوں کے علاوہ اب اخبارات بھی اپنے ہفتہ وار میگزین شائع کرتے ہیں جو نسبتاً مستقل موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں کارٹون فیچر، مستقل کالم، ادبی موضوعات، فنون لطیفہ اور فلم و ٹیلیویژن سے متعلق مضامین بھی ہوتے ہیں۔ اداکاروں، رقاصاؤں اور گویوں کو متعارف کرانے میں ان ہفتہ وار میگزینوں کا خصوصی کردار ہے۔

ماہوار، سہ ماہی ششماہی اور سالانہ رسائل و مجلّات میں ادبی، دینی اور فکری و علمی رسالوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ عالم اسلام کی چار بڑی زبانوں، عربی فارسی اردو اور ملائی زبانوں میں علمی رسائل کی بڑی تعداد چھپ رہی ہے۔ انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں سیاسی، معاشرتی، معاشی، سائنسی اور اسلامی موضوعات پر گرانقدر رسائل چھپ رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات میں انقلاب آفریں مضامین انہی رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی، معاشی معاشرتی اور اسلامی موضوعات پر بھی مغرب سے چھپنے والے مجلّات کو قائدانہ حیثیت حاصل ہے۔ عالم اسلام سے بھی انگریزی میں بعض اعلیٰ درجہ کے مجلّات چھپ رہے ہیں۔ دنیا بھر کی جامعات اپنی تحقیقات کو انہی مجلات کی زینت بناتی ہیں۔ بعض مضامین عہد ساز نوعیت کے ہوتے ہیں۔ تجربہ کار پروفیسر اور محققین ان مجلات کی زینت ہوتے ہیں۔ علمی و فکری دنیا میں ان رسائل کا کردار یقیناً عہد ساز نوعیت کا ہے۔

ڈائجسٹ

ماہوار رسالوں کی ایک قسم ڈائجسٹ ہیں۔ یہ کتابی سائز پر شائع ہونے والے ایسے رسائل ہیں جن میں ہمہ پہلو تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ اس سے تمام طبقات کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں ان میں ہلکے پھلکے تفریحی مواد سے لے کر سنجیدہ تاریخی وادبی مضامین تک سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ شکاریات، معمے، پہیلیاں لطیفے، ادبی چٹکلے، سوانح، افسانے، جاسوسی کہانیاں غرض ان میں ہر طرح کے قاری کے لیے دلچسپی کا سامان موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اشاعت عام رسالوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی زبان کا ریڈرز ڈائجسٹ اس کی اعلیٰ مثال ہے۔ اردو زبان میں کئی قسم کے ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا

مطبوعہ ذریعہ ابلاغ کے سلسلے میں ہم اخبارات، رسائل ومجلات اور ڈائجسٹوں سے متعارف ہوئے ہیں۔ یقیناً مطبوعہ ذرائع ابلاغ کا اہم کردار ہیں اور اب بھی اثر اندازی کے لحاظ سے انہیں ایک مقام حاصل ہے لیکن جب سے الیکٹرانک ذریعہ ابلاغ وجود میں آیا ہے اس وقت سے معلومات کی دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے۔ الیکٹرانک ذریعہ ابلاغ زبانی اور تحریری روایت کا امتزاج ہے۔ اس میں تحریری طور پر مرتب پیش کش ہوتی ہے لیکن اس کی ادائیگی زبانی ہوتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا زبانی اور تحریری اسلوب کا امتزاج ہے تاہم پیش کش کے حوالے سے اسے زبانی ذریعہ ہی کہنا چاہیے۔ الیکٹرانک میڈیا کے اہم عناصر ریڈیو اور ٹیلیویژن ہیں اگرچہ کمپیوٹر اور فلم بھی اسی کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔

ریڈیو

ریڈیو دراصل برقی لہروں کے ذریعہ آواز اور پیغام پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ برقی لہروں کا انکشاف میکس مولر نے کیا تھا لیکن اس تحقیق کو برنز ایڈیلین نے آگے بڑھایا۔ 1855ء میں اٹلی کے مارکونی (Guglialmo Marconi) نے لاسلکی (Wireless) کے ذریعہ سے پیغام پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ جب اطالوی ارباب اختیار نے اسے اجازت نہ دی تو اس نے برطانوی حکومت سے مذاکرات کئے اور 1896ء میں اس نے Marconi wireless telegraph and signal company تشکیل دی اور 1901ء میں اس نے وائرلیس سگنل کو بحر اطلس کی دوسری جانب پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔

1906ء میں لی ڈی فاریسٹ (Lee De Forest) نے وہ سسٹم ایجاد کیا جس کے ذریعہ آواز اور موسیقی کو منتقل کیا جاسکتا تھا۔ ڈی فاریسٹ کو اکثر اوقات ریڈیو کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے ریڈیو کے ذریعہ پہلی نشریات امریکہ کے مقام پٹز برگ (Pitts Burg) سے 2 نومبر 1920ء کو شروع ہوئیں برطانوی نشریاتی کمپنی بی بی سی نے اپنی روزانہ نشریات 1922ء میں شروع کیں ریڈیو کی نشریات برقی لہروں کے ذریعے ایک عام آدمی سے حکمران تک ہر شخص کو متاثر کرتی ہیں۔ ریڈیو کے پروگرام، جھونپڑیوں، محلوں، ہوٹلوں، کلبوں، دفتروں، دکانوں حتی کہ کھیتوں تک سنائی دیتے ہیں۔ ریڈیو کی خصوصیت ہے کہ زبانی پروگرام ہونے کی وجہ سے ان پڑھ، معذور اور نابینا افراد تک کو متاثر کرتا ہے۔

ریڈیو کا مخاطب ہر طبقے، ہر عمر اور ہر علاقے کے لوگ ہوتے ہیں یہ سفر وحضر کا رفیق ہے اور اس کی رسائی وہاں تک ہے جہاں کوئی ذریعہ ابلاغ نہیں پہنچ سکتا۔ ریڈیو بنیادی طور پر حکومتوں کا آلہ کار رہا اور حکومتیں اسے اپنے مقاصد کی تشہیر و تکمیل کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں ریڈیو نشریات پروپیگنڈے کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ دنیا میں

پرائیویٹ ادارے بھی ریڈیو کو استعمال کرتے ہیں۔ عیسائی مشنری اسے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور انہوں نے خصوصی ریڈیو سٹیشن قائم کر رکھے ہیں۔ اسی طرح موسیقی کے خصوصی ریڈیو قائم ہیں۔ دنیا کے بڑے نشریاتی ادارے۔ جیسے بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو ماسکو، وائس آف ایران، وائس آف جرمنی، آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان وغیرہ اپنے اہداف کے مطابق پروگرام نشر کرتے ہیں۔

ریڈیو ایک مفید ذریعہ ابلاغ ہونے کی وجہ سے ارتقائی مراحل سے گذرا ہے ابتدا میں بڑے سیٹ ہوتے تھے لیکن اب ٹرانسسٹر کی ایجاد نے اسے بہت آسان اور سستا کر دیا اب ہر آدمی کی اس تک رسائی ہے۔ ریڈیو اب ایک عوامی ذریعہ ابلاغ ہے جو دنیا کے کونے کونے میں سنا جا سکتا ہے اس سے نہ صرف قومی نوعیت کے اہم پروگرام، واقعات، حادثات اور اخبار کا پتہ چلتا ہے بلکہ علاقائی اخبار و واقعات کا علم بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ تفریحی، ادبی اور موسیقی کے پروگراموں کے ذریعے معلومات کے اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ ریڈیو حقیقی معنوں میں عوامی ذریعہ ابلاغ کا مقام رکھتا ہے۔ اس ذریعہ ابلاغ کے موثر ہونے کی وجہ سے اس کو تعلیمی، عسکری اور انقلابی مقاصد کے لیے موزوں ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ ریڈیو ابلاغ کا موثر اور لامحدود رسائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

فلم

فلم پردہ سیمیں پر متحرک تصاویر کا ایک سلسلہ ہے جو کسی واقعہ یا کہانی کو بیان کرتا ہے۔ ٹامس ایڈیسن (Thomas Edison) نے 1889ء میں ایک مشین ایجاد کی جس سے متحرک تصاویر دیکھی جا سکتی تھیں 1894ء میں دیوار کے ساتھ ایک پردہ لگا کر اس پر متحرک تصاویر دیکھی گئیں۔ یہ سلسلہ مقبول ہوا اوپن ایر تھیٹروں اور بڑے ہالوں میں سکرین پر متحرک تصاویر دکھائی جانے لگیں۔ یہ خاموش تصاویر کسی مربوط کہانی پر مشتمل نہیں ہوتی تھیں اور ان کے ساتھ آواز شامل نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مربوط کہانیاں شامل ہونے لگیں 1903ء میں The great train robbery نامی فلم ایک مکمل کہانی کی صورت میں پیش کی گئی۔ دنیا کی پہلی بولتی فلم 1926ء میں بنائی گئی جب کہ برصغیر میں 1931ء میں عالم آرا کے نام سے پہلی بولتی فلم تیار کی گئی۔

فلم ابلاغ عامہ کا ایک اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ ٹیلیویژن کی ایجاد سے پہلے فلم ایک نہایت مقبول اور موثر ترین ذریعہ ابلاغ تھی۔ فلم کسی کہانی یا واقعہ پر مبنی ایک مکمل پیش کش ہوتی ہے۔ آج بھی اچھی فلموں کے لیے لوگوں میں طلب ہے اور سینما گھروں میں رونق ہوتی ہے۔ فلمیں بنیادی طور پر موضوعاتی ہوتی ہیں، رومان، تاریخی واقعات، نفسیاتی مسائل، جاسوسی معاملات اور سب سے بڑھ کر نظریاتی پروپیگنڈا، وہ اہم موضوعات ہیں جن پر فلمیں بنتی ہیں۔ معاشرتی مسائل بھی فلموں کا اہم موضوع ہیں۔ جنگی پروپیگنڈے پر مبنی فلمیں دشمن کے مورال کو گھٹانے اور اپنی قوم کے مورال کو بلند کرنے کا اہم وسیلہ ہوتی ہیں۔

مغرب میں تشدد پر مبنی فلموں نے دنیا کا رخ تبدیل کیا ہے۔فلم کے ذریعہ قومی اور بین الاقوامی معاملات پر مرتب معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں فلم عام افراد کے لیے تفریح کا سستا ذریعہ ہے۔فلم ایک ایسا اہم اور موثر ذریعہ ابلاغ ہے جس سے معاشرتی و سیاسی مسائل کو واضح کر کے افراد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔بدقسمتی سے ہمارے ہاں فلم کو جنسی کشش، مار دھاڑ اور غیر سنجیدہ اظہار کے ذریعہ خراب کر دیا گیا ہے ورنہ اس ذریعہ کو بہترین مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔مغرب نے بعض تاریخی فلمیں بنائی ہیں جن کی حیثیت اب کلاسیک کی ہوگئی ہے۔فلم تہذیبی استحکام اور معاشرتی یکجہتی پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ہمارے ہاں فحش مناظر کے ذریعہ فلم کو کامیاب بنانے کا آسان نسخہ دریافت کرلیا گیا ہے جو معاشرے میں بے حیائی پھیلانے کا بڑا ذریعہ ہے۔اگر سنجیدگی سے توجہ دی جائے تو قومی اور تہذیبی مسائل پر مبنی شاندار فلمیں بنائی جاسکتی ہیں۔

ٹیلیویژن

ٹیلیویژن دو لاطینی الفاظ ٹیلی اور ویژن (Tele-Vision) کا مجموعہ ہے جس سے مراد ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم دور کا نظارہ کر سکتے ہیں۔اس کا مخفف ٹی وی (T.V.) ہے ٹیلیویژن ریڈیو سے اگلی منزل ہے۔ریڈیو میں ہم آواز سنتے ہیں۔جبکہ ٹیلیویژن میں بولنے والے کی تصویر دیکھتے ہیں ٹیلیویژن بولنے والے کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ ہم سے گفتگو کر رہا ہے اور اب تو ایسی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے کہ ٹیلیویژن پر مذاکرہ یا کانفرنس بھی ہوسکتی ہے اور ایسے پروگرام تو عام ہیں جن میں ناظرین پیش کار سے سوال کر سکتے ہیں اور بحث و مباحثہ میں حصہ لے سکتے ہیں۔ٹیلیویژن کی ایجاد نے ابلاغ میں ریڈیو کے ذریعہ لائے ہوئے انقلاب کو وسیع، موثر اور ہمہ گیر بنا دیا ہے 1888ء میں ڈبلیو ہال ویکس (W.Hall Wakes) نے تصویر برقی لہروں میں تبدیل کرنے کا تجربہ کیا۔1925ء میں جان ایل برڈ (John L.Bird) نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا اور 1928ء میں ٹیلیویژن کی نشریات کو ایک پردے پر دیکھا گیا۔1930ء میں پہلی بار لندن میں تجارتی بنیادوں پر ٹیلیویژن کی نشریات کا دائرہ وسیع کیا گیا۔آغاز میں ٹیلیویژن پر سفید و سیاہ (Black and White) تصویر آتی تھی اور 1953ء میں رنگین نشریات کا آغاز ہوا۔

ٹیلیویژن ایسی ایجاد ہے جس نے دور دراز مناظر کو سمیٹ کر ہماری نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔یہ ذریعہ ابلاغ دید و شنید کا مجموعہ ہے۔اس سے نہ صرف واقعات کو بیان کیا جاتا ہے بلکہ ان کے ظہور پذیر ہونے کو دکھایا بھی جاتا ہے جس سے نہ صرف احساس شرکت بڑھتا ہے بلکہ اثر پذیری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ٹیلیویژن ایک کثیر المقاصد ذریعہ ابلاغ ہے۔تشہیر، تفریح، موسیقی، پروپیگنڈا، تعلیم و تدریس، ڈرامے، کھیل اور تحقیقی موضوعات اس کا دائرہ اثر ہیں ٹیلی ویژن ایسی بولتی مشین ہے جو ہر گھر کی ضرورت بن گئی ہے۔علم و آگہی کے علاوہ تفریح و تسکین کا بھی بڑا ذریعہ ہے بلکہ

لوگوں کی تنہائی کا ساتھی بھی ہے۔قومی اور بین الاقوامی نشریاتی اداروں نے پروگراموں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ چوبیس گھنٹے کی نشریات ہر لمحہ میسر ہیں۔سیٹلائٹ کی ایجاد نے اسے عالمی ذریعہ ابلاغ بنا دیا ہے اور دیکھنے والوں کو اتنے چینل مہیا ہیں کہ بعض اوقات انتخاب میں دقت پیش آتی ہے۔مغربی استعمار اس ذریعہ کو اپنے خصوصی مفادات کے لیے استعمال کر رہا ہے۔پروپیگنڈا، اشتہار بازی مخصوص نظریات اور منصوبوں کا تعارف مغرب کے خاص ہتھیار ہیں۔نفسیاتی جنگ میں جہاں ریڈیو ایک حد تک کام کر رہا تھا وہاں اب ٹیلیویژن نے غیر محدود امکانات کو متعارف کرایا ہے۔ بلاشبہ ٹیلیویژن اس وقت موثر ترین ذریعہ ابلاغ ہے۔اس کے متاثرین اور اس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ یہ ذریعہ ابلاغ اپنی افادیت اور تاثیر کی وجہ سے ملکی ثقافت کا ایک اہم جز بن گیا ہے۔ پلک جھپکتے میں ہم دنیا کے کسی کونے کی صرف خبر ہی نہیں سنتے بلکہ اس خبر یا واقعہ کے عملی مظاہر بھی دیکھ سکتے ہیں۔یہ غیر معمولی واقعہ ہے۔

ڈش انٹینا اور کیبل سسٹم

سٹیلائیٹ ٹیکنالوجی کی وجہ سے ٹیلیویژن پروگراموں میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔اب پوری دنیا کے پروگراموں کو دیکھا جا سکتا ہے اور کیبل سسٹم نے اسے عام آدمی تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔Dish Receiver اور Cable System سے دنیا بھر کے چینلز کو دیکھا جا سکتا ہے۔یہ معلومات کے سیلاب کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے ہوش ربا اثرات دکھائے ہیں بین الاقوامی سطح پر دکھائے جانے والے پروگراموں میں تفریحی، تہذیبی تعلیمی اور تخریبی ہر قسم کی چیزیں دکھائی جا رہی ہیں۔ ہر ملک کے اپنے مخصوص مفادات ہیں جنہیں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ اب تو بات بین الملکی نشریاتی اداروں کی ہے جو عالمی تہذیبی فروغ کے ذرائع ہیں اور ایک خاص نقطہ نظر کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔اطلاعات کا یہ سیلاب ہے جو انسانی آزادی کو اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے۔دیکھیں یہ سیلاب بلا کہاں جا کر رکتا ہے۔

آڈیو وڈیو ریکارڈنگ (Audio Video Recording)

ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں کو جس ایجاد نے موثر بنایا ہے وہ A.V.R ہے۔ایک ٹیپ ایجاد کی گئی جو آواز اور تصویر کو محفوظ کر لیتی ہے۔ براہ راست بولنے سے Live Performance سے ابلاغ تو ہوتا ہے لیکن وہ تقریر یا پیش کش ہوا میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ ٹیپ کی ایجاد نے اسے محفوظ کرنے کا طریقہ سکھایا۔اس طرح ریڈیو اور ٹیلیویژن نے پروگراموں کو ترتیب دینے اور مسلسل پیش کرنے کی سہولت پیدا کر دی۔اس سے نشریاتی اداروں کا کام آسان ہو گیا۔وہ اکثر پروگراموں کی ریکارڈنگ کرتے ہیں اور پھر انہیں ایڈیٹ کر کے مقررہ وقت پر نشر کرتے ہیں۔اس طرح انہیں مقرر اور پیش کار پر کنٹرول حاصل ہو گیا ہے اور اپنی مرضی سے پیش کرنے کا اختیار بھی۔ چونکہ نشریاتی ادارے مخصوص مفادات کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنی پالیسی کے خلاف کوئی چیز نشر نہیں ہونے دیتے۔اسی طرح وہ قیمتی پروگراموں کو محفوظ بھی کر لیتے

ہیں۔انٹرویوز، دستاویزی پروگرام اور تعلیمی وسائنسی پروگرام محفوظ ہو سکتے ہیں۔

ٹیپ ریکارڈر ریڈیو کی طرح ہر جگہ میسر ہے بلکہ اس وقت ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر اکٹھا کر دیا گیا ہے جس کے ذریعے ٹیپ شدہ لوازمہ سنا بھی جاسکتا ہے اور ریکارڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح V.C.R ہے جس کے ذریعے ویڈیو ٹیپ دیکھا جاسکتا ہے اور سنا بھی۔اور اب بات اس سے بھی آگے نکل گئی ہے۔سی ڈی کے ذریعے سننے اور دیکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔CD Player نے انسان کو غیر محدود رسائی عطا کر دی ہے۔اس ذریعہ کو عوامی سطح پر تفریحی، موسیقی اور تعلیمی و دینی مقاصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔علماء، سیاستدان، فن کار اور شعراء کی تقاریر و کلام کو محفوظ کرنے اور سننے کے لیے استعمال میں لایا جارہا ہے۔ٹیپ ریکارڈر تو اب عام ضرورت کی شے ءسمجھی جانے لگی ہے۔صحافی حضرات خصوصاً اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔خبریں، پریس کانفرنسیں، رہنماؤں کے بیانات وغیرہ لکھنے کی بجائے ریکارڈ کر لیے جاتے ہیں اور پھر حسب ضرورت پیش کر دیئے جاتے ہیں۔وی سی آر جدید دور کی ضرورت بن گیا ہے۔اب تو شادی بیاہ، سالگرہ وغیرہ تک کی تقریبات کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔اسی طرح سیاسی جلسوں اور تفریحی پروگراموں کو ریکارڈ کیا جاتا ہے وی سی آر کو تعلیمی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔یہ صرف ٹیلیویژن کے لیے ہی مفید نہیں ثابت ہوا بلکہ عوامی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی فائدہ مند سمجھا جارہا ہے۔

Multimedia -OHP

ہیڈ پروجیکٹر (OHP) اور سلائیڈز ابلاغ کا ایک ذریعہ ہیں اس ذریعہ کو عام طور پر تعلیم و تدریس، کانفرنسوں، سیمیناروں اور ورکشاپس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے،اب اس سے آگے کا مرحلہ ملٹی میڈیا کا ہے جو کمپیوٹر کے ذریعہ بات کو موثر بنائے جانے کا ذریعہ ہے۔

کمپیوٹر/انٹرنیٹ

کمپیوٹر بیسویں صدی کی انقلاب انگیز ایجاد ہے۔یہ ایک ایسی مشین ہے جس نے معلومات کی تنظیم و ترتیب اور فراہمی میں حیرت انگیز تاثیر دکھائی ہے۔کمپیوٹر کی ایجاد نے ابلاغ کی دنیا میں طلسماتی اثر پیدا کیا ہے۔ای میل اور انٹرنیٹ (Email and Internet) نے جغرافیائی اور وقتی فاصلوں کو ختم کر دیا ہے۔اس عجیب وغریب ایجاد نے دفتروں، تعلیمی اداروں، زرعی، صنعتی اور تجارتی شعبوں کو جدید ترین معلومات فراہم کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔علمی، تحقیقی اور صحافتی ضرورتوں کے لیے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ معلومات کے حصول اور ابلاغ کا ایک نہ ختم ہونے والا ذریعہ ہے۔انٹرنیٹ سسٹم نے پوری دنیا کو اس طرح باہم مربوط کر دیا ہے جیسے ایک گھر یا ایک گاؤں ہے جہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے مصروف گفتگو ہے۔

ابلاغ کے دو ماڈل

تخلیق آدمؑ کے واقعہ میں اظہار کے بعد دو اسلوب موجود ہیں۔ یہی دو اسلوب حیات انسانی میں کارفرما نظر آتے ہیں ایک آدمؑ کا اظہار ہے اور دوسرا ابلیس کا۔ تخلیق کے یہ دونوں شاہکار اپنی شخصی خصوصیات اور اسلوب اظہار کے لیے دنیا میں ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں اگر ابلاغ اور اظہار کے اسالیب پر غور کریں تو دو ماڈل نظر آتے ہیں۔ ایک ماڈل جسے پیغمبرانہ ماڈل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرا ابلیسی ماڈل۔ تاریخ انسانی انہی دو ماڈلوں کے گرد گھومتی ہے۔

پیغمبرانہ ماڈل

خالق کائنات نے انسان کو بولنے کی صلاحیت دی۔ اس سے خود مخاطب ہوا اور اسے اپنی بات پہنچانے اور مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ سکھایا، ہدایت ربانی کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے انسان نے اپنے رب سے نیاز مندانہ اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ جو عین حق وصداقت ہے اس نے انسان کو حق وصداقت کے اظہار کا حکم دیا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی ہر بات حق وصداقت کا نمونہ ہوتی ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ حق وصداقت کا ابلاغ کرے۔ آدمؑ کی بات سچی، نرم اور انکساری پر مبنی تھی۔ نسل انسانی کے لیے ابلاغ کا وہی ماڈل مطلوب ہے جسے آدمؑ نے اختیار کیا۔ اس ماڈل کو تمام انبیاء صلحاء اور اتقیاء نے اختیار کیا اور یہی ماڈل ایک اسلامی معاشرے کا شعار ہے اور صداقت اس ماڈل کی شناخت ہے۔ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۶)

اے اہل ایمان اللہ سے ڈرتے رہو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

جھوٹ اور جھوٹی گواہی کو اس ماڈل کے منافی قرار دیا اور اہل ایمان کو حق کی گواہی کا حکم دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (۱۷)

اے ایمان والو۔ انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لیے سچی گواہی دو خواہ اس میں تمہارا تمہارے ماں باپ رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔

مومنین کی صفات بیان کرنے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۱۸)

---

(۱۶) التوبہ/۱۱۹

(۱۷) النساء/۱۳۵۔ المائدہ/۸

(۱۸) الفرقان/۷۲

وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گذرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بزرگانہ انداز سے گذرتے ہیں۔

ابلاغ کے اس ماڈل میں صداقت ہے، انکسار ہے، جھوٹ اور فریب سے کنارہ کشی ہے۔ اسی ماڈل کو انبیاء نے پیش کیا اور یہی اسلامی معاشرے کی خصوصیت ٹھہری۔

اسلامی نظریۂ ابلاغ

اسلامی نظریۂ ابلاغ پیغمبرانہ ماڈل پر مبنی ہے۔ حق وصداقت اور تواضع وانکسار پر مبنی یہی ماڈل اسلامی نظریہ ابلاغ کی بنیاد ہے اس نظریہ کے بنیادی امور کو کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

- ☆ عقیدہ اسلامی کا غیر مبہم اظہار
- ☆ اسلامی اخلاق کی توضیح
- ☆ دعوت الی اللہ کا فروغ
- ☆ دینی ودنیوی تعلیم کی اشاعت
- ☆ مسلم تشخص کے حوالے سے سیاسی واجتماعی شعور کا استحکام
- ☆ صاف ستھری تفریح

اسلامی نظریہ ابلاغ ایک ایسا نظریہ ہے جس میں فرد کی عزت نفس معاشرے کی اصلاح اور ریاست کی تنظیم میں احتساب کے اصول کارفرما ہیں۔ اسلامی نظریہ ابلاغ میں ریاست انہی حدود میں فرد کی آزادی کی ضامن ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں ذرائع ابلاغ کی شناخت مندرجہ ذیل فرائض کی ادائیگی سے مستحکم ہوگی:

- ☆ احترام انسانیت۔
- ☆ نیکی کی اشاعت
- ☆ صحیح معلومات کا ابلاغ
- ☆ تجسس سے گریز
- ☆ صالح معاشرے کے قیام میں تعاون
- ☆ اخوت ویکجہتی کے قیام میں معاونت

احترام انسانیت

اسلام انسان کی تکریم کا درس دیتا ہے وہ اس کی عزت نفس اور جائز آزادی کی حفاظت کرتا ہے۔ شرف انسانیت اسلامی اجتماعیت کا سنگ بنیاد ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ انسانوں کی آزادی ضمیر اور عزت نفس کو مجروح کرنے کا انتظام کریں۔ حقوق العباد کا خیال اسلامی نظم معاشرت کی بنیادی قدر ہے۔ مسلمان کی عزت نفس پر حملہ بدترین زیادتی ہے۔(۱۹) ایک اسلامی ریاست کے ذرائع ابلاغ انسانی عظمت اور احترام آدمیت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی نشریات وتحریرات میں کوئی ایسا پروگرام شامل نہیں کریں گے جس سے انسان کی تحقیر و بے توقیری ہوتی ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا ایک ارشاد اس پالیسی کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ آپؐ سے منقول ہے۔

المسلم اخوالمسلم لا یظلمه ولا یسلمه. (۲۰)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس سے کنارہ کرتا ہے۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده والمومن من امنه الناس علی دمائهم و اموالهم. (۲۱)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے سلسلے میں مامون رہیں۔

بے قید و بے لگام صحافت ونشریات انسانی معاشرت میں تخریب کاری کا ذریعہ ہیں۔ اسلام ذرائع ابلاغ کو احترام انسانیت کے بنیادی اصول کا پابند بناتا ہے مطبوعہ یا الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ لوگوں کی پگڑیاں اچھالیں، عوام میں انتشار پھیلائیں اور لوگوں کی عزت نفس سے کھیلیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے توہین عزت کے قوانین بنا رکھے ہیں اور بے بنیاد الزامات کی وجہ سے کئی اخباروں کو جرمانے ہوئے اور سزائیں ہوئیں۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ دل آزاری اور توہین آمیز رویہ سے گریز کریں۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَـٰبِ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَـٰنِ (۲۲)

اے اہل ایمان! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری

---

(۱۹) ابوداؤد، کتاب الادب، باب المؤاخاۃ، ۲۹۰/۴

(۲۰) بخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب لا یظلم المسلم المسلم، ۳۳۰/۱

(۲۱) ایضاً، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون، ۶/۱

(۲۲) الحجرات/۱۱

عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پہ طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔

اسلامی نقطہ نظر سے ذرائع ابلاغ کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ طنز و تعریض، الزام تراشی مذاق اڑانے اور عیب جوئی کا طریقہ اختیار کریں۔ معاشرے کے اندر محاذ آرائی نقصان کا باعث ہے اور اسلامی معاشرہ یکجہتی کی فضا کو قائم کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

نیکی کی اشاعت

نیکی کا فروغ اور برائی کی روک تھام اسلامی معاشرت کا بنیادی اصول ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ کو اسی اصول کی پابندی کرنا ہوگی۔ قرآن نے اس اصول کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ اسلامی نصب العین کا ایک نہایت ہی اہم پہلو نیکی کا فروغ اور برائی کا سد باب ہے۔ برائی چھوٹی ہو یا بڑی ظاہری ہو یا خفیہ معاشرے کی صحت کے لیے مضر ہے۔ برائی کی خصوصیت ہے کہ وہ جلد پھیلتی ہے۔ وہ نہ صرف پھیلتی ہے بلکہ نیکی کا رستہ بھی روکتی ہے اس لیے برائی کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی بلکہ اس سے صرف نظر بھی معاشرے کے اجتماعی سکون کے لیے مہلک ہے۔ قرآن مجید نے تو امت مسلمہ کے وجود کا مقصد ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۲۳)

تم دنیا میں بہترین امت ہو جسے انسانوں کے لیے اٹھایا گیا۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

امت مسلمہ کو یہ فریضہ انجام دیتے رہنا چاہیے ورنہ اس کی اجتماعی زندگی میں بگاڑ کی ایسی صورتیں پیدا ہوں گی کہ ان کی اصلاح مشکل ہو جائیگی۔ حضور اکرم ﷺ نے امت کو اس سلسلے میں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف و لتنھون عن المنکر اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذا بآمنہ فتدعونہ ولا یُستَجِیب لکم۔ (۲۴)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمہیں نیکی کا ضرور حکم دینا ہوگا اور برائی سے ضرور روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہو کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے پھر تم اسے پکارو گے اور تمہیں جواب نہ آئے گا۔

اس وقت امت مسلمہ کی جو حالت ہے وہ اسی فریضہ سے غفلت کے نتیجے میں ہے۔ نیکی کا فروغ اور بدی کا سد باب

(۲۳) آل عمران/۱۱۰

(۲۴) ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف و النھی عن المنکر، ۳۹/۲

اسلامی نصب العین کا حصہ رہا ہے۔اسلامی ریاست میں ذرائع ابلاغ کی پوری پالیسی اسی اصول کے تابع ہونی چاہیے۔ایسی خبریں، ایسے ڈرامے ایسے تفریحی پروگرام اور ایسی تشہیر جو نیکی کے تصور کے خلاف اور بدی کے فروغ کا ذریعہ بنیں نا قابل قبول ہیں۔اسلامی نظریہ ابلاغ میں نیکی کا فروغ وہ اساسی پتھر ہے جس پر میڈیا کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

فواحش ومنکرات کا سدباب

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' میں دو حقیقتیں بیان ہوئی ہیں ایک معروف کا حکم اور دوسرے منکر سے روکنا ہے۔منکرات شیطانی تدبیر کا حصہ ہیں لہٰذا شیطان کے پیرو منکرات کے فروغ سے اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔اس سے معصیت الٰہی پختہ ہوتی ہے اور اسی سے نیکی کا راستہ رکتا ہے۔منکرات میں سب سے بڑا درجہ فواحش کا ہے۔فحاشی بنیادی طور پر ایسی گفتگو اور ایسا عمل ہے جو انسان کو بدکاری پر آمادہ کرے جیسے فحش مکالمے جنسی جذبات کو ابھارنے والے گیت، عریاں تصاویر، فحش افسانے، ناول، نظمیں اور مضامین وغیرہ۔قرآن مجید نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ فواحش کے قریب نہ پھٹکیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَ مَابَطَنَ (۲۵)

فواحش کے قریب بھی مت پھٹکو خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا چھپی ہوئی۔

مفسرین قرآن کے مطابق فواحش کا اطلاق ان تمام افعال پر ہوتا ہے جن کا قبیح ہونا ہر شخص پر فطرتاً واضح ہے اور جن کی برائی، قباحت اور خباثت انسانی ضمیر پر واضح ہو۔فواحش کو پھیلانا دنیا وآخرت میں سزا کا مستوجب ہے قرآن نے کہا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ (۲۶)

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا وآخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اسلام کے پاکیزہ معاشرے کے لیے فواحش کا پھیلنا مہلک ہے اس لیے اسلامی معاشرے کے ذرائع ابلاغ ان حدود و قیود کے اندر رہ کر کام کریں گے جنہیں قرآن وسنت نے متعین کیا ہے۔اسلام عریانی وفحاشی، بے حیائی اور جنسی آوارگی کی ہرگز اجازت نہیں دیتا لہٰذا ذرائع ابلاغ آزادی کے نام پر فحش مکالمے، عریاں مناظر اور حیا سوز حرکتوں کی نشر واشاعت نہیں کر سکتے۔اسلام فلموں، ڈراموں اور رقصوں میں شرم وحیا کے تقاضوں کے خلاف حرکات کو ممنوع قرار دیتا ہے۔مخلوط

---

(۲۵) الانعام/۱۵۲

(۲۶) النور/۱۹

مجالس زنانہ حسن کی نمائش میوزیکل شو اور مکالماتی پروگرام جن میں آزادانہ جنسی اظہار کی جملہ بازیاں اور آوارہ مزاجی کی حوصلہ افزائیاں ہوں کسی طرح بھی ذرائع ابلاغ کے اسلامی تصور سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے حیائی اور فحاشی پھیلانے میں ابلیسی ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معاشروں میں پائی جانے والی فحاشی، عریانی اور اخلاقی بے راہ روی کی ذمہ داری ذرائع ابلاغ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ بے حیائی کا فروغ جرائم اور نفسیاتی امراض کو جنم دیتا ہے اور بالآخر معاشرے ایسے انتشار کا شکار ہوتے ہیں کہ ان میں خیر کے کاموں کے لیے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

ذریعہ ابلاغ کی کوئی بھی قسم ہو کوئی بھی شکل وصورت ہو، اس کے دائرہ اثر کی کوئی بھی وسعت ہو اور اس کی فنی خصوصیات کی کوئی بھی نوعیت ہو، اسے ہر حال میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اصول کی پابندی کرنا ہوگی۔ یہ اصول ذرائع ابلاغ کے دائرہ کار کی حدود متعین کرتا ہے اور اسے معاشرے کے لیے مثبت اور مفید بناتا ہے۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی عملی تطبیق کے لیے ذرائع ابلاغ کی تاثیر کو استعمال کرے اور انہیں شر وفساد کا آلہ کار نہ بننے دے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلامی معاشرے کی بشمول ذرائع ابلاغ قوت محرکہ بھی ہے۔ اور قوت ماسکہ بھی۔

نجی زندگی کا تحفظ

اسلام فرد کی نجی زندگی (Privacy) کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ معاشرے اور ریاست کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ شہریوں کی نجی زندگی کو بے نقاب کیا جائے Violation of Privacy قابل قبول نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ذرائع ابلاغ کا یہ کام نہیں وہ عیب جوئی، غیبت، بدگمانی، لوگوں کے راز معلوم کرنے، معاملات کی ٹوہ لگانے اور کریدنے کا کام کریں۔ اسی طرح تجسس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اسلام ریاست کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ شہریوں کے معاملات کی جاسوسی کرے یا ذرائع ابلاغ کو اس مقصد کے لیے استعمال کرے۔ آج جسے تفتیشی صحافت (Investigative Jornalism) کہا جاتا ہے۔ اس میں اس امر کے قوی امکانات ہوتے ہیں کہ لوگوں کے عیوب بے نقاب ہوں اور وہ بلیک میل ہوں۔ اسلام نے اپنے شہریوں کو تجسس، چغلی، غیبت اور بہتان تراشی سے مکمل تحفظ فراہم کیا ہے اور نجی زندگی (Privacy) کو انسان کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق ذرائع ابلاغ کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ افراد کی نجی زندگی کے بارے میں کھوج لگاتے پھریں کیونکہ ایسا کرنا اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اور اس سے معاشرے میں فساد پھیلتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی لیے فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب

بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (۲۷)

اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔

حضور اکرم ﷺ نے اسے مزید وضاحت سے بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ سے منقول ہے۔

ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولاتنا جبشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا و کونو عباداللّٰہ اخوانا(۲۸)

بدگمانی سے بچ کر رہو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑھ کر جھوٹ بات ہے، اور نہ کسی کی راز جوئی کرو اور نہ کسی کی جاسوسی کرو اور نہ قیمت بڑھانے کے لیے بولی دو اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ باہم روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔

صحیح معلومات کا ابلاغ

اسلامی نقطہ نظر سے خبر کی صحت ابلاغ کی اولین شرط ہے۔ معلومات میں اگر صداقت (Truth) اور ثقاہت (Credibility) کے عناصر موجود نہیں ہیں تو وہ فریب کاری ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اطلاعات کی فراہمی اور خبروں کی اشاعت میں بے احتیاطی کئی مسائل کا باعث بنتی ہے۔ بندوں کے حقوق کے سلسلے میں اولین بات ان کی عزت و وقار ہے۔ ذرائع ابلاغ کسی فرد یا گروہ کے بارے میں غلط اطلاع دے کر اس کا وقار مجروح کرتے ہیں اس لیے اسلامی اصول کے مطابق ذرائع ابلاغ کو سچائی اور حقیقت پر مبنی معلومات مہیا کرنا ہوں گی۔ قرآن مجید مومنوں کو راست گوئی کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (۲۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔

قرآن صرف صداقت پر قائم رہنے ہی کی بات نہیں کرتا وہ مومنوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سچ کا ساتھ دیں اور سچے لوگوں کے ساتھ شامل رہیں: فرمایا!

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۳۰)

---

(۲۷) الحجرات/۱۲-۱۳

(۲۸) بخاری، کتاب الادب، باب ماینهی عن التحاسد، ۸۹۶/۲

(۲۹) الاحزاب/۷۰

(۳۰) التوبہ/۱۱۹

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

ذرائع ابلاغ جب معلومات فراہم کرتے ہیں تو وہ ایک طرح کی گواہی ہوتی ہے۔ گواہی کے سلسلے میں دو باتیں اہم ہیں ایک یہ کہ گواہی سچ پر مبنی ہو اور دوسرے یہ کہ گواہی کو چھپایا نہ جائے۔ ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ سچی بات کی اشاعت اور سچ کو چھپانے کا ارتکاب نہ کریں۔ قرآن مجید نے ان دونوں باتوں کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔ حق کی گواہی کے بارے میں مومنین کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

والذین لا یشھدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراما(۳۱)

اور جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گذرتے ہیں

ذرائع ابلاغ کو جھوٹی خبروں کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے اس لیے کہ جھوٹی خبر کی اشاعت جھوٹی گواہی کے مترادف ہوتی ہے۔ اسی طرح سچی خبر کا اخفا بھی کتمان شہادت کے مساوی ہے۔ قرآن مجید نے کتمان شہادت سے واضح طور پر منع فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

ولا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانه اثم قلبه واللہ بما تعملون علیم(۳۲)

اور شہادت کو ہرگز نہ چھپاؤ جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ آلودہ ہوتا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

اسلامی ریاست کے ذرائع ابلاغ جھوٹی افواہوں اور بے بنیاد خبروں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں اور معاشرے کو فساد انگیز اور فتنہ سامان معلومات سے محفوظ رکھیں۔ افواہ طرازی اور بہتان تراشی سے گریز کرنا چاہیے۔ اسلام اطلاعات کی بہم رسانی میں تحقیق کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

یا ایھا الذین امنوا ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علی مافعلتم ندمین۔ (۳۳)

اے ایمان والو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو یہ نہ ہو کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو پھر تم کو اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔

---

(۳۱) الفرقان/۷۲

(۳۲) البقرہ/۲۸۳

(۳۳) الحجرات/۶

صالح معاشرے کے قیام میں معاونت

اسلامی ریاست کا مقصد وجود صالح معاشرے کا قیام و تحفظ ہے۔ ریاست کے تمام اعضاء معاشرتی استحکام کیلئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے اگر ذرائع ابلاغ کے اہداف اور ریاست کے اہداف میں تضاد و تصادم ہے تو معاشرہ فساد و انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اسلامی ریاست میں ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کریں جن پر ریاست عمل پیرا ہے۔ اسلامی عقائد کی پاسداری، اخلاقی اقدار کے تحفظ اور اسلامی روایت کی حفاظت میں وہ اسلامی ریاست کے ممد و معاون ہوں گے۔ اگر اسلامی ریاست اللہ کی سرزمین پر اس کے احکام کو نافذ کرتی ہے تو ذرائع ابلاغ کو اس کی اہمیت اور اس کی تاثیر کو پوری قوت کے ساتھ نشر کرنا چاہیے اور جھوٹ شر اور فساد کو مٹانے کے لیے ریاست کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ ذرائع ابلاغ ریاست کی پالیسوں کے تعارف اور نفاذ میں اس کے دست و بازو کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح شیطانی ریاستوں کے مقاصد کے فروغ میں ذرائع ابلاغ کی مؤثر معاونت ہے اسی طرح اسلامی ریاست کے مقاصد کے فروغ میں بھی ذرائع ابلاغ کو بھرپور تعاون مہیا کرنا چاہیے۔ معاشی، معاشرتی، سیاسی مسائل میں مثبت اپروچ کے ساتھ معاشرے کی تربیت کرنا ذرائع ابلاغ کے فرائض میں سے ہے۔ اسلامی شخصیت کی تعمیر اور فرد و ریاست کے درمیان متوازن تعلق کے سلسلے میں بھی ذرائع ابلاغ کا کردار بے حد اہم ہے۔

اخوت اسلامی کا فروغ

مسلم معاشرے کا استحکام اسلام کے اصول اخوت پر مبنی ہے۔ اسلامی معاشرہ رنگ و نسل اور وطن و جغرافیہ کے بجائے عقیدہ کی وحدت پر منظم ہوتا ہے اور عقیدے ہی کی بنیاد پر افراد معاشرہ اخوت کے رشتے میں جڑے ہوتے ہیں۔ تخریبی قوتیں مسلمانوں کی یک جہتی اور رشتہ اخوت کو تباہ کرنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ جذبہ اخوت کی آبیاری کے لیے اقدامات کرے اور ان عوامل کا قلع قمع کرے جو رشتہ اخوت کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا کردار یہ ہے کہ وہ اس جذبہ اخوت کو مستحکم کرنے کے سلسلے میں اپنی تاثیر استعمال کرے اور اسلامی ریاست کے ساتھ تعاون کرے۔ ذرائع ابلاغ کی مدد سے منفی قوتوں کے زور کو توڑا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے مومنوں کے بارے میں فرمایا:

انما المو منون اخوة فاصلحوا بين اخويكم و اتقو الله لعلكم ترحمون (۳۴)

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر

---

(۳۴) الحجرات/۱۰

رحمت کی جائے۔

ذرائع ابلاغ اس جذبہ اخوت کو بیدار رکھ کر مسلم معاشرے کی یک جہتی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اس تصور اخوت کے سلسلے میں فرمایا:

انّ المومن للمومن کالبنیان یَشُدُّ بعضه بعضا ثم شبك بین اصابعه (۳۵)

مومن مومن کے لیے مکان کی مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے پھر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں۔

ایک اور حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

تری المومنین فی تراحمهم و توادِّهم و تعاطفهم کمثل الجسداذا اشتکی عضواً تداعی له سائر الجسد بالسهر و الحُمی (۳۶)

تو ایمان والوں کو آپس کی رحمت اور محبت اور مہربانی میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا۔ جب کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تمام بدن کے اعضاء بے خوابی اور تپ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مرتبہ آپ ﷺ نے اسی طرح کی بات کی:

المسلمون کرجل واحدٍان اشتکی عینه اشتکی کله وان اشتکی راسه اشتکیٰ کله (۳۷)

تمام مسلمان ایک آدمی کی مانند ہیں اگر اس کی آنکھ میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اگر سر دکھتا ہے تو سارا بدن دکھنے لگتا ہے۔

یہ آیات واحادیث مسلم معاشرے کی نوعیت متعین کرتی ہیں۔ اسلامی ریاست اسی معاشرے کی محافظ اور اس کے ذرائع ابلاغ معاون و مددگار کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ذرائع ابلاغ امت مسلمہ کی وحدت واخوت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اسلامی ذرائع ابلاغ معاشرے سے فتنہ وفساد، خود غرضی ولالچ اور بغض وحسد کو ختم کر کے محبت واخوت کے جذبات کو پروان چڑھاتے ہیں اور عفو و درگذر، ہمدردی وغم گساری اور خیر خواہی و ایثار کے اوصاف کو معاشرے میں جاگزیں کرتے ہیں۔

---

(۳۵) بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب تشبیك الاصابع فی المسجد وغیرہ/۸۳؛ کتاب المظالم باب نصر المظلوم/۳۹۳؛ مسلم، کتاب البر والصلہ، باب تراحم المومنین/۱۱۳۱، حدیث:۲۵۸۹

(۳۶) بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم/۱۰۰۱۔ حدیث:۶۰۱۱؛ مسلم، کتاب البر، باب تراحم المومنین/۱۱۳۱، حدیث/۶۶

(۳۷) مسلم، کتاب البر، باب تراحم المومنین/۱۱۳۱، حدیث:۲۵۸۹

ابلیسی ماڈل

تخلیق آدمؑ پر اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی علمی برتری کے باعث ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو تمام فرشتوں نے حکم کی بجا آوری کی لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی معصیت کی۔ جب اس سے معصیت کا سبب پوچھا گیا تو اس نے ازرہ غرور کہا کہ وہ آدمؑ سے برتر ہے کیونکہ آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور وہ آگ سے بنایا گیا۔ قران نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قال مامنعك الاّتسجد اذامر تك. قال انا خير منه خلقتني من نارو خلقته من طين (۳۸)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟ اس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔

خالق کائنات نے اسے اس تکبر کی وجہ سے راندۂ درگاہ کر دیا۔ آدمؑ کے اعتراف خطا کے مقابلے میں ابلیسی رویے میں غرور اور نسل پرستی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ابلیس نے انکار پر نہ صرف بے سبب حجت بازی کی بلکہ اپنے رب کو چیلنج کیا اور اس سے مہلت مانگی کہ وہ اپنے طریق ابلاغ سے نسل آدمؑ کو گمراہ کرے گا۔ اپنے غرور پر نادم ہونے کی بجائے رب تعالیٰ سے مقابلے پر اتر آیا۔

قال انظرني الى يوم يبعثون. قال انك من المنظرين. قال فبما اغويتني لاقعدن لهم صراطك المستقيم. ثم لاتينهم من بين ايديهم و من خلفهم و عن ايمانهم و عن شمائلهم و لا تجداكثرهم شكرين (۳۹)

اس نے کہا مجھے اس دن تک مہلت عطا فرما جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا تجھ کو مہلت دی جاتی ہے۔ پھر شیطان نے کہا کہ مجھے تو تو نے ملعون کیا ہی ہے میں بھی تیرے سیدھے رستہ پر ان کو گمراہ کرنے کے لیے بیٹھوں گا پھر ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے آؤں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گذار نہیں پائے گا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

قال رب بما اغويتني لازينن لهم في الارض ولا غوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين (۴۰)

اس نے کہا: پروردگار! جیسا تو نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے گناہوں کو آراستہ

---

(۳۸) الاعراف/۱۲۔ اس مضمون کو دیگر مواقع پر بیان کیا گیا ہے: الحجر/۳۳: ص/۷۶

(۳۹) الاعراف/۱۴۔۱۷

(۴۰) الحجر/۳۹۔۴۰

کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔ہاں ان میں سے جو تیرے مخلص بندے ہیں ان پر قابو پانا مشکل ہوگا۔

اگر غور کریں تو واضح ہوگا کہ ابلیسی طریق ابلاغ میں غرور ہے، فریب ہے، حسد ہے اور جھوٹ ہے۔شیطان نے پوری انسانی زندگی میں نسل آدمؑ کو گمراہ کرنے کے لیے دھوکہ، فریب، جھوٹی آرائش اور دلکشی رکھی ہے۔پوری انسانی تاریخ میں پیغمبرانہ ابلاغ اور ابلیسی ابلاغ کے ماڈل ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔دور حاضر کا شریہ ہے کہ اس میں شیطانی طریق ابلاغ جدید بے خدا تہذیب کا موثر ہتھیار بن گیا ہے۔دین و اخلاق کا طالب علم جانتا ہے کہ ابلیسی ماڈل کن کن راستوں سے موثر ثابت ہو رہا ہے۔ابلیسی ماڈل کی خصوصیات میں چند اہم درج ذیل ہیں۔

☆ انسانیت کی تذلیل

☆ بدی کا فروغ

☆ فواحش و منکرات کی اشاعت

☆ جھوٹ کا فروغ

☆ معاشرتی انتشار

☆ جاسوسی و بدگمانی کا چلن

ابلاغ جس طرح پیغمبرانہ منہاج میں اہمیت رکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ ابلیسی منہاج میں اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ابلیسی مشن میں ذرائع ابلاغ کا کلیدی کردار ہے۔ابلیسی حکمت عملی میں فحاشی و عریانی کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو شرف عطا کیا ہے اس میں شرافت و حیاء کو سنگ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ابلیس اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور انسان کو انفرادی طور پر اور انسانی معاشروں کو اجتماعی طور پر اس اخلاقی قدر سے محروم کر دیتا ہے۔اس کے لیے وہ تمام نفسیاتی حربے استعمال کرتا ہے جن سے وہ انسان کو آمادہ جرم کر سکے اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو معصیت الٰہی کے ارتکاب پر آمادہ کرے۔ایک مرتبہ انسان یا معاشرہ اس کا ارتکاب کر لیتا ہے تو پھر اس کا کام آسان ہو جاتا ہے۔قصہ آدم و ابلیس میں قرآن نے اس کی اس تدبیر کو مفصل بیان کیا ہے۔اس تدبیر میں جھوٹ، فریب، وسوسہ اور دلفریب وعدہ سب شامل ہیں۔قرآن نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

فوسوس لهما الشيطن ليبدى لهما ماورى عنهما من سواتهما و قال ما نهكما ربكما عن هذه الشجرة الا ان تكونا ملكين اوتكونا من الخلدين. و قاسمهما انى لكما لمن النصحين (۴۱)

پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں انہیں کھول دکھائے اس نے کہا: تمہارے رب نے اس درخت سے جو تمہیں روکا ہے تو اس لیے کہ تم دونوں فرشتے بن جاؤ یا

(۴۱) الاعراف/۲۰-۲۱

ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں ہو جاؤ اور اس نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں حقیقت میں دونوں کا خیر خواہ ہوں۔

آدمؑ وحوا اس کے پر فریب وعدوں میں آ گئے اور معصیت الٰہی کے ارتکاب کی وجہ سے ابدی لباس سے محروم ہو گئے۔ قرآن بیان کرتا ہے۔

فدلهما بغرور فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواتهما و طفقا يخصفن عليهما من ورق الجنة (۴۲)

غرض اس نے دھوکہ دے کر (معصیت کی طرف) کھینچ ہی لیا جب انہوں نے اس درخت کا پھل چکھا ان کے ستر ان پر کھل گئے اور وہ جنت کے درختوں کے پتے لے کر اپنے اوپر چپکانے لگے۔

ابلیس نے فریب کاری سے آدمؑ وحوا کو عریاں کیا۔ یہ اس کا انسان پر پہلا حملہ تھا پیغمبرانہ ابلاغ میں اس فریب کاری کو بے نقاب کیا گیا اور نسل آدم کو سمجھایا گیا کہ شیطان کے اس حملے سے خبردار رہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يبنی آدم لا يفتننكم الشيطن كما اخرج ابويكم من الجنة ينزع عنهما لبا سهما ليريهما سواتهما۔ انه يركم هو و قبيله من حيث لا ترونهم انا جعلنا الشيطين اولياء للذين لا يومنون (۴۳)

اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اس فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تا کہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

شرم وحیا کا فقدان شیطانی تہذیب وثقافت کا بنیادی پتھر ہے۔ اس لیے ابلیسی ذرائع ابلاغ میں فواحش ومنکرات کی اشاعت اور بے حیائی کا فروغ اصل مقصد ہے، کیونکہ اس سے ہدف کو نرم کیا جاتا ہے اور پھر آسان وار سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب چونکہ شیطانی تہذیب ہے اس لیے بے حیائی کا فروغ اس کا مقصد اولیں ہے۔

فواحش ومنکرات کی اشاعت

دور حاضر کے ذرائع ابلاغ کو فواحش کے فروغ میں بے پناہ قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ قدیم عہد میں اس کا ارتکاب محدود پیمانے پر ہوتا تھا۔ حکمران گروہ اور صاحب ثروت افراد عیاشی میں مبتلا ہوتے۔ شراب، زنا، بدکاری وعریانی کا استحقاق چند طبقات تک محدود تھا۔ اس کا ذکر شعراء کے اشعار یا قصہ گوؤں کے بیانات میں ہوتا لیکن دور حاضر کے ابلیسی

---

(۴۲) الاعراف/۲۲

(۴۳) الاعراف/۲۷

ذرائع ابلاغ نے اسے گھر گھر پہنچا دیا ہے۔طوائف جو معاشرتی طور پر نا قابل قبول کردار تھا اسے دنیا میں مقبول بنایا گیا اور اب طوائف کلچر کا فروغ ریاست کی مختلف پالیسیوں میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔طوائف کلچر کے فروغ میں شعراء، ادباء، کہانی نویس اور ڈرامہ نگار سب شامل ہیں۔مغرب چونکہ حیا کے بنیادی وصف سے محروم ہے اس لیے اس کا ادب، آرٹ اور تفریح سب بے حیائی کے مظہر اور فحاشی کے فروغ کا باعث ہیں۔جنسی آوارگی ان کی تہذیب کا خاصہ ہے قرآن مجید نے اہل کفر ونفاق کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

المنفقون والمنفقت بعضهم من بعض يامرون بالمنكرو ينهون عن المعروف و يقبضون ايديهم. نسوالله فنسيهم ان المنفقين هم الفسقون۔ (۴۴)

منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کی طرح ہیں برے کام کا حکم دیتے ہیں اور نیک کاموں سے منع کرتے ہیں اور خرچ کرنے سے ہاتھ بند کئے رہتے ہیں انہوں نے اللہ کو بھلا دیا بیشک منافق نافرمان ہیں۔

فواحش کا ارتکاب شیطانی حکمت عملی کا حصہ ہے قرآن انسان کو خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

یاایها الناس کلوا مما فی الارض حللاً طیباً ولا تتبعوا خطوت الشیطن. انه لکم عدو مبین انما یامرکم بالسوء والفحشاء وان تقولوا علی الله ما لاتعلمون (۴۵)

لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تم کو برائی اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں۔

یاایها الذین امنوالا تتبعو اخطوت الشیطن ومن یتبع خطوت الشیطن فانه یامر بالفحشاء والمنکر۔ (۴۶)

اے اہل ایمان! شیطان کے قدموں پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو شیطان تو بے حیائی کی باتیں اور برے کاموں کا حکم دے گا۔

اسلامی معاشرے میں فواحش کی اشاعت قابل مذمت اور موجب عذاب ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنو الهم عذاب الیم فی الدنیا والاخرة والله یعلم وانتم لا تعلمون (۴۷)

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے ان کو دنیا وآخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا

---

(۴۴) التوبہ/۶۷

(۴۵) البقرہ/۱۶۸۔۱۶۹

(۴۶) النور/۲۱

(۴۷) النور/۱۹

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس پس منظر میں جدید ذرائع ابلاغ کو دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کام فواحش کی اشاعت کے سوا کچھ نہیں۔ موجودہ ذرائع ابلاغ نوجوان نسل کو عریانی، فحاشی اور جنسی بے راہ روی کی دلدل میں دھکیل رہے ہیں۔ فیشن شو، اشتہارات، شوبز، ڈریس ڈیزائننگ اور گلیمر کی آڑ میں بے حیائی کا سیلاب ہے جو تمام اخلاقی قدروں کو ساتھ بہائے لے جا رہا ہے۔ ڈش انٹینا اور کیبل نیٹ ورک ہر قسم کی نشریات و مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی چینلز میں جنسی فلمیں اور موسیقی کے پروگرام آوارگی پھیلانے کا بین الاقوامی ایجنڈا ہے۔ شعر و موسیقی کے منفی اثرات کا ذکر قرآن و سنت میں موجود ہے۔ عربوں کے ہاں یہ تصور تھا کہ کچھ لوگوں پر جنوں کا اثر ہوتا ہے تو وہ غیب کی خبریں بھی بتاتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا حضور اکرم ﷺ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ آپؐ شاعر ہیں اور آپؐ جنوں کے زیر اثر ہیں قرآن نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

وما علمنه الشعر وما ینبغی له ان هو الا ذکر وقران مبین۔ (۴۸)

اور ہم نے پیغمبرؐ کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو شایان ہے۔ یہ تو محض نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے۔

مزید فرمایا۔

هل انبئکم علی من تنزل الشیطین۔ تنزل علی کل افاك اثیم یلقون السمع واکثرهم کذبون۔ والشعراء یتبعهم الغاون۔ الم تر انهم فی کل واد یهیمون۔ وانهم یقولون مالا یفعلون۔ الاالذین امنوا وعملوا الصلحت وذکروا الله کثیراً۔ (۴۹)

لوگو! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترا کرتے ہیں وہ جعل ساز، بدکار پر اترا کرتے ہیں۔ سنی سنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا۔

ان شاعروں اور کاہنوں کی باتیں اور خیالات کا ایک محدود دائرہ تھا اور جاہلی کلچر میں بھی یہ اثرات اتنے عالمگیر نہ تھے جتنے جدید ذرائع ابلاغ سے ہو گئے ہیں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا کام معلومات، تعلیم اور تفریح مہیا کرنا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلومات کی تحریف، تعلیم کی تخریب اور تفریح کی تخسیس ہے جس میں فحاشی کے سوا کچھ نہیں پیش کیا جا رہا۔ فحاشی کی اشاعت میں ذرائع ابلاغ نے دو اہم طریقے استعمال کیے ہیں جنہیں ہم تفریحی و تشہیری کے عنوانات دے سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو تفریح و تشہیر کا بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

---

(۴۸) یٰسین/۶۹

(۴۹) الشعراء/۲۲۱۔۲۲۷

تفریح

تفریح عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ فرح ہے جس کے معنی خوشی، انبساط واطمینان کے ہیں۔ تفریح کا مطلب ایسا پروگرام جس سے طبیعت میں فرحت وانبساط ہو۔ انسانی تاریخ میں فرحت وانبساط کی سرگرمیاں محنت اور جدوجہد کے ساتھ چلتی رہی ہیں۔ افراد اور اقوام محنت اور جدوجہد کے ساتھ ایسے لمحات کی آرزو رکھتے ہیں جن میں سکون واطمینان حاصل ہو۔ انسانی طبیعت کا مطالبہ اور خواہش ہے کہ انسان کو خوش کن لمحے میسر آئیں۔ بعض افراد کے لیے اپنے خاندان میں بیٹھنا، گپ شپ کرنا، ایک دوسرے سے اظہار محبت وشفقت کرنا ہی سب سے بڑی تفریح ہے۔ پھر سیر وسیاحت، دلفریب مناظر فطرت کو دیکھنا بھی ایک تفریحی سرگرمی ہوسکتی ہے۔ کھیل تماشے اور شعر وموسیقی کی محفلیں بھی وجہ تفریح ہوسکتی ہیں۔ انسانی تاریخ میں ہر معاشرے نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق تفریحی پروگرام مرتب کیے ہیں۔ جاہلی تہذیبوں میں تفریحی سرگرمیوں میں کسی حد تک ایسے عناصر موجود رہے ہیں جنہیں ہم اخلاقی اعتبار سے نادرست قرار دے سکتے ہیں۔ موسیقی، رقص وسرود، کھیلوں کے مختلف میلے اور ان میلوں میں آزادروی کی بعض سرگرمیاں اس زمرے میں آتی ہیں۔ تفریح بلاشبہ حیات انسانی کا ایک اہم جز ہے جسمانی وذہنی محنت کے بعد انسان آرام وآسائش مانگتا ہے۔ تھوڑی سی آسائش اور آرام کے بعد انسان تازہ دم ہوجاتا ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ دور حاضر میں تفریح ایک مستقل مشغلہ بن گیا ہے اور کچھ افراد اور قومیں صرف تفریح ہی کے لئے زندہ ہیں۔ ہر وقت تفریح میں منہمک ہیں گویا زندگی صرف تفریح ہی کا نام ہے۔

جاہلی تہذیبوں میں تفریحی مشاغل اخلاقی قیود سے آزاد ہوتے ہیں اس لیے دور حاضر کی جاہلی تہذیب میں بھی تفریح اخلاقی حدود سے محدود نہیں ہے۔ شراب جوا بے ہنگم موسیقی اور عریانی وفحاشی تفریحی مشاغل شمار ہوتے ہیں۔ کھیلوں کا میدان بھی عریانی اور شور وشغب کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ تفریح کے نام پر جوا اور لاٹری کے ذریعہ انعامی اسکیموں کو جس طرح متعارف کرارہے ہیں اور مغربی معاشرت نے ناچ گانا، سٹہ، جوا، شراب نوشی، سود خوری آزاد جنسی تعلق، مخلوط مجالس اور مردوں عورتوں کی آزادانہ دوستی (Boy Friend, Girl Friend) کو ایک معمول (Norm) کے طور پر اختیار کررکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں جدید ذرائع ابلاغ ان اقدار کو متعارف کرانے کا موثر ذریعہ بن گئے ہیں۔ اسے تفریح کے نام پر عام کیا جارہا ہے۔ مغربی تصور تفریح کو ایک فن کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ بے راہ روی، جنسی آوارگی، ہیجان انگیز موسیقی، بے ہودہ رقص اور بے حیائی اور اخلاق باختگی کو فروغ دینے والی فلمیں، ڈرامے، میوزک شو اور اخلاق سوز مکالمات پرمبنی ٹاک شو ذرائع ابلاغ کے وہ اقدامات ہیں جو اسلامی معاشرے کے لیے شرمناک ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان ملکوں کے ذرائع ابلاغ بین الاقوامی طوائف کلچر کے پیرو ہیں اور مسلمان معاشروں میں اخلاقی باختگی اور فحاشی کو فروغ دے رہے ہیں۔ ارباب اختیار مغرب کی پیروی میں ذرائع ابلاغ کے انتظام کو انہی لوگوں کے سپرد کرچکے ہیں

جو کسی اخلاقی قدر اور کسی اسلامی اصول کے پابند نہیں۔ وہ اپنے معاشروں کو تباہی کے اس غار میں دھکیل رہے ہیں جس میں مغرب جا چکا ہے۔ عالم اسلام پر ثقافتی یلغار کا ایک خوفناک پہلو ہندوستان کی فلمیں اور موسیقی ہے۔ ہندوستان فحاشی کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ اس کی طوائفوں اور دلالوں کی بڑی منڈی مسلمان ممالک ہیں جن کے پالیسی ساز اسلامی شعور سے محروم ہونے کی وجہ سے ہندوستانی پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے مسلمان معاشرے ہندوستانی فلموں کی سب سے بڑی منڈی ہیں۔ ان معاشروں کی ہندو کمیونٹی اور ہندوستان کے سفارتخانے اس کاروبار کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایک طرف مسلمان معاشروں میں بدکاری کو فروغ دے رہے ہیں اور دوسری طرف ان سے قیمتی زرمبادلہ کما رہے ہیں۔ اس حقیقت سے مسلمان معاشروں کی قیادتوں کے اخلاقی اور عقلی دیوالیہ پن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تہذیبی کشمکش میں تفریح کا کردار

اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو کشمکش ہے اس میں بنیادی فرق عقیدہ اور اخلاقی قدروں کا ہے۔ اسلامی معاشرے میں تفریح اخلاقی حدود کے اندر رہ کر منائی جا سکتی ہے۔ اسلام ہر ایسی تفریحی سرگرمی کو قبول کرتا ہے جو اخلاق و شائستگی کے دائرے میں ہو۔ جو ذہن کو تازگی عطا کرے اور سیرت و کردار پر منفی اثر نہ ڈالے۔ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی ایک جہد مسلسل ہے اور تفریح اس کا ایک محدود دائرہ ہے۔ زندگی کا مقصد تعمیر حیات اور فکر آخرت ہے جب کہ جاہلی معاشروں میں تفریح کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید جاہلی معاشروں میں اخلاق و مذہب سے بیزاری ہے۔ وہاں اخلاقی بے راہ روی، جنسی ہوس، اختلاط مرد و زن کو فروغ حاصل ہے، خاندان بطور ادارہ کے انتشار کا شکار ہے اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ جنسی بیماریوں اور نفسیاتی امراض نے افراد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس کے باوجود اس کے تصور تفریح پر موسیقی، شراب اور جنسی ہوس کا غلبہ ہے۔

جاہلی تہذیب کا یہی تصور تفریح اس کا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ اسلامی معاشروں پر حملہ آور ہے۔ یہ تہذیبی جنگ ذرائع ابلاغ کے زور پر لڑی جا رہی ہے اور مسلمان مرد، عورت، جوان اور بچے سب اس یلغار کی زد میں ہیں۔ یہ تہذیبی جنگ مسلمانوں کے گھروں میں ٹی وی لاؤنج کے ذریعہ بپا ہے۔ تفریح کے نام پر یہ حملہ مسلمان گھرانوں میں خواب گاہوں (Bed Rooms) تک پہنچ گیا ہے۔ مسلمان خاندانوں میں تفریح کے نام پر ہندو کلچر اور مغربی ثقافت فروغ پا رہی ہے۔ اس وقت ٹی وی چینلز پر جو کچھ دکھایا جا رہا ہے اس کا ہماری تہذیب و ثقافت، ہماری اقدار اور ہمارے طرز زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ یہ سب کچھ ہمارے تصور حیات سے بنیادی طور پر متصادم ہے اور ہم شکست خوردگی کے عالم میں اسے قبول کئے جا رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے تفریح ہی کو زندگی سمجھ لیا ہے وہ بالآخر صفحہ ہستی سے مٹ گئی

ہیں۔ اقبال نے شاید اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بیان کی ہے:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر (۵۰)

تفریح ابلیسی نظام میں شہوات پر مبنی ایسا پروگرام ہے جس کی لذت سے دل مردہ وافسردہ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے محروم اور ویران و بے آباد ہوتے ہیں۔ تفریح ہی کا ایک نمونہ وہ مزاح ہے جس میں عیب جوئی ٹھٹھہ بازی اور طعنہ زنی ہوتی ہے۔ یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کو مزاح کا نام دیا گیا جس سے شائستگی کا قتل عام ہوتا ہے۔ مزاح ایک لطیف انداز بیان ہے جو شائستگی کے دائرے میں ظرافت کے موتی بکھیرتا ہے اور انسانی طبیعت میں ایک طرح کی شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ جاہلی تہذیب نے اس میں پھکڑ پن اور بیہودہ گوئی کو شامل کر کے اس کی لطافت کو ختم کر دیا۔ یہ بھی ابلیسی طریق کار کا حصہ ہے۔

تشہیر

فواحش ومنکرات کی اشاعت کا دوسرا طریقہ تشہیر ہے۔ تشہیر ابلیسی فن کاری کا شاہکار ہے۔ شیطان نے اللہ پاک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نسل آدم کو بہکانے اور معصیت الٰہی پر آمادہ کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرے گا اس میں مختلف اعمال کو مزین کرنا اور جھوٹ اور فریب پر مبنی وعدے کرنا شامل ہے قرآن نے بیان کیا:

قال رب بما اغویتنی لازینن لھم فی الارض ولا غوینھم اجمعین الا عبادك منھم المخلصین. (۵۱)

اس نے کہا! پروردگار جیسے تو نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔ ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں ان پر میرا قابو پانا مشکل ہوگا۔

پچھلی امتوں میں شیطان کی کارستانیوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کو اطلاع دیتے ہوئے فرمایا۔

تاللہ لقد ارسلنا الی امم من قبلك فزین لھم الشیطن اعمالھم فھو ولیھم الیوم ولھم عذاب الیم. (۵۲)

اللہ کی قسم ہم نے تم سے پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے تو شیطان نے ان کے کردار (ناشائستہ) ان کو آراستہ کر کے دکھائے تو آج بھی وہی ان کا دوست ہے اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔

شیطان کی فریب کاری اور جھوٹے وعدوں کے بارے میں متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

ولا ضلنھم ولا منینھم ولا مرنھم فلیبتکن اذان الانعام ولا مرنھم فلیغیرن خلق اللہ

(۵۰) کلیات اقبال اردو/۳۴۴

(۵۱) الحجر/۳۹-۴۰

(۵۲) النحل/۶۳

ومن یتخذ الشیطن ولیاً من دون اللّٰہ فقد خسر خسراناً مبینا۔ (۵۳)

اوران کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا اور سکھاتا رہوں گا کہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں اور یہ بھی کہتا رہوں گا کہ اللہ کی بنی ہوئی صورت کو بدلتے رہیں۔ اور جس شخص نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔

یعدھم ویمنیھم ومایعدھم الشیطن الا غرورا۔ اولئك ماوٰھم جھنم ولا یجدون عنھا محیصا۔ (۵۴)

وہ ان کو وعدے دیتا ہے اور امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ شیطان انہیں وعدے دیتا ہے وہ دھوکا ہے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ وہاں سے مخرج نہیں پاسکیں گے۔

تشہیر شیطان کے انہی دو اصولوں پر مبنی ہے جھوٹا وعدہ اور آرزوؤں کا بیدار کرنا۔ جھوٹے وعدے اور غلط آرزوئیں پروپیگنڈے کے بنیادی اصول ہیں۔ اس کو مغرب نے خوب ترقی دی۔ تشہیر نے انسانی زندگی کو بے حد متاثر کیا ہے اگر دور حاضر کی زندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ نوے فیصد کا دارمدار تشہیر پر ہے۔

سیاست، معیشت، صنعت، تجارت، زراعت حتیٰ کہ روزمرہ زندگی کی ضروریات بھی تشہیر پر منحصر ہیں۔ ذرائع ابلاغ اس تشہیر کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے اشیاء پیداوار میں جو فراوانی آئی ہے اس کی منڈیاں تلاش کرنا اور لوگوں کو خریداری پر آمادہ کرنا ایک باقاعدہ فن بن گیا ہے۔ اور موجودہ کمرشل دور میں اشتہارات کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ دیواروں پر چسپاں اشتہار، بڑے بڑے بورڈوں پر اشتہار، اخبارات کے صفحات پر اشتہارات، ریڈیو کی نشریات پر اشتہارات اور ٹیلیویژن کی سکرین پر اشتہارات غرض ایک انسان اشتہارات میں گھرا ہوا ہے اور ان اشتہارات کے پیغامات غیر شعوری طور پر انسان کو متاثر کر رہے ہیں۔ اشتہارات کے شعبہ نے عملاً ایک علم کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس کی بنیاد پر تجارتی مقاصد کے لیے اشتہاری ایجنسیاں اور تربیتی ادارے وجود میں آگئے ہیں۔

تشہیر کا بنیادی مقصد تو اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہوتا ہے لیکن اس میں تفریح کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے اور اپنی مصنوعات کو متعارف کرانے اور کاروبار میں وسعت پیدا کرنے کے لیے تشہیر سے کام لیا جاتا ہے۔ اشتہار کے ذریعہ دراصل لوگوں کے اندر آرزوئیں بیدار کی جاتی ہیں اور امنگیں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ مخصوص مصنوع کے لیے خریداری ہو۔ سرمایہ دار تھوک کے حساب سے مال تیار کرتا ہے پھر اس کی مارکیٹنگ کے لیے نفسیاتی تدابیر اختیار کرتا ہے تاکہ لوگوں میں خواہشیں پیدا ہوں اور وہ ضروری اور غیر ضروری طور پر ان اشیاء کو خریدیں۔ تشہیر میں جنسی خواہشات کو استعمال کرنے اور جھوٹ اور مبالغہ آرائی سے کام لینے کو اختیار کیا جاتا ہے۔

---

(۵۳) النساء/۱۱۹

(۵۴) النساء/۱۲۰۔۱۲۱

جنسی جذبوں کا استعمال

قابل فروخت اشیاء کو پرکشش بنانے اور دلکش دکھانے کے لیے جنسی جذبات کو اپیل کی جاتی ہے۔ ملبوسات، فرنیچر، آرائش وزیبائش کا سامان سگریٹ اور الکحل جیسی چیزوں کے لیے عورت اور مرد کی پرکشش تصویروں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جذبات انگیز مناظر کی پیش کش سے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جنس اور حسن کی جانب متوجہ کرنے والی تصاویر اور جذباتی لذت مہیا کرنے والے اشتہارات ابلیسی طریقہ کار کا مضبوط ہتھیار ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ نے ان طریقوں میں نت نئے اسالیب پیدا کر کے اخلاقی اقدار اور معاشرتی روایات کو تباہ کر دیا ہے۔ مغربی تہذیب نے عورت کو گھر سے نکال کر کارخانوں، دفتروں اور نائٹ کلبوں میں پہنچایا اور اب مقابلہ حسن کی منڈی سجائی ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ نے عورت کے استحصال کو اس کی آزادی اور خود مختاری کے حسین عنوانات کے ذریعہ مستحکم کیا ہے۔ ذرائع ابلاغ نے عورت کو گلوکارہ، اداکارہ اور تشہیری دنیا میں بطور ماڈل پیش کر کے اس کی تحقیر کی ہے لیکن ابلیسی حکمت عملی کی کامیابی ہے وہ اس پر فخر کرتی ہے اور اسے عزت و وقار کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ حد یہ ہے کہ بیشتر اشتہاری پروگراموں میں عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر لازمی تصور کی جاتی ہے۔ فلمی ستارے، گلوکار اور خوبصورت لڑکیاں مختلف اشیاء پیداوار متعارف کراتی نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ مربے اور چٹنیاں، صابن اور ریزر بلیڈ اور کیڑے مار دواؤں تک نسوانی سحر اور جذبات انگیزی کی زد میں ہیں۔ اشتہارات میں عریانی و فحاشی کا فروغ ذرائع ابلاغ کی کارستانی ہے۔ بیشتر اشتہارات مخرب اخلاق زبان پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مغرب کی اس وبا نے مسلمان معاشروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ مسلمان ممالک کے ذرائع ابلاغ وہی کچھ کر رہے ہیں جو مغربی ذرائع ابلاغ یا دوسرے کافرانہ معاشروں کے ذرائع ابلاغ کر رہے ہیں۔

جھوٹ اور مبالغہ آرائی

تشہیر میں بڑی ہوشیاری سے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ فوائد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے مثلاً سگریٹ کے اشتہاروں میں سگریٹ پینے والے کو ایک ہیرو اور فاتح کے طور پر پیش کیا جاتا ہے گویا سگریٹ نے اس کے اندر قوت پیدا کی حالانکہ سگریٹ مضر صحت چیز ہے۔ اس بات پر اب میڈیکل کے تمام حلقوں کا اتفاق ہے۔ اسی طرح میک اپ اور فیشن سے متعلق اشیاء کی تشہیر میں بھی جھوٹ اور مبالغہ کے بڑے مظاہر موجود ہیں۔ ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والے اشتہارات اکثر اوقات جھوٹ اور مبالغہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ابلیسی طریق کار میں اس مبالغہ آرائی اور جھوٹ کو خاص مقام حاصل ہے۔ اور اسی اصول پر تشہیری مہم کا دارومدار ہے۔ تشہیر میں جہاں اخلاق کی بنیادی قدروں کی پامالی ہوتی ہے وہاں صداقت و دیانت کا بھی قتل ہوتا ہے۔ بلاشبہ فروخت کاری میں پیش کاری کی ایک صلاحیت مطلوب ہوتی ہے اور میٹھا بول اور اطمینان

بخش انداز گاہک کو متاثر کرتا ہے لیکن جھوٹ اور فریب پر مبنی پیش کاری کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ بدقسمتی سے دور حاضر کی مارکیٹنگ اور سیلز مین شپ (Sales man ship) کی کامیابی موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی نفع اندوزی کی قوت پر مبنی ہے۔ یہی کامیابی کا پیمانہ اور اسی سے ناکامی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ چونکہ نفع اندوزی اصل مقصد ہے اس لیے تشہیری مہم اس کے حصول میں ممد و معاون ہے اور اس کے لیے ہر جارحانہ انداز جائز ہے۔

بدی کا فروغ

جدید ذرائع ابلاغ اتنے طاقتور ہیں کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دکھانا ان کے لیے معمولی کام ہے۔ پروپیگنڈے کی ایسی نفسیاتی ٹیکنیک موجود ہیں جن سے انسانوں کے ذہنوں کو صاف کر دیا جاتا ہے یا بدل دیا جاتا ہے۔ دور حاضر کا انسان ذرائع ابلاغ کا غلام ہو گیا ہے۔ وہ ہر لمحہ نئی خبر، نئی معلومات اور نئے نتائج کا منتظر رہتا ہے۔ انسان کے اندر ایک ایسی ہوس پیدا کر دی گئی ہے جو کسی طور پر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ دنیا میں بدی کی طاقتوں نے اس قوت کو اور انسان کی اس طلب کو شر کے فروغ و اشاعت کے لیے استعمال کیا ہے۔ ذرائع ابلاغ نے عورت کی آزادی کے نام پر اس کی عصمت مآبی کو ختم کیا ہے۔ افراد کو لذت کیشی کا سبق دے کر ہوس کار بنایا ہے۔ وہ اس قدر خود غرض ہو گیا ہے کہ اسے اپنی ذات کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی خیر، جماعتی بھلائی، قومی فلاح اور انسانی بہبود جیسے تصورات معدوم ہوتے نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اخلاقی قدروں کے تغیر کے فلسفے کو اس شدت سے عام کیا گیا کہ کوئی مستقل اخلاقی قدر باقی ہی نہیں۔ مغرب نے دوسری جنگ عظیم میں نفسیاتی جنگ کے حوالے سے جھوٹ، فریب و دجل اور بداخلاقی و دہشت گردی کی جو روایت قائم کی تھی اس نے بدی کو فروغ دینے میں اہم کردار کیا ہے۔ اب مقاصد کے حصول کے لیے ہر قسم کا اقدام جائز ہو گیا ہے خواہ اس کے لیے کوئی اخلاقی جواز موجود ہو یا نہ ہو۔ حال ہی میں عراق اور افغانستان میں ہونے والے جارحانہ اقدامات اور اسرائیل و ہندوستان کی نسل کش پالیسیوں نے شرافت و شائستگی اور اخلاق و دیانت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے ہم جنس پرستی، آزادانہ شہوت رانی اور طاقت کے استعمال کے جواز کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس نے انسانی تاریخ میں بدی کے فروغ کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں ابلیس اور اس کی ذریت کی کامیابیاں آسمانوں کو چھو رہی ہیں اور نیکی و شرافت کو اپنا دفاع مشکل ہو گیا ہے۔ یہ کرشماتی کامیابی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے۔ اب لگتا ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ ابلیس کا بازوئے شمشیر زن ثابت ہوئے ہیں جن سے شرافت، تقویٰ، نیکی و خیر خواہی اور دیگر اخلاقی قدروں کا قتل عام آسان ہوا ہے۔ ابلیسی ماڈل میں بدی کا فروغ اصل ہدف ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔

معاشرتی انتشار

انسان نے اپنی طویل اجتماعی زندگی میں معاشرے کو تشکیل دیا اور اسے مستحکم کیا۔ انسانی ترقی و بقاء کا انحصار معاشرتی استحکام پر ہے۔ اور استحکام کا انحصار فرد کے مثبت اور تعمیری کردار پر ہے۔ مغرب نے فرد کی انا کی جس طرح آبیاری کی ہے اور اسے جس انداز سے خواہشوں کا غلام بنایا ہے اس سے معاشرے کے استحکام کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں تشدد' جرائم' جاسوسی اور قتل و غارت گری کے جو پروگرام دکھائے جاتے ہیں ان سے معاشرتی انتشار عام ہوا ہے قاتل' ڈاکو' دہشت گرد اور ظالم طاقتور عنصر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ مغرب کی جیلیں بھری ہیں' جرائم کے نئے نئے طریقے منکشف ہو رہے ہیں اور معاشرے خوف اور دباؤ کا شکار ہیں۔ معاشرتی انتشار کے بعض پہلو تو وہ ہیں جن کا تعلق مغرب کے تجربے سے ہے۔ ان کے معاشرے اداروں کی شکست و ریخت کا شکار ہیں بالخصوص ان کے ہاں خاندان کا نظام منتشر ہو گیا ہے اور اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہے۔ معاشرتی انتشار کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ جس کا سبب بھی مغرب ہے۔ مغرب نے استعماری مقاصد کے تحت پوری دنیا کو کنٹرول کرنے کی بعض پالیسیاں مرتب کی ہیں۔ ان میں عورت کی آزادی جنسی آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی اور استحصالی مقاصد کی تکمیل کے لیے دنیا کے مختلف معاشروں کو مغربی ماڈل پر لانا ضروری ہے اس لیے معاشرتی تغیر کی انجینئرنگ ہو رہی ہے۔ تمام روایتی معاشروں میں روایت اور جدیدیت کے حوالے سے تصادم پیدا کیا جا رہا ہے۔ اور یوں دنیا کا ہر معاشرہ انتشار کا شکار ہے۔ اس انتشار کی شدت مسلم معاشروں میں محسوس کی جا سکتی ہے جہاں روایت مستحکم' اخلاقی قدریں پائیدار اور جنسی زندگی منضبط ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ مغربی ایجنڈے پر کام کرتے ہوئے روایتوں کو توڑنے' جنسی آوارگی پیدا کرنے اور اخلاقی قدروں کی تحقیر کے لیے مسلسل پروگرام نشر کر رہے ہیں۔ یہ انتشار معاشروں کو ابلیسی ماڈل پر چلانے کا موثر پروگرام ہے۔

انسانیت کی تحقیر

ابلیسی ماڈل کی اساس انسان کی تحقیر پر ہے۔ ابلیس نے اپنے خالق کو چیلنج کرتے ہوئے آدمؑ کی کمتری اور اپنی برتری کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہا تھا:

انا خير منه خلقتني من نار و خلقته من طين.(۵۵)

میں اس سے افضل ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا۔

آدمؑ کی تحقیر کے لیے ابلیس نے اجزائے ارضی کا خصوصی ذکر کیا۔ سورہ الحجر میں واضح طور پر عدم سجدہ کی وجہ نقل کی

(۵۵) الاعراف ۱۲/۷

گئی ہے۔ ابلیس نے کہا:

قال لم اکن لا سجد لِبَشَرٍ خلقته من صلصال من حمأ مسنون۔(۵۶)

اس نے کہا: میں ایسا نہیں ہوں کہ انسان کو جس کو تو نے کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے بنایا ہے سجدہ کروں۔ مغربی تہذیب چونکہ نسلی تفاخر کے ابلیسی اصول پر مبنی ہے اس لیے سفید نسل کے علاوہ پوری انسانیت کی تحقیر اس کا مسلک ہے۔ مغرب کی تمام معاشی، سیاسی، معاشرتی منصوبے مفاخرت کے اسی ابلیسی اصول پر مبنی ہیں۔ چنانچہ جہاں انسانیت کی عظمت کی بات ہوتی ہے تو اس سے مراد سفید فام انسان ہے۔ جہاں معاشی خوشحالی کی تشہیر ہوتی ہے تو وہاں مغرب کی خوشحالی مراد ہوتی ہے۔ جہاں انسانی حقوق اور مساوات کا ذکر ہوتا ہے تو اس میں مغرب کا انسان پیش نظر ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسرے انسان اگر کچھ عزت پا سکتے ہیں تو اسی صورت میں جب وہ ابلیسی پروگرام کے کارندے بن جائیں اور وہی طرز حیات اپنالیں۔ دنیا کے تمام معاشروں میں ایک داخلی تضاد اور اندرونی جنگ بپا ہے۔ ایک طرف ہر معاشرے میں ابلیسی ماڈل کے نمائندوں کی ایک اقلیت ہے جس کے پاس سارے وسائل ہیں اور دوسری طرف انسانی اکثریت ہے جو تحقیر، تذلیل اور محرومی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

جاسوسی و بدگمانی کے جال

ابلیسی طریق کار میں انسان کو انفرادی و اجتماعی طور پر نقصان پہنچانا اور اس کی گمراہی اور معصیت میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے انسانوں کی باہمی محبت و یکجہتی پہلا ہدف ہے۔ انسانی معاشروں کا اجتماعی سکون اور افراد و اقوام کا باہمی تعاون ابلیسی مشن سے متصادم ہے۔ انسانوں کو باہم دگر برسر پیکار رکھنا اور ان کے درمیان دشمنی کی فضا قائم رکھنا ابلیسی طریق کار کا اہم اصول ہے۔ اس کا موثر طریقہ بدگمانیوں کا پھیلانا ہے۔ بدگمانیاں باہمی اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ہیں اور بالآخر لڑائی جھگڑے پر منتج ہوتی ہیں۔ مغربی اقوام نے اس کے لیے جاسوسی کے اصول کو فروغ دیا۔ جاسوسی کی تنظیمیں قائم کی گئیں۔ ریاستی سطح پر شعبے منظم کیے اور بین الاقوامی سطح پر جاسوسی کا جال بچھایا۔ اس کے ذریعے قوموں اور ریاستوں کو زیر کرنے، تباہ کرنے شکست سے دوچار کرنے اور معاشروں کے اندر فساد و انتشار پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ مغربی پالیسی سازوں نے قومی سلامتی اور قومی مفادات کے خوبصورت ناموں سے دنیا میں فساد و انتشار پھیلا رکھا ہے۔ سی آئی اے۔ ایم آئی فائیو۔ ایم آئی سکس، موساد، کے جی بی اور را (R.A.W) ریاستوں کے چند جاسوس ادارے ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص اپنی سرگرمیوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ قتل و نہب، رشوت و خیانت، قومی اثاثوں کی اسمگلنگ اور رازوں کی چوری جیسی سرگرمیاں ان کی کاروائیوں کا حصہ ہیں۔ ان منفی سرگرمیوں کے لیے ذرائع ابلاغ کو

---

(۵۶) الحجر/۳۳

استعمال کیا جاتا ہے۔ خفیہ ریکارڈنگ، کھلی بلیک میلنگ اور بدنام کرنے کی مہمیں ذرائع ابلاغ ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخباروں کے رپورٹر اکثر اوقات جاسوسی کرنے اور بدگمانیاں پھیلانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مغرب اس انسان دشمنی اور منفی رویے کو "Intellegence" کا خوبصورت عنوان دیتا ہے۔

ابلیسی ماڈل پر منظم ذرائع ابلاغ تعمیری سے زیادہ تخریبی اور انسان دوستی سے زیادہ انسان دشمنی کا کام کر رہے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے اثرات

ذرائع ابلاغ کا بنیادی کام معلومات کا بہم پہنچانا ہے۔ سادہ سی خبر رسانی سے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن، ٹیلیفون اور انٹرنیٹ اور ای میل جیسی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ انسانی شخصیتوں اور معاشروں پر جدید ذرائع ابلاغ کے بے پناہ اثرات مرتب ہوئے ہیں یہ اثرات مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔

مثبت اثرات

(i) روزمرہ معلومات کا حصول

ذرائع ابلاغ کا سب سے اہم اثر یہ ہے کہ روزانہ معلومات مہیا ہوتی ہیں اور روزمرہ زندگی، رویوں اور حالات کو متاثر کرتی ہیں۔ اخبارات ریڈیو اور ٹیلیویژن نے انسان کو حالات حاضرہ سے باخبر کر رکھا ہے۔ جغرافیائی فاصلے اور مسافتیں مٹ گئی ہیں دنیا کے ایک کونے کی خبر دوسرے کونے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی ریڈیائی نشریات جغرافیائی حدبندیوں سے ماوراء ہیں اسی طرح ٹیلیویژن کی نشریات بھی۔

(ii) تعلیمی اثرات

ذرائع ابلاغ نے عمومی طور پر اور سمعی و بصری ذرائع نے خصوصی طور پر علمی طور پر بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ کئی تعلیمی، تحقیقی اور معلوماتی پروگرام ہیں جن سے ہر عمر کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ فکری پختگی حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم و ثقافت کے عمدہ پروگرام تعمیر شخصیت میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اخباروں کے تجزیاتی کالم اور مضامین ریڈیو اور ٹیلیویژن کے تجزیے، مذاکرے اور اجتماعی بحث کے پروگرام رائے قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تعلیمی پروگراموں نے جہاں علمی طور پر فائدہ پہنچایا ہے وہاں تفریحی پروگراموں نے بھی ایک راحت پہنچائی ہے۔

تنہائی کا علاج

مغربی پالیسیوں کے نتیجے میں جو معاشرتی انتشار اور نفسیاتی بے سکونی پیدا ہوئی ہے اس سے بے شمار لوگ تنہائی اور

نظر اندازی (Allianation) کا شکار ہوئے ہیں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نے انہیں ایک طرح کا ساتھ مہیا کیا ہے۔ وہ پروگرام دیکھتے ہیں تو ایک گونہ سکون محسوس کرتے ہیں اور تنہائی کے احساس سے کچھ دیر کے لیے نجات حاصل کرتے ہیں

منفی اثرات

سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نے جہاں مفید اثرات مرتب کیے ہیں وہاں بہت سے منفی اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ یہ دونوں ذرائع ابلاغ غیر محسوس انداز میں سامعین و ناظرین کے رویوں' سوچوں اور مزاجوں کو متاثر کرتے ہیں۔ طرز زندگی' رہن سہن' رسم و رواج' نشست و برخاست' انداز گفتگو وغیرہ جس طرح ذرائع ابلاغ میں پیش کیے جاتے ہیں عام لوگ اسی انداز کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دستاویزی فلمیں کسی بھی معاشرے کی ثقافت و تمدن اور طرز زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر اپنے ہاں تبدیلیاں لاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلم اپنی اثر انگیزی میں موثر ترین ذریعہ ابلاغ ثابت ہوا ہے۔ ماہرین ابلاغیات کا خیال ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ سے جو آگاہی حاصل ہوتی ہے اس میں سائنسی افکار کی واقفیت' جدید سہولیات و ایجادات سے شناسائی اور سیاسی و معاشرتی حالات کے علم سمیت کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔

جدید ذرائع ابلاغ نے جو منفی اثرات مرتب کیے انہیں کوئی سنجیدہ شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ فلم کے منفی اثرات پر ذرائع ابلاغ کے ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ٹیلیویژن کی چھ دہائیوں (Decades) پر پھیلی ہوئی تاثیر نے ثابت کیا ہے کہ نوجوان نسل میں بے راہ روی' بے مقصدیت' فیشن پرستی' جنسی آوارگی' تشدد اور تخریب کاری پیدا کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان میں ٹیلیویژن ڈراموں میں امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ' جرائم پروری' نمود و نمائش' ریاکاری' مکاری جیسی صفات دکھا کر منفی اثرات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مختلف معاشروں میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان میں ٹیلیویژن کا بڑا اثر ہے۔ امریکہ کی پرتشدد فلمیں' منشیات کے کاروبار غنڈہ گردی کی منظم تربیت اور فیشن پرستی میں اضافہ ٹیلیویژن کی وجہ سے ہوا۔

اخلاقی بے راہ روی

منفی اثرات میں سب سے زیادہ مہلک اخلاقی بے راہ روی ہے۔ مغرب چونکہ اخلاقی طور پر دیوالیہ ہے اس لیے ٹیلیویژن کے پروگراموں میں اخلاقی قدروں اور جنسی رویّوں میں احتیاط کا فقدان ہوتا ہے۔ سیٹلائیٹ اور کیبلز کی وجہ سے عریاں جنسی فلمیں اور ناشائستہ اطوار پر مبنی پروگرام عام ہیں بلکہ بعض چینلز تو بلیو فلموں کے لیے وقف ہیں غالباً مسلمان معاشروں کو اخلاقی طور تباہ کرنے کے لیے خصوصی پروگرام بنائے گئے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا مشنری استعمال

مغرب کا حیا سوز اور اباحیت پسند سیکولرزم جہاں مسلمانوں میں بے حیائی و بداخلاقی فروغ دینے میں ذرائع ابلاغ کو استعمال کر رہا ہے وہاں اپنے معاشرے میں شکست خوردہ عیسائیت عالم اسلام میں تخریب کاری کے لیے مشنری سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس کے بے شمار ریڈیو سٹیشن اور ٹیلیویژن چینلز عیسائیت کی تبلیغ اور اسلام کی تحقیر میں مصروف ہیں۔ دنیا میں ان کے تقریباً 50 مشنری ریڈیائی اشاعتی ادارے مصروف کار ہیں مثلاً لائبیریا کا ریڈیو سٹیشن جو ریڈیو الوا کے نام سے معروف ہے 1945ء میں افریقی اتحاد کے تعاون سے تشکیل پذیر ہوا یہ دراصل کئی امریکی نشریات کا مجموعہ ہے جو افریقہ، اسلامی مشرق اور شمالی افریقہ کے درمیان واقع ہے انگریزی، فرانسیسی اور عربی کے علاوہ ۱۵ افریقی زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔ (۵۷)

مسیحی مبلغین کے قائم کردہ ریڈیو سٹیشنوں میں ایک اہم سٹیشن لبنان اور مقبوضہ فلسطین کی درمیانی پٹی میں قائم کیا گیا ہے اسکی سروس کو آسمانی سرگوشی کا نام دیا گیا ہے اور اس کے سرمایہ کی تمام ضرورتیں امریکی مسیحی مبلغین کا عالمی ادارہ پورا کرتا ہے۔ (۵۸) اسی طرح برصغیر میں ان کے کئی ریڈیو سٹیشن مشنری سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ٹیلیویژن کے بچوں پر اثرات

ٹیلیویژن چونکہ ایک دلکش ذریعہ ابلاغ ہے اس لیے بچے اس کی طرف جلدی مائل ہوتے ہیں۔ تصویر کا ظاہر ہونا، متحرک ہونا اور غائب ہونا بچوں کے متجسس ذہن کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ پھر مغرب نے اپنی تہذیبی و تاریخی تعلیم و تربیت کے لیے بچوں کے لیے دلچسپ پروگرام بنائے ہیں جو انہیں اپنے کلچر اور اپنے قومی و تہذیبی تشخص کا ادراک دیتے ہیں ان پروگراموں میں کارٹونوں کا پروگرام موثر ہے۔ جو دنیا کے بچوں میں مقبول ہے اور انہیں مغربی ثقافت و روایت سے آگاہ کرتا اور ذہنی تعمیل کرتا ہے۔ امریکہ کے بنائے ہوئے کارٹون پوری دنیا میں دکھائے جا رہے ہیں اور بچوں کے ذہنوں کو خاص سمت کا شعور دیا جا رہا ہے۔

بچے ٹیلیویژن کے عادی ہو کر اپنی معمول کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں سے غافل ہو جاتے ہیں اور اس سے نہ صرف یہ کہ ان کی تعلیم متاثر ہوتی ہے بلکہ ان کی صحت پر بھی منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ بات مغرب کے ماہرین ابلاغیات ونفسیات کہہ رہے ہیں لیکن مغرب کے تخریب کار پالیسی ساز اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ رہے ہمارے ارباب اختیار تو انہیں ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مغرب کے ماہرین کی رائے ہے کہ ٹیلیویژن جرائم کی تجربہ گاہ ہے۔ اکثر بچوں پر تشدد اور جرائم کے پروگراموں کا شدید اثر ہوتا ہے ان میں سے اکثر فرسٹریشن (Frustration) ڈیپریشن (Depression)

(۵۷) فہمی النجار، اسلام اور ذرائع ابلاغ/۴۷

(۵۸) ایضاً/۵۷

اضطراب وانحراف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ٹیلیویژن کے اداکاروں کو رول ماڈل سمجھنے کی وجہ سے انہی جیسی زندگی گذارنے کے آرزومند ہو جاتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں کئی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تفریحی پروگرام

ٹیلیویژن کے تفریح پروگرام بھی تخریبی ہوتے ہیں۔ میوزک شو ڈرامے اور دیگر پروگرام اکثر اوقات مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ڈراموں میں اداکاروں کی مے خواری، سگریٹ نوشی اور جنسی چھیڑ چھاڑ منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ کئی سلسلہ وار پروگرام عشق و محبت کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ عشاق محفلوں اور تفریح گاہوں میں باہم ملتے جلتے گھومتے پھرتے دکھائے جاتے ہیں۔ ناظرین رفتہ رفتہ اس طرز حیات کو پسند کرتے اور قبول کرتے چلے جاتے ہیں اور یوں ایک معاشرتی تغیر واقع ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ اسلوب حیات بن جاتا ہے۔ مختلف کہانیوں میں جھوٹ، دھوکہ دہی، سازش، عورتوں کی چغل خوری اور غیبت جیسی عادات کو پیش کیا جاتا ہے جنہیں ناظرین آہستہ آہستہ قبول کرتے چلے جاتے ہیں اور یوں معاشرتی برائیاں فروغ پاتی ہیں۔ ٹیلیویژن کے پروگراموں میں غیر ثقہ اور سوقیانہ زبان استعمال ہوتی ہے اور اخلاق سوز حرکات دکھائی جاتی ہیں جن کا سب سے زیادہ منفی اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ (۵۹)

ذرائع ابلاغ کا مثبت استعمال

جدید ذرائع ابلاغ ایک طاقتور ہتھیار ہے اگر مسلمان معاشرے اسے سلیقہ مندی سے استعمال کرنا سیکھ لیں اور مسلمان حکومتیں کافر معاشروں کی تقلید سے آزاد ہو جائیں تو ان ذرائع سے اسلامی معاشرے کی اصلاح استحکام اور قوت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ انہیں اسلام کی دعوت، فروغ تعلیم، جہالت کے خاتمے، سیاسی و معاشی اور فکری و ثقافتی شعور کی پختگی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مسلم معاشروں میں جو خرافات اور توہم پرستانہ نظریات موجود ہیں ان کے ازالے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مسلم دشمن ذرائع ابلاغ کے اٹھائے ہوئے اعتراضات اور منفی پروپیگنڈے کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے۔ پھر مسلم معاشرے اگر آزاد ہوں اور ان کے ہاں اجتہادی صلاحیتیں ہوں تو ذرائع ابلاغ کو صحت مند تفریح کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید نے حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں اور کائناتی قوانین کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے ذرائع ابلاغ سے ان پہلوؤں کو اجاگر کر کے پوری انسانیت کو مخاطب کیا جاسکتا ہے، پھر مسیحی مشنری سرگرمیوں کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت دینی پروگرام ترتیب دیئے جاسکتے ہیں۔ جن سے فکری پختگی، اخلاقی تربیت اور دینی شعور کی آراستگی ہو سکتی ہے۔

......☆......

(۵۹) ایضاً/۱۸۴۔۸۹

حصہ سوم

جدید معاشرتی تعبیرات
اور مسلم معاشرہ

جدید معاشرتی تعبیرات اور مسلم معاشرہ

مغرب نے تہذیبی وتمدنی طور پر جو ترقی کی ہے اس کے نتیجے میں اس کے ہاں معاشرتی تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ یہ معاشرتی تبدیلیاں شعوری بھی ہیں اور غیر شعوری بھی۔ غیر شعوری تبدیلیاں معاشرتی تفاعل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جن کا مطالعہ ایک علیحدہ باب کا متقاضی ہے۔ شعوری تبدیلیاں ان تصورات وتعبیرات کے نتیجے میں ہوتی ہیں جو کوئی معاشرہ فکری طور پر اختیار کرتا اور قبول کرتا ہے۔ یہ تصورات دراصل تہذیبی سفر کی منازل ہوتی ہیں یا سنگ ہائے میل۔ انہی تعبیرات کی بنیاد پر ہم معاشرتی حیات اور معاشرتی سرگرمیوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مغرب کے موجودہ معاشرتی تغیر کے پیچھے وہ تعبیرات ہیں جو وقتاً فوقتاً اس کے اہل فکر و دانش اور اس کے ارباب اختیار نے پیش کیں جیسے عورت کی حیثیت' نسلی تعلقات' بنیادی انسانی حقوق' اقلیتیں وغیرہ۔ معاشرتی تعبیرات دراصل وہ پیمانے ہیں جن سے معاشرتی زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان تعبیرات کی تہہ میں ایک بنیادی تصور کارفرما ہے جسے اصل محرک (Prime Mover) یا بنیادی عامل قرار دینا چاہئے۔ تمام تعبیرات و مظاہر کے پیچھے یہی چور چھپا ہوا ہے' اور وہ ہے معاشرتی تغیر (Social Change)۔ کبھی شعوری' کبھی غیر شعوری کبھی ظاہر اور کبھی خفیہ۔ اس کے تقاضے' اس کے اثرات' اس کی روح اور اس کے مظاہر ہی دراصل تعبیرات کی صورت گری کرتے ہیں۔ مسلم معاشرے کو اس تغیر کا سامنا ہے کیونکہ مغرب کا تہذیبی دباؤ ہے اور عالمی ایجنسیاں مسلم معاشروں میں تبدیلی لانے کے لئے سرگرم ہیں۔ عالمی پالیسی سازوں نے یہ تغیر مسلط کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ مسلمان عورت خاص ہدف ہے۔ بے شمار N.G.O'S ہیں جو مختلف مسلمان ممالک میں معروف عمل ہیں اور بے پناہ وسائل کے ساتھ مسلمان عورت کو مظلوم اور مسلمان معاشروں کو ظالمانہ کردار کا حامل ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح مسلمان معاشروں کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کرنے کا عمل جاری ہے عالمی دباؤ کے ساتھ مسلمان معاشروں کے مغرب زدہ طبقات بھی اس تغیر کو بروئے کار لانے میں دامے درمے سخنے معاونت کر رہے ہیں۔

اس حصے میں ہم انہی تغیرات اور تصورات سے بحث کریں گے جو معاشرے کے فکر و عمل کی صورت گری کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی دیکھیں گے اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟

1

معاشرتی تغیر (Social Change)

ہر معاشرہ کسی نظریہ یا نظریات کے مجموعوں پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ نظریات ہی معاشروں کی تشکیل کرتے ہیں۔ان نظریات کی وجہ سے بعض رویے تشکیل پاتے ہیں اور ان رویوں کے نتیجے میں ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ مستحکم معاشرے اپنے نظریات' رویوں اور اداروں کے استحکام کے بارے میں حساس ہوتے ہیں اور آسانی سے انہیں تبدیل نہیں ہونے دیتے۔ تاہم بعض داخلی اور خارجی عوامل ایسے ہوتے ہیں جو یہ تغیر پیدا کرتے ہیں۔ معاشروں کے اندر تضادات جنم لیتے ہیں اور متصادم نظریات اور رویے تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تبدیلی کبھی کسی خاص پالیسی کی تشکیل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسی برآوردہ تبدیلی کے لیے Social Engineering کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے' کیونکہ ایسی تبدیلی کسی خاص مقصد کے تحت لائی جاتی ہے۔ ایسی کاوشیں رویوں کی تبدیلی' سیاسی اور معاشی سرگرمیوں کا تغیر اور اقدار و طریق کار کی ترمیم پر منتج ہوتی ہیں۔ تغیر کا خارجی اور داخلی عمل کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی محض انتشار کا باعث بنتا ہے۔ لہذا معاشرتی تغیر سے مراد ایک معاشرتی حالت سے دوسری معاشرتی حالت میں تغیر یا سلسلۂ تغیرات ہے:

(A transition or series of transitions from one social condition to another(1))

معاشرتی تغیر سے کئی صورتیں مراد لی جاتی ہیں۔ جیسے معاشرتی انتشار' انتہا پسندی' انقلاب وغیرہ۔ بالعموم اس سے مراد ایسی تبدیلی ہے جو مخصوص معاشرتی رویوں یا اجتماعی اعمال میں ہو۔ یہ تغیر انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی لیکن عام طور پر یہ اجتماعی تغیر ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔

معاشرتی تغیر کی اقسام

ہر معاشرہ بعض مشترک نظریات کا حامل ہوتا ہے۔ پسند و ناپسند اور جائز و ناجائز کے مشترک معیارات رکھتا ہے اور اجتماعی مفادات میں حصہ دار ہوتا ہے۔ مشترک نظریات مشترک اقدار کو جنم دیتے ہیں لہذا معاشرہ ان مشترک قدروں کی حفاظت کرتا ہے۔ نظریات اور اقدار کا اشتراک اور باہمی مفادات کا تحفظ ایک خاص قسم کے کلچر کو تخلیق کرتا ہے جو اس معاشرے کی شناخت اور پہچان بن جاتی ہے۔ کسی معاشرے کا اس شناخت کو قائم رکھنا اور اسے مستحکم کرنا اس کی اجتماعی قوت کی دلیل ہے۔ اب اگر اسی معاشرے میں تبدیلی آتی ہے یا تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ معاشرتی تغیر کیسا ہے۔ اچھا ہے یا برا۔ داخلی یا خارجی۔ اسی لحاظ سے معاشرتی تغیر کی اقسام متعین ہو سکیں گی۔

(1) Gould, J. and Uolb, W. L. (edr) Dictionary of social Sciences, Free Press New York, 1964.

پسندیدہ معاشرتی تغیر

پسندیدہ معاشرتی تغیر سے مراد وہ تغیر ہے جس سے معاشرے کو استحکام ملے اور افراد کو فلاح حاصل ہو۔ مثلاً کسی معاشرے کا کوئی ادارہ یا چند ادارے بہتر طور پر کام نہیں کر رہے لہٰذا اصلاحی عمل کے ذریعے ان کی فعالیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسا تغیر بظاہر معمولی ہوتا ہے لیکن مفید ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر افراد کے رویوں میں مثبت تبدیلیاں آتی ہیں جنہیں ہم اخلاقی پیمانوں سے متعین کر سکیں یا معاشرتی تعامل سے اندازہ ہو سکے کہ افراد معاشرہ کے رویے بہتر ہوئے ہیں تو یہ پسندیدہ تغیر ہے۔ معاشرے کا کوئی گروہ یا کمیونٹی انتشار کا شکار تھی' ان میں معاشرتی شعور یا اجتماعی اقدار کے احساس کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی اور ان میں مثبت تبدیلی آئی تو اسے پسندیدہ معاشرتی تغیر کہیں گے۔ لوگوں کے اندر جرائم کو ختم کرنے کا احساس پیدا کرنا اور جرائم کے خلاف اجتماعی اقدام کی تنظیمیں بنانا ایک پسندیدہ عمل ہے۔

اسلام معاشرے کے اندر مثبت تبدیلیاں لانا چاہتا ہے۔ فرد اور معاشرے کے بارے میں اس کا اپنا وژن ہے۔ لہٰذا وہ فرد کی معاشرتی تنظیم میں تغیرات متعارف کرانا چاہے گا جو خیر' تقویٰ اور صلاح و فلاح پر مبنی ہونگے۔ اسلام معاشرے میں خودغرضی اور معصیت کی بجائے ایثار اور خداشناسی کی قدریں نافذ کرنا چاہے گا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی تغیر اس کے مجموعی اصلاحی پروگرام کا حصہ ہے لہٰذا مثبت تغیر ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اس کے نزدیک نہ صرف معاشرتی حالات کو درست کرنا ضروری ہے بلکہ ایسے افراد کی تیاری بھی ضروری ہے جو خداشناس اور اخلاقی و روحانی ہوں اور ایک ایسا معاشرتی نظام وجود میں آئے جو عدل' تقویٰ اور ہمدردی و خیر خواہی پر مبنی ہو۔ ایسا معاشرتی تغیر جو فرد و اجتماع کو خیر و فلاح پر آمادہ و منظم کرے ہمیشہ مطلوب رہے گا۔

ناپسندیدہ معاشرتی تغیر

ناپسندیدہ تغیر سے مراد بگاڑ کا رویہ ہے۔ مثلاً معاشرے میں جرائم کا فروغ ہو۔ ظلم و استحصال بڑھ جائے۔ معاشرہ خوف اور عدم تحفظ کا شکار ہو جائے۔ معاشرتی اداروں کی کارکردگی خراب ہو جائے۔ اخلاقی قدروں کی تحقیر ہو اور اجتماعیت انتشار کا شکار ہو جائے تو ایسا تغیر ناپسندیدہ ہے۔ ایسا تغیر معاشرے کے لیے مہلک ہے اور اس تغیر کو روکنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس میں جتنا اضافہ ہوگا اتنا انتشار بڑھے گا جو بالآخر معاشرے کی اجتماعی زندگی کو لے ڈوبے گا۔

داخلی تغیر

داخلی تغیر سے مراد ان عوامل کی تاثیر ہے جو معاشرے کے اندر موجود ہوتے ہیں یا انہیں معاشرے کے اندر منظم کیا جاتا ہے۔ جیسے جرائم کی روک تھام کے لیے کمیونٹی پولیس کا نظام' ہمسائیگی کی تنظیمیں' اپنی مدد آپ کی تنظیمیں' کمیونٹی ایکشن

گروپ والدین اساتذہ کی انجمنیں اور نوجوانوں کی تنظیمیں وغیرہ۔ اسی طرح انجمن شہریاں جیسی تنظیمیں جو شہری حقوق کی نگہداشت کے علاوہ معاشرتی یکجہتی اور اجتماعی سلامتی کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ بہتر تعلیم' محفوظ ہمسائیگی اور جرائم کے خاتمے جیسے مسائل پر توجہ دیتی ہیں۔ کسی معاشرے کے یہ داخلی عوامل ہیں جو معاشرتی تغیر کا باعث بنتے ہیں۔ اسے ہم داخلی تغیر کہہ سکتے ہیں۔ یہ گروہ اور تنظیمیں داخلی طور پر منظم ہوتی ہیں اور معاشرتی تغیر کے لیے کام کرتی ہیں۔ مغربی معاشروں میں یہ گروپ اور تنظیمیں معاشرتی فلاح اور اجتماعی بہبود کے لیے سرگرم ہوتی ہیں اور بعض مقامات پر اچھے نتائج پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ داخلی تغیر کا ایک بڑا ذریعہ سیاسی جماعتیں اور پریشر گروپس ہوتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے منشور ہوتے ہیں۔ وہ اسی پروگرام پر مہم چلاتے ہیں۔ لوگوں کو مطمئن کرتے ہیں۔ جو تبدیلیاں وہ لانا چاہتے ہیں اس پر اسی ملک کے عوام اپنی رائے دیتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں وہ حکومت کے ذریعے تبدیلیاں لاتے ہیں' قانون سازی کرتے ہیں اور پالیسیاں نافذ کرتے ہیں۔ مثلاً نسائیت پسند گروہ آزادی نسواں کے لئے' ہم جنس پرست اپنے حقوق کے لئے' ماحولیات والے ماحول کے بارے میں مہم چلاتے اور قانون بنواتے ہیں۔ مغربی معاشروں میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں ان میں داخلی عوامل کا گہرا دخل ہے۔

خارجی تغیر

بعض اوقات معاشرتی تغیر کے عوامل خارجی ہوتے ہیں۔ معاشرتی تحریکیں' نظریاتی تحریکیں' بین الاقوامی سیاسی و معاشرتی حالات' مختلف مذاہب کے اثرات وغیرہ۔ معاصر معاشرتی تغیرات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظریات' رائے عامہ' ثقافتی رجحانات' مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کوئی معاشرہ بھی ان عوامل کے اثرات سے محفوظ نہیں۔ مختلف معاشروں میں چلنے والی تحریکیں اور سیاسی جماعتیں مختلف نظریات سے متاثر ہوتی ہیں۔ مغرب میں مادی سیکولر نظریے نے مختلف تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا ہے۔ لبرلزم' سرمایہ داری' اشتراکیت' نسائیت' کمیونزم' فاشزم' جمہوریت وغیرہ سب مادی سیکولرزم کا نتیجہ ہیں۔ حیات و کائنات کے بارے میں سیکولر مادیت پر مبنی تصور نے مغرب کے پورے معاشرتی ڈھانچے کو بدل دیا ہے۔ ہر تحریک نے سیاسی نظریات' معاشرتی اقدار' اجتماعی ڈھانچے اور پالیسیوں کو اسی نظریہ سے مستنبط کیا جس پر اس تحریک کی بنیاد تھی اور اس طرح اس نے معاشرے کی سمت کو متعین کرنے اور متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہر تحریک اپنے انداز سے معاشرتی تغیر کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔ بعض سیاسی جماعتیں اور نظریاتی تحریکیں موجودہ صورت حالات (Statuesquo) کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں تو بعض نئے نظریات و اعمال' ڈھانچے' ادارے اور قوانین (New Ideas, practices structures, institutions and laws) متعارف کراتی

ہیں۔ بعض اوقات روایتی اداروں، نظریات و قوانین وغیرہ کے احیاء کی کاوشیں ہوتی ہیں۔ مغربی معاشرے ان تمام تجربات سے گزرے ہیں اور گزر رہے ہیں۔

ابلاغ عامہ کے وسائل اور رسل و رسائل کے ذرائع میں انقلابی ترقی نے پوری دنیا کے معاشروں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ پھر مغربی تہذیبی رویوں کی تشہیر اور عالمگیریت Globalization کے نتیجے میں باہمی معاشرتی تفاعل میں اضافہ ہوا ہے۔ یوں پوری دنیا کے معاشروں کو ایک قسم کے تغیر کا سامنا ہے۔ مغرب اپنے عالمی تسلط کی وجہ سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی پالیسیاں دنیا پر بزور نافذ کرنے کی مہم چلائے ہوئے ہے۔ جمہوریت، انسانی حقوق، عورت کی آزادی اور جنسی بے باکی جیسے نظریات و پالیسیاں اس کی عالمی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ دنیا کے تمام معاشرے مغرب کی جارحانہ پالیسیوں کی وجہ سے شکست و ریخت اور تغیر و تبدل کا شکار ہیں۔ بین الاقوامی حالات اور مغرب کی تہذیبی جارحیت معاشرتی تغیر کے وہ خارجی عوامل ہیں جو بے حد موثر ہیں۔ پھر عالمگیریت اور بین الاقوامی تفاعل کی وجہ سے مختلف مذاہب نظریات اور اخلاقی اقدار بھی متعارف ہوئی ہیں۔ اور غیر محسوس طور پر معاشرتی تغیر کا باعث بن رہی ہیں۔ رویے تبدیل ہو رہے ہیں، عملی زندگی متاثر ہو رہی ہے اور اجتماعی رجحانات تغیر پذیر ہیں۔ ہر معاشرے میں جزوی یا کلی طور پر تبدیلیوں کا ایک سلسلہ جاری ہے۔

11 ستمبر کے حادثے نے اتفاقی اور ارادی طور پر رویوں میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عالم اسلام میں امریکہ کے خلاف جذبات نے دونوں معاشروں کو تغیر کا ایک نیا تجربہ عطا کیا ہے۔ اس حادثاتی تغیر کے اثرات کے دوام کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم امریکی معاشرہ بالخصوص اور مغربی معاشرے بالعموم ایک ایسے معاشرتی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں جس نے عمومی رویوں کو بہت متاثر کیا ہے۔

ماہرین عمرانیات نے معاشرتی تغیر کے سلسلے میں جو بحثیں کی ہیں ان میں چند امور ہمیشہ توجہ طلب رہے ہیں۔ ان کا سمجھنا اور جائزہ لینا ضروری ہے:

1- وہ عوامل اور قوانین جو تغیر کے آغاز، اس کی سمت کے تعین اور اس کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔
2- تغیر کا عمل اور اس کی تشکیل (Linear, multilinear and cyclical etc)
3- تغیر کا نتیجہ (فرد، خاندان، کمیونٹی اور اداروں وغیرہ پر اس کے اثرات)۔
4- تغیر کے وقت کا پیمانہ

مختلف عمرانی نظریات میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ معاشرتی تغیر کیوں اور کیسے واقع ہوتا ہے؟ عام طور پر معاشرے کے موجودہ اور گذشتہ ادوار کے نمونوں اور سمتوں کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس کے

ارتقاء میں پائے جاتے ہیں۔ عام خیال یہ تھا کہ اس تعین سے مستقبل کے تغیر کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ و معاشرت کے علماء نے معاشرتی تغیر کے بارے میں جو نظریات پیش کیے ہیں انہیں مندرجہ ذیل اقسام میں بیان کیا جا سکتا ہے:

1- ارتقائی نظریات (Evolutionary Theories)

ان نظریات کے حامل یہ تجویز کرتے ہیں کہ معاشرے بھی حیاتیاتی ساخت و ہیئت کی طرح ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔ جیسے سوشل ڈاروزم۔ یہ نظریات ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer 1820-1903) جیسے لوگوں نے پیش کیے۔

2- تاریخی جبریت اور جدلی تعبیر

(Historical Determinism and the dialectical Interpretation of change) اسے کارل مارکس (Karl Marx 1818-83) نے پیش کیا۔ اس کے مطابق تاریخی عوامل تغیر کو متعین کرتے ہیں۔

3- متدائر اور متداول نظریہ تغیر (Cyclical theories of change)

اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ معاشرتی اور تاریخی تغیر ایک متدائر نظام کے تحت واقع ہوتا ہے اور خط مستقیم کی صورت میں متحرک نہیں ہوتا بلکہ یوں کہیے کہ ایک دائرے کی صورت میں واقع ہوتا ہے۔ اسے واضح کرنے کے لیے 'نشوونما' بلوغ اور وفات' کے استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ نظریات ابن خلدون (1332-1406) کے ہاں پائے جاتے ہیں اور زیادہ واضح انداز میں اوسوالڈ سپرینگر (Oswald Sprenger 1880-1936) نے پیش کیے ہیں۔

4- نظامی نظریات (System theories)

ان نظریات کو پیش کرنے والوں کا خیال ہے کہ معاشروں کی حیثیت ایک نظام کی ہے جس کی تشکیل میں کئی باہمی مربوط و منحصر نظاموں کا حصہ ہے۔ اور تغیر کا آغاز کئی عوامل کرتے ہیں جو ان نظاموں کے اندر اور ان سے باہر موجود ہوتے ہیں۔ ان تصورات کو میکس ویبر (Max Weber 1864-1920)' فرڈیننڈ ٹونیز (Ferdinand Toennies 1855-1936) اور ٹیلکاٹ پارسن (Talcolt Parsons, 1902-79) نے پیش کیا ہے۔

یہ تمام نظریات جبریت اور مادیت پر مبنی ہیں اور معاشرتی تغیر کے تعین میں انہی اصولوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ ان میں ہر ایک کسی ایک عامل کی نشاندہی کرتا ہے جو معاشرتی تغیر کو متعین کرتا ہے۔ مثلاً سوشل ڈاروزم میں فطری دنیا میں ارتقاء کا تقابل انسانی معاشروں سے کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ معاشرے سادہ سی حالت سے پیچیدہ صورت میں ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔ معاشرتی تغیر کے سلسلے میں استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ معاشرتی تنظیمیں معاشرتی ماحول کے

تغیر کی مطابقت میں اسی طرح ترقی کرتی ہیں جس طرح مختلف انواع اپنے طبیعاتی ماحول سے مطابقت کی صورت میں ارتقاء پذیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا کوئی معاشرتی تنظیم جو اپنے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی ختم ہو جاتی ہے۔ کارل مارکس کا نظریہ کہ مادی جدلیت اور معاشی قوتوں کے تصادم کے نتیجے میں معاشرتی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات اب تجربے سے ثابت ہوگئی ہے کہ معاشی قوتوں کے تصادم کا نظریہ درست نہیں ہے۔ معاشرتی تغیر کے یہ نظریات یا تو غلط مفروضات پر مبنی ہیں یا انسانی مسائل کے اسباب کی بجائے علامات کے نظام پر مبنی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی معاشرے حیاتیاتی ساختوں کی طرح ارتقاء پذیر نہیں ہوتے۔ یہ بہت ہی کمزور استدلال ہے۔ طبقاتی تصادم معاشرتی و معاشی ناانصافی کی علامت ہے سبب نہیں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پرانی تہذیبوں کا آغاز' عروج اور فنا معاشرتی ارتقاء کے نتیجے میں نہیں ہوا۔ نہ ہی ذرائع پیداوار کے مابین کشمکش کی وجہ سے ہوا۔ لہٰذا معاشرتی تغیر کی تمام مادی تعبیرات مسئلہ کا بہت محدود حل ہیں۔ ان تعبیرات میں اس سوال کا مناسب جواب نہیں ہے کہ آخر وہ کون سی شے ہے جو لوگوں کو تغیر پر آمادہ کرتی ہے اور وہ کون سے محرکات ہیں جو معاشرتی تغیر کا باعث بنتے ہیں۔ چونکہ انسان صرف روٹی کا بندہ نہیں اس کے اخلاقی و روحانی تقاضے بھی ہیں لہٰذا اخلاقی و روحانی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ معاشرتی تغیر کے ارتقائی نظریات جیسے سوشل ڈارونزم' تاریخ کی جبریت اور مارکس کی مادی جدلیت کی تعبیر وغیرہ معاشرتی تغیر کی پوری وضاحت نہیں کر سکتے۔

متاخرین' ماہرین عمرانیات نے ان بڑے، بڑے نظریات سے ہٹ کر عام سطح پر مطالعے کو اختیار کیا ہے۔ فرد' خاندان اور سوسائٹی پر توجہ دی ہے اور خاص مسائل کو پیش نظر رکھا ہے۔ جیسے تغیر کیسے واقع ہوتا ہے؟ اس کی سمت کیسے متعین ہوتی ہے؟ تغیر کو وقوع پذیر کرنے اور اس کی سمت متعین کرنے میں مختلف گروہوں کا کیا کردار ہے؟ عام آدمی ان عوامل کو کیسے کنٹرول کرتا ہے جو اس کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان نظریات کے علاوہ کچھ اور نظریات پائے جاتے ہیں مثلاً معاشرے میں انسانی رویوں کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ کیا ان رویوں کی تشکیل فرد خود کرتا ہے یا وہ اس میں غالب معاشرتی ساختوں' قدروں اور نمونوں سے متاثر ہوتا ہے؟ یا فرد اور معاشرتی عوامل مل کر رویوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مطالعاتی نتائج کبھی یکساں نہیں ہوتے تاہم ماہرین معاشرت کا اس پر اتفاق ہے کہ تغیر ایک پیچیدہ عمل ہے اور اسے سیدھے خط کے اصول سے نہیں ناپا جاسکتا۔

معاشرتی تغیر کے عوامل

ماہرین معاشرت نے تغیر کو متاثر کرنے والے عوامل کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

مادی عوامل: جیسے معیشت' ٹیکنالوجی' ماحول یا حیاتیات نظریاتی عوامل: جیسے تصور کائنات' عقیدہ' نظریہ' اقدار اور مذہب وغیرہ

یہ عوامل آزادانہ طور پر بھی تغیر پذیری کو متاثر کرتے ہیں اور باہمی تفاعل کے ذریعے بھی کیونکہ یہ عوامل ایک دوسرے کو بھی متاثر کرتے ہیں اور مل کر بھی تغیر کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر

اسلام حیات انسانی اور کائنات کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اس لیے وہ معاشرتی تغیر کے بارے میں بھی مخصوص رائے رکھتا ہے۔ قرآن کے تصور کائنات میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی وجود کی حیثیت سے بھی۔ ہدایت ربانی انسان کی مادی، روحانی اور معاشرتی حالات و کیفیات کے متعلق رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ اسلام نہ صرف فرد کی شخصی تعمیر سیرت کی بات کرتا ہے بلکہ افراد کے باہمی انسانی تعلقات اور تفاعل کے تسلسل میں بھی رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ مزید برآں اسلام ایک نظریاتی فریم ورک مہیا کرتا ہے جس کے ذریعہ معاشرتی تغیر کو زیادہ مربوط اور کلی طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسلام تہذیبوں کے عروج و زوال کی تعبیر پیش کرتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نظریاتی عوامل اور لوگوں کے اخلاقی حالات وہ بنیادی عوامل ہیں جو معاشرتی تغیر کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے معاشرتی تغیر کو سمجھنے کے لیے دو نکات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ایک تغیر کی سطحیں اور دوسرے ربانی اصول تغیر۔

تغیر کی سطحیں

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ تغیر کے عوامل میں مادی اور نظریاتی دونوں اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو انسانی زندگی بھی دو سطحوں پر متاثر ہوتی ہے۔ ان کو آپ سطحیں کہہ سکتے ہیں اور عوامل کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں تغیر اور انسانی حالات میں تبدیلی کے بنیادی اور ثانوی عوامل ہوتے ہیں۔ مادی تعبیرات پیش کرنے والوں نے تو مادی عوامل کو اولین اہمیت دی ہے بلکہ انہی پر انحصار کیا ہے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے نظریاتی اور مادی دونوں عوامل اہمیت رکھتے ہیں۔

ابتدائی سطح

اسلامی لحاظ سے ابتدائی تغیر کا تعلق ان عوامل سے ہے جو نظریاتی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ نظریات جو کسی معاشرے کی بنیاد ہوتے ہیں جب بھی معاشرتی تغیر کا آغاز ہوتا ہے تو وہ اسی بنیاد سے ہوتا ہے جس پر معاشرہ استوار ہوتا ہے۔ نظریات معاشرتی تشکیل کا باعث ہوتے ہیں اس لیے ان میں تبدیلی لازماً معاشرتی تغیر پر منتج ہوتی ہے۔ ان میں تبدیلی رویوں میں، سوچ میں اور ماحول کے فہم میں تغیر پیدا کرتی ہے جیسے عقیدہ، اخلاقی اقدار، روحانی رویے، زندگی کا وژن اور کائنات کے بارے میں تصور وغیرہ۔ یہ نظریات انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ انہیں استحکام دیتے ہیں اور رویوں کی سمتیں متعین کرتے ہیں۔ ان میں تبدیلی کی سطح معاشرتی تغیر کی سطح متعین کرے گی۔ یہ تغیر بنیادی اور اصلی ہے۔ اس پر کسی معاشرے کے تغیر اور تعمیر و تخریب کا انحصار ہے۔

معاشرتی تغیر کی ثانوی سطح

تغیر کی ثانوی سطح مادی ہے۔ کسی معاشرے میں جب مادی عوامل اور اجتماعی زندگی کے ضابطوں میں تغیر آتا ہے تو پورا معاشرہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ذرائع پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی آئے گی تو اس کا اثر معاشرتی زندگی پر پڑے گا۔ خدمات (Services) کے دائرے میں تغیر آئے گا تو اس سے انفرادی اور اجتماعی رویوں میں فرق پڑے گا۔ معاشرے میں نئی ٹیکنالوجی متعارف ہوگی تو اس کا معاشرتی رویوں پر اثر پڑے گا۔ معاشرتی طریق قاعدہ قانون ضابطے اور نمونے بدلیں گے تو معاشرے میں مجموعی تغیر بھی رونما ہوگا۔

مادی نقطہ نظر سے حیات دنیوی کا تعلق سعی و جہد سے ہے۔ تمام مادی نتائج اس جد و جہد سے متعلق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۲)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (۳)

جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلدی دے دیتے ہیں۔

قرآن نے ایمان اور عمل صالح کی بات کو اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ اس کی اصولی حیثیت میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ ایمان اور عمل صالح دونوں سطحوں کی اصولی حیثیت کو محیط ہے۔ قرآن کی صرف ایک مختصر صورت کا نقل کرنا کافی ہوگا۔

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ (۴)

عصر کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

---

(۲) ہود/ ۱۵

(۳) بنی اسرائیل/ ۱۸

(۴) العصر/ ۱۔۳

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی دو سطحوں کی طرف اشارہ ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا(۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے(۶) ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا۔(۷) جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کر دے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔

قرآن کے مطابق معاشرتی تغیر ایمانی و نظریاتی سطح پر بھی ہوتا ہے اور عملی اور مادی سطح پر بھی لیکن اس تغیر کا باعث انسان ہوتا ہے کیونکہ وہی ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن سے معاشرے میں تبدیلی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تشریعی قانون کے تحت انسان جو صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ اپنے افکار و اعمال کے ذریعے تخریب و تعمیر کی صورتیں پیدا کرتا ہے اس لیے معاشرتی تغیر کا محرک (The agent of social change) انسان ہے۔ مادی عوامل کی حیثیت تائیدی محرکات کی ہے۔

ربانی اصول تغیر

اسلامی نقطہ نظر سے پوری کائنات میں اصل قوت محرکہ خالق کائنات کی ہے وہی Prime Mover ہے۔ کائنات کے اندر تغیر اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ تغیر دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک تشریعی قانون کے تحت اور دوسرا تکوینی قانون کے تحت۔ تشریعی قوانین کا تعین اس نے کر دیا ہے اور ان کے تحت از خود تغیر یا استحکام پیدا ہوتا ہے۔ تغیر کی اس قدرت کا ذکر اس نے قرآن میں کئی مقامات پر کیا ہے بلکہ اس تغیر کو وہ اپنے وجود، قدرت اور توحید پر دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ استدلال کا اسلوب یہ ہے کہ وہی تغیر کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے لہٰذا وہی الوہیت کا مستحق ہے۔ تخلیق، تقلیب، تکویر اور اختلاف اس کی قدرت کے مظاہر ہیں جو تشریعی اور تکوینی سطحوں پر ہر کام کر رہے ہیں۔ قرآن نے کہا:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (۸)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

---

(۵) النور/۵۵

(۶) پہلی سطح کا عمل

(۷) دوسری سطح کے عامل کی طرف اشارہ

(۸) آل عمران/۱۹۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۹)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں اور جہازوں میں جو سمندر میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں اور بارش میں جس کو اللہ آسمانوں سے برساتا ہے اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ (۱۰)

اللہ ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے اہل بصیرت کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (۱۱)

اسی نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔ اور اسی نے سورج اور چاند کو بس میں کر رکھا ہے سب ایک وقت مقرر تک چلتے رہیں گے۔ دیکھو وہی غالب اور بخشنے والا ہے۔

کائنات میں اللہ کا تصرف کارفرما ہے اور اس تصرف کے مظاہر میں وہ تغیر و تبدل بھی ہے جس کو ہر وقت دیکھا جا سکتا ہے۔ گردش لیل و نہار' موسموں کا تغیر' زمین میں روئیدگی کا تنوع' فصلوں اور پھلوں کا پکنا' درختوں کا اگنا' نشوونما پانا اور سوکھ جانا اور کھیتوں کا لہلہانا اور سوکھ جانا' جانداروں کا پیدا ہونا' بڑا ہونا اور مر جانا سب تغیرات ہیں جو اس کے تصرف کے مظاہر ہیں۔

انسانی معاشروں میں عمومی طور پر تغیر بھی تشریعی قوانین کے تحت چلتا ہے لیکن وہ جب چاہتا ہے تو تکوینی مداخلت بھی کرتا ہے اور پورے نظام کو الٹ دیتا ہے۔ قوانین فطرت جس طرح کام کرتے ہیں ان کے پیچھے بھی قوت محرکہ اسی کی ذات ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۲)

اور اللہ اس حالت کو جو کسی قوم کی ہے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ

---

(۹) البقرہ/۱۶۴ (۱۰) النور/۴۴

(۱۱) الزمر/۵ (۱۲) الرعد/۱۱

خرابی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر وہ مڑ نہیں سکتی اور اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

معاشروں میں جو مثبت یا منفی تغیر آتا ہے وہ ارادہ الٰہی سے آتا ہے لیکن انسان اس ارادہ الٰہی کے لیے ایجنٹ (Agent) کا کام کرتا ہے۔ انسانی حالات کا تغیر اس کی مشیت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی معاشرہ اللہ کے قوانین اور اس کے احکام کے خلاف چلتا ہے تو نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں معاشرہ اپنی فطری روش کھو بیٹھتا ہے اور معاشرتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ معاشرتی برائیاں فروغ پاتی ہیں اور فساد بپا ہوتا ہے اور بالآخر معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جابجا اس اصول کو بیان کیا ہے۔ چند ایک مثالیں کافی ہوں گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ ٱلْقُرُونِ مِنۢ بَعْدِ نُوحٍ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِۦ خَبِيرًۢا بَصِيرًا ۝ (۱۳)

اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے پھر اس پر حکم ثابت ہو گیا اور ہم نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ اور ہم نے نوح کے بعد بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا اور تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا اور دیکھنے والا کافی ہے۔

قوم سبا کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مشیت کے نفاذ کا بیان ان الفاظ میں کیا:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِى مَسْكَنِهِمْ ءَايَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا۟ مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَٱشْكُرُوا۟ لَهُۥ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝ فَأَعْرَضُوا۟ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ ٱلْعَرِمِ وَبَدَّلْنَٰهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَىْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَىْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝ ذَٰلِكَ جَزَيْنَٰهُم بِمَا كَفَرُوا۟ ۖ وَهَلْ نُجَٰزِىٓ إِلَّا ٱلْكَفُورَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ ٱلْقُرَى ٱلَّتِى بَٰرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَٰهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا ٱلسَّيْرَ ۖ سِيرُوا۟ فِيهَا لَيَالِىَ وَأَيَّامًا ءَامِنِينَ ۝ فَقَالُوا۟ رَبَّنَا بَٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَٰهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ (۱۴)

اہل سبا کے لیے ان کے مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی۔ دو باغ داہنی جانب اور بائیں طرف۔ اپنے پروردگار کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔ پاکیزہ شہر اور بخشنے والا پروردگار ہے۔ تو انہوں نے منہ پھیر لیا پس ہم نے ان پر زور کا سیلاب چھوڑ دیا اور انہیں ان کے باغوں کے بدلے دو ایسے باغ دیئے جن کے میوے بدمزہ تھے اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی اور ہم ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان جنہیں ہم نے برکت دی تھی دیہات بنائے تھے جو سامنے نظر آتے تھے اور ان میں آمد و رفت کا

---

(۱۴) سبا/۱۵۔۱۹

(۱۳) بنی اسرائیل/۱۶۔۱۷

اندازہ مقرر کر دیا تھا کہ رات دن بے خوف و خطر چلتے رہو۔ تو انہوں نے دعا کی کہ اے پروردگار ہماری مسافتوں میں بُعد اور طول پیدا کر دے اور انہوں نے اپنے حق میں ظلم کیا۔ تو ہم نے ان کے افسانے بنا دیئے اور انہیں بالکل منتشر کر دیا۔ اس میں صابر و شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس اصول کو قرآن میں ایک اور جگہ اس طرح بیان کیا گیا:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○ (۱۵)

اور جب تمہارے پروردگار نے تمہیں آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دونگا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے۔

عمل کی آزادی اور سعی و جہد کی اہمیت

قرآن انسان کے ارادہ و اختیار کو تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اعمال کی سمت متعین کرتا ہے اور راہوں کا انتخاب کرتا ہے۔ ہدایت ربانی کے مطابق زندگی گزارنے میں امن ہے، خوف و حزن سے نجات ہے۔ معصیت کے نتیجے میں بدامنی، خوف و حزن اور فساد معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ مادیت پرست معاشرتی تغیر کی چھوٹی بڑی تمام سطحیں صرف مادی پیمانوں سے ناپتے ہیں اور ربانی قوانین اور ارادۂ الٰہی کے عامل سے غافل ہیں۔ قرآن یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ کی وجہ سے تغیر کا محرک ہے اور تغیرات کا ذمہ دار بھی لیکن اس کی سرگرمیوں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو محض مادی اور بشری پیمانوں سے نہیں ناپنا چاہیے بلکہ قوانین الٰہی سے فیصلوں کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان اپنی معاشرتی زندگی میں مثبت رویے اختیار کرتا ہے تو مشیت الٰہی اس کے لیے سازگاری پیدا کرتی ہے اور اگر وہ منفی رویے اختیار کرتا ہے تو مشیت اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔

اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے انسان ہی معاشرتی تغیر کا وسیلہ ہیں۔ وہی اپنے معاشرتی ماحول اور تاریخ کے اچھے یا برے منظر کے ذمہ دار ہیں لیکن ربانی قانون ہر وقت ایک آخری اور فیصلہ کن عامل کی حیثیت سے موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اصول ہبوط آدمؑ کے وقت بتا دیا تھا۔ قرآن نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۱۶)

ہم نے فرمایا کہ سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جنہوں نے میری

---

(۱۵) ابراہیم/ ۷

(۱۶) البقرہ/ ۳۸-۳۹

ہدایت کی پیروی کی ان کو کچھ خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○(۱۷)

تاکہ جو مرے بصیرت پر مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر جیتا رہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سنتا جانتا ہے۔

کائناتی اخلاقی قانون

معاشرتی نظریات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان ماہرین نے معاشرتی تغیر کے مادی پیمانوں اور مادی عوامل پر کلی انحصار کرتے ہوئے کائناتی اخلاقی قانون کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جبکہ اسلام اس کائناتی اخلاقی قانون کو ایک اہم سبب قرار دیتا ہے۔ اسلام قوموں کے عروج و زوال میں کائناتی طبیعاتی قوانین کی تاثیر کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ کونیاتی اخلاقی قوانین کی بات بھی کرتا ہے۔ جسے مادیت پرست بالکل نظر انداز کر گئے ہیں مثلاً اگر کوئی معاشرہ ہدایت ربانی کو قبول کرتا ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی احکام کی پاسداری کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ معاشرتی استحکام ہوگا کیونکہ انسانوں کے باہمی تعلقات اخلاقی ضابطوں سے مربوط ہوں گے۔ جماعتی بنیادوں پر باہمی یکجہتی ہوگی۔ ادارے مضبوط اور موثر ہوں گے اور یوں افراد کے درمیان تلخیاں اور رنجش، گروہوں کے درمیان کشمکش اور اداروں کی شکست و ریخت نہیں ہوگی۔ معاشرے میں خیر و برکت ہوگی استحکام ہوگا اور مثبت تغیر وقوع پذیر ہوگا

قرآن کہتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○(۱۸)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

تغیر ایک اجتماعی عمل

اسلامی نقطہ نظر سے معاشرتی تغیر کے عمل میں فرد، گروہ اور پورا معاشرہ شامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک فرد اچھی یا بری رسم کا آغاز کرتا ہے جو آہستہ آہستہ پورے معاشرے کا طرز عمل بن جاتی ہے حضور اکرمؐ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

---

(۱۷) الانفال/۴۲

۱۸) الاعراف/۹۶

مَنْ سَنَّ سُنَّةً فی الاسلام سُنَّةً حَسَنَةً فله اجرُها و اَجرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَه مِنْ غَيْرَ ان يَنْقُصَ من اُجورِهم شئٌ ومن سنّ فِی الاسِلام سُنَّةً سَيئة فَعَليه وَزْرُها ووزر من عمل بها (۱۹)

جس شخص نے اسلام میں ایک اچھی سنت قائم کی اسے اس کا اجر ملے گا اور اس کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کوئی کمی ہو۔ اور جو اسلام میں برا طریقہ رائج کرے گا اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور اس کا بوجھ بھی ہوگا جو اس پر عمل کرے گا۔

بعض اوقات کوئی جماعت یا گروہ ایک رویہ اختیار کرتا ہے جسے بالآخر معاشرے کی بڑی اکثریت قبول کر لیتی ہے۔ قرآن مثبت تغیر کے لیے گروہی سرگرمی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○ (۲۰)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔

لیکن کلی معاشرتی تغیر اس وقت رونما ہوتا ہے جب پورا معاشرہ اس کو ایک Norm کے طور پر اپنا لیتا ہے۔ کوئی بھی مثبت یا منفی تغیر اجتماعی عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی معاشرے میں اگر خیر غالب ہے تو انفرادی یا جزوی بگاڑ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اگرچہ اس کے پھیلنے کے امکانات رہتے ہیں اسی طرح اگر معاشرے میں شر غالب ہے تو جزوی نیکی اور انفرادی خیر کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی بقول نعیم صدیقی مرحوم:

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو
ہے کیا حسین فریب جو کھائے ہوئے ہیں ہم

معاشرتی تغیر کے ساتھ ہمیشہ اجتماعی سرگرمی موثر ہوتی ہے۔ بدی جس طرح پھیلتی ہے اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرتی تغیر کے لیے اجتماعی جدوجہد ہی اصل عامل ہے۔ یہ پریشر گروپس اور سیاسی جماعتیں بالآخر اقتدار کے ذریعہ تبدیلیاں لاتی ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو تغیرات رونما ہو رہے ہیں وہ خالصتاً مادی پیمانوں، معاشی اصولوں اور حیاتیاتی مفروضوں پر مبنی ہیں۔ ان میں سے بیشتر شر محض ہیں اور حیات انسانی کی تباہی کا باعث ہیں۔ علماء معاشرت نے معاشرتی تغیر کو ایک خودکار عمل کے اصول کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ لوگ دنیا کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ تغیر ایک معاشرتی حقیقت ہے

---

(۱۹) مسلم کتاب الزکوۃ، باب الحث علی الصدقۃ ۳/ ۸۷

(۲۰) آل عمران/ ۱۰۴

اور اسے بالآخر واقع ہونا ہے۔ حالانکہ اس تغیر کے لیے فکری و عملی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ حکمت عملی تیار کی جاتی ہے اس کے لیے مہم چلائی جاتی ہے۔ پریشر گروپس، این جی اوز، سیاسی جماعتیں، مذہبی گروہ، اہل قلم اور دانشور حضرات اور سب سے بڑھ کر ذرائع ابلاغ کے لوگ اس موضوع کو لے کر چلتے ہیں اور معاشرے میں مقبول بنانے کے لیے دانستہ کوششیں کی جاتی ہیں۔ یہ اسی طرح کا دھوکہ ہے جو مارکیٹ قوتوں (Market Forces) کے نام سے معاشی میدان میں دیا جا رہا ہے۔ جدید دور میں جو معاشرتی تغیر آ رہا ہے وہ زیادہ تر تخریبی ہے۔ ادارے توڑ پھوڑ کا شکار ہیں۔ باہمی انسانی تعلقات مسائل کا شکار ہیں۔ فرد کی انفرادیت کی وجہ سے خاندان اور ادارہ ازدواج ختم ہو رہا ہے۔ معاشرے سے محبت و رحم کے جذبات کی جگہ استحصال اور ظلم نے لے لی ہے۔ اخلاقی قدریں بے وقار ہو رہی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو دنیا کو ایک نئے معاشرتی تغیر کی ضرورت ہے اور وہ صرف اسلام مہیا کر سکتا ہے۔

اسلامی طریق تغیر

اسلام معاشرتی تغیر کا نقیب ہے لیکن وہ جس طرح کا تغیر چاہتا ہے اس کا ادراک شاید جدید ماہرین عمرانیات کو حاصل نہ ہو۔ اسلامی نقطہ نظر سے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

1- اسلام فرد، خاندان، معاشرے، کمیونٹی اور ریاست کے بارے میں اپنا نقطہ نظر رکھتا ہے۔

2- موجودہ معاشروں میں جو تضادات پائے جاتے ہیں وہ ہر سطح پر ہیں فرد، خاندان، کمیونٹی اور ریاست میں سے کوئی بھی معمول کے مطابق کام نہیں کر رہا لہٰذا ہر سطح پر تبدیلی کی ضرورت ہے۔

3- اسلام کا اپنا طریق تغیر ہے۔ وہ فرد کے اندر تبدیلی لانا چاہتا ہے اور معاشرے کے اجتماعی رویے بدلنا چاہتا ہے اور آخر کار ریاست کے طور طریقوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ گویا اسلامی نقطہ نظر سے تغیر انسانی سطح پر اللہ کے احکام اور کائناتی اخلاقی قوانین سے ہم آہنگ ہوگا تو مثبت نتائج برآمد ہوں گے ورنہ وہی الجھاؤ رہے گا جو اس وقت معاشرتی سطح پر موجود ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے تغیر تاریخ کا اندھا بہرا عمل نہیں ہے۔ وہ تاریخی جبریت (Historical determinism) کے نظریہ کو مسترد کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان ہی تغیر کا فعال عامل (Active agent) ہے۔ اس لیے تغیر ہمیشہ Engineered ہوتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسان خلیفۃ اللہ اور صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ اس لیے باقی تمام عوامل اس کے ماتحت ہیں۔ لہٰذا اسلام مثبت تغیر کا داعی ہے اور طریق تغیر میں وہ جزوی اور کلی تصور کو قبول کرتا ہے۔

جزوی تغیر (Partial Change)

چونکہ معاشرہ باہمی انسانی تعلقات (Interpersonal Relations) کا نام ہے اس لیے باہمی تعلقات میں انسانی خودغرضی یا شیطانی وساوس سے خرابی پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے معاشرے میں تفرقے، عداوتیں اور بدگمانیاں پروان چڑھتی ہیں اور معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح اور اعتماد و محبت کی فضا پیدا کرنا ایک مثبت تغیر ہے۔ چونکہ اسلام ایک مثالی معاشرے کا تصور رکھتا ہے اس لیے اس آئیڈیل کو سامنے رکھتے ہوئے جزوی ٹوٹ پھوٹ کی اصلاح ہوتی رہنی چاہئے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ادارہ منظم کیا تھا جو معاشرتی انحرافات پر نظر رکھتا تھا اور مثالیت کی طرف اس کے رخ کو متعین رکھتا۔ جزوی تغیر میں معاشرے کے اجتماعی ضمیر کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انحراف کی حیثیت چونکہ (Anti Body) کی ہے اس لیے اجتماعی ضمیر اسے قبول نہیں کرتا۔ اس کی فوری نشاندہی ہوتی ہے اور فروغ پانے سے پہلے ہی اس کا سدباب ہو جاتا ہے۔ اس اجتماعی ضمیر کا ادراک ہر فرد کو ہوتا ہے لہٰذا اسلامی معاشرے کا ہر فرد انحراف کے بارے میں نہ صرف واضح موقف رکھتا ہے بلکہ اسے ختم کرنے میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ اصلاحی عمل (Corrective process) ہمیشہ جاری رہتا ہے اور یہی جزوی تغیر کا عمل ہے جو مسلمان معاشروں میں ہمیشہ نمایاں نظر آتا ہے۔ افراد، جماعتیں اور تنظیمیں اس عمل میں شریک رہتی ہیں اور نتائج پر نظر رکھتی ہیں۔ جزوی تغیر میں فرد کی باطنی تبدیلی بھی شامل ہے جو کلی تغیر کے لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

کلی تغیر (Total Change)

کلی تغیر سے مراد ایسا عمل ہے جو معاشرے کی ہیئت اجتماعی کو بدل دے۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو کسی منحرف معاشرے کو اسلامی Norm پر لانے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے اقدامات بعض ضوابط کو متعارف کرانے اور بعض انحرافات کو ختم کرنے کے لیے ہوتے ہیں لیکن اس تدریجی عمل میں کہیں کہیں انقلابی اقدامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ یہ اقدامات فوری نفاذ کے متقاضی ہوتے ہیں جیسے متبنّیٰ (منہ بولا بیٹا) کے بارے میں قرآن کا فیصلہ یا نکاح متعہ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا حکم۔ کلی تغیر ریاست کی سطح پر ہی ممکن ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے قوت نافذہ درکار ہوتی ہے۔ ریاست چونکہ ہیئت اجتماعیہ کی ذمہ دار ہوتی ہے اس لیے مطلوبہ معاشرتی معیار کے مطابق کسی معاشرے کی تشکیل ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ O (۲۲)

---

(۲۲) الحج/۴۱

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو صلوٰۃ قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ O (۲۳)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

معاشرے کا انصاف پر قائم رہنا اس کے مختلف اداروں کا مستحکم رہنا اور باہمی تعلقات میں توازن برقرار رہنا ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے کلی تغیر اختیار و اقتدار کا متقاضی ہے۔ کلی تغیر اجتماعی ہوتا ہے جس میں پورے معاشرتی ماحول کو تبدیل کیا جاتا ہے تاکہ فرد کی اخلاقی نشوونما میں کوئی رکاوٹ نہ آئے اور معاشرے کا اجتماعی ضمیر بھی مجروح نہ ہو۔

اسلامی طریق تغیر کی روح عدل ہے۔ جبر و تشدد اور قوت قاہرہ کے ذریعہ تغیر کا حصول اسلام کا مطلوب نہیں ہے۔ اسلامی طریق تغیر میں بگاڑ، عدم توازن کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ باہمی تعاون پر مبنی ایک مربوط کوشش ہے جو عدم توازن سے توازن یا توازن کی ایک سطح سے دوسری سطح کی طرف انتقال پر منتج ہوتی ہے۔ اسلامی طریق تغیر متوازن، تدریجی اور ارتقائی ہوتا ہے۔ جدت پسندی کو یکجہتی کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے اور انقلابی اقدامات میں بھی ارتقاء اور تدریج کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اسلامی طریق تغیر میں ناجائز ذرائع کا استعمال قابل قبول نہیں اس لیے کہ اچھے مقصد کے حصول کے لیے اچھے ذرائع ہی ہونے چاہئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے تاریخ انسانی کا سب سے بڑا معاشرتی تغیر پیدا کیا۔ معاشرتی تغیر کے محرک کے طور پر آپ کا اسوہ ہمیشہ مشعل راہ رہے گا۔

☆

(۲۳) الحدید/۲۵

(2) عورت کی معاشرتی حیثیت-ایک تاریخی جائزہ

انسانی زندگی میں فساد اور استحکام کی بنیاد مرد اور عورت کے متوازن اور غیر متوازن تعلق پر ہے۔عورت اور مرد انسانی زندگی کا لازم و ملزوم حصہ ہیں اور انسانی تخلیق میں بھی ان دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا۔

ہمارے ملک کے ایک اچھے مصنف کے بقول عورت نصف انسانیت ہے۔کسی ترقی پسند معاشرے اور صالح تمدن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عورت کی حیثیت متعین کرے۔عورت کی صحیح حیثیت متعین کرنے سے دو فائدے ہوں گے۔

(i) اس سے مرد کی حیثیت کا بھی تعین ہوگا اور

(ii) تمدن اور انسانی دوائر کار بھی واضح ہو جائیں گے۔

پروفیسر جنکس (Jencks) نے اپنی کتاب ''تاریخ سیاسیات'' (۲) میں انسانی معاشرے کی ارتقائی تقسیم وحشی اور پدری معاشروں کی صورت میں کی ہے۔معاشرے کی موجودہ ارتقاء پذیر صورت (صنعتی معاشرہ) کو نسبتاً مادری کہنا پڑتا ہے۔بہر نوع معاشرہ ترقی کے ابتدائی مدارج میں ہو یا عروج کی منازل طے کر رہا ہو۔یہ بات مسلم ہے کہ عورت معاشرے کا ایک ایسا ناگزیر عنصر ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ سماجی اور تمدنی اصلاح و بقاء کا انحصار تقریباً اسی نوع کی حیثیت پر ہے۔عورت کی حیثیت، اس کا کردار و عمل اور اس کی حیات بخش صلاحیتیں معاشرے کے عروج و زوال کا سامان ہیں۔اسلام جو ایک نظام حیات ہے اور انسانیت کی مکمل رہنمائی کرتا ہے، اس مسئلہ پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔اس سے قبل کہ ہم اسلامی نقطۂ نظر پیش کریں ہمیں اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مختلف قبل از اسلام معاشرے میں عورت کا کیا مقام رہا ہے اور اسلام نے اسے کیا حیثیت دی ہے؟

مسلمان علمائے معاشرت نے اسلام سے پہلے کے معاشرتی حالات کو یونان سے شروع کیا ہے کیونکہ یونان علم و تمدن کی دنیا میں امامت کے فرائض سرانجام دے چکا ہے۔بیشتر علمی، سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ نظریات کی نسبت یونان کی طرف کی جاتی ہے۔یونان نے سیاسی اور معاشرتی استحکام کی طرح ڈالی، رومی تہذیب نے اسے پروان چڑھایا اور ایرانیوں نے یونانی اور رومی اثرات کو تقویت دی۔مذاہب میں ہندومت، مسیحیت اور یہودیت بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔اس لیے ہمیں ان مذہبی اور غیر مذہبی معاشروں میں حیثیت نسواں کی ایک جھلک دیکھ لینی چاہئے۔

---

(۱) النساء/۱

(۲) تاریخ سیاسیات (اردو ترجمہ)/ ۳۰ حیدرآباد دکن

یونان

موجودہ مغربی تہذیب کی تہہ میں یونانی فکریات و معاشرت اور رومی قانون و معاشرت بنیادی اہمیت کے ساتھ کارفرما ہیں۔ یونانی معاشرت میں عورت کی حیثیت اچھی نہ تھی۔ ان کے اساطیری ادب (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈورا (Pandora) کو انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک عورت ادنیٰ درجہ کی مخلوق اور معاشرتی مرتبہ کے اعتبار سے انتہائی پست درجہ پر تھی۔ معاشرے میں عزت کا مقام صرف مرد کے لیے مخصوص تھا۔ لیکی تاریخ اخلاق یورپ میں یونان میں عورت کی حیثیت کے بارے میں لکھتا ہے:

''بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ انتہائی پست تھا۔ اس کی زندگی مدۃ العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہر کی، بیوگی میں اپنے فرزندوں کی نوراشت میں ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کے مرد وغیرہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا تاہم عملاً وہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ عدالت میں اس کا اظہار یونانی ناموس و حیا کے منافی تھا..... افلاطون نے بلاشبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی۔ عملی زندگی اس سے غیر متاثر رہی۔ ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا یعنی یہ کہ اس سے طاقتور اولاد پیدا ہو جو حفاظت ملک کے کام آئے اور اسپارٹا کے قانون میں تو یہ تصریح موجود تھی کہ کمسن و ضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمسن بیویاں کسی نوجوان کے حبالۂ عقد میں دے دینا چاہئیں تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو'' (۳)

یونانی اپنے دور عروج میں اخلاقی خرابیوں کا شکار تھے۔ مرد اخلاقی اعتبار سے آزاد تھے۔ ان سے پاکیزگی اور عصمت کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ طوائفوں سے تعلق رکھنا ان کے ہاں معیوب نہ تھا البتہ عورتوں سے عصمت و شرافت کی توقع کی جاتی تھی۔ وہ ایک مرد سے وابستہ رہتیں اور طوائف بننا نا قابل قبول تھا۔ اس دور میں عورتیں گھروں میں رہتیں اور مخلوط مجالس میں شریک نہ ہوتیں۔ ان کے گھروں میں مردوں اور عورتوں کے الگ حصے ہوتے۔ یونانیوں کے ہاں پردے کا بھی رواج تھا، اس طور پر انہیں معاشرتی اعتبار سے بلند درجہ حاصل تھا۔ لیکن یونانیوں کے ہاں جب اخلاقی تنزل شروع ہوا تو پھر ان میں زنا کاری عام ہوئی۔ یہ وہ دور ہے جس میں طوائف کلچر کو خوب فروغ ہوا۔ سید مودودیؒ کے بقول:

''رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفر، شعراء، مؤرخین، اہل ادب اور ماہرین فنون، غرض تمام سیارے اس آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی

---

(۳) تاریخ اخلاق یورپ ۲: ۱۵۰

صدر نشین تھی، بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اس کے حضور میں طے ہوتے تھے۔ قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا ان میں اس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جس کی دو راتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں بسر نہ ہوتی تھیں''۔(۴)

اخلاقی تنزل کے اس دور میں نکاح ایک غیر ضروری رسم بن گیا تھا۔ نکاح کے بغیر عورت و مرد کا تعلق ایک معمول کی چیز متصور ہونے لگا۔ کام دیوی (Aphrodite) کی پرستش تمام یونان میں عام ہوئی۔ ان کی اساطیر میں اسکی داستان یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین مزید دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی اور ان کے ماسوا ایک فانی انسان کو بھی اس نے قرب سے نوازا تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا کیوپڈ (Cupid) پیدا ہوا تھا جو اس دیوی کے ناجائز تعلق کا نتیجہ تھا۔ (۵) یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کر کے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبے تک پہنچ گیا۔ (۶)

روم

رومیوں کے ہاں بھی وحشت و تاریکی سے بھرپور تمدنی عروج کی ویسی ہی تاریخ ہے جیسے یونانیوں کی تھی۔ ابتدا میں ان کے ہاں نظام معاشرت میں مرد خاندان کا سردار ہوتا تھا اور اسے اپنے خاندان پر مکمل اختیار تھا حتیٰ کہ بعض اوقات وہ بیوی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ ان کے ہاں تمدنی عروج کے زمانے میں ایک حد تک خاندانی نظام برقرار رہا۔ عورت خاندانی نظام میں محصور تھی۔ عورت کی عصمت و عفت قابل احترام قدر متصور ہوتی اور اسے معیار شرافت خیال کیا جاتا۔ عورت اور مرد کے تعلق کی جائز اور شریفانہ صورت نکاح کے سوا کوئی دوسری نہ تھی۔ ایک عورت اسی وقت عزت کی مستحق ہو سکتی تھی جبکہ وہ ایک خاندان کی ماں (Matron) ہو۔ بیسوا طبقہ اگرچہ موجود تھا اور مردوں کو ایک حد تک اس طبقہ سے ربط رکھنے کی آزادی بھی تھی مگر عام آدمیوں کی نگاہ میں اس کی حیثیت نہایت ذلیل تھی اور اس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ (۷)

تمدنی ترقی کے ساتھ آہستہ آہستہ رویوں میں تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ اخلاق و معاشرت کی پابندیاں کمزور ہونے لگیں تو عورت کے بارے میں بھی اہل روم کا نظریہ بدلتا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین بدلے اور خاندانی نظام کی حیثیت میں تغیر آیا کہ نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (Civil Contract) بن کر رہ گیا جس کی بقا کا دارومدار فریقین کی رضامندی پر تھا۔ اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو بھی گوارا کر لیا گیا اور بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی زنا کو معمولی چیز سمجھنے لگے۔ یونان کی طرح روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی و عریانی کے

---

(۴) پردہ/۱۴ (۵) پردہ/۱۴ (۶) پردہ/۱۴ (۷) پردہ/۱۴

مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہونے لگیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو فروغ نصیب ہوا حتیٰ کہ قیصر ٹائبیریس ۱۴ء تا ۳۷ء کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے برسر عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اسی دور میں عام ہوا۔ (۸) لیکی رومی عورت کے بارے میں لکھتا ہے:

''عورت کا مرتبہ رومی قانون نے عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی توڑ سکتا تھا۔ زمانہ مابعد یعنی دور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کو منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات اتنے وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ 560 سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہ سنا تھا''۔ (۹)

غلاموں کی طرح عورت کا مقصد بھی خدمت اور چاکری تھا۔ مرد اسی لیے شادی کرتا تھا کہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اس کا کوئی حق نہ تھا۔ البتہ طبعی کمزوریوں کے باعث اسے بعض سہولتیں دی گئیں۔ بعد میں حالات تبدیل ہوئے تو ' ے وراثت اور ملکیت کے پورے حقوق دیے گئے اور قانون نے اسے باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کر دیا۔ عورتیں معاشی طور پر آزاد ہو گئیں اور خود مختاری کا یہ عالم تھا کہ شوہروں کو سود پر قرض دیتیں۔ طلاق کا رواج عام ہوا، حتیٰ کہ بقول رومی فلسفی و مدبر سنیکا (۴ ق م تا ۵۶ء) ''اب روم میں طلاق کوئی بڑی قابل شرم چیز نہیں رہی۔ عورتیں اپنی عمر کا حساب شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں''۔ (۱۰)

ایران

یونان اور روم کی طرح ایران بھی ایک قدیم تہذیبی مرکز ہے جو کئی ادوار پر محیط اور کئی مراحل سے گزرا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی۔ اسلام سے پہلے کے مزدکی اور مجوسی افکار اور رسوم و رواج نے تو ایک دنیا کو متاثر کیا۔ مجوسی کلچر اور سریت نے تو مسلم روایت اور ثقافت کو بھی متاثر کیا۔ اقبال اور مولانا عبیداللہ سندھی خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ایرانی معاشرہ بھی یونانی اور رومی معاشروں کی طرح عیش و تنعم اور اخلاقی آوارگی کا شکار ہوا اور اس میں تمام قباحتیں در آئیں جو اخلاقی طور پر زوال پذیر معاشروں کی خصوصیات میں سے ہوتی ہیں۔ ایران میں عورت کی حیثیت ویسی ہی تھی۔ اس کی ذات میں انہیں کوئی اخلاقی قدر نظر نہیں آتی تھی حتیٰ کہ ماں، بیوی اور بیٹی کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی۔ بابل میں تو

---

(۸) پردہ/۱۸ (۹) تاریخ اخلاق یورپ (۱۰) پردہ/۱۶

دیوداسیوں کی ایک کثیر تعداد بھجن گاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مزدکیت نے عورت کو معاشرے کی مشترک ملکیت قرار دیا تھا اور اخلاقی حدود و قیود کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مزدکیت نے ایرانی نفسیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اسلام کے اخلاقی ضابطوں اور روحانی تعلیمات اور شرعی قوانین نے تہذیبی تبدیلی کا کام کیا ہے لیکن قوموں کے تاریخی و تہذیبی تجربوں کے نفسیاتی اثرات کو آسانی سے نہیں مٹایا جا سکتا۔

یہودیت

یہودیت ایک نسلی مذہب ہے اور یہودی ان کے بقول اللہ کی منتخب قوم ہے۔ یہ مذہب بنیادی طور پر بنی اسرائیل ہی سے بحث کرتا ہے۔ بنی اسرائیل بلاشبہ ایک منتخب قوم تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے کئی رسول بھیجے۔ ان کے سب سے بڑے نجات دہندہ موسیٰ تھے جنہوں نے انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔ یہودیوں کی طویل تاریخ میں انہیں جو الہی رہنمائی ملی وہ ان کے دعوے کے مطابق عبرانی بائبل (Hebrew Bible) جسے عیسائی عہد نامہ قدیم کہتے ہیں، میں موجود ہے البتہ مذہبی و قانونی فکر کا سرمایہ تالمود میں ہے۔ اس مذہب کی روایت بھی عورت کے بارے میں اچھا تصور نہیں پیش کرتی۔ ان کے نزدیک مرد نیک سرشت ہے اور حسن کردار کا حامل ہے اور عورت بدطینت اور مکار ہے کیونکہ اس نے آدمؑ کو بہلا پھسلا کر پھل کھانے پر آمادہ کیا جس سے اللہ نے منع کیا ہوا تھا۔ اس نافرمانی کے نتیجہ میں جنت سے نکلنا پڑا اور اللہ کی ان نعمتوں سے محروم ہو گئے جن سے متمتع ہو رہے تھے۔ گویا حوّا نے آدمؑ کو اللہ کی نافرمانی پر اکسایا۔ عہد نامہ قدیم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے پوچھا کہ: ''کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا'' تو آدم نے جواب دیا کہ ''جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا'' (۱۱) اس کی اس حرکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا'' (۱۲)

بائبل کے یہ الفاظ عورت کی سازشی خصلت اور محکومانہ حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ یہودی شریعت میں مرد کا اختیار اور عورت کی محکومیت مبرہن ہے۔ بائبل کی کتاب گنتی میں ہے:

''اگر کوئی عورت خداوند کی منت مانے اور اپنی نوجوانی کے دنوں میں اپنے باپ کے گھر ہوتے ہوئے اپنے اوپر کوئی فرض ٹھہرائے اور اس کا باپ اس کی منت اور اس کے فرض کا حال جو اس نے اپنے اوپر ٹھہرایا ہے سن کر چپ ہو رہے تو وہ سب منتیں اور سب فرض جو اس عورت نے اپنے اوپر ٹھہرائے ہیں قائم رہیں گے۔ لیکن اگر اس کا باپ جس دن یہ سنے اسی

---

(۱۱) پیدائش، ۳/۱۱ (۱۲) ایضاً/۱۶

دن اسے منع کرے تو اس کی کوئی منت یا کوئی فرض جو اس نے اپنے اوپر ٹھہرایا ہے قائم نہیں رہیگا۔ اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا کیونکہ اس کے باپ نے اسے اجازت نہیں دی اور اگر کسی آدمی سے اسکی نسبت ہو جائے حالانکہ اسکی منتیں یا منہ کی نکلی ہوئی بات جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی ہے اب تک پوری نہ ہوئی ہو اور اس کا آدمی یہ حال سن کر اس دن اس سے کچھ نہ کہے تو اس کی منتیں قائم رہیں گی۔ لیکن اگر اس کا آدمی جس دن یہ سب سنے اسی دن اسے منع کر دے تو اس نے گویا اس عورت کی منت کو اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی تھی توڑ دیا اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ ہر بیوہ اور مطلقہ کی منتیں اور فرض ٹھہرائی ہوئی باتیں قائم رہیں گی۔ اور اگر اس نے اپنے شوہر کے گھر ہوتے ہوئے کچھ منت مانی یا قسم کھا کر اپنے اوپر کوئی فرض ٹھہرایا ہو تو جو کچھ اس عورت کے منہ سے اس کی منتوں اور ٹھہرائے ہوئے فرض کے بارے میں نکلا ہے وہ قائم نہیں رہے گا۔ اس کے شوہر نے ان کو توڑ ڈالا ہے اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ اسکی ہر منت کو اور اپنی جان کو دکھ دینے کی ہر قسم کو اس کا شوہر چاہے تو قائم رکھے یا اگر چاہے تو باطل ٹھہرائے۔ پر اگر اس کا شوہر ہر روز خاموش ہی رہے تو وہ گویا اس کی سب منتوں اور ٹھہرائے ہوئے فرضوں کو قائم کر دیتا ہے۔ اس نے ان کو قائم یوں کیا کہ جس دن سے سب سنا وہ خاموش ہی رہا۔ پر وہ اگر ان کو سن کر بعد میں ان کو باطل ٹھہرائے تو وہ اس عورت کا گناہ اٹھائے گا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان اور باپ اور بیٹی کے درمیان، جب بیٹی نوجوانی کے ایام میں باپ کے گھر ہو، انہی آئین کا حکم خداوند نے موسیٰ کو دیا۔ (۱۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی مذہب میں عورت کی حیثیت کیا ہے۔ وہ باپ اور شوہر کے اختیار میں ہے حتیٰ کہ اسکی مذہبی رسم بھی ان کی مرضی کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ یہودی قانون کے مطابق مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی۔ اس طرح عورت کو دوسری شادی کا بھی حق نہیں تھا (۱۴) عہد نامہ قدیم میں بتایا گیا ہے کہ داؤد علیہ السلام کی نوے بیویاں تھیں اور یعقوبؑ کی بھی کئی بیویاں تھیں۔ یہودی روایات کے مطابق عورت ناپاک وجود ہے اور اس کائنات میں مصیبت اسی کے دم سے ہے۔

عیسائیت

عورت کے بارے میں عیسائیت کا نقطۂ نظر اور بھی زیادہ سخت ہے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اس کی تحقیر و تذلیل کی بلکہ اسے انسانیت کا مجرم قرار دیا۔ انکے نزدیک عورت برائی کی جڑ اور معصیت کا ذریعہ ہے اور تمام انسانی مصائب کی اساس یہ ہے۔ اگرچہ اس کی بنیاد بائبل کی وہی روایت ہے جو ہم یہودیت کے سلسلے میں کتاب پیدائش سے نقل کر آئے ہیں تاہم اسکی اساس پر اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ عیسائی نقطۂ نظر کا اندازہ طرطولین (Tertullian)

(۱۳) گنتی، ۳۰/۳-۱۶ (۱۴) انسائیکلو برٹانیکا، مقالہ یہودیت

کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے:

''عورت تو! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوا ہے۔ خدا کا فتویٰ جو تمہاری جنس پر تھا وہ اب بھی تم میں موجود ہو تو پھر جرم بھی تم میں موجود ہو گا۔ تم تو شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا''

مسیح نے شادی ہی نہیں کی تھی، انہیں اجتماعی زندگی گزارنے کا موقع نہیں میسر آیا تھا تاہم عورت کے بارے میں ان سے بھی کچھ اچھے کلمات منقول نہیں ہیں۔

سینٹ پال جو موجودہ عیسائیت کا بانی ہے، عورت کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے (وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے):

''عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سیکھنا چاہئے اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے اور مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے کیونکہ پہلے آدمؑ بنایا گیا۔ اس کے بعد حوا اور آدمؑ نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑ گئی۔ (۱۵)

پس تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہر مرد کا سر مسیح اور ہر عورت کا سر مرد اور مسیح کا سر خدا ہے۔ جو مرد سر ڈھنکے ہوئے دعا یا نبوت کرتا ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتا ہے اور جو عورت بے سر ڈھکے دعا یا نبوت کرتی ہے وہ اپنے سر کو بے حرمت کرتی ہے۔ اگر عورت اوڑھنی نہ اوڑھے تو بال بھی کٹائے۔ اگر عورت کا بال کٹانا یا سر منڈانا شرم کی بات ہے تو اوڑھنی اوڑھے البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہئے کیونکہ وہ (مرد) خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے اس لیے مرد عورت سے نہیں عورت مرد سے ہے اور مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی۔ پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہئے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔ (۱۶)

ایک مسیحی روحانی شخص کرائی سوسٹم (Chrysostum) عورت کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتا ہے:

''ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلبرائی، ایک آراستہ مصیبت''

چونکہ مسیحی اخلاقیات میں تجرد اور صنفی تعلقات سے کنارہ کشی ہی اصل کمال تھا اس لیے نکاح اور صنفی تعلقات بذات خود نجس اور ناقابل التفات تھے۔ ان کے ہاں تجرد اور دوشیزگی معیار اخلاق قرار پائی اور متاہل زندگی تقویٰ اور بلندیٔ اخلاق کے خلاف سمجھی جانے لگی۔ چونکہ صنفی تعلق میں عورت ہی بنیادی کردار ہے اس لیے اسے پست، ذلیل اور گناہ کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ مسیحی شریعت میں جتنے قوانین بنے اس میں عورت کی حیثیت کو پست رکھنے کی کوشش کی گئی۔ وراثت وملکیت میں اس کے حقوق محدود تھے وہ خود اپنی کمائی پر بھی اختیار نہیں رکھتی تھی۔ ہر چیز کا مالک مرد تھا۔ طلاق اور خلع کی اجازت نہ تھی۔ مذہب د

---

(۱۵) تیمتھیس کے نام پہلا خط، ۲/۱۱-۱۴

(۱۶) کرنتھیوں کے نام پہلا خط، ۱۱/۳-۱۰

قانون کی رو سے نکاح کا تعلق نا قابل انقطاع تھا۔ نکاح ثانی کی کسی صورت میں اجازت نہ تھی خواہ زوجین میں سے کسی کی موت واقع ہو جائے۔ مسیحی علماء کے نزدیک نکاح ثانی مہذب زنا کاری تھا۔ مسیحی دنیا کے ملکی قوانین اس بارے میں سخت تھے گویا مسیحی مذہب نے عورت کی تحقیر اور اسے پابندیوں میں جکڑے رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مسیحی دنیا میں عورت کی زندگی ایک بے بس مخلوق اور مرد کے ہاتھ میں کھلونے کے سوا کچھ نہ تھی۔

ہندومت

ہندومت میں عورت کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے اپنی کتاب ''نظام سلطنت'' میں ہندومت کی ایک تصویر کھینچی ہے۔ ذیل کے چند اقتباسات سے اندازہ ہو سکے گا کہ ان کے ہاں عورت کا کیا مقام ہے۔ منوسمرتی میں عورت کے متعلق مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو اس کی حیثیت متعین کرتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا عورت کا ذاتی خاصہ ہے (۱۷)۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچپن میں باپ کے اختیار میں رہے' جوانی میں شوہر کے ماتحت اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں ر ہے خودمختار ہو کر کبھی نہ رہے (۱۸)۔ چانکیہ برہمن کے بقول دریا' مسلح سپاہی' پنجے اور سینگ رکھنے والے جانور' بادشاہ اور عورت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے (۱۹)۔

جھوٹ بولنا' بغیر سوچے سمجھے کام کرنا' فریب' حماقت' طمع' ناپاکی اور بے رحمی یہ عورت کے جبلی عیب ہیں (۲۰)۔

شہزادوں سے تہذیب اخلاق' عالموں سے شیریں کلامی' قمار بازوں سے دروغ گوئی اور عورتوں سے مکاری سیکھنی چاہیے (۲۱)۔ آگ پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندان شاہی اور عورت یہ سب موجب ہلاکت ہوتے ہیں ان سے ہوشیار رہنا چاہیے (۲۲)۔

پھر رسم ستی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ عورت کو خلع اور وراثت کا کوئی حق نہیں۔ اس کے رشتہ دار جائیداد لیں گے لیکن اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا' اسے مذہبی تعلیم سے بھی محروم کیا جاتا تھا۔ سنسکرت میں لڑکی کو ''دوہتر'' (دور کی ہوئی) بیوی کو ''پتنی'' (مملوکہ) کہا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو معاشرت میں عورت کو کیا مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں میں مہاتما بدھ کا مقام بہت اونچا ہے۔ انہوں نے بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل میں جا ٹھکانا کیا۔ انہیں عورت سے طبعی نفرت تھی اور اس دھرم میں عورت کی حقیقت نفرت ہی کی حقیقت ہے۔ پہلے بدھ مت میں عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب انہیں دھرم میں شامل کیا گیا تو بدھ مہاراج نے کہا کہ اب یہ دھرم صرف پانچ سو سال چلے گا۔ اگر عورت دھرم میں شامل نہ ہوتی تو یہ ہزار سال چلتا۔ بقول سید سلیمان ندوی مرحوم

(۱۷) منوسمرتی ۹/۱۷۔ (۱۸) ایضاً ۵/۱۴۵ (۱۹) چانکیتی ۱/۱۵

(۲۰) ایضاً ۲ (۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً ۱۴/۱۲

''اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب ہیں ان سب میں عورت اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلقات کو اخلاق و ورع کی ترقی و اعلیٰ مدارج کے لیے مانع تسلیم کیا گیا۔ ہندوستان میں بدھ، جین، ویدانت اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی کو روحانی کمال کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا (۲۳)۔

عرب قبل از اسلام

قبل از اسلام عربوں میں عورت کی حالت بھی بدتر تھی۔ لڑکی موجب نفرت سمجھی جاتی تھی، بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا۔ نکاح پر کوئی پابندی نہیں تھی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیٹا باپ کی بیوہ سے شادی کر لیتا تھا۔ طلاق دینے کا بھی کوئی متعین قاعدہ نہ تھا۔ عورت کو تنگ کرنے کے مختلف سامان تھے۔ عورت کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ قرآن و سنت نے عربوں کی اس حالت کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ. يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَابُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (۲۴)

اور ان میں کسی کو بیٹی کی خبر دی جائے تو سارا دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے (اور سوچے کہ) آیا اس کو بحالت ذلت لیے رہے یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گاڑ دے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۲۵)

حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے جس کو خدا رحمان کا نمونہ یعنی (اولاد) بنا رکھا ہے۔ (مراد بیٹی ہے) تو (اس قدر ناراض ہو کہ) سارا دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی میں گھٹتا رہے۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ. بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۲۶)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔

مسلم میں عمرؓ کا یہ قول موجود ہے۔

والله إن كنا فى الجاهلية ما نعد للنساء امراً حتى انزل الله فيهن ما انزل و قسم لهن ما قسم (۲۷)

خدا کی قسم ہم جاہلیت میں تھے اور عورتوں کو کچھ نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں نازل کیا جو اس نے نازل کیا اور ان کا حصہ مقرر کیا۔

---

(۲۳) سیرۃ النبی، ۶/۲۲۲ (۲۴) النحل/۵۹۔۵۸ (۲۵) الزخرف/۱۷

(۲۶) التکویر/۹،۸ (۲۷) مسلم، کتاب الطلاق، ۱۹/۴

دور جاہلیت کے جو واقعات کتب احادیث وتفاسیر میں آتے ہیں انہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور حیرانی ہوتی ہے کہ اس ضعیف مخلوق پر کس قدر مظالم ڈھائے گئے۔ سنن دارمی میں ایک واقعہ ہے جو اس دور کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

عن الوضين أن رجلا أتى النبى ﷺ فقال انا كنا أهل جاهلية وعبادة أوثان فكنا نقتل الاولاد وكانت عندى ابنة لى فلمّاً اجابت وكانت مسرورة بدعائى اذا دعوتها، فدعوتها يوما فاتبعتنى فمررت حتى أتيت بئراً من أهلى غير بعيد فأخذت يدها فرديت بها فى البئر وكان آخر عهدى بها أن تقول يا أبتاه يا أبتاة. فبكى رسول الله حتى وكف دمع عينيه فقال له رجل من جلساء رسول الله ﷺ :احزنت رسول الله ﷺ فقال له: كف فانه يسأل عما اهمه ثم قال له: اعد على حديثكِ فأعاده فبكى حتى وكف الدمع من عينيه على لحيته ثم قال له: ان الله قد وضع عن الجاهلية ماعملوا فاستأنف عملك (۲۸)

وضین سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا حضورؐ ہم جاہلیت والے بتوں کی پوجا کرنے والے لوگ تھے ہم اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ میرے ہاں میری ایک بچی تھی اور وہ میرے بلانے پر بہت خوش ہوتی تھی جب کبھی میں اسے بلاتا۔ ایک دن میں نے اسے بلایا اور وہ میرے پیچھے ہو لی۔ میں اسے لے گیا حتی کہ تھوڑی دور اپنے خاندان کے ایک کنوئیں پر پہنچا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا۔ اس کی آخری بات جو مجھ سے تھی وہ یہ کہ وہ مجھے ابا جان ابا جان کہتی رہی' یہ سن کر حضورؐ رو پڑے حتیٰ کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ تو حضورؐ کے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص نے کہا تو نے رسول اللہ ﷺ کو غمگین کیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے اسے روکا کہ یہ شخص ایسی چیز کے بارے میں پوچھ رہا ہے جو اسے بہت بھاری معلوم ہوئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اپنی بات دہرائے۔ اس نے اپنی بات دہرائی تو حضورؐ رو پڑے حتی کہ اشکوں سے ریش مبارک تر ہو گئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اعمال معاف کر دیئے ہیں' اب از سر نو اپنے اعمال کا آغاز کرو۔

قیسؓ بن عاصم نے جاہلیت میں آٹھ دس لڑکیاں دفن کی تھیں گویا ان کی زندگی کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔ (۲۹)

اسی طرح نکاح وطلاق کے بارے میں اہل جاہلیت کا دستور نرالا تھا۔ کتب احادیث میں ان سب اشخاص کا ذکر موجود ہے جو قبول اسلام سے پہلے چار سے زائد بیویاں رکھتے تھے۔ ان میں حارثؓ بن قیس اسدی اور غیلان ثقفی کے نام نمایاں ہیں۔

(i) حارث بن قيس اسدى قال اسلمت وعندى ثمان نسوة فذكرت للنبى ﷺ فقال

---

(۲۸) دارمی، باب ما كان عليه الناس قبل بعث النبى، ۳/۱

(۲۹) تفسیر ابن کثیر ۴/ ۴۷۸

النبی ﷺ اختر من هن أربعاً (۳۰)

حارثؓ بن قیس اسدی کہتے ہیں کہ میں اسلام لایا تو میری آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا ان میں سے چار اختیار کرلو۔

(ii) **ان غیلان بن اسلم ثقفی اسلم وله عشر نسوة فی الجاهلية فأسلمن معه فأمره النبی أن يتخير أربعاً منهن (۳۱)**

غیلانؓ بن اسلم ثقفی اسلام لے آئے تو ان کی دور جاہلیت کی دس بیویاں تھیں جو ان کے ساتھ اسلام لے آئیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے چار کو منتخب کرلو۔

طلاق پر کوئی پابندی نہیں تھی اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے۔ اس طرح وہ عدت کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتے تھے اور عورت کو تنگ کرتے تھے۔ (۳۲)

ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں سوتیلی ماں سے نکاح کے متعلق لکھا ہے۔

وقد كان نكاح امرأة الاب مستفيضاً شائعاً فی الجاهلية (۳۳)

باپ کی بیوہ سے شادی کرلینا جاہلیت میں عام معمول تھا۔

کتب حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیسؓ کی بیوی نے حضور ﷺ سے آکر شکایت کی کہ ثابت جنگ احد میں شہید ہو گئے ہیں۔ ان کی دو بچیاں ہیں۔ ثابت کے بھائی نے ان کے پورے مال پر قبضہ کرلیا ہے کیونکہ جاہلیت میں یہی دستور تھا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "**يقضی الله فی ذلك**" اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔ سورۃ نساء کی آیت ۱۱ "**يوصيكم الله**" نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اس عورت اور آدمی کو میرے پاس بلاؤ۔ آپؐ نے بچی کے چچا کو کہا:

اعطهما ثلثين واعط امهما الثمن وما بقی فلك۔ (۳۴)

بچوں کو دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دو اور جو بچ جائے وہ تمہارا ہے۔

ان تمام حالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت کیا تھی۔ اس پس منظر کو سامنے رکھیں تو ہمارے لیے نسبتاً آسان ہوگا کہ ہم اسلام کے احسانات کو نمایاں کرسکیں اور بتائیں کہ اسلام نے عورت کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ زیادہ بہتر اور مفید ہے۔

---

(۳۰) ابوداؤد: کتاب الطلاق باب فی من اسلم وعنده نساء اكثر من اربع۔ ۲/۳۶۰۔

(۳۱) ترمذی، کتاب النکاح باب ماجاء فی الرجل يسلم وعنده عشر نسوة ،۳/۴۳۵

(۳۲) ابوداؤد کتاب الطلاق باب فی فسخ الرجعة بعد التطليقات الثلاثة ،۲/۳۳۸۔

(۳۳) احکام القرآن ،۲/ ۱۴۸ (۳۴) احکام القرآن ،۲۶/ ۱۴۹

دور حاضر میں عورت کی حیثیت

دور حاضر اپنے فکری فلسفے' تہذیبی تجربے اور معاشرتی رویوں کے باعث دراصل مغربی تجربہ ہے۔ مغرب اس وقت دنیا کی غالب قوت ہے اور اس کی تہذیب تقریباً دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ تھوڑی بہت مزاحمت مسلمان معاشروں میں ہے لیکن اس کی حیثیت معمولی چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ یہ دفاعی حکمت عملی حقیقت میں شکست ہی کی راہ ہے کیونکہ مسلمان معاشروں میں اقدام کی صلاحیت نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ مسلمان قیادتیں ہیں۔ چونکہ تمام معاشرتی ادارے مغربی منہاج پر کام کر رہے ہیں، تعلیم، سوچ اور تہذیبی رویوں میں مغربی ماڈل ہی پیش نظر ہے اس لیے مزاحمتی ردعمل کے سوا مثبت تبدیلی اور اسلامی رویوں کے استحکام کے لیے کوئی بڑا کام نہیں ہو رہا۔ پھر مغرب کی حکمت عملی یہ ہے کہ اس نے اس تہذیبی جنگ کے لیے مسلم معاشروں ہی کو میدان جنگ کے طور پر منتخب کیا ہے اس لیے تہذیبی تصادم مسلم معاشروں کے اندر بپا ہے۔ مسلم معاشروں کی تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، عسکری اور فکری قیادتیں اس تہذیبی تصادم میں مغرب کی معاونت کر رہی ہیں اور مغرب اپنے حلیفوں کو ہر قسم کی امداد مہیا کر رہا ہے۔ جو لوگ مزاحمت کر رہے ہیں وہ بے سر و سامان ہیں اور ان کا ایجنڈا محض ردعمل کا ایجنڈا ہے۔ مثبت تبدیلیوں اور اسلامی نمونوں کے لیے عملی اقدامات نیم دلانہ ہیں اس لیے آہستہ آہستہ میدان ان کے ہاتھ سے نکل رہا ہے

مغرب کے تہذیبی تجربے کے پس منظر میں اسکے اپنے تاریخی، ثقافتی، فکری اور مذہبی عوامل ہیں۔ موجودہ تہذیبی تجربہ ایک اعتبار سے انکی روایت کا ارتقاء اور تسلسل ہے۔ اس کے پس منظر میں یونانی، رومی اور مسیحی تجربات ہیں۔ کہیں کہیں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات بھی جھلکتے ہیں لیکن غالب عناصر یورپی ہیں جن میں یونانی اساطیری ادب، رومی طرز حیات، مقامی قبائلی رسوم و رواج اور مسیحی مذہبی رجحانات و اعمال شامل ہیں۔ مغرب کا غالب مزاج مادی ہے اور عیش کوشی ان کا طرز حیات ہے۔ یہ دو عناصر ان کے تہذیبی تجربے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مسیحی عہد میں مصنوعی روحانیت کچھ دیر غالب رہی لیکن جلد ہی ریاست اور کلیسا کی کشمکش شروع ہو گئی جو بالآخر کلیسا اور مذہب کی شکست اور مادیت اور عیش کوشی کی فتح پر منتج ہوئی۔ موجودہ مغرب مادی، سیکولر اور عیش کوش ہے۔ اس کی عسکری طاقت اس طرز حیات کے دفاع اور پوری دنیا میں اس نظام اقدار کے نفاذ کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تمدنی ترقی کا لازمی نتیجہ عیش پرستی اور اخلاقی قدروں کا زوال ہے جو بالآخر تباہی پر منتج ہوا۔ عیش پرستی کا مرکزی کردار عورت ہے۔ یونانیوں پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ ہوا تو طوائف کلچر کو فروغ ملا۔ عمل قوم لوط ایک وبا کی طرح پھیلا۔ یہی طوائف کلچر روم کے تمدنی عروج کے دور میں فروغ پذیر ہوا۔ سید مودودیؒ کے بقول: ''تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور پھر نصیب نہیں ہوا (۱) اور بہیمی خواہشات سے اس قدر

(۱) پردہ/۱۴

مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصر عظمت ایسا پیوند خاک ہوا کہ پھر اسکی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہی''(۲) جدید مغرب اسی تباہی کی طرف کشاں کشاں جا رہا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ یونان اور روم تباہ ہوئے تو یہ قومی اور علاقائی بربادیاں تھیں۔ جدید مغرب تباہ ہوگا تو ساتھ دنیا کے بڑے حصے کو بھی لے ڈوبے گا۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ مسلم معاشروں کے دانشور نئی صف بندی، مستحکم حکمت عملی وایمانی جذبے کے ساتھ ایسا اقدامی لائحہ عمل اختیار کریں جو اسلامی اخلاقی وتہذیبی قدروں کے نفاذ کا ذریعہ بنے اور مغربی یلغار کا سد باب ہو سکے۔

اس تہذیبی تجربے کا جائزہ لیں تو اس میں عورت کی حیثیت ہمیشہ پست رہی۔ آزاد جنسی تعلقات اور طوائف کلچر کے فروغ سے لے کر عورت کے شیطانی دروازہ ہونے تک کے سب تصورات یورپین معاشرت کا حصہ ہیں۔ قرون وسطی میں کیتھولک چرچ کا رویہ خطرناک حد تک عورت دشمن(Anti Woman) تھا۔ کتاب پیدائش کا تصور(Genesis Myth) سینٹ پال(St. Paul) کی تحریریں اور مشہور مسیحی متکلم تھامس اکوائنس(Thomas Acquinus) کے خیالات عورت دشمن متصور ہوتے تھے۔ "Door of the Devil" اور "Misbegotten Male" جیسی اصطلاحیں مسیحی مذہبی ادب کا حصہ ہیں۔ پھر بعض عیسائی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ عورت اپنی انوثت کو ختم کر کے ہی نجات حاصل کر سکتی ہے (Women could achieve salvation by symbolic denial of their femaleness) ان تحریروں میں عورت کے لیے بعض خصوصی صفات کا تذکرہ بھی ملتا ہے مثلاً کینہ پرور (Malicious)؛ بے وفا (Disloyal''، سنگ دل Heartless وغیرہ۔ وہ صرف مثالی نسوانی کردار (Ideal female role) کے ذریعہ ہی نجات(Salvation) حاصل کر سکتی ہے۔

یورپ کا نیا دور تحریک تنویر(Englihtenment) سے شروع ہوتا ہے۔ تحریک اصلاح مذہب(Reformation) انقلاب فرانس(French Revolution) اور انگلستان میں صنعتی انقلاب(Industrial Revolution) نے علمی و معاشرتی شخصیتیں پیدا کیں۔ ان فکری وعملی انقلابات نے معاشرتی حالات میں تبدیلی پیدا کی۔ اب آزادی اور مساوات (Freedom and Equality) نئی قدریں قرار پائیں۔ مسیحیت کی مذہبی روایت کے خلاف بغاوت نے مختلف سطحوں پر کام کیا۔ علمی وسائنسی، سیاسی ومعاشرتی اور معاشی ومادی وغیرہ تمام سطحیں انقلابی تبدیلیوں کی زد میں تھیں۔ ان تمام سطحوں پر خالص مادی وعقلی بنیادیں ہی کسی نتیجہ کے لیے قبول کی گئیں۔ آزادی کے تصور نے مسیحی نظام اخلاق، جو جبر اور گھٹن پر مبنی تھا اور نظام جاگیرداری(Feudal System) جو ظلم اور جبر واستحصال کی علامت تھا، کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ دور جدید کے آغاز میں صنف اناث کو پستی سے اٹھانے کے لیے کوشش کی گئی۔ عورت کی تذلیل کے تصور کو ختم کیا گیا، اسکے سلب شدہ معاشی حقوق بحال کیے گئے اور نکاح وطلاق کے پچھلے قوانین کی سختی دور کی گئی۔ عورت کے حقوق کے لیے جو مہم چلائی گئی وہ دراصل ان نظریات پر مبنی تھی جو جدید مغربی معاشرت کے ستون متصور ہوتے ہیں یعنی:

(۲) ایضاً/۱۸

(i) مردوعورت کی مساوات

(ii) عورتوں کا معاشی استقلال

(iii) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط

صنعتی انقلاب نے کارخانوں کے مزدوروں اور کارکنوں کی طلب بڑھادی تھی اور کارخانہ دار کو سستے کارکنوں کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے عورتوں اور بچوں کو ترجیح دی کیونکہ انہیں کنٹرول کرنا بھی آسان تھا اور ان سے زیادہ کام بھی لیا جا سکتا تھا۔ عورتوں کو چونکہ اس طرح کے کام سے نیا واسطہ تھا لہٰذا وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کام پر آمادہ رہتیں۔ اب چونکہ ان کی مسابقت مرد مزدوروں سے شروع ہوئی تو جلد ہی یہ مسابقت رقابت میں بدل گئی اور مرد کارکنوں میں اجتماعی طور پر اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا تو عورتیں آہستہ آہستہ وزنی کاموں سے پیچھے ہٹ کر دفتری یا نسبتاً ہلکے کاموں پر اکتفا کرنے لگیں۔ یورپ میں پہلی مرتبہ مردوں اور عورتوں کے درمیان محبت، معاشرتی یکجہتی اور اجتماعی ہم آہنگی کی جگہ مقابلے کی فضا پیدا ہوئی جس نے تحریک آزادی نسواں کے لیے ایندھن فراہم کیا۔ ملازمت کرنے والی عورت نے معاشی آزادی کا ادراک کیا تو وہ معاشرتی آزادی پر بھی عمل پیرا ہوئی۔ گھر، خاندان، اولاد کی پرورش، خانہ داری کی تنظیم کو بوجھ سمجھنے لگی اور آزاد معاشرتی زندگی کی راہ پر چل نکلی۔ انقلاب فرانس کے دوران عورتوں نے اجتماعی آواز اٹھائی۔ جن لوگوں نے "Tale of the two cities" کو پڑھا ہے یا اس پر مبنی فلم دیکھی ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ عورت کے انتقامی رویوں کا اظہار کس طرح ہوتا ہے۔ اس انتقام کی جھلک اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یورپ میں جو معاشرتی تغیر رونما ہوا وہ جاگیردارانہ معاشرے سے صنعتی معاشرے پر مبنی تھا دونوں معاشروں کے تقاضے مختلف تھے۔ صنعتی معاشرت نے عورت کی شخصیت کو اجتماعی سرگرمیوں میں جذب کر لیا۔ دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی سرگرمیوں میں شرکت، کلب سٹیج اور رقص و سرور کی مصروفیتیں اس کی شخصیت کا حصہ بن گئیں۔ مساوات اور آزادی کے تصور نے عورت کو معاشی استقلال کے ساتھ ان اخلاقی بندھنوں سے بھی آزاد کر دیا جو مذہب اور ثقافتی روایت کی وجہ سے موجود تھے۔ نکاح آہستہ آہستہ غیر متعلق ہونے لگا، آزادانہ جنسی تعلقات قابل قبول ہونے لگے۔ اسقاط حمل اور ہم جنس پرستی فروغ پانے لگی۔ مغربی معاشرت آہستہ آہستہ انہی معیارات کی طرف بڑھنے لگی جنہیں یونانی اور رومی معاشروں نے تمدنی عروج کے زمانے میں اپنایا تھا۔ اور سنت اللہ کے مطابق موجودہ مغربی معاشرت کا انجام بھی وہی ہوگا جو یونانی اور رومی معاشروں کا ہوا تھا۔ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عریانی اور فحاشی کو پروان چڑھایا۔ دونوں صنفوں نے ایک دوسرے کے لیے جاذب نظر ہونے کے لیے بڑھ چڑھ کر کوششیں شروع کیں۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ لباس کے نت نئے فیشن اور بناؤ سنگھار کا سامان آتش شہوت کو بھڑکانے کا ذریعہ بنا۔ پھر تشہیر کے مختلف طریقے متعارف ہوئے۔ آرزوؤں کو بیدار کرنے اور خواہشوں کو انگیختہ کرنے میں ماہرانہ اسلوب استعمال کیے گئے۔ فیشن انڈسٹری اور بناؤ سنگھار کا سامان بنانے والی کمپنیاں مغرب کی معاشرتی زندگی پر مکمل طور پر حاوی ہیں اور

مغرب کی عورت اب اس تشہیری مہم کی باندی ہے۔ بدقسمتی سے مسلمان معاشرے بھی اس اخلاقی انحراف اور شیطانی مہم کا شکار ہو گئے ہیں۔ اصحاب اختیار تقلید مغرب میں فواحش کو فروغ دینے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اور منحرف اور خود رو دانشور اس کارشر میں ہراول دستے کا کام کر رہے ہیں۔ مغربی معاشرت نے قدم بہ قدم انہی معیارات کی طرف سفر جاری رکھا جنہیں یونانی اور رومی معاشروں نے تمدنی عروج کے زمانے میں اپنایا تھا اور سنت اللہ کے مطابق اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو یونانی اور رومی معاشروں کا ہوا تھا۔

امریکہ میں عورتوں نے انیسویں صدی کے آغاز ہی میں دفتروں اور کارخانوں میں کام شروع کر دیا تھا۔ امریکی زندگی کے پس منظر میں یورپی معاشرتی حالات تھے اس لیے یہاں اس سے اگلے مرحلے کے لیے جدوجہد تھی۔ نیویارک کے قریب سینیکا فالز (Seneca Falls) کے مقام پر 1848 میں عورتوں کی ایک ملک گیر کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک منشور منظور کیا گیا۔ یہ "منشور جذبات" (Declaration of Sentiments) کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس منشور کو خواتین کی تمام معاشرتی سرگرمیوں کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے اس منشور میں کہا گیا:

"تاریخ انسانی گواہ ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ظلم وستم کا شکار رہی ہے۔ آج بھی عورت کی یہ حالت ہے کو موجودہ جمہوری نظام سیاست میں اسکی کوئی آواز نہیں...... اسے عوامی نمائندگی کا حق حاصل نہیں..... مرد اپنی مرضی سے حکومت کے اختیارات پر قبضہ کر کے عورتوں کے خلاف قانون سازی کرتا ہے اور عورتوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے یک طرفہ اور من مانے قوانین کی پابندی کریں۔ ملک کے جاہل اور گنوار مردوں کو وہ حقوق حاصل ہیں جن سے تعلیم یافتہ عورتیں بھی بالکل محروم ہیں۔ معاشرے میں شادی شدہ عورت زندہ درگور ہے۔ اسے ملکیت کا حق حاصل نہیں۔ یہاں تک کہ جو کچھ وہ خود کماتی ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کی کمائی کا مالک بھی اس کا شوہر ہوتا ہے۔ شادی کے وقت عورت سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے ہر جائز و ناجائز حکم کو مانے گی..... تمام اچھی ملازمتوں پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ عورتوں کو مردوں سے کم تنخواہ دی جاتی ہے...... آج ایک عورت بھی مذہبی معلم، ڈاکٹر یا قانون دان نہیں ہے۔ اسے کالجوں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ وہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتی۔ مذہب کا میدان ہو یا سیاست کا عورت صرف ماتحت اور محکوم ہے...... اس ملک میں ہم محسوس کرتی ہیں کہ ہمیں مذہبی اور معاشرتی طور پر ذلیل کیا گیا ہے ہم مظلوم ہیں۔ ہمارا استحصال ہوا ہے، ہمیں ہمارے جائز حقوق نہیں دیے گئے۔ اب ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں امریکہ کے مرد شہریوں کے برابر حیثیت دی جائے...... ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں اپنے مقصد کے حصول میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ہم ہمت نہیں ہاریں گی۔ ہم جائز ذرائع اور پرامن طریقے سے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی اور مختلف مقامات پر کنونشن منعقد کر کے رائے عامہ ہموار کریں گی تا کہ رائے عامہ ہموار کر کے حکومت سے اپنے جائز مطالبات منوا سکیں"۔

عورت صنعتی دور میں

مغرب میں صنعتی دور نے معاشرتی انقلاب کی بنیاد فراہم کی اور بڑی معاشرتی تبدیلیوں کے لئے راہ ہموار کی۔ مغرب کے صنعتی دور کے بارے میں کوئی یکساں پالیسی نہیں اختیار کی جاسکتی کیونکہ صنعتی تبدیلیاں تدریجی ہیں اور مغرب کے مختلف ممالک نے صنعتی عمل میں مختلف پالیسیاں اختیار کی تھیں۔ قبل از صنعتی دور یکساں طرز معاشرت نافذ تھا جو آہستہ آہستہ تبدیل ہوا لہٰذا اب مغرب کے تمام ممالک میں صنعتی ترقی کے نتیجہ میں یکساں معاشرتی رویے اور پالیسیاں فروغ پا رہی ہیں۔ برطانیہ چونکہ پہلا ملک ہے جہاں صنعتی انقلاب آیا اس لئے اس معاشرے میں عورت کی حیثیت کے بارے میں گفتگو سے ایک عمومی اندازہ ہو سکے گا۔ اس بحث میں ہمارا زیادہ انحصار این اوکلے (Ann Oakley) کے بیانات پر ہوگا۔(۱) اس نے صنعتی انقلاب سے ستر کی دہائی تک برطانوی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عورت پر صنعتی دور کا جو سب سے بڑا اور واضح اثر ہوا وہ جدید گھریلو عورت (Modern role of House Wife) کا ظہور ہے۔

برطانیہ کے ما قبل صنعتی معاشرے میں خاندان بنیادی پیداواری اکائی تھا۔ شادی اور خاندان ایک فرد کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ خاندان کے تمام افراد پیداواری سرگرمیوں میں مشغول رہتے۔ زراعت اور پارچہ بافی بنیادی معاشی سرگرمیاں تھیں جن میں عورت اور مرد دونوں کا حصہ لینا ضروری تھا۔ پارچہ بافی میں مرد کپڑا بنتا تھا اور عورت دھاگہ کشید کرتی اور رنگتی تھی۔ زراعت میں مرد زیادہ تر کھیت میں کام کرتا یا چوپایوں کی نگہداشت کرتا اور عورت گھر کا کام کرتی۔ کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور کپڑوں کی سلائی دھلائی اور اس پر مزید بچوں کی نگہداشت تھی۔ معاشی سرگرمیوں، گھریلو اور خاندانی مصروفیتوں میں واضح امتیاز موجود نہ تھا۔

صنعتی انقلاب نے طریق پیداوار میں بنیادی تبدیلی متعارف کرائی۔ کارخانے لگے تو خاندان کے پیداواری اکائی ہونے کا مرحلہ ختم ہوا۔ اب کارخانہ پیداواری اکائی تھا اور اس نے خاندان کی جگہ لے لی۔ اوکلے اسے 1750ء۔ 1841ء کا دور کہتی ہے اس دور میں عورت نے کپڑے کی فیکٹریوں میں کام شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مزدوری تھی اور اسے اجرت ملتی تھی۔ اسی دور میں بچے بھی کام کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ بچوں کے کام پر پابندی شروع ہوئی اور ایسے قوانین منظور ہوئے جن سے مزدور کی حیثیت سے عورت کے مقام و مرتبہ میں فرق آیا۔ 1819ء میں یہ قوانین شروع ہوئے جو بالآخر بچوں کی مزدوری پر پابندی کی صورت پر منتج ہوئے۔ یہی وہ دور ہے جس میں بچوں اور بالغوں کی حیثیت میں واضح

(1) Oakley, Ann, House wife, Allan Lan, London,1974. The Socialogy of House wife, Martine Rabertson, Oxford 1974.

امتیاز شروع ہوا۔ اس صورت حال میں بچے والدین کے زیادہ محتاج ہوئے اور والدین پر بچوں کا انحصار بڑھ گیا۔ او کلے کے خیال میں اس کا نتیجہ تھا کہ عورت کا شادی پر انحصار بڑھا اور اسے گھر تک محدود ہونا پڑا۔ یہ دلچسپ استدلال ہے کیونکہ والدین پر بچوں کا انحصار ایک حیاتیاتی حقیقت ہے۔ انسانی شخصیت کے جسمانی ارتقاء کے مراحل پر نظر رکھنے والا ہر شخص اس تعلق کی نوعیت سے آگاہ ہے۔

عورت کی ملازمت پر پابندی

1841ء سے لے کر پہلی جنگ عظیم 1914ء تک مرد مزدوروں اور معاشرتی مصلحین کے دباؤ کی وجہ سے صنعتوں میں عورتوں کی ملازمتیں محدود ہوئیں۔ کارخانوں کے مرد مزدوروں نے عورتوں کی ملازمت کو اپنے لئے خطرہ سمجھا اور 1841ء ہی میں مرد مزدوروں کی کمیٹیوں نے عورتوں کی ملازمت کو تدریجی طور پر ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ 1842ء میں Mines Act کے ذریعہ کانوں میں عورتوں کی ملازمت بند کر دی گئی۔ 1851ء میں چار میں سے ایک شادی شدہ عورت ملازمت کرتی تھی جو 1911ء میں دس میں ایک عورت کی سطح پر آ گئی۔ ہیلن ہیکر (Helen Hacker) بیان کرتی ہے کہ عورت کی ملازمت کے نتیجہ میں مردوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا:

''مردوں نے جلد ہی انہیں اپنے لئے خطرہ سمجھا اور تمام معاشی، قانونی اور نظریاتی ہتھیار استعمال کئے تا کہ ان کے مقابلے کو کم کیا جا سکے۔ انہوں نے عورتوں کو ٹریڈ یونینوں سے خارج کیا۔ مالکوں سے رابطہ کر کے عورتوں کو ملازمت دینے سے روکا۔ ایسے قوانین منظور کروائے جو شادی شدہ عورتوں کی ملازمت کو محدود کریں اور عورت کے خلاف مہم چلائی کہ عورت گھر کو لوٹ جائے اور وہیں محدود رہے'' (۲)

وکٹوریہ دور کے اعلیٰ اور متوسط طبقات کا یہ نظریہ عام تھا کہ عورت کا مقام گھر ہے ملکہ وکٹوریہ سے منسوب بیان کو ہڈسن نے نقل کیا ہے:

"Let woman be what God intended, a help mate for men, but with totally different duties and vocations"(3)

1859ء میں Saturday Review میں عورت کی حیثیت کے بارے میں مقالے کا ایک اقتباس ہڈسن نے نقل کیا ہے جو اس عہد کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

Married life is a women's professsion, and to this life her training, that of dependence - is modelled.(4)

---

(2) Hacker, H. M, women as a minority group, in Glazer Malbin and Waehrer,H. Y; (ed.) Woman in man-made world, rond Macnally, Chicago, 1972.

(3) Hudson K. The place of women in society/46 Ginn, London, 1970.

(4) Ibid

اور اسی اخبار میں 1865ء میں شائع شدہ مقالے کا اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

No women can or ought to know very much of the mass of meanness and wickedness and misery that is loose in the wide world. She could not learn it without loosing the bloom and freshness which is her mission in life to preserve. (5)

اوکلے کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے یہ نظریات کارکن طبقے (Working Calss) تک بھی پہنچ گئے۔ اس نظریاتی عامل کے ساتھ، بچوں کی مزدوری پر پابندی اور عورتوں کی ملازمتوں کی محدودیت نے شادی شدہ عورتوں کی اکثریت کو ماں اور گھریلو خاتون کے کردار میں مقید کر دیا۔

عورت کی ملازمت کا دور

اوکلے کا خیال ہے کہ 1914ء سے 1950ء کا عرصہ عورت کی ملازمت کے سلسلے میں نئے رجحانات کا نقیب ہے۔ اس دور میں عورتوں کے لئے ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوئے لیکن انہیں ساتھ ہی گھریلو ذمہ داریوں کو بھی نبھانا پڑا۔ اس دوران عورت کو کئی قانونی اور سیاسی حقوق حاصل ہوئے مثلاً 1928ء میں ووٹ کا حق ملا لیکن ان سے بھی اس کے ماں اور گھریلو خاندان کے مرکزی کردار کی ادائیگی میں کوئی کمی نہ آئی۔ اوکلے کے خیال میں صنعتی دور نے عورت کے کردار پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب کیے ہیں۔

(i) معمول کی گھریلو زندگی سے مرد کی کنارہ کشی

(ii) عورتوں اور بچوں کا مردوں پر معاشی انحصار

(iii) گھریلو کام اور بچوں کی نگہداشت کی دوسرے کاموں سے علیحدگی

اوکلے کے خیال میں بیسویں صدی کے برطانوی معاشرے میں عورت کے لئے گھریلو خاتون اور ماں کے کردار کو اداراتی حیثیت (Instiutionalised) دے دی گئی۔

اس عرصے میں عورت کام بھی کرتی رہی اور گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھاتی رہی۔ معاشی خوشحالی کے تصور نے پورے خاندان کو کام پر مجبور کیا۔ فلاح کے تصور نے ہر فرد کے معاشی کردار کو ضروری بنا دیا لیکن عورت ملازمت کے باوجود برابری کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔ برطانیہ کے اندر 1970ء میں Equal Pay Act منظور ہوا اور پانچ سال کا عرصہ اس کی تنفیذ کے لئے دیا گیا۔ 1982ء میں یوروپین کورٹ نے فیصلہ دیا کہ یہ ایکٹ یوروپی یونین کے قوانین سے ہم آہنگ نہیں لہٰذا 1984ء میں ترمیم منظور کی گئی جس کے ذریعہ عورت کی تنخواہ کو ایک جیسے کاموں میں مرد کے برابر قرار دیا گیا۔ 1975ء میں

(۵) Ibid/53

.Sex discrimination Act منظور ہوا جس نے ملازمت میں جنس کی بنیاد پر امتیاز کو غیر قانونی قرار دیا عورتوں کو ملازمتوں کے مواقع میسر آنے لگے تو برطانیہ (1961ء۔1981ء) میں ملازم عورتوں کی تعداد 207 لاکھ ہو گئی جب کہ کام کرنے والے مردوں کی تعداد میں دو لاکھ کی کمی آئی۔ 1961ء میں 32.3 فیصد کام کرنے والی عورتیں تھیں اور 1981ء میں یہ تعداد 39.5 فیصد ہو گئی۔ Labour Force Survey کے مطابق 1993ء میں برطانیہ کی کام کرنے والی آبادی کا 44.43 فیصد عورتوں پر مشتمل تھا۔

1980ء میں شعبہ ملازمت اور محکمہ شمار آبادی (Department of Employment and the office of Population Census and Surveys) نے سروے کروایا جسے جین ماٹن اور کیرڈون رابرٹ (Jean Martin and Ceridwen Roberts) نے مرتب کیا اور اسے A lifetime perspective کا نام دیا گیا۔ (۶) اس میں عورت کی ملازمت کے حوالے سے پورا ریکارڈ مرتب کیا گیا۔ اگر اس سروے کی مہیا کردہ تمام معلومات کا جائزہ لیا جائے اور عورتوں کی ملازمتوں کی نوعیت کا تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(i) عورت کو کم اجرت ملتی تھی

(ii) ان کی ملازمت اکثر اوقات جز وقتی ہوتی

(iii) اکثر اوقات نچلی سطح کی ملازمتوں پر ان کا تقرر ہوتا

(iv) عورتوں کو خاص قسم کی ملازمتیں ملتیں بالخصوص جو کم درجہ کی ہوتیں۔

اس عرصے میں تحقیقات ہوتی رہیں، بہتری کی کوششیں ہوتی رہیں۔ اور اب عورت نے بہتر تعلیم اور صلاحیت کی بنیاد پر مردوں کے مضبوط حصاروں میں بھی اپنی حیثیت منوائی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ عورت نے Job Market پر قبضہ کر لیا ہے اور مردوں کو بعض میدانوں سے پیچھے دھکیل دیا ہے تاہم کرمپٹن اور سینڈرسن (۷) (Crampton and Senderson) کا خیال ہے کہ عورت اب بھی کمتر سطح پر کام کر رہی ہے عدم مساوات اور کمتری کی نوعیت ایک صنعت سے دوسری صنعت کے حوالے سے متعین ہوتی ہے اور اسی بنا پر اختلاف کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ عورت نے ملازمتوں کے استحقاق، اجرتوں کی مساوات اور شاہراہ حیات پر گامزن رہنے کے لیے بڑی محنت سے مسلسل جدوجہد کی ہے۔ امید ہے کہ یہ سفر آہستہ آہستہ کٹ ہی جائے گا۔

......☆......

(6) Martin J. and Roberts.C. women and employment. A life time perspective H.M.So,London 198.

(7) Crompton, Rosemary and Senderson kay, Gendered jobs and Social change, Uniwin Hyman, London 1990.

(3) تحریک آزادی نسواں

ابتداء میں یہ تحریک عورت کے حقوق کی تحریک تھی جو بعد میں آزادی نسواں اور نسائیت کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ عنوان کی تبدیلی سے سرگرمی کی شدت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن بنیادی تصور تبدیل نہیں ہوا۔ اول و آخر بات حقوق پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے۔ مغرب میں عورت کے حقوق کا تصور ہمیں انیسویں صدی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ جان سٹوارٹ مل اور ہیریٹ ٹیلر (John Stuart Mill & Hairiet Taylar) 1869ء نے کہا تھا۔

If the principle (of democracy) is true, we ought to act as if we believed it, and not to ordain that to be born a girl instead of a boy, any more than to be born black instead of white, or a commoner instead of a noble man, shall decide the person's position throughout life.(1)

مغرب میں عورت کے حقوق کی جدوجہد ایک تاریخ رکھتی ہے۔ مغربی عورت کی موجودہ حیثیت اس جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس جدوجہد یا تحریک کو مختلف نام دیئے گئے' حقوق نسواں' سفریجی تحریک' آزادی نسواں' نسائیت یا تحریک نسائیت (Women's Right, Sufferage movement, Women Liberation movement, Feminism or Feminist movement) کہا گیا۔ ابتدا میں یہ حقوق کی جدوجہد تھی لیکن اس میں تھوڑی سی توسیع کر کے اسے خاندان یا معاشرے میں عورت کے استحصال کے شعور و ادراک سے تعبیر کیا گیا۔ یہ بنیادی طور پر مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کا منظر نامہ ہے۔ اس کا تصور فرانس میں پیدا ہوا۔ 1890ء میں عورتوں کے حقوق کی سیاسی تحریک کا پتہ چلتا ہے لیکن انیسویں صدی کے پہلے نصف میں اس کی فکری بنیادیں رکھی جا چکی تھیں۔ عورتوں کی اجتماعی آواز انقلاب فرانس 1893ء میں چھپی میری والسٹون کرافٹ (Mary Walstone Croft) کی کتاب "Vindication of the rights of women" نے تحریک آزادی نسواں میں بنیادی کردار ادا کیا۔ معاشی سیاسی اور تعلیمی حقوق کی جدوجہد جاری رہی۔ 1882ء میں (Married Women's Property Act) پاس ہوا جس میں عورت کے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے یہ اجازت ملی کہ وہ اپنی رقم جس طرح چاہے خرچ کرے۔ ناروے میں 1840ء اور 1850ء کی دہائیوں میں عورت کے حق وراثت کو تسلیم کر کے برابری کا درجہ دیا گیا اور 1864ء میں عورت کو کاروبار کرنے کا حق دیا گیا۔ 1866ء میں ناروے میں Professional Freedom Law پاس کیا گیا۔ اسے مغربی حقوق کی تاریخ میں قانونی سنگ میل کی حیثیت دی گئی ہے۔ تحریک آزادی نسواں میں ووٹ کے حق کو بنیادی حیثیت حاصل رہی لیکن معاشرے اسے

---

(1) The Subjugation of Women, Oxford University Press, Oxford, 1974

قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سوئٹزر لینڈ میں ووٹ کا حق 1917ء میں دیا گیا، برطانیہ میں ووٹ کا حق 1918ء میں دیا گیا اگرچہ 1880ء میں انہیں مقامی حکومتوں کی ملازمتوں کے لیے اہل قرار دیا گیا تھا۔ امریکہ میں 1920ء میں اور فرانس میں 1946ء میں یہ حق دیا گیا۔ ناروے میں انہیں تمام ملازمتوں کے لیے 1912ء میں اہل قرار دیا گیا تھا۔ 1910ء میں فن لینڈ کی پارلیمنٹ میں 19 عورتیں بطور ارکان موجود تھیں۔ فرانسیسی اور برطانوی عورتوں نے سیاسی اور معاشرتی حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی اور عورتوں کو سیاسی جدوجہد میں شامل کرنے کی کاوشیں ہوتی رہیں۔ ہسپانوی اور اطالوی عورتوں نے کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے حقوق اور معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد جاری رکھی۔ حقوق کی جدوجہد میں آزادی اور خودمختاری کی اقدار مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ صنعتی انقلاب نے کسانوں کو دیہاتوں سے شہروں میں منتقل کیا اور عورتوں کو حالات کے جبر کی وجہ سے معاشی جدوجہد میں شامل ہونا پڑا اور اس کے نتیجہ میں عورتوں کی اجرت اور دیگر حقوق کی تحریک شروع ہوئی۔ حقوق کی مساوات ہی وہ بنیادی نعرہ تھا جس پر حقوق نسواں کی تحریک چلتی رہی۔ اس دوران مغربی عورت نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور آہستہ آہستہ مردوں کی حمایت حاصل کی۔ کانفرنسیں، قراردادیں اور مظاہرے اس جدوجہد کا اہم حصہ رہے ہیں۔ اس دوران پہلی اور دوسری جنگ عظیم بپا ہوئی تو اس میں عورتوں پر بھی دوسرے افراد معاشرہ کی طرح مصیبت آئی اور اسے ان جنگوں میں فعال حصہ بھی لینا پڑا۔ ان جنگوں میں مردوں کی بڑی تعداد کام آئی تو عورتوں کو نئی ذمہ داریاں اور نئے کام انجام دینا پڑے۔ یہی وہ وقت ہے جب اسے زیادہ آزادی کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے۔

سلویا وال بی (Sylvia Wal by) (۲) کا خیال ہے کہ انیسوی صدی اور بیسویں صدی کے آغاز میں تحریک نسواں کی مہم ووٹ کے حق سے آگے نکل چکی تھی۔ ان کی مہم میں طلاق کی آسانی، بہتر تعلیم و تربیت کی سہولتیں اور شادی شدہ عورت کا حق ملکیت جیسے مسائل شامل تھے لیکن بیسویں صدی کے بڑے حصے میں وہ شہری حقوق کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ یعنی بلا لحاظ جنس تمام بالغ اشخاص کے لیے قانونی مساوات۔ لیکن تحریک نسواں بطور ایک وسیع تحریک ساٹھ کی دہائی میں نمودار ہوئی۔ ساٹھ کی دہائی کئی اعتبارات سے اہم ہے۔ اس کا ایک پہلو وہ تحریکیں ہیں جن کا ظہور امریکہ میں ہوا۔ مثلاً تشدد پسند امریکی افریقیوں کی سیاہ فام قوت کی تحریک (Black Power Movement) نوجوانوں کی تحریکیں جیسے، جمہوری معاشرے کے لیے طلبہ تحریک "Students for Democratic Society" ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگوں کے خلاف تحریک امن "Peace Movement" وغیرہ۔ تحریک آزادی نسواں نے ان سے قوت حاصل کی اور

(۲) Walby, Silvia. Patriarchy at work, Polity Press, Cambridge, 1986; Theorising Patriarchy, Black Well Oxford, 1990

آزادی کا تقاضا کیا، معاشرے کے مسلمہ اصولوں پر اعتراض کیا اور ظلم و استحصال کو نشانہ بنایا۔

جولیٹ مشیل (Juliet Mitchell) (۳) کے بقول ان تحریکوں نے تحریک آزادی نسواں کو فکری و تحریکی مواد مہیا کیا۔ عورتوں نے ان تحریکوں میں حصہ لیا تھا لیکن اس میں بھی انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا ہے اس لیے انہیں اپنی آزاد تحریک شروع کرنی چاہیے۔ باربرا ڈیکارڈ (Barbra Deeard) ان تحریکوں میں عورتوں کی شمولیت کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

Here many young women learned both the rhetoric and the organisation of protest. Not surprisingly, as they became more sensitive to the blacks second class status, they became more aware of their own. (۴)

اس احساس کا نتیجہ تحریک آزادی نسواں ہے۔

ٹریس گل اور لیری وٹی (Tress Gill & Larry Whitty) نے عورت کی مزدوری، ملازمت اور اجرت کے حوالے سے لکھا ہے کہ عورت کو زندگی کا بیشتر حصہ اجرت پر کام کرنا پڑتا تھا تاکہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی غربت کا ازالہ کر سکے (۵) لیکن ابھی تک ملازمت ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا کہنا ہے:

Women still educated and trained on the expectation that their paid job will take second place to their domestic role.(6)

1960ء کی دہائی تحریک کے لیے اس لیے اہم ہے کہ اس وقت جہاں رویوں میں تبدیلی اور احساسات میں شدت آئی وہاں نئے معاشرتی طرز عمل کا سراغ بھی ملتا ہے۔ گل اور وٹی (Gill & Witty) کے بقول:

Women have worked to overcome this sexual divide. The 1960s and 70s were a period of economic expansion when women expressed their anger at apparently equal education leading to unequal jobs and career opportunities.(7)

اس دوران آزادی کے شعور نے جہاں حقوق کی مساوات اور مواقع میں برابری کا نعرہ دیا وہاں عورت کی ذات کے حوالے سے بھی نئے مطالبے اور نئے نعرے وجود میں آئے۔ انہی مصنفین کے بقول:

Better birth control techniques, having children became largely a

---

(۳) Mitchell, J.J., Women's Estate, Penguine, Hammonds worth, 1971

(۴) Decard, B.S., The Women's Movement, Harpens Row, NewYork, 1975

(۵) Women's Right in Work Place/I

(۶) Ibid

(۷) Ibid

question of choice.The women liberation movement emerged demanding equal pay and job opportunities, Nurseries free contraception and abortion at request. (8)

برطانوی منظر

برطانیہ میں تحریک آزادی نسواں میں لیبر موومنٹ(Labour Movement) کا بنیادی کردار ہے۔ اشترا کی نظریات نے جہاں مزدوروں کو استحصالی طبقات کے خلاف صف آراء کیا وہاں اشترا کی نظریات ہی کے زیر اثر عورتوں کی تحریک آزادی کے لیے بھی حمایت پیدا ہوئی۔ جس طرح امریکہ میں استحصال کے خلاف تحریکوں نے آزادی نسواں کی تحریک کو تقویت دی اسی طرح برطانیہ میں طبقاتی کشمکش نے اسے قوت پہنچائی۔ تاہم امریکہ اور برطانیہ میں تحریک آزادی نسواں کا نشوونما مختلف طریقوں پر ہوا۔ امریکہ میں لبرل نسائیت اور انقلابی نسائیت کے رجحانات غالب رہے۔ امریکہ کی سب سے موثر تحریک نسواں لبرل ہے (Liberal National Organisation of Women) اس کے ارکان کی تعداد 175,000 ہے اور انقلابی نسائیت کی دو بنیادی فعال رہنما کیٹ ملیٹ (Kate Millett) اور شلامیتھ فائیر سٹون (Shulamith Firestone) امریکی ہیں۔ برطانوی تحریک نسواں مارکسی اور اشترا کی اصولوں پر منظم ہوئی ہے۔ ڈیوڈ بوشیر (David Bouchier) کا اندازہ ہے کہ 1983ء میں تین سو (300) نسوانی تنظیمیں تھیں لیکن اکثریت بائیں بازو کی تنظیموں کے ذریعہ سرگرمیوں کو ترجیح دیتی تھیں۔(۹)

نکی چارلس (Nickie Charles) کا خیال ہے۔(۱۰) کہ نیشنل ویمن کوآرڈینیشن کمیٹی (National Women Coordination Committee) نے اپنی قومی کانفرنسوں میں 1970-1978ء تک مختلف اہداف کا تعین کیا اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی:

(i) اجرتوں کی برابری 1971ء میں
(ii) تعلیم اور ملازمت کے برابر مواقع
(iii) 24 گھنٹے مفت نرسری کی سہولت 1975ء میں
(iv) عورت کی قانونی مالیاتی آزادی
(v) ہم جنس پرست عورتوں پر امتیازات کا خاتمہ 1987ء میں
(vi) عورتوں کی جسمانی اور جنسی تشدد سے آزادی

---

(۸) Ibid

(۹) Bouchier, David. The Feminist challenge. Macmillan. London. 1983.

(۱۰) Gender division and social change. Horvesterw eat sheaf, Hammul Hamstead. 1993

آخری مسئلہ پر مارکسی واشتراکی اور انقلابی گروہوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ انقلابیوں کے ہاں تشدد اہم مسئلہ تھا جبکہ اشتراکی معاشی عوامل کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ اس وجہ سے یہ آخری کانفرنس تھی اس کے بعد کوئی کانفرنس نہ ہو سکی۔ برطانوی تحریک نسواں نے بعض اہداف حاصل کئے لیکن انقلابی تبدیلیاں لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ البتہ برطانوی معاشرے میں ملازمتوں کے سلسلے میں جنسی تقسیم کے حوالے سے نئی تنظیم (Restructuring) ہوئی ہے۔ اس کا خیال ہے۔

This restructuring has changed the distribution of women and men within the work force and has made it more acceptable for men to be seen pushing proms and hanging out the washing; but it has not resulted in the elimination of women's subordination and it may have contributed to the fragmentation of the working class and the undermining of its resistance to capitalist exploitation.(11)

1960ء کی دہائی حقوق نسواں کی تحریک میں ایک نیا موڑ ہے۔ یہیں سے اس تحریک نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ اب صرف حقوق کی بات نہیں مکمل آزادی کی بات شروع ہوئی اور کہا گیا کہ آزادی وخودمختاری بذات خود ایک قدر ہے جس کا حصول ضروری ہے (Freedom and liberty are Sovereign Values)۔ آپ اس جدوجہد کی ارتقائی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ صنعتی انقلاب نے عورت کو جبراً گھر سے نکال کر کارخانہ اور بازار میں لا کھڑا کیا تھا لیکن عورت نے اس آزادی کو اپنا حق سمجھ کر حاصل کرنے کی جدوجہد کی اور اب یہ ایک مستقل قدر کی حیثیت سے اس کے ایجنڈے کا حصہ ٹھہری ہے۔ مغربی معاشروں میں اختلاط مردوزن پر کبھی پابندی نہیں رہی۔ عورتوں کی جداگانہ معاشرتی سرگرمیاں، حجاب، حیا اور جائز جنسی تعلقات پر اکتفا کبھی بھی مغربی معاشرت کا اہم حصہ نہیں رہیں۔ ایک طرف عیسائیت کا تصور عصمت تھا جس میں جنسی زندگی ایک گندگی قرار پائی اور دوسری طرف آزاد شہوت رانی کا عمل تھا جو یونانی اور رومی معاشروں کی بدولت مغربی معاشرت کا ایک حصہ تھا۔ آزادانہ طرز حیات اور مخلوط معاشرت کے باعث جنسی تعلقات کے مواقع نے مرد وعورت کیلئے نئے وقتی اور ہنگامی رشتوں کی صورتیں پیدا کیں لیکن اب بھی عورت کے لیے ایک مشکل تھی اور وہ جنسی عمل کے نتیجے میں حمل کی صورت تھی۔ یہ عورت کی حیاتیاتی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ قوت اس طرح کہ اسی کے ذریعے وہ خاندان کی تخلیق کرتی ہے۔ خالق کی حیثیت سے کنٹرول بھی کرتی ہے اور بچوں کے احترام وعزت کا مرکز بھی بنتی ہے۔ کمزوری اس لیے کہ اسے یہ بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور جنم دینے کے تکلیف دہ مرحلے سے گزر کر پرورش کے دورانیہ میں مکمل وابستگی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ چونکہ بچہ اسکی حیاتیاتی جذبے کا حاصل ہوتا ہے اس لیے وہ اس کی محبت اور اس کے لیے

---

(11) Ibid

شفقت کے جذبات میں گرفتار ہوتی ہے۔اس کی حیاتیاتی امنگ اور جذباتی وابستگی اس کی ساری توجہات کو محدود کر کے بچے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ بقائے نسل کا فطری نظام شاید ان جذبوں اور ان وابستگیوں کا تقاضا کرتا ہے اس لیے وہ اس جذبے سے کبھی جان نہیں چھڑا سکتی۔اس جذبے کی وجہ سے وہ مرد سے مستقل تعلق کی خواہاں ہوتی ہے کہ بقائے نوع کے اس عمل میں وہ تنہا اس ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتی۔ چونکہ انسان کی تخلیق میں مرد و عورت کا اشتراک ہے اس لیے اسکی پرورش اور تحفظ میں بھی دونوں مل کر کام کریں۔انسانی تاریخ مرد و زن کے اس اشتراک عمل کی گواہ ہے۔

محبت، عشق، وابستگی، وفا، رحم اور احساس ذمہ داری سب اس اشتراک کا نتیجہ ہیں۔مغربی عورت نے' جو آزادی کی نئی لذت سے آشنا ہوئی تھی' اس آزاد جنسی تعلق پر مائل ہوئی لیکن اس تعلق کا نتیجہ حمل تھا جسے قائم رکھنا اس کے لیے مصیبت کا باعث تھا۔اس لیے بھی کہ اس سے اسکی آزادی میں فرق آتا تھا اور اس لیے بھی کہ اسکی شخصیت کا روپ اور حسن بھی متاثر ہوتا تھا۔مقابلے کی اس منڈی میں بہتر اور خوبصورت مال کی زیادہ مانگ ہوتی ہے اس لیے مرد ایک عورت سے دوسری عورت کی تلاش میں رہتا اور عورت ایک مرد سے دوسرے مرد کی آغوش میں جانے کے لیے مسلسل تگ و دو میں رہتی۔اس وجہ سے اسقاط حمل ایک اہم مسئلہ بن گیا۔تحریک آزادی نسواں نے اسے حقوق کی جنگ میں اہم نقطہ قرار دیا۔لیکن اسقاط حمل ایک تکلیف دہ عمل تھا جس سے گزرنا عورت کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہا۔1960ء کی دہائی اس اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جدید میڈیکل سائنس نے مانع حمل گولیاں تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ان گولیوں کی ایجاد نے آزاد جنسی تعلق کی ایک بڑی مشکل کو دور کر دیا۔مغرب کی نوجوان نسل کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔دوسری جنگ عظیم کے بعد تباہ حال یورپ تعمیر جدید کو تقریباً مکمل کر چکا تھا اور معاشی انقلاب نے خوشحالی کا ایک نیا سنہرا باب متعارف کرایا تھا۔خوشحال یورپ اب عیش و عشرت کے اس ماڈل کو دیکھ رہا تھا جو یونان اور روم نے اپنایا تھا۔1960ء کی دہائی تحریک نسواں کے لیے نیا پیغام لائی' اب محض حقوق کی بات نہ تھی' وہ تو تقریباً حاصل ہو چکے تھے' اب عورت کی آزاد حیثیت کو مستحکم کرنا اور اسکی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔مغربی معاشروں میں عورت نے بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کر دیا۔شادی اور مستقل وابستگی کا تصور مجروح ہوا۔خاندان کا ادارہ انتشار کا شکار ہوا۔محض ساتھی کی حیثیت سے جوڑے رہنے لگے۔طلاقیں اور علیحدگی کے رجحانات بڑھے۔تنہا ماؤں (Single Mothers) کا ایک بڑا گروہ وجود میں آیا۔ناجائز بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہوا۔ماں باپ کی علیحدگی میں بچوں کی نگہداشت کے مسائل پیدا ہوئے اور آہستہ آہستہ ریاست کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور ماہرین عمرانیات اسے معاشرتی تغیر (Social Change) کا خوبصورت عنوان دیتے رہے۔اس طرح مغربی معاشرہ ایک منفرد معاشرہ قرار پایا اور اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ جدید سوشیالوجی کا اہم موضوع ٹھہرا ہے۔طوائفیں جنہیں اب Sex Worker کہا

جاتا ہے، اجرت پر جنسی عمل، جس میں طوائفیں، دلال اور گاہک شامل ہیں، کو اب Sex Industry کا عنوان دیا گیا ہے۔ مغربی معاشرے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس آزادی کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ انتہائی غور کا مستحق ہے۔ جنسی عمل جو تخلیق انسان اور بقائے نسل انسانی کا ذریعہ ہے ایک لذت آمیز عمل بھی ہے۔ قدرت نے اس میں ایک کشش، ایک تسکین اور ایک لذت رکھی ہے۔ غالباً اسے پرکشش اس لیے بنایا کہ مرد وعورت اس عمل پر آمادہ ہوں اور تخلیق و بقائے انسانی میں اپنا کردار ادا کریں۔ شیطان نے انسان کو اس کی لذت کے پہلو کو زیادہ پرکشش بنایا اور اسے تفریح کا ذریعہ قرار دیا۔ انسان نے اپنے طویل تجربے اور ربانی ہدایت کے تحت اس تعلق کے لیے جو حدود و قیود متعین کی تھیں شیطان نے اسے ہمیشہ ناپسندیدہ قرار دیا اور انسان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان حدود کو توڑے اور اسے اپنی تسکین و تفریح کے طور پر استعمال کرے۔ مغرب نے شیطان کے اس اشارے کو سمجھا اور تحریک آزادی نسواں نے اسے بطور نعرے کے استعمال کیا اور اس سلسلے میں اکثر مردوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس آزادی کا کڑوا کسیلا اور زہریلا پھل ہم جنس پرستی ہے۔ جنس کو تفریح کا مشغلہ سمجھنے کے باعث مغرب کے مردوں اور عورتوں نے ہم جنس پرستی کو زیادہ لذت کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور اس کے لیے Gay اور Lesbion جیسی اصطلاحیں اختراع کیں۔ انہوں نے اپنے حقوق کی جنگ لڑی ہے اور اب مغرب میں ایک تسلیم شدہ اقلیت کے طور پر زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ابھی امریکہ کے اینگلیکن (Englican) کلیسا نے ایک ہم جنس پرست پادری (Gay Priest) کو بشپ (Bishop) مقرر کیا۔

آزادی نسواں کے اہداف اور حصول کے امکانات

ساٹھ کی دہائی کے بعد آزادی نسواں پر بہت کچھ لکھا گیا۔ تحریک نسواں کی مصنفات نے کئی کتابیں لکھیں اور معاشرے میں عورت کی حیثیت کے بارے میں تجاویز پیش کیں۔ اگرچہ ابھی تک آخری ہدف پر اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے حصول کے طریقوں پر۔ تاہم ڈیوڈ بوشیر (David Bouchier) کے مطابق نسائیت پسندوں نے تین اہداف پیش کیے ہیں:

An integrated or egalitarian society where sex differences no longer counts and androgynous society where sex differences no longer exist; and a separatist society where men and women no longer share the same social world.(12)

---

(۱۲) The Feminist Challenge, Macmillan, London, 1983.

(i) صنفی مساواتی معاشرہ (Egalitarian Society)

مارکسی و اشتراکی نسائیت پسندوں کے ہاں مساواتی معاشرے کا قیام ایک نصب العین ہے جسے حاصل کرنا چاہیے۔لبرل گروہ کو بھی اس نصب العین سے ہمدردی ہے کیونکہ ان کے اہداف میں مساوی مواقع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں میں ایک طرح کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں لہذا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ امتیازات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

(ii) جنسی امتیازات (Androgyny) کا خاتمہ

انقلابی نسائیت پسندوں کا خیال ہے کہ صنفی امتیازات کا مکمل خاتمہ ہی اصل مقصود ہے۔شولامتھ فائیرسٹون (Shulamith Firestone) کی معروف رائے ہے کہ حمل اور بچے کا نشوو ارتقاء عورت کے رحم کی بجائے کہیں خارج میں ہونا چاہیئے کیونکہ رحم کی آزادی ہی اصل آزادی ہے۔

(iii) مکمل علیحدگی Separation.

یہ بھی انقلابی نسائیت پسندوں کا نعرہ ہے کہ دونوں اصناف کی معاشرتی شرکت ختم ہو جائے اور دونوں الگ الگ دائرہ کار میں کام کریں۔انہی میں سے بعض لوگوں کی رائے ہے کہ آخر کار عورت ہی کو غالب ہونا ہے۔کیونکہ عورت کو اپنی آزادی کے لیے مرد کی احتیاج کو ختم کرنا ہوگا۔مرد کی حیثیت مزدور کی ہوگی جنسی عمل کے لیے وقت پڑنے پر اسے استعمال کیا جائے اور بس۔مکمل نسوانی معاشرے کے حصول تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔لیکن اکثریت کی رائے ہے کہ علیحدہ معاشرہ مقصود ہے اور نہ قابل عمل۔

تحریک نسواں کی بعض خصوصی تجاویز بھی ہیں جس کے نتیجے میں ان کی رائے کے مطابق عورت کی معاشرتی حیثیت بہتر ہو جائے گی۔ ان میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں

(i) صنفی کردار کا خاتمہ

نسائیت پسند مصنفات میں سے بڑی تعداد یہ رائے رکھتی ہے کہ صنفی کردار کا خاتمہ ہی اصل حل ہے۔بالخصوص ماں اور گھریلو خاتون (Mother and House Wife) کا کردار ان کا ہدف تنقید ہے۔اوکلے کے خیال میں عورت کی آزادی کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں:

(a) خاتون خانہ کا کردار ختم کر دینا چاہیے۔وہ گھریلو کام کاج کے لیے اجرت کے تصور کے خلاف ہے کیونکہ اس سے عورت کی گھریلو حیثیت پکی ہو جاتی ہے۔

(b) خاندان کو اس کی موجودہ شکل میں ختم کر دینا چاہیے کیونکہ ماں اور خاتون خانہ کا کردار خاندان کے ادارے سے

وابستہ ہے۔ خاندان کے ادارے کو ختم کر دینے سے وہ تسلسل بھی ختم ہو جائے گا جس میں لڑکی ماں کا کردار سیکھتی ہے اور لڑکا باپ کا۔

(c) جنس کی بنیاد پر تقسیم کار معاشرتی زندگی کے ہر دائرے سے ختم کر دی جائے

اوکلے کہتی ہے:

. We need an ideological revolution a revolution in the idealogy of gender rules current in our culture, a revolution in our concepts of gender identity". (13)

اس طرح مرد اور عورت کو مذکر و مونث کی حیثیت سے نہیں بلکہ لوگوں (people) کی حیثیت سے پہچانا جائے۔

ایک انقلابی نسائیت پسند مصنفہ کیٹ ملیٹ (Kate Millette)(14) کا استدلال یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں کلچر کا متعین کردہ صنفی کردار موجود نہ ہو ایسے افراد کو نشو و نما دے گا جن کی شخصیت مکمل ہو گی اور معاشرہ جزوی، محدود اور مطابقت رکھنے والی شخصیت نہیں پروان چڑھائے گا۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ عورت مردانہ خصائص پروان چڑھائے اور مرد نسوانی خصوصیات کا حامل ہو اور ہم جنس پرستوں (Homosexual and lesbians) کے لیے مکمل رواداری وجود میں آئے اور جنس مذکر و مونث کے پیمانے سے نہ ناپی جائے۔ لوگ اپنی پسند کے رویوں کو پروان چڑھائیں جنہیں روایتی تذکیر و تانیث کے حوالے سے نہ دیکھا جائے۔

خاندان کا کردار

نسائیت پسندی نے خاندان کے ادارے کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے عورت محدود ہو گئی ہے۔ اور وہ صرف ماں اور گھریلو خاتون ہے اس لیے اس ادارے میں بنیادی تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ عورت کی حیثیت کی بحث نے خاندان کے ادارے کو بھی معرض بحث میں لا کھڑا کیا ہے اور اس کی تبدیلیوں کے سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اوکلے کی رائے ہے کہ خاندان کے ادارے کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر عورت کے لیے ماں اور خاتون خانہ کے کردار سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں (۱۵) کچھ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ خاندان کے ادارے کو جوں کا توں (Statusquo) رہنے دیا جائے۔ البتہ ماں اور خاتون خانہ کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے مثلاً گھریلو کام کے لیے اجرت دی جائے اور بچوں کی نگہداشت (Child Care) کا انتظام کیا جائے۔ بچے کی پیدائش کے لیے چھٹی مع تنخواہ (Maternity leave) دی جائے اور ملازمت پر اس کا حق باقی رکھا جائے۔ اس سلسلے میں متبادل تجاویز بھی دی گئی ہیں مثلاً:

---

(۱۳) Oakley, A. Conventional Families

(۱۴) Sexual Politics, Double Day, New York, 1970

(۱۵) Oakley, A Conventional Families, in R.N. Rapopontetal, (Edit) 1982.

مشترکہ کردار

سوزان براؤن ملر (Susan Brown Millar) نے ایک تجویز دی ہے جسے وہ سادہ حل قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خاوند بیوی اپنے روایتی کردار کو درمیان میں تقسیم کر دیں۔ دونوں میں سے ہر ایک آدھا دن کام کرے اور بقیہ دن بچوں کی نگہداشت کرے۔(۱۶) جیسی برنارڈ (Jessie Bernord) اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

With one stroke, it alleviates one of the major responsibilities of men(sole responsibility for the provider role) and of women (exclusive responsibility for house work and child care):(17)

اس مشترکہ کردار کا جائزہ آر اور آر رپوپورٹ (R.and R. Rapoport) نے Dual - Career میں لیا ہے۔ ان کے مطابق یہ متبادل اکثر لوگوں کے نزدیک قابل عمل نہیں ہے۔

بچوں کی اجتماعی پرورش (Collective Child Rearing)

خاندان کے فرائض میں بچوں کی نگہداشت بھی تھی اب اس کے بچوں کی اجتماعی پرورش کا متبادل اصول متعارف کرایا گیا۔ جسے روایتی مشترک خاندان اور Kibbutz کی طرح کی جمعیتیں ادا کریں۔ ہنگری کے مارکسی مصنف وجدہ اور ہیلر (18) (Vajda and Heller) یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک اجتماعی خاندان یا کمیون (Commune or Collective Family) یہ فرائض ادا کریں گے اور تمام بالغ افراد بچوں کی پرورش کا فریضہ انجام دیں گے۔ بالغوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت یک زوجگی سے لے کر جنسی آوارگی تک موجود ہوگی کیونکہ کمیون میں جنسی تعلقات اخلاقی قدروں کے ماتحت نہیں ہیں۔ اجتماعی خاندان کمیون سے مختلف ہے کیونکہ وہ صرف گھریلو معاملات اور بچوں کی نگہداشت سے متعلق ہے اور یہ پیداواری اکائی نہیں ہوتی۔

دیگر متبادلات

ایلون ٹوفلر (19) (Alvin Toffler) نے ایک انوکھا متبادل پیش کیا ہے۔

اس نے پیشہ ور والدین (Professional parents) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ معاون والدین

---

(۱۶) Ibid.

(۱۷) The future of Marriage, Penguin, Hummonds worth, 1978.

(۱۸) Wajda, M. and Heller, A., Family Structure and Commssion, in Glozer, Malbin and Waehcrer, 1972

(۱۹) Toffler, A. Future Shock, Parguin, London. 1971.

(Pro Parents) خاندان کی حیثیت اختیار کریں گے اور ماں' باپ' چچا' چچی اور دادا' دادی اور نانا' نانی کا کردار ادا کریں گے۔ یہ لوگ بچے کی پرورش کو تنخواہ دار ملازمت کی حیثیت سے اختیار کریں گے۔ اس طرح رضا کارانہ طور پر بچوں کی پرورش کا خاتمہ ہوگا اور بہت سے حیاتیاتی والدین کو خاندانی کردار سے چھٹکارا ملے گا۔ انہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو پیشہ ور لوگوں کے سپرد کرنا ہوگا۔

بہت سے مصنفین نے خاندان کے متبادل اداروں کا تصور پیش کیا ہے۔ اشتراکی نسائیت پسند معنفہ جولیٹ مشیل (۲۰) (Juliet Milchell) نے مختلف تجربات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق اجتماعی زندگی (Communal living) سے ہے جو افراد اور حالات کی مناسبت سے متعین ہوسکتی ہے۔ وہ ایسے ادارے تجویز کرتی ہے جو رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دیں اور ان میں مختلف مرد اور عورتیں مصروف خدمت رہیں۔ جیسی برنارڈ (Jessie Barnord) بھی ایسی تجاویز کی حمایت کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ مستقبل کے ازدواجی رشتے ایسے ہوسکتے ہیں جس میں افراد اپنے حالات اور ترجیحات کے مطابق ان کی نوعیت طے کرسکیں گے۔ (۲۱) مستقبل میں عورت کے کردار کے سلسلے میں دو نظریات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

(i) صنفی مساوات (Gender Equality)

صنفی امتیازات کا خاتمہ اور مرد و عورت کی یکسانیت کا نفاذ' عورت کا ان ذمہ داریوں سے آزاد ہونا جو عورت ہونے کی وجہ سے اس پر مسلط ہیں۔

(ii) آزادیِ اختیار (خاندان کے بارے میں رویوں کا اختیار جسے رواداری کے ساتھ برداشت کیا جائے)۔

خاندان کے بارے میں اس تصور نے مغربی طرز معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ نسائیت پسندوں کے جارحانہ پروپیگنڈے اور مردوں کے شکست خوردہ رویوں کی وجہ سے مزید تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ مغرب چونکہ ربانی ہدایت سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس نے اسلام کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے۔ اس سبب وہ اس آخری اور جامع ہدایت سے استفادہ بھی نہیں کر پا رہا۔ اسلام کے بارے میں مغرب کے عام آدمی کی دلچسپی بڑھی ہے لیکن پالیسی ساز دانشور اور ذرائع ابلاغ کے لوگ شیطان کے پیرو ہیں لہٰذا انہوں نے اسلام اور عام مغربی انسان کے درمیان دھوئیں اور غبار کا ایک پردہ حائل کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مغرب کا عام انسان بھی اسلام کے حیات بخش پیغام سے محروم ہو گیا ہے بلکہ مسلم معاشروں کے منحرف مغرب زدہ طبقات بھی اپنے الحاد میں پختہ ہو گئے ہیں۔

---

(۲۰) Mitchell J.J., Women's Estate, Panguin, Harmards worth. 1971

(۲۱) The Future of Marriage

نسائیت (Feminism) کے مکاتب فکر

ہم نے دیکھا کہ حقوق نسواں کی جدوجہد کس طرح آزادیِ نسواں کی تحریک بنی۔ یہی تحریک جب عملی اور احتجاجی سرگرمیوں سے بڑھ کر فکری بنیادوں کی تلاش میں نکلی تو اسے نسائیت (Feminism) کا نام دیا گیا۔ علماء معاشرت نے اس فکری تحریک کے اصولوں اور اس کی اقسام کا جائزہ لیا ہے۔ نسائیت آزادی نسواں ہی کا دوسرا نام ہے' اسے عام طور پر اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح ان کے بقول عورت کے بارے میں مثبت اپروچ کا اشارہ دیتی ہے جب کہ آزادی نسواں میں ایک منفی پہلو ابھرتا ہے۔ تاہم دونوں کے مقاصد یکساں ہیں ایک عملی جدوجہد کی نشاندہی کرتی ہے تو دوسری فکری بنیادوں کی تلاش میں ہے۔ فکری بنیادوں اور عملی تجاویز پر کام کرنے والی تحریک کو نسائیت (Feminism) کا نام دیا گیا ہے۔ علماء معاشرت نے اس کی فکری کاوشوں اور عملی تجاویز کے باعث اس کے اصولوں اور اس کی اقسام کا جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں اس کے معروف مکاتب فکر کا تعارف پیش کریں گے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ تحریک کس سمت میں سفر کر رہی ہے اور کون سے مقاصد کو پیش نظر رکھا جا رہا ہے۔

مرد اور عورت کے تعلق کے بارے میں تاریخی تصور یہ ہے کہ حیات کے یہ دو وجود ایک دوسرے سے مربوط باہم دگر منحصر ایک دوسرے کی تکمیل اور باہمی وابستگی و پیوستگی کے ساتھ حیات کی بقا اور تسلسل کا وسیلہ ہیں۔ تعلقات کی یہ حیاتیاتی تعبیر مذہب، فلسفہ اور روایت کے جلو میں پروان چڑھتی رہی اور معاشروں کے لیے فلاح و سعادت کا باعث بنی رہی۔ انسان اگرچہ اس تعلق کی سرحدوں اور مسرتوں کے ادراک میں بھی گم رہا اور خالصتاً وجودی و مادی لذتوں سے بھی لطف اندوز رہا لیکن حقائق کی دنیا میں یہ دونوں رزم گاہ حیات کی شدتوں اور بقائے نوع کی مسافتوں کے رفیق ہیں۔ عام انسانوں کے مکاتب فکر کی طرح مرد و عورت بھی اتفاق و اختلاف اور محبت و نفرت کے مراحل سے گذرتے رہے۔ تاریخ انسانی میں کمزور افراد پر ظلم و تشدد ہوتا رہا ہے طاقتور اور باوسیلہ افراد نے کمزور اور بے وسیلہ لوگوں کے حقوق پامال کئے ہیں اس میں مرد بھی شکار رہے ہیں اور عورت بھی۔ تاریخی جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے حقوق بھی پامال ہوئے اور عورت تشدد اور ظلم کا شکار بھی ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی حفاظت کا بھی انتظام ہوا۔ اور یہ مجموعی انسانی منظر ہے۔ یہ کرشمہ تحریک آزادی نسواں کا ہے کہ اس نے صحیح حیاتیاتی تعبیر کی بجائے مسخ شدہ نفسیاتی تعبیر پیش کی اور صنفی عدم مساوات کو ایک نعرے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ Feminist ماہرین معاشرت نے صنفی عدم مساوات (Gender Inequality) کے نظریات کو فروغ دیا ہے۔ اس مسئلے پر Feminist نقطہ نظر کے تین مکاتب ہیں۔

(i) انقلابی نسائیت (Redical Feminism)

(ii) مارکسی و اشتراکی نسائیت (Marxist and Socialist Feminism)

(iii) لبرل نسائیت (Liberal Feminism)

اگر چہ ان میں کافی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اور تینوں نظریات میں شامل اجزا موجود ہیں تاہم ان میں امتیازات بھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس تحریک کے دانشوروں کی سوچ کیا ہے۔

انقلابی نسائیت (Redical Feminism)

عورت کے بارے میں یہ ایک انتہا پسندانہ نظریہ ہے۔ انقلابی نسائیت کا نظریہ رکھنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرد نے عورت کا استحصال کیا ہے کیونکہ عورت مرد کو مفت خدمت مہیا کرتی ہے۔ وہ بچے پالتی ہے اور گھر کا کام کرتی ہے۔ اسے اختیارات کی حیثیت سے محروم رکھا گیا ہے اس لیے وہ محکوم ہے اور مرد حاکم ہے۔ ان کے نزدیک معاشرے کا انتظام چونکہ پدرسری (Patriarchy) ہے۔ اس لیے اس میں حاکمانہ اختیار مرد کو حاصل ہیں اور وہی غالب ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق مرد کا تعلق حکمران طبقہ سے اور عورت محکوم اور رعیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاندان کا ادارہ عورت کی محکومی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کا ہمیشہ استحصال ہوا ہے۔ اور انقلابی تبدیلیوں کے بغیر اس کا کوئی علاج نہیں۔ تاہم اس گروپ میں عورت کے استحصال کی بنیاد اور اس کے ممکنہ حل کے بارے اتفاق نہیں پایا جاتا۔ مثلاً بعض انقلابی نسائیت پسند رہنما جیسے شُلامتھ فائیرسٹون (Shulamith Firestone) کا خیال ہے کہ عورت کے استحصال کا بنیادی سبب حیاتیاتی (Biology) ہے۔ خاص طور پر جنم دینے کی صلاحیت۔ جبکہ بعض دوسرے لوگ مرد کی حاکیت کو کلچر کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کے نزدیک جبری جنسی عمل اور عورت پر مردانہ تشدد وہ طریقہ کار ہے جس سے وہ اپنا غلبہ قائم رکھتا ہے۔ یہ خواتین چونکہ مرد کو عورت کا دشمن قرار دیتی ہیں اس لیے آزادی نسواں کی اس تحریک میں وہ مردوں سے کسی قسم کی بھی مدد لینے کے خلاف ہیں۔ علیحدگی پسند نسائیت پسند گروہ کا استدلال ہے کہ عورت کو مردانہ غلبہ والے معاشرے سے الگ اور آزادانہ طور پر اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے۔ لیڈز انقلابی نسائیت پسند گروپ (Leeds Revolutionary Feminist Group) کا خیال ہے کہ صرف ہم جنس پرست خواتین (Lesbians) ہی صحیح معنوں میں نسائیت پسند ہیں کیونکہ صرف وہی مردوں کے بغیر صحیح معنوں میں آزاد ہیں۔ ایک اور گروہ جو عورت کی امتیازی حیثیت (Female Supremacists) پر یقین رکھتا ہے یہ رائے رکھتا ہے کہ عورت نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ واقعتاً اخلاقی لحاظ سے اس سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ معاشرے کو پدرسری (Patriarchy) سے بدل کر مادرسری (Matriarchy) میں تبدیل کیا جائے۔ مرد صرف عورت کے استحصال ہی کے ذمے دار نہیں ہیں بلکہ معاشروں میں جنگ و جدل اور فساد و تصادم کے باعث بھی ہیں۔ اکثر انقلابی نسائیت پسند اشتراکی اور لبرل نسائیت پسندوں کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ معاشروں کو کسی ایک کی حاکیت کی بجائے برابری کی سطح پر منظم کیا جانا چاہیے۔ اس مکتب فکر میں وحدت

خیال نہیں بلکہ اس کے اسباب ونتائج کے سلسلے میں تعبیر کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ذیل میں چند ایک تعبیرات کو پیش کیا جاتا ہے۔

الف) جنسی استحصال

انقلابی نسائیت کے نظریہ میں عورت کی مظلومیت اور محکومیت کو جارحانہ انداز سے پیش کیا گیا۔ کئی خواتین مصنفات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مظلومیت کے بنیادی سبب کے بارے میں تھوڑے سے اختلاف کے باوجود یہ دانشور بنیادی تصور پر متفق ہیں۔ ان میں سب سے اہم فائیر سٹون ہیں۔ اس کے نزدیک عورت کی محرومی کا سبب جنسی استحصال ہے۔ انقلابی نسائی نظریے کو شلامتھ فائیرسٹون نے مستحکم انداز میں پیش کیا۔ اس کی کتاب "The Dialectics of Sex" 1970ء میں شائع ہوئی جس میں اس نے نسوانی عدم مساوات کو پہلی مرتبہ پیش کیا۔(۱) اس کتاب میں اس نے جنسی استحصال (Sexual Opression) جنسی طبقاتی نظام (Sexual Class System) اور حیاتیاتی خاندان (Biological Family) جیسی اصطلاحیں متعارف کرائیں جو نسائیت پسندانہ تحریک کے مقبول نعرے ہیں۔ یہ اصطلاحیں اگرچہ انقلابی نسائیت پسندی کے نظریاتی پس منظر میں تخلیق کی گئی تھیں لیکن انہیں نسائیت پسندی کے ہر مکتب فکر کے افراد نے استعمال کیا۔ اس کے خیال میں جنسی تسلط عورت پر ظلم کی بنیادی شکل ہے۔ فائیرسٹون اس اشترا کی تصور کو رد کرتی ہے کہ استحصال کا سبب معاشی تفاوت اور انفرادی ملکیت ہے۔ اس کے نزدیک جنسی طبقاتی نظام عمومی طبقاتی نظام پر مقدم ہے۔ اس کے مطابق مرد اور عورت تخلیقی طور پر مختلف ہیں۔ تقسیم کار اور عدم مساوات براہ راست حیاتیاتی حقیقت کا نتیجہ ہے۔ حیاتیاتی تفاوت نے وہ معاشرتی تنظیم تخلیق کی ہے جسے وہ حیاتیاتی خاندان (Biological Family) کا نام دیتی ہے۔ اس نے حیاتیاتی خاندان کی چار خصوصیات بیان کی ہیں:

(i) عورت کی حیاتیاتی معذوری

عورت حیاتیاتی طور پر معذوریوں کا شکار ہے۔ ایام ماہواری (Manstruation) انقطاع ماہواری (Menopause) اور بچہ اور اس کی پیدائش ایک مستقل جسمانی اور ذہنی بوجھ ہے لیکن حمل اور رضاعت کہیں بڑی معاشرتی ذمہ داری ہے۔ حمل اور رضاعت کے دوران عورت کا مرد پر انحصار بڑھ جاتا ہے کیونکہ یہ اس کے وجود اور بقا کا مسئلہ ہوتا ہے۔

(ii) عورت کی احتیاج

دوسری انواع کے نومولودوں کے برعکس چونکہ انسانی نومولود ایک لمبے عرصے تک نگہداشت کا محتاج ہوتا ہے اس لیے عورت ماں کی حیثیت سے مرد کی امداد توجہ اور تحفظ کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور اس کے لیے اطاعت اور ماتحت حیثیت قبول کرتی ہے۔

---

(۱) ہمارے سامنے اس کا 1972ء کا ایڈیشن ہے جسے Paladine نے لندن سے شائع کیا۔

(iii) اختیارات کا غیر متوازن رشتہ

ماں بچے کا باہمی انحصار اور دونوں کا مرد پر انحصار ایک ایسا معاشرتی مظہر ہے جو ہر معاشرے میں موجود رہا ہے۔ اس صورت حال نے ہر انسان کی نفسیات کو متاثر کیا۔ مرد پر عورت کے انحصار نے اختیارات کے ایک غیر متوازن رشتے اور اختیارات کی خصوصی نفسیات کو جنم دیا۔

(iv) عدم مساوات

حیاتیاتی خاندان کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی عدم مساوات کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مرد اپنی طاقت اور عورت پر اختیارات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے غلبے کو وسعت دیتا اور مستحکم کرتا ہے۔ جنسی طبقاتی نظام بنیادی فریم ورک مہیا کرتا ہے جس پر معاشی طبقاتی تقسیم کا دارومدار ہے۔ معاشی طبقاتی تقسیم نے مرد کو یہ موقع مہیا کیا کہ وہ معاشی طاقت کی بنیاد پر تمام کمزور طبقات کو مغلوب کرے کیونکہ جنسی طبقاتی تقسیم نے اسے یہ بنیاد فراہم کی۔ فائیرسٹون کی رائے ہے کہ جب تک عدم مساوات کا یہ نظام ختم نہیں ہوتا اس وقت تک کسی حقیقی مساوات کا حصول ناممکن ہے۔ جنسی طبقاتی نظام تمام استحصالی نظاموں کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک آنتوں کا یہ طفیلی کیڑا (Tape Worm) ختم نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک حقیقی انقلاب نہیں آ سکتا۔

ب) ثقافتی تعبیر

انقلابی نسائیت کے حلقہ میں اورٹنر (Ortner) (۲) نے اس عدم مساوات کو ثقافتی پیمانوں سے پیش کیا ہے۔ شیری بی اورٹنر (Shery B. Ortner) فائیرسٹون کے ساتھ اس حد تک تو متفق ہیں کہ عورت عالمی طور پر مظلوم اور کم مایہ ہے، لیکن اس کے نزدیک اس کا سبب حیاتیاتی نہیں بلکہ حیاتیات کی تعبیر ہے اور اس تعبیر کا تعلق کسی معاشرے کے کلچر سے ہوتا ہے۔ جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ عورت کی حیاتیت نہیں بلکہ اس کی حیاتیاتی حیثیت اور اس کی قدر و قیمت کا تعین ہے۔ اس کا خیال ہے جب تک قدر و قیمت کا یہ عالمی تعین ختم نہیں ہوگا اس وقت تک عورت کی محکومیت ختم نہیں ہوگی۔ اورٹنر (Ortner) کا استدلال یہ ہے کہ حیثیتوں کے تعین کے دو پیمانے ہیں ایک فطرت (Nature) اور دوسرے کلچر۔ مختلف معاشروں میں فطرت کی بجائے کلچر کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کلچر ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان فطرت کو کنٹرول بھی کرتا ہے اور منضبط بھی۔ ہتھیار کی دریافت نے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ حیوانوں کو پکڑ سکے اور مار سکے۔ مذہب اور مذہبی رسوم نے مافوق الفطرت قوتوں کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ شکار اور کھیت کی پیداوار میں کامیابی حاصل کرے۔

---

(2) Ortner. S.B., is female to male as nature to culture, in M. Z. Rosaldo and L. Lamphrene.(ed) women culture and society stanford university press stanford, 1974.

کلچر اس کے مطابق وہ مہارت ہے جس سے انسان نے فطرت کو کنٹرول اور منضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک کلچر نظریہ اور ٹیکنالوجی ہی کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا اسے فطرت پر تفوق حاصل ہے۔ اس کے نزدیک کلچر کو فطرت پر جو فوقیت حاصل ہے وہی بنیاد ہے عورت کی بے قدری کی۔ عورت کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قریب ہے اس لیے مرد سے کمتر ہے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں چار بنیادی نکات بیان کرتی ہیں۔

(i) اور ٹنر Ortner) کا استدلال یہ ہے کہ یہ بات عالمی طور پر مسلم ہے کہ عورت فطرت کے قریب ہے کیونکہ اس کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی عوامل ان فطری طریق سے قریب تر ہے جن کا تعلق تخلیق نوع سے ہے۔ ان عوامل میں ایام ماہواری، حمل، بچے کی پیدائش اور رضاعت شامل ہیں۔ عورت کی جسمانی ساخت ان عوامل کے لیے فطری طور پر زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس کی تخلیق انہی بنیادوں پر ہوئی ہے۔

(ii) ماں کی حیثیت سے عورت کا معاشرتی کردار بھی فطرت کے قریب تر ہونے کی دلیل ہے۔ عورت ہی بنیادی طور پر بچوں کو اجتماعیت کا شعور عطا کرتی ہے۔ شیر خوار اور ذرا بڑے بچے انسانیت کی اس سطح پر ہوتے ہیں جو فطرت کے قریب ہوتی ہے۔ ان کی ثقافتی حس کم اور ثقافتی عمل بالغوں سے بہت قلیل ہوتا ہے۔ عورت کا بچوں سے قریبی تعلق اسے فطرت سے مزید قریب کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال اور ان کے تحفظ میں لگی رہتی ہے۔

(iii) ماں چونکہ خاندان سے جڑی ہوتی ہے اور خاندان دوسرے اداروں کی بہ نسبت فطرت کے قریب تر ہوتا ہے اس لیے عورت فطرت کے قریب ہوتی ہے۔ سیاست جنگ اور مذہبی سرگرمیاں فطرت سے ذرا بعید متصور ہوتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریوں سے بہتر خیال کی جاتی ہیں اس لیے یہ مرد کا دائرہ کار متصور ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے مرد بالاتر خیال کیا جاتا ہے۔

(v) اور ٹنر کا استدلال ہے کہ عورت نفسیاتی طور پر فطرت کے قریب تر ہے۔ چونکہ عورت بچوں کی نگہداشت اور ان کے اجتماعی شعور کے فروغ کا خیال رکھتی ہے اس لیے وہ ذاتی' قریبی اور خصوصی تعلق کو نشوونما دینے کا سلیقہ رکھتی ہے خصوصاً بچوں کے ساتھ اس کا تعلق بچوں کی توانا نشوونما اور اس کے جذبہ امومت کے اظہار و استحکام کا وسیلہ بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مرد سیاست، جنگ اور مذہب میں سرگرم عمل ہونے کی وجہ سے وسیع تعلقات قائم کرتا ہے اور اس کا متحمل ہوتا ہے اس لیے وہ ذاتی اور خصوصی تعلق کے قیام میں کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا مرد زیادہ معروضی اور کم جذباتی متصور ہوتا ہے۔ مردوں کا فکری نظام زیادہ خیالی اور عمومی ہوتا ہے۔ اور ذاتی وخصوصی کم ہوتا ہے۔ اور ٹنر کا خیال ہے کہ قدرت کے عطا کردہ وجود میں کلچر ایک طرح سے فکری نظام اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ فروغ پاتا اور منتقل ہوتا ہے۔ لہٰذا مرد کلچر کے قریب تصور کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کے فکری طریقے زیادہ متعین، زیادہ خیالی

اور زیادہ معروضی ہوتے ہیں اور چونکہ کلچر فطرت سے بہتر متصور ہوتا ہے اس لیے عورت کی نفسیات ایک مرتبہ پھر کمتر تصور کی جاتی ہے اور مرد بلند گردانا جاتا ہے۔ آرٹنر یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ عورت اپنے حیاتیاتی وجود، نفسیاتی عمل، معاشرتی کردار اور نفسیات کے باعث کلچر اور فطرت کے درمیان کہیں کھڑی نظر آتی ہے۔

کلچر کی برتری اور فطرت کی کمتری کے جس تصور پر آرٹنر نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے وہ ہمیشہ کے لیے صحیح نہیں۔ فطرت کی برتر قوت کے کئی اظہارات ہیں جنہیں مختلف معاشروں نے قبول کیا ہے اور فطرت کی بعض طاقتوں کو کنٹرول کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فطرت کمتر ہے تاہم اس تجزیے نے مغرب میں بعض رویوں کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ج) دائرہ کار کی تقسیم

ماہر بشریات مشل۔ زیڈ روسالڈو (Michelle Z.Rosaldo) (۳) نے عورت کی محکومی کا سبب دائرہ کار کی تقسیم قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عملی زندگی میں گھر اور باہر کے دائرہ کار کی تقسیم ہوئی جسے پبلک اور پرائیویٹ یا گھریلو اور خارجی زندگی کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ دو واضح معاشرتی دائرہ کار ہیں۔

(i) گھریلو دائرہ کار

وہ گھریلو دائرہ کار کو اس ادارے اور سرگرمی سے تعبیر کرتی ہے جو ماں، بچوں کے گرد منظم ہوتی ہے۔ ماں کا لفظ ہی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ بچوں اور ان سے متعلق سرگرمیوں سے وابستہ ہے۔ یہ دائرہ کار محدود لیکن اس کی سرگرمیاں نتیجتاً زرخیز اور نفع بخش ہیں۔ یہ سرگرمیاں ایک نفسیاتی تسکین مہیا کرتی ہیں۔

(ii) عوامی دائرہ عمل

عوامی دائرہ کار بنیادی طور پر مرد کا حلقہ اثر تصور ہوتا ہے۔ وہ تمام ادارے اور تعلقات جو مرتبے، اثر و رسوخ اور وسیع زندگی کو مربوط کرنے والی تنظیم اور بالآخر ماں بچے کو بھی کنٹرول کرتے ہیں' پبلک سرگرمیاں شمار ہوتی ہیں۔ گویا گھریلو دائرہ خاندان اور خاندان کی رہائش پر مشتمل ہے اور عوامی ائرہ کار اس حلقے پر مشتمل ہے جس میں رسوم و رواجات، مذہب، سیاست اور معیشت کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔

روسالڈو کے خیال میں عورت کی محکومی کی وجہ اس کی حیاتیات نہیں ہیں بلکہ حیاتیاتی وجود کی تعبیر ہے۔ وہ عورت کی حیاتیاتی کمزوری کو تسلیم کرتی ہے لیکن اسے سبب نہیں قرار دیتی بلکہ اس کی تعبیر کو وجہ بتاتی ہے۔ عورت کے حیاتیاتی تقاضوں کو اس کی سرگرمیاں محدود رکھنے کے لیے بنیاد بنایا ہے۔ وہ اورٹنر کی طرح حیاتیات کی تعبیر کو وجہ قرار دیتی ہے لیکن اس کی

(3) Rosaldo, M. Z and L. Lamphren, (led), Woman culture and society, stanford press.

تعبیر اورٹنر سے مختلف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دائرہ کار کی تقسیم نے دراصل عورت کی محکومی پر مہر ثبت کی ہے۔ اس تعبیر نے اسے بچوں کی پرورش سے منتھی کردیا ہے اور یوں اس کا دائرہ کار محدود ہوگیا ہے۔

مرد نے اپنے آپ کو گھریلو زندگی سے فاصلے پر رکھا ہے وہ دوسرے انسانوں سے اتنی ذاتی وابستگی نہیں رکھتا ہے جتنی ماں سے توقع کی جاتی ہے۔ مرد کو ایک غیر محسوس حاکمانہ اختیار اور سیاسی سرگرمی سے وابستہ کیا جاتا ہے مرد چونکہ گھریلو زندگی سے علیحدگی کی وجہ سے اس دنیا میں موجود انسانی قربت کی لطافتوں سے محروم ہوتا ہے لہٰذا وہ خارجی دنیا کی مذہبی رسوماتی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ خارجی زندگی مرد کو اقدام کی صلاحیت اور طاقت کے اظہار کا اعتماد عطا کرتی ہے اس لیے وہ سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کی خارجی قوت کی وجہ سے گھریلو دائرے میں اپنے اختیارات استعمال کرتا ہے جو عورت کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔

روسالڈو کا خیال ہے کہ دنیا کے کسی معاشرے میں مکمل جنسی مساوات نہیں ہے تاہم عورت کسی حد تک یہ مساوات حاصل کرسکتی ہے اگر مرد زیادہ گھریلو دائرہ میں کردار ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ جوں جوں مرد گھریلو معاملات میں دلچسپی لینے لگے گا توں توں وہ عملاً صنفی مساوات کے قریب آتا جائے گا۔

مغرب میں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسے قوانین بن رہے ہیں اور عملاً مغربی معاشروں میں مرد کو آمادہ اور مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ گھریلو (Domestic) کردار ادا کرے۔ تحریک نسائیت کی مہم اور پراپیگنڈے کے نتیجے میں برتن صاف کرنے، کپڑے دھونے، کھانا بنانے، بچوں کو نہلانے سلانے میں مرد کی شرکت ایک معاشرتی خوبی تصور کی جاتی ہے۔ مغربی معاشروں میں بعض طلاقیں ایسے ہی مسائل پر اختلاف کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ نسائیت پسند گروہوں کی مہم کا حصہ ہے کہ مرد کو (Domesticate) کیا جائے۔ اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب ہو رہی ہیں۔ دائرہ کار کی اس تقسیم کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تاہم یہ ایک مکمل تعبیر نہیں لنڈا امروئے اور آڈرے مڈلٹن (Linda Imroy and Audrey Middleton) کا خیال ہے کہ خارجی دنیا میں عورت کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے باوجود اسے کمتر سمجھا جاتا ہے اور ان کی خدمات کو کم اہم گردانا جاتا ہے۔ اس لیے صرف دائرہ کار کی بات نہیں معاملہ اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ مغرب میں عورت کی ملازمت اور مزدوری کے باوجود اور خارجی دنیا میں اس کی گہری شرکت کے باوصف اس کی اجرتوں اور اس کی معاشرتی حیثیت کا فرق موجود ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ گھریلو اور عوامی دائرہ ہائے کار ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ تقسیم کار کی وجہ سے مرد زیادہ یکسوئی کے ساتھ خارجی دنیا میں کام کرتا ہے اور خاندان کے لیے زیادہ سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

اگر ان تینوں مصنفات کی تعبیرات کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا کہ اصل بات حیاتیاتی ہے۔ قدرت نے عورت کو خاص حیاتیاتی اور معاشرتی کردار کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ کمزوری اس لیے کہ وہ

خارجی دنیا کی جفاکشی کی متحمل نہیں اور قوت اس لیے کہ تخلیق، تربیت اور اجتماعیت میں جو کردار وہ ادا کر سکتی ہے وہ مرد کے بس کی بات نہیں۔ اگر اسے حیاتیاتی و اجتماعی کردار سے محروم کر دیا جائے تو معاشرتی فساد پیدا ہوگا جس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ مغرب اس فساد کا شکار ہے لیکن اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تباہی کی راہ پر بگٹٹ دوڑ رہا ہے۔ حیاتیات یا اس کی تعبیر ایک حقیقت کی نشاندہی ہے لیکن اس سے جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ تعصب، تنگ نظری اور مسخ شدہ ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ عورت کی محکومی کا علاج فطرت اور اجتماعی اصولوں کے خلاف بغاوت میں نہیں ہے بلکہ اس کے عادلانہ نظام میں ہے۔ جس میں مرد وعورت ہدایت ربانی کی روشنی میں اعتدال وتوازن کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں اور کوئی ایک دوسرے کے حقوق پامال نہ کرے۔

مارکسی اور اشتراکی نسائیت (Marxist and Socalist Feminism)

مارکسی اور اشتراکی نقطہ نظر رکھنے والے مرد یا عورت پدرسری معاشرے کو مکمل طور پر عورت کے استحصال کا ذمہ دار نہیں قرار دیتے۔ ان کے نزدیک عورت کی مظلومیت کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ سرمایہ دار ہی اس صورت حال کا اصل فائدہ اٹھانے والا ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا بحیثیت ماں یا خاتون خانہ کے کام کرنا دراصل استحصال ہے کیونکہ اس کام کا اسے کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ مارکسی اور اشتراکی نسائیت پسند تخلیق دولت میں عورت کا استحصال دیکھتے ہیں جب کہ انقلابی نسائیت پسند بچوں کی پیدائش کو استحصال کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ مارکسی نسائیت پسند اجرت والے کام میں بھی عورت کا استحصال دیکھتے ہیں۔ اس کی کم فائدہ مند حیثیت کی وجہ سے انفرادی ملکیت وجود میں آئی اور نتیجہ ذرائع پیداوار کی عدم ملکیت کی صورت میں ظاہر ہوا اور یوں وہ اختیارات کے مرتبہ سے محروم ہوگئیں

مارکسی اور اشتراکی نسائیت پسند عورت کے استحصال کے مسئلے پر تو انقلابی نسائیت پسندوں سے متفق ہیں بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام کے آغاز وارتقاء کے عہد میں لیکن وہ حکمران طبقہ کی عورتوں اور غریب عوام کی عورتوں کے درمیان تفاوت پر زیادہ پریشان ہیں۔ اس لیے مارکسی اور اشتراکی کارکنوں کے نزدیک مارکسی نسائیت پسندوں اور محنت کشوں کے درمیان تعاون کے زیادہ امکانات ہیں جب کہ مارکسی اور اشتراکی نسائیت پسند انقلابی نسائیت پسند مردوں کے ساتھ کسی قسم کے تعاون کے قائل نہیں۔

مارکسی اور اشتراکی نسائیت پسند اشتراکی معاشرے کے قیام کو اس کا حل تجویز کرتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں ذرائع پیداوار اجتماعی ملکیت میں ہوں گے اور کوئی کسی کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ انقلابی نسائیت پسند اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں استحصال کے اسباب مختلف ہیں اس لیے اس کا حل بھی مختلف ہوگا۔ مارکسی اور اشتراکی نسائیت پسندوں میں اپروچ کا تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مارکسی زیادہ فوری تبدیلیوں کے حامی ہیں جبکہ اشتراکی تدریجی تبدیلیوں کو قبول کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سرمایہ دارانہ معاشرے میں جمہوری طرز عمل کے نتیجہ میں جنسی مساوات کے اصول کو حاصل کیا جا سکتا ہے اس لیے

مہوری عمل کا ساتھ دینا چاہیے۔

صنفی عدم مساوات کے بارے میں مارکس کے ساتھ اینگلز نے زیادہ توجہ دی اس نے اس عدم مساوات کی معاشرتی حیثیت پر خصوصی بحث کی۔ اس کی کتاب "The origin of the family ,private property and state" کی حیثیت ایک کلاسیکل ماخذ کی ہے۔ اس کتاب میں اس نے انسانی معاشرت کے ارتقاء پر مخصوص نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ اس نے انسان کے معاشرتی ارتقاء میں مختلف مدارج کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں عورت کی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ اس کے خیال میں ابتدائی معاشرتی مرحلے جسے وہ وحشت و بربریت (savagery and barbarism) کہتا ہے میں عورت کو بہتر مرتبہ حاصل تھا۔ اس دور میں تقسیم کار تھی۔ مرد باہر سے خوراک اکٹھی کرتا تھا اور عورت گھریلو دائرے کی تنظیم کرتی تھی لیکن عورت مرد کے ماتحت نہ تھی۔ انفرادی ملکیت بھی بالکل ابتدائی شکل میں تھی جو چند ابتدائی قسم کے اوزاروں پر مشتمل تھی اور وہ بھی عورت کے ذریعہ اگلی نسل کو منتقل ہوتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یک زوجگی کا اصول نہ تھا۔ مرد و عورت مختلف ساتھیوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے اور اس طرح مرد کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کون سا بچہ اس کا ہے لیکن عورت چونکہ جنم دیتی تھی اس لیے اسے تیقن ہوتا تھا کہ اس کا بچہ کونسا ہے اس لیے جو کچھ ملکیت ہوتی وہ عورت ہی کے ذریعہ منتقل ہوتی۔ اینگلز کے مطابق اسی دور میں وہ حادثہ ہوا جس میں عورت کو شکست ہوئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے محکوم ہوگئی۔ یہی وہ دور ہے جب انسان نے جانوروں کو پالتو بنایا اور ریوڑ پالا اس طرح گوشت دودھ اور کھال وغیرہ ابتدائی معیشت کا اہم سامان ٹھہرا۔ چونکہ مرد اس کو کنٹرول کرتا تھا اس لیے اس نے اسے عورت کے ذریعہ اگلی نسل کو منتقل کرنے کی اجازت نہ دی اس طرح اس کو گھر میں تسلط حاصل ہوگیا اور بچوں کو اپنی طرف منسوب کرنے کی طرف مائل ہوا۔ مرد نے آہستہ آہستہ عورت پر پابندیاں لگانی شروع کیں کہ وہ کسی اور سے جنسی تعلق نہ رکھے۔ آخر کار اس عہد میں جسے اینگلز تمدن (Civilization) کہتا ہے یک زوجگی شادی مستحکم ہوگئی۔ اس وقت مرد نے خاندان پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ اس خاندان کو وہ Patrarchal family کہتا ہے۔

مارکسی اور اشتراکی نقطہ نظر میں اینگلز کی اس تعبیر کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اینگلز نے ساری بنیاد موہوم بشریاتی شھادت پر رکھی ہے۔ تاریخی شھادت اس معاشرتی نمونے کو ثابت نہیں کرتی۔ انقلابی نسائیت پسند مکتب فکر کی طرح مارکسی واشتراکی مکتب فکر میں بھی مختلف الخیال دانشوروں نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے تاہم ان میں سب سے اہم سٹیفن کونٹز اور پیٹا ہینڈرسن (Stephen Coontz and Peta Hendreson) ہیں (۳)

صنعتی اسباب

سٹیفن کونٹز اور پیٹا ہینڈرسن نے مارکسی اور اشتراکی فریم ورک کو قبول کرتے ہوئے عورت کی محکومیت کی وضاحت کی ہے۔ وہ اینگلز کے بہت سے نکات سے اتفاق کرتی ہیں البتہ وہ عورت کی محکومی کی عالمی حیثیت کو مسترد کرتے ہوئے اس

(3) Coontz. stephnie and Henderson, Peta, women's work men's property, verso London 1986.

کے اسباب کو معاشرتی دائروں میں تلاش کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کی مظلومیت کا تعلق اشیاء صرف کی پیداوار کے طریق کار سے ہے۔ پیداواری طریقہ کار میں دونوں کے کردار سے ان کا مرتبہ متعین ہوا نہ کہ تخلیق نسل کی نوعیت سے۔ اس اعتبار سے انقلابی عورت نسائیت پسندانہ نظریہ کو مسترد کرتی ہیں۔ وہ اینگلز کے اس نظریے سے اختلاف رکھتی ہیں کہ انسانی معاشرے کا آغاز عورت کی برتری سے ہوا۔ ان کے خیال میں ابتدائی معاشروں میں عورت اور مرد کی مساوات کا اصول کارفرما تھا۔ وہ اس سے بھی اتفاق کرتی ہیں کہ ابتدا ہی سے معاشروں میں مردوں اور عورتوں میں تقسیم کار کا اصول بھی معمول تھا۔ لیکن تقسیم کار کا لازمی نتیجہ عدم مساوات نہ تھا۔ کچھ عورتیں شکار، تجارتی سفروں اور جنگی کارروائیوں سے مستثنیٰ تھیں کیونکہ ان میں مشقت اور خطرات کا سامنا ہوتا تھا۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو خاص طور پر مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ایسا طرز عمل حیاتیاتی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ معاشرتی ضرورت کے تحت کیا گیا تھا۔

ان کے خیال میں جنس کی بنیاد پر تقسیم کار عدم مساوات پر منتج نہیں ہوئی اور ابتدائی معاشرے کمیونل (communal) تھے۔ اشیاء صرف جنہیں مرد و عورت مل کر پیدا کرتے تھے ان میں سب لوگ حصہ دار ہوتے تھے۔ شکار کا گوشت اور اخذ کردہ سبزیاں اور پھل کمیونٹی کے تمام رشتہ دار افراد کو دیے جاتے۔ حتیٰ کہ اجنبیوں کو بھی خوراک میں حصہ دیا جاتا تھا۔ کونز اور ہیڈ رسن اینگلز کی تائید میں یہ رائے رکھتی ہیں کہ عورت و مرد کی عدم مساوات ملکیت کے تصور میں تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ملکیت کی تبدیلی کے سلسلے میں وہ خاندانی اجتماعی ملکیت (Kin Corporate Property) کے مرحلے کو جنسی عدم مساوات کی بنیاد قرار دیتی ہیں۔ اس مرحلے میں پہلی مرتبہ غیر رشتہ دار اجانب خوراک میں اپنے حق سے محروم ہو گئے۔ والدین اور رشتہ دار اس اجتماعی زندگی میں اہمیت حاصل کر گئے اور خاندان کے بزرگوں نے جائیداد پر کنٹرول حاصل کر لیا اس طرح عمر اور بزرگی کو زیادہ معاشی اختیار حاصل ہو گیا۔

کونز اور ہیڈ رسن نے جنسی عدم مساوات کے آغاز کو تو بیان کیا لیکن مردوں کو غلبہ کیوں حاصل ہوا؟ اس کا کوئی موثر جواب نہیں دیا گیا۔ تاہم انہوں نے اس کی وضاحت شادی کی رسم میں تلاش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف معاشروں میں شادی کے مختلف طریقے رائج ہوئے۔ ایک طریقہ جسے وہ Patrilocality کہتی ہے ایسا ہے جس میں عورت شادی کے بعد خاوند کے خاندان میں منتقل ہوتی ہے۔ وہاں جا کر وہ اپنی حیثیت کم کر بیٹھتی ہے اور اسے ان قواعد وضوابط کے مطابق رہنا ہوتا ہے۔ جو اسکے سسرال والوں کے ہاں معروف ہیں اور یوں اس کی محکومیت شروع ہوتی ہے۔ بعض معاشروں میں مرد عورت کے خاندان میں منتقل ہوتے تھے جسے وہ Matrilocal کہتی ہیں۔ ان معاشروں میں عورت اپنی حیثیت کو نہیں کھوتی تھی اور یہ معاشرے زیادہ تر مساوات کے اصول پر مستحکم تھے۔ اس اصول کے تحت خاوند جو کچھ حاصل کرتا تھا اس میں اپنی بیوی کے خاندان کو حصہ دار سمجھتا تھا اور وہ اس سے مستفید ہوتے تھے ملکیت کا یہ عمل آہستہ آہستہ خاندان سے فرد کے کنٹرول میں آیا اور یوں انفرادی ملکیت کی وجہ سے مال دار افراد نے دیگر افراد پر غلبہ حاصل کر لیا اور اس محکومی میں مرد و

عورت سب شامل تھے۔

یہ نظریہ اگرچہ اینگلز سے زیادہ مرتب اور لطیف ہے اور اس میں عدم مساوات کو خالص معاشرتی اسباب کے دائرے میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم وہ حیاتیاتی پہلو کو نقطہء آغاز کے طور پر اختیار کرتی ہیں اور اسے نظرانداز نہیں کرسکیں۔ وہ یہ فرض کرتی ہیں کہ عورت کی یہ حیثیت کہ وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور دودھ پلاتی ہے تقسیم کار پر منتج ہوئی ہے جس میں عورت خوراک اور اس سے متعلق چیزیں جمع کرتی اور پکاتی ہے اور مرد شکار کرتا ہے۔ یہ تقسیم کار حیاتیاتی اختلاف پر مبنی ہے اور اس اعتبار سے عدم مساوات کا بنیادی نکتہ ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے مارکسی واشترا کی نقطہ نظر کو خوبصورتی سے مرتب کیا اور بیان کیا ہے۔

لبرل نسائیت (Liberal Feminism)

لبرل نسائیت پسند گروہ کے ہاں نظریات کا کوئی مرتب مجموعہ نہیں اس لیے وہ انقلابی اشترا کی نظریات سے قدرے مختلف ہیں۔ ان کا ہدف جنسی مساوات کا حصول ہے لیکن تدریجی طور پر۔ ان کے خیال میں معاشرے میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کا ایک تدریجی عمل کام کرتا ہے۔ اسی کے اندر سرگرم رہنا چاہیے اور اسی کے ذریعہ مقاصد حاصل کرنے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے خلاف مغرب میں کوئی ردعمل نہیں۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ جنسی عدم مساوات سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ بعض باصلاحیت خواتین معاشرے اور خاندان کی فلاح میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتیں کیونکہ انہیں خدمت کا موقع نہیں ملتا اور بعض مرد اپنے بچوں سے قریبی تعلق نہیں رکھ پاتے کہ وہ بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک عدم مساوات کا تعلق اداروں اور معاشروں سے نہیں بلکہ کلچر اور انفرادی رویوں سے ہے۔ مرد وعورت کے متعین معاشرتی کردار نے ان سے محدود اور بے لچک توقعات وابستہ کی ہیں اس لیے معاشرتی امتیازات نے عورت کو برابر مواقع سے محروم کردیا ہے۔ لبرل نسائیت پسندوں کے نزدیک تعلیم اور ملازمتوں کے مساوی مواقع وہ ہدف ہے جسے حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے قانون سازی اور رویوں کی تبدیلی کے لیے کام کرتی ہیں۔ مثلاً انہوں نے برطانیہ میں جنسی امتیاز کا قانون (Sexdiscrimation Act) اور مساوی اجرتوں کا قانون (Equal Pay Act) جیسے اقدامات کی حمایت کی۔ انہوں نے بچوں کی کتابوں سے Sexism اور مرد وعورت کے متعلق روایتی تصورات کو نکالنے کی جدوجہد کی۔ وہ انقلابی تبدیلیوں کی بجائے موجودہ معاشرتی نظم کے اندر جمہوری طریقہ پر کام کو ترجیح دیتی ہیں۔

ان کے خیال میں موجود صنفی عدم مساوات چونکہ معاشرے کے مفاد میں نہیں ہے لہٰذا وہ اسے دور کرنے کی جدوجہد میں معاشرے کے ہر فرد کی حمایت کو خوش آمدید کہیں گی۔ اگرچہ یہ انقلابی تبدیلی نہیں لیکن لبرل نسائیت پسندوں کے ایجنڈے سے خاص معاشرتی تبدیلی واقع ہوگی۔

تحریک آزادیٔ نسواں کی کامیابی

تحریک آزادی نسواں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر اسے عالمی سطح پر لانے میں کامیاب ہوئی۔ مغرب کے سیاسی اور معاشی پالیسی سازوں نے تحریک کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے اور اب پوری دنیا میں مغربیت کو پھیلانے اور غالب کرنے کا جو ایجنڈا ہے اسے تحریک آزادی نسواں کے ساتھ ہم آہنگ کردیا گیا ہے۔ مغربی استعمار نے جن جن ممالک پر قبضہ کیا تھا وہاں ایک گروہ پروان چڑھایا ہے جو مغربی ثقافت کا امین ہے۔ یہی گروہ ہر جگہ برسراقتدار ہے لہٰذا ان کے ذریعہ تحریک آزادی نسواں کے ایجنڈے سمیت مغربیت کے غلبے کا ایک منظر ہے جو ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس تحریک کا دوسرا منظر اقوام متحدہ کا پلیٹ فارم ہے۔ اقوام متحدہ نے 1952ء میں ووٹ کا حق دیا۔ اور بالآخر اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ شق بھی شامل ہوگئی کہ عورت اور مرد کے تمام حقوق یکساں ہیں۔ پھر اسقاط حمل کے حق کو 1970ء میں تسلیم کرلیا گیا۔ یہ پلیٹ فارم تحریک آزادی نسواں کے ایجنڈے کو عالمی سطح پر نافذ کرنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اقوام متحدہ نے مرد و عورت کے یکساں حقوق کے لیے کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے دو سال کام کرنے کے بعد ایک دستاویز تیار کی جسے ''خواتین سے امتیاز کے خلاف اقوام متحدہ کا کنونشن'' کا نام دیا گیا:

(Convention of U.N.O. on the elimination of all kinds of discrimination against woman).

اس کا مختصر نام (SEDAW document) ہے۔ اس دستاویز کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 18 دسمبر 1979ء میں منظور کیا۔ 1981ء میں بیس ممالک نے اسے قبول کیا اور اس کی دسویں سالگرہ پر اقوام متحدہ کے ایک سو ممالک نے اس پر دستخط کیے جن میں دس مسلمان ممالک بھی شامل تھے۔ کنونشن اقوام متحدہ کے تمام ممبر ممالک پر زور دیتا ہے کہ وہ قانون سازی کے ذریعہ مردوں اور عورتوں میں ہر قسم کا امتیاز ختم کریں اور تعلیم سیاست، ملازمت، معیشت اور معاشرت ہر میدان میں مساویانہ طریقہ اختیار کریں۔ تحریک آزادی کا ایجنڈا اب اقوام متحدہ کا ایجنڈا قرار پایا اور تحریک نے اقوام متحدہ کی چھتری تلے اپنے عالمی پروگرام کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ 1994 میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بہبود آبادی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے ایجنڈے میں جنسی آزادی، کنڈوم کا استعمال اور ہم جنس پرستی جیسے موضوعات زیر بحث تھے۔ 1995 میں بیجنگ میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام خواتین کی چوتھی کانفرنس تھی۔ اس کے لیے جو ایجنڈا تیار کیا گیا وہ ایک سو اکیس صفحات پر مشتمل تھا اور اسے بیجنگ ڈرافٹ کا نام دیا گیا۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت کی گئی تھی۔ یہ دراصل عالمی استعمار کا معاشرتی تبدیلی (Social Change) کا ایجنڈا تھا۔ اقوام متحدہ کے تحت منعقد ہونے والا یہ خواتین کا سب سے بڑا عالمی اجتماع تھا۔ قاہرہ اور بیجنگ کانفرنسوں کا ایجنڈا تحریکِ آزادی نسواں کا تیار کردہ تھا۔ اس حیا سوز ایجنڈے پر مسلم ممالک کی اکثریت متفق تھی۔ کیتھولک عیسائیوں نے اس کی مخالفت کی اور

بیجنگ کانفرنس میں تو مغربی ممالک کی بیشتر خواتین نے مخالفت کی۔صرف دو مسلمان ممالک کی خواتین نے مخالفت کی' ایک سوڈان اور دوسرا ایران۔سعودی عرب نے اس کانفرنس میں شرکت ہی نہیں کی تھی۔اس ایجنڈے کے نمایاں موضوعات کچھ اس طرح تھے:

- ☆ مرد وعورت کی فطری مساوات، عورت کو اس کے روایتی کردار (ماں، بہن، بیٹی، بیوی) پر مجبور نہ کیا جائے۔
- ☆ معاشرے کے ڈھانچے کو تبدیل کیا جائے تاکہ عورت فطری مساوات حاصل کرے۔
- ☆ منتخب اداروں میں خواتین کی 50% نشستیں دی جائیں، اسی طرح ملازمتوں میں بھی۔
- ☆ بچے پیدا کرنے کا اختیار عورت کو حاصل ہو۔وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔
- ☆ اسقاط حمل کو قانونی قرار دیا جائے اور اس کا حق بھی عورت کو حاصل ہو۔
- ☆ ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ حاصل ہو اور جسم فروشی کو بھی قانونی تحفظ مہیا ہو۔

تحریک کے اثرات

تحریک آزادی نسواں نے اب تک جو کچھ حاصل کیا اور آئندہ جو کچھ حاصل کرنے والی ہے اس کے نتائج خوفناک ہیں۔یہ تحریک انسانی معاشروں پر ایسی مصیبت لائی جو بالآخر معاشروں کو تباہ کر دے گی۔

لیڈی ایمل لوٹین (Lady Emil Lutyens) نے تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

The Feminist movement has made one great mistake. It has attempted to force a unity which does not and can not exist, and has tried to lose sight of differences of physique, of mentality, of emotional and spiritual outlook between the two sexes which differences constitue the woman's greatest claim to take share with man in public life. (1)

تحریک آزادی نسواں نے مذہب کے خلاف سخت موقف اختیار کیا۔اسکی وجہ عیسائی مذہب کی تعلیمات تھیں اور مذہب کے خلاف ان کے جذبات قابل فہم ہیں پیٹ ہولڈن (Pat Holden) کے بقول:

Liberation movement considered church as an instrument of opression of woman. Genesis myth, writings of Paul and the views of Thomas Acquinas - are considered antiwomen - Misbigotten male, of Jcrome that "She is the door of the devil". (2) Some christian literature suggests that only by a

---

(1) Women's rights in the work place/1

(2) Edit. Pat Holden, Women's Religious experience/3

symbolic denial of their femaleness could women achieve salvation. Women could only achieve salvation through the male-related role of wife, mother or daughter. The dark side of a women's nature was lustful, heartless, disloyal and malicious but she could overcome this by the performance of idealized female role. (۳)

مغربی عورت کا یہ رویہ سمجھ آتا ہے کیونکہ مغرب کے جاگیردارانہ اور پھر سرمایہ دارانہ نظام نے اس کا استحصال کیا اور عیسائی مذہب نے اسے تحفظ فراہم نہیں کیا لیکن مسلمان عورت کا تو یہ تجربہ نہیں ہے۔ بلاشبہ دورِ غلامی میں استعمار نے جو جاگیردارانہ نظام قائم کیا اس نے عورت کے حقوق کو سلب کیا اور ہمارے روایتی معاشرے میں ناانصافیوں کی ایک صورت موجود ہے۔ لیکن اسلام تو عورت کے تحفظ کے لیے ہمیشہ سرگرم رہا۔ عالم اسلام میں تحریک آزادی نسواں حقوق کے تحفظ کے نام پر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ عالمی تحریک آزادی نسواں مغرب کے اسلام دشمن ایجنڈے میں کارکن کا کردار ادا کر رہی ہے۔ عالم اسلام میں اس تحریک کو جو کارکن میسر آئے ہیں ان میں اکثریت لادین، اخلاقی طور پر کمزور، اباحیت پسند اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ انہیں عالمی سطح سے جو ایجنڈا دیا جاتا ہے اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اسلام کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جو عیسائیت کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ تحریک نسواں مسلمان معاشروں میں استعمار کی لونڈی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ 1882 میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا۔ کرومر (Croamer) جو مصر میں قونصل جنرل اور آزادی نسواں کا سرپرست تھا اپنے ملک میں عورتوں کے ووٹ کی مخالف انجمن کا بانی رکن اور صدر تھا۔ قاسم امین فرانس کا پڑھا ہوا اور اپنے معاشرے کے لیے تحقیر کے جذبات رکھتا تھا۔ قاسم امین کی کتاب 1899 میں شائع ہوئی۔ (۴) یہ کتاب استعماری نقطۂ نظر سے مقامی پالیسی کی نمائندہ تھی۔ استعماری طاقتوں نے مسلم معاشرے کی ہیئت کو تبدیل کرنے کی منصوبہ بندی قبضہ کے وقت ہی کر لی تھی۔ مصر اور الجزائر میں اس پر عمل شروع ہوا۔ ایران کے رضا شاہ اور ترکی کے کمال اتاترک نے رضاکارانہ طور پر مغربی معاشرت کو اپنے معاشروں پر ریاستی جبر سے مسلط کیا۔ مغربی لباس کا پہننا لازمی قرار دیا گیا اور ترکی میں تو روایتی مسلم لباس کھلے عام جلایا گیا۔ عالم اسلام کے لیے تحریک نسواں کا ایجنڈا یہ تھا کہ اسلام کو جبر اور یورپ کو نجات دہندہ ثابت کیا جائے۔ ترکی میں اسلامی ضابطے کی بجائے سوئس عائلی ضابطے کا نفاذ دراصل بالائی طبقہ کو ان کی مغربیت کا جواز فراہم کرنا تھا۔ استعمار نے مسلمان معاشروں میں اصلاح کا جو پروگرام ترتیب دیا تھا اس میں مغربی لباس، پردے کا استرداد، عورت کو نکاح و طلاق کا اختیار اور بچوں کی

---

(۳) Ibid

(۴) قاسم امین نے دو کتابیں لکھیں۔ تحریر المرأۃ اور المرأۃ الجدیدہ۔ عالم عرب میں اس پر شدید ردعمل ہوا۔ جواب میں کئی مضامین لکھے گئے۔ علامہ فرید وجدی کی کتاب المرأۃ المسلمہ معرکۃ الآراء کتاب ہے اس کتاب کا اردو ترجمہ "مسلمان عورت" کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ ہمارے سامنے اس کا نواں ایڈیشن ہے جسے ثناء اللہ خان نے ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

حضانت خصوصی طور پر شامل تھیں۔ Woman and Gender in Islam کی مصنفہ لیلی احمد کا کہنا ہے کہ:

Anthropology and Feminism are the tools of Imperialism.

مغربی معاشروں پر بالخصوص اور تمام انسانی معاشروں پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

خاندانی نظام کا انتشار

عورت کی آزادی نے اسے خاندانی نظام اور اس کے اندر روایتی کردار سے بغاوت پر آمادہ کیا لہٰذا پہلا اثر یہ ہوا کہ خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ عورت کی ملازمت اور اسکی ثقافتی سرگرمیوں نے اس رابطے کو تباہ کر دیا جو خاندان کے مختلف افراد کو باہم مربوط رکھ کر خاندان کو یک جہتی عطا کرتا تھا۔ خاندان میں عورت کا وجود رحمت وشفقت اور ہمدردی و غمگساری کا نمونہ تھا جس سے بچے بھی محروم ہوئے اور بوڑھے بھی۔ خاوند جس کا منتظمانہ کردار بیوی کے مشفقانہ طرز عمل سے مل کر خاندان کو استحکام عطا کرتا تھا اب وہ یا تو بے رحم جبر کی صورت اختیار کر گیا یا خاندان کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو کر نئی راہوں پر چل نکلا۔ شادیاں ختم ہو گئیں، طلاقوں کی کثرت ہوئی، بچے بے راہ ہوئے اور بزرگ بے یار ومددگار رہ گئے۔ خاندان کے روایتی کردار کی تباہی کا تعلق براہ راست عورت کی آزادی سے ہے۔ مغرب میں ریاست نے آگے بڑھ کر بعض فلاحی اقدام کیے۔ بوڑھوں کے لیے پناہ کے مراکز اور بچوں کے لیے نگہداشت کے مراکز کا قیام اہم فلاحی اقدامات ہیں۔ لیکن کمیونزم کے زوال کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے خونی پنجے ان مراکز تک پہنچ چکے ہیں اور اب بزرگوں کو ان سہولتوں کے عوض انکی پس انداز رقوم اور جائیداد سے محروم کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ ریاست اب بلا معاوضہ خدمات سے پیچھا چھڑا رہی ہے۔ اس طرح خاندان پر انتشار کے ظالمانہ اثرات کے مظاہر واضح ہونے کو ہیں۔ مغربی معاشروں کو اپنے فلاحی کاموں اور معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے نئی لوٹ کھسوٹ کی ضرورت پڑ رہی ہے، اس لیے کمزور معاشروں کے وسائل پر قبضہ کرنے اور ان پر ڈاکہ ڈالے بغیر یہ معیار برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ نیا استعماری دور کیا رنگ دکھاتا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب اب دوبارہ خاندانی قدروں کے احیاء کے لیے بھی سرگرم عمل ہے لیکن وہ اس لیے ممکن نہیں کہ عورت نے آزادی کا جو لطف اٹھایا ہے اسے وہ ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں اور عورت ہی خاندان کے استحکام کا مرکزی کردار ہے۔ مغربی مرد اپنی قوامیت (Supervisory Role) کھو بیٹھا ہے اور روٹھے صنم کو التجاؤں سے تو منایا نہیں جا سکتا بالخصوص وہ اگر ظالمانہ اور غیر منصفانہ روش پر چل نکلا ہو۔

جنسی آوارگی

عورت کی آزادی کا ایک مظہر آزادانہ میل و جول اور اختلاط مرد و زن ہے۔ مغربی معاشرہ اسے اپنی ثقافتی پہچان قرار دیتا ہے لیکن اس نے مغربی معاشرے سے شرم و حیا اور عفت و عصمت جیسی صفات ختم کر دی ہیں۔ عورت ایک میکانکی شخصیت بن گئی۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے عمدہ تصویر کشی کی ہے جب اس نے کہا:

نہ خیال آشنائی نہ رسوم جام و بادہ — وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ — یہ دلیل خوشدلی ہے میرے واسطے نہیں ہے
میری آرزو سے کم تر میری تاب سے زیادہ — وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا

عورت اور مرد کے تعلق میں ایک پراسرار جاذبیت اور Mystique ہے جس میں دوری اور فراق کا بنیادی کردار ہے۔ آزادانہ میل جول نے اس پراسراریت کو ختم کر دیا ہے۔ وہ محض ایک جسمانی لطف اندوزی ہے جس کا تقاضا حیوانی جبلتیں کرتی ہیں۔ فرائڈ نے جنس اور میکڈوگل نے جبلتوں کے سہارے جملہ انسانی رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔ آزادانہ اختلاط نے زنا بالرضا اور زنا بالجبر کے ذریعہ مغرب میں ایک طوفان بپا کر رکھا ہے۔ مانع حمل ادویات کے باوجود ناجائز اولاد کی ایک فوج ہے جو مغربی معاشروں کا لازمی حصہ بن رہی ہے اور اپنے وجود کے جواز کے لیے وہ ہر مستحکم قدر کی نفی کر رہی ہے۔ مغربی معاشروں پر تو اس کے اثرات مرتب ہو ہی رہے تھے افریقہ و ایشیا کے روایتی معاشروں نے اس نو دریافت جنسی آزادی کو آوارگی سے بھی کسی اگلے مرحلے تک پہنچایا ہے۔ غیر منظم معاشروں میں آزادی جو تباہی لاتی ہے اسے افریقہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ایڈز کی بیماری نے جب سر نکالا تو انہیں احساس ہوا کہ معاملہ خراب ہے۔ خوشحال مغربی معاشرے تو علاج کرنے کے قابل تھے اس لیے سنبھل گئے۔ افریقہ کے پسماندہ معاشرے تو جہنم کے ایندھن کا سامان پیش کر رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مغرب اخلاقی احساس کی محرومی کے باعث مسئلے کے اخلاقی پہلو کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کنڈوم کے استعمال پر زور دے رہا ہے' گویا بدکاری کا ارتکاب درست ہے صرف بیماری سے بچنے کے لیے کنڈوم استعمال کیا جائے۔ کنڈوم کلچر تحریک آزادی نسواں کے ایجنڈے میں بھی شامل ہے۔ تیسری دنیا میں بالعموم اور مسلم ممالک میں بالخصوص اسے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ مقبول عام بنایا جا رہا ہے۔ ان ممالک کے ارباب اختیار مجرمانہ معاونت اور احمقانہ شمولیت پر شاداں و فرحاں ہیں۔

مردوں کے خلاف نفرت

آزادی نسواں کا ایک پہلو جس کا ظہور مغرب میں ہوا ہے وہ مرد کی کردار کشی ہے۔ تحریک نسائیت نے مردوں کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے اس کے اثرات مغربی معاشرے میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ عورت کے حقوق اور اس

کی مظلومیت سے بات شروع ہوئی تھی جواب مردم آزادی تک آ پہنچی ہے۔ ملازمتوں میں عورتوں نے ہر جگہ قبضہ کیا ہے اور مردوں کی بے روزگاری بڑھی ہے۔ اس مغربی معاشرے کے بعض منظر دلچسپ ہیں۔ مردوں کی زیادہ تعداد کم تعلیم یافتہ ہے اس لیے ان کے لیے ملازمتیں نہیں اور جہاں ملازمتیں ہیں وہ سب مزدوروں یا جسمانی محنت والی ہیں۔ سٹیو بڈلف (Steve Biddulp) نے مغربی معاشروں کے بعض دلچسپ حقائق بیان کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ (۵)

☆ شرح اموات سے پتہ چلتا ہے کہ مرد عورت سے اوسطاً چھ سال پہلے مر جاتا ہے۔

☆ مرد عام طور پر قریبی تعلق قائم رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے دو اشارے (Indicators) ہیں۔ چالیس فیصد شادیاں ناکام ہوتی ہیں اور ستر فیصد معاملات میں عورت طلاق کا مقدمہ دائر کرتی ہے۔

☆ بیروزگاروں میں مردوں کی شرح ستر فیصد ہے۔

☆ بارہ سے ساٹھ سال کی عمر میں مرنے والوں کی بڑی وجہ خودکشی ہے۔ 1996ء میں برطانیہ میں چھ ہزار خودکشیاں ہوئیں جن میں پچھتر فیصد مرد تھے۔

فریڈرک ہیورڈ (Fredric Hayward) اپنے مقالہ "Male Bashing" (۶) میں لکھتا ہے:

By far, male-bashing is the most popular topic in my current talkshows and interviews. Reporters and television crews have come to me from as far away as Denmark, Australia and Germany to investigate this American phenomenon. What is going on, they ask,? Why do women want it? Why do men allow it?

The trend is particularly rampant in advertising. In a survey of a 1000 random advertisements; one hundred percent of the jerks singled out in male-female relationships were male. There were no exceptions. That is, whenever there was a husband-wife or boyfriend-girlfriend interaction, the one who was dumped on was the male.

One hundred percent of the ignorant ones were male. One hundred percent of the ones who lost a contest were male. One hundred percent of the ones who smelled bad were male. One hundred percent of the ones who were put down without retribution were male. Sometimes the male would insult the female, but she was always sure to get him back in spades before the

---

(۵) Biddulf, Steve, Manhood/6

(۶) اس کا یہ مقالہ "To be a man" میں شامل ہے۔

commercial ended. One hundred percent of the objects of rejection were male. One hundred percent of the objects of anger were male. One hundred percent of the objects of violence were male.

In entertainment the trend is similarly raging. Some television shows are little more than a bunch of anti-male jokes strung together. Deciding to count the phenomenon during one episode of 'The Golden Girls', I found thirty-one women's insults of men compared to two men's insults of women. Family sitcoms like 'The Cosby Show' or 'Family Ties' have an unwritten rule that mothers are never to be the butt of jokes or made to look foolish.

As to literature, just glance through the recent bestseller lists. There is no anti-female literature that matches the anti-male tone of Smart Women, Foolish Choices, Women Who Love Too Much, Men Who Cant' Love Men Who Hate Women and the Women Who Love Them. Two authors told me about pressure from their editors to create anti-male titles as a way of increasing sales. The Closest thing to a female flaw that one can publicly acknowledge is that women tend to love too much:

Product also reflect the popularity of hating men. One owner of greeting card store reported that male-bashing card are her biggest selling line. 3M sells a variety of Post notes, such as 'The more I know about men the more I like my dog' and 'There are only two things wrong with men. Everything they say and every thing they do'.

(In Australia, the All men are Bastards, calendars and diaries were big sellers. Imagine if the gender of these were reversed, what an uproar would have resulted.)

Unfortunately, sexism teaches us to think of men as one gain organism that has been dominant for thousands of years, and that can handle (or even deserves) a generation or two of abuse. The reality is that men have the same insecurities as women, and the generation of abuse has already had dire consequences for male mental health. Boys, struggling with maturation and never knowing anything but the current age of abuse, suffer even more. Recall the suicide rates amongst young men being the leading cause of death, clear indication of culturally low self-esteem). Relationships suffer as well.

In male-bashing times. disagreements lead to the man feeling blamed and the women feeling oppressed.

Since the dawn of history, the male-female relationship has been able to survive evolutionary traumas by remaining a perfectly balanced system. Both men and women had their sets of privileges and power. Both men and women had positive and negative stereotypes. Feminist activities were the first to recognize that the system was obsolete, but seem to be the last to recognize that the system was. at least in balance. They disputed the system, and that was good but they disrupted the ball once and that was dawn gerous. (7)

خود انحصاری کا غرور

قدرت نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا معاون' ساز گار اور باہم گر وابستہ بنایا ہے' جسمانی' نفسیاتی اور معاشرتی طور پر وہ ایک دوسرے سے آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور مل کر نئی تخلیق اور نشوونما کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں' محب ہیں' رقیب نہیں ہیں۔ تحریک نسائیت نے یہ غضب ڈھایا ہے کہ وہ عورت کو خود انحصاری کی راہ پر چلا دیا ہے۔ مرد کے خلاف مہم کے پیچھے بھی یہی نفسیات کام کر رہی ہے۔ عورت ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے اور عورت مرد کے بغیر بھی زندگی گذار سکتی ہے اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ مغرب میں ایسی تحقیقات ہو رہی ہیں کہ معمول کے مطابق حمل کے طریق سے گذرے بغیر بچہ پیدا کرنے کی کوئی صورت ممکن ہو سکے۔ Human Cloning کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ اس غرور کی وجہ سے طلاقیں ہوتی ہیں۔ عورت اور مرد تو اپنے لیے تسلی کا کوئی اور سہارا ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن بچوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہ فلاحی اداروں کی نذر ہو جاتے ہیں جہاں وہ کئی مصائب کا شکار ہوتے ہیں اور یوں معاشرے کو ایسے شہری میسر آتے ہیں جو دماغی طور پر غیر متوازن' نفسیاتی طور پر الجھاؤ کا شکار اور معاشرتی طور پر ناقابل قبول ہوتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک ہی تو کہا تھا:

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی میں ہے
موج کی آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

برطانیہ میں فلاحی اداروں میں پلنے والے بچوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ پھر ماں باپ کی بدسلوکی کا شکار ہونے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور معاشرے احساس مروت سے محروم مشین بن رہے ہیں۔

......☆......

Stave Biddulf, Manhood/34-36 (7)

4 اسلام میں حیثیت نسواں

اسلام نے ایک نئی معاشرت منظم کی۔ اس نئی معاشرت کی دو بنیادیں تھیں۔ ایک تو جاہلی معاشروں کا عمومی پس منظر تھا جس میں عرب کے جاہلی معاشرے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اس معاشرت نے خام مال کا کام دیا جس کی اصلاح پر اسلامی معاشرہ مبنی تھا۔ اخذ و رد کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ایک صالح معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔ دوسرے پیغمبرانہ تعلیمات کا پس منظر تھا جس میں حضور اکرمؐ نے ربانی ہدایت کے اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ وحی الٰہی اور پیغمبرانہ بصیرت نے ان دونوں امور کو سامنے رکھتے ہوئے اور ایک نئی معاشرت تخلیق کی۔ اس نئی معاشرت میں عورت کی حیثیت کو بھی متعین کیا گیا۔ اس کے مقام و مرتبہ، اس کی سرگرمیوں کا دائرہ کار اور اس کے تعلقات کی نوعیتوں کا تعین بھی کیا گیا۔ اگر قدیم معاشروں کے پس منظر کو دیکھا جائے تو اسلام کا وہ کردار واضح ہو کر سامنے آتا ہے جو اس نے عورت کے وقار کو بلند کرنے اور معاشرے میں اسے محترم مقام دینے کے لیے ادا کیا۔ دنیا کے مختلف معاشروں میں بنیادی خرابی اس امر سے پیدا ہوئی کہ عورت اور مرد کے درمیان تخلیقی طور پر امتیاز روا رکھا گیا اور اسی امتیاز کی بنیاد پر وہ ساری فاسد عمارت کھڑی کی گئی جس میں عورت کو ذلیل ترین سمجھا گیا۔ اسلام نے اس تخلیقی امتیاز کو مٹایا اور انسان کو یہ بتایا کہ مرد اور عورت کی تخلیقی بنیاد ایک ہے۔ دونوں ایک ہی اصل سے آئے ہیں۔ اس لیے پیدائشی اور بنیادی اعتبار سے کسی کو فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ارشاد باری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا۔ اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

اس آیت میں بیک وقت تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کا معاشرتی زندگی پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

(i) وحدت ربانی

(ii) وحدت نسل انسانی

(iii) وحدت حقوق و فرائض

یعنی پہلے اس چیز کو بیان کیا کہ مرد و عورت کا خدا ایک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد کا خدا بڑا رحیم ہے اور عورت کا ظالم۔

(۱) النساء/۱

دوسرے یہ بیان کیا کہ نسل انسانی ایک ہے۔ اس لیے نسلی اعتبار سے مرد و عورت کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی۔ تیسرے مرحلہ پر یہ بات بیان کی کہ انسانی معاشروں میں عام طور پر تقسیم کچھ اس طرح ہوتی رہی ہے کہ حقوق مرد کے حصے میں آتے رہے اور فرائض کا بوجھ عورت کے کندھوں پر ڈالا جاتا رہا لیکن اس آیت نے حقوق و فرائض کی ذمہ داری دونوں پر برابر ڈالی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح مرد حقوق کا مالک بنتا ہے۔ اسی طرح اس کے فرائض بھی ہیں اور جس طرح عورت پر فرائض کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں۔ بخاری اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول موجود ہے جو حیثیت نسواں پر حضور اکرم ﷺ کے رویہ کی واضح دلیل ہے۔

عن عبد الله بن عمرؓ كنا نتقى الكلام والا نبساط الى نساء نا على عهد النبى ﷺ مخافة ان ينزل فينا القرآن فلما مات النبى ﷺ تكلمنا (۲)

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے عہد میں اپنی عورتوں سے کھلی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اللہ کی طرف سے حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو ہم جی کھول کر باتیں کرنے لگے۔

اسلام ہی نے دنیا کو بتایا کہ زندگی مرد و عورت دونوں کی محتاج ہے۔ عورت کو کارگاہ حیات میں ذلیل کر کے انسانی معاشرے کی خدمت نہیں کی جاسکتی۔ قدرت ان دونوں صنفوں سے کام لینا چاہتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک صنف کا ظلم پوری انسانی زندگی کے لیے فساد کا باعث بن جائے گا۔ عورت کے مسئلے میں قرآنی انداز بیان کے دو پہلو ہیں۔

(i) قرآن عورت کے وقار اور عزت انسانی کو مرد کے مساوی قرار دیتا ہے۔

(ii) قرآن عورت کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔

ہم سب سے پہلے اولین شق کو لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تین باتیں قابل غور ہیں۔

(i) قرآن پاک میں جہاں کہیں فضیلت انسانی کا ذکر ہے اس میں مرد و عورت دونوں شریک ہیں۔

(ii) قرآن پاک میں جہاں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا دارومدار ایمان و عمل پر ہے وہاں عورت اور مرد دونوں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ عورت عورت ہونے کی وجہ سے ذلیل ہے اور مرد مرد ہونے کی وجہ سے جنت کا حق دار ہے۔ اللہ کے ہاں نیکی اور تقویٰ ہی شرف قبولیت کا درجہ ہے اور وہ مرد و عورت دونوں ہی میں ہو سکتا ہے۔

(iii) قرآن پاک یہ بات اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ کسی معاشرے کے استحکام اور فساد کا دارومدار مرد و عورت

---

(۲) ابن ماجہ، باب ذکر وفات النبی ﷺ ودفنہ، ۱/۵۲۳، بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء، ۲/۱۸۳؛ بخاری کے الفاظ ہیں
عن عبداللہ بن عمرؓ قال: كنا نتقى الكلام والانبساط الى نسائنا على عهد النبىؐ هيبة ان ينزل فينا شئ فلما توفى النبى ﷺ تكلمنا و انبسطنا

دونوں پر ہے۔ یہ دونوں ہی مل کر معاشرہ کو صالح بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں اور دونوں ہی تمدنی ، بادی اور معاشرتی ہلاکت کا باعث بن سکتے ہیں۔ قرآن پاک کا بیان ہے کہ صالح اور نیک بننے کی صلاحیتیں جس طرح مرد میں موجود ہیں اسی طرح عورت میں بھی موجود ہیں اور شیطانیت جس طرح عورت کو خراب کر سکتی ہے اسی طرح مرد کو بھی۔ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات ان امور کی تائید کرتی ہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۳)

اور ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور سمندر میں سوار کیا اور نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۴)

اور ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ......(۵)

جبکہ آپؐ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان بنانے والا ہوں پھر میں جب اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں (اپنی طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا...... ۔

ان آیات میں انسانی عظمت کا مجموعی ذکر ہے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو ذلیل اور ناکارہ سمجھے۔ اسی طرح قرآن پاک نے تقویٰ اور دین و آخرت کی فلاح کا جو معیار مرد کے لیے مقرر کیا ہے وہی عورت کے لیے ہے۔ اس معیار کو پورا کیے بغیر کوئی بھی صحیح مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶)

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) پر لطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

---

(۳) بنی اسرائیل/۷۰
(۴) التین/ ۴
(۵) ص/ ۷۱-۷۳
(۶) النحل/ ۹۷

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۷)

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راستباز مرد اور راستباز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۸)

سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے میری راہ میں اور انہوں نے جہاد کیا اور شہید ہو گئے اور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹)

وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔ (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے ہیں (اور) حمد کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور ایسے مؤمنوں کو آپ خوشخبری سنا دیجئے۔

---

(۷) الاحزاب/ ۳۵

(۸) آل عمران/ ۱۹۵

(۹) التوبہ/ ۱۱۲

عَسٰی رَبُّہٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَہٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡکُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبۡکَارًا (۱۰)

اگر پیغمبرؐ تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو اس کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے اس کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام لانے والی، ایمان والی، فرمانبرداری کرنے والی، عبادت کرنے والی اور روزہ رکھنے والی ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں۔

قرآن پاک یہ بھی بتاتا ہے کہ تمدن کے صلاح و فساد کا دارومدار دونوں پر ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ ایک کو سراسر عیب و ذلت ثابت کر کے اسے ہر قسم کی برائی کا باعث قرار دیا جائے اور دوسرے کو نیکوکاری اور عزت کا مستحق بنا دیا جائے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دونوں مومن بھی ہو سکتے ہیں اور کافر و منافق بھی۔

اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡکَرِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ وَیَقۡبِضُوۡنَ اَیۡدِیَہُمۡ نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمۡ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (۱۱)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بری بات (یعنی کفر و مخالفت اسلام) کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات (یعنی ایمان و اتباع نبویؐ) سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے خدا کا خیال نہ کیا تو خدا نے ان کا خیال نہ کیا۔ بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَیُطِیۡعُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ اُولٰٓئِکَ سَیَرۡحَمُہُمُ اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (۱۲)

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ اور زکوۃ دیتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔

اسلام مرد و عورت کے بنیادی حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ عورت مختلف حیثیتیں رکھتی ہے۔ اس لیے تفصیلی وضاحت کے لیے ان حیثیتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے مثلاً عورت ماں ہے، بیٹی ہے، بہن ہے اور بیوی ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مرد جب کبھی عورت کے مسائل پر غور کرتا ہے تو اجنبی کے نقطہ نظر سے غور کرتا ہے باپ بیٹے اور بھائی کی حیثیت سے نہیں اور فساد کا یہی سبب ہے۔ قرآن و حدیث نے عورت کی تمام حیثیتوں سے بحث کی ہے اور ان حیثیتوں کے تعین کے بعد اس کے حقوق و فرائض کو بیان کیا ہے۔

---

(۱۰) التحریم: ۵ (۱۱) التوبہ: ۶۷ (۱۲) التوبہ: ۷۱

عورت ماں کی حیثیت سے

قرآن وسنت کے اعتبار سے ماں کا مقام معراج انسانیت ہے۔ ماں کو اس حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور وہ مقام دیا گیا کہ جس کی عظمت کا تصور بھی دوسروں کے ہاں ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں خدا کی توحید کے بعد دوسرا درجہ والدین کی اطاعت کا ہے۔ اور والدین میں سے بھی والدہ کو ترجیح ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۱۳)

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے (توریت میں) بنی اسرائیل سے قول وقرار لیا کہ عبادت نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بھی، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا اور اہل قرابت کی بھی اور بے باپ بچوں کی بھی اور محتاجوں کی بھی اور عام لوگوں سے بھی اچھی طرح کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ پھر تم (قول وقرار کر کے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۱۴)

اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو، اور تم ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمایئے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جٰهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا. اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس کی کوئی دلیل تیرے پاس نہیں تو تو ان کا کہنا نہ ماننا تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے پھر میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا بد) جتلا دوں گا۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْلِيْ

---

(۱۳) البقرہ/ ۸۳ (۱۴) بنی اسرائیل/ ۲۳، ۲۴ (۱۵) العنکبوت/ ۸

وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ. وَإِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰى أَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (١٦)

اور ہم نے انسانوں کو ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا۔

وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ. أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (١٧)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے (میں پورا ہوتا ہے) یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے اے میرے پروردگار مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور نیک کام کروں جس سے آپ خوش ہوں اور میری اولاد میں بھی میرے لیے صلاحیت پیدا کر دیجئے میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں فرمانبردار ہوں یہ لوگ وہ ہیں کہ ہم ان کے کاموں کو قبول کر لیں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے اس طور پر کہ یہ اہل جنت میں سے ہوں گے اس وعدہ صادقہ کی وجہ سے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ والدہ کو کیا مرتبہ عطا کیا ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے لیے کیسے دلائل دیئے گئے ہیں۔ بات صرف قرآن پر ختم ہو جاتی۔ رسول کریم ﷺ نے والدین کے بارے میں عمومی طور پر اور والدہ کے لیے خصوصی طور پر ہدایات دی ہیں۔ اگر قرآن پر اکتفا کیا جائے تو بھی کچھ کم نہیں لیکن آپ نے اس کی مزید وضاحت کر کے اہمیت بڑھا دی۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ؟ قَالَ أُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ أُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ أُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أَبُوْكَ (١٨)

---

(١٦) لقمان/ ١٤، ١٥۔ (١٧) الاحقاف/ ١٥۔

(١٨) مسلم، کتاب البر والصلۃ، ٢/ ١٩٩۔ بخاری میں ان الفاظ کا اضافہ ہے جاء رجل الی رسول اللہ فقال، بخاری، کتاب الادب، [illegible] اصح السیر، ٢/ ٨٦٣

ابو ہریرہؓ سے (روایت ہے) کہا کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ بولا پھر کون؟ فرمایا تیرا باپ۔

عن المغيرةؓ عن النبیؐ قال: ان الله حرم عليكم عقوق الأمهات و وأد البنات ومنع هات وكره لكم قيل وقال وكثرة السوال واضاعة المال (١٩)

مغیرہؓ سے (روایت ہے) انہوں نے کہا (کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ نے یقیناً تم پر حرام ٹھہرائی ہے ماؤں کی نافرمانی اور بیٹیوں کو زندہ گاڑنا اور بخل اور گدائی اور تمہارے لیے برا جانا قیل وقال اور سوال کی کثرت اور مال ضائع کرنا۔

عن عائشةؓ قالت: قال رسول الله ﷺ: دخلت الجنة فسمعت فيها قراءة فقلت من هذا؟ قالوا حارثة بن النعمان كذلكم البر كذلكم البر وكان أبر النّاس بأمه (٢٠)

عائشہؓ سے (روایت ہے) انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جنت میں داخل ہوا اور اس میں قراءت سنی تو میں نے کہا یہ کون ہے؟ بولے حارثہ بن نعمانؓ۔ نیکی یوں ہوتی ہے نیکی یوں ہوتی ہے اور وہ اپنی ماں سے سب لوگوں سے بڑھ کر نیکی کرتے تھے۔

عن بهز بن حكيم عن ابيه قال: قلت يا رسول الله ﷺ: من أبر؟ قال أمك. قلت ثم من؟ قال أمك. وقلت ثم من؟ قال أمك. قلت ثم من؟ قال أباك ثم الأقرب فالأقرب (٢١)

بہزؓ بن حکیم سے (روایت ہے) انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا۔ انہوں نے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں کس سے نیکی کروں؟ فرمایا اپنی ماں سے۔ میں نے عرض کیا' پھر کس سے؟ فرمایا اپنی ماں سے میں نے عرض کیا' پھر کس سے؟ فرمایا اپنی ماں سے۔ میں نے عرض کیا' پھر کس سے؟ فرمایا اپنے باپ سے' پھر قریب تر اور قریب تر سے۔

عن ابی بكرةؓ عن النبیؐ قال: كل الذنوب فيغفر الله منها ماشاء الا عقوق الوالدين فانه يعجل لصاحبه فی الحياة قبل الممات (٢٢)

ابوبکرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا (کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ چاہے تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے سوائے والدین کی نافرمانی کے وہ اس کے مرتکب کے لیے مرنے سے پہلے زندگی ہی میں (سزا میں) عجلت کر دیتا ہے۔

ان آیات و احادیث میں ماں کو جو حیثیت دی گئی ہے اس کے سامنے دنیا جہاں کی عظمتیں ہیچ ہیں۔ غالباً دنیا کے مذہبی ادب میں اس طرح کے بیانات موجود نہیں ہیں۔

---

(١٩) بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدين الكبائر، ٢/٨٨٤۔

(٢٠) شرح السنہ ١٢/٧

(٢١) ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی بر الوالدين، ٢/١٢، (١٩٠٣)

(٢٢) مشکوۃ، کتاب الادب، باب البر والصلہ/ ٢١، شرح السنة عن ابی بکرۃ قال: ما من ذنب أحرى ان يعجل الله لصاحبه العقوبة فی الدنيا مع مايدخره له فی الآخرة من البغی وقطيعة الرحم۔ باب تحريم العقوق ١٢/٢٦

بیٹی کی حیثیت سے

والدہ کے بعد عورت کی دوسری قابل عزت حیثیت بیٹی کی ہے۔ بیٹی کے ساتھ رحمت وشفقت کا سلوک قرآن وسنت کا واضح اصول ہے۔ قرآن نے زندہ درگور کرنے کو جہنم میں جانے کا سبب بتایا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بیٹی کی تربیت اور اس کے ساتھ شفقت کو آگ سے نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے بیٹی کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ. بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۲۳)

اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی۔

عن عائشةؓ قالت :جاء تنی امرأة ومعها ابنتان لها تسألنی فلم تجد عندی غیر تمرة واحدة فاعطيتها ایاها فقسمتها بین ابنتیها ولم تأکل منها ثم قامت فخرجت فدخل النبی ﷺ فحدثته. فقال: من ابتلی من هذه البنات بشیء فأحسن الیهن کن له ستراً من النار (۲۴)

عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت میرے پاس مانگنے آئی اور اس کے ہمراہ اس کی دو بیٹیاں تھیں اس نے میرے پاس کھجور کے سوا کچھ نہ پایا تو میں نے اسے وہی دے دی تو اس نے اسے اپنی بیٹیوں پر بانٹ دیا اور اس نے خود نہ کھایا پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر چلی گئی۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ گھر آئے اور میں نے آپؐ کو بتایا تو آپؐ نے فرمایا: جوان بیٹیوں کی وجہ سے کوئی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے لیے آگ سے آڑ ہوں گی۔

عن انسؓ قال :قال رسول الله ﷺ :من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة انا وهو هکذا وضم اصابعه (۲۵)

انسؓ سے (روایت ہے) انہوں نے کہا (کہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دو لڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک پرورش کی وہ اور میں قیامت کے روز اس طرح آئیں گے اور آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ملایا۔

---

(۲۳) التکویر/۸۔۹

(۲۴) مشکاة، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة/۴۲۱؛ مسلم نے اس روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے: قالت: جاء تنی امرأة ومعها ابنتان لها فسألتنی فلم تجد عندی شیأً غیر تمرة واحدة فاعطیتها ایاها فاخذتها فقسمتها بین ابنتیها ولم تأکل منها شیأً ثم قامت و خرجت وابنتاها فدخل علی النبی فحدثته حدیثها فقال النبیؐ: من ابتلی من البنات بشیء فأحسن الیهن کن له ستراً من النار. باب فضل الاحسان الی البنات، ۲/۳۳۹

(۲۵) مسلم، کتاب البر والصلہ، باب فضل الاحسان الی البنات، ۲/۳۳۰

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من كانت له انثى فلم يئدها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها يعني الذكور أدخله الله الجنة (۲۶)

ابن عباسؓ سے (روایت ہے) انہوں نے کہا رسول اللہؐ نے فرمایا۔ جس کی کوئی انثی (بہن یا بیٹی) ہو اور وہ اسے زندہ نہ گاڑے اور اس کی توہین نہ کرے۔ اور اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

عن ابن عباسؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من آوی یتیماً الی طعامه وشرابه اوجب الله له الجنة البتة الا ان یعمل ذنباً لا یغفر ومن عال ثلاث بنات او مثلهن من الأخوات فأدبهن و رحمهن حتی یغنیهن الله اوجب الله له الجنة فقال رجل یا رسول الله: او اثنتین قال او اثنتین حتی لو قالوا او واحدة لقال واحدةً (۲۷)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے پینے میں ساتھ رکھا تو اللہ نے اس کے لیے جنت لازم ٹھہرائی سوائے اس کے کہ کوئی ایسا گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہو سکے۔ اور جس نے تین بیٹیوں یا ان کی طرح تین بہنوں کی پرورش کی اور انہیں سلیقہ سکھایا اور ان پر ترس کھایا یہاں تک کہ اللہ نے انہیں بے نیاز کر دیا تو اللہ نے اس کے لیے جنت لازم ٹھہرا دی۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا' یا رسول اللہؐ: اور دو ہوں تو؟ فرمایا: اور چاہے دو ہوں یہاں تک کہ لوگ اگر ایک کہتے تو آپؐ ایک ہی کا فرما دیتے۔

مسلم کے کتاب المناقب میں حضرت فاطمہؓ کے متعلق حضورؐ کا یہ ارشاد موجود ہے:

فانما ابنتی بضعةٌ منی یریبنی ما رابها ویو ذینی ما اذاها (۲۸)

بلاشبہ میری بیٹی میرا جگر گوشہ ہے جو چیز اس کے لیے باعث تشویش ہوگی وہ میرے لیے بھی پریشانی کا سبب بنے گی اور جو بات اس کے لیے موجب اذیت ہوگی وہ مجھے تکلیف دے گی۔

ترمذی (۲۹) میں مذکور ہے کہ حضرت بریدہؓ سے دریافت کیا گیا کہ حضور ﷺ کو کون زیادہ محبوب تھا۔ تو آپ نے فرمایا: فاطمہؓ۔

ان آیات واحادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے بیٹی کی حیثیت سے عورت کو کتنا معزز و محترم سمجھا ہے۔ اسلامی تعلیمات پر نظر رکھنے والا کوئی شخص بھی عورت کی عظمت کے اس پہلو کا منکر نہیں ہو سکتا۔

---

(۲۶) ابوداؤد، کتاب الادب، ۳۵۴/۵

(۲۷) شرح السنہ، باب رحم الخلق، ۱۳/ ۴۴

(۲۸) مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل فاطمہ، ۶/ ۱۱۲۷ ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں: انما فاطمة بضعة منی یونینی ما اذا ھا ایضاً

(۲۹) ترمذی، مع شرح ابن عربی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل فاطمہ، ۱۳/ ۲۴۸

بیوی کی حیثیت سے

بیوی کی حیثیت سے عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے کیونکہ یہی وہ تعلق ہے جس میں مرد کو اپنے اختیارات استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس تعلق میں عورت کے لیے ہر معاشرے میں فرائض تو مقرر کیے گئے لیکن حقوق سے اسے محروم رکھا گیا۔ ہم نے پہلے مختلف معاشروں کی تعلیمات کو دیکھا ہے جن میں عورت مکمل طور پر مرد کے رحم و کرم پر ہے اور اس کی انفرادی حیثیت کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اسلام نے اس حیثیت میں بھی عورت کو بلند مقام بخشا۔ اس کے انفرادی تشخص کو تسلیم کر کے اس کے فرائض کے ساتھ اس کے حقوق بھی بیان کیے۔ قرآن و سنت کی واضح نصوص سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے ذمہ فقط فرائض ہی نہیں اس کے کچھ حقوق بھی ہیں اسلام جن کا تحفظ کرتا ہے اور جن کی ادائیگی مرد کا فریضہ ہے۔ وہ یہ ہیں: مہر، نان و نفقہ، خلع اور حسن سلوک وغیرہ۔ اس کی تفصیل کتاب کے باب حقوق الزوجین میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حقوق میں مساوات

اسلام نے بحیثیت مجموعی عورت کو سربلند کرنے میں بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس نے اسے انسانی و اخلاقی اعتبار سے مردوں کے مساوی قرار دیا ہے۔ معاشرتی طور پر بھی اسے اس محرومی سے نجات دلائی جو مختلف معاشروں میں روا رکھی گئی تھی۔ مثلاً قرآن و سنت نے وراثت میں عورت کے مستقل حصے بیان کیے تاکہ اس قانون سے کسی وقت بھی ظالمانہ رویے کا انسداد ممکن ہو۔

عورت کی عمومی حیثیت

اسلام نے ان خصوصی حیثیتوں کے علاوہ اس کی مطلق حیثیت کو بھی بلند کیا ہے۔ اسے معاشرے میں عزت، وقار اور احترام کا مرتبہ دیا ہے۔ اس کے معاشرتی مرتبے کو بلند کیا ہے اور حقوق میں مساوات کا اعلان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل نصوص سے یہ حیثیت واضح ہوتی ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے وقار کے لئے نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہی کافی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

عن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: حبب الى من الدنيا النساء والطيب وجعلت قرة عين فى الصلاة (۳۰)

دنیا میں سے مجھے عورتیں اور خوشبو عزیز ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

---

(۳۰) نسائی مع شرح السیوطی، کتاب عشرة النساء، باب حب النساء ۷/۶۲

آنحضور ﷺ نے اہل یمن کے لیے جو مجموعہ قوانین تیار کرایا اس میں عورت کی قانونی مساوات کا ذکر کیا۔ بیہقیؒ نے سنن کبریٰ میں ایک جملہ نقل کیا ہے جس سے قرآنی آیت ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الألباب (۳۱) کی تشریح ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

ان الرجل یقتل بالمرأۃ (۳۲) بلاشبہ مرد عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا۔

ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن (۳۳) میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے ایک عورت کے قصاص میں ان کئی مردوں کو قتل کرایا تھا جو اس کے خون میں شریک تھے۔ ابوداؤد نے کتاب الدیات میں عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عورت امان اور پناہ دے سکتی ہے۔

عن عائشۃؓ عن النبی انه قال علی المقتتلین۔ان ینحجزوا الاول فالأول وان کانت امرأۃ (۳۴)

عائشہؓ نبی اکرم ﷺ کا قول نقل کرتی ہیں کہ مقتول کے لواحقین پر لازم ہے کہ وہ (جان لینے سے) رک جائیں اگر کوئی قریبی رشتہ دار معاف کردے خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو.....

کتاب الجہاد میں یہ الفاظ منقول ہیں۔

عن عائشۃؓ قالت: ان المرأۃ لتجیر علی المومنین فیجوز (۳۵)

عائشہؓ سے مروی ہے کہ عورت مومنوں کی جگہ پر پناہ دے سکتی ہے۔ سو یہ قابل قبول ہوگی۔

عن ابی ہریرۃؓ عن النبی ﷺ قال: ان المرأۃ لتأخذ للقوم (۳۶) **یعنی تجیر علی المسلمین۔**

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ عورت مسلمانوں کے فائدے کے لیے دشمن کو پناہ دے سکتی ہے۔

بخاری نے کتاب الجہاد میں آنجناب ﷺ کا وہ ارشاد نقل کیا ہے جو آپؐ نے چچازاد کے سلسلے میں فرمایا تھا۔

قد اجرنا من اجرت یا أم ھانی (۳۷)

---

(۳۱) البقرہ/۱۰۹
(۳۲) السنن الکبریٰ، ۸/ ۳۵۸۔
(۳۳) احکام القرآن، ۱/ ۱۶۲۔
(۳۴) ابوداؤد، کتاب الدیات، باب عفو النساء، ۲/ ۲۵۵
(۳۵) ایضاً، کتاب الجہاد، باب فی امان المرأۃ/ ۳۸۰
(۳۶) ترمذی مع شرح ابن عربی، ابواب السیر، باب ماجاء فی امان المرأۃ۔ ۶/ ۹۰
(۳۷) بخاری، کتاب الجہاد، باب امان النساء، ۲/ ۱۳۹

ام ہانیؓ تم نے جسے پناہ دی اسے ہماری بھی پناہ ہے۔

سورۃ نساء کی مختلف آیات کے ذریعہ عورت کے مالی حقوق بھی متعین کر دیے ہیں۔ اور اسے خلع کا حق دے کر شخصی آزادی کا بھی تحفظ کیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

۱۔ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا (۳۸)

مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو حصہ قطعی ہے۔

۲۔ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ (۳۹)

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر۔

۳۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۴۰)

تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔

اسلام عورت کو مظلومیت کے اس جال سے نکالنے کے بعد اسے یوں آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ بے ہنگم زندگی گزارے بلکہ وہ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اصول وضع کرتا ہے، اس کے لیے دائرہ کار متعین کرتا ہے اور اسے خوب و ناخوب کی شناخت عطا کرتا ہے۔ اسلام اس کے واسطے وہ طرز عمل تجویز کرتا ہے جس کے ذریعے وہ انسانی معاشرت کے لیے رحمت بن سکے اور اسے ان راہوں سے دور رکھتا ہے جن پر چل کر وہ معاشرتی آفت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں دو چیزوں کو بنیاد بنایا ہے۔

(i) صحیح تعلیم (ii) عمدہ تربیت

مسلمان عورت اگر ان دو چیزوں کو اپنائے تو وہ ملت اسلامیہ کے لیے پاکیزہ روح کا کام دے سکتی ہے ورنہ حقوق اور تحفظات کی ہر جنگ میں بداخلاقی کے پہلوؤں کو دور نہیں کیا جا سکے گا۔

---

(۳۸) النساء/ ۷

(۳۹) النساء/ ۱۱۔۱۲

(۴۰) النساء/ ۳۲

تعلیم نسواں

اسلام چونکہ اپنا مخصوص فکری و عملی نظام رکھتا ہے اس لیے اس نظام میں وہی فرد ٹھیک چل سکتا ہے جس کی تربیت اس نہج پر ہوئی ہو۔ جس قدر کوئی فرد فکری ناپختگی اور بے ترتیبی کا شکار ہوگا اسی قدر وہ معاشرے کو ضرر پہنچائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے تعلیم کو ایک فریضہ قرار دیا۔

طلب العلم فریضه علی کل مسلم (۴۱)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

تعلیم اور دین سے واقفیت پر مسلمان کی زندگی کا دارومدار ہے اس واسطے حضور ﷺ نے کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں قرار دیا۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف تو آپؐ کی خصوصی توجہ تھی حتیٰ کہ بیعت اسلام کے وقت جو شرائط بیان کی جاتی تھیں وہ ایک طرح کی تعلیم تھی۔ سورہ ممتحنہ میں بیعت کے اصولوں کا ذکر ملتا ہے۔ عورتوں سے بیعت لیتے وقت آپؐ جو عہد لیتے تھے قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَـٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَـٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَـٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُنَّ ٱللَّهَ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۴۲)

اے پیغمبر ﷺ جب مسلمان عورتیں آپؐ کے پاس (اس غرض سے) آدیں کہ آپؐ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد لادیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان بنالیویں اور مشروع باتوں میں وہ آپؐ کے خلاف نہ کریں گی۔ تو آپ ان کو بیعت کرلیا کیجئے۔ اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیا کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

نبی کریم ﷺ نے تعلیم میں عورت کا خاص لحاظ رکھا تھا۔ حضور ﷺ کے خطبات سے مستفیض ہوتی تھیں حارثہ بن نعمان کی صاحبزادی کہتی ہیں۔

ماحفظتِ ق الا من فی رسول الله یخطب بها کل جمعة (۴۳)

---

(۴۱) شرح السنہ، ۱/۲۹۰

(۴۲) الممتحنہ/۱۲

(۴۳) مسلم، کتاب الجمعہ، ۳/۱۳، ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الرجل یخطب علی قوس، ۱/۳۹۲؛ مسلم نے عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے ان کی بہن کی روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں اخذت ق والقرآن المجید من فی رسول الله یوم الجمعة وهو یقرأ بها علی المنبر فی کل جمعة۔ ایضاً۔

میں نے سورۃ ق صرف حضور ﷺ کی زبانی یاد کی ہے جو آپ جمعہ کو اس سے خطبہ دیتے۔

ابن سعدؒ نے طبقات میں خولہ بنت القیس الجہنیہ کا قول یوں نقل کیا ہے۔

كنت اسمع خطبة رسول الله ﷺ يوم الجمعة وانا فى مؤخر النساء(۴۴)

میں جمعہ کے روز حضور ﷺ کا خطبہ سنتی تھی اور میں عورتوں کے آخر میں ہوتی تھی۔

آنجناب ﷺ کو عورتوں کی تعلیم کا اس قدر احساس تھا کہ کئی مرتبہ نماز کے بعد عورتوں کی جانب تشریف لے جاتے اور پھر ان کو دین کی باتیں سناتے۔ بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت بیان کی ہے۔ اس سے آپؐ کے اہتمام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عن ابنؓ عباس : إن النبى ﷺ خرج ومعه بلال فظن انه لم يسمع النساء فوعظهن وامرهن بالصدقة فجعلت المرأة تلقى القرط والخاتم و بلال يأخذ فى طرف ثوبه(۴۵)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نکلے اور ان کے ساتھ بلالؓ تھے انہیں خیال آیا کہ عورتوں نے نہیں سنا آپؐ نے انہیں نصیحت کی اور انہیں صدقہ کا حکم دیا تو عورتوں نے بالیاں اور انگوٹھیاں پھینکنی شروع کیں اور بلالؓ کپڑے کے پلو میں رکھتے جاتے۔

حضور ﷺ کی اس توجہ کے نتیجے میں خواتین کے اندر حصول تعلیم و تربیت کا جو احساس پیدا ہوا اس کی شہادت بخاری کی کتاب العلم کی یہ روایت دیتی ہے۔

عن ابى سعيد الخدریؓ قال: قال النساء للنبى ﷺ: غَلَبنا عليك الرجال فاجعل لنا يوماً من نفسك فوعدهنّ يوماً لَقِيَهُنّ فيه فوعَظهُنّ وأمَرهُنّ فكان فيما قال لَهُنّ: مامِنكُنّ إمْرأة تقدم ثلثة من ولدِها إلّا كان لَهَا حِجاباً من النار. فقالت امرأة: و اثين؟ قال: واثنين (۴۶)

ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ عورتوں نے آنحضور ﷺ سے کہا کہ مردوں نے آپؐ سے ہماری نسبت زیادہ حصہ لیا ہے آپ ہمارے لیے ایک مخصوص دن رکھیں آپؐ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا اس میں آپؐ ان سے ملے انہیں نصیحت کی اور حکم دیا کہ کوئی تین بچے پیدا کرتی ہے تو وہ اسے آگ سے بچانے کا ذریعہ بنے گا۔ ایک عورت نے کہا کہ دو بچے بھی؟ آپؐ نے فرمایا: دو بچے بھی۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت حذیفہؓ کی بہن سے منقول ہے۔

---

(۴۴) طبقات، ۸/۲۱۷۔

(۴۵) بخاری کتاب العلم، باب عظة الامام للنساء، ۱/۲۳

(۴۶) ایضاً، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدہ، ۱/۲۱-۲۲

قالت خطبنا رسول الله فقال: یامعشر النساء أمالکن فی الفضة اماتحلین اما انه لیس منکن امرة نحلی ذهباً الاعذبت به (۴۷)

کہتی ہیں کہ حضورؐ نے ہم سے خطاب فرمایا آپؐ نے فرمایا اے گروہ خواتین تمہیں چاندی کی طرف رغبت نہیں تم اس کے زیور نہیں پہنتی سنو تم میں سے کوئی سونے کے زیور پہنے گی تو اسے عذاب دیا جائے گا۔

آپؐ کے نزدیک تعلیم نسواں کی اتنی اہمیت تھی کہ اگر آپؐ خود نہ جاسکتے تھے تو کسی نمائندہ کو بھیج دیتے آپ اس اہم امر سے غافل نہیں رہے۔ آپؐ کے نزدیک معاشرے کے استحکام میں عورت کی تعلیم و تربیت کو بڑا دخل ہے۔ ابوداؤد کی کتاب الصلاۃ میں ام عطیہؓ کی ایک روایت موجود ہے جو حضور علیہ السلام کی خصوصی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

عن ام عطیة ان رسول الله ﷺ لمّا قدم المدینة جمع نساء الانصار فی بیت فارسل الینا عمر بن الخطابؓ فقام علی الباب فسلم علینا فرددنا علیه السلام ثم قال: أنا رسول رسول الله الیکن وأمرنا بالعیدین ان نخرج فیها الحیض والعتق ولا جمعة علینا ونهانا عن اتباع الجنائز (۴۸)

ام عطیہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہماری طرف عمر بن خطابؓ کو بھیجا انہوں نے دروازے پہ کھڑے ہو کر ہمیں سلام کیا۔ اور ہم نے جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تمہاری طرف رسول اللہ کا قاصد ہوں۔ انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہم میں جو نوجوان اور حیض والی عورتیں ہیں عیدین کے لیے جائیں اور ہم پر جمعہ فرض نہیں اور آپؐ نے ہمیں جنازوں کے پیچھے چلنے سے بھی منع کیا۔

ابوداؤد کی کتاب الآداب میں ایک خاتون کی تعلیم کے ضمن میں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ اسے صبح اٹھتے ہی مندرجہ ذیل دعا پڑھنی چاہیے۔

سبحان الله وبحمده ولا قوة الا بالله ماشاء الله کان ومالم یشألم یکن. اعلم أنّ الله علی کل شیء قدیر و ان الله قد احاط بکل شیء علما(۴۹)

پاک ہے اللہ اپنی تعریف کے ساتھ قوت اسی کے ذریعے مل سکتی ہے اللہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہوتا وہ ہر شے پر قادر ہے اور اسی کے علم نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔

قرطبی نے سورہ نور کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

---

(۴۸) ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب خروج الناس فی العید، ۱/۳۰۶؛ نسائی مع شرح السیوطی، کتاب الحیض والاستحاضه، باب شهود الحیض فی العیدین ودعوة المسلمین، ۱/۱۹۴

(۴۹) ابوداؤد، کتاب الآداب، باب مایقول اذا اصبح، ۶/۳۳۸۔

علموا نساء کم سورة النوا (۵۰) اپنی عورتوں کو سورۃ نور سکھاؤ۔

عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں۔

ما رأیت احداً من الناس اعلم بالقرآن ولا بفریضة ولا بحلال وحرام ولا بشعر ولا بحدیث العرب ولا بنسب من عائشةؓ (۵۱)

میں نے لوگوں میں سے کسی شخص کو قرآن، فرائض، حلال وحرام، شعر، اخبار عرب اور نسب کے بارے میں عائشہؓ سے زیادہ عالم نہیں دیکھا۔

نبی کریم ﷺ کی ان توجیہات کا نتیجہ تھا کہ اس عہد کی خواتین حصول علم کے میدان میں مردوں کے برابر چلتی نظر آتی ہیں۔ ازواج مطہرات خواتین کے علم کا بڑا ذریعہ تھیں۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا علمی وادبی مقام تو ایک مسلم حقیقت ہے۔ حدیث وفقہ میں ان کو خصوصی درجہ حاصل ہے۔ حضورؐ کے تشریف لے جانے پر اکابر صحابہؓ بھی ان سے مشورے کرتے تھے۔ سیرت ورجال کی رو سے اکثر آپ ہی کی رائے صائب ہوتی۔ دور صحابہ وتابعین میں خواتین کی علمی سرگرمیاں تو عیاں ہیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے ادوار میں بھی خواتین بہت نمایاں رہیں۔ مشہور محدث اور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی سوانح میں حافظ سخاویؒ نے لکھا ہے کہ حافظؒ کے اساتذہ میں کئی خواتین بھی شامل ہیں مثلاً فاطمہ بنت عبد الہادیؒ اور عائشہ بنت عبد الہادیؒ۔ عائشہ کی شاگردہ عمرہ بنت عبد الرحمانؒ بہت معروف ہیں۔ مشہور محدث امام زہریؒ ان کے شاگرد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے قاسم بن محمدؒ نے مشورہ دیا کہ میں اس خاتون کے پاس جایا کروں میں نے محسوس کیا کہ واقعی وہ علم کا نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ (۵۲) میں ان مشہور خواتین کا ذکر کرتے ہیں جو علمی اعتبار سے بلند مقام رکھتی تھیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ فی تمییز الصحابہ میں ام المومنین ام سلمہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پختہ عقل اور صائب رائے سے نوازا تھا۔

کانت ام سلمة موصوفة بالجمال البارع والعقل البالغ والرای الصائب (۵۳)

ام سلمہؓ انتہائی حسن کے ساتھ ساتھ پختہ عقل اور درستی رائے سے بھی متصف تھیں۔

ام سلمہؓ کی صاحبزادی زینب بنت ابی سلمہؓ بقول حافظ ابن عبد البرؒ (۵۴) افقہ النساء تھیں۔ تعلیم کی طرف یہ توجہ اکر

---

(۵۰) تفسیر القرطبی، ۱۲/ ۱۵۸

(۵۱) تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۲۷

(۵۲) تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۱۰۶

(۵۳) الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ۴/ ۴۵۹

لیے دلائی گئی تھی کہ عورت دین واخلاق کے لحاظ سے تربیت یافتہ ہو مگر اس تربیت کے لیے تعلیم ضروری ہے' اسی لیے مختلف طریقوں سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمارے فقہاء نے عورت کے حق تعلیم کو قانوناً تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اور عورت اس حق کی طلب میں عدالت تک کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ اس کی مفصل بحثیں ہمارے فقہاء کے ہاں موجود ہیں۔ مثلاً فتاویٰ قاضی خاں' فتاویٰ عالمگیری وغیرہ۔

عمدہ تربیت

چونکہ ساری تعلیم کا مقصود اخلاق وتقویٰ کی تربیت ہے اس لیے قرآن وسنت نے فکری اصلاح کے ساتھ اخلاق وعمل کی اصلاح پر بڑا زور دیا ہے' وہ تمام احکام اسے سکھائے گئے ہیں جو اسلامی معاشرے کے بہترین فرد بننے کے لیے ضروری ہیں۔ خواتین کا بالخصوص یہ خیال رکھا گیا کہ وہ عزت وحیا کے ساتھ زندگی گزاریں اور کتاب وسنت کی پیروی کو اپنا شعار بنائیں۔ اسلام نے اس کے لیے دو امور مدنظر رکھے ہیں۔

(i) ان تمام اعمال وحرکات سے اسے روک دیا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی نسوانی شخصیت کے لیے مضر ہیں۔

(ii) ان اصولوں کی پیروی کو ضروری قرار دیا جو مثبت طور پر مومنہ کے کردار کی پختگی کے ضامن ہیں۔

قرآن وسنت نے ان تمام امور کی نشان دہی کی ہے جن سے مسلم خواتین کو بچنا چاہئے مثلاً مسلم کے کتاب اللباس (۵۵) میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا جو عورتیں مصنوعی بال گوندھتی ہیں دانتوں کو گھس کر خوبصورت بناتی ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے یہ سن کر ایک خاتون نے کہا کہ تمہاری بیوی بھی تو ایسا کرتی ہے عبداللہؓ نے کہا اگر وہ ایسا کرتی ہے تو وہ عقد میں نہیں رہ سکتی جاؤ دیکھو' چنانچہ اس عورت کا خیال غلط نکلا۔ اسی کتاب میں مروی حضور اکرم ﷺ کا ایک اور ارشاد ملاحظہ فرمائیے۔

ونساء كاسيات عاريات مميلات مائلات رؤوسهن كاسمنة البخت المائلة لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها وان ريحها لتوجد من مسيرة كذا وكذا (۵۶)

وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود عریاں رہتی ہیں جو مٹک مٹک کر چلتی ہیں اور جو اونٹ کے کوہان کی طرح اپنے کندھوں کو ہلا ہلا کر ناز وادا کا اظہار کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی بلکہ اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گی حالانکہ جنت کی مہک دور تک پھیلی ہوگی۔

اسی طرح قرآن وسنت میں شرک' چغلی' غیبت' بہتان تراشی اور اسی قبیل کی دوسری حرکات سے منع کیا گیا ہے اور

---

(۵۵) مسلم، کتاب اللباس، باب النساء الکاسیات/ ۲۰۵

(۵۶) مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النساء الکاسیات، ۶/ ۱۶۸

مومن خواتین سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کی حرکات نہیں کریں گی۔ دراصل اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں خاتون دین واخلاق کا مجسمہ ہو۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے عورت جب ہی معاشرے کے لیے مفید ہوسکتی ہے جب وہ دین واخلاق میں اونچا مقام رکھتی ہو ورنہ اس کی بداخلاقی و بدکرداری پورے معاشرے کو جہنم میں بدل سکتی ہے۔ چونکہ معاشرے کا اجتماعی شعور انفرادی تربیت سے ہی پختہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے انفرادی تربیت پر بڑا زور دیا ہے۔ اسی تربیت کا ایک حصہ تو وہ تعلیم تھی جسے خواتین کے لیے ضروری قرار دیا اور اس میں بھی ان پہلوؤں کو زیادہ مدنظر رکھا جن میں اخلاق کی پختگی، سیرت کی تعمیر اور تقویٰ کے احساس کو دخل ہے۔ تربیت کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ عورت کے لیے حدود کار متعین کردئے جائیں۔ اسے فکری طور پر یہ سمجھایا جائے کہ اس کی عملی زندگی کے لیے یہ حدود ہیں۔ اور عملاً اسے زندگی کے اسی دائرہ کار میں کام کرنے کا موقع ملے جو اس کے لیے ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ اس کی زندگی سے ان تمام مواقع کو ختم کردیا جائے جن سے اس کی تربیت پر اثر اندازی کا شبہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہماری زندگی کا ایک پہلو اجتماعی ہے۔ اس اجتماعی زندگی کی تگ و دو میں بوقت ضرورت عورت نمایاں حصہ لے سکتی ہے۔ مگر عام حالات میں اسے اجتماعیت کے کھلے میدان میں کھل مل کر کام کرنے سے منع کردیا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی مخصوص دائرہ کار ہے۔ جسے نسوانی حصہ کہنا چاہئے۔ اسے چند حدود سے متعین کردیا گیا ہے کہ وہ اس اجتماعی زندگی میں کھل کر کام کرسکتی ہے اور اسی زندگی کی تربیت اسے اس وقت کام آئے گی جب ہنگامی حالات میں اسے کھل کر کام کرنا ہوگا۔ غالباً اسی احتیاط کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ نے جمعہ اور جہاد کو عورت پر فرض نہیں قرار دیا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ہنگامی حالات میں جو رخصتیں پائی جاتی ہیں انہیں عام زندگی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

آنجناب کے مندرجہ ارشادات بطور تائید پیش کئے جاسکتے ہیں۔

عن عائشة : قالت قلت یا رسول الله ﷺ: علی النساء جهاد؟ قال: نعم علیهن جهاد ولا قتال فیه الحج والعمرة (۵۷)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے عورتوں کے جہاد کے بارے میں سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا ہاں ان پر جہاد ہے اس میں جنگ نہیں (بلکہ) حج وعمرہ ہے۔

عن عائشه ام المومنینؓ قالت: استاذنت النبیؐ فی الجهاد فقال: جهاد کن الحج (۵۸)

عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے جہاد کے بارے میں حضور اکرمؐ سے اجازت طلب کی تو آپؐ نے فرمایا: تمہارا جہاد حج ہے۔

ابوداؤدؒ نے باب الجمعہ میں غلاموں اور عورتوں کی حیثیت بیان کرتے ہوئے خاتم الرسل ﷺ کے اس ارشاد کو بیان کیا ہے۔

---

(۵۷) ابن ماجہ، ابواب المناسک، باب الحج جہاد النساء ۱/ ۹۶۸

(۵۸) بخاری کتاب الجہاد، باب جہاد النساء ۲/ ۱۰۱

عن طارق بن شهابؓ :عن النبی ﷺ قال الجمعة حق واجب علی کل مسلم فی جماعة إلا أربعة عبد مملوك او امرءة اوصبی او مریض(۵۹)

طارق بن شہابؓ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ جمعہ ہر مسلمان پر باجماعت واجب ہے سوائے چار قسم کے لوگوں کے غلام عورت بچہ اور مریض۔

اسی طرح عورت کو عام معاشی تگ و دو سے بھی دور رکھا تا کہ اجتماعی احساس پاکیزہ رہ سکے بلکہ حضور اکرمؐ کے ارشادات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا بہترین مقام اس کا گھر ہے۔ عورت کی اسی نماز کو بہتر قرار دیا گیا ہے جو وہ گھر میں آخری گوشے میں ادا کرتی ہے۔ قرآن نے ازواج مطہرات کو جو حکم دیا ہے وہ امت مسلمہ کی خواتین کے لیے ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے فرمایا:

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۶۰)

اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانہ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو اور تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا مانو اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اے گھر والو تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو پاک صاف رکھے۔

ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہ آیت اس رویہ پر دلالت کرتی ہے کہ عورتوں کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور باہر کی گشت سے منع کیا گیا ہے۔

وفیه دلالة علی ان النساء مأمورات بلزوم البیوت منهیات عن الخروج(۶۱)

اور اس میں اس امر کا اشارہ ہے کہ عورتوں کو حکم ہے کہ وہ گھر میں رہیں اور انہیں باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں۔

خیر مساجد النساء قعر بیوتهن (۶۲)

عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے عائشہؓ کی روایت سے حضور اکرم ﷺ کا ایک عمدہ قول نقل کیا ہے۔

---

۵۹) ابوداود، باب الجمعة للمملوک والمرأة، ۱/۳۸۴

۶۰) الاحزاب ۳۳

۶۱) احکام القرآن، ۳/۴۴۳

۶۲) مسند احمد، ۶، ۲۹۷

عن عائشةؓ : عن النبی ﷺ انه قال: علیکن بالبیت فانه جهاد کن(۶۳)

حضرت عائشہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا تم اپنے گھروں میں رہو۔ کیونکہ یہی تمہارا جہاد ہے۔

اسلام میں امر و نہی کے اس امتزاج سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عورت کو نہ تو قیدی اور مملوک بناتا ہے کہ اس کے اختیارات ہی نہ ہوں' اور نہ اسے ایسی بے ہنگم آزادی دیتا ہے جس سے دین و اخلاق کی قدریں مجروح اور معاشرے کا اجتماعی سکون غارت ہو۔ اسلام اس کے لیے دائرہ کار متعین کرتا ہے تاکہ وہ اصل کام کر سکے اور وہ اچھا خاندانی نظام ہے جس کے نتیجے میں اچھا معاشرہ اور اچھا شہری نظام تشکیل پائے گا۔ یہی سبب ہے کہ آنجناب ﷺ نے عورتوں اور مردوں کی تربیت میں اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ مسجد نبویؐ کی نماز میں بھی اس اختلاف کو سامنے رکھا مسلم میں کتاب الصلاۃ میں ابو ہریرہؓ کی روایت اس طرز عمل کا زندہ ثبوت ہے۔

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: خیر صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وخیر صفوف النساء آخرها وشرها اولها(۶۵)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور بدترین پچھلی اور عورتوں کی بہترین صف سب سے آخری ہے اور بدترین پہلی۔

اس تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں ایک ایسا معاشرتی نظام وجود میں آتا ہے جس میں مرد اپنی حدود پہچانتا ہے اور عورت اپنے اعمال کا تعین کرتی ہے۔ اس دوہری ذمہ داری سے اسلامی معاشرہ پرسکون' باوقار اور مستحکم ہوتا ہے۔ اسلام نے عورت کو صحیح مقام دے کر اس کا دائرہ کار متعین کر کے انسانیت کو فساد عظیم سے بچا لیا ہے۔ اس وقت عورتوں کی خارج از خانہ جو سرگرمیاں ہیں ان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اسی میں کتنی سرگرمیاں ہیں جو ناگزیر معاشی' تعلیمی اور معاشرتی و فلاحی ہیں اور کتنی تفریحی اور آزادانہ گشت سے متعلق ہیں۔ ایک متعین دائرہ کار میں وہ اسلامی اخلاقی حدود کے اندر تعلیمی' طبی اور فلاحی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی ہیں جس کی اجازت مسلمانوں کی مجاز دینی اتھارٹی دے سکتی ہے لیکن Job Market میں مردوں کو پیچھے دھکیل کر ملازمتوں پر قبضے کی پالیسی دینی و معاشرتی نقطۂ نظر سے مفید نہیں۔ معاشی تگ و دو کے لئے عورتوں کا شوقیہ شامل ہونا معاشرتی لحاظ سے مہلک ہے۔ مسلمان معاشرے مغرب کی نقالی میں اور مغرب کے دباؤ کی وجہ سے اپنی عورتوں کو آزادی پر آمادہ کر رہے ہیں اس کا انجام معاشرتی اداروں کی تباہی اور اخلاقی فساد کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا۔

☆

---

(۶۳) ایضاً ۶/۰ ۶۷: بخاری کتاب الجہاد، باب جہاد النساء ۴۰۲/۲

(۶۴) مسلم کتاب الصلاۃ، باب النساء المصلیات وراء الرجال ۳۲/۲

5 اسلام اور نسلی امتیاز

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کی نسل کو پوری دنیا میں بکھیر دیا تاکہ اس کی زمین آباد ہو۔ نسل انسانی نے مختلف جغرافیائی اور موسمی حالات میں نشوونما پائی اور یوں رنگ، نسل اور زبان کے اختلافات پیدا ہوئے۔ پھر مختلف گروہوں کی تنظیم، سیاسی و عسکری قوت اور معاشی وسائل کے استعمال اور تصرف کے باعث بھی انسانوں کے درمیان امتیازات پیدا ہوئے۔ ابتدائی انسانی تنظیمیں نسلی تھیں۔ خاندان اور قبیلے کی بنیاد پر وحدتیں وجود میں آئیں۔ ازاں بعد معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے پیشے منظم ہوتے گئے۔ جب تمدنی ضرورتیں بڑھیں، شہری جمعیتیں وجود میں آئیں تو مختلف معاشرتی وحدتوں میں تعلقات کی نوعیتیں زیر بحث آئیں اور باہمی تفاعل کی کئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ خاندانوں کی برتری قبائل کے تفوق اور قوموں کے درمیان امتیازات کا تعلق تمدنی فروغ سے ہے۔ منظم نسل کے رویے ہمیں دنیا کی دو قدیم قوموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک یہودی اور دوسرے ہندو۔ یہودی اپنے آپ کو اللہ کی منتخب قوم اور تمام انسانوں سے برتر گروہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات ان کے مذہبی عقیدے اور قومی نفسیات کا حصہ ہے۔ وہ انسانیت کو صرف دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہودی اور غیر یہودی (Jews and Gentile)۔ حقوق اور مراعات، ترجیحات اور فضائل حقوق و فرائض اور ذمہ داریاں اسی تفریق کی بنیاد پر طے پاتی ہیں۔ یہود دنیا کا بدترین نسل پرست گروہ ہے۔ غیر یہودیوں کے بارے میں ان کے رویے کا تذکرہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ. (۱)

”اور اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ تم اس کے پاس دولت کا ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو واپس دے دے۔ اور ان میں کوئی اس طرح کا ہے کہ اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک ان کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دیتے ہی نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے بھی ہیں“۔

ہندوؤں نے اپنے معاشرتی نظام کو ذات پات پر استوار کیا ہے۔ ان کے ہاں چار طبقے ہیں۔ برہمن، ویش، کھشتری اور شودر۔ ان میں سے ہر ایک نسلی طور پر متعین ہے اور اس کی حیثیت اس کی پیدائش سے ہی طے پا جاتی ہے۔ کوئی شخص ایک ذات سے دوسری ذات میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ شودر جو نچلے درجے کا انسان ہے ہمیشہ اس طرح رہے

---

(۱) آل عمران/۷۵

گا۔ ہندوؤں نے اس نسلی تقسیم کو مذہبی تقدس عطا کیا ہے اس لیے اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ شودر ہمیشہ اچھوت رہے گا وہ کبھی قابل عزت نہیں ہو سکتا۔

عربوں کے ہاں نسلی تفاخر موجود تھا۔ وہ بھی یہودیوں کی طرح اپنے سوا تمام انسانوں کو کم تر گردانتے تھے۔ اپنے آپ کو عرب اور دوسروں کو عجم کہتے جس کے معنی گونگے اور بے زبان کے ہیں۔ اقبال نے ابوجہل کی روح کا نوحہ بیان کرتے ہوئے عرب فضیلت کے ضائع ہونے کا ذکر کیا ہے۔

سینۂ ما از محمد ؐ داغ داغ — از دم او کعبہ را گل شد چراغ
مذہب او قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضل عرب
قدر احرار عرب نشناختہ — با کلفتان حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند
اعجمی را اصل عدنانی کجا است۔ — گنگ را گفتار سحبانی کجا است، (۲)

عربوں کے ہاں نسلی تفاخر کی بنیاد پر جو امتیازات تھے اس کا شکار وہ تمام لوگ تھے جو عرب نہ تھے۔ ان امتیازات کا ایک پہلو خود عرب قبائل کی درجہ بندی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے تفاخر کی بنیاد پر دوسروں کو ہیچ سمجھتا تھا۔ غرض عرب معاشرہ ایک نسل پرست معاشرہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنی دعوت میں اس نسلی امتیاز کی اصلاح کے لیے جرأت مندانہ اقدام کیا۔ آپؐ نے قریش مکہ کو، جو اپنے آپ کو سب سے افضل گردانتے تھے، خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ إِنَّ اللهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعَظُّمَهَا بِالْآبَاءِ. النَّاسُ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ. (۳)

اے گروہ قریش! اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء و اجداد پر فخر کرنے کو ختم کر دیا۔ لوگ آدمؑ سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر معاشرے کو ناپسندیدہ نسلی گروہ سے پاک رکھنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ یہ کوششیں ظالمانہ قوانین و اقدامات پر مبنی ہوتی ہیں ان میں غلامی، قتل، ملک بدری اور معاشرتی تباہی شامل ہوتی ہے۔ مختلف نسلی گروہ اس نفرت اور ظلم کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی تفصیلات بائبل اور قرآن میں موجود ہیں۔ قرآن میں ہے۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُونَ

---

(۲) جاوید نامہ/ ۵۸۔۵۹۔

(۳) ابن ہشام ۴/۵۴۔

نِسَآءَكُمْ وَ فِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۴)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی۔انہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

تاریخ کے اوراق ایسی کئی کاروائیوں کی شہادت دیتے ہیں جن میں انسانوں کی ایک نسل نے دوسری نسل کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا۔نسل پرستی کا مطلب کسی گروہ کا نسل کی بنیاد پر اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھنا ہے۔ انسانی معاشروں میں یہ رویے ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور اس کی بنیاد پر ظلم و جبر بھی ہوتا رہا ہے۔

جاہلیت قدیمہ میں مختلف قبائل و اقوام میں نسلی امتیازات کے سلسلے میں جو خرابیاں تھیں وہ جاہلیت جدیدہ میں ایک نظریہ، فلسفہ اور طرز حیات بن گئیں۔ یہ سہرا مغربی اقوام کے سر ہے کہ انہوں نے سفید فام اقوام کی برتری کو ایک نظریاتی اصول کے طور پر متعارف کرایا۔سفید اقوام کے نسل پرستانہ رویہ کے مظاہر کو پوری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے۔جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت نے نسل پرستی کو ریاستی سطح پر منظم کیا۔افریقی اور ایشائی باشندے اس امتیاز کا نشانہ تھے۔عالمی سامراج نے اس نسل پرستانہ پالیسی کو کسی نہ کسی شکل میں زندہ رکھا ہے۔مغرب نے نیشنلزم کا جو تصور متعارف کرایا، اس نے انسانیت کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔والٹر لیک (Walter Laque) نے نیشنلزم کی کمزوریوں کو بیان کرتے ہوئے کہا:

Nationalism is distinguished by the over estimation or one's own nation and the denigration or others, the lack of the spirit of self criticism and responsibility, an ambivalent appraisal of the destiny of one's nation based on the feeling of infenionity, and a general tendency to attribute any thing wrong with one's nation to the evil doing of others, who should consequently be fought.(5)

والٹر لیک جس نیشنلزم کی بات کرتا ہے اس کی تہہ میں سفید اقوام کی برتری کا احساس موجود ہے اور جو غیر سفید اقوام کے لیے نفرت اور تحقیر کی جذبات کا حامل ہے۔یہ اقوام بعض سیاسی چال بازی اور ڈپلومیسی کے ذریعہ ان جذبات کے اظہار میں محتاط ہوتی ہیں لیکن ان کی دور رس پالیسیوں کی بنیاد یہی احساس برتری ہے۔اس احساس کا اظہار ہمیں اس اعلان میں ملتا ہے جو ملکہ الزبتھ اول نے 1610 میں جاری کیا تھا۔

Negroes and black moors(6) should be deported from England and

(۴) البقرہ/۴۹۔

(۵) Communism and Nationalism in the Middle East/18.

(۶) غالباً اس سے مراد مسلمان ہیں کیونکہ سپین میں مسلمانوں کو Moor کہا جاتا تھا۔

because they were infidels, and they were contributing to economic and social problems such as poverty and famine.(۷)

مشہور مورخ فلپ ڈی کرٹن (Philip D.Curtin) لکھتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں تقریباً 9.5 ملین افریقی بحراطلس کی دوسری طرف منتقل کیے گئے تھے۔ جن کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ غلاموں کی حیثیت سے شمالی اور جنوبی امریکہ کریبین (Caribean) میں زندگی بسر کریں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے 1884 ایڈیشن میں سیاہ فام افراد کے بارے میں کچھ اس طرح اظہار کیا گیا:

The African negro occupied the lowest position in the evolutionary scale and this was supposedly demonstrated by abnormally long arms and a light weight brain.

کارل مارکس (Carl Marx) کے دوست اور دوست راست اینگلز (Frednick Engels) نے آئرش لوگوں کے بارے میں اسی طرح کے تحقیر آمیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ 1844 میں لکھتا ہے:

The southern facile character of the Irishman, his crudity, which places him but litle above the savage, his contempt for all human enjoyment, in which his very crudeness makes him incapable of sharing, his filth and poverty, all favour drunkenness.(8)

ہٹلر کے نازی جرمنی میں آریہ نسل کی برتری کا شعور ریاست کی پالیسی تھا اور یہودیوں کے بارے میں ہلاکت خیز رویہ اختیار کیا گیا۔ ہٹلر کی رائے میں سلاو (Slav) اور یہودی (Jews) آریہ نسل کو خراب کر رہے ہیں کیونکہ وہ کم تر درجہ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی جو فرعون کے عہد میں اور پھر بخت نصر اور رومیوں کے ہاتھوں تذلیل کا شکار ہوئے اور آخر میں ہٹلر کی امتیازی پالیسی کی وجہ سے تباہی کا سامنا کرتے رہے اب ایک ظالم نسل پرست حکومت کے طور پر فلسطینیوں کی نسل کشی میں وہی طریقے اختیار کر رہے ہیں جو کبھی ان پر آزمائے گئے۔

ابھی چند برس پہلے 1990 میں یوگوسلاویہ کی شکست وریخت کے وقت سربوں نے بوسنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ نسل پرستی کے ظالمانہ رویوں کی بدترین مثال ہے۔ نسلی تطہیر (Ethnic Cleansing) کے جو واقعات گرازدے (Gorazde) سربیکا (Srebrenica) اور سرائیو و (sarajevo) میں ہوئے ہیں ان سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ کشمیر میں جو کچھ ہندوستانی فوج کر رہی ہے وہ انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ ہے۔ کشمیریوں کی

---

(۷) The image of Africa, Macmillon,London, 1965.

(۸) The condition of the Working class in England in 1844, progressiver publishers, Moscow, 1973.

نسل کشی کی منظم مہم نام نہاد مہذب دنیا کے سامنے ہو رہی ہے اور کوئی بین الاقوامی ادارہ ان کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا پورا ڈھانچہ نسل پرستی پر مبنی ہے اگر کسی معاملے کا تعلق سفید نسل سے ہے تو انصاف، انسانی حقوق، جمہوریت اور انسانیت کے سارے اصول منطبق ہوں گے لیکن اگر اس کا تعلق کسی اور نسل سے ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نے نسلی امتیاز (Racial Segragation) کی پالیسی' جسے Apartheid کہا جاتا ہے' ایک مدت تک جاری رکھی۔ اور اب بظاہر افریقیوں کے اقتدار کے باوجود سفید فام اقلیت نے اپنی مراعات اور امتیازات کو برقرار رکھا ہے۔ امریکہ میں سیاہ فام غلاموں کے ساتھ جو رویہ روا رکھا گیا وہ امریکی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ اس وقت بھی سیاہ فام نوجوانوں کی بڑی تعداد جیلوں کی زینت ہے اور زندگی کی سہولتوں میں ان کا حصہ کم تر ہے۔ 11 ستمبر کے بعد مسلمانوں کو جس تشدد کا سامنا ہے اس نے امریکی نسل پرستانہ رجحانات کو مزید بے نقاب کر دیا ہے۔ برطانیہ اور جرمنی میں نسل پرستانہ جذبات کا اظہار سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کر گیا ہے اور دائیں بازو کے انتہا پسند کھلم کھلا تارکین وطن آبادی کے خلاف نعرہ بازی کرتے ہیں۔ آزادی اظہار کے مسلک کے باعث انہیں کھلی چھٹی ہے۔ بعض مقامات پر تشدد کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔

نسل کے بارے میں جدید عمرانی نظریات

نسل کے بارے میں عام طور پر حیاتیاتی کے حوالے سے بحثیں کی گئی ہیں۔ ان میں دو پہلو نمایاں رہے ہیں ایک جسمانی ساخت وخصوصیات (Phenotype) اور دوسرے جینیاتی خصوصیات (Genotype)۔ انسانی گروہوں کے درمیان جینیاتی خصائص اور جسمانی خصائص کی بنیاد پر تفریق کی گئی۔ مائیکل بینٹن (Micheal Banton) نے نسل کے تین نظریات کو متعین کیا ہے۔ (۹)

(i) نسل ایک نسبی حقیقت Those who see race as lineage

(ii) نسل ایک قسم Those who see as a type

(iii) نسل ایک زیر نوعی حقیقت Those who see as a subspecies

نسل ایک نسبی حقیقت

انگریزی زبان میں نسل کے لیے Race کا لفظ بولا جاتا ہے بینٹن کا خیال ہے کہ 1508 تک یہ لفظ انگریزی زبان میں نہیں استعمال ہوتا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے سکاٹ شاعر ولیم ڈنبار (Williom Dunber) نے اپنی نظم میں

(۹) Racial Theories, Cambridge Universiy Press Cambridge 1987-9.

1508ء میں استعمال کیا۔ چونکہ بائبل کو مسیحی دنیا میں سند مانا جاتا تھا اسی لیے اس کے مطابق انسانوں کی ایک ہی نسل ہے جو آدم وحوا کی پیداوار ہے۔ بائبل کے مطابق طوفان نوح اور ستون بابل کے گرنے سے نسل انسانی بکھر گئی اور مختلف خطوں میں رہنے کی وجہ سے جغرافیائی اثرات کے تحت مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالی نے بعض گروہوں کو مختلف بنایا تاکہ وہ زمین کے مختلف حصوں میں زندگی گذار سکیں۔ نسل ایک نسبی حقیقت کے طور پر اس نظریہ کو پیش کرتی ہے کہ تمام انسان بنیادی طور پر برابر ہیں تاہم مختلف خطوں میں بکھر جانے کی وجہ سے واضح نسبی اختلاف پیدا ہوا تو شکلوں جسمانی ساختوں اور رنگوں کے اختلاف پر منتج ہوا۔ مختلف جغرافیائی خطوں میں منتشر ہونے کی وجہ سے مختلف نظر آنے لگے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے برطانوی اور امریکن مصنفین نے انسانوں کے بارے میں لکھتے ہوئے مشکل ہی سے کہیں Race کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سیاہ فام افریقیوں کی غلامی اور ان سے توہین آمیز سلوک کے باوجود انہیں غیر انسان سمجھنے کی کوئی بات واضح طور پر سامنے نہیں آئی۔ تاہم اٹھارھویں صدی میں اس طرح کے خیالات شروع ہوگئے کہ انسانوں کی مختلف نسلوں میں تفاوت ہے اور بعض نسلیں دوسروں سے برتر ہیں۔ مشہور برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم (David Hume) نے 1748ء میں کہا:

Negroes were the only race which had never developed a major civilization and this indicated that they were naturally inferior to the whites"

انیسویں صدی میں نسل کے بارے میں متنوع خیالات کا سلسلہ زیادہ نمایاں ہونے لگا اور مختلف گروہوں میں صف بندی کے نظریات زیادہ مقبول ہونے لگے۔

نسل ایک قسم

اس نظریہ کا انحصار اس تصور پر ہے کہ تمام انسانوں کی بنیاد ایک نہیں ہے اور انسانیت کئی گروہوں میں تقسیم ہے۔ اس نظریہ کو کثیر النسلی (Polygenetic Theory) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی کئی بنیادیں ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت سے نہیں بلکہ مختلف نسلیں مختلف ماں باپ سے شروع ہوئیں۔ بینٹن کہتا ہے کہ نسلی اختلاف قبل از تاریخ زمانے سے موجود ہے۔ یا تو خدا نے ایسا بنایا اور یا کسی حادثہ کے نتیجے میں یہ اختلاف شروع ہوا۔ نسل کی مختلف اقسام کا یہ نظریہ اس وقت مقبول ہوا جب مغربی اقوام کا دوسری قوموں سے رابطہ بڑھا۔

بینٹن کہتا ہے:

As the evidence about the diversity of human forms accumulated, more and more writers tended to refer to various kinds of type and indeed the construction of typologies of various kinds became a characteristic of

nineteenth century scholorship.(10)

نسل کے بارے میں یہ تصور کئی ملکوں میں زیر بحث رہا لیکن امریکہ میں اس پر سب سے زیادہ توجہ ہوئی۔ فلاڈلفیا کے ڈاکٹر سیموئل جیمز مارٹن (Samuel James Marton) نے انسانی کھوپڑیوں کی پیمائش سے پانچ نسلوں کا تعین کیا:

(i) کاکیشین (Caucasian) یورپ، ہندوستان، شمالی افریقہ کے کچھ حصے اور مشرق وسطیٰ کے لوگ۔

(ii) منگولین لوگ۔(Mongolian) چینی اور اسکیمولوگ

(iii) ملائی (Malay) ملائشیا اور پولینیزین جزائر (Malaysia and polynesian Island)

(iv) امریکی (American) جنوبی اور شمالی امریکہ کے مقامی باشندے

(v) ایتھوپیا (Etheopia) زیریں صحارا افریقہ

مارٹن کے اس نظریہ کو جے سی ناٹ اور جی آر گلڈن (J.C Nott and G.R. Gilddon) نے آگے بڑھایا۔(11) گلڈن کا خیال تھا کہ انسانوں کے مختلف گروہ موجود ہیں جو تقریباً مستقل امتیازات کے حامل ہیں۔ اقسام کے اس اختلاف نے مختلف گروہوں کے مختلف رویوں کو جنم دیا ہے۔ ان مصنفین کا خیال کہ بائبل سے پہلے قدیم مصریوں نے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ مختلف نسلیں نیل کے ساحلی علاقوں میں 3500 ق م میں موجود تھیں۔ اور ان میں سیاہ فام اور سفید فام کبھی مخلوط نہیں ہو سکی تھیں۔ ناٹ اور گلڈن سفید فام نسل کی برتری پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ کاکیسیز جو کوہ قاف (Caucasus mountains) سے نکلے ہیں تمام ادوار میں حکمران رہے ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ جمہوریت کو فروغ دینے کے قابل ہیں جبکہ گہری رنگت کے لوگ صرف فوجی حکومتوں کے اہل ہوتے ہیں۔ ناٹ اور گلڈن دوسرے کئی مصنفین کی طرح یہ یقین رکھتے تھے کہ مختلف نسلیں حیاتیاتی طور پر مختلف ہیں اور ان کے رویوں میں اختلاف اسی حیاتیاتی فرق پر مبنی ہے۔

بینٹن کا خیال ہے کہ ان مصنفین کی رائے نازی جرمنی کے نظریہ سے مماثلت رکھتی ہے۔ آریہ نسل کی برتری اور خالص نسل کو برقرار رکھنے کا نازی نظریہ مختلف مغربی مصنفین کی آراء پر مستحکم ہوا تھا بالخصوص فرانسیسی مصنف آرتھر ڈی گوبینو (Arthur de Gobineau) جس نے 1850ء کی دہائی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ آریہ نسل برتر ہے اور جو مشرق سے ہجرت کر کے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔ اسی نسل کے لوگوں نے دنیا میں مختلف تہذیبوں کو قائم کیا۔

---

(10) Racial Theories, Cambridge Press 1987.

(11) Types of mankind, Philadalphia, 1854.

نسل ایک زیرنوعی حیثیت

نسل کا یہ نظریہ دراصل پہلے دونوں نظریات کے امتزاج پر مبنی ہے اور اس کے اشارے چارلس ڈارون (Charls Darwin) کے نظریہ ارتقاء میں ملتے ہیں۔ بینٹن کے بقول ڈارون نے انواع کو ایک گروہ کی حیثیت سے دیکھا جس کے ارکان مشترک خصوصیات کو ورثے میں حاصل کرتے ہیں لیکن مختلف امتزاجات کی صورت میں جو ہر وقت تغیر پذیری کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ چونکہ انواع کا مسلسل ارتقاء ہو رہا ہے اس لیے مختلف شاخوں، زیریں گروہوں اور انواع میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی گروہ الگ ہو جائے تو اس کے ارکان باہمی تعلق کی بنا پر اپنی مستقل خصوصیات کو نشوونما دے لیتے ہیں۔ ڈارون نے گلیپوگوز جزیرہ (Glapogos Island) کے بعض پرندوں اور کچھوؤں کو اصل زمین کے پرندوں اور کچھوؤں سے ذرا مختلف پایا۔ ڈارون کے نزدیک یہ ارتقاء قدرتی انتخاب (Natural Selection) کے نتیجے میں قائم ہوا۔ اور کسی نوع کے الگ ہونے والے ارکان اپنی جینیاتی خصوصیات تشکیل دیتے ہیں۔ ڈارون کے مطابق انواع جنسی انتخاب (Sexual Selection) بھی کرتی ہیں۔ مثلاً مادہ اپنے پسندیدہ نر کو منتخب کرتی ہے اور یوں اس نوع میں اچھی خصوصیت والے فرد پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف انسانی نسلیں اس اصول پر کام کرتی ہیں جس میں فطری انتخاب جنسی انتخاب اور اتفاقات کا تنوع کام کرتا ہے۔ اور انسانی گروہ مختلف جسمانی خصوصیات نشوونما کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اگرچہ تمام انسان ایک ہی بنیاد رکھتے ہیں تاہم وہ مختلف نسلوں میں نشوونما پا سکتے ہیں۔

زیرنوعی حیثیت اور معاشرتی ارتقاء

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں زیرنوعی نسلی نظریہ بہت مقبول تھا۔ یہی وہ دور تھا جب مختلف ارتقائی نظریات پروان چڑھ رہے تھے ڈارون حیاتیاتی ارتقاء کے نظریہ پر کام کر رہا تھا اور انگریز عملیت پسند عمرانی عالم (Functionalist Sociologist) ہربرٹ سپنسر (Herber Spencer) معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو پروان چڑھا رہا تھا۔ سپنسر نے نسل اور معاشرتی ارتقاء کے تعلق پر موثر نظریات پیش کیے ہیں۔ سپنسر کا خیال ہے کہ نسلوں کا اختلاط انسانیت کے لیے مفید ہے۔ مختلف تاریخی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ فاتحین جب آخر کار مفتوحین کے ساتھ معاشرتی سطح پر ملتے ہیں تو اس اختلاط سے نسلوں کی مختلف خصوصیات باہم ملتی ہیں اور اس سے بہترین خصوصیات والی نسلیں جنم لیتی ہیں۔ سپنسر یہودیوں کی مثال دیتا ہے۔

"Not withstanding their boasted unity of blood, resulted from a mixing of many semitic varieties in the country east of the Nile and who, both in their wanderings and after the conquest of Palestine, went on amalgamating

kindred tribes"(12)

اس کا خیال یہ ہے کہ رومیوں نے دوسرے آریائی قبائل، سبینی، سبیلی اور سیمنایٹ (Sabini,Sabelli, and Samnites) سے مخلوط ہو کر قوت حاصل کی۔ اسی طرح انگلستان نے بھی قریبی طور پر متعلق گروہوں کے ساتھ باہمی شادیوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ آریائی اور سکنڈی نیویا قبائل سے اختلاط واضح ہے۔ تاہم وہ سمجھتا ہے کہ ایسے معاشروں کا اختلاط جو قریبی طور پر نسلی تعلق نہ رکھتے ہوں مفید ثابت نہیں ہوتا' وہ لکھتا ہے۔

If instead of different species, remote varieties are united, the intermediate organism is not infertile, but many facts suggest the conclusion that infertility results in subsequent generations: the incongrous workings of the united structures, through longer inshowing itself,came out ultimately.(13)

سپنسر کا خیال ہے کہ مختلف زیر نوعی نسلی اختلاط جو حیاتیاتی طور پر متوازن نہیں ہے مختلف نوعیت کے نتائج پیدا کر سکتا ہے اور جو اکثر اوقات غیر متوازن نسلیں پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ میکسیکو اور دوسری جنوبی امریکن ریاستیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔

سپین میں باسق۔ کیلٹک، گوتھک، مسلمانوں اور یہودی (Basques, Celtic, Gothic, Moorish and Jewish) گروہوں سے غیر موافق غیر متجانس اختلاط ہوا۔ جس کا نتیجہ مسلسل اختلاف ہے۔ ایسے معاشرے مضبوط مرکزی حکومت کے متقاضی ہوتے ہیں تاکہ مختلف نسلی گروہوں میں اختلاف و تصادم کو روکا جا سکے۔ سپنسر کا خیال ہے کہ حکومت کی زیادہ مداخلت معاشرتی ارتقاء میں رکاوٹ کا باعث ہوتی ہے معاشرتی مطالعہ کے بعد سپنسر اس نتیجہ پر پہنچا کہ معاشرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(i) سادہ معاشرے: جن میں صرف ایک نسل موجود ہوتی ہے۔

(ii) پیچیدہ معاشرے: جن میں مختلف نسلیں موجود ہوتی ہیں۔

اس بنیاد پر اس نے ایک تجزیہ مرتب کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کی نوعیت کیا ہے؟ متوازن ہے یا غیر متوازن اور تہذیبی طور پر اس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ معاشرے کی تین اقسام بیان کرتا ہے۔

(i) سادہ معاشرہ: ایک وحدت جسے مختلف حصوں، گروہوں اور قبائل میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

(ii) مخلوط و مرکب معاشرہ: ایسا معاشرہ جو مختلف گروہوں پر مشتمل ہو اور ہر گروہ کا اپنا سردار ہو اور ان کے اوپر ایک بڑا سردار ہو۔

---

(۱۲) Spencer, Herbert, Structure,Function and Evolution, Nelson, London 1971

(۱۳) Ibid

(iii) دوہرا مخلوط معاشرہ: جہاں زیادہ پیچیدہ مرکب موجود ہو۔ مختلف گروہ قبائل اور جمعیتیں ایک مرکزی حکومت کے تحت موجود ہوں۔

سپنسر کے مطابق جتنا کوئی معاشرہ پیچیدہ اور مرکب ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اتنا ہی مہذب ہوتا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں اعلیٰ نسلیں زیادہ مستحکم معاشرے قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ مختلف معاشروں کے ارتقاء میں نسل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کمزور قبائل مغلوب ہوجاتے ہیں اور مضبوط نسل کے لوگ فاتح ہوتے ہیں۔ کمزور قبائل ہمیشہ شکست وریخت کا شکار رہتے ہیں اور کبھی غلبہ پانے کی حیثیت میں نہیں آتے۔ اعلیٰ نسلوں کے لوگوں میں پیچیدہ مرکب معاشرے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ مستحکم اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرے وہ ہوں گے جو تہرے مخلوط (Triply combind) ہونگے۔ سپنسر نے مثال کے طور پر قدیم میکسیکو، اسیری، مصری، رومی، برطانوی فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور روسی سلطنتوں کو پیش کیا ہے۔

سپنسر نے معاشرتی زندگی کے ارتقاء میں بقاء اصلح (Servival of the fittest) کا اصول پیش کیا۔ (۱۴) مضبوط نسلیں اپنے ماحول کا مقابلہ اور سازگاری کے طریقوں سے باقی رہتی اور ترقی کرتی چلی جاتی ہیں جب کہ کمزور نسلیں فنا ہوجاتی ہیں۔ کرسٹوفر بولٹ (Christopher Bolt) کا خیال ہے کہ انیسویں صدی میں کئی مصنفین نے اسی اصول کے تحت نیوزی لینڈ اور امریکہ کی زوال پذیر قوموں کا مطالعہ کیا ہے۔ تاہم بولٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دلچسپ بات کہتا ہے:

With a large degree of wishful thinking, some victorians maintanined that if the survival of the fittest principle operated as it should, the Negro population of North America and the West Indies might soon follow these tribes towards extinction ".(15)

یہ بھی واضح ہے کہ انیسویں صدی کے معاشرتی اور حیاتیاتی سائنسدانوں نے اپنے نظریات کو بہتر طور پر پیش کیا تاہم ان کی بحث کا مرکز زیر نوعی نسلی نظریہ تھا۔ اور مجموعی اپروچ جسمانی ساخت وخصوصیات پر مبنی (Phenotypal) تھی اس لیے ان کا تجزیہ انسانی نسلوں کے جسمانی اختلافات پر مبنی تھا۔ جینیاتی اختلافات تک ان کی علمی رسائی نہ تھی اس لیے وہ اس پہلو پر توجہ نہ دے سکے۔

---

(۱۴) عام طور پر اسے ڈارون کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ بنیادی طور اسے سپنسر (Spencer) نے معاشرتی ارتقاء کے سلسلے میں پیش کیا جسے ڈارون نے مستعار لے کر حیاتیاتی دائرے میں استعمال کیا۔

(۱۵) Christopher Bolt, Victorian attitude to race, Routledge and Kegon Paul.London,1971.

جینیاتی نظریہ

دوسری جنگ عظیم کے بعد جینیاتی میدان میں پیش رفت ہوئی تو نسل کے جینیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ مشہور ماہر جینیات سیٹو جون (Steve Jone) نے نسلی نظریات جینیاتی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔(۱۶) ہر انسان پچاس ہزار جینز پر مشتمل ہے اور ان میں کچھ افراد میں اختلافات کا باعث ہوتے ہیں۔ تقریباً دس جین ایسے ہیں جو کھال کا رنگ متعین کرتے ہیں ماحول اور جغرافیائی حالات کے اثرات سے رنگوں کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ جون (Jone) کے مطابق ان اثرات نے مختلف قوموں میں رنگوں کا فرق پیدا کیا ہے۔ جینیاتی تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ افریقی انسانی نسل کی ایسی شاخ ہے جو پہلے الگ ہوگئی تھی۔ باقی تمام نسلیں ایک دوسرے سے قریبی طور پر متعلق ہیں۔ جون کی رائے ہے کہ اگرچہ جینیاتی اختلافات کی بات کی جاتی ہے تاہم مختلف نسلوں کے درمیان جینیاتی اختلاف کی تائید میں کوئی دلیل نہیں۔ وہ اپنی رائے کے حق میں تین دلائل دیتا ہے۔

(i) جون کہتا ہے کہ کھال کے رنگ سے متعلق جینز کے علاوہ ہمیں مختلف نسلوں کے درمیان جین کا اختلاف نظر نہیں آتا۔ مختلف افراد میں فرق ہوسکتا ہے لیکن قوموں کے درمیان بحیثیت مجموعی فرق ثابت نہیں ہوتا ہماری کھال کا رنگ یہ نہیں بتاتا کہ اسکے تحت کیا موجود ہے۔

(ii) جینیاتی تنوع ہمیں نسلوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں دیتا۔ 85 فیصد تنوع ایک ہی ملک کے مختلف افراد میں پایا جاتا ہے۔ 10.5 فیصد فرق ایک ہی براعظم کے مختلف ملکوں میں پایا جاتا ہے مثلاً انگریزوں اور ہسپانویوں کے درمیان یا کینیائی اور نائیجیریوں کے درمیان۔ جون کہتا ہے۔

The overall genetic difference between-races Africans and Europeans say---is no greater than that between different countries within Europe or within Africa. Individuals ---not nations and not races are the main repository of human variation.(17)

(iii) مجموعی طور پر انسان دوسری انواع کی بہ نسبت باہمی طور پر زیادہ یکساں اور متجانس ہے۔ چونکہ اس کا اختصاص snail کی نوعی تحقیق سے ہے اور اس میں علاقائی تنوع پایا جاتا ہے اس لیے وہ کہتا ہے۔

If you are a snail it would make good biological sense to be a racist. But you have to accept that humans are tediously uniform animals.(18)

---

(۱۶) Jones S. Says: "we are all cousins under the skin" the independent, 12 December 1991

(۱۷) Ibid

(۱۸) Ibid

سیٹو جون کا خیال ہے کہ نسل کے بارے میں ہمارے بہت سے رویوں کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے وہ کہتا ہے۔

Humanity can be divided into groups in many ways by culture,by language and by race .which usually means by skin colour--each division depends to some extent on prejudice and because they do not overlap, can add to confusion.(19)

یہی وجہ ہے کہ نسل (Race) کے لیے کوئی متفقہ تعریف سامنے نہیں آئی بالخصوص معاشرتی تعریف میں کوئی اتفاق نہیں پایا جاتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نسلی تصور ایک خیالی آرائش ہے۔ جینیاتی تحقیق یہ اشارہ دیتی ہے کہ نسل کا یہ تصور کہ یہ آریائی نسل ہے اور یہ کاکیسز ہے جس کی ابتدا کاکیسا کے پہاڑوں سے ہوئی، کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جون کا خیال ہے کہ نسل کا تصور انسانی گروہوں کی جماعت بندی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تصور جماعت بندی سے ایک قدم آگے حکم لگانے کی بات ہے۔ اس کے خیال میں یہ تصور کہ متمیز خالص نسل ہے جو اپنی خصوصیات میں دوسروں سے مختلف ہے، تباہ کن اثرات کا حامل ہے۔ ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اسی موہوم تصور پر مبنی تھا اور 1923ء میں امریکہ کے صدر کالون کولج (Calvin Coolidge) نے تارکین وطن کے لیے جو قانون پاس کیا تھا وہ بھی نسل پرستانہ رویہ کی وجہ سے تھا۔ اس قانون کے مطابق صرف مغربی اور شمالی یورپ کے تارکین وطن امریکہ میں داخل ہو سکتے تھے۔ یہ قانون اس پالیسی پر مبنی تھا کہ دوسری نسلوں سے اختلاط اور شادی بیاہ کی وجہ سے ناردی (nordic) نسل میں کمتری پیدا ہوگی۔ جون کہتا ہے

Much of the story of the genetics of race -a field promoted by some eminent scientists-turn out to have been prejudice dressed up as a science.(20)

جون کے خیال میں نسل پرستی سائنس کی بجائے ایک اخلاقی مسئلہ ہے اور جدید سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ نسل پرستی کے لیے کوئی حیاتیاتی بنیاد نہیں ہے۔ انسانوں میں جینیاتی اقسام کا تنوع ہے جو جسمانی خصوصیات کو متاثر کرتا ہے۔ لیکن یہ تنوع اتنا اہم نہیں کہ اس سے نسلی اختلافات کا تعین ہو سکے۔ اور اس تنوع کا مختلف گروہوں کے کلچر، رویہ اور اخلاق سے بھی کوئی تعلق نہیں کہ اس کی بنیاد پر امتیاز کیا جا سکے۔

نسل کی معاشرتی حیثیت

اگرچہ اکثر ماہرین عمرانیات نسل کی حیاتیاتی بنیادوں کا انکار کرتے ہیں تاہم اس تصور کی موجودگی کے باعث معاشرتی مطالعہ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ نسل کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس لیے علم المعاشرت

(۱۹) His Words are: it is a tinystep from classifying people to judging them. Ibid

(۲۰) Ibid

کے طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا اور جائزہ لینا چاہیے۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے نسل کا جائزہ لینے والوں میں جان رچرڈسن اور جان لیمبرٹ (John Richardson and John Lambert) توجہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نسل کی عمرانیات (Sociology of Race) کے سلسلے میں بحث کی ہے (۲۱)۔ بالخصوص انہوں نے نسلی برتری کے تصور کا جائزہ لیا ہے۔ سٹیو جون کی طرح یہ بھی نسل کی حیاتیاتی بنیادوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس تصور پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ کچھ نسلیں برتر ہوسکتی ہیں۔ نسلی برتری کے نظریہ پر انہوں نے تین نکاتی گفتگو کی ہے۔

(i) حیاتیاتی اختلاف اور ثقافتی رویہ

ان کا خیال ہے کہ حیاتیاتی اختلافات کا مختلف انسانی گروہوں کے کلچر اور رویوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حیاتیات کا معاشرتی اور ثقافتی رویے پر کچھ اثر ہوتا ہے لیکن یہ تعلق بہت دور کا اور بالواسطہ ہوتا ہے۔

(ii) ثقافت اور رویے کے معاشرتی اسباب

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی گروہوں کے رویوں اور ثقافتوں کے اختلاف کی وجوہ حیاتیاتی سے زیادہ معاشرتی ہوسکتی ہیں۔ حیوانوں کی نسبت انسانی رویوں کی تشکیل میں حیاتیات کا اثر کہیں کم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان حیوانوں کی طرح جبلتوں یا داخلی دواعی کا پابند نہیں بلکہ انسانی بقا و ارتقاء کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اگر ثقافتی لچک موجود ہوتی ہے۔ ایک ہی نسل مختلف حالات میں مختلف کلچر پیدا کرسکتی ہے۔ مثلاً افریکانا گروہ نے جنوبی افریقہ میں جو کلچر پیدا کیا وہ اس سے مختلف ہے جس میں اسی نسل کے لوگ نیدرلینڈ میں رہ رہے ہیں۔

نسلی برتری کا معروضی پیمانہ

یہ تقریباً ناممکن ہے کہ کوئی ایسا معروضی پیمانہ تلاش کیا جائے جس سے کسی نسل کی برتری یا کمتری کا تعین ہوسکے۔ وکٹوریہ عہد کے برطانوی یقین رکھتے تھے کہ ان کے شہری اور صنعتی معاشرے دوسری قوموں سے برتر ہیں رچرڈسن اور لیمبرٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

Claims of progress appears less convincing when we consider the subsequent problems of industrial pollution, personal allianation and the possibility of clear warfare. The African pigmy or Mongolian herdman is arguably in a more harmonious relationship with his physical environment than is the urban inhabitant of London or New York.(22)

---

(۲۱) The Sociology of Race, Causway Press, Ormskirk, 1985.

(۲۲) Ibid

حقیقت یہ ہے کہ اگر ثقافتی کامرانی اور تکنیکی ترقی برتری اور کمتری کے پیمانے ہیں تو یہ کسی ایک نسل کی خصوصیت نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مختلف نسلوں نے مختلف اوقات میں بڑی ترقیاں کی ہیں۔ افریقہ میں کئی تہذیبیں پروان چڑھیں جیسے اشانتی اور زمبابوے (Ashanti and Zimbabway) رچرڈسن اور لیمبرٹ گولڈ تھروپ (Gold Thrope) کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ سولھویں صدی میں چین، ہندوستان اور عرب میں متمدن لوگ تھے (۲۳)

اکثر ماہرین عمرانیات کے نزدیک نسل ایک معاشرتی تشکیل ہے اور اس کا حیاتیات سے کوئی تعلق نہیں۔ نسل کے متعلق رویوں کا تعلق مختلف معاشروں کے نظام عقائد (belief system) سے ہے۔ مختلف گروہوں کے متعلق انسانی رویوں کی تشکیل میں تاریخی عوامل، ثقافتی رجحانات اور مذہبی عقائد کا اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ طرز عمل ہے جو بعض اوقات نسلی امتیاز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک معاشرتی اور ثقافتی تشکیل قرار دینا کہیں زیادہ واضح ہے بہ نسبت ایک سائنٹیفک حیاتیاتی اصول کے۔ مغربی اقوام نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت اپنی قوموں کو احساس برتری کا شعور دیا اور مغلوب قوموں کی تذلیل کی تاکہ وہ اطاعت اور سپردگی کے لیے تیار رہیں۔

مغربی پالیسی سازوں نے نسل پرستانہ رویوں کو چھپاتے ہوئے نسل کے لیے Race کی بجائے نئی اصطلاح استعمال کی اور وہ ہے Ethnicity۔ تھامس ہائی لینڈ ارکسن (Thomas Hylland Eriksen) کہتا ہے کہ Ethnicity یونانی لفظ Ethnos سے مشتق ہے جو خود ایک اور یونانی لفظ Ethnikos سے نکلا ہے جس کے معنی لامذہب یا کافر (Pagan or heathen) ہے۔ انیسویں صدی کے نصف تک Ethnic انہی معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ Race کی جگہ استعمال ہونے لگا اور اب انتھروپولوجی اور سوشیالوجی میں اس گروپ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ثقافتی طور پر متمیز ہے نہ کہ جسمانی طور پر۔ (۲۴)

جان ملٹن ینگر (John Millton Yinger) کا خیال ہے کہ جسمانی اور معاشرتی طور پر مختلف نسلی گروہوں کی تقسیم موجود ہے لیکن جسمانی طور پر مختلف نسلوں کا نظریہ قدرے پیچھے چلا گیا ہے کیونکہ جسمانی تفاوت کی سرحدیں متمیز نہیں رہیں جبکہ معاشرتی اختلافات واضح نظر آتے ہیں۔ معاشرتی طور پر متعین گروہ Ethnic groups ہیں (۲۵) جو حیاتیاتی طور پر بھی مختلف نظر آتے ہیں۔ معاشرتی طور پر مختلف گروہ جنہیں وہ "Ethnic کا نام دیتا ہے منفرد طور پر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

A segment of a large society is seen by others to be different in some

---

(۲۳) Ibid

(۲۴) Ethnicity and Nationalism, Pluto Press London, 1993

(۲۵) J.M Yinger, Towards a theory of assimilation and disassimilation Ethnic and Racial Studies (1981)

combination of the following characteristics language, religion,race and ancestrol home land with its related culture, the members also perceive themselves in that way, and they participate in shared activities built around (real or mythical)common origin or common culture.(26)

ینگر کی اس تعریف پر وہ تمام گروہ Ethnic کہلائیں گے جو ان خصوصیات کی وجہ سے مختلف قرار پاتے ہیں۔ دوسرے لوگ ان کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں یا وہ خود بھی اپنے آپ کو مخصوص گروہ سمجھتے ہیں۔ ینگر ان گروہوں کی تین اقسام بیان کرتا ہے

(i) اس کا خیال ہے کہ کسی ملک میں تارکین وطن کی وہ آبادی جو پہلی مشترک شہریت رکھتی ہے اس شہریت کی بناء پر ایک مخصوص گروہ متصور ہوگی۔ جیسے امریکہ میں آباد کوریائی، ویتنامی اور فلپائنی۔ یہ گروہ سابقہ مشترک شہریت کی وجہ سے ایک Ethnic گروہ قرار پائیں گے۔

(ii) زیریں معاشرتی گروہ (Sub societal group) بھی ایتھنک کہلائے گا جو مشترک نسلی و ثقافتی پس منظر رکھتا ہے۔ وہ مثال کے طور پر امریکی ہندی گروہوں، اونائیڈا ہندی (Oneida) اور ایروقیویز (Iroquois)، ایران کے ترکمانوں اور سابقہ یوگوسلاویہ البانویوں کو پیش کرتا ہے۔

(iii) تیسری قسم کے ایتھنی (Ethnie) بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

Pan culture groups of persons of widely different cultural and social back ground who however can be identified as similar on the basis of language race or religion mixed with broadly similar statuses.(27)

جیسے امریکہ میں ہسپانوی گروہ جو لاطینی امریکہ کے مختلف ملکوں سے آیا ہے لیکن ایک ایتھنک گروہ (Ethnic group) متصور ہوتا ہے یا جیسے برطانیہ میں ایشیائی گروہ جو مختلف ملکوں سے آئے ہیں اور زبان، مذہب کا گہرا اختلاف رکھتے ہیں لیکن اسکے باوجود انہیں ایک Ethnic گروہ قرار دیا گیا ہے۔

ینگر کی طرح جان رچرڈسن (John Richardson) بھی نسل اور سیاہ وسفید فام کی جگہ Ethnic کی اصطلاح کو زیادہ پسند کرتا ہے۔(۲۸) اس کے خیال میں مختلف گروہوں کے تشخص کو متعین کرنے کے لیے عمرانی علماء نے جتنی اصطلاحیں استعمال کی ہیں ان میں Ethnicity کی اصطلاح زیادہ جامع اور زیادہ قابل قبول ہے وہ کہتا ہے۔

This clarificatory approach is attractive in so far as it highlights socio

---

(۲۶) Ibid.

(۲۷) Ibid

(۲۸) Richardson. J. Race in M. Haralambos(ed) Development in Sociology. Cause Way Press ormskirk, Vol.3 (1987) Vol. 6 (1990)

cultural criteria(unlike the conventional race system) and it accomodates a potentially wide range of groups (unlike the two category black/white model).

مغربی علماء معاشرت کا مسئلہ تعصبات کو چھپانے اور بظاہر معروضی اور غیر جانبدارانہ تحقیق کا اظہار بھی ہے۔مغربی معاشرے بنیادی طور پر نسل پرست ہیں۔ان کے حکمران اور پالیسی ساز سفید فام کی برتری اور انکے مفادات ہی کے حوالے سے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔چونکہ ان کے نسلی تعصبات کھل کر سامنے آگئے ہیں اس لیے وہ نسل کی بجائے کسی اور اصطلاح کی تلاش میں تھے جس کے ذریعے ان کی انصاف پسندی واضح ہو سکے۔ان کے مطالعاتی گروہوں میں ماہرین عمرانیات نے Ethnicity کی اصطلاح ایجاد کی جسے اب تمام غیر سفید فام گروہوں پر چسپاں کیا جارہا ہے۔سوشیالوجسٹ گروہ کے نزدیک یہ ایک مفید اصطلاح ہے جس کے تحت مختلف گروہوں کو متعین کیا جاسکتا ہے۔مغربی معاشروں میں نسل پرستی ایک طاقتور عامل ہے اور غیر سفید فام گروہوں کے لیے نہ صرف معاندانہ رویہ موجود ہے بلکہ امتیاز بھی برتا جاتا ہے۔اس لیے خوبصورت اصطلاحوں اور رویوں میں نرمی کے باوجود نسل پرستانہ رجحانات موجود ہیں اور عمرانی تحقیق کا کوئی سنجیدہ طالب علم اس عامل کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔نسل پرستی کے رویوں میں دو اصطلاحیں اہمیت رکھتی ہے ایک تعصب (Prejudice) اور دوسری امتیاز (Discrimination)۔دونوں نسل پرستی کے رویوں کے مختلف مظاہر کو واضح کرتی ہیں۔ایک نسل پرست نہ صرف دوسری نسل کے لوگوں سے نفرت کرتا ہے بلکہ انکی تحقیر اور انہیں نقصان پہنچانے کا عملی اقدام بھی کرتا ہے۔کیش مور (E.E Cashmore) ان کی تعریف بیان کرتا ہے۔(۲۹)

تعصب (Prejudice)

اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

Learned beliefs and values that lead on indvidual or group of individuals to be biased for or against members of a particular group.

نسلی امتیاز (Discrimination)

اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے کیش مور لکھتا ہے۔

The unfavourable treatment of all persons socially assigned to a particular category.

تعصب اور امتیاز عام طور پر کسی گروہ کے بارے میں عمومی نظریہ یا خاص غیر متبدل قسم (Stereo type) پر مبنی ہوتا ہے اور Stereo type کسی گروہ کے بارے میں جھوٹی تعمیم (Generalization) کرنا یا بہت ہی سادہ کیفیت

(۲۹) E.E.Cashmore, Dictionary of Race and Ethnic Relations, London.

میں جانچنا(Over Simplification) ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ چھوٹے قد کے لوگ جارح ہوتے ہیں یا عورتیں کمزور اور مفصل ہوتی ہیں۔ یہ تعمیم درست نہیں ہے۔ کوئی ایک فرد یا چند افراد ایسے ہو سکتے ہیں لیکن سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا درست نہیں اور یہ Stereo typing کہلاتا ہے۔ ابتدائی عمرانی علماء نسلی تعصب (Racial Prejudice) اور نسلی امتیاز (Racial discrimination) جیسی اصطلاحیں استعمال کرتے تھے لیکن اب اس کے لیے نسل پرستی (Racism) کا زیادہ استعمال ہو گیا ہے۔

نسل پرستی(Racism)

نسل پرستی ایک متنازع اصطلاح ہے۔ رابرٹ مائل(Robert Mile)(۳۰) کے مطابق Racism کی اصطلاح 1930ء کی دہائی میں استعمال ہوئی جب انیسویں صدی کے ان نظریات کو زیر بحث لایا گیا جو نسل(Race) کے متعلق اختیار کیے گئے تھے 1930ء میں ہی نسل پرستی کی اصطلاح ہٹلر کے نظریات نازی پارٹی کی پالیسوں کی وجہ سے بھی استعمال ہوئی۔ حیاتیاتی اختلافات پر مبنی نسلی نظریات کے پس منظر میں یونیسکو نے نسل پرستی کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں اس تنظیم نے مختلف ملکوں میں چار کانفرنسیں منعقد کیں جن میں مختلف ممالک کے ماہرین جمع ہوئے تاکہ نسل(Race) کے متعلق متفقہ بیان تیار کیا جائے جو بین الاقوامی کمیونٹی کی رائے قرار پائے۔

اس کے چوتھے بیان میں نسل پرستی(Racism) کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

Racism falsely claims that there is a scientific basis for arranging groups hierarchically in terms of psychological and cultural characteristics that are immutable and innate.(31)

نسل پرستی کی بحث میں سائنٹیفک بنیاد کا بار بار ذکر ہوتا ہے کیونکہ نسل پرستوں نے سائنسی منہاج کا خاص طور پر سہارا لیا اور حیاتیاتی اور نفسیاتی تجزیوں کو سائنس قرار دے کر مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ برطانوی ماہر عمرانیات جان ریکس(John Rex) نے خاص طور پر کہا کہ نسل پرستانہ نظریات کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ اس نے Racism کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

Deterministic belief systems about the difference between the various ethnic groups,segments or strata.(32)

نسل پرستانہ نظریات میں ان اختصاصات کو انسانی گروہوں کی طرف منسوب کیا گیا جن پر انہیں اختیار حاصل

---

(۳۰) Mile, Robert, Racim, Routledge, London,1993

(۳۱) Ibid/46

(۳۲) Rex john, Race and Ethnicity, open University,Press Milton Keynes,1986.

نہیں تھا اور یہ اختصاصات تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ کہتا ہے:

It does not really matter whether this is because of men's genes, because of the history of which their ancestors have been exposed, because of the nature of their culture or because of divine decree. Which ever is the case it might be argued that this man is an and that, being an x, he is bound to have particular undesirable qualities.(33)

ریکس نے جو تعریف کی ہے اس کا تعلق ان نسلی نظریات سے ہے جو انیسویں صدی میں پیش کیے گئے۔ بہت سے معاصر ماہرین عمرانیات نسل پرستی کو ان نظریات سے متعلق نہیں کرتے بلکہ کچھ تو ان رویوں سے منسوب کرتے ہیں جو ان نظریات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً جان سولومن (John Soloman) نسل پرستی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Those ideologies and social processes which discrinimate against others on the basis of their putatively different racial membership.(34)

یہ تعریف غالباً اس عمومی تصور کے قریب ہے جو مختلف گروہوں کو نسلی امتیاز کا نشانہ بناتا ہے، ان کی تحقیر کرتا ہے توہین آمیز سلوک کرتا یا تبصرہ کرتا ہے۔ رچرڈسن (Richardson) ثقافتی نسل پرستی (Cultural racism) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

A Whole cluster of cultural ideas, beliefs and arguments which transmit mistaken notion about the attributes and capabilities of racial groups.(35)

نسل پرستی کے حوالے سے معاصر ماہرین عمرانیات نے ایک نئی اصطلاح استعمال کی ہے وہ Racism کی جگہ پر Racialism استعمال کرتے ہیں مثلاً جان ریکس (John Rex) نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

Racialism is an unequal treatment of various racial groups.(36)

گویا Racialism عملی اقدام ہے جبکہ Racism ایک نظریاتی رویہ ہے۔ نسل، نسل پرستی، تعصب اور امتیاز وہ موضوعات ہیں جن پر جدید عمرانی علوم میں مفصل بحثیں موجود ہیں۔ Racism, Race اور Ethniciy کی تعریف، کے بارے میں نظریات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مغربی ماہرین عمرانیات نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ استعمار کے نتیجے میں انہیں اپنی نو آبادیات میں سے تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد کو اپنے معاشروں میں

---

(۳۳) Ibid

(۳۴) Soloman.J. Theories of Race and Ethnic Relations, Cambridge University Press Cambridge, 1986.

(۳۵) Richardson op cit.

(۳۶) Race and Ethnicity.

جگہ دینا پڑی۔ ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا اس کے دور رس اثرات ہیں۔ مغربی پالیسی سازوں کو نہ صرف ان گروہوں کی شناخت کا سامنا ہے بلکہ وسیع تر تناظر میں معاشرتی تعلقات کا مسئلہ بھی ہے جسے اب وہ Race Relations اور Ethnie Relations کی اصطلاحوں میں بیان کر رہے ہیں۔ وہ اپنی نسل پرستی چھپانا چاہتے ہیں لیکن یہ تعصبات نفرتوں اور امتیازی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس درپیش مسئلہ کو انہوں نے علم کی ایک شاخ بنا دیا ہے۔ اور اب Sociology of Race ایک باقاعدہ علم ہے۔ جس میں تعریف، اقسام، نظریے، اصول اور نتائج زیر بحث آتے ہیں۔

اسلام اور نسلی امتیاز

گذشتہ اوراق میں نسل، نسلی امتیاز اور نسل پرستی کے بعض ان پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو جدید عمرانیات کا موضوع بحث ہیں۔ مغربی مفکرین چونکہ وحی الٰہی کی رہنمائی سے محروم ہیں اس لیے وہ ٹامک ٹویاں مار رہے ہیں۔ اندازے، تخمینے، خیالی مفروضے، عملی مظاہر کے تجزیے، رویے اور ان کے جائزے غرض مفروضوں اور مشاہدوں کی ایک دنیا ہے جسے نام نہاد ماہرین عمرانیات نے آباد کر رکھا ہے۔ یقینی علم سے محرومی کا نتیجہ ہے کہ ظن و تخمین کے اندھیروں میں گم کردہ راہ پھر رہے ہیں اور حیران و پریشان ہو کر کبھی ایک نظریہ پیش کرتے اور کبھی دوسرا اور کبھی ایک تجزیہ سامنے آتا اور کبھی دوسرا جائزہ۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے وحی کے حقیقت آشنا اصولوں کو بیان فرمایا اور پیغمبرانہ حکمت سے گرہ کشائی فرمائی۔

بقول ظفر علی خانؒ:

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وحدت نسل انسانی

اسلام نے سب سے پہلے وحدت نسل انسانی کا تصور دیا۔ تخلیق آدم کی پوری کہانی بیان کی اور یہ واضح کیا کہ آدمؑ کی تخلیق مٹی کے عناصر سے ہوئی اور انہی عناصر سے حوا کی تخلیق کی اور ان دونوں سے نسل انسانی کو فروغ دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۳۷)

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ جب اس کو درست کرلوں

---

(۳۷) ص/۷۱-۷۲۔

اوراس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

دوسری جگہ پر فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ O فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (۳۸)

اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں جب اس کو (صورت انسانیہ) میں درست کرلوں اواس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔

قرآن تخلیق انسان کے سلسلے میں جو نقطۂ نظر پیش کرتا ہے وہ ان دو آیات میں آ گیا ہے یعنی تخلیق انسان عناصرِ ارضی سے ہوئی اور خالق کائنات براہ راست اس تخلیق کا ذمہ دار ہے۔ قرآن اس سے اگلی بات یہ کہتا ہے کہ پوری نسل انسانی اس جوڑے سے بڑھی ہے جو براہ راست خالق کائنات کی تخلیق ہے وہ فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا. (۳۹)

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد وعورت پھیلا دیئے اور تم اللہ تعالی سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ پوری نسل انسانی اسی جوڑے سے آگے بڑھی ہے گویا انسان کی بنیاد عناصر ارضی ہیں اور نسل انسانی کی بنیاد وہ اولیں مرد وعورت کا جوڑا ہے جو براہ راست اللہ کی تخلیق ہے۔ وحی الٰہی نے ظن وتخمین کے ان تمام نظریات کی جڑ کاٹ دی جو تخلیق اور نسل انسانی کے متعلق وضع کیے گئے۔ نسل انسانی کے بعض امتیازات پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن وہ متوازن بات کرتا ہے جو نسلی تعصبات کو ختم کرنے کا حقیقی نسخہ ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۴۰)

لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور

---

(۳۸) الحجر/۲۸-۲۹۔

(۳۹) النساء/۱

(۴۰) الحجرات/۱۳۔

سب سے خبردار ہے۔

غور کریں تو ان اختلافات کا ذکر ہے جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ گروہ، قبیلے، قومیں وجود میں آئیں، نسل انسانی میں ایک تنوع پیدا ہوا جو طویل انسانی زندگی کا نتیجہ ہے۔ اس میں جغرافیائی، ماحولیاتی اور جینیاتی اثرات کے امکانات موجود ہیں۔ رنگوں، چہروں بشروں، قد وقامت اور قوت مزاحمت جیسے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ اختلافات نسل انسانی کے وجودی حقائق ہیں۔ ان اختلافات میں بھی خالق کائنات کی تکوینی حکمت عملی کام کر رہی ہے۔ قرآن اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (۴۱)

اور اسی کے نشانات وتصرفات میں سے ہے آسمانوں اور زمین پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لیے ان میں یقیناً نشانیاں ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کہ انسانوں کی زبانوں اور رنگوں کے اختلافات کو آیات الٰہی قرار دیا اور اسے تخلیق ارض وسماء کے برابر بیان کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زبانوں اور رنگوں کا اختلاف تکوینی نظام کا حصہ ہے۔ نسل انسانی کی وسعت اور کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنا، مختلف جغرافیائی اور ماحولیاتی حالات میں زندگی بسر کرنا مشیت ایزدی کا منشا ہے۔

حکمت ربانی ان حقائق کو بیان کرنے کے بعد انسانوں کی توجہ اس جانب مبذول کراتی ہے کہ رنگوں اور زبانوں کا تنوع اور نسل انسانی کے ظاہری اختلافات اس کے اندر مستقل امتیازات کا باعث نہیں۔ یہ وہ بنیادیں نہیں ہیں جن کی وجہ سے نسل انسانی کے عز وشرف اور تحقیر وتذلیل کے معیارات مقرر کیے جائیں۔ ان کی حیثیت تو محض شناخت کی ہے تا کہ انسان اس تنوع کا ادراک کرے اور خالق کی خالقیت کو سمجھے۔ اصل معیار اور حقیقی عز وشرف کا دار ومدار کردار اور خدا شناسی پر ہے۔ کوئی فرد، قوم یا گروہ معرفت رب اور اطاعت الٰہی میں جتنا مستحکم ہوگا اتنا ہی معزز ہوگا۔ اسلام رنگ ونسل کے امتیازات کو وجہ شرف نہیں مانتا وہ نہ صرف وحدت نسل انسانی کا داعی بلکہ وحدت کردار کا بھی مبلغ ہے

حضور اکرم ﷺ نے ہدایات ربانی کی روشنی میں جو افراد تیار کیے اور جو معاشرہ تخلیق کیا وہ تقویٰ کی اساس پر قائم تھا اور اخوت کے اصول پر مستحکم تھا۔ آپ ﷺ نے ان عوامل کی نفی کی جو نسلی امتیازات اور تفاخر کا باعث بن سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان تمام اقدامات کو ممنوع قرار دیا جو تفریق کا باعث بن سکتے تھے یا معاشرتی ونسلی ہم آہنگی کو نقصان پہنچا سکتے تھے، قرآن نے ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا!

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ

(۴۱) الروم/۲۲۔

عَسٰۤی اَنۡ یَّکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡهُنَّ وَلَاتَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ وَ مَنۡ لَّمۡ یَتُبۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا وَ لَایَغۡتَبۡ بَّعۡضُکُمۡ بَعۡضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡهِ مَیۡتًا فَکَرِهۡتُمُوۡهُ وَاتَّقُوااللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ○ (۴۲)

مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔ اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تم ضرور نفرت کرو گے اور اللہ کا ڈر رکھو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

آپ ﷺ نے جو معاشرہ قائم کیا اس کا بنیادی اصول اخوت کا تھا۔ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کے ساتھ اخوت کے رشتے میں جڑا ہوا ہے لہذا وہ اپنے بھائی کے بارے میں کوئی ایسی بات اور کوئی ایسا رویہ نہیں اختیار کرے گا جس سے اخوت کے رشتے کو نقصان پہنچے۔ قرآن نے اس رشتہ اخوت کو بیان کرتے ہوئے کہا۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَاتَّقُوااللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۔ (۴۳)

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر معاشرتی زندگی میں اختلاف کی کوئی صورت پیدا ہو تو اسے حل کرو اور اگر بات حد سے بڑھنے لگے تو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو تا کہ معاشرتی استحکام کو نقصان نہ پہنچے۔

آپؐ نے نسلی تفاخر کو جاہلیت قرار دیا اور نسلی برتری کے احساس کو جرم قرار دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے اپنے خطابات میں نسلی تفاخر اور جاہلیت کی مذمت کرتے ہوئے وحدت نسل انسانی کے اصول پر زور دیا آپؐ نے فرمایا۔

عَنۡ ابۡنِ عُمَرؓ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ خَطَبَ النَّاسَ یَوۡمَ فَتۡحِ مَکَّةَ فَقَالَ. یَا اَیُّهَا النَّاسَ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَذۡهَبَ عَنۡکُمۡ عُبِّیَّةَ الۡجَاهِلِیَّةِ وَتَعَاظُمَهَا بِآبَائِهَا فَالنَّاسُ رَجُلَانِ رَجُلٌ بَرٌّ تَقِیٌّ کَرِیۡمٌ عَلَی اللّٰهِ

(۴۲) الحجرات/۱۱-۱۲۔

(۴۳) الحجرات/۱۰۔

وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ هَيِّنٌ عَلَى اللّٰهِ. وَالنَّاسُ بَنُو آدَمَ وَخَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مِنَ التُّرَابِ۔ (۴۴)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لوگوں سے خطاب کیا اور فرمایا۔ لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء واجداد پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ انسان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آدمی نیک اور متقی وہ اللہ کے ہاں معزز ہے اور دوسرا فاجر اور بد بخت جو اللہ کے ہاں بے وزن ہے۔ انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ابن ھشامؒ نے اس خطبہ کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْآبَاءِ اَلنَّاسُ مِنْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ. (۴۵)

اے گروہ قریش۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ لوگ آدمؑ سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے۔

حضور اکرم ﷺ نے نسل پرستی کے خلاف تاریخ ساز اقدام کیا۔ اس سے نہ صرف نسل پرستی کے جاہلانہ اصول کی نفی ہوئی بلکہ انسانی اصولوں کی بنیاد پر ایک امت وجود میں آئی جو نسل پرستی کے خلاف ایک زندہ علامت ہے۔ امت اپنے وجود اور تشخص کے باعث نسل پرستی کے خلاف ایک مجسم احتجاج ہے۔ بدقسمتی سے مسلمان قیادتوں کی بزدلی، خیانت اور امت کے تصور سے بے وفائی کی وجہ سے استعمار کو نیشنلزم اور نیشن سٹیٹ جیسے مہلک اور نسل پرستانہ تصورات عالم اسلام میں متعارف اور نافذ کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمان بھی امت کے نظریاتی تشخص کی بجائے قومیتوں کے فریب میں آ گیا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید اقوام کی نسل پرستانہ ذہنیت پوری قوت سے ہر جگہ آشکار ہے۔

اقبال نے قومیت کے حوالے سے استعماری قوتوں کے ارادوں کا صحیح ادراک کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس فتنے سے آگاہ کیا تھا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ﷺ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

(۴۴) ترمذی، ابواب التفسیر، ۲/۱۵۹۔

(۴۵) ابن ہشام، ۴/۵۴۔

دامن دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی(۴۶)

اسلام نسل پرستی کے خلاف ایک زندہ روایت ہے' نسل کے حیاتیاتی نظریے کو رد کرتا ہے' ثقافتی اور نفسیاتی عوامل کو نسلی اختلاف کے عارضی اسباب مانتا ہے لیکن ان کی بنیاد پر نسل پرستی کے مستقل اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ان تمام نظریات کے بارے میں قرآنی ارشاد پر اکتفا کرتا ہے جس میں کہا گیا۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۴۷)

یہ محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔

......☆......

---

(۴۶) بانگ درا/ ۲۴۸

(۴۷) الانعام/ ۱۱۷

اسلام اور اقلیتیں*

مذاہب عالم میں اسلام کو جو خصوصی حیثیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اسلام بیک وقت مذہب بھی ہے اور ریاست بھی۔ مذہب کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے اس کے مطابق وہ بندے اور معبود کے تعلق کا نام ہے۔ اس تعریف کے مطابق وہ مذہب ہے کیونکہ وہ بندے اور معبود کے تعلق کو بہت عمدہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ اسلام رب کی عبادت اس کی محبت' اس کے لئے قربانی اور اس کے احکام کی پابندی کے سلسلے میں شاندار وضاحتیں اور بہترین اصول بیان کرتا ہے لیکن عام مذاہب سے بڑھ کر انسان اور انسان کے رشتوں کی بات بھی کرتا ہے اور ان تعلقات کی تنظیم کے اصول بھی دیتا ہے۔ س سے بھی زیادہ وہ انسان اور کائنات اور انسان اور اس کے ماحول کے بارے میں بھی ہدایات دیتا ہے۔ اس طرح وہ محض مذہب نہیں بلکہ دین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دنیا کے بانیان مذاہب میں حضور اکرم ﷺ کو یہ خصوصی مرتبہ حاصل ہے کہ آپ نے دین اسلام کی بنیاد پر نہ صرف ایک نیا معاشرہ قائم کیا بلکہ ربانی اصولوں کے مطابق ایک ریاست بھی منظم کی اور اپنی زندگی میں ریاست کی تنظیم کے سلسلے میں اصول و قواعد بھی مرتب کئے۔

اسلامی ریاست کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تنظیم کے لئے سیاسی' معاشی اور معاشرتی اصول بھی طے کئے اور اس کے ملکی اور بین الممالک قوانین اور تعلقات کے ضابطے بھی مرتب فرمائے؛ نیز ریاست کے شہریوں کے حقوق و فرائض ان کی حیثیت اور ان کے باہمی تعلقات کے بارے میں رہنما اصول بھی دیئے۔ حضور اکرم ﷺ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو دین اسلام کا مذہبی ضابطہ اور ریاستی نمونہ موجود تھا۔ آپ نے قیام عدل اور شہریت کی حدود و قیود کے بارے میں ایک اسوہ چھوڑا جسے امت نے قابل اتباع پایا۔ پروفیسر گب کہتا ہے کہ سیاسی تنظیم کا جو تجربہ عیسائیت کو مسیحؑ کی مصلوبیت کے تین سو برس بعد میں ہوا وہ اسلام کو اپنے رہنما کی زندگی ہی میں حاصل ہو گیا۔* اگرچہ وہ اسے منفی طور پر پیش کرتا ہے تاہم دنیوی زندگی کی تنظیم کو نظر انداز کرنے سے مذہب صرف رہبانیت رہ جاتا ہے جسے اسلام نے قبول نہیں کیا۔ مذہب کا محدود تصور رکھنے والے اہل مذہب کو بالعموم اور عصر حاضر کے سیکولر انسانوں کو بالخصوص اسلام کے سیاسی کردار کی بات سمجھ نہیں آتی کبھی وہ اسے دنیاداری سمجھ کر حضور اکرم ﷺ کو ایک سیاسی رہنما اور مدبر ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور کبھی اسلامی ریاست کے حوالے سے بعض قانونی اور سیاسی پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔

---

* یہ باب بنیادی طور پر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی "اسلامی ریاست"، مولانا امین احسن اصلاحی کی "اسلامی ریاست" مولانا محمد اسحاق سندیلوی کی "اسلام کا سیاسی نظام" اور مولانا حامد الانصاری کی "اسلام کا نظام حکومت" سے استفادہ پر مبنی ہے تاہم دیگر مصادر سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

* "And above all the at preliminary compromise with the political life which, attained by cristianity only after three countries of existance, was reached in Islam during the life time of its founder." The new American library of the world literature, Sol Madison Avenue, Mohammedanism/100, New York, 1955

استعمار کی ظاہری شکست اور عالم اسلام سے ظاہری طور پر خارج ہونے کے بعد مسلمان معاشروں میں اسلامی ریاستوں کے قیام کی آرزو بیدار ہوئی لیکن اس نے استعماری طاقتوں کو اور ان کے تربیت یافتہ سیاسی جانشینوں اور سیکولر اشرافیہ کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ مخلص مسلمانوں کو کبھی سیاسی اسلام کا طعنہ دیتے ہیں کبھی انہیں تشدد پسند (Millitant) اور کبھی بنیاد پرست (Fundamentalist) کہتے ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ اعتراض اسلام کے اجتماعی کردار پر ہے۔ اسلامی ریاست' اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کے قیام کی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اسلامی ریاست کے قیام کو وہ سیکولر آئیڈیالوجی کے لئے براہ راست خطرہ سمجھتے ہیں۔ سیکولر ارباب اختیار نے مسلم ممالک میں اپنے سرپرستوں کے ایما پر غیر مسلم عیسائیوں' ہندوؤں اور دوسرے منحرف گروہوں سے تعاون کے ذریعہ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی کردار کے بارے میں مخالفانہ مہم چلا رکھی ہے۔ اس مہم کے دو اہم نکات ہیں: ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق اور دوسرے اسلامی ریاست میں مسلمانوں پر تبدیلی مذہب کی پابندی۔ ان کے خیال میں یہ دونوں باتیں روشن خیالی کے اس دور میں مسلمانوں کی قدامت پرستی' رجعت پسندی اور انسان دشمنی پر مبنی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو اپنے اکثریتی ملکوں میں بھی اسلامی ریاست کے قیام سے روکنا عین روشن خیالی اور انسان دوستی ہے۔ مغرب تو اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کے قیام کو اپنے لئے تہذیبی چیلنج سمجھتا ہے لیکن مسلمانوں کا سیکولر طبقہ کیوں مخالفت کرتا ہے؟ مسلمان ہونے کی وجہ سے تو یہ رویہ نا قابل فہم ہے البتہ اپنے غیر اخلاقی اور غیر اسلامی طرز زندگی کے تحفظ کی خاطر مخالف اسلام مہم میں ہراول دستے کا کام کرنا سمجھ میں آتا ہے کیونکہ انہوں نے جو طرز زندگی اپنایا ہے اس میں اسلام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس طبقہ کی بوکھلاہٹ قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے۔

مغرب نے اس پروپیگنڈا مہم میں مسلمان ملکوں کی عیسائی اقلیتوں اور مسلمان معاشروں کے منحرف فرقوں کو استعمال کیا ہے۔ عالم اسلام کے اندر یہ گروہ شور مچاتے ہیں کہ ان پر ظلم ہو گیا اور عالمی سطح پر ابلیسی ذرائع ابلاغ اور مغرب کے پالیسی سازوں نے بیان بازی شروع کر رکھی ہے کہ مسلمان ملکوں میں اقلیتیں محفوظ نہیں ہیں۔ کوئی کانفرنس' کوئی بین المذاہب مکالمہ اور کوئی سیاسی اور معاشرتی بحث اقلیتوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مغربی پالیسی سازوں اور میڈیا کارکنوں کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ مغربی معاشروں میں مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کے باوجود مسلم معاشروں کے خلاف مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جدید معاشرتی تعبیرات کے سلسلے میں اسلام اور اقلیتوں کے مسائل پر بات کرنا ضروری ہے۔ ذیل میں ہم اس کے اصولوں اور عملی پہلوؤں پر اسلامی تعلیمات اور عصر حاضر کے تعامل کے حوالے سے بات کریں گے۔

جدید معاشرے اور اقلیتیں

عصر جدید نے معاشرتی تغیر اور سیاسی تبدیلی کے کئی مناظر دیکھے ہیں۔ استعماری طاقتوں کا کنٹرول' بڑی سلطنتوں کا قیام و زوال اور استعماری قوتوں کی شکست' قومی ریاستوں کی تشکیل' سرد جنگ اور اب یک قطبی (Unipolar) عالمی منظر

اور مسلمانوں کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کے الزامات کا سامنا اور تہذیبوں کے تصادم جیسے نظریات کی تشہیر ایسے حالات ہیں جو عصر حاضر کے جلو میں ہیں۔ ان میں سب سے اہم قومی ریاست (Nation state) کا تصور ہے جس نے نئے مسائل پیدا کئے ہیں۔ یورپ میں جب بڑی سلطنتیں ٹوٹیں تو آہستہ آہستہ نسلی اور لسانی بنیادوں پر قوموں کا تصور ابھرنا شروع ہوا جو بالآخر قومی ریاستوں (Nation states) پر منتج ہوا۔ مسلم دنیا میں بڑی سلطنتیں تھیں' ہندوستان میں سلطنت مغلیہ' یورپ' ایشیا اور افریقہ کے حصوں پر مشتمل خلافت عثمانیہ یا سلطنت عثمانیہ تھی۔ اس طرح افریقہ میں مسلمانوں کی بڑی حکومتیں تھیں۔ اولین طور پر تو استعمار نے مسلمانوں کے بڑے علاقوں پر قبضے کئے۔ سلطنت مغلیہ ختم ہوئی اور بالآخر سلطنت عثمانیہ بھی ختم کردی گئی۔ استعماری طاقتوں نے نقشوں پر لکیریں کھینچ کر علاقے تقسیم کئے اور وہاں اپنے کنٹرول کو مستحکم کرنے کے لئے لسانی اور جغرافیائی وحدتوں کو منظم کیا۔ ایک خاص منصوبہ بندی کے ساتھ ترکوں میں ترک قومیت کے نظریہ کو پروان چڑھایا اور شرق اوسط میں عرب قومیت کی حوصلہ افزائی کی۔ خلافت عثمانیہ کے بکھرنے سے صرف مشرق وسطیٰ میں چھ وحدتیں قائم کیں۔ عراق' اردن' سعودی عرب' شام' لبنان اور فلسطین۔ یہی کام کمیونسٹ سوویت یونین نے کیا۔ وسط ایشیا کے بیشتر مسلمان ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ترکی زبان کے مختلف لہجے بولتے ہیں۔ انہیں آذری' قازق' ترکمان' کرغیز میں تقسیم کردیا اور فارسی بولنے والے تاجکوں کو الگ قومیت قرار دیا۔ اور ان سب وحدتوں کو جغرافیائی اور لسانی حد بندیوں میں جکڑ دیا۔ عالم اسلام میں مختلف نسلی اور لسانی گروہ بڑی سلطنتوں کے اندر اپنے محدود تشخص کو قائم رکھتے ہوئے امت مسلمہ کی بڑی وحدت میں مسلم تشخص کے ساتھ زندہ تھے۔ ان کی لسانی اور نسلی شناخت کبھی بھی اسلامی شناخت سے متصادم نہیں ہوئی۔ اقبال جو سامراجی عزائم کا گہرا ادراک رکھتے تھے ان چھوٹی وحدتوں کے الگ تشخص کے خلاف نعرہ زن رہے۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

استعماریوں نے جو مسلمان علاقے واگذار کئے تو ان چھوٹی چھوٹی وحدتوں کو قومی ریاستوں کی صورت میں منظم کر کے ان کا انتظام مغربی فکر اور مغربی تہذیب میں تربیت یافتہ و پختہ افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ گئے۔ ان قومی ریاستوں کے ارباب اختیار کے اپنے مفادات بھی اس پرانے نظام کے ساتھ وابستہ تھے لہٰذا انہوں نے وحدت اسلامی اور امتی تشخص کو اجاگر کرنے کی بجائے محدود قومی تشخصات کو مضبوط کرنے میں پورا زور لگایا۔ اس وقت عالم اسلام اور عالم کفر دونوں میں سیکولر قومی ریاستیں مستحکم ہیں۔ قومی لباس' قومی ترانہ' قومی جھنڈا اور قومی جغرافیائی حدود وہ علامتیں ہیں جن سے قومی ریاستیں پہچانی جاتی ہیں۔ بڑی سلطنتیں جو مذہبی یا شخصی بنیاد پر قائم تھیں ان میں مختلف مذہبی' لسانی اور نسلی گروہ رہتے تھے۔ ان کے درمیان مفادات کے لحاظ سے اختلافات بھی ہوتے تھے۔ انہیں مرکز کے خلاف شکایات بھی ہوتی تھیں کبھی کبھار بغاوتیں

بھی ہوتی تھیں، بعض گروہ مرکز سے خودمختارانہ حیثیت بھی منوا لیتے تھے۔ بعض گروہ مسلسل باغیانہ روش پر بھی گامزن رہتے لیکن سلطنت اپنے وسیع تناظر میں وحدت اور یکجہتی کی علامت رہتی اور سلطنت کے شہریوں کو اس وسیع تر دائرے میں سرگرم رہنے کا موقع ملتا۔ شہریوں کو نقل و حرکت، مختلف مذہبی، نسلی اور لسانی گروہوں کو معاشرتی تفاعل اور باہمی افہام و تفہیم کے مواقع میسر رہے۔ یورپ سے باہر قومی ریاستوں کی تشکیل چونکہ استعماریوں نے کی تھی اس لئے غیر فطری جغرافیائی تقسیم سے مختلف نسلی لسانی اور مذہبی گروہ مستقل طور پر اکثریت اور اقلیت میں تبدیل ہوئے۔ قومی ریاستوں سے پہلے اکثریت اور اقلیت کا یہ تصور نہ تھا جو قومی ریاستوں کی تشکیل کے بعد ہوا۔ ایک گروہ کو قوم کی حیثیت حاصل ہوگئی اور دوسرے نسلی لسانی اور مذہبی گروہوں کو اس قومی تشخص کو اپنانا پڑا اور ان کی قومی پہچان اس گروہ کے ساتھ منسلک ہوگئی جو اب قوم کی صورت میں صاحب اختیار ہوا۔ قومی ریاست میں غالب گروہ کی زبان، اس کی روایت اور کلچر اس کا لباس اور مذہب سب اہمیت حاصل کر گئے۔ یورپ میں قومی ریاستوں کی تشکیل سے زیادہ فرق نہ پڑا کیونکہ ان کا تہذیبی و تمدنی پس منظر ایک تھا۔ مذہبی روایت بھی ایک تھی اور فکری و عملی مطالبات بھی ایک ہی نوعیت کے تھے۔ علاقائی کلچر اور روایت بھی تہذیبی پس منظر سے متصادم نہ تھی اس لئے یورپ میں قومی ریاستوں کی تشکیل میں کوئی تہذیبی یا فکری مسئلہ نہیں پیش آیا۔ یہ صرف مفادات یا بعض قوموں یا ارباب اختیار کا تفاخر تھا کہ جس کی وجہ سے تصادم کی نوبت آئی۔ عالم اسلام کا حال مختلف تھا یہاں مرکز نے ہمیشہ نسلی و لسانی و مذہبی گروہوں کو ایک ڈھیلے ڈھالے نظام میں جوڑ رکھا تھا۔ ان گروہوں کو اپنے دائرے میں سرگرم رہنے کے وسیع اختیارات تھے۔ اس لئے ظالمانہ جکڑ بندیوں کی گنجائشیں کم تھیں۔ اگر کوئی شخص یا گروہ سلطنت یا وسیع اجتماعیت کے خلاف سازش نہیں کرتا تو کوئی تعرض نہ ہوتا۔ اکثر سازشیں محلاتی ہوتیں اور دور دراز یا سیاسی وابستگیوں سے دلچسپی نہ رکھنے والے لوگ ہمیشہ محفوظ و مامون رہتے۔ استعماریوں نے عالم اسلام میں منحرف مذہبی گروہوں، غیر مسلم جمعیتوں اور چھوٹی نسلی اور لسانی قومیتوں کو پروان چڑھایا۔ ان کی جدید تعلیم و تربیت کا انتظام کیا انہیں اپنے سیاسی انتظامی اور عسکری ڈھانچے میں شامل کیا اور امت مسلمہ کی وحدت اور اس کے اجتماعی تشخص کے خلاف استعمال کیا۔ امت مسلمہ کے تاریخی تسلسل کے انقطاع کے طور پر سیکولر نظام وضع کیا جو مغربی ماڈل پر تھا اور جس کی اساس محدود قومیتوں پر تھی لہٰذا قومی ریاستوں کی تشکیل کے بعد یا تو اقتدار کے بڑے مناصب پر چھوٹے مذہبی یا لسانی گروہوں کے افراد کو مستحکم کیا یا انہیں الگ تشخص کے شعور کے ساتھ بڑے گروہ سے متصادم کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کی قومی ریاستیں مستقل طور پر کشمکش کا شکار ہو گئیں۔ اکثریت اور اقلیت کا تصور مغرب کی پیداوار ہے لہٰذا قومی ریاستوں کے وجود سے وابستہ ہے۔ یورپ لسانی و جغرافیائی تنوع کے باوجود اب ایک یونین کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ اسے کوئی بڑی مشکل درپیش نہیں ہے کیونکہ ان کا لباس ان کا کلچر ان کی مذہبی روایت، تمدنی مظاہر اور تاریخی پس منظر ایک ہے۔ لیکن مسلمان ایک امت کا تصور رکھنے کے

باوجود متحد ہونے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ اہل مغرب کے لئے سب سے بڑا مسئلہ غیر یورپی باشندے ہیں جو ان کی نوآبادیوں سے نقل مکانی کر کے ان کے معاشروں میں آئے ہیں۔ ان میں نسلی ولسانی گروہ بھی ہیں اور مذہبی بھی۔ مغربی معاشرے کی حیثیت ایک کٹھالی کی ہے جو اس میں جاتا ہے وہ اس رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یہ گروہ جن کو وہ Ethnic گروہ کہتے ہیں اپنی چمڑی کا رنگ اور اپنے جسمانی خدوخال تو نہیں بدل سکتے لیکن ان کے ذہن' ان کے آداب' ان کا رہن سہن اور ان کی ثقافت مغربی معاشروں ہی کی ہے۔ ہندو جو مذہبی تشخص کے حوالے سے بڑا تعصب رکھتے ہیں وہ مغربی ثقافت میں اپنے باطنی تشخص کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ کیونکہ وہ مغربی ثقافت سے متصادم نہیں بلکہ اس کی حیثیت مرچ مسالے کی ہے جسے اہل مغرب چٹخارے کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ مغربی معاشروں میں Ethnicity کے حوالے سے بہت لٹریچر آرہا ہے پالیسیاں بن رہی ہیں اور یورپی معاشرے کی یکجہتی کو قائم رکھنے اور اسے لاحق خطرات سے نپٹنے کے لئے حکمت عملی طے کی جا رہی ہے۔ مغربی معاشرے انتہائی ظالمانہ تاریخ کے حامل ہیں۔ قتل و غارت اور گروہی صفایا (Elimination) ان سے غیر متوقع نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر ان کے پالیسی ساز کسی وقت اس نتیجے پر پہنچے کہ غیر یورپی گروہوں سے نجات حاصل کئے بغیر وہ اپنے معاشروں کی وحدت نہیں برقرار رکھ سکتے تو ان گروہوں کو ختم کرنے یا جلاوطن کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ یہ سب کچھ سیکولر قومی ریاستوں کے تصور کی موجودگی ہی میں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی معاشروں کے لئے غیر یورپی کافروں کا مسئلہ کوئی بڑا معاملہ نہیں ہے کیونکہ ان کے جذب ہونے اور یک جہتی میں گم ہونے کے امکانات زیادہ ہیں ان کے لئے اصل مسئلہ مسلمانوں کا ہے کیونکہ ان کی بڑی تعداد کے جذب ہو جانے کے باوجود ایک ایسی جماعت باقی رہے گی جو مسلم تشخص پر اصرار کرے گی کیونکہ مسلم تشخص مغربی روایت' اس کے کلچر' اس کے آداب اور اس کی روح سے سازگار نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے خلاف اقدامات کا زیادہ اندیشہ ہے اور اس لئے بھی کہ مغرب سے باہر بھی اسلام اور مسلمانوں کو مغربی تغلب کے خلاف ایک مزاحمت سمجھا جا رہا ہے۔ یہ جو عالمی سطح پر مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مہم ہے اس کا ایک پہلو مغرب میں بسنے والے مسلمانوں پر سازگاری کے لئے دباؤ ڈالنا ہے تا کہ وہ اپنے الگ تشخص سے دستبردار ہو جائیں اور مغربی معاشروں میں ضم ہو جائیں۔ جذب کی کئی سطحیں ہو سکتی ہیں اور ایک مرتبہ کوئی گروہ اپنے تشخص پر مفاہمت کر لیتا ہے تو پھر اسے آخری حد تک پہنچنے میں وقت تو لگ سکتا ہے رکاوٹ نہیں ہوتی۔

مغربی معاشروں میں اقلیتوں کو دباؤ میں رکھا گیا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی سازی میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ پارٹی سیاست میں شامل ہونے سے بھی انہیں پالیسی مسائل پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں۔ انہیں ہر حال میں پارٹی پالیسی ہی کی پیروی کرنا ہوتی ہے۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز پر بھی مسلمان پارٹی ارکان اسی نقطہ نظر کی پیروی کریں گے

جسے پارٹی طے کرے گی۔ جمہوریت کے خوبصورت نظام میں اکثریت ہمیشہ اکثریت ہے اور اقلیت ہمیشہ اقلیت ہے۔ اس کے لئے تحفظات کی بات مغرب میں ممکن نہیں، عالم اسلام میں ممکن ہے کیونکہ ایک تو اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور قانونی ضابطے انہیں تحفظ دیتے ہیں، دوسرے یہاں کی اقلیتوں کو بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ عالم اسلام میں مذہبی اقلیتوں نے اکثریت کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ مغرب میں ایسا ممکن نہیں۔ وہاں تو حقوق کی درخواستیں اور التجائیں ہوتی ہیں اور اکثریت کے رحم و کرم پر مبنی نظام ہی نافذ ہوتا ہے۔ قومی ریاستوں میں جن گروہوں کو اقلیت قرار دیا جاتا ہے ان کی حیثیت واقعی دوسرے یا تیسرے درجہ کے شہری کی ہوتی ہے۔ یہ ریاستیں منافقانہ طریقہ پر مساوات کی بات کرتی ہیں لیکن عملاً نسلی امتیاز کی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہوتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان پر اعتماد نہیں کیا جاتا بلکہ ہنگامی حالات میں ان پر ظالمانہ قانون نافذ کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں چینیوں اور جاپانیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا تھا۔ قومی حکومتیں اپنی اقلیتوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتی ہیں ان کی ایک مثال ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سلوک کی ہے۔ 11 ستمبر کے بعد امریکہ میں مسلمانوں کو جس طرح تحقیر، تذلیل اور تشدد کا سامنا ہے اس رویہ کو دوسری سیکولر قومی ریاستوں نے جس طرح اختیار کیا ہے اس سے سیکولر قومی ریاستوں کی منافقت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ سیکولر قومی حکومتیں اپنی اقلیتوں کو جو تھوڑے بہت نمائشی حقوق دیتی ہیں وہ کسی وقت بھی واپس لئے جا سکتے ہیں کیونکہ انہیں عطا کرنے والی بھی یہی حکومتیں ہوتی ہیں اور انہیں واپس لینے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اقلیت کا کوئی باضمیر نمائندہ کبھی اچھے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا اگر کسی شخص کو کوئی عہدہ ملتا ہے تو وہ نمائشی ہوتا ہے اور حکومت کی پالیسی کے اتباع میں ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اکثریت کی خوشامد اور اسے راضی رکھنے کی فکر میں رہتا ہے۔ دنیا کی کوئی سیکولر قومی حکومت اقلیتوں کو وہ مراعات دینے کے لئے تیار نہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں۔ اکثریت و اقلیت کا تصور ہی امتیاز کی پالیسی کو ظاہر کرتا ہے۔ دور حاضر کی تمام سیکولر قومی حکومتیں مختلف نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہی ہیں۔

اسلام اور نسلی اقلیتیں

اسلام ایک نظام حیات ہونے کے لحاظ سے معاشرتی تنظیم کے بارے میں واضح پروگرام کا حامل ہے۔ مختلف انسانی گروہوں کے بارے میں اس کا ایک موقف ہے جس کا اظہار قرآن و سنت کی نصوص میں موجود ہے۔ مثلاً وہ انسانوں کو اکثریت و اقلیت کے پیمانوں سے نہیں ناپتا بلکہ اصولوں اور وابستگیوں کے حوالے سے شناخت کو قبول کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے نسلی و لسانی بنیادوں پر انسانوں کی تفریق اور اس پر مبنی اکثریت و اقلیت کا تصور قابل قبول نہیں۔ اس کے نزدیک انسانیت ایک وحدت ہے اور نسلی و لسانی اختلافات وجہ تفریق و امتیاز نہیں۔ وہ محض تعارف کا ذریعہ اور پہچان کا وسیلہ ہیں؛ نیز ان کی حیثیت خالق انسان کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ زبان اور رنگ کا اختلاف

قدرت الٰہی کی کرشمہ سازی ہے اور اسے تخلیق ارض وسماء کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (۱)

اور اس کے نشانات وتصرفات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لئے اس میں یقیناً نشانیاں ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ رنگوں اور زبانوں کا تنوع اور نسل انسانی کے ظاہری اختلافات ان کے اندر مستقل تفریق وامتیاز کا باعث نہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے نسل انسانی کے مختلف لوگوں کے لئے عزوشرف اور تحقیر وتذلیل کے معیارات مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ قرآن قبائلی اور گروہی اختلاف کو نسلی اختلاف نہیں مانتا وہ رنگ ونسل کو محض شناخت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس نے اعلان کیا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۲)

لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا سب سے خبردار ہے۔

قرآن نسل انسانی کی ایک بنیاد کو پیش کرتا ہے اور وحدت نسل انسانی کے نظریہ کا علمبردار ہے وہ نسلی امتیازات کا مخالف اور اس بنیاد پر بننے والی پالیسیوں اور رویوں کو انسان دشمنی سمجھتا ہے۔ اس کا اعلان ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا (۳)

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے اور تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو اور قرابت سے بھی۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نسلی بنیاد پر اکثریت واقلیت کے تصور کے ہی خلاف ہے۔ نسلی اور لسانی گروہ انسانی بنیادوں پر برابر کے حقوق وفرائض رکھتے ہیں لہٰذا عددی اقلیت کی بنیاد پر کسی گروہ کو حقوق سے محروم نہیں کیا

---

(۱) (الروم/۲۲)

(۲) الحجرات/۱۳

(۳) النساء/۱

جا سکتا اور معاشرتی سطح پر ان کی تحقیر نہیں کی جا سکتی۔ اسلامی ریاست چونکہ محدود معنوں میں قومی ریاست نہیں ہے اس لئے اس میں اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر حقوق و فرائض کا تعین نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ اس بات کے خلاف ہے کہ اکثریتی گروہ کی نسلی شناخت کو قومی شناخت کا نام دے کر باقی تمام گروہوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس شناخت کو اپنا کر اپنی شناخت کو ختم کر دیں۔ یہ شناختیں فطری ہیں اور انہیں پہچان کا ذریعہ رہنا چاہیے۔ اس مسئلہ پر اسلام قومی ریاستوں سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے اور وہ اسے نسلی امتیاز کی پالیسی سمجھتا ہے جو وسیع تر انسانی مفادات کے لئے مہلک ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں نسلی امتیاز و تفریق کی اس پالیسی کی ہمیشہ کے لئے نفی کر دی اور مسلمانوں کو یہ اشارہ دیا کہ ان کے معاشرے نسلی امتیاز کے نظریہ کو کبھی قبول نہ کریں۔ مسلمانوں کے اقتدار کی طویل تاریخ میں مختلف قبائل اختلاف کرتے بلکہ جنگ و جدل میں بھی مصروف رہے لیکن اقتدار کی اس اکھاڑ پچھاڑ میں کبھی بھی نسلی بنیاد نے نظریہ کی صورت نہیں اختیار کی۔ یہ مغربی استعمار کی ایجاد اور مسلمانوں کے خلاف ایک تخریبی ہتھیار ہے۔ اقبال نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کا شانۂ دین نبوی ہے
بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے (۴)

نسلی اقلیت و اکثریت کا فتنہ امت مسلمہ کے لئے مہلک ہے۔ اسے استعمار نے مسلمانوں میں انتشار اور ان کی متحدہ قومیت کو توڑنے کے لئے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ مغربی معاشروں میں انہیں نسلی لسانی گروہ قرار دے کر ان کے اسلامی تشخص کو تباہ کرنے کی منصوبہ بندی کی ہے۔ مغرب میں انہیں ایشیائی قرار دے کر ہندوؤں، سکھوں اور دوسری کافر قومیتوں کے ساتھ نتھی کر دیا ہے تاکہ ان کی اگلی نسلیں اسلامی تشخص کا حوالہ بھول جائیں اور وسیع تر کافرانہ روایت و ثقافت میں گم ہو جائیں۔

اسلام اور مذہبی اقلیتیں

اسلام کے نزدیک انسان کی اصلی شناخت اپنے خالق سے اس کا تعلق ہے۔ اللہ کی معرفت، اس کے احکام کی پابندی، اس کے اوامر و نواہی کا خیال، اس کی توحید کا اقرار، اس کے رسولوں پر ایمان اور بالخصوص خاتم النبیین محمد کریم ﷺ کی نبوت و رسالت پر یقین، جوابدہی کے تصور کا شعور اور اسلام کے ضابطہ اخلاق کی پابندی وہ عناصر ہیں جن سے ایک انسان کی روحانی شناخت متعین ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام مادی اور ظاہری شناختوں کو عارضی سمجھتا ہے اس لئے ان پر کسی تفریق و امتیاز کی بنیاد رکھنا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ قرآن انسانوں کی دو قسمیں قرار دیتا ہے ایک مومن و مسلم اور دوسرے

---

(۴) بانگ درا/ ۲۲۷

کافر و مشرک۔ دنیا و آخرت کی فلاح کا دارومدار ایمان و کفر کے رویوں پر ہے۔ قرآن کا موقف واضح اور صریح ہے۔ کسی مداہنت اور کسی لگی لپٹی کے بغیر وہ ایمان و کفر کی واضح تقسیم کی بات کرتا ہے۔

هُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّمِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ (۵)

وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔

ایمان اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق کی اساس ہے جب کہ کفر طاغوت کی سرپرستی میں جانے کا نام ہے۔ قرآن ان دونوں رویوں کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ قَدۡتَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَا انۡفِصَامَ لَہَا وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ○ (۶)

دین میں زبردستی نہیں ہے ہدایت واضح طور پر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص طاغوت سے اعتقاد نہ رکھے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سنتا اور جانتا ہے جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست اللہ ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید وضاحت کے ساتھ ان کی مختلف حیثیتوں کو بیان کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا لَا یَسۡتَوٗنَ ○ اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی نُزُلًا بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىہُمُ النَّارُ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡہَا وَقِیۡلَ لَہُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ (۷)

بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے باغ ہیں۔ یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے لئے دوزخ ہے جب چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ

---

(۵) التغابن/۲

(۶) البقرۃ/۲۵۶-۲۵۷

(۷) السجدہ/۱۸-۲۰

جس دوزخ کے عذاب کو تم جھوٹ سمجھتے تھے اس کے مزے چکھو۔

لَا يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۸)

اہل دوزخ اور اہل جنت برابر نہیں اہل جنت تو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

قرآن مجید ایمان اور کفر کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کرتا ہے۔ دنیوی زندگی میں ان کے مختلف رویوں کی وجہ سے آخرت میں ان کی حیثیتوں کو بیان کرتا ہے۔ بلاشبہ دنیوی زندگی میں وہ انسانوں کے کفر کی وجہ سے فوری سزا نہیں دیتا' انہیں مہلت دیتا ہے' ان کے رزق اور ان کی آسائشوں میں رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ بسا اوقات انہیں دنیاوی وسائل کی فراوانی ارزاں کرتا ہے۔ دنیا کی سہولتوں کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو وہ دنیا دیتا ہے اور آخرت طلب کرنے والوں کو آخرت کی سہولت اور نعمت عطا کرتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (۹)

جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں پھر اس کے لئے جہنم کو مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ نفرین سن کر اور راندۂ درگاہ رب ہو کر داخل ہو گا اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ اور اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے اس لئے وہ اپنے شہریوں کو نظریاتی نقطۂ نظر سے ہی دیکھتی ہے۔ وہ لوگ جو اس نظریہ کو مانتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی گذارتے ہیں اور وہ جو اس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو کسی اور اصول کے مطابق گذارنا چاہتے ہیں ایک جیسے نہیں قرار دئے جا سکتے۔ اسلامی معاشرہ اپنے تمام شہریوں کو اپنے نظریے کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی دیتا ہے اور ان کے اس حق کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس نظریاتی معاشرے کی تنظیم اور حفاظت کا تعلق ہے اس کی ذمہ داری صرف ان شہریوں پر ڈالتا ہے جو اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ بات غیر منطقی بھی نہیں کیونکہ کوئی سیکولر ریاست اس کی تنظیم کے لئے کسی مذہبی آدمی کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ ریاست کی تنظیم سیکولر اصولوں اور ملک کے دستور کی بجائے اپنی مرضی یا مذہبی اصولوں کے مطابق کرے۔ درحقیقت تمام سیکولر ریاستوں میں مذہب یا مذہبی گروہوں کو ریاست کے کاروبار سے الگ رکھنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اسلام منافقانہ طور پر مساویانہ مواقع کی بات نہیں کرتا کہ خفیہ طور پر اس کے خلاف منصوبہ بندی کرے۔ اسلامی ریاست ان تمام لوگوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی جو اسلام کو نہیں مانتے۔ یہودی' عیسائی' ہندو' بدھ' پارسی'

---

(۸) الحشر/۲۰

(۹) بنی اسرائیل/۱۸۔۱۹

بہائی، قادیانی وہ گروہ ہیں جو مسلمان معاشروں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ وہ مذہبی گروہ قرار پاتے ہیں جو مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اور ان کے شرعی اور عمرانی علوم میں کبھی بھی اقلیت کی اصطلاح نہیں استعمال ہوئی۔ ہمیشہ ایک مذہبی گروہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ اگر ہم جدید سیاسی اصطلاح استعمال کریں تو یہ مذہبی گروہ مذہبی اقلیت قرار پائیں گے۔ اسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے غیر مسلم شہریوں کے وجود اور حقوق کو تسلیم کیا ہے۔ ان کے لئے حدود و قیود متعین کئے ہیں اور قانونی ضابطے وضع کئے ہیں۔ اس دنیا میں ایسے مذاہب موجود ہیں جن کے ہاں غیروں (Others) کے لئے کوئی حقوق نہیں حتیٰ کہ زندگی کا حق بھی نہیں ہے۔ ان کے ہاں صرف ایک ہی عزت کا راستہ ہے اور وہ اس مذہب و نظریہ کو قبول کرنا ہے۔ ورنہ صفحۂ ہستی سے مٹ جانا یا ذلت کی زندگی ہے۔ یہ اسلام کا احسان ہے کہ اس نے دوسرے معاشروں کو غیروں (Others) کے بارے میں ایک باعزت طریقہ اختیار کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ آج سیکولر معاشرے غیروں Others) کے لئے منافقانہ طور پر عزت کے جو ضابطے طے کر رہے ہیں وہ اسلام نے حقیقی معنوں میں نافذ کر رکھے ہیں۔ قرآن نے یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکین کا باقاعدہ تذکرہ کیا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کو خصوصی مقام دے کر اہل کتاب قرار دیا ہے۔ یہودیوں کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جو میثاق مدینہ کے عنوان سے اسلامی تاریخ کا خصوصی باب ہے۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کا طرز عمل اور پھر مفتوحہ علاقوں میں عیسائیوں کے ساتھ خصوصی سلوک مسلم تاریخ کا شاندار حصہ ہے۔ بعد کے مسلمانوں نے مختلف علاقوں کی مذہبی کمیونیٹیز کے ساتھ اہل کتاب ہی کے حوالے سے برتاؤ کیا۔

پہلی اسلامی ریاست کو جن غیر مسلموں سے براہ راست واسطہ پڑا تھا وہ دو قسم کے تھے ایک وہ جو الٰہی ہدایت کے کسی نہ کسی طور قائل تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ ان میں یہودی اور عیسائی آتے تھے۔ انہیں قرآن نے کافروں کی مستقل صنف قرار دیا اور اہل الکتاب کے نام سے تعبیر کیا۔ دوسرے مشرکین عرب تھے جو توحید الوہیت کے منکر اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ قرآن نے دونوں کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت سے کہا:

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ○ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ○ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ○ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ○ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ○ (۱۰)

جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک (کفر سے) باز رہنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ

---

(۱۰) البینہ/۱۔۶

آتی۔ اللہ کی طرف سے رسول ﷺ جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جس میں مستحکم تحریریں ہیں اور اہل کتاب جو متفرق ہوئے ہیں تو واضح دلیل آنے کے بعد ہوئے ہیں۔ اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاص عمل کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے۔ اور جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب اور مشرک وہ دوزخ کی آگ میں ہونگے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔

ان میں سے مشرکین تو رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ برسرپیکار تھے اور اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کے بارے میں تو واضح پالیسی تھی کہ ان کی بقاء کا دارومدار اسلام کو قبول کرنے پر تھا ان کے لئے کوئی اور راستہ نہ تھا شرک اسلام کے وجود سے متصادم ہے اس لئے انہیں مہلت دی گئی کہ اسلام قبول کر دیا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

سورۃ توبہ میں ان کے لئے جو اعلان کیا گیا وہ پالیسی بیان (Policy statement) ہے۔ ان کو موقعہ دیا گیا کہ چار مہینے کی مہلت ہے اس کے بعد اسلام یا جنگ کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول اکرم ﷺ اور آپ کے رفقاء کو نہ صرف مکہ سے نکالا تھا بلکہ مدینہ میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور مسلسل جارحانہ کاروائیوں سے حالت جنگ پیدا کئے رکھی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝(۱۱)

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے مشرکوں سے، جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا، بیزاری اور جنگ کی تیاری ہے۔ تو (تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہ کر سکو گے۔ اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی۔ پس تم اگر توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر نہ مانو تو جان رکھو کہ تم اللہ کو ہرا نہ سکو گے اور آپ کافروں کو دکھ دینے والی خبر سنا دیں۔ البتہ جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا ہو اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور

(۱۱) التوبہ/۱۔۵

نہ کیا ہو اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی ہو تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو اسے پورا کرو۔ اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ جب عزت کے مہینے گذر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد کتب حدیث میں منقول ہے:

عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله: امرت ان قاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الّا الله وان محمد رسول الله ويقيموا الصلوة ويوتوالزكوة فاذا فعلوا ذلك عصموا منى دماء هم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله (۱۲)

ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں جب تک وہ یہ شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو ان کے خون اور مال محفوظ ہوں گے مگر حق اسلام کے بدلے اور ان کا حساب اللہ کے ہاں ہے۔

یہ حدیث خصوصی طور پر مشرکین عرب سے متعلق ہے کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا تھا اور عملاً اسلام کو ختم کرنے اور رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اس لئے مشرکین عرب کا معاملہ خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ سورۃ توبہ کے احکام کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لیکن یہ احکام اور یہ معاملہ...... مشرکین بنی اسمٰعیل یا مشرکین عرب کے لئے خاص تھے اور اس تخصیص کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انہی کے اندر ایک نبی معبوث فرما کر اپنی حجت ان پر براہ راست قائم کر دی تھی۔ باقی رہے عام غیر مسلم جن پر دین حق کی حجت بالواسطہ طور پر پوری کی گئی ہے اور جن کو اتمام حجت کے پہلو سے وہ امتیازات حاصل نہیں رہے ہیں جو خاص آنحضرت ﷺ کی قوم کو حاصل رہے ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا۔ (۱۳)

اہل کتاب کے ساتھ خاص معاملہ کیا گیا۔ انہیں اسلامی ریاست کے شہری کے طور پر تسلیم کیا گیا اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ اس کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔ اہل کتاب یہودی اور عیسائی ہیں۔ قرآن مجید نے اہل الکتاب کی اصطلاح دونوں کے لئے استعمال کی ہے۔ اور دونوں کو الگ گروہوں کی حیثیت سے بھی خطاب کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

يَـٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَـٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوۡرَىٰةُ وَٱلۡإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِهِۦٓ

---

(۱۲) بخاری، کتاب الایمان، باب فان تابوا...... ۱/۱۱؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس، ۱/۱۰۲

(۱۳) اسلامی ریاست/ ۱۸۹-۹۰

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O (۱۴)

اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد اتری ہیں تو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ O (۱۵)

کہو اے اہل کتاب جب تک تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم لوگوں پر نازل ہوا ان کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں:

فاما اليهود والنصارى فهم المراد باهل الكتاب بالاتفاق (۱۶)

جہاں تک یہود و نصاریٰ کا تعلق ہے تو اہل کتاب سے بالاتفاق یہی لوگ مراد ہیں۔

ابن عابدین نے کتابی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

من يعتقد دينا سماويا اى منزلا بكتاب كاليهود والنصارى (۱۷)

کتابی وہ شخص ہے جو آسمانی دین بھی یعنی وہ کتاب منزل پر اعتقاد رکھتا ہو جیسے یہود و نصاریٰ۔

شبہ اہل الکتاب

کچھ گروہ ایسے ہیں جنہیں شبہ اہل الکتاب قرار دیا گیا ہے۔ جیسے مجوسی۔ تاہم مجوسیوں کے بارے میں فقہاء کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

(i) ایک رائے یہ ہے کہ وہ اہل کتاب تھے لیکن بعد میں یہ کتاب اٹھالی گئی لہٰذا یہ بت پرستوں سے مختلف ہیں اور یہود و نصاریٰ سے بھی۔ تاہم انہیں اہل کتاب ہی شمار کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ اور امام ابن حزمؒ کی یہی رائے ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی اسی مفہوم کی روایت منقول ہے۔

امام شافعیؒ اور عبدالرزاقؒ وغیرہ نے حسنؓ کے ذریعہ علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ علیؓ نے فرمایا:

---

(۱۴) آل عمران/ ۶۵

(۱۵) المائدہ/ ۶۸

(۱۶) نیل الاوطار، ۸/ ۶۰

(۱۷) رد المحتار، ۳/ ۱۹۹

"أنا أعلم الناس بالمجوس' كان لهم علم يعلمونه' وكتاب يدرسونه' وانما ملكهم سكر فوقع على ابنته أواخته' فاطلع عليه اهل مملكته' فلما صحا خاف ان يقيموا عليه الحد' فامتنع منهم' فدعا اهل مملكته' فلما اتوه قال: تعلمون دينا خيراً من دين آدم' وقد ينكح بنيه وبناته' وانا على دين آدم' مايرغب بكم عن دينه؟ فتابعوه' وقاتلوا الذين خالفوه حتى قتلوهم' فاصبحوا وقداسری علی کتابهم فرفع بين اظهرهم' وذهب العلم الذی فی صدورهم' فهم اهل كتاب"(۱۸)

میں مجوسیوں کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ ان کے ہاں علم تھا جسے وہ جانتے تھے اور کتاب تھی جسے پڑھتے تھے۔ ان کا ایک بادشاہ تھا جس نے نشے کی حالت میں بیٹی یا بہن سے جماع کیا۔ اہل مملکت کو اس کا پتہ چل گیا تو اسے خوف ہوا کہ اس کو سزا نہ ملے' کچھ دیر الگ رہا اور پھر اہل مملکت کو بلایا۔ جب وہ آئے تو انہیں کہا کہ آدمؑ کے دین سے بہتر دین کو جانتے ہو وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا نکاح کرتے تھے۔ میں آدمؑ کے دین پر ہوں۔ تمہیں اس کے دین سے کیا چیز مانع ہے سو انہوں نے اس کی پیروی کی اور جن لوگوں نے مخالفت کی ان سے جنگ کی اور انہیں قتل کیا اسی دوران ان کی کتاب ان کے درمیان سے اٹھالی گئی اور وہ علم جو ان کے سینوں میں تھا غائب ہو گیا۔ سو یہ لوگ اہل کتاب ہیں۔ (۱۹)

امام شافعیؒ اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے انہیں اہل کتاب کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے۔

(ii) جمہور اہل علم انہیں اہل کتاب نہیں مانتے۔ امام شافعیؒ بھی ایک قول کے مطابق اس کی تائید کرتے ہیں۔ ان کا مدار استدلال یہ ہے کہ عمرؓ مجوسیوں سے جزیہ لینے کے حق میں نہیں تھے جب تک عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے شہادت نہ دی کہ:

إن رسول اللهﷺ اخذ هامن مجوسی هجر (۲۰)

رسول اللہﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قال: انی اشهدلسمعت رسول اللهﷺ يقول: سنوا بهم سنة اهل كتاب غير نالكحی سائهم ولا اكلی ذبائحهم (۲۱)

---

(۱۸) کتاب الام، ۴/۹۶؛ نیل الاوطار، ۸/۶۰؛ کتاب الخراج/۱۲۹-۱۳۰، امام یوسف نے اس روایت کو قدرے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(۱۹) کتاب الام، ۴/۹۶

(۲۰) ایضاً؛ المہذب ۲/۲۵۱، المحلی، ۷/۳۴۵

(۲۱) بخاری، ۲/۱۳۱؛ ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، ۵/۲۱۱؛ ابوداؤد، ۲/۱۵؛ نیل الاوطار، ۸/۵۹

انہوں نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے: ان کے بارے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کرو البتہ ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرنا اور ان کا ذبیحہ نہ کھانا۔

امام مالکؒ نے ابن شہابؒ سے نقل کیا ہے کہ:

قال بلغنی ان رسول اللہ ﷺ اخذ الجزیۃ من مجوسی البحرین وان عمرؓ بن الخطاب أخذ من مجوسی فارس وان عثمان بن عفان اخذ ھا من البربر(۲۲)

وہ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے مجوسیوں سے جزیہ لیا اور عمرؓ بن الخطاب نے ایران کے مجوسیوں سے جزیہ لیا اور عثمانؓ نے بربروں سے جزیہ لیا۔

قرآن مجید نے بھی اہل کتاب میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ہی ذکر کیا ہے۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ○(۲۳)

یہ قرآن اسی لئے اتارا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے دو ہی گروہوں پر کتابیں اتری ہیں اور ہم ان کے پڑھنے سے بے خبر تھے۔

جمہور اہل علم کی رائے یہی ہے کہ یہ شبہ اہل الکتاب ہیں کیونکہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت کے مطابق بھی حضور اکرم ﷺ نے ان کی عورتوں سے نکاح کرنے اور ان کے ذبائح کھانے سے منع کیا۔ امام شافعیؒ اور ابن حزمؒ اگرچہ مجوس کو اہل کتاب کہتے ہیں لیکن وہ کتابی ہونے کے تصور کو یہیں تک محدود کرتے ہیں اور مجوسی کے علاوہ کسی اور گروہ کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے عمرؓ کے اقدام سے اختلاف نہیں کیا اس لئے مجوسیوں کے بارے میں عمرؓ کے فیصلے پر اجماع صحابہؓ ثابت ہوتا ہے۔ شہرستانی نے بھی مجوس کا ذکر اہل کتاب کی حیثیت سے کیا ہے۔(۲۴) بعض حضرات مجوسیوں کو اہل الذمہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے۔ امام ابو یوسفؒ نے نقل کیا ہے۔ کہ فروہ بن نوفل اشجعی نے کہا کہ یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ مجوسیوں سے جزیہ لیا جا رہا ہے جب کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ اس پر مستورد بن الاحنف نے کھڑے ہو کر کہا تم رسول اللہ ﷺ پر الزام لگا رہے ہو توبہ کرو ورنہ میں قتل کر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے جزیہ وصول کیا۔ معاملہ علیؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس پر انہوں نے کتاب اٹھائے جانے والا قصہ بیان کیا۔(۲۵) ابو عبیدؒ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کا قول نقل کیا ہے کہ:

---

(۲۲) الموطا/۱۸۷

(۲۳) الانعام/۱۵۶،۱۵۷۔

(۲۴) الملل والنحل،۱/۸۴

(۲۵) کتاب الخراج/۱۲۹

لولانی رأیتُ اَصحَابی یَاخُذُون مِنَ المُجوس جزیَۃ مَا اَخَذتُھا (۲۶)

اگر میں نے صحابہؓ کو مجوسوں سے جزیہ وصول کرتے نہ دیکھا ہوتا تو میں وصول نہ کرتا۔

شبہ اہل کتاب کی توسیع

کیا یہ ممکن ہے کہ شبہ اہل کتاب کے تصور کو وسیع تر کیا جائے اور اس میں وہ تمام کفار و مشرکین آ جائیں جو غیر عرب ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا اصلاحی کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان میں سے جو اسلام کی اصطلاح کے لحاظ سے صریحی اہل کتاب تھے مثلاً یہودی اور عیسائی' وہ تو بہر حال اس سلوک کے مستحق تھے ہی کیونکہ خود قرآن ہی نے ان کو بنی اسمٰعیل کے بالمقابل ایک امتیازی سلوک کا مستحق قرار دیا تھا اور ان سے متعلق ساری پالیسی پوری تفصیل کے ساتھ عہد رسالتؐ میں ہی طے پا چکی تھی باقی جو صریحی اہل کتاب نہیں تھے۔ (۲۷) مثلاً مجوسی' جب وہ اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آئے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال سامنے آیا تو خود پیغمبرؐ ہی کے ایک ارشاد نے اس مسئلہ کو طے کر دیا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے بعد صابئین اور بربروں کا مسئلہ سامنے آیا اور باتفاق صحابہ و علماء وہ بھی اسی درجے میں رکھے گئے یہاں تک کہ پوری امت کے اجماع و اتفاق سے یہ بات طے ہو گئی کہ عجم کے تمام غیر مسلم خواہ ان کی عملی و اعتقادی گمراہیوں کی نوعیت کچھ بھی ہو' جب وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی میں آئیں گے تو ان کا سیاسی درجہ وہی ہو گا جو قرآن نے اہل کتاب کو دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں ان کو یہ درجہ اس لئے حاصل ہو گا کہ اسلامی قانون کی رو سے وہ اسی درجے کے از روئے نص حقدار ہیں اور جو اہل کتاب نہیں ہیں وہ اس وجہ سے اس درجہ کے مستحق قرار پائیں گے کہ وہ مشابہ اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب اور مشابہ اہل کتاب میں اگر کوئی فرق کیا گیا ہے تو صرف اس دائرے کے اندر کیا گیا ہے جو ان کے ذبیحہ کے کھانے اور نہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے اور نہ کرنے سے متعلق ہے۔ ان کے سیاسی اور مدنی حقوق میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک عیسائی' ایک ہندو اور ایک پارسی سب برابر ہیں۔ (۲۸)

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت سے یہ بعید ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس سے محروم رہی ہو۔
وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ○ (۲۹) یعنی کوئی امت جس میں خبر دار کرنے والا نہ گزر چکا ہو۔

---

(۲۶) کتاب الاموال/۳۶

(۲۷) مولانا اصلاحی ان کے لئے مشابہ اہل کتاب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

(۲۸) اسلامی ریاست/۱۹۰-۱۹۱

(۲۹) فاطر/۲۴

قرآنی بیان ہے جو ہدایت کی عالمگیریت پر دلالت کرتا ہے۔ **ولکل قوم ھاد** (۳۰) (یعنی قوم کے لئے ایک ہادی آیا) ۔کو سامنے رکھا جائے تو تمام قوموں کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان کے پاس ہدایت آئی ہوگی جسے انہوں نے یا تو ضائع کردیا یا اس میں خود ساختہ چیزیں ملادیں اور یا اس کے اندر مکمل ردوبدل کردیا۔اس لئے فقہاء اسلام کا یہ فیصلہ کہ عجم کے تمام غیر مسلموں کو مشابہ اہل کتاب قرار دیا جائے' حکمت پر مبنی ہے مسلمانوں کو ہمیشہ تکثیری (Plural) معاشرے کا تجربہ رہا ہے اس لئے شرعی طور پر رویے کے تعین سے قواعد وضوابط اور باہمی تعلقات وروابط میں سہولت پیدا ہوئی۔اب مسلمانوں کو دوسری اقوام کی بہ نسبت غیروں سے متعلق معاشرتی وسیاسی سطح پر ضابطہ سازی کی سہولت حاصل ہے۔عرب سے باہر مسلمان جہاں جہاں گئے انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ شبہ اہل کتاب کا تعامل کیا۔جب محمد بن قاسمؒ نے سندھ اور ملتان کے علاقے فتح کئے تو ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ زیر غور آیا۔محمد بن قاسم کی فوج میں بڑی تعداد تابعینؒ کی تھی ان میں بعض صحابہ کرامؓ بھی تھے۔ان سب نے بالاتفاق مشورہ دیا کہ ہندوستان کے بت پرست غیر مسلموں کو شبہ اہل کتاب کی حیثیت دی جائے۔یعنی ان کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے اور ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے۔(۳۱) یہ رویہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت

روایتی طور پر اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کی بقول سید مودودیؒ تین اقسام تھیں اور مسلمان معاشروں نے اسی تقسیم کے مطابق ان سے معاملہ کیا۔اسلامی قانون انہیں جن اقسام مین تقسیم کرتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(i) وہ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعہ اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں۔

(ii) دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں۔

(iii) تیسرے وہ جو جنگ اور صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں رہ رہے ہوں جیسے مستامنین وغیرہ۔ان میں ایک اور قسم بھی شامل کرلیں تو چار اقسام بن جائیں گی۔

(iv) وہ لوگ جو اسلام سے ارتداد اختیار کرکے کسی اور مذہب کو اپنالیں۔

اسلام کے قوانین صلح وجنگ کے لحاظ سے یہ پہلے تینوں گروہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق بھی ہے البتہ چوتھے گروہ کے احکام مختلف ہیں۔

---

(۳۰) الرعد/۷

(۳۱) خطبات بہاولپور،۲۲۴

معاہدین وہ لوگ ہیں جو جنگ کے بغیر یا دوران جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور اسلامی حکومت سے مخصوص شرائط طے کر کے معاہدہ کرلیں ان کے لئے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہیں۔ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا غیر مرغوب) ان شرائط سے سرمو تجاوز نہ کیا جائے بلالحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت وقوت (Relative Position) میں کتنا ہی فرق آ جائے۔ (۳۲) حضور اکرم ﷺ سے منقول ہے:

لعلكم تقاتلون قوماً تظهرون عليهم فيتقونكم باموالهم دون انفسهم و ابناء هم (و فی رواية فيصالحونكم على صلح) فلا تصيبوا منهم فوق ذلك فانه لا يصلح لكم (۳۳)

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آ جاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کر لے (ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم سے صلح نامہ طے کر لے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے جائز نہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد منقول ہے!

الا من ظلم معاهداً اوانتقصه اوكلّفه فوق طاقته أواخذ منه شيئاً بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة (۳۴)

خبردار جو شخص کسی معاہدہ پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر دباؤ ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔

- سید مودودیؒ ان احادیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلح نامہ میں جو شرائط طے ہو جائیں ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج بڑھایا جا سکتا ہے' نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے' نہ ان کی عمارتیں چھینی جا سکتی ہیں' نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کئے جا سکتے ہیں' نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جا سکتا ہے' نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جا سکتا ہے جو ظلم یا انتقاص یا تکلیف مالایطاق' اخذ بغیر طيب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً فتح ہونے

---

(۳۲) اسلامی ریاست/۳۴۲

(۳۳) ابوداؤد، کتاب الخراج، باب تعشیر اہل الذمۃ/ ۴۴۷

(۳۴) ایضاً/ ۴۴۶

والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدون نہیں کئے ہیں اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔(۳۵) امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

یوخذ منهم ما صولحوا علیه و یوفی لهم ولا یزاد علیهم (۳۶)

ان سے وہی لیا جائے گا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے۔ ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائیں گی اور ان پر کچھ اضافہ نہ کیا جائے گا۔

معاہدین کے سلسلے میں تفصیلات ابو عبید قاسم ابن سلامؒ کی کتاب الاموال میں موجود ہیں۔ مولانا اصلاحی کے بقول: خلفائے راشدین کے زمانہ ہی میں بہت سے مقامات اسلامی حکومت کے دائرہ اختیار میں آ چکے تھے جو بلاد الصلح (Protectorates) کے حکم میں داخل تھے مثلاً ہجر، بحرین، ایلہ، دومۃ الجندل، اذرح، بیت المقدس، دمشق، شام کے اکثر شہر (ملک کو مستثنیٰ کر کے) بلاد جزیرہ مصر، خراسان (اکثر حصہ) ان تمام مقامات کے باشندوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاملات تمام تر معاہدات پر قائم تھے جن کی نسبت ابو عبید قاسمؒ نے لکھا ہے کہ:

فهؤلاء علی شروطهم لا یحال بینهم وبینها (۳۷)

یعنی ان کے ساتھ ان شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائے گا جو ان کے ساتھ طے پا چکے ہیں۔ اس کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔(۳۸)

مفتوحین

دوسری قسم کے غیر مسلم وہ ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے اور اس وقت ہتھیار ڈالے جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہو گئیں۔ یہ مفتوحین جب ذمی بنائے جاتے ہیں تو انہیں چند حقوق دیئے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان احکام کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔ جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت واضح ہوتی ہے۔(۳۹)

(i) جب امام ان سے جزیہ قبول کر لے تو ہمیشہ کے لئے عقد ذمہ قائم ہو جائے گا اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ عصمت نفس و مال ثابت ہو جاتی ہے۔(۴۰) اس کے بعد امام کو

---

(۳۵) اسلامی ریاست/۳۴۴

(۳۶) کتاب الخراج/۳۵

(۳۷) کتاب الاموال/۱۰۱

(۳۸) اسلامی ریاست/۱۹

(۳۹) اسلامی ریاست/۳۴۵

یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انہیں غلام بنالیں۔ سیدنا عمرؓ نے عبیدہؓ کو صاف لکھا تھا:

فاذا اخذت منهم الجزية فلا شئى لك عليهم ولاسبيل (۴۱)

جب تم ان سے جزیہ قبول کرلو تو پھر تم کو ان کے خلاف کسی اقدام کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

(ii) عقد ذمہ قائم ہونے کے بعد اپنی زمینوں کے مالک وہی ہوں گے' ان کی ملکیت ان کے ورثاء کو منتقل ہوگی اور ان کو اپنے املاک میں بیع' ہبہ اور رہن وغیرہ کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی حکومت کو انہیں بے دخل کرنے کا حق نہ ہوگا۔ (۴۲) یہ بات بنیادی طور پر معاہدین کے لئے ہے کیونکہ عمرؓ کے زمانہ میں مفتوحین کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہیں کی گئی تھیں۔ وہ بدستور مفتوحین کے قبضہ میں رہیں اور وہ خراج ادا کرتے رہے۔ البتہ ان کا قبضہ مستقل تصور ہوگا اور حکومت انہیں بے دخل نہیں کر سکے گی اور وہ اس میں وہی تصرف کر سکیں گے جو ملکیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے یعنی قبضہ کا انتقال بیع رہن اور ھبہ وغیرہ۔ (۴۳)

(iii) جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی جو مال دار ہیں ان سے زیادہ' جو متوسط الحال ہیں ان سے کم اور جو غریب ہیں ان سے بہت کم لیا جائے گا اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے ان کو جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم مقرر نہیں ہے لیکن اس کے تعین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا اس کے لئے آسان ہو۔ سیدنا عمرؓ نے مالداروں پر اڑتالیس درہم سالانہ' متوسط الحال لوگوں پر چوبیس درہم سالانہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر بارہ درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔ (۴۴)

(iv) جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائے گا جو اہل قتال (Combatant) ہیں۔ غیر اہل قتال مثلاً بچے' عورتیں' دیوانے' اندھے' اپاہج' عبادت گاہوں کے خادم' راہب' از کاررفتہ بوڑھے' ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصے تک ممتد ہو جائے اور باندی غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ (۴۵)

(v) بزور شمشیر فتح ہونے والے شہر کے معاہدے پر مسلمانوں کو قبضہ لینے کا حق ہے لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور

---

(۴۰) بدائع الصنائع ۷/۱۱۱

(۴۱) کتاب الخراج، فصل الکنائس/۸۴

(۴۲) فتح القدیر، ۳/۳۵۹

(۴۳) کتاب الاموال/۸۴

(۴۴) کتاب الخراج، فصل فیمن تجب الجزیۃ/۱۲۲

بطریق احسان ان کو علی حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ سیدنا عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے ان میں کوئی معبد نہیں توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

ترکت علی حالھا ولم تھدم و لم تیعرض لھا (۴۶)

ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔

فقہا نے وضاحت سے لکھا ہے کہ قدیم معابد کو مسمار کرنا ناجائز ہے۔ (۴۷) اس کے مقابلے میں مغربی استعمار کی فتوحات اور قبضوں کو دیکھیں، ان کے رویوں قوانین اور معاملات کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ انسانی قدریں کہاں محفوظ ہیں؟

جنگ و صلح کے علاوہ کسی اور صورت میں شامل ہونے والے غیر مسلم

ان کے لئے وہ تمام حقوق ہوں گے جو دوسری قسم کے ذمیوں کو دیئے گئے ہوں لیکن اسلامی ریاست حالات کی مناسبت سے مزید رعایتیں بھی دے سکتی ہے۔ اس وقت مسلمان ریاستوں میں جو غیر مسلم رہ رہے ہیں وہ اس تیسری قسم کے تحت آتے ہیں لہٰذا ان کو شخصی معاملات میں آزادی دے کر باقی تمام امور میں برابر شہری حقوق دیئے جا سکتے ہیں۔ البتہ کلیدی اسامیوں پر تعیناتی کا مسئلہ کلاسیکی رائے کے مطابق اختیار کیا جائے گا کیونکہ اس پر اجماع ہے اور مسلمانوں کے عملی تواتر کا اظہار ہے۔ اسلامی ریاست سیکولر ریاستوں کی طرح سیاسی مساوات کا منافقانہ اعلان نہیں کر سکتی۔ وہ جس طرح غیر مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کے شخصی معاملات و قوانین کے نفاذ کو ضروری سمجھتی ہے اس طرح اپنی حدود میں غیر مسلموں کے لئے ان کے شخصی معاملات کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتی ہے۔ مولانا اصلاحیؒ پاکستان کے غیر مسلموں کو معاہدین میں شمار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: اب اس سوال پر غور کیجئے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ ان کی حیثیت معاہد اہل ذمہ کی قرار پائے گی یا ان کو مفتوح اہل الذمہ کے حکم میں رکھا جائے گا؟ اس سوال کا جواب متعین ہو جانے کے بعد ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو مفتوح اہل الذمہ قرار دینے کے لئے کوئی معمولی سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ نہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کوئی جنگ کی ہے اور نہ حکومت پاکستان نے ان کو بزور شمشیر مغلوب کیا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے لازمی نتیجہ کے طور پر پاکستان کے حصہ میں آئے ہیں اور اس تقسیم کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں کے باہمی راضی نامہ سے ہوئی ہے، نہ کسی جنگی فتح و تسخیر کے ذریعہ سے۔ اس وجہ سے تنہا یہی بات کہ یہ غیر مسلم ایک

---

(۴۵) بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱، فتح القدیر، ۴/۷۳-۴۷۲، کتاب الخراج/۷۳

(۴۶) کتاب الخراج، فصل فی الکنائس/۱۴۱

(۴۷) بدائع الصنائع، ۷/۱۱۴

باہمی راضی نامہ کے تحت ہمارے ساتھ شامل ہوئے ہیں اس امر کے لئے کافی ہے کہ ان کو مفتوح و مغلوب رعایا کے زمرہ میں نہ رکھا جائے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو ان کے معاملہ میں قابل لحاظ ہیں اور جن کی بنا پر ان کا معاہد ہونا بالکل متعین اور طے ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

(i) یہ کہ ابتدا سے اب تک اس ملک کے تمام ذمہ دار لیڈر متفق اللفظ ہو کر ان کو اس بات کا یقین دلاتے رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے اندر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف منصفانہ سلوک کیا جائے گا بلکہ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جائے گا۔

(ii) یہ کہ تقسیم کے بعد اس ملک کا نظام چلانے کے لئے عارضی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنایا گیا جس کی رو سے یہ غیر مسلم اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق اسی میں محفوظ کئے گئے ہیں۔

(iii) پھر اس ایکٹ 1935ء کی جگہ جو دستور زیر ترتیب ہے اسے مرتب کرنے کے لئے جو دستور ساز اسمبلی بنائی گئی ہے اس کے غیر مسلم ارکان پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے نمائندے ہیں اور اسمبلی کے ارکان ہونے کی حیثیت سے ان کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اسمبلی کے مسلمان اراکین کو حاصل ہیں۔ (۴۸)

یہ ساری باتیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ یہاں کے غیر مسلموں نے اپنی آزاد مرضی سے اپنے مصالح کے تحت اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور پاکستان کے ارباب حل و عقد نے بحیثیت ایک اقلیت کے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس ذمہ داری اور اعتماد کا تقاضا' اس ملک میں ایک لادینی جمہوری ریاست (Secular Democratic State) کے قیام کی صورت میں تو یہ ہوتا کہ ان کو اس مفہوم میں ایک اقلیت قرار دیا جاتا جو موجودہ زمانہ میں اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے اور ان کے لئے وہی حقوق پاکستان کی کتاب دستور میں درج کئے جاتے جو اس زمانہ کی لادینی ریاستیں اپنے دساتیر (Constitutions) میں بالعموم ضابطہ کے طور پر درج کر دیتی ہیں۔ لیکن چونکہ برعظیم ہند کے مسلمانوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا ہی اس لئے تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں کو لادینیت کے اثرات سے بچا سکیں اس لئے جن غیر مسلموں نے پاکستان میں قیام کو اپنے لئے منتخب کیا انہوں نے یہ انتخاب کیا کہ یہاں کا اجتماعی نظام بہر حال اسلامی ہی ہوگا۔ اس لئے اب ہمیں اسی سوال پر غور کرنا ہے کہ اسلامی نظام کے اندر ہم ان وعدوں اور اعلانات سے کس طرح پوری ایمانداری کے ساتھ عہدہ برا ہو سکتے ہیں جو ہم نے اس ملک کے غیر مسلموں سے کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام کے اندر اس طرح کے غیر مسلموں کی حیثیت جو پاکستان میں ہیں ''معاہد اہل ذمہ'' کی قرار پائے گی اور ان کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس ملک کے دستور

---

(۴۸) یہ واضح رہے کہ کتاب کی یہ فصل ۵۰ء میں لکھی گئی جب پاکستان کا پہلا دستور زیر ترتیب تھا لیکن غیر مسلموں کی دستوری حیثیت بعینہ وہی ہے جو موجودہ دستور میں تسلیم کی گئی ہے۔

میں ان کے حقوق کا تحفظ ہوگا''۔(۴۹)

عام مصنفین نے معاہدین اور اہل صلح کو ایک قسم قرار دیا ہے البتہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اہل صلح کو معاہدین سے الگ ایک مستقل قسم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن سے کوئی جنگ ہو رہی ہو اور جنگ کے کسی واضح نتیجہ پر پہنچنے سے قبل اس کے اختتام سے پہلے ہی ان سے کوئی مستقل یا عارضی مصالحت ہوگئی ہو اور فریقین کے درمیان جنگ بندی ہوگئی ہو۔صلح کی شرائط پر ان سے معاملات طے کئے گئے ہوں۔ان کے لئے عموماً اہل صلح یا موادعین کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔(۵۰)

ڈاکٹر غازی صاحب نے محاربین کے نام سے ایک اور قسم کا ذکر بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

تیسری قسم ان محاربین کی ہے جو دارالاسلام کے باشندے ہوں اور بغیر کسی بنیاد کے جائز اور قانونی حکومت کے خلاف ہتھیار لے کر کھڑے ہوگئے ہوں۔یہ محاربین مسلمان بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔یہ لوگ مسلمان یا غیر مسلم ہوں لیکن ایک چھوٹے گروہ کی صورت میں حکومت وقت سے ٹکرا رہے ہوں اور امن و امان کا مسئلہ اور لوگوں کی جان و مال کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہوں۔اس طرح کے لوگوں کے لئے شریعت میں الگ قوانین و احکام دیئے گئے ہیں۔(۵۱)

سید مودودیؒ نے معاہدین اور مفتوحین کے علاوہ تیسری قسم کو وسیع رکھا ہے جس میں ہر نوع کے غیر مسلم شامل کئے جا سکتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ غیر مسلم اسلامی ریاست کے شہری نہیں بلکہ کسی اور ملک کے باسی ہیں اور مسلمانوں سے برسر جنگ ہیں۔

مرتدین

غیر مسلموں کی ایک انتہائی حساس قسم مرتدین کی ہے۔مرتد وہ شخص ہے جو اسلام کو قبول کرنے کے بعد اسے رد کرے۔وھبہ الزحیلی کے بقول:

تقع الردة بمجرد الرجوع عن الاسلام الى الكفر' سواء كان بالنية ام بالفعل المكفر' ام بالقول. وسواء قال ذلك استهزاء ام عنادًا اواعتقادًا' كمن انكر وجود الخالق' ونفى بعثة الرسل او كذب رسولًا' اوحلل حراماً بالاجماع او حرم حلالا بالاجماع اونفى وجوب مجمع عليه' اواعتقد وجوب ماليس بواجب بالاجماع اوعزم على الكفرا وانكر شيئًا معلوماً من الدين بالضرورة (۵۲)

---

(۴۹) اسلامی ریاست/۲۳۵۔۲۳۷

(۵۰) خطبات بہاولپور/۲۲۴

(۵۱) ایضاً/۲۲۶

(۵۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ،۱۸۳/۶

اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف صرف رجوع کرنے سے ارتداد واقع ہو جاتا ہے۔ کافر اس رجوع کی نیت کرے، اپنے عمل سے اس کا اظہار کرے یا زبان سے اعلان کرے۔ ایسا اس نے مذاق اڑانے کی غرض سے کیا ہو یا دشمنی سے یا عقیدے کے طور پر اظہار کیا ہو مثلاً جب خالق کے وجود کا انکار کیا ہو انبیاء کی بعثت کی نفی کی ہو یا رسولؐ کی تکذیب کی ہو یا اس چیز کو حلال قرار دیا ہو جو بالاجماع حرام ہے اور اسے حرام قرار دیا ہو جو بالاجماع حلال ہے یا اس واجب کی نفی کی ہو جس کے وجوب پر اجماع امت ہے یا ایسے وجوب کا معتقد ہو جو بالاجماع واجب نہیں یا کفر پر پختگی کا اظہار کیا ہو یا کسی ایسی چیز کا انکار کیا ہو جو دین سے بدیہی طور پر معلوم ہو۔

مرتدین کے احکام

مرتدین غیر مسلموں کا جارحیت پسند گروہ ہے اس کو اصولی طور پر محاربین کا حصہ شمار کرنا چاہئے۔ چونکہ ان کی خصوصی حیثیت ہے اس لئے عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں ان کے بارے میں خصوصی بحث کی گئی ہے اور امام بخاری نے کتاب استتابۃ المرتدین و المعاندین کے عنوان سے مستقل باب باندھا ہے۔ (۵۳) امام بخاری نے حکم المرتد والمرتدۃ کے عنوان کے تحت وہ تمام آیات جمع کر دی ہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

وقال ابن عمر والزهری وابراهیم: تقتل المرتدة واستتابتهم وقال الله تعالی:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ○ (۵۴)

اللہ ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور پہلے اس بات کی گواہی دے چکے کہ یہ پیغمبر برحق ہے اور ان کے پاس دلائل بھی آ گئے اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیتا ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہو۔ ہمیشہ اس لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ ہاں جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی حالت درست کر لی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے اور پھر کفر میں بڑھتے گئے ایسوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ

---

(۵۳) بخاری ۴/۱۲۷

(۵۴) آل عمران/۸۶

كٰفِرِيْنَ○(۵۵)

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے کسی فریق کا کہا مان لو گے تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر بنا دیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا○(۵۶)

جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کو اللہ نہ تو بخشے گا اور نہ سیدھا رستہ دکھائے گا۔

مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ○(۵۷)

اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دیگا جن کو درست رکھے اور جسے وہ درست رکھیں اور مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا جاننے والا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ○ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ○ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○(۵۸)

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے۔ وہ نہیں جو کفر پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا اور اس لئے کہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا رکھی ہے اور یہی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت

---

(۵۵) آل عمران/۱۰۰

(۵۶) النساء/۱۳۷

(۵۷) المائدہ/۵۴

(۵۸) النحل/۱۰۶-۱۱۰

میں خسارہ اٹھانے والے ہونگے۔ پھر جن لوگوں نے ایذائیں اٹھانے کے بعد ترک وطن کیا پھر جہاد کئے اور ثابت قدم رہے تمہارا پروردگار ان کو بے شک ان کے بعد بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ۝(۵۹)

اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائیگا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا وآخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

امام بخاریؒ کی نقل کردہ ان آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں دین سے ارتداد کا تذکرہ ہے۔ پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کافر ہمیشہ کوشش کریں گے کہ مسلمانوں میں ارتداد پھیلے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ارتداد کا سبب دنیا کی محبت ہوگی۔ اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ مرتد کے اعمال ضائع جائیں گے اور وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔ کفر ہمیشہ ہر حربہ استعمال کرے گا کہ مسلمانوں کو دین سے بہکائے حتیٰ کہ طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرے گا کیونکہ ایمان کفر اور اس کے سرپرست شیطان کی سرگرمیوں کے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ارتداد کی سخت وعید اور انتہائی سخت سزا سنائی ہے۔ اسی باب میں امام بخاریؒ نے عکرمہؒ کی روایت نقل کی ہے:

قال: أتی علیؓ بزنادقة فاحرقهم فبلغ ذلك ابن عباس فقال: لو كنت انا لم احرقهم لنهی رسول الله ﷺ: لا تعذبوا بعذاب الله ولقتلتهم لقول رسول الله من بدّل دينه فاقتلوه(۶۰)

کہتے ہیں کہ علیؓ کے سامنے زندیق پیش کئے گئے تو آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔ ابن عباسؓ کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو انہیں نہ جلاتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرماتے ہوئے کہا: تم اللہ کے عذاب سے کسی کو سزا نہ دو۔ میں انہیں قتل کرتا کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو دین تبدیل کرے اس کو قتل کردو۔

صدیق اکبرؓ کے زمانے میں جب بعض قبائل نے ارتداد کی راہ اختیار کی تو صدیق اکبرؓ نے ان سے جنگ کی۔ امام بخاریؒ نے اس صورت حال کو ایک روایت میں بیان کیا ہے۔

ان ابا هريرةؓ قال: لما توفی النبی واستخلف ابو بكرؓ وكفر من كفر من العرب قال عمرؓ:

---

(۵۹) البقرہ/۲۱۷

(۶۰) بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین، باب حکم المرتد، ۴/ ۱۳۸؛ ابوداؤد، ۲/ ۴۴۴؛ ترمذی، ۵/ ۲۵؛ ابن ماجہ، ۲/ ۸۴۸، مسند احمد، ۱/ ۲۸۲، نیل الاوطار، ۷/ ۲۰۲

يا ابا بكرؓ! كيف تقاتل الناس وقد قال رسول اللهﷺ: امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله عصم منى ماله ونفسه الا بحقه وحسابه على الله. قال ابو بكرؓ: والله لا قاتلن من فرق بين الصلوة والزكوة فان الزكوة حق المال. والله لو منعوني عنا قا كانوا يؤدونها الى رسول اللهؐ لقاتلتهم على منعها، قال عمرؓ: فوالله ماهو الا ان رأيت أن قد شرح الله صدر ابي بكر للقتال فعرفت انه الحق (٦١)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرمﷺ کا وصال ہوا اور ابو بکرؓ خلیفہ بنے تو عرب قبائل کے لوگوں میں سے جنہوں نے کفر اختیار کرنا تھا اختیار کیا۔ عمرؓ نے کہا! ابو بکر! تم لوگوں سے کیسے جنگ کرو گے جب کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ یہ اقرار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ان کا مال اور جان محفوظ ہیں الا یہ کہ حق اسلام کا تقاضا ہو اور ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ ابو بکرؓ نے کہا: اللہ کی قسم میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جو صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں تفریق کرتے ہیں زکوٰۃ مالی حق ہے، اللہ کی قسم اگر وہ بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کریں جو وہ رسول اللہؐ کو دیتے تھے تو میں اس انکار پر جنگ کروں گا۔ عمرؓ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم کہ جب اللہ نے ابو بکرؓ کا سینہ جنگ کے لئے کھول دیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہی حق ہے۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتدین سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا کیونکہ ان کے لئے خاص حکم ہے یا تو وہ توبہ کر کے اسلام کی طرف لوٹ آئیں یا قتل کے لئے تیار ہو جائیں۔ حضور اکرمﷺ کا ارشاد پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ جو شخص دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔ (٦٢) اسی طرح مفسرین نے کہا ہے کہ سورہ فتح کی آیت نمبر ١٦۔ بنو حنیفہ کے مرتدین کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی۔ قرطبیؒ نے نقل کیا ہے:

قال رافع بن خديج: والله لقد كنا نقرأ هذه الاية فيما مضى سَتُدْعَونَ الى قَوْمٍ أُولِى بَأسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُم اويسلمون فلا نعلم من هم؟ حتى دعانا ابو بكر الى قتال بنى حنيفة فعلمنا أنهم هم (٦٣)

رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں! اللہ کی قسم ہم لوگ یہ آیت پڑھتے تھے کہ تم جلد ایک سخت جنگجو قوم کے ساتھ لڑائی کے لئے بلائے جاؤ گے۔ ان سے یا تو تم جنگ کرتے رہو گے یا وہ اسلام لے آئیں گے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہاں تک کہ ابو بکرؓ نے بنو حنیفہ سے جنگ کے لئے ہمیں ندا دی تو ہمیں پتہ چلا کہ یہی لوگ ہیں (جن کی طرف آیت میں اشارہ ہے)۔

---

(٦١) بخاری، کتاب استتابة المرتدين، باب من ابى قبول الفرائض ۴/١٣٩

(٦٢) من بدل دينه فاقتلوه، ابو داؤد ٢/٤٤١؛ ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ۵/٢۵؛ ابن ماجہ ٢/٨٤٨؛ مسند احمد ١/٢٨٢

(٦٣) احکام القرآن ١٦/٢٧٢

مرتد کی سزا ایک تجزیہ

دور حاضر کے کفر نے اسلام کے حوالے سے مسلمان معاشروں پر جو دباؤ بڑھایا ہے اس میں ایک مسئلہ مرتد کی سزا کا بھی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشروں کے اندرونی استحکام کی ایک وجہ دین اور اس کا احترام ہے۔ مغربی استعمار نے اپنے نوآبادیاتی دور میں عیسائی مشنریوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ لوگوں کو عیسائیت میں داخل کریں۔ اس کے ساتھ جدید نظام تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں میں آزاد خیالی' مذہب بیزاری اور مغربی لادینی نظریات سے وابستگی پیدا کی گئی۔ تعلیم کے ذریعہ نا مسلمان گروہ پیدا کرنے میں انہیں کامیابی ہوئی جو یقیناً بڑی کامیابی ہے لیکن بڑی تعداد کو عیسائی بنانے میں شدید ناکامی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمان معاشرے مرتد کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس کے پیچھے صدیوں کی روایت اور قانونی ضابطے تھے۔ مغرب کو اس وقت جو غلبہ حاصل ہے اس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر تبدیلی مذہب کی مہم تیز ہوئی ہے اور ایک مرتبہ پھر وہ ارتداد کی سزا کو اپنے رستے کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے اسے دور کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی قوت کے اظہار پر مغلوب کفر مختلف حیلوں بہانوں سے ارتداد کی مہم میں مصروف تھا۔ یہودیوں نے ایک منصوبہ بندی کی تھی کہ مسلمانوں کو بددل کرنے کے لئے یہ تدبیر کی جائے کہ صبح کے وقت ایمان لے آؤ تو شام کے وقت انکار کر دو تا کہ نئے مسلمان محسوس کریں کہ کوئی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ ایمان لا کر واپس یہودیت کی طرف جا رہے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ○ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ (۶۴)

اور اہل کتاب کا ایک گروہ ایک دوسرے سے کہتا کہ جو کتاب مومنوں پر نازل ہوئی ہے اس پر دن کے شروع میں ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کر دیا کرو تا کہ وہ برگشتہ ہو جائیں۔ اور اپنے دین کے پیرو کے سوا کسی اور کے قائل نہ ہوں۔ اے پیغمبرؐ! کہہ دیں کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں۔ کبھی نہ ماننا کہ جو چیز تمہیں ملی ہے ایسی کسی اور کو بھی ملے گی یا وہ تمہیں اللہ کے سامنے قائل معقول کر سکیں گے۔ یہ بھی کہہ دو کہ بزرگی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ کشائش والا علم والا ہے۔

عالمی کفر اب پھر مسلمانوں کی عسکری و سیاسی کمزوری کے باعث ارتداد کے فتنہ کو ہوا دینا چاہتا ہے۔ آزادی رائے

---

(۶۴) آل عمران/۲: ۷۲-۷۳

کے نام پر ایک مرتبہ ارتداد کی اجازت ہو جائے تو پھر مسلمانوں کے معاشروں میں پہلے سے دخیل تخریبی قوتیں تباہی مچا دیں گی اور مسلمان معاشروں میں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسے کئی ہیرو پیدا ہو نگے ۔ یہ مسلمانوں کی معاشرتی دفاعی حکمت عملی ہے تا کہ خارجی تخریب کاری ان کے معاشرتی استحکام کو نقصان نہ پہنچائے ۔ ارتداد کے حوالے سے یہ بات واضح طور پر قانونی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کی تاثیر سے کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے تو مسلمان کو تو سزا ملے گی لیکن غیر مسلم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی ۔ یہاں تک تو دفاعی حکمت عملی کی بات تھی اب ذرا اس مسئلہ کا ایک اور پہلو سے بھی جائزہ لیا جائے تو بہتر ہوگا اور وہ ہے اسلام کا معاشرتی وسیاسی پہلو۔

اسلام ایک ریاست ایک معاشرہ

عام طور پر مذہبی آزادی کی بات کی جاتی ہے ۔ طریق استدلال یہ ہے کہ مذہب کو اختیار کرنا انسان کا ذاتی فعل ہے ۔ اسے انتخاب کی آزادی ہونی چاہئے اور یہ مسلمانوں کی تنگ نظری ہے کہ تبدیلی مذہب پر سزا دیتے ہیں ۔ بظاہر یہ سادہ سیدھا استدلال ہے اور متاثر کرنے والا ہے لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی ۔ اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں جن میں اسے عام مذاہب استعمال کرتے ہیں ۔ یہ صرف بندے اور معبود کا تعلق ہی نہیں بندے اور اس کے ماحول کا تعلق بھی ہے یہ ایک معاشرت ہے اور ایک ریاست ہے ۔ کوئی شخص اسے اختیار کرنے پر تو مجبور نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ قرآن نے کہا ہے ☆ لیکن اختیار کرنے کے بعد اس کی اجتماعی زندگی سے بغاوت نہیں کر سکتا ۔ دنیا کی کوئی ریاست بغاوت کو برداشت نہیں کرتی ۔ سیکولر ریاستوں میں High Treason کی سزا موت ہے ۔ یہ کافرانہ دانش کا محض واویلا ہے اس کے حق میں کوئی ٹھوس دلیل نہیں ۔

پھر ارتداد کی بھی کئی قسمیں ہیں ۔ ایک شخص عقلی طور پر مطمئن نہیں ہے تو مذہبی رسوم کے بارے میں غیر فعال ہو سکتا ہے اور اپنے شکوک وشبہات اور اپنی دین بیزاری کو اپنے تک محدود رکھ سکتا ہے ۔ استعمار کے بعد مسلمان معاشروں کی مغرب زدہ جماعت اس طرح کے ارتداد کا شکار ہے لیکن کوئی شخص جب اسلام سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہے تو وہ صرف آداب ورسوم ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ اس کی اجتماعیت کے خلاف اعلان جنگ بھی کرتا ہے ۔ کوئی فعال مرتد اسلامی اجتماعیت میں کیسے برداشت کیا جائے گا ؟ اسلام نے جو سزا متعین کی ہے وہ جارحیت پسند مرتد کی ہے ۔ وہ شخص جو استہزا تحقیر اور توہین کا رویہ اختیار کرتا ہے ۔ عالم کفر کے کارندے مسلمان معاشروں میں حرص ولالچ اور خفیہ تخریب کاری کے ذریعہ بعض افراد کو تبدیلی مذہب پر آمادہ کرتے ہیں اور پھر اسے اسلامی فکر وعمل کے خلاف استعمال کرتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کو رعایت دینے کے معنی اسلام کی اجتماعیت کو ختم کرنا ہے ۔

☆ لا اکراہ فی الدین ۔ البقرہ/۲۵۶

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ادھر کسی کے بارے میں ارتداد کا پتہ چلا اور اسی وقت اس کی گردن اڑا دی گئی۔ قانون کا ایک عمل ہے اس کے لئے توبہ اور رجوع کا دروازہ کھلا ہے۔ اور پھر یہ بھی طے کرنا ہے کہ یہ انحراف ہے یا ارتداد؟ اور ارتداد ہے تو اس کی نوعیت محض استہزا کی ہے یا مکمل تبدیلی مذہب ہے۔ وہ خاموش اور نرم رو ہے یا ارتداد کا مبلغ ہے۔ اسلامی ریاست اندھے کی لاٹھی نہیں ہے وہ قاعدہ قانون اور دستور و نظام کی ریاست ہے جس میں انسانی جان کے احترام کو ایک بنیادی دستوری اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ انحراف' تبدیلی مذہب اور کھلم کھلا مخالف اسلام سرگرمیوں میں سے ہر ایک کا جائزہ لیا جائے گا۔ قتل کی سزا کا مستحق صرف وہی ہوگا جو ارتداد کا جارح مبلغ اور آتش انتقام و نفرت کا بھڑکانے والا ہے۔ مرتد چونکہ اسلامی اجتماعیت کو نقصان پہنچانے اور اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت کرنے کا عملی اظہار کرتا ہے اس لئے اس کی سزا انتہائی نوعیت کی ہوگی۔ اس مسئلہ پر سید مودودیؒ کی رائے کو نقل کرنا مناسب ہوگا وہ فرماتے ہیں:

اسلام کے اس قانون کو سمجھنے میں لوگوں کو جو الجھنیں پیش آتی ہیں ان کی کئی وجوہ ہیں:

اول یہ کہ اسلام بحیثیت مذہب اور اسلام بحیثیت ریاست کا فرق نہیں سمجھتے اور ایک کا حکم دوسرے پر چسپاں کرنے لگتے ہیں حالانکہ ان دونوں حیثیتوں اور ان کے احکام میں فرق ہے۔

دوم یہ کہ موجودہ حالات کو نگاہ میں رکھ کر اس حکم پر غور کرتے ہیں جب کہ غیر مسلم حکومتوں میں ہی نہیں خود مسلمانوں کی اپنی حکومتوں میں بھی غیر اسلامی تعلیم اور غیر اسلامی تہذیب کے غلبے سے مسلمانوں کی نئی نسلوں میں بکثرت لوگ گمراہ ہو کر اٹھ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک صحیح اسلامی حکومت موجود ہو تو اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام اسباب کا سد باب کرے جن سے کوئی مسلمان واقعی اسلام سے غیر مطمئن اور ارتداد پر آمادہ ہو سکتا ہو۔ جہاں اسلامی حکومت اپنے حقیقی فرائض انجام دے رہی ہو وہاں تو غیر مسلموں کا کفر پر مطمئن رہنا بھی مشکل ہے کجا کہ ایک مسلمان الٹا اسلام سے غیر مطمئن ہو جائے۔

سوم یہ کہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مسلم سوسائٹی ہی وہ چٹان ہے جس پر اسلامی ریاست کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اور اس چٹان کے استحکام پر ریاست کے استحکام کا پورا انحصار ہے۔ آخر دنیا میں وہ کون سی ریاست ہے جو اپنے اندر خود اپنی تخریب کے اسباب و وسائل کو پرورش کرنا یا گوارا ہی کرنا پسند کرتی ہو؟ ہم اپنی حد تک اپنی ریاست کی بنیادی چٹان کے ہر ذرے کو چٹان سے بہ دل و جان وابستہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ پھر بھی اگر کوئی ذرہ ایسا نکل آئے جو علیحدگی کو ہی ترجیح دیتا ہو تو ہم اسے کہیں گے کہ تمہیں علیحدہ ہونا ہے تو ہمارے حدود سے باہر نکل جاؤ ورنہ یہاں ہم تمہیں دوسرے ذروں کی پراگندگی کا سبب بننے کے لئے آزاد نہیں چھوڑ دیں گے۔ (۶۵)

---

(۶۵) اسلامی ریاست/۳۲۲۔۳۲۳، اس مسئلے پر مفصل بحث سید مودودی کے کتابچے "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" کے صفحات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں مرتدین کے لئے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں کیونکہ وہ ریاست کے مقصد وجود ہی کے منکر ہیں اس لئے وہ تحفظ کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ مرتدین کے ساتھ نرمی اور ان کی حوصلہ افزائی اسلام کی نفی کے مترادف ہے۔ کوئی صاحب ہوش مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ وہ مرتد کے حقوق کے لئے کھڑا ہو کر اسلامی معاشرت کی تخریب کے لئے آمادہ ہو۔

غیر مسلموں کے لئے ذمی کی اصطلاح

اسلامی روایت میں غیر مسلموں کے لئے ذمی کی اصطلاح استعمال ہوتی رہی ہے۔ سید مودودیؒ کے بقول: اس کے معنی شودر اور ملیچھ کے نہیں ہیں اور نہ یہ تذلیل کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ذمہ عربی زبان میں Guarentee کو کہتے ہیں اور ذمی وہ شخص ہے جس کے حقوق ادا کرنے اور محفوظ رکھنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لے لیا ہو۔ اسلامی حکومت یہ ذمہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے لیتی ہے۔ (۶۶) رسول اللہ ﷺ نے ذمیوں کے حقوق کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں اور خلفائے راشدین کے عہد میں ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا گیا اور اس بارے سیدنا عمرؓ اور سیدنا علیؓ کے احکامات چشم کشا ہیں۔ کیا موجودہ حالات میں غیر مسلم رعایا کے لئے ذمی کی اصطلاح کا استعمال ضروری ہے؟ مسلمان اس اصطلاح کے عمدہ معنوں پر جتنی اچھی بحث کر لیں غیر مسلم اس اصطلاح کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ذمی کے تصور سے وہ دوسرے درجہ کے شہری قرار پاتے ہیں۔ سید مودودیؒ نے پاکستان میں اسلامی ریاست کی بحث میں ذمیوں کی بات بھی کی ہے۔ جب قرارداد مقاصد منظوری کے لئے پیش ہوئی تو اسمبلی کے اقلیتی ارکان نے 'جو سب کے سب ہندو تھے' شدید مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست کا اسلامی بنایا جانا اقلیتوں کو مستقل طور پر دوسرے درجے کا شہری بنا دے گا۔ (۶۷) قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران رکن اسمبلی سریش چندر چٹو پادھیا نے اسلامی ریاست کے بارے میں سید مودودیؒ کی رائے پر خاص طور پر تبصرہ کیا اور قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

''آپ یہ قرارداد منظور کر سکتے ہیں کیونکہ آپ اکثریت میں ہیں لیکن ہم اس پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی مخالفت کریں۔ ہم اسے قبول کر کے خودکشی نہیں کر سکتے۔ غیر مسلم ثانوی کردار ادا نہیں کریں گے۔ وہ صرف ماشکی اور لکڑ ہارے کا کام نہیں کریں گے۔ کیا آپ کسی خوددار شخص سے اس قسم کی پوزیشن قبول کرنے کی توقع کر سکتے ہیں''۔ (۶۸) یہ صاحب اس بات کو بھول گئے کہ ماشکی اور لکڑ ہارے کو گھٹیا قرار دینا ہندو

(۶۶) اسلامی ریاست/ ۲۳۵۔۲۳۷

(۶۷) فادر فرانسس، یہ دیس ہمارا ہے/ ۶۳، لاہور

(۶۸) زاہد چوہدری، پاکستان کی سیاسی تاریخ/ ۱۱، ۲۷۲۔۲۷۳

ذات پات کے نظام کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے تو پیشوں اور کام کاج کی بنیاد پر عزت و ذلت کا معیار قائم ہی نہیں کیا۔

صرف مسلمان کے سربراہ مملکت ہونے کے مسئلہ پر اقلیتی ارکان اتنے جز بز تھے کہ انہوں نے غیر مسلموں کے حقوق کے سلسلے میں موجود شقوں کو بھی در خور اعتنا نہ سمجھا۔ صدر کے لئے مسلمان ہونے کی لازمی شرط کے مسئلے پر پوری کی پوری عوامی لیگ' ہندو وزراء سمیت تمام ہندو ارکان اور مسیحی رکن اور کانگریس کے نمائندے گومیز نے اسی دفعہ کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ 43 کے مقابلے میں مخالف ووٹوں کی تعداد بیس تھی۔ (۶۹)

استعمار سے آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں نے اس بات کی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ریاست کے استعماری ماڈل سے ہٹ کر اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں تو مسلمان معاشرے کی غیر مسلم اقلیتوں نے جو استعماریوں کے زیر سایہ مراعات یافتہ تھیں' اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے کے قیام کو اپنے لئے خطرہ قرار دیا اور ذمی کی اصطلاح کو دوسرے درجے کی شہریت قرار دیا۔ یہ بحث پاکستان مصر اور دوسرے مسلم ممالک میں پچھلی نصف صدی سے جاری ہے۔ غیر مسلم اقلیتوں کو استعماری طاقتوں کی تائید اور حمایت حاصل ہے کیونکہ استعماری ماڈل کے ساتھ ان کے مفادات وابستہ ہیں۔

مسلمانوں کی سیاسی و عسکری حالت قابل رشک نہیں نیز مسلمانوں کے ارباب اختیار استعماری ماڈل کے پروردہ اور مراعات یافتہ ہیں لہٰذا ان کے مفادات بھی استعماری ماڈل کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ عالمی استعماری طاقتوں کا دباؤ بھی ہے اس لئے مصالح عامہ کے تحت اسلامی ریاست ذمی کی اصطلاح کو نظر انداز کر کے اس کے عدم استعمال کا فیصلہ کر سکتی ہے اور ان کو وہ تمام حقوق عطا کر سکتی ہے جو شریعت کے تحت ان کو حاصل ہیں اگر وہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ذمہ میں نہیں آنا چاہتے اور صرف حکمرانوں کا تحفظ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی صوابدید ہے۔ البتہ کلیدی مناصب پر تقرری کے سلسلے میں کمزوری نہیں دکھانی چاہئے اسلامی ریاست غیر مسلم شہریوں کو اپنی اجتماعیت میں جذب کرنے (Assimilation) کا اقدام نہیں کرے گی اور انہیں اپنی مذہبی شناخت کو قائم رکھنے میں مدد دے گی۔

تکثیری معاشرہ (Pluralist Society)

اسلامی معاشرے ہمیشہ تکثیری (Plural) معاشرے رہے ہیں اور غیر مسلم گروہوں کو ان کی شناخت کے ساتھ اجتماعیت کا حصہ تسلیم کیا گیا ہے' ان کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے' ان کے لئے قانون سازی کی گئی ہے' ضوابط بنائے گئے ہیں اور ان کو ہر قسم کی زیادتی سے تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ آج جس تکثیری معاشرہ کی بات ہو رہی ہے وہ سیکولر فریم ورک سے متعلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق (Truth) صرف ایک نہیں بلکہ کئی ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے حق (Truth) ایک اضافی (Relative) حقیقت ہے۔ اس نقطہ نظر سے تمام مذاہب اور نظریات سچائی پر مبنی ہیں اور ہر مذہب و نظریہ کے ماننے

---

(۶۹) Mahfuz-ul-Haque, Muslim Nationalism, Concept of Pakistan / 92. Dhaka, May, 1965.

والے کی نظر میں وہ سچائی ہے۔ یہ تکثیری معاشرے کا نظریاتی پہلو ہے اور اسلام اس سے متفق نہیں۔ اسلام کے مطابق حق صرف ایک ہے اور انسانوں کو ہمیشہ اس کی تلقین کی جاتی رہی۔ انسان نے اسے محفوظ رکھنے اور اس کے مطابق زندگی گذارنے میں کوتاہی کی جس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے اور حق کی مختلف تعبیرات ہونے لگیں۔ انہی تعبیرات کی وجہ سے یہ سمجھا جانے لگا کہ حق صرف ایک نہیں بلکہ کئی ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ حق کی تکثیر نہیں اس کو سمجھنے اس کی تعبیر کرنے اور اس پر عمل کرنے کی تکثیر ہے۔ قرآن کہتا ہے!

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۷۰)

اور اہل انجیل کو چاہئے کہ جو احکام اللہ نے اس میں نازل فرمائے ہیں اس کے مطابق حکم دیا کریں اور جو اللہ کے احکام کے مطابق حکم نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرمان ہیں اور اے پیغمبر! ہم نے آپ پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان سب پر شامل ہے تو جو اللہ نے حکم نازل فرمایا ہے اس کے مطابق ان کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔ ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے لئے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا مگر جو حکم اس نے تم کو دیئے ہیں ان میں وہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ سو نیک کاموں میں جلدی کرو۔ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور پھر جن باتوں میں تم کو اختلاف تھا وہ تم کو بتا دے گا۔

اسی بات کو سورہ ہود میں دہرایا:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ○ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۷۱)

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کر دیتا لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، مگر جن پر تمہارا پروردگار رحم کرے اور اسی لئے اس نے پیدا کیا ہے اور تمہارے پروردگار کا قول پورا ہو گیا کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

---

(۷۰) المائدہ/۴۷۔۴۸

(۷۱) ھود/۱۱۸۔۱۱۹

قرآن جس چیز کی وضاحت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسانوں کو حق کی رہنمائی کا انتظام کیا جاتا رہا اور ہر قوم کے پاس اس حق کے آثار موجود ہیں جن کے مطابق وہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ قرآن حقانیت کا جامع اور آخری ایڈیشن اور حق کے ان تمام پہلوؤں پر مشتمل ہے جو اس سے پہلے دیئے گئے اس لئے اب حق کی واضح اور مکمل صورت وہ ہے جسے قرآن بیان کرتا ہے۔ اگر کوئی اسے تسلیم نہیں کرتا تو یہ اس کا انتخاب ہے۔ اس سلسلے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌO (۷۲)

دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت واضح طور پر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص طاغوت سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

چونکہ انسانی فہم میں کمی بیشی کا امکان ہے اور شیطان بھی مصروف عمل ہے اس لئے انسان نافہمی یا ذاتی مفادات کی وجہ سے حق کی تعبیر میں مختلف الخیال ہو گئے اور قرآن کے مطابق **كل حزب بالديهم فرحون** (۷۳) یعنی ہر گروہ اسی سے خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔ چونکہ مشیت ایزدی میں اس اختلاف کی گنجائش تھی اس لئے انسانی معاشرے سچائی کے ادراک میں اختلاف کرتے رہے۔ قرآن کے مطابق ابتدائی معاشرہ وحدت پر مبنی تھا اور تکثیریت بعد کی پیداوار ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے اس وحدت کی طرف دعوت دیتا رہا لیکن لوگ انکار کرتے رہے۔ فرمایا!

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍO (۷۴)

پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا تو اللہ نے ان کی طرف بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کا ان میں فیصلہ کر دے۔ اور اس میں اختلاف بھی انہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجودیکہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آ چکے تھے۔ اور یہ اختلاف انہوں نے صرف آپس کی ضد سے کیا۔ تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے۔

---

(۷۲) البقرہ/۲۵۶

(۷۳) الروم/۳۲

(۷۴) البقرہ/۲۱۳

حق ایک ہونے کے باوجود تعبیر وعمل کا اختلاف رکھنے والے گروہ ایک معاشرتی حقیقت ہیں۔قرآن اسے تسلیم کرتا ہے اور انہیں یہ حق بھی دیتا ہے کہ وہ اپنی تعبیر کے مطابق عمل کریں۔لوگوں کو جبراً ایک نظریہ پر متفق کرنا منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے۔موجودہ سیکولر کلچر بظاہر تکثیری ہے لیکن درحقیقت وہ لوگوں کو سیکولر فریم ورک مجتمع کرنا چاہتا ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اسلام کی حقانیت کو ختم نہ کر دیا جائے۔سیکولر گروہوں کی منصوبہ بندی یہ ہے کہ پہلے حق کی تکثیر کی بات کی جائے اور پھر سیکولر آئیڈیل کو واحد راستہ قرار دیا جائے۔

اسلام نے اسی بنیاد پر منکرین میں سے اہل کتاب کو خصوصی حیثیت دی کیونکہ وہ اس پیغام کے امین تھے جس میں حق موجود تھا۔اور اس حق کی بنیاد پر ان سے توقع تھی کہ وہ قرآن اور رسول اکرم ﷺ کو تسلیم کریں گے لیکن ان کی ضد اور گروہی عناد آڑے آئے اور وہ حق کے آخری ایڈیشن پر ایمان لانے سے محروم ہو گئے۔ان کی یہی محرومی دشمنی وانتقام میں بدل گئی ہے۔صدیاں بیت گئی ہیں ان کی آتش انتقام ٹھنڈی نہیں ہوتی۔قرآن ان کی عداوت بغض اور مخالفت کے باوجود ان کی خصوصی حیثیت کو قائم رکھتا ہے اور انہیں حق کے مخاطبین میں شمار کرتا ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے تکثیری معاشرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ کو اپنے عقیدہ وعمل کی آزادی ہو اور کوئی گروہ کسی دوسرے کے مذہبی وثقافتی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔اسلامی نقطہ نظر سے تکثیری معاشرے کا مطلب سیکولر معاشرہ نہیں جس میں حق وصداقت اضافی قدریں قرار پائیں اور سیکولر آئیڈیل غالب ہو۔قرآن اسے کفر کہتا ہے اور طاغوت کی پیروی قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں اللہ کی ذات اور اس کی نازل کردہ صداقت غیر متعلق اور اضافی ہو جاتی ہے یہی تو کفر ہے۔اقبال کے بقول

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نو امیدی
مجھے بتا، تو سہی اور کافری کیا ہے

اسلامی معاشرہ مسلمان اور نامسلمان کے امتیاز کو قائم رکھ کر انسانی بنیادوں پر ایک روادار اور وسیع النظر ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں مذہبی اختلاف، تعصب اور نفرت کا باعث نہ بنے اور بنیادی انسانی حقوق کے اتلاف کا سبب نہ قرار پائے۔اس پس منظر میں ان حقوق کو دیکھا جائے جو اسلام غیر مسلموں کو عطا کرتا ہے اور ان کا تحفظ کرتا ہے۔تو واضح ہو گا کہ اسلام ایک عادلانہ ورحیمانہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔

جزیہ

اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے سلسلے میں ایک اور بحث جزیہ کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

جزیہ کے لفظی معنی معاوضہ اور بدلہ کے ہیں۔یعنی کچھ دے کر کچھ لینا۔یہ لین دین ایک دوسرے کے مقابل اور معاوضہ

ہے۔ یہ ایک ٹیکس تھا جو اسلامی ریاست ان غیر مسلموں سے لیتی تھی جو جنگ کی صورت میں مفتوح و مغلوب ہوتے تھے۔ انہوں نے مسلمان قوموں سے باقاعدہ جنگ کی تھی اور شکست کھائی تھی۔ اسلامی ریاست ایسے غیر مسلموں کو جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت فراہم کرتی تھی اور اس حفاظت کے عوض ان سے ایک خصوصی ٹیکس لیا جاتا تھا جسے جزیہ کہا جاتا ہے۔ فقہاء نے اسے قاعدہ فقہیہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ **الجبایة بازاء الحمایة.** یعنی مالی مطالبہ حمایت و حفاظت کا معاوضہ ہے۔ یہ بنیادی طور پر غیر مسلموں ہی کے ضمن میں ہے۔ اگرچہ بعض مصنفین نے اس ٹیکس کو حفاظت کے ساتھ متعلق کرنے کے سلسلے میں زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بھی ایک ریاستی ٹیکس ہے جو جان و مال کے تحفظ فراہم کرنے پر وصول کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں سیدنا عمرؓ کے عہد میں بنو تغلب کے ساتھ معاہدے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بنو تغلب نے جزیہ یا خراج دینے کی بجائے دگنی زکوٰۃ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ بظاہر یہ دلیل اور مثال مطمئن کرنے والی ہے لیکن قرآن مجید میں زکوٰۃ کے بارے میں وارد آیات سے اس کے عبادت ہونے کا قطعی تاثر ملتا ہے جو درحقیقت بندے اور اس کے رب سے متعلق ہے۔ اس کی ادائیگی سے معاشرے یا ریاست کو فائدہ پہنچتا ہے یا ریاست اسے جمع کرنے اور خرچ کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ریاست کا عائد کردہ ٹیکس ہے جو وہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت کے عوض وصول کرتی ہے۔ جزیہ کی زکوٰۃ کو غیر مسلم اور مسلم شہریوں کے ٹیکس کی صورت میں مماثلت تلاش کرنا اگرچہ نادرست ہے تاہم قابل غور ضرور ہے۔ کسی شخص کا مسلمان ہونا اس کی حفاظت کا مستلزم ہے اور یہ ذمہ داری مسلم کمیونٹی کی ہے خواہ ریاست موجود ہو یا نہ ہو۔ لیکن غیر مسلم کی حفاظت اسلامی ریاست یا اسلامی فوج کی ذمہ داری ہے۔

اسلامی ریاست یا عسکر اسلامی حفاظت فراہم نہیں کر سکتا تو اسے جزیہ لینے کا کوئی حق نہیں۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب مسلمانوں کو شام کے مفتوحہ علاقے چھوڑ کر اپنی طاقت کو ایک جگہ پر مرتکز کرنا پڑا تو ابوعبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے انہیں واپس کر دو اور ان سے کہو!

انما رددنا علیکم اموالکم لانه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع و انکم اشترطتم علینا ان نمنعکم و انا لا نقدر علی ذلك و قد رددنا علیکم ما اخذ نا منکم و نحن لکم علی الشرط و ما کتبنا بیننا. (۷۵)

ہم نے تمہارا مال واپس کر دیا ہے اس لئے کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارے خلاف فوجوں کا اجتماع ہوا ہے اور تم سے یہ شرط ہوئی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ اور ہم اس شرط پر قائم ہیں جو ہم نے باہمی رضامندی سے لکھی تھی۔

چنانچہ سالاران عسکر نے جمع شدہ رقوم واپس کر دیں۔ بلاذری لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے کہا:

---

(۷۵) کتاب الخراج فصل فی الکنائس، ۱۳۹

ردكم الله علينا و نصركم عليهم، فلوكانوا هم لم يردوا علينا شيئاً و اخذوا كل شئى بقى لنا حتى لا يدعوا لنا شيئاً (۷۶)

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے لئے لوٹا دے اوران پر آپ کو کامیابی عطا کرے۔ اگر آپ کی جگہ وہ ہوتے تو کوئی چیز نہ لوٹاتے اور ہماری ہر شئی لے جاتے یہاں تک کہ کچھ باقی نہ چھوڑتے۔

اس پر فقہاء اسلام کا اتفاق پایا جاتا ہے کہ جزیہ اس تحفظ اوران مراعات کا معاوضہ ہے جو اسلامی ریاست فراہم کرتی ہے۔ اگر ریاست یہ حفاظت نہ فراہم کرے تو وہ جزیہ نہیں لے سکتی۔

جزیہ کی شرائط

(i) جزیہ کی مقدار کو کتاب وسنت نے متعین نہیں کیا۔ جزیہ غیر مسلم شہری کی استطاعت کے مطابق ہوگا اور اسی سے لیا جائے گا جو برسر روزگار ہے۔ اپاہج' معذور' دائمی مریض اور بوڑھے افراد اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(ii) جزیہ ادا کرنے کی صورت میں غیر مسلم شہری لازمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوگا اس لئے اسی فرد پر جزیہ عائد ہوگا جو جنگی خدمات کے قابل ہوگا۔ عورتیں' بچے اور جسمانی طور پر نااہل افراد پر ٹیکس معاف کر دیا جائے گا۔

(iii) غیر مسلم مذہبی خدام و کارکن بھی اس سے مستثنیٰ ہوں گے جیسے پنڈت' پادری اور پروہت وغیرہ۔ (۷۷)

(iv) اسلامی ریاست اپنے حالات کے مطابق جزیہ کی مقدار طے کر سکتی ہے مثلاً سیدنا عمرؓ کے عہد میں مالداروں پر اڑتالیس درہم' متوسط طبقہ پر چوبیس درہم اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر بارہ درہم سالانہ مقرر کیا گیا تھا۔ (۷۸)

(v) جزیہ شخصی ہے۔ جائیداد اور مال پر نہیں جب کوئی غیر مسلم فوت ہوگا تو یہ ٹیکس از خود ختم ہو جائے گا۔

امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

ان وجبت عليه الجزية فمات قبل ان توخذ منه اواخذ بعضها و بقى البعض لم يوخذ بذلك ورثته ولم توخذ من تركته (۷۹)

اگر ذمی پر جزیہ واجب ہوا اور وہ اس کو ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کے ورثاء سے وہ وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ترکہ سے لیا جائے گا۔

---

(۷۶) فتوح البلدان (طبع یورپ)/۱۳۷

(۷۷) کتاب الخراج، باب فمن تجب عليه الجزية/۱۲۲

(۷۸) ایضاً

(۷۹) ایضاً/۱۲۳، المبسوط ۱۰/۸۱

جزیہ کی معافی

جزیہ چونکہ اسلامی ریاست اور غیر مسلم شہری کے درمیان جان و مال کی حفاظت کے بدلے (۸۰) اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کی شرط پر عائد ہوتا ہے اس لئے اگر جزیہ کے بنیادی عوامل ختم ہو جائیں تو جزیہ از خود ختم ہو جائے گا۔ مثلاً

(i) ریاست حفاظت کے قابل نہ ہو تو اسے جزیہ لینے کا کوئی حق نہیں۔

(ii) غیر مسلم شہری مسلمان ہو جائے تو جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ (۸۱) عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں غیر مسلموں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا تو ریاست کے کارکن پریشان ہو گئے کہ یہ لوگ جزیہ سے بچنے کے لئے مسلمان ہو رہے ہیں۔ اس پر عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی پریشانی پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

ان اللہ بعث محمداً ھادیاً و لم یبعثہ جابیاً فمن اسلم من اھل تلك الملل فعلیه فی ماله صدقة ولا جزیة علیها (۸۲)

اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو ہادی بنا کر بھیجا ہے، ٹیکس وصول کرنے والا نہیں بنا کر بھیجا۔ سو ان لوگوں میں سے جو اسلام لے آیا اس کے ذمہ زکوٰۃ ہوگی جزیہ نہ ہوگا۔

(iii) اگر کوئی غیر مسلم شہری اپنے آپ کو دفاعی حمایت کے لئے پیش کر دے تو پھر اس سے ٹیکس نہیں وصول کیا جائے گا۔ مسلمانوں کی ریاستوں میں غیر مسلموں نے فوجی خدمات ادا کیں اور انہیں ٹیکس سے مستثنیٰ کیا جاتا رہا۔ سیدنا عمرؓ کے عہد میں قاہرہ سے بحر احمر تک جو نہر نکالی گئی اس کے نقشہ کی تیاری میں جس ذمی نے مدد کی تھی اس کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ (۸۳)

ظاہر ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلم شہری کے اسلامی ریاست سے وفادارانہ تعلق کے اظہار کے لئے ہے۔ اسی سے اس کی غیر مسلم حیثیت بھی محفوظ ہوگی اور جان و مال کا تحفظ بھی ہوگا۔ جدید دور کی سیکولر قومی ریاستیں اقلیتوں کی الگ شناخت کو ختم کرنے اور اکثریت کے تہذیبی رنگ میں رنگنے کے ظاہری اور خفیہ ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ اسلامی ریاست غیر مسلم شہریوں کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنا تشخص قائم رکھیں۔ اسلامی ریاست اس کا احترام کرتی ہے اور انہیں تبدیلی مذہب پر مجبور نہیں کرتی۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ٹیکس ایک طرح کا دباؤ ہے اگر ٹیکس سے بچنا ہے تو مسلمان ہو جاؤ لیکن یہ بات اس لئے بے وزن ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد لازمی فوجی خدمات بھی ہیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اس ٹیکس کو ظالمانہ استحصال کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ سیدنا عمرؓ نے حکم دیا تھا:

---

(۸۰) کتاب الاموال ۔۴۲

(۸۱) کتاب الخراج، فصل فی المجوس و عبدة الاوثان ۱۳۱

(۸۲) کتاب الخراج ۱۲۲ لا یوخذ بشئی من الجزیة اذا کان اسلم

(۸۳) [illegible] (Muslim conduct of state 101)

لا يكلفوا فوق طاقتهم (۸۴) ان کی طاقت سے بڑھ کر ادا کرنے کی انہیں تکلیف نہ دی جائے۔

جزیہ کے عوض ان کی املاک کو نیلام نہیں کیا جا سکتا۔ امیر المومنین علیؓ نے اپنے ایک عامل کو فرمان بھیجا تھا:

لا تبيعن لهم فى خراجهم حماراً ولا بقرة ولا كسوة شيئاً ولا صنفاً (۸۵)

خراج میں ان کا گدھا، ان کی گائے ان کے کپڑے نہ بیچنا۔

جزیہ کی وصولی میں ہر قسم کی سختی سے منع کیا گیا۔ سیدنا عمرؓ نے شام کے گورنر ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں یہ بھی تھا

و امنع المسلمين من ظلمهم والاضرار بهم واكل اموالهم الّا بحلها (۸۶)

مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انہیں ستانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔

شام کے سفر میں سیدنا عمرؓ نے ایک عامل کو جزیہ وصول کرنے کیلئے سزا دیتے دیکھا تو فرمایا:

لا تعذب الناس فان الذين يعذبون الناس فى الدنيا يعذ بهم الله يوم القيامة و امر به فخلى سبيلهم (۸۷)

ان کو تکلیف نہ دو اگر تم انہیں اذیت پہنچاؤ گے تو قیامت کے دن اللہ تمہیں عذاب دے گا۔ اور اس نے چھوڑ دیا۔

جو غیر مسلم شہری فقیر ہو جائیں انہیں نہ صرف جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا بلکہ اسلامی بیت المال سے ان کے لئے وظائف مقرر کئے جاتے۔ سیدنا عمرؓ نے ایک دفعہ ایک ضعیف العمر ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے اس کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ آپ نے نہ صرف اس کا جزیہ معاف کیا بلکہ اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا:

انظر هذا وضربائه، فوالله ما انصفنا أن أكلنا شبيته ثم نخذله عند الهرم (۸۸)

خدا کی قسم یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں۔

خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں یہ بھی لکھا ہے:

وجعلت لهم ايما شيخ ضعف عن العمل او اصابته آفة من الآفات اوكان غنياً فافتقر وصار اهل دينه يتصدقون عليه طُرحت جزيته و عيل من بيت مال المسلمين و عياله ما اقام بدارالهجرة دارالاسلام (۸۹)

---

(۸۴) کتاب الخراج/۱۲۵

(۸۵) فتح البیان،۴/۹۳

(۸۶) کتاب الخراج، فصل فی الکنائس/۱۴۱

(۸۷) ایضاً/۱۲۵

(۸۸) ایضاً/۱۲۶، کتاب الاموال/۴۶

(۸۹) کتاب الخراج، فصل فی الکنائس/۱۴۴

میں نے ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو شخص بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہو جائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے یا وہ پہلے مال دار تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس کو صدقہ و خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے اور اسے اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے مدد دی جائے۔

اگر کوئی ذمی شخص دشمن کے قبضے میں آ جائے اور اس کو فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فدیہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔(۹۰)

کیا دور حاضر میں جزیہ لگایا جا سکتا ہے

اسلامی ریاست اور شریعت اسلامیہ کے نفاذ پر اہل کتاب' مشرکین اور سیکولر لا دین طبقات کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مسلمان ممالک کی غیر مسلم اقلیتیں ذمی قرار دی جائیں گی اور ان پر جزیہ لگایا جائے گا جو ایک قسم کی تذلیل ہے۔اس سلسلے میں اہل فکر کی دو آراء ہیں:

ایک رائے تو جزیہ لگانے کے حق میں ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جزیہ ان کی حفاظت اور ان کے تشخص کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔اس سے مراد ان کی تذلیل نہیں ہے۔قرآن نے **حتی یوتوالجزیة عن یدوھم صاغرون** (۹۱) کا جو کہا ہے تو اس کا تعلق عسکری تصادم سے ہے۔مسئلہ اسلام اور کفر کے غلبے کا تھا۔کفر غالب ہوتا تو اسلام کو مٹا دیا جاتا اسلام غالب آیا تو کافر طبقات کو ان کے مذہب و ملت کی حفاظت فراہم کی اور اس کے عوض یہ ٹیکس لگایا۔آج اگر ٹیکس لگے گا تو تذلیل کے لئے نہیں بلکہ حفاظت کے لئے۔آج بھی کفر کی یہ حالت ہے کہ جہاں اسے غلبہ ہوتا ہے وہاں سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اسلامی احکام منسوخ کئے جاتے ہیں اور اسلامی شناختیں ختم کی جاتی ہیں۔اس کے مظاہر اور مثالیں ہمارے سامنے ہیں پھر بھی جارح کفر مسلمانوں پر الزام لگاتے نہیں تھکتا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اس وقت مسلم معاشروں میں جو غیر مسلم اور لا دین طبقات ہیں وہ عسکری حریف نہیں ہیں اور نہ وہ جنگ کے نتیجے میں مفتوحین کی صورت میں معاشرے کا حصہ ہیں بلکہ یہ لوگ مسلم معاشرے کا کئی برسوں سے حصہ ہیں۔ان میں دو قسم کے لوگ ہیں:

(i) کچھ لوگ تو وہ ہیں جن کے آباؤ اجداد محاربین و مفتوحین تھے لہٰذا مسلم معاشرے میں ذمی کی حیثیت سے تحفظ فراہم کیا گیا اور ان پر جزیہ لاگو کیا گیا۔صدیاں گذرنے کے بعد اور اسلامی ریاست کی شکست و ریخت اور استعماری غلبے کے نتیجے میں معاشرتی تسلسل ٹوٹا ہے اور نئے معاشرتی حالات پیدا ہوئے ہیں۔ماضی کے ان ذمیوں کی اگلی نسلیں ایک نئے تجربے سے گذر رہی ہیں۔دور استعمار میں انہیں مراعات حاصل تھیں بلکہ ایک لحاظ سے مسلمانوں پر تفوق حاصل تھا۔آزاد مسلم

(۹۰) کتاب الاموال/۱۲۷

(۹۱) التوبہ/۲۹

ممالک میں اب بھی ان کی حیثیت ایک اقلیت کی ہے۔ وہ مسلم معاشرے کا مستقل حصہ ہیں اور یہ شہریت انہیں ورثے میں ملی ہے لہٰذا وہ مسلمانوں سے عسکری طور پر متصادم بھی نہیں ہیں اس لئے ان پر از سرنو جزیہ نافذ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ وہی ٹیکس ادا کریں گے جو عام شہری ادا کرے گا۔ یہ اقلیتیں تمام مسلمان ممالک میں پائی جاتی ہیں۔ کسی ملک میں بھی اگر اسلامی ریاست قائم ہوئی اور شریعت کا قانون نافذ ہوا تو انہیں وہ تمام حقوق ملیں گے جن کا اعلان شریعت اسلامیہ نے کیا ہے۔

(ii) دوسری قسم کے وہ غیر مسلم شہری ہیں جو دور استعمار میں عیسائی بنے۔ ان کا تعلق اس ملک کے کسی بھی طبقے سے ہوسکتا ہے۔ یہ لوگ عیسائی مشنری سرگرمیوں کے نتیجے میں عیسائی ہوئے یا استعماری حکومت کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے عیسائیت کی جانب راغب ہوئے۔ ان لوگوں کو بھی استعماریوں نے مراعات دے رکھی تھیں اور ان کی پالیسوں کی توسیع میں ان کی خدمات شامل تھیں۔ جب استعمار نے اپنا بوریا بستر لپیٹا تو یہ اقلیتیں اکثریتی معاشرے کو ورثے میں ملیں۔ ان میں کچھ افراد تو ترک وطن کر کے استعماریوں کے دیس میں جا بسے البتہ بڑی تعداد انہی معاشروں میں رہ گئی اور کئی قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئیں۔ اسی طرح استعماریوں نے بعض غیر مسلم کیونیٹیز کو اپنے زیر تصرف مسلمان ممالک میں آباد کیا جیسے ملائشیا میں چینی اور ہندو آبادی۔ یہ اقلیتیں اب مسلمانوں سے برابری کی سطح کا مطالبہ کرتی ہیں۔

پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے کیونکہ اس میں کئی عناصر شامل ہو گئے ہیں۔ عیسائی آبادی ہے جو نو آبادیاتی دور میں نچلی ذات کے ہندوؤں سے عیسائی ہوئے اکا دکا مسلمان مرتدین کی اولاد بھی ہے۔ پھر ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی ہے جو تقسیم ملک کے وقت ترک وطن کرنے کی بجائے یہیں رہ گئی۔ اسی طرح پارسی اور بہائی گروہ بھی ہیں۔ یہ اقلیتیں تو پاکستان کو ورثے میں ملیں انہیں مفتوحین یا معاہدین میں تو شامل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تاریخی طور پر ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس میں ان اقلیتی گروہوں نے قائدین تحریک پاکستان سے کوئی معاہدہ کیا ہو یا یہ لوگ عسکری طور پر مفتوح ہو کر شامل ہوئے ہوں اور چونکہ تحریک پاکستان ایک سیاسی تحریک تھی جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا لہٰذا انہیں مفتوحین بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے رضا کارانہ طور پر اس خطے میں رہنا پسند کیا۔ رضا کارانہ پسندیدگی کے لئے کوئی شرائط بھی طے نہ کیں لہٰذا ان کی حیثیت عام غیر مسلم شہریوں کی ہے جنہوں نے اس ملک کے دستور اور قانون کو تسلیم کیا۔ لیکن بد قسمتی سے اس اقلیت نے پہلے دن سے ہی اپنے آپ کو اکثریت پر مسلط کرنے کی کوشش کی اور انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کیا دستور سازی کی تاریخ ان کے اس رویہ کی گواہ ہے۔

پاکستان کو ایک اور مشکل کا بھی سامنا ہے اور وہ ہے قادیانی گروہ۔ انگریزی استعمار کے عہد میں اس گروہ کی خاص مقاصد کے تحت حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔ نئی نبوت کا مطلب ایک نئی امت تخلیق کرنا تھا تا کہ امت مسلمہ کی مجموعی وحدت

کو چیلنج کیا جا سکے۔ امت کے اجتماعی ضمیر نے نئی نبوت کو رد کر دیا اور قادیانیوں نے خود بھی اپنے الگ تشخص کو مستحکم کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ استعماری دور میں تو وہ مسلمان معاشرے کا حصہ رہے لیکن پاکستان بننے کے بعد تصادم بڑھا تو حکومت پاکستان اور اس کی پارلیمنٹ نے انہیں غیر مسلم قرار دے دیا۔ قادیانی اپنے مسلمان ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور مسلمان معاشرے میں رہ کر ارتداد کی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ دستور پاکستان کے مطابق غیر مسلموں کو جو مراعات ہیں انہیں لینے سے وہ انکار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو خفیہ رکھ کر مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ البتہ اقلیتوں کی جملہ سرگرمیوں کے پیچھے قادینوں کا دماغ اور وسائل پوری طرح کام کرتے ہیں۔

رضا کارانہ شمولیت

تقسیم ہند کے وقت بعض اقلیتوں کا یہ فیصلہ کہ وہ ہندوستان جانے کی بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دیں گے گو یک طرفہ فیصلہ ہے تاہم تحریک پاکستان کی قیادت نے اسے قبول کیا۔ قائد اعظمؒ سے پارسیوں کی ملاقاتیں تو ثابت ہیں لیکن مسیحی قیادتوں سے کسی قسم کے مذاکرات ثابت نہیں۔ بعض مسیحی مؤلفین نے کچھ دعاوی کئے ہیں لیکن ان کی تاریخی حیثیت کیسی ہے اس کا فیصلہ غیر جانبدارانہ تحقیق سے ہی ہو سکے گا۔ تاہم اتنی بات ثابت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں رہ جانے والی ہندو قیادت بالخصوص اور موثر مسیحی افراد نے اپنا پورا زور لگایا کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست بنے۔ فادر فرانس نے دعویٰ کیا ہے کہ انگریز چند تحصیلوں پر مبنی پنجاب میں مسیحی ریاست بنانا چاہتے تھے لیکن مسیحی رہنماؤں نے انکار کر دیا۔ (۹۲) اس دعویٰ کی تصدیق ممکن نہیں ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے علاقہ میں بسنے والے مسیحوں نے یہیں رہنا پسند کیا۔ سندھ اور بلوچستان کے ہندوؤں کی بڑی تعداد نے اپنی جائیدادوں اور کاروبار کی وجہ سے وہیں رہنا پسند کیا۔ بلکہ کچھ تو ہندوستان جا کر واپس آئے اس طرح ایک غیر مسلم اقلیت وجود میں آئی جو رضا کارانہ طور پر پاکستان میں شامل ہوئی۔ چونکہ تحریک پاکستان کی قیادت نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا اعلان کیا تھا اس لئے اسے ایک طرح کا معاہدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک فریق حقوق کے تحفظ کا اعلان کر رہا ہے اور دوسرا رضا کارانہ طور پر قیام کا فیصلہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اس معاہدے کی شرائط یک طرفہ اعلان پر مبنی ہیں جسے دوسرے فریق نے قبول کیا ہے۔ اس لئے ان کے حقوق کا تحفظ اسی اعلان کی روشنی میں ہوگا۔ پاکستان کی اقلیتوں کو شبہ معاہدین کی قسم قرار دیا جا سکتا ہے۔ حقوق کے تحفظ کے وہ تمام پہلو جو شریعت اسلامیہ غیر مسلموں کو مہیا کرتی ہے وہ انہیں حاصل ہونگے۔ اور پاکستان کا دستور متفقہ

---

(۹۲) یہ دیس ہمارا ہے، ۶۱/ قرائن بتاتے ہیں کہ بعض علاقوں میں مسیحی آبادی کا ارتکاز اس مقصد کو حاصل کرنے کا آغاز ہے۔ عیسائی مشنریوں کی خفیہ منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ اہداف متعین ہوتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے طویل المیعاد پروگرام وضع کیا جاتا ہے۔ مشرقی تیمور کے بعد ایشیا میں مزید عیسائی ریاستوں کے قیام کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔ پاکستان میں پنجاب کے بعض علاقے اس منصوبہ بندی کی زد میں ہیں۔ دینی قیادتوں کو اس کا ادراک اور اسے سمجھنے کی فرصت ہے یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

طور پر جو حقوق طے کریگا وہ بھی انہیں حاصل ہونگے۔

اس ساری بحث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو اس میں بسنے والے موجودہ غیر مسلم شہریوں پر جزیہ عائد نہیں ہوگا بلکہ وہ عام شہریوں کی طرح ٹیکس دیں گے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے معاشرے کے ایک طبقہ کو نفسیاتی تسکین حاصل ہوگی اور وہ اس معاشرے کا بہتر حصہ ثابت ہونے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک ریاست کے سیکولر ہونے کا تعلق ہے اس پر مسلمان اکثریت کو کبھی مصالحت نہیں کرنی چاہئے۔ حقوق کا تحفظ ایک بات ہے اور ریاست کے اسلامی تشخص کی نفی بالکل دوسری بات ہے جس پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ اقلیتوں کو اپنے حقوق کے تحفظ تک محدود رہنا چاہئے اور ریاست کی نوعیت کو بدلنے کی مہم جوئی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اس کے دوررس اثرات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک رائے ہے جسے رد کیا جا سکتا ہے۔ فیصلہ وہی ہوگا جسے امت مسلمہ کے جید علماء کی کونسل متفقہ طور پر کرے گی۔ یہ فیصلہ ملکی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور امت کی سطح پر بھی لیکن ہر دو صورتوں میں علماء دین ہی کی بات فیصلہ کن ہوگی نیم خواندہ ارباب اختیار کے فیصلوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔

غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرے غیر مسلموں کے جن حقوق کا تحفظ کرتے ہیں اور عملی طور پر ان کو نافذ کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

جان کی حفاظت

اسلامی ریاست ایک غیر مسلم شہری کو اسی طرح جان کا تحفظ فراہم کرے گی جس طرح مسلمان شہری کی جان کو تحفظ حاصل ہوگا۔ غیر مسلم کا خون مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم قتل ہو تو اس کے قصاص میں بلا تمیز مذہب قاتل کو قانون کے مطابق قتل کیا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں ایک ذمی کو قتل کیا گیا تو آپ نے قاتل کو قانون کے مطابق قتل کا حکم صادر کرتے ہوئے فرمایا:

انا احق من وفیٰ بذمته (۹۳) اپنے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں۔

احادیث میں ذمی کے قتل کے بارے بڑی سخت وعیدیں منقول ہیں:

عن عبد الله بن عمروؓ عن النبیؐ قال: من قتل معاهد الم یرح رائحة الجنة ان ریحها یوجد من میسرة اربعین عاماً (۹۴)

---

(۹۳) عنایہ شرح ہدایہ، ۸/۲۵۶؛ دار قطنی نے یہی حدیث عبد الرحمن بن البیلمانی سے نقل کی ہے اور اسی راوی کی دوسری روایت میں اوفی بذمته کے الفاظ ہیں۔ البتہ دار قطنی نے ابن البیلمانی کے بارے میں کہا ہے۔ و ابن البیلمانی ضعیف لا تقوم به حجة اذا اوصل الحدیث فکیف اذا ارسل۔ دار قطنی نے یہی حدیث ابن عمرؓ کی روایت سے نقل کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں انا اکرم من وفی بذمته۔

(۹۴) بخاری، کتاب الدیات، باب اثم من قتل ذمیا ۴/ ۱۲۷؛ ابن ماجہ؛ کتاب الدیات، باب من قتل معاہدا / ۳۸۶

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی (مسافت) کی دوری سے محسوس ہوگی۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال: من قتل مُعاھِداً له ذِمة الله و ذمة رسوله، فلا یراح رائحة الجنة۔ و ان ریحھا لیُوجَدُ مِنْ مَیسرة سبعین عاماً (۹۵)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس شخص نے کسی ذمی کو، جس کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے، قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا اور وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی دوری سے سونگھی جائے گی۔

اخرج البیھقی عن الزھری أنّھا کانت دیة الیھودی والنصرانی فی زمن النبی مثل دیة المسلم و فی زمن ابی بکر و عمرو عثمان. فلما کان معاویة اعطیٰ اھل المقتول النصف والقی النصف فی بیت المال قال: ثم قضیٰ عمر بن عبدالعزیز بالنصف والغیٰ ما کان جعل معاویة (۹۶)

بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں یہودی و نصرانی کی دیت مسلمانوں کی دیت کے برابر تھی اور یہی صورت حال ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے زمانوں میں تھی۔ جب معاویہؓ کا وقت آیا تو انہوں نے مقتول کے ورثاء کو آدھی دیت اور آدھی بیت المال میں ڈال دی۔ جب عمر بن عبدالعزیز کا عہد آیا تو انہوں نے نصف دیت کو برقرار رکھا اور امیر معاویہؓ کے بیت المال میں ڈالے جانے والے حصہ کو ختم کر دیا۔

عن ابن عمرؓ: ان النبی ﷺ ودی ذِمّیاً دیة المسلم (۹۷)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے ایک ذمی کی دیت وہی ادا کی جو ایک مسلمان کی دیت ہوتی ہے۔ (۹۷)

خلفاء راشدین کے زمانے میں اس اصول پر عمل ہوتا رہا اور اس عہد کی مثالیں حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

(i) سیدنا عمرؓ کے عہد میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا تھا معاملہ آپ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالہ کیا جائے چنانچہ اسے مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا گیا اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (۹۸)

(ii) سیدنا عمرؓ کی شہادت کے موقع پر عبیداللہ بن عمرؓ نے ہرمزان اور ابولؤلؤ کی بیٹی کو قتل کی سازش میں شریک ہونے کے شبہ میں قتل کر دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں یہ کیس ان کے سامنے پیش ہوا۔ جلیل القدر صحابہؓ کی رائے تھی کہ انہیں

---

(۹۵) ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب من قتل معاہداً/۳۸۶؛ ترمذی، کتاب الدیات، باب فمن تقتل نفساً معاہداً/۳۴۵

(۹۶) نیل الاوطار، باب دیۃ المعاہد، ۷/۵۵

(۹۷) نیل الاوطار باب دیۃ المعاہد، ۷/۵۵

(۹۸) برہان، شرح مواہب الرحمن، ۳/۲۰۷

(۹۹) تاریخ طبری، ۳/۲۶۷

قصاص میں قتل کیا جائے لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس سے دیت دے کر عبیداللہ بن عمرؓ کی جان بچائی۔(۹۹)

(iii) سیدنا علیؓ کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔قانونی کارروائی اور ثبوت مکمل ہونے پر آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔حکم کے نفاذ سے پہلے مقتول کے بھائی نے آکر کہا کہ میں نے خون معاف کیا۔آپ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: **لعلهم فزعوك اوهددوك.** شاید ان لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔اس نے کہا کہ ''نہیں مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائے گا''۔ اس پر آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا:

من كان له ذمتنا فدمه كدمنا و ديته كديتنا (۱۰۰)

جو کوئی ہمارا ذمی ہو تو اس کا خون ہمارے خون کی طرح ہے اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق آپ نے فرمایا:

انما قبلوا عقدة الذمة لتكون اموالهم كاموالنا و دمائهم كدمائنا (۱۰۱)

انہوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔

فقہاء نے اسی ارشاد سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اس کی دیت وہی ہوگی جو مسلمان کو قتل خطا سے لازم آتی ہے۔(۱۰۲) قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں۔ شعبیؒ، نخعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلم کو قتل کیا جائے گا۔(۱۰۳)

عزت کی حفاظت

جان کی حفاظت کی طرح عزت کی حفاظت میں بھی غیر مسلم مسلمان کے برابر ہے۔زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا، گالی دینا یا مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔حنفی فقہاء نے اسے وضاحت سے لکھا ہے:

و يجب كف الاذى عنه و تحرم غيبته كالمسلم (۱۰۴)

اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے، جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔

---

(۱۰۰) برہان،۲/۲۰۲

(۱۰۱) ایضاً

(۱۰۲) درمختار،۳/۲۰۳

(۱۰۳) نیل الاوطار،۷،کتاب الدماء،باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر

(۱۰۴) ایضاً،۳/۲۷۳

مال کی حفاظت

غیر مسلم کے مال کی حفاظت بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح مسلمان کے مال کی۔ اس سلسلے میں دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔ سیدنا علیؓ کے ارشاد **اموالھم کاموالنا** (۱۰۵) یعنی ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں۔ سے یہی مستنبط ہوتا ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غیر مسلم شہری کے مال کو ہڑپ کرے یا اسے نقصان پہنچائے۔

ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے قرن اول کے مسلمانوں کے بعض واقعات نقل کئے ہیں جن سے اہل ذمہ کے مال کی حفاظت کے سلسلے میں ان کے رویے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

صعصہؓ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب اہل ذمہ کی بستیوں سے گزرتے ہیں تو ان کی چیزوں میں سے کبھی کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: بلا قیمت؟ میں نے کہا ہاں! بلا قیمت۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی معمولی بات ہے) انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ وہی بات کہتے ہو جو اہل کتاب کہتے ہیں کہ:

لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی الله الکذب وھم یعلمون (۱۰۶)

ہمارے لئے امیوں' غیر اہل کتاب' کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان لگاتے ہیں۔ (۱۰۷)

ابو عبید اللہ یا ابو عبد اللہ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں سعدؓ کے ساتھ تھا رات راستہ میں گذارنی پڑی۔ پاس ایک ذمی کا مکان تھا۔ ہم نے اس کے مالک کو دریافت کیا لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ سعدؓ نے کہا' اگر کل کو خدا سے ایمان کے ساتھ ملنے کی آرزو رکھتے ہو تو خبردار اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ چنانچہ ہم نے اس کی دیوار کے نیچے بھوکے رات گذاری۔ (۱۰۸)

ابو الدرداءؓ کا حال یہ تھا اگر اہل ذمہ کی کسی بستی سے گذر ہوتا تو زیادہ سے زیادہ جو فائدہ وہ ان سے اٹھاتے وہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے کنوئیں سے پانی پی لیں' ان کے سایہ میں ستا لیں اور ان کی چراگاہ میں اپنے گھوڑے کو چرا لیں اور پھر اس کا بھی نقد یا جنس کی صورت میں ان کو معاوضہ دیتے۔ (۱۰۹)

عبادہ بن صامتؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے ذمیوں کی کسی بستی میں اپنے غلام کو مسواک کے لئے بھیجا

---

(۱۰۵) برہان، ۲/۲۸۴

(۱۰۶) آل عمران/ ۷۵

(۱۰۷) کتاب الاموال/ ۱۴۹

(۱۰۸) ایضاً/ ۱۵۰

(۱۰۹) ایضاً

لیکن پھر واپس بلا لیا اور کہا جانے دو' آج اس کی کوئی قیمت نہ سہی لیکن کل خشک ہو کر اس کی بھی قیمت ہوگی۔(۱۱۰)

سیدنا عمرؓ جابیہ میں تھے کہ ایک ذمی نے آ کر ان کو خبر دی کہ لوگوں نے ان کا انگوروں کا باغ تباہ کر ڈالا۔ سیدنا عمرؓ خود تحقیق کے لئے بڑھے تو دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لئے جا رہے ہیں۔ فرمایا: اچھا! آپ بھی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ امیر المؤمنین! بھوک نے ستایا تھا اس وجہ سے یہ حرکت ہوگئی۔ عمرؓ نے فوراً حکم دیا کہ باغ والے کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے (۱۱۱) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فوج کی زیادتیوں سے اہل ذمہ کے سامنے اپنی براءت کا اظہار کیا۔(۱۱۲)

اگرچہ اہل ذمہ سے یہ مفاہمت تھی کہ جہاں مسلمانوں کی بستی نہیں اور سرکاری انتظامات بھی نہیں وہاں سرکاری عمال اور عام مسلمان مسافروں کے لئے وہ بعض سہولتیں مہیا کریں گے۔ اس میں کھانا اور مَرکب کے لئے چارہ کے سوا اور کسی چیز کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا لیکن امام مالکؒ کی رائے یہ ہے کہ ان سے کوئی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔ امام صاحب کا قول ہے:

لا ینال منهم شیء الا بطیب انفسهم۔ قیل فالضیافة التی کانت علیهم! فقال: کان یخفف عنهم بها(۱۱۳)

ان سے اس کی مرضی کے بغیر کوئی چیز نہ لی جائے۔ کہا گیا کہ جو ضیافت جو ان کے ذمہ ہے تو فرمایا کہ وہ بھی کم سے کم ہو۔

معاشی حقوق کا تحفظ

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو معاشی سرگرمیوں کی اسی طرح آزادی ہے جس طرح مسلم شہریوں کو حاصل ہے۔ صنعت و حرفت' تجارت و زراعت اور دوسرے تمام پیشوں میں انہیں عام مسلمانوں کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور ان پر ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جا سکے گی جو مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔ معاشی میدان میں جدوجہد کا حق مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے مساویانہ ہوگا۔ تجارت کے جو طریقے مسلمانوں کے لئے ممنوع ہوں گے وہی غیر مسلموں کے لئے بھی ممنوع ہوں گے۔ البتہ غیر مسلموں کو شراب اور سور کا استثنا حاصل ہوگا۔ وہ شراب بنانے پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں۔ انہیں سور پالنے' کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں۔(۱۱۴) اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم شہری کی شراب یا اس کے سور کو نقصان پہنچائے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ فقہاء نے اس کی وضاحت کی ہے۔

ویضمن المسلم قیمة خمره و خنزیره اذا اتلفه (۱۱۵)

---

(۱۱۰) ایضا (۱۱۱) ایضا/۱۵۰

(۱۱۲) ایضا (۱۱۳) ایضا/۱۴۹

(۱۱۴) کتاب الخراج/۲۰۸۔۲۰۹؛ المبسوط/۱۳، ۳۷۔۳۸

مسلمان اس شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اسے تلف کر دے۔

شخصی معاملات (Personal Law)

غیر مسلموں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون (Personal Law) کے مطابق طے ہوں گے۔ مسلمانوں کے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے وہ ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا بلکہ ان معاملات میں ان کے مذہبی و قومی قانون کا خیال رکھا جائے گا اور اسلامی عدالت انہی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح یا بلا مہر نکاح' یا زمانہ عدت کے اندر نکاح ثانی یا محرمات کے ساتھ نکاح اگر ان کے ہاں جائز ہوں تو انہیں جائز قرار دیا جائے گا۔ خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے تمام ادوار میں اسلامی حکومتوں کا اس پر عمل رہا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس معاملے میں حسن بصریؒ سے اس معاملہ میں فتویٰ طلب کرتے ہوئے لکھا تھا:

مابال الخلفاء الراشدين تركوا اهل الذمة و ما هم عليه من نكاح المحارم و اقتناء الخمور والخنازير (١١٦)

کیا بات ہے کہ خلفاء راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح اور شراب اور سور کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا؟

حسن بصریؒ نے جواب میں لکھا:

انما بذلوا الجزية ليتركوا وما يعتقدون وانما انت متبع ولا مبتدع والسلام (١١٧)

انہوں نے جزیہ دینا اس لئے قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام پچھلے طریقے کی پیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا۔

فقہاء نے اس سلسلے میں جو تفصیلات لکھی ہیں ان کے مطابق اگر فریقین اسلامی عدالت سے درخواست کریں کہ ان کا فیصلہ شریعت اسلامی کے مطابق کیا جائے تو عدالت شریعت کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ اگر شخصی قانون میں ایک فریق مسلمان ہو تو فیصلہ شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا۔ جیسے کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی اور وہ شخص فوت ہو گیا تو عورت کو شریعت کے مطابق عدت وفات گذارنی ہوگی اور اگر وہ عدت کے اندر نکاح کرے گی تو وہ نکاح باطل ہوگا۔ (۱۱۸)

---

(۱۱۵) در المختار، ۳/۲۷۳

(۱۱۶) المبسوط، ۵/۳۸۔۴۱: کتاب الاموال/۳۶

(۱۱۷) ایضاً۔ امام ابو یوسف نے مجوسیوں کے سلسلے میں عمر بن عبدالعزیزؒ کا خط نقل کیا ہے جس کا مفہوم اس سے ملتا جلتا ہے' کتاب الخراج، فصل فی المجوس /۱۳۰

(۱۱۸) ایضاً

مذہبی آزادی

اسلامی ریاست غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کو یقینی بنائے گی انہیں اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر کو ادا کرنے کی اجازت ہوگی البتہ اس میں اتنی تفصیل ضروری ہے کہ وہ اپنی بستیوں میں پوری آزادی کے ساتھ پبلک میں اعلان واظہار کے ساتھ ادا کرسکیں گے اور خالص اسلامی آبادیوں میں ادا کرنے کے لئے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہوگا۔ حکومت کو اختیار ہے کہ مصالح مسلمین کے لئے وہ کسی اظہار پر پابندی لگائے۔ صاحب بدائع لکھتے ہیں:

لا یمنعون من اظهار شئی مماذکرنامن بیع الخمرو الخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیر من اهل الاسلام و انما یکره ذلك فی امصار المسلمین و هی التی یقام فیها الجمع والاعیاد والحدود......... و أما اظهار فسق یعتقدون حرمته کالزنا وسائر الفواحش التی حرام فی دینهم فانهم یمنعون من ذلك سواء کانوا فی امصار المسلمین اوفی امصارهم (۱۱۹)

جو بستیاں امصار مسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب وخنزیر بیچنے، صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا۔ خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال امصار مسلمین میں ناپسندیدہ ہیں یعنی ان شہروں میں جنہیں جمعہ وعیدین اور اقامت حدود کے لئے مخصوص کیا گیا ہو رہا وہ فسق جس کی حرمت کے خود وہ بھی قائل ہیں مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں حرام ہیں تو اس کے علاوہ ارتکاب سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا خواہ امصار مسلمین میں ہوں یا خود اپنے امصار میں۔

اپنے قدیم معابد کے اندر وہ تمام شعائر کا اظہار کرسکتے ہیں۔ حکومت اسلامیہ اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ (۱۲۰) لیکن امصار مسلمین میں ان صلیبوں، اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (۱۲۱)

عبادت گاہیں

مسلمان آبادیوں میں غیر مسلموں کے قدیم معابد سے تعرض نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان کی ٹوٹ پھوٹ ہو تو انہیں دوبارہ اسی جگہ پر بنانے کا حق ہے لیکن نئی عبادت گاہیں بنانے کا حق نہیں ہے۔ (۱۲۲) وہ مقامات جو امصار مسلمین نہیں ہیں

---

(۱۱۹) البدائع والصنائع، ۷/۱۱۳

(۱۲۰) شرح السیر الکبیر، ۳/۲۵۱

(۱۲۱) ایضاً

(۱۲۲) بدائع، ۷/۱۱۳، شرح السیر الکبیر، ۳/۲۵۱

تو ان میں غیر مسلموں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اسی طرح وہ مقامات جو امصار مسلمین نہیں رہے یعنی وہاں اقامت جمعہ و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہو ان میں بھی غیر مسلموں کو نئے معابد کی تعمیر اور اپنے شعائر کے اظہار کا حق ہے۔ (۱۲۳) امام ابو یوسف نے ابن عباسؓ کی رائے ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

اما مصر مصرته العرب فليس لهم ان يحد ثوا فيه بناء بيعة و لا كنيسة و لا يضربوا فيه بنا قوس و لا يظهر وا فيه خمراً و لا يتخذوا فيه خنزيراً۔ و كل مصر كانت العجم مصرته ففتحه الله على العرب فنزلوا على حكمهم فللعجم ما فى عهد هم و على العرب ان يوفوا لهم بذلك (۱۲۴)

جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد و کنائس تعمیر کریں، ناقوس بجائیں یا علانیہ شراب اور سور کا گوشت بیچیں۔ باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے حکم کی اطاعت قبول کر لی تو عجم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور مسلمانوں پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

عام ملکی قانون

شخصی معاملات میں انہیں استثناء حاصل ہے لیکن عام ملکی قانون میں ان کی وہی حیثیت ہوگی جو عام مسلمان شہری کی مثلاً وہ فوجداری اور دیوانی قانون میں مسلمانوں کے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تعزیرات کا قانون مسلم و غیر مسلم کے لئے یکساں ہوگا۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی غیر مسلم کو دی جائے گی۔ غیر مسلم کا مال مسلمان چرانے یا مسلمان کا مال غیر مسلم چرا لے دونوں صورتوں میں اسلامی حد نافذ ہوگی۔ غیر مسلم کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے یا مسلمان ایسا کرے دونوں صورتوں میں ایک ہی حد قذف جاری ہوگی۔ اسی طرح زنا کی سزا بھی غیر مسلم اور مسلم کے لئے یکساں ہے البتہ شراب کے معاملہ میں غیر مسلموں کو استثناء حاصل ہے۔ (۱۲۵)

امام مالکؒ کے نزدیک ذمی کے لئے بھی شراب کی طرح زنا کے معاملہ میں بھی استثناء ہے۔ وہ سیدنا عمرؓ اور سیدنا علیؓ کے اس فیصلہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ذمی اگر زنا کرے تو اس کا معاملہ اس کے اہل ملت پر چھوڑ دیا جائے یعنی اس کے شخصی قانون کے مطابق عمل کیا جائے۔

اسی طرح دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان برابر ہیں اس مساوات کا طبعی لازمہ یہ ہے کہ دیوانی قانون کی رو سے

---

(۱۲۳) ایضاً، شرح السیر الکبیر، ۳/ ۲۵۷

(۱۲۴) کتاب الخراج، فصل فی الکنائس والصلبان/ ۱۴۹

(۱۲۵) کتاب الخراج ۲۰۸-۲۰۹، [illegible]

جتنی پابندیاں مسلمان پر عائد ہوتی ہیں وہی سب غیر مسلموں پر عائد ہوں گی۔ مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر ٹیکس لیا جائے گا جب ان کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہو جائیں اس سے کم پر ٹیکس نہ ہوگا۔(۱۲۶)

یہ نصاب اس وقت کے لئے تھا ظاہر ہے کہ آج کی حکومتیں اپنے ٹیکس کے نظام میں جو حد مسلمانوں کے لئے مقرر کریں گی وہی غیر مسلموں کے لئے بھی ہوگی۔ اصل بات مالی معاملات میں غیر مسلموں اور مسلموں کے درمیان مساوات کی ہے۔

آزادی تحریر و تقریر

غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں تحریر و تقریر اور رائے اور مافی الضمیر کے اظہار کی اور اجتماع کی وہی آزادی حاصل ہوگی جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اس سلسلے میں جو قانونی پابندیاں مسلمانوں کے لئے ہوں گی وہی ان کے لئے بھی ہوں گی:۔

(i) غیر مسلم قانون کی حدود میں رہتے ہوئے حکومت پر اس کے حکام پر اور خود رئیس مملکت پر آزادانہ تنقید کر سکیں گے۔

(ii) قانون کی حدود کے اندر غیر مسلموں کو مذہبی بحث و مباحثہ کی ویسی ہی آزادی ہوگی جیسی مسلمانوں کو۔

(iii) وہ اپنے مذہب کی حقیقت اور اس کی خوبیاں بیان کرنے میں پوری طرح آزاد ہوں گے اگر ایک غیر اسلامی مذہب کا پیرو کسی دوسرے غیر اسلامی مذہب کو قبول کرے تو اسلامی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اسی طرح ایک غیر مسلم کی تاثیر سے کوئی مسلمان اپنا مذہب چھوڑے گا تو غیر مسلم سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا البتہ مرتد ہونے والے مسلمان کو سزا دی جائے گی کیونکہ اسلامی ریاست کی حدود میں کسی مسلمان کو اپنا دین بدلنے کی اجازت نہیں۔

(iv) کسی غیر مسلم کو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی عقیدہ یا عمل اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور اپنے ضمیر کے مطابق وہ ایسے سب کام کر سکیں گے جو ملکی قانون سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔(۱۲۷)

ملازمتیں

چند مخصوص مناصب کے سوا وہ تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کے حق دار ہوں گے اور اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی تعصب نہیں برتا جائے گا۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے لئے اہلیت کا ایک ہی معیار ہوگا اور اہل آدمیوں کا بلا امتیاز انتخاب کیا جائے گا۔(۱۲۸)

اسلامی ریاست چونکہ ایک نظریاتی ریاست ہے اس لئے ایسے تمام مناصب جو اس ریاستی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور پالیسی سازی یا پالیسی کی تنفید میں بنیادی ذمہ داری رکھتے ہیں ان پر کوئی غیر مسلم متعین نہیں ہوگا۔ مثلاً وہ

---

(۱۲۶) کتاب الخراج فصل فی العشور/۱۳۳

(۱۲۷) سید مودودی، اسلامی ریاست/ ۳۶۵، مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست/۲۴۱

(۱۲۸) ایضاً، مولانا اصلاحی/۲۴۲

رئیس مملکت نہیں بن سکیں گے کیونکہ رئیس مملکت نے اصولِ اسلام کے مطابق ریاست کا نظام چلانا ہے لہٰذا جو شخص اس اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتا وہ سلطنت کا نظام کیسے چلائے گا۔ (۱۲۹) اسلامی ریاست لادین جمہوریتوں اور سیکولر ریاستوں کی طرح فریب کاری نہیں کرتی کہ اعلان تو مساوی مواقع کا ہو لیکن عملاً اقلیت کے کسی آدمی کو اپنے مذہب کے مطابق پالیسی سازی اور پالیسی کی تنفیذ کے منصب پر فائز ہونا ممکن نہیں۔ ہاں دکھاوے کے لئے ایسے آدمی کو آگے لایا جا سکتا ہے جو اپنے مذہب سے منحرف اور اکثریت کی پالیسی کا حامی ہو۔ اسلامی ریاست ایسی منافقانہ پالیسی سے انکار کرتی ہے اور اپنے واضح موقف کا اعلان کرتی ہے۔

اسی طرح داخلی استحکام خارجہ تعلقات، نظام تعلیم اور نفاذ شریعت جیسے امور کی سربراہی صرف مسلمان کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ تمام بڑے انتظامی مناصب پر غیر مسلم فائز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی چیز انہیں اکاؤنٹنٹ جنرل، چیف انجینئر یا پوسٹ ماسٹر جنرل بنائے جانے میں مانع نہیں۔ (۱۳۰)

پارلیمنٹ

کسی غیر مسلم کے لئے وزیر، سپہ سالار، یا قاضی بننا ممنوع ہے کیونکہ پالیسی کے نفاذ کے ذرائع میں اصولی طور پر تو اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ میں غیر مسلم شریک نہیں ہو سکتے۔ لیکن موجودہ زمانے کے حالات میں اس کے لئے گنجائش نکالی جا سکتی ہے بشرطیکہ ملک میں اس بات کی واضح اور صریح ضمانت موجود ہو کہ:

(الف) پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی کرنے کی مجاز نہ ہوگی اور ہر فیصلہ جو اس حد سے متجاوز ہوگا قانونی سند حاصل کرنے سے محروم ہوگا۔

(ب) ملک کے قانون کا اولین ماخذ قرآن و سنت ہوں گے۔

(ج) قوانین کی آخری توثیق کا اختیار جس شخص کو حاصل ہوگا وہ لازماً مسلمان ہوگا۔ (۱۳۱)

روزگار اور کفاف کا ذمہ

غیر مسلموں کے بے کاروں کے لئے روزگار مہیا کرنے کا اور ان کے معذوروں اور ان کے متعلقین کے لئے بیت المال سے ان کی ضرورت کے مطابق وظیفہ کا ذمہ لیا جا سکتا ہے (۱۳۲)

......☆......

---

(۱۲۹) ایضاً/۳۶۳، حوالہ اصلاحی/۲۴۴

(۱۳۰) ایضاً ۳۶۰ [illegible]

[illegible] ۳۰۳

[illegible] ۲۲

اسلام اور بنیادی انسانی حقوق

دور حاضر میں انسانی حقوق کی بات ایک فیشن کی صورت اختیار کر گئی ہے اور اس کا سبب وہ ظلم و جور ہے جو انسان نے روا رکھا ہے۔ اسی لیے انسان کے بارے میں خود انسانوں کے درمیان بار بار یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ بقول سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''قانون فطرت نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے لیے اگر غذا بنایا ہے تو وہ صرف غذا کی حد تک ہی اس پر دست درازی کرتا ہے، کوئی درندہ ایسا نہیں ہے جو غذائی ضروریات کے بغیر بلا وجہ جانوروں کو ہلاک کرتا ہو...... یہ انسان ہی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر اسی کی دی ہوئی قوتوں سے اپنی ہی جنس پر ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ ایک اندازہ کے مطابق انسان کے اس روئے ارض پر آنے سے آج تک تمام حیوانات نے اتنے انسانوں کی جان نہیں لی جتنی انسانوں نے صرف دوسری جنگ عظیم میں انسانوں کی جان لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں کے بنیادی حقوق کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ خالق انسان ہی نے اس سلسلہ میں انسان کی رہبری کی اور پیغمبروں کی وساطت سے انسانی حقوق کی واقفیت بہم پہنچائی ہے''۔(۱)

انسان اجتماعی شعور رکھنے والی مخلوق ہے اور اجتماعیت کا پہلا تقاضا حقوق و فرائض کا تعین اور اس کے مطابق عمل ہے جس کے بغیر کوئی اجتماعیت، خواہ سادہ ہو یا ریاست کی صورت میں منظم، قطعاً نہیں چل سکتی۔ باہمی زندگی میں 'کچھ لو اور کچھ دو' کا اصول ضروری ہے ورنہ معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ ابن سینا نے ''الشفاء'' میں لکھا ہے کہ انسان اجتماعی مزاج رکھتا ہے۔ اجتماعی زندگی سے روابط پیدا ہوتے ہیں اور ان روابط کی تنظیم کے لیے انسان قوانین کا محتاج ہے۔ یہ قوانین حقوق و فرائض کا بھی تعین کرتے ہیں۔ حقوق کی تفصیلی بحث میں جانے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حق کے مفہوم کا تعین کر لیا جائے۔ حقوق حق کی جمع ہے اور اس کے اصلی معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ علمائے لغت (۲) نے حق کے کئی معنی بیان کیے ہیں جن کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا لیکن عام طور پر چار معانی میں یہ استعمال ہوتا ہے۔

حق کے تمام معنی لازم ہے (۳) ہیں۔ واجب اور جائز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد وہ ذمہ داری بھی ہوتی ہے جو کسی اور شخص سے ایک آدمی پر عائد ہوتی ہے۔ حقوق و فرائض کا گہرا تعلق ہے اگر ایک کے حقوق ہیں تو وہی دوسرے کے فرائض بن جاتے ہیں۔ حق کے تصور سے متعلق متعدد نظریے پیش کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً قدرتی، قانونی، تاریخی، اخلاقی اور فلاحی نظریے وغیرہ۔ حقوق کے ان تمام نظریات میں زندگی اور سوسائٹی کے کسی ایک پہلو کا ذکر ملتا ہے

٥

(۱) [illegible] ۵۵۰

(۲) [illegible] ۳۶

(۳) [illegible]

کے تصور معاہدہ عمرانی کا جائزہ لیا۔

2- انقلاب فرانس کے بعد ''منشور حقوق انسانی''(Declaration of the Rights of Man)1789ء میں نمودار ہوا جس میں قوم کی حاکمیت، آزادی، مساوات، ملکیت کے فطری حق، ووٹ کا حق، قانون سازی کا اختیار، ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات، تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا(Trial by Jury)وغیرہ کا اثبات کیا گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد مغرب میں انسانی حقوق کے حوالے سے عوام میں اور حکومتی سطح پر مسلسل کاوشیں ہوتی ہیں۔ اس میں امریکی اعلان آزادی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس اعلان آزادی کا مسودہ تھامس جیفرسن (Thomas Jefferson) کا تیار شدہ ہے جو انگریز مفکرین بالخصوص جان لاک(John Locke) کے نظریات پر مبنی تھا۔ 1789ء میں فرانس کی قومی اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور (Declaration of the Rights of man) منظور کیا۔

1792ء میں تھامس پین (Thomas Paine) نے ایک کتابچہ بعنوان(The Rights of Man) شائع کیا جو ایک ماخذ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ امریکہ میں انسانی حقوق کے حوالے سے قانون سازی ہوتی رہی اور ان کے تحفظ کا اہتمام بھی ہوتا رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور متعدد یورپی ممالک میں بنیادی حقوق کو دساتیر میں شامل کیا گیا۔

حقوق کی ساری بحث کا دارومدار معاہدہ عمرانی پر ہے۔ یہ ایک موہوم تصور ہے جو فرد اور معاشرے کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے سیاسی مفکرین نے پیش کیا۔ (۵) معاہدہ عمرانی پر لکھنے والوں نے واضح طور پر کہا کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ریاستیں اور حکومتیں ارادتاً کسی معاہدہ کے ذریعہ سے وجود میں نہیں آئیں بلکہ فطری طور پر ایک خاندان یا قبیلہ کی طرف ابتدائی گروہ بندیوں سے بتدریج قائم ہوئی ہیں۔ (۶) پروفیسر الیاس کے بقول ''انسان کی پوری سیاسی تاریخ میں ہمیں کوئی ایک واقعہ یا ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں ریاست کی تشکیل کے لیے معاہدہ عمرانی کو استعمال کیا گیا ہو''۔ (۷) یہی وجہ ہے کہ مغربی حکومتوں نے جب چاہا انسانی حقوق کو نظر انداز کر کے ظالمانہ کارروائیاں جاری رکھیں۔ دور حاضر میں امریکہ نے بنیادی انسانی حقوق کو کمزور قوموں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا، انہیں مسلسل دباؤ میں رکھ کر سیاسی و معاشی فوائد حاصل کیے اور جب چاہا اپنے آپ کو بالاتر سمجھ کر ان حقوق کی بے دریغ پامالی کی۔

1940ء میں ایچ جی ویلز (H-G.Wells) نے اپنی کتاب (New World Order) میں انسانی حقوق کے ایک منشور کو جاری کرنے کی تجویز پیش کی اور 1941ء میں منشور اوقیانوس(Atlantic Charter) پر دستخط ہوئے

---

(۵) The Social Contract 4

(۶) Protection of Human Rights under the law 3

(۷) The Social Contract and the Islamic State 1

جس کا مقصد بقول چرچل ''انسانی حقوق کی علمبرداری کے ساتھ جنگ کا خاتمہ تھا''۔1946ء میں فرانس نے 1789ء کے منشور انسانی حقوق کو اپنے دستور میں شامل کیا اور اسی سال جاپان نے بھی انسانی حقوق کو دستور میں شامل کیا۔1947ء میں اٹلی نے اپنے دستور میں بنیادی انسانی حقوق کو شامل کیا۔

3- جمہوری فلسفہ کے تحت یو۔این۔او نے بہت سے مثبت اور تحفظاتی حقوق کے متعلق قراردادیں پاس کیں اور بالآخر ''عالمی منشور حقوق انسانی'' منظر عام پر آیا۔جس میں وہ تمام حقوق سمو دیئے گئے جو مختلف یورپی ممالک کے دساتیر میں تھے۔

4- دسمبر 1946ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد پاس کی جس کی رو سے نسل کشی کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جرم قرار دیا گیا۔

5- دسمبر 1948ء میں نسل کشی کے انسداد اور سزادہی کے لیے ایک قرارداد پاس کی گئی، 12 جنوری 1951ء سے اس کا نفاذ ہوا۔عالمی منشور کی قرارداد کے حق میں 48 ووٹ آئے جبکہ روس سمیت 8 ممالک نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔دسمبر 1948ء کے منظور شدہ ''عالمی منشور حقوق انسانی'' کے دیباچہ میں یہ الفاظ مذکور ہیں:

''بنیادی انسانی حقوق میں، فرد انسانی کی عزت واہمیت میں، مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موثق بنانے کے لیے۔''

متذکرہ بالا پورے منشور کے کسی جز سے کسی بھی قوم کے نمائندوں نے اختلاف نہ کیا کیونکہ یہ عام اصولوں کا اعلان تھا، معاہدہ نہ تھا۔یہ واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔علاوہ ازیں اس مختصر سے بیان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اول تو مغرب میں انسانی حقوق کے تصور کی تاریخ ہی صرف چند صدیوں پر محیط ہے۔دوم اس کے پیچھے کوئی سند نہیں ہے۔اس کے برعکس اسلام نے حقوق انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم بھی ہے اور بہتر بھی۔اور ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ نے چھوڑی ہیں۔اسلام نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں ان کا جائزہ لینے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کے مقام کے بارے میں بھی اسلام کا تصور جان لیں جسے وہ ارفع حقوق دیے گئے ہیں اور جن کا ابھی ہم ذکر کرنے والے ہیں۔

مقام انسانی کا تعین

انسان کو ابتدا سے ہی اپنے متعلق ایک بڑی غلط فہمی رہی ہے جو اب تک برقرار ہے۔کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ بلند ہستی سمجھ لیتا ہے۔تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے اور وہ ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (۸) (ہم سے بڑا طاقتور کون؟) اور ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (۹) (تمہارا سب سے بڑا مالک میں ہوں) کی

(۸) فصلت/۱۵ (۹) النازعات/۲۴

صدا بلند کرتا ہے اور ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اور کبھی یہی انسان تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ، بادل، چاند، سورج اور دیگر مظاہر فطرت غرضیکہ ہر اس چیز کے آگے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا منفعت اسے نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو دیوتا یا معبود مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصلی حقیقت اس کے سامنے پیش کی۔ قرآن پاک میں بے شمار مقامات پر انسان کے مقام کی نشاندہی کی گئی ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ○ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (۱۰)

(جب یہ بات ہے) تو انسان کو (قیامت کی فکر کرنی چاہیے اور) دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو پشت اور چھاتی (یعنی تمام بدن) کے درمیان سے نکلتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ (۱۱)

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا سو وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۱۲)

اے انسان تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے، جس نے تجھ کو (انسان) بنایا پھر تیرے اعضاء کو درست کیا پھر تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا (اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا۔

شرف انسانیت

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ میں انسان کے تکبر کو توڑا گیا ہے اور اس کے زعم باطل پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ دوسری جانب اسلام نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل اور حقیر بھی نہیں جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۱۳)

کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (۱۴)

---

(۱۰) الطارق/۵۔۷ (۱۱) یٰسین/ ... ۔۷۸
(۱۲) الانفطار/۶۔۸ (۱۳) التین/۴
(۱۴) الاسراء/۷۰

اور ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۱۵)

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدے میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے تو ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے۔

وہ مظاہر فطرت جن کی پرستش انسان نے کی، وہ تو دراصل اس کی خدمت کے لیے خلق کی گئی تھیں اسے ان کے سامنے نہیں جھکنا چاہیے۔ قرآن پاک میں اس بات کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۱۶)

جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔

الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۱۷)

وہ ایسا (قادر) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے۔ پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ (۱۸)

اور اس نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔

قرآن پاک اشیاء کائنات کو انسان کے لیے فائدہ مند، خدمت گزار اور مسخر قرار دے رہا ہے۔ ان کے سامنے سر بسجود ہونا اور ان سے حاجت روائی کی دعا کرنا نہ صرف انسان کی عاقبت نااندیشی ہے بلکہ اس کے لیے باعث ذلت بھی ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبوی ﷺ سے بھی انسان کی عظمت ثابت ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (۱۹)

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: لَا تَقُوْلَنَّ قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَكَ...... فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (۲۰)

یہ نہیں کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرے کو بگاڑے...... کہ خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

---

(۱۵) البقرہ/۳۴ (۱۶) البقرہ/۲۹

(۱۷) یٰسین/۸۰ (۱۸) النحل/۵

(۱۹) مشکوٰۃ، کتاب وآداب/ ۳۹۷

(۲۰) [illegible] ب المفرد، باب لا تقل قبح اللہ وجہک، ص ۱۰

مندرجہ بالا آیات واحادیث میں انسانی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسی فضیلت جس میں اور کوئی مخلوق شامل نہیں۔ یہی اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا راز ہے حتٰی کہ اسے خالق کائنات نے اپنا نائب اور خلیفہ فی الارض بنایا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲۱)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپؐ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین پر ایک نائب۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (۲۲)

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی سوانہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

یہاں نیابت خداوندی اور خلافت الٰہی سے انسانی عظمت مثبت طور پر واضح ہے۔

نیابت خداوندی اور خلافت الٰہی دراصل اطاعت کا وہ عہد ہے جو حقوق انسانی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ آدمؑ کو روئے زمین پر اتارنے کے ساتھ جو ہدایت دی گئی تھی۔ وہ اطاعت الٰہی کے ساتھ بندگان خدا اور خلق خدا کے سلسلے میں حقوق وفرائض کا ایک ضابطہ تھا جو انسانی زندگی کے ارتقائی سفر میں مختلف تشریحات وتوجیہات کے ساتھ انبیاء کرامؑ کے ذریعہ سے انسانیت کو عطا ہوتا رہا تا آنکہ پیغمبر آخرالزمان ﷺ پر انسانیت کی تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ اپنے کمال کو پہنچ کر مکمل ہو گیا۔ غور کریں تو حقوق انسانی کی سند وحی الٰہی ہے جس کا مصدر خالق کائنات ہے اور جس کا مہبط نبی ورسول کی ذات ہے۔ اس سلسلہ سند کو قرآن کی زبان سے واضح کر دیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۲۳)

اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے لیے منتخب کیا یہ ایک ہی سلسلے کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ. كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ. اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ. (۲۴)

---

(۲۱) البقرہ/۳۰ (۲۲) الاحزاب/۷۲
(۲۳) آل عمران/۳۳-۳۴ (۲۴) الشوریٰ/۱۳

اللہ نے مقرر کیا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کی ہدایت کی گئی ابراہیم اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اس تائید کے ساتھ کہ تم لوگ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

حقوق کا اسلامی تصور

شرف انسانیت کے بعد حقوق کے اسلامی تصور کا ذکر کرتے ہیں، جس سے واضح ہوگا کہ اسلام نے انسانیت کو کیا عطا کیا ہے؟ اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کے پیدائشی حقوق بھی ہیں اور ریاست کے عطا کردہ بھی، اجتماعی بہبود کا لحاظ بھی ضروری ہے اور اخلاقی حدود کا خیال بھی ناگزیر ہے۔ اس اعتبار سے حقوق اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور کوئی فرد، سوسائٹی اور ریاست ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ بلاشبہ فرد کی فلاح اور سوسائٹی کی بقا دونوں ضروری ہیں اور ان کے درمیان توازن کا خط کھینچنا ضروری ہے اور یہ توازن وحی والہام کی غیر جانبدارانہ تعلیم کے سوا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین اگر احکام خداوندی کے خلاف حکم دے تو ایک عام آدمی بھی اسے رد کر سکتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ۔ (۲۵)

اللہ تعالیٰ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت کی گنجائش نہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا تصور جامع اور کامل ہے۔ اسلام حقوق کی بحث میں فرد کو بے لگام نہیں ہونے دیتا اور اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مصالح عامہ کے خلاف حرکتیں کرتا پھرے۔ مغرب کی تاریخ اور اس کے سیاسی ارتقاء سے واقف لوگوں کے نزدیک انسان کے حقوق کی تاریخ یو۔ این۔ او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہے یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna Carta) سے۔ حالانکہ یہ بات بداہتاً غلط ہے۔ اسلام نے تو انسانی حقوق کی ضمانت اس وقت دی جب دنیا اس کے تصور تک سے ناآشنا تھی۔

اسلام ایک فطری دین ہے جس کے مطابق یہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے کا لحاظ رکھا جائے۔ حتیٰ کہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے سلسلے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً نباتات کو بے مقصد نہ کاٹا جائے، حیوانات کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اس میں انسان کے متعلق تو اس قدر تفصیلی ہدایات ہیں کہ کسی دیگر مذہب اور کسی معاشرتی وسیاسی نظام میں نہیں پائی جاتیں۔ اسلام فرد سے آغاز کر کے اجتماعیت کے نقطہ عروج تک سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ اسلام نے حقوق کی اقسام بیان کی ہیں۔ پھر ان کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے اور اس خوش اسلوبی سے اسے سمیٹا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے حقوق کی اقسام بیان کی ہیں۔ مثلاً وہ حقوق کو اخلاقی، قانونی، سیاسی ومعاشی حقوق میں تقسیم کرتا ہے۔ اخلاقی حقوق میں

---

(۲۵) مشکاۃ باب الامارۃ والقضاء /۳۲۱

وہ انفرادی و اجتماعی حقوق آ جاتے ہیں جن کی ادائیگی اخلاقی بنیادوں کے لیے ضروری ہے اگر چہ ان کے لیے قانونی و سیاسی بندش نہیں تاہم معاشرتی احساس کا تقاضا اور شرف انسانیت کا مطالبہ ہے کہ انہیں ادا کیا جائے۔ اس کے بعد وہ حقوق آتے ہیں جن کا لحاظ نہ کیا جائے تو اجتماعیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ ایسے حقوق کی پامالی پر قانونی گرفت ہوتی ہے۔ اسلام ان حقوق کا تحفظ قانون کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ عدم لحاظ کی صورت میں اس کے لیے حد اور سزا قائم کرنا قانون کا کام ہے۔ اس سے ملتے جلتے وہ حقوق ہیں جو ایک ریاست اپنے شہریوں کو دیتی ہے۔ گویہ حقوق فطری ہیں اور ہر منظم شہریت اس بات کی پابند ہے کہ ان میں رکاوٹ نہ ڈالے لیکن پھر بھی ریاست کا اعلان ضروری ہے۔ اس کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں انسانیت اپنے وسیع مفہوم میں حقوق کا تعین کرتی ہے اور اس کے لیے کوئی مذہبی، لسانی، جغرافیائی اور معاشی حد بندیاں نہیں ہوتیں۔ ان کا مستحق ہر وہ متنفس ہے جس پر لفظ انسان صادق آتا ہے۔ جس طرح اسلام نے حقوق انسانی کو مرتب صورت میں پیش کیا ہے اور اس کا خیال رکھنے کے لیے اصول و ضوابط دیے ہیں وہ کسی نظام میں نہیں پائے جاتے۔ ان کے بعض حصے ضرور کہیں نہ کہیں پائے جاتے ہیں لیکن وہ تفصیل و ترتیب نہیں جو اسلام نے مہیا کی ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص، اسوہ رسول ﷺ اور عمل صحابہؓ سے ان کی بہترین تشریح ہو سکتی ہے۔

حقوق کی اہمیت:

جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے اس کی اہمیت سے کسی بھی ذی فہم کو انکار نہیں ہو سکتا۔ انسانی معاشرہ میں حقوق کی اہمیت کا اندازہ لاسکی کے اس فقرہ سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

Rights, in fact are those conditions of social life without which no man can seek, in general, to be himself at his best. (26)

مغربی مفکرین دعوٰی کرتے ہیں کہ بنیادی انسانی حقوق کی تاریخ صرف چند صدیوں کی تاریخ ہے اور مغرب نے بڑی جدوجہد کے بعد جو کچھ حاصل کیا ہے آج پوری دنیا اس سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ لیکن قرآن نے جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن اولین انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا بنیادی حقوق اسی دن سے اس کے احساس و شعور کا حصہ ہیں اور ان کا حصول و تعین ان کا اپنا کارنامہ نہیں بلکہ خود مقتدر اعلیٰ نے اسے بتدریج یہ حقوق عطا کیے ہیں۔ وحی الٰہی نے ہی بنیادی حقوق کا شعور پیدا کیا ہے۔ قرآن کی پیش کردہ تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فطری حقوق (Natural Rights) اور پیدائشی حقوق (Birth Rights) کی اصطلاحوں کے بارے میں واضح تصور موجود ہے جبکہ مغربی تصور حقوق میں کافی ابہام پایا جاتا ہے۔ اسلام نے حقوق کے فطری اور پیدائشی پہلو کو واضح کیا ہے کیونکہ ان حقوق کا عطا کرنے والا اللہ خالق و مالک ہے۔ وحی الٰہی ہی حدود و قیود متعین کرتی ہے۔ ریاست اور شہری دونوں

Grammar of politics/91 (26)

قرآن وسنت کے ایک ایسے ناقابل ترمیم اور ناقابل تنسیخ (Irrevocable) دستور کے تحت زندگی بسر کرنے کے پابند ہیں جس کی کوئی ایک دفعہ بھی ان کے درمیان قابلِ گفت وشنید (Negotiable) نہیں۔

حقوق کی درجہ بندی

بقول سید سلیمان ندویؒ "اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ دار کوئی تفصیل نہیں۔ انسان اور حیوان کے درمیان بھی کوئی خط فاصل نہیں۔ مثلاً بدھ کی اخلاقی تعلیم میں انسان اور حیوان کے اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور انسان کا قتل برابر کا درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی منفعت رسانی کے باعث ماں کا درجہ پا سکتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت داروں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا۔ لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں فطری تفصیل سے کام لیا ہے" (۲۷) اسلام نے یہ ترتیب اخلاقی حقوق میں رکھی ہے، مثلاً سورہ النساء میں انہیں اس طرح بیان فرمایا:

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (۲۸)

اور والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور اہل قرابت کے ساتھ بھی اور یتیموں اور غرباء کے ساتھ بھی اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۹)

آپؐ فرما دیجیے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نیک کام کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (۳۰)

اور قرابت دار کو اس کا حق (مالی وغیر مالی) دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی دیتے رہنا اور (مال کو) بے موقع

---

(۲۷) سیرۃ النبی ۶، ۲۱۰ (۲۸) النساء ۳۶

(۲۹) [illegible] ۲۱۵ (۳۰) [illegible] ۲۶

مت اڑانا۔

اس ترتیب میں فطری تعلق اس طرح سمولیا گیا ہے کہ انسان اعتدال وتوازن سے نہیں ہٹتا۔حدیث نبوی ﷺ میں انسان کے ذاتی حقوق کا بھی ذکر ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّه. (۳۱)

تیرے پروردگار کا تجھ پر حق ہے۔تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔تیرے عیال کا تجھ پر حق ہے۔سو تجھے ہر حق دار کا حق دینا چاہیے۔

عن عبدالله بن عمرو بن العاص قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم: يَا عَبْدَ اللّٰهِ أَلَمْ أُخْبَرْ أَنَّكَ تَصُمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّيْلَ فقلت: بَلٰى يَا رَسُولَ الله صلى الله عليه وسلم قَالَ: فَلَا تَفْعَلُ صُمْ وَأَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (۳۲)

عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ صحیح خبر نہیں دی گئی کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو،انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو۔روزہ رکھو اور افطار بھی کرو کیونکہ تیرے وجود کا تجھ پر حق ہے۔تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے،تیرے مہمان کا تجھ پر حق ہے۔

حقوق کی اس تفصیل میں اجتماعی ضرورت اور معاشرتی اساس کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔مثلاً قرآن وسنت میں ان حقوق کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ ترتیب رکھی گئی ہے۔

حقوق والدین،حقوق اولاد،حقوق زوجین،اہل قرابت کے حقوق،ہمسایہ کے حقوق،یتیموں کے حقوق،بیواؤں کے حقوق،حاجت مندوں کے حقوق،بیماروں کے حقوق بلکہ اس سے بڑھ کر جانوروں کے حقوق اور نباتات کے حقوق کا بھی ذکر ہے۔ان میں ہر ایک کے متعلق ایسا جامع اور اتنا انسانی اور فطری طریق کار اختیار کیا ہے کہ انسانی معاشرہ قابل رشک صورت اختیار کرسکتا ہے۔

انسانی حقوق

اسلام نے انسانی برادری کے حقوق کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔یہ حقوق قابل غور ہیں۔مثلاً اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا وغیرہ۔قرآن پاک میں آتا ہے:

---

(۳۱) بخاری،کتاب الصوم،باب من اقسم علی اخیه لیفطر فی التطوع،۱/۴۹۱

(۳۲) بخاری،کتاب الصوم،باب حق الجسم فی الصوم ۱/۴۹۲

وَقُولُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۳۳) اور عام لوگوں سے بات اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا۔

انسانی معاملات میں کوئی تعصب جائز نہیں۔ فرمایا:

وَلَا يَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّاتَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۳۴)

اور کسی خاص قوم کی عداوت اس کا باعث نہ بن جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ حسد، کینہ اور غیبت سے روکا گیا ہے اور محبت انسانی کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد رسول ﷺ ہے:

لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُوْنُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (۳۵)

نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے حسد کرو اور نہ باہم روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔

لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَ خِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (۳۶)

کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔

اسلام میں انسانی ہمدردی، خیر خواہی اور امداد و تعاون میں مسلم وغیر مسلم کے فرق کو بھی مٹا دیا گیا ہے، اسیروں کی امداد، غلاموں کی آزادی، غریبوں کی امداد اور حاجت مندوں اور مستحقوں کے لحاظ سے مذہبی تفریق جائز نہیں۔ ام المومنین صفیہؓ اپنے یہودی رشتہ داروں کی امداد کرتیں۔ ابو عبیدہؓ عمرو بن شرحبیلؓ اور عمرو بن میمونؓ عیسائی راہبوں کی امداد کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے بھکاری کے اخراجات بیت المال سے ادا کر دیے تھے۔ اسلام جو مساوات کا علمبردار ہے، اس کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اور سب کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ خالق حقیقی قرآن پاک میں انسانوں کے بارے میں جو کچھ فرماتا ہے اسے ہم وحدت نسل انسانی کا عنوان دے سکتے ہیں۔

وحدت نسل انسانی:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۳۷)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا۔ اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔

اس سے انسانوں کا برابر ہونا ثابت ہے اور اس برابری کے نتیجہ میں حقوق بھی سب کو یکساں حاصل ہیں۔ اب فردا

(۳۳) البقرہ/۸۳ (۳۴) المائدہ/۸

(۳۵) مشکوٰۃ، باب ماینھی عنه من التھا جرو التقاطع ۲/۶۲۰

(۳۶) ایضاً ۲/ ۶۰ (۳۷) النساء/۱

فرد ان بنیادی حقوق کو بیان کیا جاتا ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے انسان کو حاصل ہیں۔

جان و مال اور ناموس کا تحفظ:

قرآن پاک میں انسانی جان کے تحفظ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۸)

جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کرنے پر قتل تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا اور جو شخص کسی شخص کو بچا لے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچا لیا۔

اس آیت پاک میں ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل بتایا گیا ہے۔ اور دوسری جانب ایک انسان کی جان بچانے کو پوری نسل انسانی کی جان بچانے کے مترادف ٹھہرایا گیا ہے۔ دراصل اس میں حرمت جان کا اصول دیا گیا ہے۔ اور اس سے صرف دو حالتیں مستثنیٰ ہیں۔

(ا) اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوا ہو تو اسے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے۔

(ب) فساد فی الارض جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے کو قتل کیا جائے۔

مندرجہ بالا آیت سے انسانی جان کے تحفظ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

The instinct of self-preservation is a basic natural urge of life in all its gradations. But for human beings the self to be preserved is not only the individual physical entity, his essential self is a social self.(۳۹)

ایک انسان کا سب سے مقدم و مقدس حق یہ ہے کہ اس کی جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی جائے۔ عزت [illegible] قرآن نے یوں بیان کیا ہے۔

لا يسخر قومٌ من قوم (۴۰) وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۱)

[illegible] کوئی قوم کسی قوم [illegible] اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔

[illegible] حق کے احترام کی تاکید مختلف طریقوں سے بیان فرمائی۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ [illegible] فرمایا

فان دماءكم واموالكم واعراضكم حرامٌ كحرمة يومكم هذا (۴۲)

[illegible] جیسی حج کے اس دن کی حرمت ہے۔

[illegible]

شخصی آزادی کا حق

دوسرا اہم حق جو اسلام نے انسان کو دیا ہے وہ شخصی آزادی کی حفاظت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ایک خاص دائرے کے اندر اس کو اختیار بھی بخشا ہے اور اس اختیار ہی کی بنا پر اس کو دنیا میں امر و نہی کا مکلف اور آخرت میں جزا و سزا کا حق دار بنایا ہے۔ انسانوں کے لیے جو اجتماعی نظام پسند فرمایا ہے اس میں فرد کو جماعت کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ زندگی کے ہر گوشہ میں ایک خاص حد تک اس کی انفرادی آزادی محفوظ رکھی ہے اور اس آزادی ہی کے صحیح یا غلط استعمال پر اس کی انفرادی شخصیت کے کمال و زوال اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کو منحصر کیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ عین منشاء الٰہی ہے کہ ہر شخص کی انفرادی آزادی اس وقت تک محفوظ رکھی جائے جب تک وہ اپنی اس آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے یا جماعت کے مفاد کو خطرہ میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

ان حقوق کے بعد آزادی کا ہونا لازمی امر ہے۔ اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقہ سے اس کا جرم ثابت کیے بغیر اور اسے صفائی کا موقع دیے بغیر سلب نہیں کی جا سکتی۔ اسلام اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ محض شبہات و اوہام کی بنا پر کسی شخص کو اس کے اس بڑے فطری حق سے محروم کر دیا جائے۔ انفرادی مصلحت سے قطع نظر تمدنی و اجتماعی نقطہ نظر سے بھی اسلام شبہات اور بدگمانیوں کی بنا پر کسی کی شخصی آزادی پر حملہ کو نہایت خطرناک قرار دیتا ہے۔ ابوداؤد میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ مدینہ کے کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کیے گئے تھے۔ ایک صحابیؓ نے عین خطبہ کے دوران اٹھ کر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ میرے ہمسایوں کو کس قصور میں پکڑا گیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ ان کے اس سوال کو سن کر سکوت فرمایا تا کہ کوتوال شہر اگر گرفتاری کے لیے کوئی معقول وجوہ رکھتا ہے تو اٹھ کر بیان کرے لیکن جب تیسری مرتبہ ان صحابیؓ نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا۔

خلّوا له جيرانه (۴۳)

اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کسی کو مجرد الزام پر قید نہیں کر دیا کرتے تھے۔ خلافت راشدہ میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے شخصی آزادی کے تحفظ کا علم ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

ربیعہ بن عبدالرحمنؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس اہل عراق میں سے ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ امیر المومنین! میں ایک ایسے معاملہ کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ جھوٹی شہادت کا فتنہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا یہ چیز شروع ہو

(۴۳) ابوداود، کتاب القضاء، ۳/۳۲۷

گئی ہے۔اس نے کہا کہ ہاں۔آپؐ نے فرمایا:

وَاللّٰہِ لَا یُؤسَرَ رَجُلٌ فِیْ لِلْاِسلَامَ بِغَیْرِ العَدْلِ (۴۴)۔

(خدا کی قسم اسلام میں کوئی شخص بغیر عادل گواہوں کے قید نہیں کیا جا سکتا)۔

عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کا مصری کو کوڑے مارنا اور قید کرنا بعد ازاں اس کا فرار ہونا اور حضرت عمرؓ کے پاس جانا، ایک مشہور واقعہ ہے۔حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔

مَتٰی تَعَبَّدْ تُمْ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْھُمْ اُمَّھَا تَھُمْ اَحْرَاراً (۴۵)

(تم کیوں لوگوں کو غلام بناتے ہو جب کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔)

مذہب و مسلک کی آزادی

تیسرا اہم حق عقیدہ و مذہب اور مسلک و رائے کی آزادی کا ہے۔اسلام نے انسانیت کو " **لَااِکْرَاہَ فِی الِدِیْن** " (۴۶) کا اصول دیا۔اس کے تحت ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ جس مذہب یا مسلک کو اپنانا چاہے اپنا لے۔اس حق کے باب میں اسلامی قانون کی سب سے بہتر وضاحت حضرت علیؓ نے کی ہے۔ان کے زمانے میں خوارج کا گروہ پیدا ہوا۔جو علانیہ اسٹیٹ کے وجود کی نفی کرتا اور بزور شمشیر اس کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا۔

کُوْنُوا حَیْثُ شِئْتُمْ وَبَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَا تَسْفِکُوْا دَماً وَلَا تَقْطَعُوْا سَبِیْلاً وَلَا تَظْلِمُوْا اَحَداً فَاِنْ فَعَلْتُمْ نَبَذْتُ اِلَیْکُمْ اَلْحَرْب۔ (۴۷)

تم جہاں چاہو رہو ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو گے اور ظلم سے باز رہو گے۔اگر ان باتوں میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔

مساوات کا حق

اسلام نے نہ صرف مساوات کے حق کو تسلیم کیا ہے بلکہ علانیہ کہا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اگر کسی کو فضیلت ہے تو وہ تقویٰ کے اعتبار سے۔ارشاد باری ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (۴۸)

---

(۴۴) موطا، کتاب الاقضیہ باب شرط الشاہد ۲/۷۲۰

(۴۵) کنز العمال ۶/۳۵۵

(۴۶) البقرہ ۲۵۶

(۴۷) [illegible]

(۴۸) الحجرات ۱۳

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اس میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قوموں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ مختلف نسلیں، مختلف رنگ، مختلف زبانیں درحقیقت انسانی دنیا کے لیے کوئی معقول وجہِ تقسیم نہیں ہیں۔

مساوات ہی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا

"هَلَكَ كِسْرَىٰ فَلَا يَكُوْنُ كِسْرَىٰ بَعْدَهٗ"۔ (۴۹)

کسریٰ مر چکا، آج کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔

(الف) قانونی مساوات

اسلام کے نزدیک ہر شخص بلا امتیاز قانون کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس دین میں تو قانونی مساوات کا بلند تر تصور یہ ہے کہ بانی اسلام ﷺ بھی اس سے ماورا نہیں۔ ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ (چوری کی سزا اسلام میں قطع ید ہے) لوگوں نے عورت کے خاندان کی عظمت کے پیش نظر اسے اس جرم کی سزا سے بچانا چاہا۔ اسامہ بن زیدؓ جو آنحضرت ﷺ کے نہایت محبوب تھے، سفارش کے لیے آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجے گئے۔ مگر آپ ﷺ اس پر نہایت ناراض ہوئے اور فرمایا "تم سے پہلے بہت سی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی بااثر آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کر جاتے (لیکن میں ایسا نہیں کروں گا) خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ فَاطِمَةُ فَعَلَتْ ذَالِكَ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" (۵۰)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر فاطمہؓ (بنت محمدؐ) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔

ایک روایت میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ عاملوں کے فرائض پہ گفتگو کر رہے تھے کہ وہ زیادتی کرنے والے سے قصاص لیں گے تو عمرو بن العاصؓ نے کہا: فرض کیجیے کہ ایک شخص کہیں کا گورنر ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَاُقِصَّنَّهٗ مِنْهُ وَلَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُصُّ مِنْ نَفْسِهٖ. (۵۱)

---

(۴۹) مشکوۃ، کتاب الفتن، باب الملاحم، ۳/۱۵

(۵۰) بخاری، کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع، ۱۱۷۰ (دارالسلام ایڈیشن)

(۵۱) کتاب الخراج/۲۶

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں اس (گورنر) سے بھی قصاص لوں گا کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ رسول اللہ لوگوں کو خود اپنی ذات کے خلاف بدلہ کا موقع دیتے تھے۔

خلافت راشدہ میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ خلفائے راشدین مدعا علیہ کی حیثیت سے عام عدالتوں میں حاضر ہوئے اور ایک معمولی شہری کے مقابل میں اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام کے سلسلے میں جواب دہی کی۔

(ب) معاشرتی مساوات

خون، نسب، رنگ اور پیشہ وغیرہ کی بناء پر جو فرق و امتیازات قائم کیے گئے ہیں اسلامی نقطۂ نظر سے سب باطل ہیں۔ شرافت اور رذالت کی کسوٹی صرف تقویٰ ہے۔ قرآن پاک نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۵۲)

اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے جو تقریر فرمائی وہ بھی اس مساوات کا ایک بین ثبوت ہے۔

لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لَاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى (۵۳)

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ سوائے تقویٰ کے۔

(ہ) معاشی مساوات

معاشی دائرہ میں ہر انسان کا ایک حق ہے اور دنیا کی پیداوار میں اس کا حصہ ہے۔ ہر انسان کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے حصہ کو نہ بھولے۔ (لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا) (۵۴) نبی اکرم ﷺ نے انسانی معاشرہ کے ہر رکن کے لیے مندرجہ ذیل حقوق رکھے ہیں:

1- بَيْتٌ لِسَكَنِه۔ رہنے کے لیے گھر
2- ثَوْبٌ يُوَارِيْ عَوْرَتَه تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا
3- جِلَفُ الْخُبْزِ پیٹ کے لیے روٹی

---

(۵۲) الحجرات/۱۳

(۵۳) مسند احمد، ۵/۴۱۱

(۵۴) القصص/۷۷

4- الماء پانی (استعمال کے لیے خواہ وہ آسمان سے برسے یا نہروں و کنوؤں سے آئے)۔

قرآن کریم کا بیان ہے:

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بَارَكَ فِيهَا وَ قَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ (۵۵)

اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں جو طلبگاروں کے لیے یکساں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اشیاء تمام بنی نوع آدم کی ملکیت ہیں۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ تمام انسان معاشی میدان میں چند اخلاقی اصولوں اور کچھ قوانین کے تحت اپنی صلاحیتوں کی بنا پر تگ و دو کرنے میں آزاد ہیں۔ معاشی مساوات سے اجتماعی ملکیت ہرگز مراد نہیں (جیسا کہ اشتراکیت میں ہے) بلکہ یہ دین تو ذاتی ملکیت کا بنیادی حق بھی انسان کو دیتا ہے۔ فی الحقیقت اسلام حق معیشت کی مساوات کا قائل ہے۔ البتہ جائز ذرائع سے کسی پر ظلم کیے بغیر اگر کوئی شخص زیادہ وسائل حاصل کرتا ہے تو اسلام اسے غصب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں وہ ظلم، احتکار و اکتناز اور لوٹ کھسوٹ کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام انسان کو معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ وہ انسان کو معاشی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کرتا ہے تاکہ وہ کسی کا دست نگر نہ ہو۔ وہ انسانی زندگی میں جدوجہد کے بارے میں ایک عمومی اصول دیتا ہے جس میں معاشی جدوجہد بھی شامل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۶)

انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ، جس کے لیے اس نے سعی کی۔

وہ اس جدوجہد میں حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود متعین کرتا ہے تاکہ معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، معاشی استحصال، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری اور ناجائز کاروباری سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں۔ اسلام معاشرے میں انفاق کے اصول متعارف کراتا ہے جو بالآخر اسے خود کفالت کی منزل عطا کرتا ہے۔ ہر شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے شہری کی زندگی سے معاشی تعطل کو دور کرے اور اسے فعال معاشی کارکن بنائے۔ محروم المعیشت لوگوں کو خوشحال شہریوں کے اموال کا حصہ دار بنایا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ. لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۷)

وہ (مسلمان) جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک معین حق ہے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۸)

---

(۵۵) فصلت/۱۰

(۵۶) النجم/۳۹ یہ آیت بنیادی طور پر دنیوی زندگی کے اعمال اور دنیا و آخرت میں ان کی جزا سے متعلق ہے لیکن معاشی جدوجہد کے لیے بھی سمجھا گیا ہے۔

(۵۷) المعارج/۲۴ (۵۸) الذاریات/۱۹

اور ان کے مال میں مانگنے اور نہ مانگنے والے محروم کا حق ہے۔

- ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دینے والا لینے والے کو اس کا حق دے رہا ہے احسان نہیں کر رہا۔ قرآن اسے اللہ کا قرض قرار دیتا ہے یعنی کوئی شخص اگر کسی محروم شہری کی مدد کرتا ہے تو وہ اللہ کو قرض دے رہا ہے جس کا نفع یقینی ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (۵۹)

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔

انفاق کی سرگرمی کے باوجود اگر کچھ لوگ رہ جائیں تو اسلامی ریاست ان کی کفالت کا انتظام کرے گی۔ مسلمانوں کا بیت المال محروم شہریوں کا ذمہ دار ہے۔ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس کا کوئی سرپرست نہیں اس کا سرپرست میں ہوں۔ اَنَا وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَه (۶۰) اسی طرح مرنے والے کے قرض کے بارے میں فرمایا:

اَنَا وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَه اَعْقِلُ لَه وَاَرِثُه (۶۱)

جس کا کوئی وارث نہیں اس کا میں وارث ہوں اس کی جانب سے دیت دوں گا اور اس کا وارث ہوں گا۔

ذاتی ملکیت کا حق

اسلام انفرادی ملکیت کے حق کو اصول وضوابط کے ساتھ تسلیم کرتا ہے جو بالآخر جماعت کے مصالح پر منتج ہوتی ہے۔ اس حق کی جائز صورتوں کو تو وہ اپنے نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

قرآن پاک کا فرمان ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا. وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (۶۲)

مردوں کے لیے ان کے مال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے مال کا حصہ ثابت ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ. (۶۳)

اور یتیموں کے مال ان ہی کو پہنچاتے رہو اور تم اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو۔

---

(۵۹) المزمل/۲۰۔

(۶۰) مسند احمد ۴/۱۳۳

(۶۱) ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام، ۳/۱۴۹

(۶۲) النسا/۳۲

(۶۳) النسا/۲

اسلام ذاتی ملکیت کو تسلیم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس سے مرتب ہونے والے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ملکیت، چوری، ڈاکہ، لوٹ مار وغیرہ سے تحفظ بھی دیتا ہے۔اس تحفظ کی عملی ضمانت، دست اندازی کی تمام صورتوں پر سخت سزائیں مقرر کر کے دیتا ہے۔مثلاً چوری کی سخت سزا ''قطع ید'' اس حق کے احترام اور اس پر دست درازی کی ممانعت کی کھلی دلیل ہے۔بلاشبہ ایسی ملکیت جس سے اجتماعی مفاسد پھیل جائیں اسلامی ریاست مصالحہ مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ پابندیاں لگا سکتی ہے۔لیکن اسے ابدی اصول کی حیثیت سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی اجتماع کا حق

اسلام نے آزادیءِ اجتماع کا حق بھی انسان کو عطا کیا ہے۔قرآن کریم کا بیان ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۶۴)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے جس کے لوگ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں۔

آزادی اجتماع کے موضوع پر سید مودودیؒ لکھتے ہیں ''جب اختلاف آراء کو انسانی زندگی کی ایک اٹل حقیقت کے طور پر قرآن نے بار بار پیش کیا ہے تو پھر یہ نہایت ممکن الامر ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے لوگ آپس میں مربوط ہوں۔(۶۵)

حق اجتماعیت کا سوال سب سے پہلے حضرت علیؓ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور انہوں نے ان کے لیے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کر لیا۔انہوں نے خارجیوں سے فرمایا: ''جب تک تم تلوار اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی'' (۶۶)۔

مذکورہ بالا بیان کردہ حقوق کے علاوہ اسلام نے کچھ اور حقوق سے بھی انسان کو روشناس کرایا ہے جن میں نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، تحفظ ناموس خواتین کا حق، عدل و انصاف اور ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق، معصیت سے اجتناب کا حق اور سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ریاست کے معاملات میں شرکت کا حق:

اسلامی ریاست چونکہ شخصی، گروہی، خاندانی اور نسلی ریاست نہیں اور ہر مسلمان کو بحق نیابت الٰہی، امور مملکت میں شرکت کا پورا حق ہے۔قرآن نے اس اصول کو واضح لفظوں میں بیان کیا ہے:

---

(۶۴) آل عمران/۱۰۴

(۶۵) اسلامی ریاست/ ۵۶۸

(۶۶) نیل الاوطار' کتاب الحدود' باب قتال الخوارج واہل البغی' ۷/ ۱۶۶

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (٦٧)

اور مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے چلنا ہے۔

حضور اکرم ﷺ جو اسلامی ریاست کے پہلے سربراہ تھے انہیں حکم ہوتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ. فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (٦٨)

اے پیغمبر! ان سے معاملات میں مشورہ کرلیا کرو اور پھر جب ارادہ پختہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد شوریٰ کے اس مفہوم میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں:

(الف) ریاست کے امیر اور اس کے مشیر نمائندے لوگوں کی آزادانہ رائے سے منتخب ہوں۔

(ب) لوگوں کو اور ان کے نمائندوں کو تنقید، اختلاف اور اظہار رائے کی آزادی ہو۔

(ج) عوام کو یہ حق حاصل ہو کہ جسے وہ چاہیں وہی ریاست کا انتظام کرے اور جسے وہ نہ چاہیں اسے منصب ریاست سے ہٹایا جا سکے۔

جیسا کہ ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان ہوا ہے اس کے پیچھے کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے تصور حقوق انسانی کو سند اور قوت نافذہ دونوں حاصل ہیں۔

حقوق کے ضمن میں ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا اور یہ کوئی معاہدہ نہ تھا کہ ان حقوق کو ساری قوموں سے منوایا جا سکے لیکن اسلام کے حلقہ میں داخل ہونیوالا ہر فرد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کا پابند ہے۔ اس لیے وہ لازماً مانے گا۔ اس اعتبار سے یہ حقوق مسلمانوں کو بھی دیے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی، دوستوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی۔ یہ بھی دین اسلام کے رحمت ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ انسانی حقوق کے ضمن میں بھی اسلام کا دین العمل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسلام واقعی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہے اور یہی اسلام کی وہ خصوصیت ہے جو اسے تمام ادیان اور نظامہائے فکر سے ممتاز کرتی ہے۔ خالق کائنات نے قول صادق فرمایا جو قرآن حکیم میں محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (٦٩)

آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا۔

یہ ایک مختصری فہرست ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت کی واضح نصوص پیش کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

---

(٦٧) الشوریٰ/٣٨

(٦٨) آل عمران/١٥٩

(٦٩) المائدہ/٣

اسلامی تعلیمات کے تتبع سے مزید تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ انسان کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں غالباً اسلام کا نقطہ نظر زیادہ واضح اور تفصیلی ہے کیونکہ اسلام ہمیں بعض ایسے حقوق کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے جن کا تصور بھی دور حاضر کا دماغ نہیں کر پارہا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان حقوق کو ایک سند حاصل ہے۔ بقول سید مودودیؒ مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے پابند ہیں" (۷۱)۔ اسلام نے انسانی حقوق کے بارے میں بڑی جزئیات دی ہیں جو یقیناً اعلیٰ معیار کی دلیل ہیں۔ اسلام کے سیاسی نظام پر لکھنے والے مسلم مصنفین نے حقوق کی تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ قدیم مآخذ اور جدید تصانیف میں ان تفصیلات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ (۷۰)

☆

(۷۰) انسان کے بنیادی حقوق/ ۲۸

(۷۱) مولانا صلاح الدین کی کتاب "بنیادی حقوق" اس موضوع پر مفصل کتاب ہے جس میں عمدہ معلومات جمع کی گئی ہیں۔

8

اسلام اور عالمگیریت

(Globalization)

پس منظر:

پچھلے دس برسوں میں عالمی سطح پر معاشی، سیاسی، معاشرتی اور تکنیکی میدانوں میں اتنی تیزی سے اور ایسے ڈرامائی انداز میں تبدیلیاں آئی ہیں جو پہلے کبھی مشاہدے میں نہیں آئی تھیں۔ ابلاغ کی سہولتوں نے جغرافیائی حدود کے تصور کو ختم کر دیا ہے۔ ابلاغ کی اس صلاحیت نے تجارت اور مالی معاملات کی درجہ بندی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اسی انقلاب اور اس کے انتظام کو عالمگیریت (Globalization) کا نام دیا جا رہا ہے۔

تعریف:

گلوبلائزیشن ایک کثیر الجہت منظر ہے۔ مختلف لوگوں نے اس کی تعریف مختلف انداز میں کی ہے۔ بعض لوگوں نے معاشی پہلو پر توجہ مرکوز کی ہے۔ لہٰذا وہ اسے عالمی معیشت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے کلچر کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک گلوبلائزیشن کے ثقافتی اثرات اور تبدیلیاں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور سیاسی انتظامات و تنظیمات میں تبدیلیوں کی صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ مزید کچھ لوگوں نے ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کو (globalization) سے منسلک کیا ہے۔ اور کمیونیکیشن اور ٹرانسپورٹ کے میدان میں آنے والی تبدیلیوں کو اس کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو (globalization) ان جملہ تغیرات میں شامل ہے جہاں انسان کے تمام پہلو اس انقلاب سے متاثر ہوئے ہیں۔ عالمگیریت کا زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مغربی تہذیب و تمدن کے فروغ و وسعت کا ایک نیا مرحلہ ہے۔ مغربی تہذیب پچھلے دو سو سال سے دنیا پر غلبہ حاصل کرنے میں مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ اس لیے یہ مرحلہ مغربی فکر، مغربی اداروں اور زندگی کے بارے میں مغربی اپروچ کے مختلف پہلوؤں کے بڑے غلبے کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں مغربی تہذیب دوسری تہذیبوں کی قیمت پر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور اس کی طاقت میں اضافہ ہوا ہے۔ عالمگیریت کی تعریف میں انہی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل تعریفات سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہی وہ امور ہیں جو عالمگیریت کی بحث میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تعریفات کے الفاظ پر غور کریں اور نتیجہ نکالیں۔

(1) عالمگیریت سے مراد صنعت اور خدمات (Industry and Services) کے شعبوں کی ایسی سرگرمیاں جو

---

(1) The geographic dispersion of industiral and services activities and the cross border networking of companies". The penguin dictionary of Economics.

جغرافیائی حدود کو پار کر گئی ہیں اور مختلف کمپنیوں نے مختلف ملکوں میں مربوط سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔

(2) تجارت، مالیات کی روانی، ٹیکنالوجی کے فروغ، معلومات کا مربوط نظام اور مختلف تہذیبوں کے باہمی تعامل کے ذریعے عالمی سطح پر مختلف معیشتوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یکجہتی کا نام عالمگیریت ہے۔

(3) آزاد مارکیٹ پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا پوری دنیا کے ممالک میں پھیلاؤ' اس کا نام عالمگیریت ہے۔

(4) مغربیت اور مغرب کے تاجرانہ معیارات کو اور سیاسی نظاموں کو دنیا بھر میں تسلیم کر لینے کا نام عالمگیریت ہے۔

(5) انتھونی گڈنز (Anthony Giddens) کے مطابق عالمگیریت کی تعریف کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے۔
عالمی سطح پر معاشرتی تعلقات کا ایسا استحکام جو دور دراز آبادی کو اس طرح مربوط کر دے کہ معاشی معاملات کی تشکیل میں وہ واقعات جو کئی میل دور وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور اس کے برعکس بھی عالمگیریت کہلائے گا۔

(6) فرانسیسی ماہر عمرانیات پیری بورڈیو (Pierre Bourdieu) کے نزدیک عالمگیریت ایک بڑی اصطلاح ہے جس کا مطلب ایک ایسے نظام کو حق بجانب ثابت کرنا ہے جو کثیر القومی کمپنیوں اور صنعتی ملکوں کی حکومتوں کے مفادات اور مالی سرمایہ مہیا کرنے کے لیئے وجود میں لایا گیا ہو۔

(7) مختلف بین الاقوامی طرز ہائے عمل اور مقامی ڈھانچوں کا ایسا ارتباط جو ایک ملک کی معیشت سیاست' کلچر' نظریہ حیات کو دوسرے ملک میں دخیل ہونے کی اجازت دے علل اور اسباب کا سلسلہ جو مقامی پیداوار کی تنظیم نو سے بین

---

(2) The rapid integration of economies worldwide through trade. financial flows. technology spillovers. information networks and cross cultural currents. (International monetry fund. world Economic out look. May (1997)

(3) "The spread of free market capitalism to virtually every country in the world. (Thomas Friedman. The Lexus and the olive tree. 1999)

(4) Westernization and the acceptance of western business standards and political systems around the World (Mahatir Muhammad. 1999)

(5) According to Anthony Giddens globalization can be defined as "The intensification of World wide social relations which link distant localities in such a way that local happenings are shaped by events occuring many miles away and vice versa.

(6) Globalization is strong discourse to justify and legitimize power structure that respond to the interests of the big transnational corporate, finance capital and governments of the Industrialized countries- (French sociologist, Pierre Bourdieu).

(7) A coalescence of various transnational processes and domestic structures, allowing the economy, politics, culture an ideology of the one country to penetrate another. The chain of causality runs from the spatial reorganization of production to international trade and to the integration of financial market. (Mittelman. 1997:3)

الاقوامی تجارت اور مالیاتی منڈی تک کو سمیٹ لے۔

(8) مارکیٹ کی ایسی بے رحم یک جہتی جسے قومی ریاستوں اور ٹیکنالوجی نے پہلے کبھی مشاہدہ نہیں کیا ایسا طریقہ جو کارپوریشنوں، قومی ریاستوں اور افراد کو پوری دنیا میں تیز، گہری اور سستی رسائی مہیا کرے جو آزاد مارکیٹ کو سرمایہ دراری کے پوری دنیا میں پھیلاؤ سے پہلے کبھی میسر نہیں آئی تھی۔

(9) عالمگیریت کے عمل نے دنیا کی معیشت اور سیاست میں بالکل نیا انداز متعارف کرایا لیکن اس نے سرمایہ داری کے بنیادی طریق کار کو تبدیل نہیں کیا۔ مزید براں اس نے امن اور خوش حالی کے مقاصد کو پورا کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

(10) اگر چہ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ عالمگیریت کا عمل نیا نہیں ہے۔ انسان باہمی تعامل میں ہمیشہ مشغول رہا ہے۔ آج کی عالمگیریت بنیادی طور پر مختلف ہے کیونکہ اس کی رفتار غیر معمولی ہے نہ یہ نئی قسم کے رابطوں سے متحرک ہے جیسے انٹرنیٹ وغیرہ اور اس کی تنظیم کے ضابطے مختلف ہیں بلکہ بالکل بغیر ضابطوں کے چل رہی ہے۔

(11) ہابس بام کے بقول: عالمگیریت کا مطلب ہے وسیع لیکن ضروری نہیں کہ برابر مواقع پر مبنی ہو۔ اور یقیناً امیر اور غریب کے درمیان فرق کو بڑھائیگی تاہم لاکھوں افراد عالمگیریت کا ترقی کے ذریعہ کی حیثیت سے تجربہ نہیں کریں گے بلکہ انتشار پھیلانے والی قوت کی حیثیت سے ایک طوفان کی طرح جس میں زندگیوں، ملازمتوں اور روایات کو تباہ کرنے کی قوت ہے۔

گویا عالمگیریت ایک ایسا نظام ہے جس کے تحت معاشرے اور ادارے عالمی سطح کا رخ کرتے ہیں یا تجارت کو عالمی سطح پر منظم کر دیا جاتا ہے۔

---

(8) The inexorable integration of markets, nation - states and technologies to a degree never witnessed before - in a way that is enabling individuals, corporations and nation - states to reach around the world faster, deeper and cheaper tan ever before the spread of free - market capitalism to virtually every country in the world. (T. L. Friedman, 1999: 7-8)

(9) The process of globalization has produced much that is new in the world's economy and politics, but it has not changed the basic ways in which capitalism operates. Furhermore, it has done little to aid the cause of either peace or prosperity. (Magdoff, 1992: 41)

(10) Although it can be argued that the process of globalization] is not new, as human beings have always been engaged in a process of interaction throughout history, today's globalization. is different, primarily because of the speed with which it is taking place. It is driven by new forms of connectivity, such as the internet, and is governed by different rules, or in many causes, by no rules at all. (Mohammadi, 2002:3)

(11) As Hobsbawm (1999) suggests "globalization means wider, but not necessarily equal, access for all and will lead to an increase in disparity between 'the haves and have-nots'". ......However, millions of people around the world experience globalization not as an agent of progress but as a disruptive force, almost hurricane - like in its ability to destroy lives, jobs and tradition. (Mohammadi 2002: 3-4)

عالمی بستی:(Global Village)

عالمگیریت کو مقبول بنانے کیلئے بعض نعرے تشکیل دیئے گئے ہیں تاکہ عام آدمی اپنے آپ کو اس نظام میں سمو سکے۔ عالمی سرمایہ داروں نے ابلاغ عامہ اور تشہیر کے ذریعہ لوگوں کو یہ باور کرایا کہ دنیا اب (Global Village) ہے۔ اور اب ہر انسان اسی گلوبل ویلج کا شہری ہے۔ ہمارے نام نہاد دانشور اس اصطلاح کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہے کہ اسکے تضمنات کیا ہیں؟ عالمی بستی کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے مفادات اور نقصانات ہماری دلچسپیاں اور ہماری آرزوئیں اب ہمارے خاندان، بستی، شہر یا ملک سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا سے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو پورے عالمی نظام سے وابستہ کر دینا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب عالمی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہن ہو جانا چاہیے۔ ہمارے نفع نقصان کا فیصلہ ہم نہیں بلکہ عالمی ساہوکار کریں گے جو کہیں دور بیٹھے ہیں۔ جنہیں ہم دیکھ بھی نہیں پاتے اور جن تک ہماری رسائی بھی نہیں۔ اسے ہماری بدقسمتی کہیے اور ہمارے دانشوروں کے ذہنی افلاس کی سطح سمجھئے یا بدنیتی کہ وہ اس تصور کی تشہیر کو دانشوری سمجھتے ہیں جبکہ مغرب میں عالمگیریت کے خلاف ردِعمل ہے۔ وہاں بائیں بازو کے کارکن اسے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی ایک چال قرار دے رہے ہیں، جو صحیح تجزیہ ہے۔ لیکن ہمارے بائیں بازو کے دانشور بھی عالمی سرمایہ کاروں کے گماشتوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ رہے مذہبی لوگ تو انہیں محدود مذہبی منافرتوں سے فرصت نہیں کہ وہ اس عالمی خطرے کا ادراک کر سکیں۔

عالمی بستی کے بنیادی عناصر

عالمی بستی کے چار بنیادی عناصر ہیں:

(i) **وقت اور فاصلے کا قرب:** ٹیلی کمیونیکیشن (Telecommunication) ابلاغ عامہ اور تعلیم کے ذریعہ وقت اور فاصلے اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ انسانوں کو رابطے میں کوئی دقت نہیں ہے۔

(ii) **علاقائی احتیاج:** معاشی طور پر ایک علاقہ دوسرے کا محتاج ہو گیا ہے۔ قدیم معیشت میں ایک علاقہ اپنی بنیادی ضرورتوں کا خود کفیل ہوتا تھا اور زائد چیزوں کے لیے دوسرے علاقوں کا رخ کرتا تھا لیکن عالمی سرمایہ کاروں اور ان کے ایجنٹوں نے معیشت کو اس طرح منظم کیا ہے کہ ہر علاقہ دوسرے کا محتاج ہو گیا ہے۔

(iii) **عالمی اقدار کا تسلط:** عالمی طور پر معلومات کے تبادلہ اور ابلاغ کی سہولت نے مشترک اقدار کو فروغ دیا ہے لہٰذا اب انسان ان مشترک اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے جسے عالمی سرمایہ دارانہ نظام نے مسلط کیا ہے۔

(iv) **عالمی سرمایہ داروں کی منصوبہ بندی:** آزاد مارکیٹ کے تصور کو فروغ دینے کے نتیجے میں ہر شخص اس انداز میں کاروبار کرنا چاہتا ہے جیسے عالمی سرمایہ داروں کی منصوبہ بندی ہے۔

یوں عالمی ساہوکاروں اور سرمایہ داروں نے پوری دنیا کو جسے مختلف معاشرے خواہاں ناخواہاں اپناتے چلے جا رہے ہیں ایک بستی قرار دیکر اس پر اپنی اغراض مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور سادہ لوح اسے بخوشی قبول کرر ہے ہیں۔

عالمگیریت کی قوت محرکہ:

عالمگیریت کو بروئے کار لانے اور مستحکم کرنے میں جو عوامل کام کرر ہے ہیں وہ درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

(i) ذرائع ابلاغ اور رسل ورسائل میں بہتری:

ٹرانسپورٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بہتری اور ترقی کی وجہ سے رفتار کار بڑھی ہے۔ اشیاء کے نقل وحمل میں آسانی پیدا ہوئی ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جلدی منتقلی کا عمل تیز ہوا ہے۔اسی طرح نقل وحمل کی قیمتوں میں کمی آئی ہے۔رابطوں میں آسانی پیدا ہوئی اور حلقہ وسیع ہوا ہے۔

(ii) فرد کے ذوق اور ترجیحات کی تبدیلی

سامان اور خدمات (Goods and Services) کے تنوع اور تعلیم وابلاغ کے فروغ نے ذواق وترجیحات میں کافی تبدیلی پیدا کی ہے۔متنوع اشیاء وخدمات کی موجودگی میں انسان اپنی سہولت اور ذوق کے مطابق اشیاء کا انتخاب کرتا ہے۔

(iii) حکومت کی پالیسیوں میں دانستہ تبدیلیاں

حکومتیں اپنی سہولتوں اور بعض اوقات بیرونی دباؤ کے تحت اشیاء وخدمات کی آمدورفت میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں۔اس کے نتیجے میں اشیائے صرف کی کثرت میسر آتی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ عالمی سرمایہ دار اور ساہوکار اشیاء کی آزادانہ نقل وحرکت پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔دنیا کے ایک حصے میں ضرورت سے زائد اشیاء موجود ہیں جن کی آزادانہ نقل وحمل کا اہتمام ہوتا ہے جبکہ دوسرے حصے میں ضرورت سے زائد مزدور موجود ہیں جن کی نقل وحرکت پر پابندیاں لگاتے ہیں۔بدقسمتی سے حکومتیں ان پالیسیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔جن کے نتیجے میں بالآخر عام انسان ہی خسارے میں رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتوں کی حیثیت سرمایہ داروں کو سہولتیں مہیا کرنے والے ادارے کی ہوتی ہے جس کا کام استحصالی نظام کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔اگر کہیں کوئی حکومت ان پالیسیوں کو نافذ کرنے میں رکاوٹ بنتی یا سستی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔

کارپوریٹ حکمت عملی کی تبدیلیاں:

سرمایہ داروں نے اب حکمت عملی یہ اپنائی ہے کہ پیداواری اخراجات کم ہوں جبکہ پہلے پالیسی یہ تھی کہ قیمتیں کم ہو

جائیں۔نئی حکمت عملی کے نتیجے میں کارکن اور مزدور فارغ کیے جاتے ہیں تا کہ کم سے کم مزدوروں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔انسانوں کے بجائے مشینوں کے استعمال سے پیداواری اخراجات میں کمی آئی ہے لیکن بیروزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔میکانیکیت کے نتیجے میں صنعتی ملکوں نے اسی حکمت عملی کے تحت تیسری دنیا سے مزدوروں کی درآمد بند کردی ہے۔خود غرضی پرمبنی یہ پالیسی تیسری دنیا کو مزید بحران میں مبتلا کرے گی۔کیونکہ تیسری دنیا کے مزدور صنعتی ملکوں میں روزگار حاصل کرنے کے لیے نہیں جاسکیں گے۔لیکن صنعتی ملکوں کی سستی اشیاء سے تیسری دنیا کے بازار بھر جائیں گے۔یہی اس عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا مقصد ہے۔WTO کو اس لیے منظم کیا گیا کہ ترقی یافتہ ممالک کی اشیاء بلا روک ٹوک دنیا کے ہر خطے میں پہنچ سکیں۔تیسری دنیا کے ممالک اپنی محدود پیداوار کی صلاحیتوں سے بھی محروم ہوجائیں گے۔

عالمگیریت کے نتائج:

عالمگیریت کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ناگزیر ہے اور اسے روکا نہیں جاسکتا۔یہ بھی عالمی سرمایہ داروں کی بازی گری ہے۔یہ بات وہی لوگ کہہ رہے ہیں جو عالمگیریت کی پالیسیوں کو جبراً دنیا پر مسلط کررہے ہیں۔ظاہر ہے کہ وہ اسے ناگزیر کہیں گے تو لوگ مانیں گے ورنہ کون قبول کریگا۔اگر ذرا غور کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ عالمگیریت کے نتیجے میں بہت خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔اگرچہ ٹیکنالوجی میں جو ترقی ہورہی ہے اسے روکا نہیں جاسکتا لیکن معاشی و معاشرتی پالیسیوں کو تبدیل کیا جاسکتا ہے البتہ عالمی ساہوکار ایسا نہیں ہونے دیں گے۔اگر ذرا غور کریں تو واضح ہوگا کہ عالمگیریت کے نتیجے میں بے حد خرابیاں پیدا ہورہی ہیں۔

(i) عالمگیریت مزدور اور کارکن کے لیے نقصان دہ ہے۔

اکثر سرمایہ کاری ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتی ہے اور کم آمدنی والے ملکوں میں بہت تھوڑی سرمایہ کاری ہوتی ہے۔کثیر القومی کمپنیاں کم ترقی یافتہ ملکوں میں کارکنوں کو امیر ملکوں کے کارکنوں کی نسبت بہت کم اجرتیں دیتی ہیں۔اس طرح عالمگیریت وہیں زیادہ استحصال کا باعث بن رہی ہے جہاں انسانی طور پر زیادہ سہولتوں کی ضرورت ہے۔اب کثیر القومی کمپنیوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے۔وہ طریقہ یہ ہے کہ بعض صنعتی پیداواری یونٹ تیسری دنیا میں لے گئے ہیں جہاں اجرتوں کا معیار کم ہے۔کم اجرت پر ہونے والی پیداوار کے اخراجات کم ہوتے ہیں لہٰذا سرمایہ دار عالمی منڈی میں زیادہ نفع بھی کماتا ہے اور مقابلے کے میدان میں بہتر حیثیت کا مالک بھی ہوتا ہے۔اس طریقہ کار سے ترقی یافتہ ملکوں کا کارکن محروم تو ہوتا ہے لیکن اسے حکومتی ذرائع سے سہولت دے کر مطمئن کردیا جاتا ہے۔

(ii) عالمگیریت سے غریب اور امیر کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے۔

معاشی ترقی کا جائزہ لینے والوں کا اندازہ ہے کہ پچھلے 150 سالوں کے مقابلے میں پچھلے تیس سال میں

امیر و غریب کے درمیان فرق بڑھا ہے اور اب عالمگیریت کے نتیجے میں اور بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ ارتکاز دولت کی جو صورتیں اب پیدا ہو رہی اور جو سہولتیں اب میسر ہیں وہ پہلے نہ تھیں۔

(iii) عالمگیریت قومی حکومتوں کے لیے خطرہ ہے۔

عالمگیریت کے منتظم جو امیر ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور عالمی مالیاتی اداروں کے منتظمین بھی جو ترقی یافتہ ملکوں سے آتے ہیں، قومی حکومتوں کو اپنی پالیسیاں اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اکثر اوقات یہ پالیسیاں قومی حکومتوں اور ان کے عوام کے خلاف ہوتی ہیں۔ جبر کے ایسے ذرائع ان کے ہاتھ میں ہیں کہ قومی حکومتیں ان کے احکامات ماننے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ عالمی ساہوکارانہ نظام رشوت' دھونس دھاندلی اور سازش کے ذریعے اپنی پالیسیاں نافذ کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ پالیسیاں بعض حالات میں قومی خودکشی کے مترادف ہوتی ہیں لیکن قومی حکومتیں اپنے مفاد پرستانہ رویوں کے باعث اپنا لیتی ہیں۔ ارباب اختیار رشوت کا اپنا حصہ وصول کرنے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں اور قومیں قرض کے جال میں اس طرح پھنستی ہیں کہ ان کی آزادی تک داؤ پر لگ جاتی ہے۔

(iv) عالمگیریت کثیر القومی کمپنیوں کو طاقتور بنا رہی ہے۔

بعض کثیر القومی کمپنیاں ایسی ہیں جن کا بجٹ اور منافع بعض قومی حکومتوں سے زیادہ ہے لہٰذا وہ اگر کسی حکومت کو گرانا چاہیں یا کسی ملک کو نقصان پہنچانا چاہیں تو انہیں یہ طاقت حاصل ہو گئی ہے۔ عالمگیریت دراصل انہی کمپنیوں کا ایک کھیل ہے جو انہیں مزید طاقتور بنانے کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔

(v) عالمگیریت ایک عسکری خطرہ۔

عالمگیریت چونکہ یک قطبی (Unipolar) صورت حال کا نتیجہ ہے لہٰذا اس کی پالیسیوں سے اختلاف کرنے والے ممالک کو بڑی طاقت کی طرف سے عسکری حملے کا خطرہ ہے۔ بڑی طاقت نے اپنی مرضی سے اقدام کر کے (Preemptive strike) کے اصول کو متعارف کرایا ہے اس سے قوموں اور ملکوں کی حاکمیت (Sovereignty) کو سخت خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ عراق پر حملے نے ایک نیا ماڈل طے کیا ہے جسے فلسطین، کشمیر اور چیچنیا میں آزمایا جا رہا ہے۔ فلسطین پر جارحانہ حملوں کی کوئی مذمت نہیں ہوئی اور عالمی برادری کی خاموشی نے جارح ملک کو مزید شہ دی ہے۔ چند طاقتور ممالک کو تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری کا اختیار ہے جبکہ کوئی دوسرا ملک تیار نہیں کر سکتا' جو کرے گا اس پر حملہ کر دیا جائے گا۔ طاقت کا توازن ہمیشہ طاقتور کے حق میں رکھنے کا یہ اصول عالمگیریت کا خطرناک نتیجہ ہے۔ اس صورت حال کا نقصان عالم اسلام کو پہنچ رہا ہے۔ عالم اسلام کی قیادتوں نے مجرمانہ غفلت کے باعث اپنے عوام کو محرومیوں کا شکار رکھ کر عالمی ساہوکاروں کی پالیسیوں کو نافذ کیا ہے۔ ملکی وسائل مغرب میں منتقل کئے ہیں اور اپنے عوام کے ساتھ رابطے مستحکم کرنے کے بجائے عالمی

سرمایہ کاروں اور عالمی سامراج کے ساتھ وابستگی اختیار کی ہے اور اب حالت یہ ہے کہ عالمی سامراج نے آنکھیں دکھانی شروع کی ہیں تو بے بسی کے عالم میں یہ اسی کے قدموں میں گر رہی ہیں مگر اپنے عوام سے یک جہتی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان قیادتوں نے اپنے مجرمانہ تغافل سے اپنا مستقبل بھی تباہ کیا ہے اور اپنے ملکوں کے عوام کو بھی تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ ان قیادتوں نے نئے عالمی نظام کے رخ کا ادراک نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو عیش وعشرت میں مشغول رکھا۔ ملکی صنعتیں مستحکم ہوئیں، نہ معاشی نظام مضبوط ہوا اور نہ یہ ممالک عسکری طور پر طاقتور اور خود مختار ہوئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عالم اسلام عسکری طور پر مفلوج، معاشی طور پر غیر مستحکم، سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار اور معاشرتی طور پر انتشار اور بحران کی زد میں ہے۔ عالم اسلام اگر دوبارہ محکوم ہوتا ہے تو یہ قیادتوں کی بے بصیرتی، خود غرضی، نا اہلی اور بد نیتی کے باعث ہوگا۔ عالمی استعمار کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اب ہر قسم کی متوقع مزاحمت کو ختم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ مسئلہ صرف ہزیمت ہی کا نہیں ہے، قومی وجود کے خاتمے اور مکمل حوالگی (Capitulation and Surrender) کا ہے۔

(i) عالمگیریت کے وکیل اس کے مندرجہ ذیل مثبت اثرات کی بات کرتے ہیں۔

(ii) بیرونی سرمایہ کاری سے غربت میں کمی ہوگی۔ ملازمتوں کے مواقع پیدا ہونگے اور آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

(iii) تجارت کی توسیع اور بیرونی سرمایہ کاری سے معاشرتی ارتقاء ہوگا اور متوسط طبقہ مضبوط ہوگا۔

(iv) ابلاغ اور اطلاعات کی ٹیکنالوجی کے مطالعہ کے کئی میدانوں میں علم کو فروغ دیا ہے۔

(v) ابلاغ سستا اور آسان ہوگا۔ ٹیلیفون اور سفر کی قیمتیں کم ہوئی ہیں۔

(vi) اس کے ذریعہ ایک دوسرے کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ معاشرے اگرچہ متنوع ہیں لیکن تعاون بڑھا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے ذرائع موجود ہیں۔

(vii) عالمگیریت نے انسانیت کے لئے یہ ممکن بنایا ہے کہ کائناتی یا انسان کی پیدا کردہ آفات کے وقت ایک دوسرے کے لئے شفقت ونفرت کا اظہار کریں۔

(viii) حقوق انسانی، عوامی احتساب اور عورتوں کی مشکلات جیسے مسائل سامنے آئے ہیں۔

(ix) لیکن غریب اور تیسری دنیا کی اقوام کے لئے اس کے منفی اثرات کہیں زیادہ ہیں ذیل میں چند ایک دیئے جا رہے ہیں۔

(x) بین الاقوامی کارپوریشنز نے جنگلات کی کٹائی کی وجہ سے ماحول کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ منافع خوری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

(xi) اگرچہ غربت میں کچھ کمی ہوئی لیکن اسی کی وجہ سے نئے معاشی امتیازات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔

(xii) غربت کی وجہ سے مختلف علاقوں میں اونچ نیچ بڑھی ہے۔

(xiii) منافع کی خاطر بنیادی ضرورتوں کونظرانداز کردیا گیا ہے۔ جنوب میں بیرونی سرمایہ کاری سے ایسی صنعتیں لگی ہیں جو بیرونی مارکیٹوں کے لئے نفع بخش ہیں لیکن مقامی لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کونظرانداز کردیا گیا ہے۔

معاشی پالیسیاں:

عالمگیریت کے نتیجے میں جو معاشی پالیسیاں تشکیل پارہی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام سرمایہ کھینچ کر سب سے بڑی معاشی قوت کے ہاں جائیگا اور تیسری دنیا کے لوگ مزید غربت کا شکار ہوں گے۔ WTO کے تحت 2005ء میں تجارت کی تمام پابندیاں ختم ہو جائیں گی اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی اشیاء پوری دنیا کی منڈیوں پر چھا جائیں گی۔ غریب ممالک کی حیثیت صرف خام مال پیدا کرنے والوں کی رہ جائے گی۔ انہیں ایسی جارحانہ معاشی پالیسیوں کا سامنا ہوگا کہ ان کے لیے کھڑا ہونا محال ہو جائے گا۔ عالمگیریت یقیناً ایک ایسی معاشی تباہی لائے گی جس سے قوموں کی آزادی مخدوش ہو جائے گی۔ معاشی پالیسیاں طاقتور قومیں بنائیں گی اور کمزور قومیں انہیں اپنائیں گی۔ ان پالیسیوں کو بہ جبر نافذ کیا جائیگا۔ جہاں تھوڑی بہت مزاحمت ہوگی وہاں عسکری قوت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا تا کہ اختلاف کرنے والے کا مزاج درست کیا جاسکے۔

اس وقت جو عالمی مالیاتی نظام ہے وہ سود اور سٹہ (interest and speculation) پر مبنی ہے۔ اقبال کے بقول فکر چالاک یہود نے جو نظام ترتیب دیا ہے اس نے ابتدا ہی سے انسانیت کی روح کو کچل دیا ہے۔ عالمگیریت سے یہ اور مستحکم ہوگا اور دین واخلاق اور انسانیت وشرافت کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ ملے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام عالمگیریت کے تحت ننگی جارحیت کا مرتکب ہوگا اور انسانیت اسکے بوجھ تلے سسکیاں لے کر دم توڑ دے گی۔ مالیاتی اداروں پر عالم کفر کا تسلط ہے۔ کسی مسلمان مالیاتی ادارے کے عالمی سطح پر کام کرنے کے تمام مواقع بند کردیے گئے ہیں تا کہ ہر عالمی مالیاتی عمل استعمار کے علم میں اور ان کی نگرانی میں تکمیل پذیر ہو۔ بی سی سی آئی کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہیئں تھیں لیکن وہاں سر تسلیم خم ہے کہ مزاج یار میں جو آئے سو کرے۔ مغربی ملکوں کے تمام بنک سرمایہ کی منتقلی (Money Laundering) میں ملوث ہیں۔ تیسری دنیا کے تمام خائن اور (Corrupt) حکمران اپنا سرمایہ مغرب کے بنکوں میں رکھتے ہیں جو بالآخر ضبط کرلیا جاتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے بنک تو اس سلسلے میں خصوصی مقام رکھتے ہیں۔ خفیہ ناموں سے خفیہ کھاتے مشکل ہی سے کھاتہ داروں کے کام آتے ہیں یہ مال بالآخر وہیں پہنچتا ہے جہاں کا خمیر ہوتا ہے۔ خائنوں اور مجرموں کے صرف نام باقی رہ جاتے ہیں اور قومیں ان کی خیانتوں کی سزا بھگتتی ہیں۔

معاشرتی وثقافتی تباہی:

عالمگیریت کے نتیجے میں مغربی معاشرت اور ثقافت کا غلبہ ہوگا۔ مغربی اقدار کے جارحانہ فروغ کی پالیسی پہلے ہی مرتب کی جا چکی ہے۔ عالمی میڈیا کے ذریعہ اسے مسلط کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ عالمگیریت دراصل مغربی کلچر کے غلبے ہی کا دوسرا نام ہے۔ خاندان کی تباہی، اخلاقی قدروں کی پامالی، عریانی وفحاشی کا فروغ، ایثار وشفقت کا نقدان، خود غرضی ومفاد پرستی کا راج، غیرت وعصمت کی ناقدری اور ہر شے حتیٰ کہ انسان بھی خریدنی وفروختنی ہوگا۔ ہم جنس پرستی کو معمول قرار دیا جائے گا اور طوائف کلچر کو مقبول بنایا جائے گا۔ عورت کی آزادی کے نام پر اسے بے حیائی کی صلیب پر قربان کر دیا جائے گا۔ عالمگیریت کا سب سے بڑا ہدف مسلمان معاشرے ہوں گے۔ چونکہ اخلاقی قدروں کی تھوڑی بہت پاسداری صرف مسلمان معاشروں میں ہے۔ لہٰذا انہیں زیر کرنے کے لیے تمام داخلی اور خارجی ہتھکنڈے استعمال کیے جائیں گے۔ عالمگیریت اخلاق کی تباہی اور شرافت کی بربادی کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔ معاشرتی اعتبار سے ایک ایسا خوفناک طوفان اٹھ چکا ہے جس سے مسلمان معاشرے تباہی کی گھاٹ اتر جائیں گے۔

سیاسی غلامی:

عالمگیریت کے نتیجے میں طاقتور قوموں کے سوا باقی تمام قومیں محکوم ہوں گی۔ قومی حکومتیں آہستہ آہستہ بے اختیار ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی حیثیت شہری اور ضلعی حکومتوں کے ناظم کی ہوگی۔ بلکہ ضلعی وشہری نظام براہ راست عالمی اقتدار کے ماتحت ہوگا اور یوں کمزور قومی حکومتیں غیر موثر ہو جائیں گی۔ عسکری ومعاشی غلبے کے ساتھ سیاسی غلبہ بھی مکمل ہو جائے گا۔ عالمگیریت ایک دجالی نظام ہے جس کا اثر ونفوذ غیر معمولی ہوگا۔ مغرب نے وفاقوں کی فیڈریشنوں کے ذریعے علاقائی وحدت کا انتظام کر لیا ہے اور اس کے مزید استحکام کے لیے کام ہو رہا ہے لیکن عالم اسلام کو چھوٹے یونٹوں میں مزید تقسیم کرنے کی منصوبہ بندی ہو چکی ہے تاکہ نظریاتی اور دینی وحدت کی بنیاد پر کوئی مزاحمت پروان نہ چڑھ سکے۔ عالمگیریت کی کوکھ میں ایک ایسا زہریلا تصور پروان چڑھ رہا ہے جو امت مسلمہ کے لیے مہلک ہوگا۔ مشیت الٰہی کی تکوینی مداخلت ہی اس ہلاکت خیزی کو روک سکتی ہے کیونکہ مادی طور پر تو امت مسلمہ کی پوری قیادت عالمگیریت کے طبلچی کا کردار ادا کر رہی ہے۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ پچھلی تین چار صدیوں سے قیادتوں کی نالائقی اور غداری کی وجہ سے وہ پے در پے شکست کھا رہے ہیں۔

ماحولیاتی تباہی:

عالمگیریت کے نتیجے میں طاقتور قوموں کو بالعموم اور کثیر القومی کمپنیوں کو بالخصوص کمزور قوموں کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کا اختیار مل جائے گا۔ اب سرمایہ کاری کے نام پر بیرونی سرمایہ کاروں کو نفع کا لالچ دیا جا رہا ہے۔ عالمگیریت

کے مستحکم ہونے کے نتیجے میں شاید یہ تکلف بھی نہ ہوگا۔ یہ لوگ خود بخود قابض ہو جائیں گے۔ جنگلات' پانی کے وسائل' معدنیات' تیل وگیس اور خوراک وغیرہ تمام وسائل پر ان کا تسلط ہوگا۔ وہ اسے لوٹ کر عالمی منڈی میں لے جائیں گے اور اہل وطن فاقوں مرتے رہیں گے۔

افریقہ میں کان کنوں اور تیل نکالنے والی کمپنیوں نے جو تباہی مچا رکھی ہے۔ اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نائیجیریا اور کانگو کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دولت مند ملکوں کے تعیش کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہوگی انہیں بے دریغ حاصل کیا جائے گا۔ جنگلات تباہ ہوں گے۔ فیکٹریوں سے زہریلے مادے خارج ہوں گے۔ ماحول کو خراب کرنے والی تمام صنعتیں غریب ممالک میں لگیں گی اور تیسری دنیا کے لوگوں کو مبتلا مصیبت کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

مذہبی ونسلی فسادات

عالمگیریت کا ایک خطرناک نتیجہ کمزور ممالک کے اندر انتشار وفساد ہوگا۔ مذہبی اختلافات اور نسلی فسادات کی حوصلہ افزائی کی جائے گی تاکہ کمزور معاشروں سے عالمی ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف مزاحمت پیدا نہ ہو۔ یہ معاشرے اگر باہم دست وگریباں رہیں گے تو عالمی قوتیں اپنا کام اطمینان سے کریں گی۔ چونکہ عالمگیریت کے پیچھے تخریب کار ذہن کام کر رہا ہے اس لیے اس سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث ہوگا۔ مذہب خاص طور پر عالمگیریت کا نشانہ ہے۔ اور اسلام بنیادی ہدف ہے۔ ہر مذہب میں اخلاقی قدروں کی پاسداری کا ایک اہتمام ہے جو عالمگیریت کے بے رحم مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہے اس لیے مذہبی اثر ورسوخ کو کم کرنے کے لیے پہلے ہی مذہب پر دباؤ بڑھا دیا گیا ہے۔ مذہبی بنیاد پرستی کو ایک مذموم مظہر کے طور پر زور وشور سے پیش کیا جا رہا ہے اور موہوم اسلامی بنیاد پرستی کو خاص طور پر اجاگر کیا جا رہا ہے۔ شکاگو یونیورسٹی نے فنڈامینٹلزم پروجیکٹ کے تحت کئی جلدوں میں مطالعہ شائع کیا ہے جو میڈیا کے کارکنوں اور پالیسی ساز اداروں اور افراد کے لیے رہنمائی کا کام دے رہا ہے۔ چونکہ عالمی استعمار کو اہل مذہب ہی سے مزاحمت کا خطرہ ہے۔ اس لیے پہلے ہی ان کے خلاف ایسی فضاء تیار کی جا رہی ہے کہ وہ اپنی مدافعت میں ہی لگے رہیں اور ان انسان دشمن پالیسیوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکیں۔ عالمی استعمار کے جارحانہ اقدامات کی وجہ سے مسلمان اہل دین وشعور پر دباؤ بڑھ گیا ہے۔ حکمت عملی یہ ہے کہ خارجی طور پر عسکری حملوں کی دھمکی دی جا رہی ہے اور داخلی طور پر اپنے پروردہ وتربیت یافتہ عناصر کے ذریعہ الزام تراشیوں اور سازشوں کا تانا بانا بنا جا رہا ہے۔ مسلمان معاشروں کے اصحاب اختیار نے چونکہ عالمی استعمار سے سازگاری کر لی ہے اس لیے وہ عوام کو خارجی حملوں سے ڈراتے ہیں اور اندرونی انتشار کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ اپنی گرفت مضبوط کر سکیں۔

عالمگیریت اور مسلم دنیا

عالمگیریت کی تحریک کے نتیجے میں جو تبدیلیاں آئیں گی اس کا حاصل یہ ہوگا کہ سرمایہ اور اشیاء کی منتقلی آسان ہوگی اور شاید افراد کی آمد ورفت بھی آسان ہوگی۔ تیسری دنیا کے افراد کے لیے تو پابندیاں کسی نہ کسی طرح رہیں گی البتہ ترقی یافتہ ممالک کے افراد آسانی کے ساتھ دندناتے پھریں گے۔ اس سے جو فرق پڑے گا وہ بنیادی طور پر اخلاقی اور ثقافتی ہوگا۔ چونکہ مغربی کلچر بدکرداری پر مبنی ہے اس لیے سب سے پہلا اثر تو اخلاقی ہوگا۔ بدکرداری کو فروغ ملے گا۔ سرمایہ دار ممالک کے بدکردار افراد کو دولت کی وجہ سے ہر قسم کے اقدام کی اجازت ہوگی اور حکومتیں ان کو تحفظ فراہم کریں گی۔ لوگوں کو تسلی دی جائے گی کہ سرمایہ کاری بڑھ رہی ہے۔ طوائف کلچر کی حوصلہ افزائی ہوگی کیونکہ عصمت فروشی بھی تو سرمایہ لانے کا باعث بنے گی۔ اور سرمایہ سے محبت کرنے والی حکومتیں اسے ''جنسی صنعت'' (Sex Industry) قرار دینے میں کوئی تامل نہ کریں گی۔ مسلم دنیا پر پہلا اثر جو عالمگیریت کا ہوگا وہ حیا باختگی اور اخلاقی فساد کا ہوگا۔ مسلمان معاشروں میں جو تھوڑی بہت مزاحمت ہے وہ عالمگیریت کے بوجھ تلے دم توڑ دے گی (خدا نہ کرے کہ ایسا ہو)۔ مسلم معاشروں پر عالمگیریت کا جو دباؤ ہوگا اس کی وجہ سے انہیں اپنے معاشروں میں دینی روایت کو قائم رکھنا ہوگا، انہیں زبان کی حفاظت کرنا ہوگی اور اپنے معاشرتی اداروں کا دفاع کرنا ہوگا اور سب سے اہم اپنے تشخص کو بدلتے ہوئے حالات، نئے تقاضوں اور تغیر پذیر عالمی ماحول میں قائم رکھنے کی جدوجہد کرنا ہوگی۔ دینی قیادت کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اسے ہوش وحواس قائم رکھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ انفرادی واجتماعی، معاشرتی وسیاسی ہر سطح پر عالمگیریت کے اثرات بد کی مزاحمت منظم رہنی چاہیے۔

معاشی اثرات:

مسلم ممالک پر سب سے برے اثرات معاشی ہوں گے۔ مسلم ممالک کی معیشتیں پہلے ہی کمزور ہیں۔ انفراسٹرکچر مضبوط نہیں ہے۔ صنعتی بنیاد مستحکم نہیں۔ کرپشن اور بدنظمی کا دور دورہ ہے۔ ایسے میں جب عالمگیریت پوری قوت کے ساتھ آئے گی تو مسلم ممالک کی معیشتیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکیں گی۔ مسلم ممالک میں بڑی صنعتیں نہیں ہیں۔ زیادہ زور ٹیکسٹائل پر رہا ہے اور اس میں مقابلہ سخت ہوگا۔ الیکٹرونکس، آٹومیشن، اسلحہ اور (space science) کے میدان میں کوئی پیش رفت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ زرعی میدان میں بھی مشینری کی کمی ہے۔ امکان ہے کہ مسلم ممالک کی زمینیں اور زرعی اثاثے کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ بیچ دیئے جائیں گے۔ کیونکہ عالمی ساہوکاروں نے سرمایہ کاری کے نام پر قبضہ کی پالیسی تیار کر رکھی ہے اور ہمارے ارباب اختیار چند سکوں کے عوض قیمتی اثاثے لٹانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس سے ان کی وقتی ضرورتیں تو

پوری ہو جائیں گی لیکن قوم اپنے مستقل اثاثوں سے محروم ہو جائے گی۔ عالمگیریت مسلمانوں کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ وہ معاشی طور پر مفلوج، سیاسی طور پر مغلوب اور ثقافتی طور پر شدید فساد اور انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔ عالمیت کا بنیادی مقصد مغربی تہذیب کا غلبہ ہے اور جہاں جہاں مزاحمت ہے اس کا خاتمہ، پوری دنیا کو مغربی کلچر کا پابند بنانا، مغربی بداخلاقی کی اقدار کو اپنانا اور مغربی معیشت کے استحکام کے لیے کام کرنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عالمگیریت کا سب سے بڑا چیلنج مسلمانوں کو درپیش ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ عالمگیریت یورپ اور امریکہ کی مرکزیت پر مبنی ہے اور (Eurocentric) فریم ورک ہی پر مبنی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا عملی پروگرام، اس کا نفاذ اور اس کا طریق کار سب مغربی تہذیب کے غلبے ہی کے لیے ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ مغربی تہذیب کا پودا اسلامی ممالک میں کیسے پھلے پھولے گا اور کس طرح ثمر آور ہوگا سر دست تو اس کے نفوذ کے لیے بھرپور کوشش کی جا رہی ہے اور مسلم ممالک میں دائیں اور بائیں بازو کے دانشور، حکومتی کارندے، سرمایہ کار اور NGO's کے کارکن پوری تن دہی سے اس عظیم کام میں عالمی استعمار کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

امت مسلمہ کا لائحہ عمل:

مغربی تہذیب کے موجودہ چیلنج اور دنیا کی واحد بڑی طاقت کی عیاں جارحیت کے سامنے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ ایک مکمل اطاعت کا اور دوسرا اپنے تشخص کے تحفظ کا۔ مسلم ممالک کے ارباب اختیار تو شاید پہلے راستے کو منتخب کریں کیونکہ اس میں انکی اپنی حفاظت کا راز پنہاں ہے اور ان کے مفادات مغربی تہذیب کے غلبے سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا وہ اس طریق کار کا ساتھ دیں گے اور عالمگیریت کے لیے سہولتیں بہم پہنچائیں گے لیکن مسلم ممالک کے اہل دین بالخصوص اور عوام بالعموم شاید اپنی اقدار کی تباہی اور اپنے تشخص کی معدومیت کو قبول نہ کریں۔ اسلامی اخلاق و اقدار کے تحفظ کے لیے شاید کوئی اقدام کریں اور اس طرح خطرہ ہے کہ مسلم معاشرے داخلی طور پر تصادم کی راہ پر چل نکلیں، جو کسی طرح بھی امت کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ گو عالمگیریت کے علمبردار اس سے خوش ہوں گے۔ ان کے نزدیک یہ بھی غلبہ کی تحریک کا ایک پڑاؤ ہے اور اس میں کامیابی عالمگیریت کے استحکام میں معاون ثابت ہوگی۔ مسلمانوں کو سوچ سمجھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کرنا چاہیئے اور ان طریقوں کے بارے میں سوچنا چاہیے جن سے وہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکیں۔ مسلم معاشروں کے لیے الگ الگ اسٹریٹجی اختیار کرنے کی بجائے ایک متحدہ لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا کیونکہ عالمیت کے سلسلے میں مغرب نے متحدہ اسٹریٹجی اپنائی ہے۔ مثلاً شریعت کے نفاذ کی مخالفت میں تمام مغربی ممالک متفق ہیں، آزاد خیالی کے حق میں سب متحد ہیں، لادین مغربی جمہوریت کے حق میں سب متحد ہیں اور نام نہاد انسانی حقوق کی پاسداری میں سب متفق ہیں لہٰذا امت مسلمہ کو متحدہ لائحہ عمل تیار کرنا اور اپنانا ہوگا۔ اس کے بغیر مزاحمت ممکن نہیں۔ اس لائحہ عمل کے دو پہلو ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرا مادی۔

روحانی لائحہ عمل:

امت مسلمہ ایک روحانی گروہ ہے اس کی ساری جد و جہد کائنات کی روحانی تعبیر پر مبنی ہے۔ توحید الوہیت اور توحید ربوبیت اس روحانی تعبیر کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالی اس کائنات کا خالق، اسے نشوونما دینے اور اسے کنڑول کرنیوالا ہے۔ انسان کی راہنمائی کے لیے اس نے نبوت ورسالت کا ادارہ قائم کیا جو وحی الٰہی کی بنیاد پر فرد اور معاشرے کی اصلاح و نشوونما کے لیے کام کرتا رہا۔ مغرب اس روحانی اساس کا انکار کرتا ہے۔ اس کے ہاں خالق کائنات کا حیات انسانی کی تعمیر وترقی میں کوئی حوالہ نہیں۔ اس کی نظر میں وحی الٰہی ایک موہوم تصور ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ انبیاء تاریخ کا حصہ ہوں گے لیکن ان کے روحانی تجربے زندگی کا حوالہ نہیں بن سکتے۔ مغرب اس وقت کائنات کی مادی تعبیر پر یقین رکھتا ہے اور حیات انسانی کی تعمیر مادی اصول وضوابط کے حوالے سے ہی کر رہا ہے۔ جب تک مسلمان اپنے عقیدے پر مضبوط ایمان کو اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک اس حملے کا مقابلہ ممکن نہیں۔ امت مسلمہ کا ہر فرد تجدید عہد کرے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مستحکم کرنے کا انتظام کرے تاکہ وہ اس جارحیت میں ثابت قدم رہے اور حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے اپنی محبت واطاعت کے تعلق کو مضبوط کرے۔ اور اس کے خلاف کوئی چیز قبول نہ کرے حب الٰہی اور حب رسول ﷺ مسلمان کا حصار اور اس کا کامیاب ہتھیار ہے۔ اسی سے امت نے اب تک ہر چیلنج کا مقابلہ کیا ہے۔

امت کے آفاقی تصور کا استحکام:

روحانی لائحہ عمل کا دوسرا نکتہ امت کا عالمی تصور ہے۔ اسلام کا تصورِ عالمگیریت روحانی بھی ہے اور مثبت بھی۔ امت مسلمہ رنگ ونسل اور جغرافیائی وحدتوں کی بجائے ایک روحانی الاصل گروہ ہے جو (Transnational) ہے۔ توحید اس تصور کو مستحکم کرتی ہے۔ رسالت اجتماعیت کو مضبوط بناتی ہے اور کعبۃ اللہ ایک مرکز پر مجتمع کرتا ہے۔

اللہ تعالی نے اس امت کے بارے میں کہا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ (۷)

لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے ہاں تم میں سے وہ شخص قابل تکریم ہے جو زیادہ متقی ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے:

---

(۷) الحجرات/۱۳

(۸) الانبیاء/۹۲؛ المومنون/۵۲۔ اس میں فاعبدون کی جگہ فاتقون ہے۔

إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ أَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۸)

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس تم میری عبادت کرو۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

انا آخر الانبیاء و انتم آخر الامم (۹) میں آخری نبی اور تم آخری امت ہو۔

اس امت کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن نے کہا:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۱۰)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک میانہ رو امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہونگے۔

مسلمانوں کو عالمی روحانی قوت بننے کے لیے کسی نئے فریم ورک پر کوئی بڑی جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی بنیادیں موجود ہیں' تصور موجود ہے' مسلمان عوام کے اندر تڑپ موجود ہے' اسے صرف منظم اور متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے دشمنوں نے امت کے اس تصور کو ختم کرنے کے لیے قومیت کی تحریک متعارف کرائی اور دور استعمار میں عالم اسلام کو ٹکڑوں میں بانٹا اور چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو مستحکم کرنے اور باہم دگر لڑانے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ چونکہ امت روحانی اساس اور نظریاتی تصور پر قائم ہے اس لیے اسلام کے خلاف جارحانہ مہم چلائی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ احیاء امت کے لیے اس تصور کو فکری اور نظریاتی طور پر مستحکم کیا جائے۔ چونکہ امت کی شناخت حضور اکرم ﷺ کی قیادت سے ہے۔ لہٰذا حب رسول ؐ اور اتباع رسول ؐ کو محکم کرنے کے انتظامات کیے جائیں تاکہ خطرات کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اخلاقی قدروں کا استحکام:

روحانی لائحہ عمل کا تیسرا نکتہ اخلاقی قدروں کا استحکام ہے۔ مغرب نے سیکولرائزیشن کے تحت اخلاقی قدروں کو اضافی قرار دیا ہے اور وہ صرف انہی قدروں کا فروغ چاہتے ہیں جنہیں وہ دوست رکھتے ہیں۔ اسلام ہمیں مستقل اور پائیدار قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی قدروں کی تغیر پذیری کو سختی سے رد کر دینا چاہیے اور مسلمان معاشروں میں نئی اقدار کی مزاحمت کرنی چاہیے۔ حیاء' عفت' غیرت' عدل' احسان' معروف و منکر اور شفقت و رحمت جیسی قدروں پر ہی معاشرے کا وجود منحصر ہے۔ یہ ختم ہو گئیں تو معاشرے کا اسلامی تشخص ختم ہو جائے گا۔ عالمگیریت دنیا میں فحاشی' بدکرداری' بے حیائی' بے غیرتی' خود غرضی اور ظلم کو نافذ کرنا چاہتی ہے۔ مسلمان معاشرے اپنی روحانی اساس کے استحکام میں اسلام کی عطا کردہ اخلاقی قدروں کی حفاظت کریں۔ یہی ان کی اصل قوت ہے۔ مسلمان معاشرے اگر داخلی طور پر مضبوط ہوں گے

---

(۹) ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنة الرجال/۵۹۱۔ مکتبہ دار السلام ریاض

(۱۰) البقرہ/۱۴۳

اور افراد معاشرے کا شعور بیدار ہوگا تو خارجی اثرات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ عالمگیریت کے پروگرام میں داخلی تضادات کو ابھارنا اور اخلاقی بنیادوں کو کمزور کرنا شامل ہے۔ چونکہ عالمگیریت کو طاقتور میڈیا کی حمایت حاصل ہوگی اس لیے اس قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمان معاشروں کی اصل قوت ان کا روحانی تشخص ہے اور اسی پر ساری مزاحمت کا دارومدار ہے۔ ہمارے مذہبی اختلافات موجود ہیں اور گروہی وفاداریوں کی بنیاد پر اجتماعی قوت کمزور ہوسکتی ہے۔ عالمگیریت مغرب کے اتحاد کا مظہر ہے اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کا ذریعہ۔ اور اگر ہمارے فرقہ وارانہ اختلافات بڑھ گئے تو پھر عالمگیریت بغیر کسی مزاحمت کامیاب ہوجائے گی۔ شعور امت کی پختگی، وحدت امت کا ادراک اور فرقہ وارانہ رواداری سے ہم روحانی تشخص کو مضبوط کرسکتے ہیں۔ یہی بچاؤ کا ذریعہ ہے اور اسی سے ہم وہ متبادل نظام دینے کے قابل ہوں گے جس میں انسانیت کی اصلاح وفلاح مضمر ہے۔

مادی لائحہ عمل:

مسلمان ممالک کا اجتماعی پلیٹ فارم موجود ہے لیکن مغرب نے اس کے اندر نقب لگائی ہوئی ہے۔ بعض ممالک دانستہ طور پر عالمی استعمار کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ او آئی سی میں یوگنڈا جیسے ممالک بھی شامل ہیں جس کا صدر عیسائی ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں۔ او آئی سی کو امت مسلمہ کا نمائندہ ہونا چاہیے اور بنیادی طور پر وہی ممالک اس کے رکن ہونے چاہئیں۔ جہاں حکومتیں مسلمان ہیں۔ مسلم اقلیات کی شمولیت کا الگ نظام وضع کرنا چاہیے تاکہ پالیسی بناتے وقت کوئی غیر مسلم اس میں شامل نہ ہو۔ یہ خطرہ تو ہمیشہ رہے گا کہ کوئی مسلمان استعمار کا جاسوس ہو اور ذاتی اغراض کے لیے امت سے غداری کرے لیکن جانتے بوجھتے غیر مسلم کو امت کے اجتماعی پلیٹ فارم میں شامل کرنا حماقت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ بدقسمتی سے او آئی سی نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اور عملاً استعمار کے ہاتھ میں کھلونا ثابت ہوئی ہے۔ اسے صحیح خطوط پر منظم کرکے اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ مادی لائحہ عمل میں جہاں مشترکہ پلیٹ فارم کی مضبوطی اور عمدہ تنظیم شامل ہے وہاں کچھ اور اقدام بھی ضروری ہیں جو مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

معیشت کا اپنا نظام:

مغربی استعمار کے آغاز سے اب تک دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ چلا آرہا ہے۔ ستر سال کے قریب اشتراکی نظام نے متبادل معاشی تنظیم مہیا کی لیکن سرمایہ دار نے اس کا مقابلہ کیا۔ وقتی حک و اضافہ کے ساتھ اس نے اپنا دباؤ جاری رکھا اور بالآخر اشتراکی نظام بکھر گیا۔ اس دوران عوامی بہبود کے پروگرام متعارف کرائے۔ غریب ملکوں کو امداد دینے کے انتظامات کیے گئے لیکن زیادہ توجہ مغربی ممالک کے عوام پر رہی۔ ان کا معیار زندگی بلند کیا گیا' انہیں سہولتیں مہیا کی گئیں اور

عوامی فلاح کے بہت سے پروگرام متعارف کرائے گئے۔ ترقی کے نئے پیمانے متعارف کرائے گئے اور غریب ملکوں کو قرض دے کر سود کی صورت میں اپنی معیشتوں کا انتظام کیا گیا۔ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک کے مختلف کنسورشیم بنائے گئے جو تیسری دنیا کے ملکوں کو دیئے جانے والے قرضوں کی تنظیم کرتے اور ان ملکوں سے سودی قسطوں کا بہاؤ جاری رہتا تاکہ ان ممالک کی مستقل آمدنی کا وسیلہ قائم رہے۔ ناروے جیسا چھوٹا ملک قرض دینے کی پوزیشن میں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پوری اٹھان استحصالی نظام پر ہے۔ سرمایہ دار وسیع پیمانے پر اشیاء تیار کر کے مارکیٹ میں لے آتا ہے اور پھر تشہیر کے ذریعہ اس کی کھپت کا انتظام کرتا ہے وہ ہمیشہ نئے خریدار اور نئی منڈیوں کی تلاش کا انتظام کرتا ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے بعض ممالک استعماری دور میں خام مال کے مراکز کے طور پر متعین کئے گئے۔ جواب تک چل رہے ہیں۔ ان ممالک میں قحط، غربت اور پسماندگی ہے جب کہ اُن کے خام مال پر پلنے والا سرمایہ دار روز بروز فربہ ہو رہا ہے۔ اس کی تجوریاں بھر رہی ہیں اور اس کے عشرت کدے آباد ہو رہے ہیں۔ اس استحصالی نظام کی بنیاد سود اور جوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بنکوں کے نظام کو مستحکم کیا اور اسٹاک ایکسچینج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو مفروضوں پر مبنی ہے۔ یہی نظام قیمتوں کا تعین کرتا ہے اور زر کی حیثیت متعین کرتا ہے۔ بڑے سرمایہ دار بازار حصص پر کنٹرول رکھتے ہیں اور Speculation کے ذریعہ زر کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ حصص کی مارکیٹ معیشت کی قوت متعین کرتی ہے جو اکثر موہوم ہوتی ہے اور کسی وقت دھڑام سے گر سکتی ہے۔ عالمی ساہوکاروں نے پوری دنیا میں بنکوں اور سٹاک ایکسچینج کے اداروں کو متعارف کرایا اور اس طرح ہر ملک کی معیشت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ عالمی سرمایہ داروں کا ہاتھ نبض پر ہوتا ہے اور وہ کسی ملک کی موت وحیات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

ایں بنوک ایں فکرِ چالاک یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

مسلمان ممالک جب تک اپنا نظام معیشت ترتیب نہیں دیں گے اس وقت تک وہ سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔ اس نظام کی ترتیب کے کئی فکری و عملی زاویے ہیں جنہیں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے عالم اسلام کے معیشت دان ذہناً مغرب سے مرعوب ہیں کیونکہ وہ اس نظام کے پروردہ ہیں۔ مسلمان ممالک کی جامعات سرمایہ دارانہ معیشت کے ماڈل کو سامنے رکھ کر وہی کچھ پڑھا رہی ہیں جو مغرب میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی ایک مجتہد بھی نہیں پیدا ہوا جو سود اور سٹاک ایکسچینج کی لعنت سے پاک معاشی نظام مرتب کر کے دے۔ جب تک سود، سٹہ اور جوا ختم نہیں ہوگا اس وقت تک مسلمان مملکتوں کے پنپنے کی کوئی امید نہیں۔ عالمگیریت اسی سودی نظام کو مزید مستحکم کرنے کا نظام ہے جسے عالمی ساہوکار منظم کر رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔

......☆......

موضوعات

الف

ب

پ

ت

ٹ

ث

ج

چ

ح

خ

د

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

ی، ے

شخصیات

الف

س

ش

ص

ق

ک

گ

ل

،154:Margon

،116:Voltair

،116:Vanvenargues

،154:Y. Bochofen

،64:(Elanvital)

،160:Fletcher

،117:A.L.Kroeher

،117:Kluck Halm

،274:Redfield

کتب

ک

گ

ل

مقامات

چ

ح

خ

د

ر

ز

س

ش

ط

ع

ف

ق

المــراجع

عربی

مصنف	کتاب کا نام
ابو یوسف، یعقوب ابن ابراہیم	کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیہ، القاہرہ ۱۳۸۲ء
ابن کثیر، اسماعیل الدمشقی	تفسیر القرآن الکریم۔ طبع مصر
ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی	سنن ابن ماجہ طبع عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۳ء
"	مطبع دارالسلام، ریاض
ابن خلدون، عبدالرحمٰن	المقدمہ۔ طبع دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۶۱ء
ابن حنبل، احمد	المسند۔ بولاق، مصر
ابن قتیبہ	الامامۃ والسیاسۃ، طبع مصر
ابن قیم، الجوزیہ، حافظ	اعلام الموقعین، محمد محی الدین عبدالحمید، مصر ۱۳۷۳ھ
ابن منظور، الافریقی	لسان العرب۔ طبع بیروت ۱۹۵۶ء
ابن ابی شیبہ، امام ابوبکر عبداللہ بن حجر	"الکتاب المصنف فی الحدیث والاثار"، حیدرآباد دکن: ۱۹۶۸ء، ۳ جلدیں
ابوعبید، قاسم بن سلام	کتاب الاموال، تحقیق محمد حامد الفقی، المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، پاکستان
ابن سعد، محمد	الطبقات الکبریٰ۔ طبع بیروت ۱۹۶۰ء
ابن ہشام،	السیرۃ النبویہ۔ طبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۳۶ء
ابوزہرہ، محمد	المجتمع فی الاسلام۔ طبع دارالفکر العربی مصر
البلاذری، الامام ابوالحسن، احمد بن یحییٰ	فتوح البلدان، مراجعت، رضوان محمد رضوان، للمجاہدین افغانستان ۱۴۰۵ھ دارالکتب العلمیہ، بیروت
البخاری، محمد بن اسماعیل	الجامع الصحیح طبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۴۵ھ
"	مطبع دارالسلام، ریاض
البخاری، محمد بن اسماعیل	الادب المفرد۔ طبع نور محمد کراچی
البیہقی، ابی بکر احمد بن الحسین	"شعب الایمان"، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۰ء، ۹ جلدیں

الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ — الجامع الصحیح طبع منیریہ مصر ۱۹۳۱ء

" — مطبع دارالسلام، ریاض

التبریزی، خطیب، ولی الدین محمد بن عبداللہ — مشکوۃ المصابیح۔ طبع اصح المطابع دہلی

الجزیری، عبدالرحمان — الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ طابع دارالکتاب العربی مصر ۱۹۵۰ء

حمیداللہ، ڈاکٹر — الوثائق السیاسیہ، دارالنقاش، بیروت

الحداد، نقولا — علم الاجتماع، حیاۃ الھیئۃ الاجتماعیہ وتطورھا، المطبعۃ العصریۃ القاھرۃ

الخربوطلی، الدکتور علی حسنیٰ — الاسلام واہل الذمۃ المجلس الاعلی للشئون الاسلامیہ بالقاہرہ ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء

الدھلوی، شاہ ولی اللہ — حجۃ اللہ البالغہ۔ طبع مصر؛ اردو ترجمہ، مولانا عبدالحق حقانی، دارالاشاعت کراچی

الدھلوی، شاہ ولی اللہ — ''بدور بازغہ''، حیدرآباد: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

الدارمی، ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمان بن — سنن الدارمی۔ طبع مطبعۃ الاعتدال دمشق ۱۳۴۹ھ

الذہبی، شمس الدین ابوعبداللہ — تذکرۃ الحفاظ۔ طبع مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ (حیدرآباد دکن) ۱۳۳۳ھ

زین الدین ابن نجیم، — ''بحرالرائق شرح کنزالدقائق''، بیروت: دارالمعرفہ، ت، ن، ۸ جلدیں

السجستانی، ابوداؤد سلیمان بن الاشعث — سنن ابی داؤد طبع مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۵۰ء

" — مطبع دارالسلام، ریاض

الشہرستانی، عبدالکریم — الملل والنحل۔ طبع مکتبۃ الحسینیہ مصر ۱۹۴۸ء

الشوکانی، محمد بن علی بن محمد — ''نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث سیدالاخبار''، مصر مکتبہ الدعوۃ الاسلامیہ، ت، ن، ۴ جلدیں

الشعرانی، الشیخ عبدالوہاب — ''کشف الغمہ''، قاہرہ: ۱۳۸۱ھ، ۲ جلدیں

الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر — تفسیر الطبری۔ طبع دارالمعارف مصر

طبرانی، ابن القاسم سلمان بن احمد — ''المعجم الکبیر''، بغداد: المکتبہ الوطنیہ، ۱۹۷۹ء، ۱۱ جلدیں

الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر — ''تاریخ الامم والملوک''، بیروت: موسسہ العلمی للمطبوعات، ت، ن

الجصاص، ابوبکر، احمد بن علی الرازی — احکام القرآن، مطبوعہ مصر

العسقلانی محمد بن علی الکنانی المعروف بان حجر — الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ طبع المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر ۱۳۵۸ھ

الغزالی، ابوحامد، محمد بن محمد — احیاء علوم الدین۔ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۵۸ھ

القشیری، مسلم بن الحجاج	الجامع الصحیح طبع محمد بن علی صبیح واولادہ مصر ۱۳۳۴ھ
"	مطبع دارالسلام، ریاض
القرطبی، ابن رشد	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد طبع استقامہ القاہرہ ۱۹۳۸ء
القبانی، راغب	الثقافہ طبع المکتبہ الاہلیہ بیروت
مالک، بن انس	الموطأ۔ طبع مصر
المناوی، محمد عبدالرؤف	مختصر شرح الجامع الصغیر۔ طبع عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۴ھ
مصطفیٰ محمد عمارہ	نضرۃ النور شرح مختارات الاحادیث النبویہ۔ طبع مصطفیٰ البابی الحلبی مصر
الیسوعی، لوئس معلوف	المنجد۔ طبع کاثولیکیہ بیروت ۱۹۶۰ء
النسائی، ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب	سنن النسائی طبع المطبعۃ المصریہ ۱۹۳۰ء
"	مطبع دارالسلام، ریاض
النووی، ابوزکریا یحیٰ بن شرف	ریاض الصالحین۔ طبع عیسیٰ البابی الحلبی، مصر
ہیکل، محمد حسین	عمر الفاروق۔ طبع مصر
الہندی، علی المتقی	کنز العمال فی سنن الاعمال والافعال، حیدرآباد دکن: مطبعۃ مجلس دائرہ المعارف العثمانیہ، ت،ن
الھیثمی نورالدین علی بن ابی بکر	''مجمع الزوائد ومنبع الفوائد''، قاہرہ: ۱۳۵۲ھ، ۱۰ جلدیں

اردو

مصنف	کتاب
آرنلڈ، میتھو (اردو ترجمہ)	ثقافت وانتشار۔ مسلم ایجوکیشنل کراچی ۱۹۵۰ء
الانصاری، مولانا حامد	اسلام کا نظام حکومت۔ طبع ندوۃ المصنفین
اصلاحی، مولانا امین احسن	اسلامی ریاست۔ طبع اچھرہ لاہور
الدھلوی، شاہ ولی اللہ	حجۃ اللہ البالغۃ (اردو ترجمہ) طبع غلام علی اینڈ سنز لاہور
دریا آبادی، عبدالماجد	(مترجم) "تاریخ اخلاق یورپ"، اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۲ء؛ ۱۹۲۸ء، ۲ جلدیں
رسل، برٹنڈ (مترجم عزیز)	نظام معاشرہ اور تعلیم۔ طبع مجلس ترقی ادب لاہور
رفیع الدین، ڈاکٹر	"قرآن اور علم جدید"، لاہور: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، ۱۹۸۱ء، ۵۹۴
الشلبی، ڈاکٹر احمد	تاریخ تعلیم و تربیت۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۳ء
عمری، جلال الدین انصر	عورت اسلامی معاشرے میں طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۲ء
غازی، ڈاکٹر محمود احمد	خطبات بہاولپور، بہاولپور یونیورسٹی بہاولپور
محمد ظفیر الدین، مولانا	اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ طبع ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۲ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	حقوق الزوجین۔ طبع اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۴ء
" " "	تفہیم القرآن، لاہور
" " "	پردہ، لاہور
" " "	اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور
" " "	اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، لاہور
" " "	حقوق الزوجین
ندوی، سید سلیمان	سیرۃ النبی۔ طبع دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) ۱۹۶۲ء
نعمانی، مولانا عبدالرشید	لغات القرآن۔ طبع ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۹ء

ENGLISH

Name of Books	Author's Name
Abdul Latif, S.	Islamic Cultural Studies, Lahore, Sh. Mohammad Ashraf, 1947.
Abdul Quddus Sayyid,	Social change in Pakistan , progressive publishers Zaildar park , Ichhra , Lahore Pakistan ,1990.
Abu Sulayman, Abdul Hamid,	Towards an Islamic Theory of International Relation. The International Institute of Islamic Thought, Herndon, Virginia, USA, (1415-1994)
Ali Dr. Basharat	Laws and Principles of Quranic Sociology, Jamiyatul-Falah Karachi 1971
Ali, Dr. Basharat,	Muslim Social Philosophy, Jamiyatul Falah publications, Karachi 1971
Bagby, Philip	Culture & History, Longmans, Green & Co., 1958.
Barness, H. E.	Social Institutions, New York, Prentice Hall, 1946.
Beals, Ralph L., and Haijer, Harry,	An Introduction to Anthropology. The MacMillan Company, 1970 3rd edition
Benson	Religion in Contemporary Cultures.
Bogardus, Emory,S	Sociology , The Macmillan Company, New York. 1954
Bowle, Gordon T.	The people of Asia, weidenfeld and Nicolson, St john Hill London , 1977
Buber, Martin,	I and Thou, London
Cales, G.D.H.	Introduction to the Social contract and courses by Jaecques Rousseau, London, 1913
Cooper, David,	The death of the family, Penguin, Harmonds work, 1972
Daryll, ford, C., Habital,	Society and Economy, New York: CP Dutton, 1950

Edwin R. A. Seligman, Edit. — Encyclopedia of Social Sciences, The Macmillan Co., New York, 1972.

M. Th. Hautsma and others, Edit. — Encyclopedia of Islam, E. J. Brill Ltd, Leyden, 1913.

Siddiqi Allama Alla-ud-Din, Edit. — International Islamic Colloqium Paper, Lahore, 1956.

Walter Yust Edit. — Encyclopedia Britannica, London, 1950.

Mai Yamani, Edit. — Feminism and Islam, Gamet Publishing limited 8 Southern court south street Reading Berk Shine U.K. 1996

Eggan, Fred, Rd. — Social Anthropology of North American Tribes, The University of Chicago Press, 1939.

Eliot, T. S. — Notes Towards the Definition of Culture, London, Fother & Foher Ltd., 1948.

Fichter, J. H. — Sociology, University of Chieago Press, Chicago, London.

Garness, J. W. — Political Science & Government, Calcutta World Press, 1955.

Gellner, Ernest, — Muslim society, Cambridge University Press Cambridge, U.K. 1884.

Gold thorpe, J.E, — An introduction to Sociology, Cambridge University Press Cambridge U.K. 1985

Gundry, W. D. — Religions. New York

Habib ur-Rahman Hafiz, — Elements of Sociology, Ideal Publications, Dacca, 1970

Hammond, peter B. — Cultural and Social Anthropology .Selected Readings The Macmillan Company New York, 1964

Haralambos .M — Sociology , Themes and Perspectives , Bell and Hyman LTD London , 1995

Hobbes — Laviathan, Cambridge Medieval History, Cambridge

Hurd , Geofrey and others, — Human Societies, An Introduction to Sociology, Routledge and Kegan Paul, London . 1973.

مصنف کی دیگر تصانیف

- اصول الحدیث
- حفاظت حدیث
- اقبال اور احیاء دین
- سید مودودی بحیثیت مفسر
- برطانیہ کی مسلم کمیونٹی اور اس کے مسائل
- حضور اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کے تقاضے
- رسول رحمت ﷺ
- مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں مسجد کا کردار
- روزہ حدیث کی روشنی میں
- پیغمبرانہ دعائیں
- اقامت صلوٰۃ
- خلق عظیم
- پیغمبرانہ منہاج دعوت
- شرح حدیث اربعین نووی

ISBN 969-503-401-2

الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور